عالمی شہرت یافتہ عالمِ دین

نگارشاتِ

ڈاکٹر محمد حمید اللہ رح

گردآوردہ: محمد عالم مختارِ حق

اللهم صل على سيدنا محمد النبي

الأمي وعلى آله وصحبه وبارك وسلم

Marfat.com

نگارشاتِ ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

مصنف:

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

گردآوردہ:

محمد عالم مختارِ حق

بیکن بُکس
BEACON BOOKS

• غزنی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور فون 042 - 7351662
• گلگشت، ملتان فون 061 - 520790, 520791

Email beaconbookspakistan@hotmail.com

Marfat.com

131251

اشاعت : 2004ء

عبدالجبار نے
لعل سٹار پرنٹنگ پریس سے
چھپوا کر بیکن بکس ملتان-لاہور
سے شائع کی۔

قیمت : -/410روپے

ISBN 969 - 534 - 032 - 6

فہرست

صفحہ نمبر

حرفِ مدعا 9

(i) قرآن

تاریخ قرآن مجید 17

قرآنی تصورِ مملکت 38

قرآن مجید اور عورت 65

قرآن مجید کے فرانسیسی ترجمے 73

ایلاف - جاہلیت میں عربوں کے معاشی و سفارتی تعلقات 82

تراجم قرآن مجید تازہ بتازہ نو بہ نو 108

قرآن مجید کی سالگرہ مبارک 120

(ii) سیرت

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت 125

عہد نبویؐ کی سیاستِ خارجہ کا شہکار 149

عہد نبویؐ کے اصولِ سیاست 160

عہد نبویؐ کے عربی ایرانی تعلقات 173

آنحضرتؐ کا نامۂ مبارک کسریٰ کے نام "ایک نئی دریافت" 191

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط قیصر روم کے نام 199

سیرت طیبہ کا پیغام عصر حاضر کے نام 213

(iii) فقہ

فقہ کی تشکیل اور آغاز کا معمہ 261

Marfat.com

صفحہ نمبر

اسلام اور علم ہیئت کے نئے مسائل 294

اسلام میں انسانی خون کا احترام 310

اسلامی جہاد 314

(iv) اکابرین

امام محمد کی بارہ سو سالہ یادگار وفات 321

مولانا رومی کی سات سو سالہ برسی 332

شمس الائمہ السرخسی 335

امام سرخسی کی نو سو سالہ برسی 357

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی صد سالہ یادگارِ ولادت 369

ابو حنیفہؒ کی کتاب النبات 378

ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی 391

کتاب النبات دینوری 405

القاضی الرشید 409

(v) تاریخ

علم تاریخ میں مسلمانوں کا حصہ 425

فتح مکہ کی چودہ سو سالہ یادگار 447

(vi) قانون

قانون بین الممالک 455

علم قانون میں مسلمانوں کا حصہ 469

تاریخِ قانون میں مسلمانوں کا حصہ 485

رومی قانون اور اسلامی قانون 495

Marfat.com

صفحہ نمبر

(vii) خطۂ عرب

عربوں کی جہاز رانی پر استدراک 513

آٹھویں صدی ہجری میں مصر و شام میں ڈاک کا نظام 536

پٹرول، گیس اور ابتدائے اسلام 546

(viii) مستشرقین

استنبول کی موتمر مستشرقین عالم 555

کیمبرج کی موتمر مستشرقین عالم 568

موتمر مستشرقین عالم کا اجلاس 575

موتمر مستشرقین عالم کا 25 واں اجلاس ماسکو 583

موتمر مستشرقین عالم امریکہ میں 595

اٹھارہویں موتمر مستشرقین لائڈن 609

(ix) ادب

گارساں دتاسی 617

دانتے کی نظم طربیہ 629

فرانسیسی زبان کی پیدائش میں عربی کا حصہ 634

ادیبوں سے دہائی 643

حیدرآباد کی ایک تعلیمی جوبلی 648

(x) سود

انجمن ہائے قرضہ بے سودی 655

(xi) مکاتیب 663

مآخذ و مراجع 691

Marfat.com

حرفِ مُدعا

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے سانحۂ ارتحال کے بعد جو ۱۸ ردسمبر ۲۰۰۲ء کو وقوع پذیر ہوا، غالباً سب سے پہلے ان کی بہترین تحریریں بیکن بکس اردو بازار لاہور/گلگشت ملتان نے ۲۰۰۳ء میں چھاپ کر اوّلیت کا اعزاز حاصل کیا۔ راقم کے دل میں قدرت نے تب ہی سے داعیہ پیدا کر دیا کہ میں موصوف کی نگارشات کو یکجا کرنے کا کام بسم اللہ کہہ کر شروع کر دوں۔ چنانچہ اسی نقطۂ نظر سے جب موصوف کے علمی ورثہ کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ آپ کا سب سے پہلا مضمون ''مدراس کی سیر'' لاہور کے ہفت روزہ ''نونہال'' میں 8 رجنوری 1924ء کو چھپا تھا (مدیر ''تکبیر'' صلاح الدین کے انٹرویو میں سہوِ قلم سے 1928ء چھپ گیا ہے)۔ یہ بھی عجیب اتفاق کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا آخری مضمون ''ایک شرارت'' بھی ''نونہال'' ہی میں چھپا (کراچی 1989ء)۔ ڈاکٹر صاحب نے مظہر ممتاز قریشی صاحب کے نام اپنے ایک مکتوب محررہ کیم جمادی الآخر 1410ھ میں اپنے مقالات کی تعداد ایک ہزار سے زاید بتائی ہے اور یہ وہ مضامین ہیں جو 41 سالہ قیامِ فرانس کے دوران لکھے گئے (البتہ حیدرآباد دکن میں لکھے گئے مضامین اِن سے الگ ہیں۔ مکتوب بنام مظہر قریشی صاحب مورخہ 5 رصفر 1410ھ)۔ ان مضامین میں بیشتر فرانسیسی اور انگریزی میں لکھے گئے اور کمتر اردو میں مگر اس ''کمتر'' کا دور بھی 65 سالوں پر محیط ہے اور ظاہر ہے کہ اس طویل عرصہ کے ریکارڈ کی تلاش خاصا صبر آزما اور وقت طلب معاملہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی حینِ حیات دو اداروں نے موصوف کے ایام سے ان کے مضامین کے دو مجموعے شائع کیے پہلا مجموعہ مکتبہ جامعہ دہلی نے 1944ء میں ''عہدِ

Marfat.com

نبوی میں نظامِ حکمرانی'' کے عنوان سے شائع کیا جس میں بارہ مضامین شامل ہیں (تیسرا ایڈیشن اردو اکیڈمی سندھ، کراچی سے 1987ء میں اشاعت پذیر ہوا)۔ دوسرا مجموعۂ مضامین جو ''رسولِ اکرم کی سیاسی زندگی'' کے عنوان سے دارالاشاعت کراچی سے 1950ء میں چھپا، وہ 33 مقالات پر مشتمل ہے۔ ایک مضمون ''رسولِ اکرم کی سیرت کا مطالعہ کس لیے کیا جائے'' دونوں مجموعوں میں معمولی ترمیم و اضافہ کے بعد مشترکہ طور پر شامل ہے۔ راقم کو ان دو مجموعوں کے علاوہ کسی تیسرے باقاعدہ مجموعے کا علم نہیں ہو سکا۔ ایسی صورتِ حال میں راقم کو جو کچھ میسر آ سکا (اور اس ''جو کچھ'' میں سلفیہ لائبریری شیش محل روڈ لاہور کے مہتمم جناب حافظ احمد شاکر صاحب کا بہت بڑا حصہ ہے جنہوں نے لائبریری سے بھرپور استفادہ کا موقع فراہم کیا)۔ خوانندگانِ گرامی کی خدمت میں ''جہاں ہے، جیسا ہے'' کے اصول کے تحت یہ مضامین بغیر کسی مناسب ترتیب کے مختلف جلدوں میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ تکمیل پر خدا نے توفیقِ رفیق کی تو انشاء اللہ العزیز ''نقاشِ نقشِ ثانی بہتر کشد زاول'' کے مصداق طبعِ ثانی مناسب ترتیب کے ساتھ پیش کریں گے۔ وما توفیقی اِلا باللّٰہ۔

اب چند باتیں مصنف محترم کے بارے میں۔

اکثر تذکرہ نگاروں نے یہ بات زور دے کر لکھی ہے کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کو یہ بات قطعاً پسند نہ تھی کہ ان کی سوانح عمری لکھی جائے۔ وہ کسی زندہ شخص پر کام کرنے کو پسند نہ کرتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس سے آزادیِ فکر نہیں رہتی۔ اس لیے ان کی زندگی کے بعض اہم گوشے اہلِ علم سے مستور ہیں۔ تاہم ہم نے موصوف پر لکھے گئے مضامین اور بعض دیگر مستند ذرائع سے ان کی زندگی کے متعلق جو کچھ اخذ کیا وہ ہدیۂ قارئین کرام ہے:

ڈاکٹر محمد حمید اللہ 16 رمحرم الحرام 1326ھ/ 19رفروری 1908ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے (مظہر ممتاز قریشی صاحب کے نام اپنے مکتوب محررہ 11رربیع الانور 1410ھ میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی تاریخ ولادت 19رجنوری بتائی ہے جسے سہوِ قلم ہی کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہ پیشتر ازیں اپنے خودنوشت حالات میں 19رفروری تحریر کر چکے ہیں (ڈاکٹر

Marfat.com

محمد حمید اللہ از راشد شیخ)۔ اور تعلیم و تربیت کے مختلف مراحل طے کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے شعبۂ دینیات میں شرکت کی اور ایم اے ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے آپ یورپ کو روانہ ہو گئے۔ بون یونیورسٹی (جرمنی) سے ۱۹۳۲ء میں صرف دس ماہ کے عرصہ میں اسلام کے بین الاقوامی قانون پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈی فل کی ڈگری حاصل کی اور سوربون یونیورسٹی پیرس سے ۱۹۳۳ء میں عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں اسلامی سفارت کاری'' کا تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر صاحب کچھ عرصہ تک جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں پروفیسر رہے۔ یورپ جانے کے بعد جرمنی اور فرانس کی یونیورسٹیوں میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔ فرانس کے نیشنل سنٹر آف سائنٹیفک ریسرچ سے تقریباً بیس سال تک وابستہ رہے۔ علاوہ ازیں یورپ اور ایشیا کی کئی یونیورسٹیوں میں آپ نے توسیعی خطبات بھی دیے۔ ڈاکٹر صاحب السنۂ شرقیہ یعنی عربی، فارسی، ترکی اور اردو کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی وغیرہ زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے۔ آپ نے اہلِ مغرب کو اسلام کی حقیقی تعلیمات اور پیغمبرِ اسلام کی سیرت طیبہ سے متعارف کرانے کے لیے مختلف یورپی زبانوں میں سیکڑوں مقالات اور متعدد کتابیں لکھیں۔ فرانسیسی زبان میں آپ کے ترجمۂ قرآن مجید اور اسی زبان میں دو جلدوں پر مشتمل سیرت پاک کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح انگریزی میں آپ کی کتاب ''محمد رسول اللہ'' بہت مقبول ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب ستمبر 1948ء میں دولت آصفیہ کے پاسپورٹ پر ایک ماہرِ قانون بین الممالک کی حیثیت سے سیکورٹی کونسل کے وفد میں شریک ہو کر نیو یارک پہنچے۔ اسی دوران سقوطِ حیدر آباد کا سانحہ پیش آ گیا۔ پھر ان کی غیرت نے بھارت جانا گوارا نہ کیا اور پیرس (فرانس) میں ہی مستقل سکونت اختیار کر لی اور بقیہ عمر وہیں بتا دی۔ آپ کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد 175 ہے جن میں سے دو درجن کے قریب اردو کتابیں ہیں۔ ان اردو کتابوں میں سے بعض کے اسماء درج ذیل ہیں:

۱۔ عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ

Marfat.com

۲۔ عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی

۳۔ عہدِ نبوی کا نظامِ تعلیم

۴۔ امام ابو حنیفہ کی تدوین قانون اسلامی

۵۔ رسولِ اکرم کی سیاسی زندگی

۶۔ قانون بین الممالک کے اصول اور نظیریں

۷۔ خطباتِ بہاولپور

۸۔ ترجمہ مقالات گارسان دتاسی

آپ کی بعض تصانیف کے اردو تراجم:

۱۔ سیاسی وثیقہ جات (اردو ترجمہ الوثائق السیاسیہ للعہد النبوی والخلافۃ الراشدہ از ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی)
(ڈاکٹر صاحب اس ترجمہ کو ناقص قرار دیتے ہیں)
)بحوالہ رسالہ معارف اسلامی)

۲۔ محمد رسول اللہ (اردو ترجمہ **Muhammad Rasul Allah** از نذیر حق (ڈاکٹر صاحب کو یہ ترجمہ بھی "وفادارانہ معلوم نہ ہوا) بحوالہ مکتوب بنام راقم مورخہ ۲۵رصفر ۱۴۰۴ھ۔

۳۔ سیرۃ ابن اسحٰق (مرتبہ)۔ (اردو ترجمہ از نور الٰہی ایڈووکیٹ)

روزنامہ "منصف" حیدرآباد دکن مورخہ ۶رستمبر 2003ء کا مبصر آپ کے آثار پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں بلا کی سادگی تھی۔ ان کی وضع قطع مشرقی اور طرز رہائش اور بود و باش قدیم عالموں کی طرح سادہ اور منکسرانہ تھا۔ وہ صاف اور سادہ لباس پہنتے، استری اور کلف کے قائل نہ تھے۔ برہنہ سر کبھی نہ ہوتے اور ہمیشہ باوضو رہتے۔ ان کے عادات و اطوار بزرگانِ دین اور صحابہ کرام کا نمونہ تھے۔ انہیں دیکھنا گویا علم کو مجسم شکل میں دیکھنا تھا۔ وہ ایک کھلی کتاب تھے۔ سرتاپا انہماک اور سرتاپا صداقت۔ وہ سچے علم دوست اور عالمِ باعمل تھے۔ وہ علم و تقویٰ، قناعت اور سادگی میں سلف کی مثال تھے۔ قناعت کا یہ عالم کہ شاہ فیصل ایوارڈ سے معذرت کر لی اور

Marfat.com

پاکستان کے ہجرہ ایوارڈ کے دس لاکھ روپے ادارہ تحقیقاتِ اسلامی اسلام آباد کے کتب خانہ کو عطیہ کر دیے۔ اب یہ کتب خانہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ لائبریری کے نام سے موسوم ہے۔ اسی طرح سیرت ابن اسحٰق پر نقوش ایوارڈ برائے 1985ء قبول کرنے سے معذرت کر لی۔ ان کی قناعت پسندی کی اور بھی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

یہ منحنی سا اور دبلا پتلا شخص اتنا سخت جان واقع ہوا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ ہجرت کی تحقیق میں پا پیادہ، گھوڑے اور اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھ کر اس راستے پر عملاً سفر کیا جس راستے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی تھی۔

بلند اخلاقی کا یہ مقام کہ اپنے مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرنے کے لیے بھی ناشر کی اجازت ضروری گردانتے چنانچہ ''رسولِ اکرم کی سیاسی زندگی'' کی ''عرضِ مولف'' میں رقم طراز ہیں کہ ''جن رسالوں میں یہ مضامین نکلے ہیں ان کی اجازت حاصل کرنی اخلاقی طور پر ضروری ہے۔ حالات نے اس کا موقع نہ دیا لیکن مجھے امید ہے کہ نیک کام اور ازدیارِ نفعِ عام کو وہ بھی خوشی سے منظور کرتے ہیں۔

صابر ایسے تھے کہ ایک روز وہ بینک سے رقم لینے گئے تو معلوم ہوا کہ ان کا اکاؤنٹ خالی ہے کسی شخص نے ان کے دستخطوں میں مہارت حاصل کی اور جعلی دستخط کر کے ساری رقم نکلوا لی۔ ڈاکٹر صاحب نے کسی سے اس بات کا ذکر نہ کیا۔ روزمرہ کی ضروریات کے لیے بھی ان کے پاس رقم نہیں تھی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اگلے ماہ پنشن آنے تک وہ کچھ نہیں کھائیں گے اور محض پانی وغیرہ پر گزارا کریں گے۔ ایک روز مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے ان پر نقاہت کا غلبہ ہوا اور وہ گر پڑے۔ ہسپتال پہنچایا گیا تو معلوم ہوا کہ کئی روز سے فاقہ سے تھے۔ بعد ازاں ان کے بھتیجے عطاء اللہ کی صاحبزادی سدیدہ انہیں اپنے ہمراہ فلاڈلفیا لے گئی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ تمام زندگی اشاعت علم نافع میں مصروف رہنے کے بعد 17/ دسمبر 2002ء کو امریکی ریاست فلوریڈا کے شہر Jackson Vill میں صبح گیارہ بجے نیند کی حالت میں انتقال کر گئے۔ آپ نماز فجر کے بعد سوئے تھے اور اسی حالت میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اس وقت آپ کی عمر 95 برس تھی۔ آپ کی نماز جنازہ امریکی نژاد دانشور

Marfat.com

ڈاکٹر یوسف ضیاء کواک جی نے پڑھائی جو شمالی ٹیکساس کے اسلامک ایسوسی ایشن کے امام ہیں۔ 18/دسمبر 2002ء کو ڈیڑھ بجے دن Chapal Hill قبرستان میں انکی تدفین ہوئی۔

ان گزارشات کے بعد جی چاہتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا ذکرِ خیر ان کے اس زریں قول پر ختم کیا جائے جو علم کے حوالے سے ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے:

''انسان کی بیشتر زندگی علم سیکھنے میں گزر جاتی ہے جب علم کو سمجھنے کا وقت آتا ہے تو وہ اس خاکداں سے چلا جاتا ہے''۔

(مجلہ عثمانیہ صفحہ: 55)

فقط۔ وما علی الا البلاغ

محمد عالم مختار حق

۲۵ر رجب المرجب ۱۴۲۵ھ/

11/ستمبر 2004ء

Marfat.com

قرآن

Marfat.com

تاریخ قرآن مجید

محترم صدر، محترم وائس چانسلر برادران وخواہران محترم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

قرآن مجید ایک ایسا موضوع ہے جس کے بہت سے پہلو ہیں اور ایک گھنٹے کے مختصر وقت میں یہ ممکن نہیں کہ ان سارے پہلوؤں پر روشنی ڈالی جا سکے۔ اس لیے صرف اس کے ایک پہلو یعنی تدوین قرآن مجید کی تاریخ کو چند الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

مسند احمد بن حنبل میں ایک حدیث ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ”اللہ نے حضرت آدم سے لے کر مجھ تک ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے، جن میں سے تین سو پندرہ صاحب کتاب تھے“۔ تین سو پندرہ صاحب کتاب نبیوں کے نام نہ تو قرآن مجید میں ہیں اور نہ احادیث میں ان کا ذکر ہے، لہٰذا ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ان کی تفصیل معلوم کر سکیں۔ صرف چند اشارے ملتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام پر دس صحیفے نازل ہوئے تھے۔ لیکن یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کس زبان میں تھے۔ چہ جائیکہ ان کی مندرجات کا علم ہو۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے حضرت شیث علیہ السلام بھی پیغمبر تھے۔ ان کے متعلق بعض روایات میں ذکر ملتا ہے کہ ان پر بھی چند کتابیں نازل ہوئی تھیں۔ لیکن ان کا بھی دنیا میں اب کوئی وجود نہیں۔ قدیم ترین نبی، جن کی طرف منسوب کتاب کا کچھ حصہ ابھی حال ہی میں ہم تک پہنچا

Marfat.com

ہے، حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔ غالباً آپ نے سنا ہوگا کہ فلسطین میں بحر مردار کے پاس بعض غاروں میں کچھ مخطوطے ملے ہیں۔ ان مخطوطوں میں سے ایک کتاب حضرت اخنوخ یا انوخ یعنی حضرت ادریس علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ حال ہی میں اس کتاب کے کچھ ترجمے انگریزی زبان میں شائع ہوئے ہیں۔ اگرچہ اس بات کا کوئی حتمی وقطعی ثبوت نہیں، لیکن اب تک تحقیق کے مطابق ہم اسے قدیم ترین نبی کی کتاب کہہ سکتے ہیں۔ اس کتاب میں آخری نبی کی بشارت بھی ہے جس کو بعد میں عہد جدید (انجیل) کے باب ''مکتوب یہوذ'' نے بھی نقل کیا ہے۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق بھی ہمیں کچھ اشارے ملتے ہیں۔ عراق میں ''صابیہ'' کے نام سے ایک چھوٹا سا گروہ پایا جاتا ہے، جس کا ایک مستقل دین ہے۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ ''حضرت نوح علیہ السلام کی کتاب اور ان کے دین پر عمل پیرا ہیں'' ان کا کہنا ہے کہ ایک زمانے میں حضرت نوح علیہ السلام کی پوری کتاب ہمارے پاس موجود تھی لیکن امتداد زمانہ کے سبب سے اب وہ ناپید ہے۔ اس کے مندرجات صرف چار پانچ سطروں میں ہمارے پاس موجود ہیں جن میں اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کے بعد ایک اور نبی آئے ہیں جن کی کتاب کا ذکر خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ صحف ابراہیم و موسیٰ دو مرتبہ قرآن مجید (53:37 تا 41 اور 19:87) میں اس کا ذکر آیا ہے۔ ان کی کتاب کے مندرجات یہودی اور عیسائی ادبیات میں تو نہیں، قرآن مجید میں چند سطروں کی حد تک محفوظ ملتے ہیں۔ اسی طرح بعض ایسے انسان بھی ہیں جن کو صراحت کے ساتھ نبی تو تسلیم نہیں کیا جا سکتا، لیکن ان کی نبوت کے امکان کو رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے ایک شخصیت ''زردشت'' کی ہے۔ پارسی انہیں اپنا نبی مانتے ہیں۔ ان کی نبوت کا امکان اس بنا پر بھی ہے کہ قرآن مجید میں مجوس قوم کا ذکر آیا ہے۔ مجوسیوں کا مذہب زردشت کی لائی ہوئی کتاب ''آوستا'' پر مبنی ہے۔ آوستا کے متعلق ہم تک کچھ معلومات پہنچی ہیں۔ جب ہم اس کا قرآن مجید سے موازنہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کس کو کیا برتری حاصل ہے؟ زردشت کی کتاب اس وقت کی ''زند'' زبان میں تھی۔ کچھ عرصے بعد ایران پر دوسری قوموں کا غلبہ ہوا اور

Marfat.com

فاتحین کی زبان وہاں رائج ہوئی۔ پرانی زبان متروک ہوتی گئی۔ نتیجہ یہ کہ ملک بھر میں مٹھی بھر علما اور محققین کے سوا زند زبان جاننے والا کوئی نہ رہا۔ اس لیے زرتشتی مذہب کے علماء نے نئی زبان پازند میں اس کتاب کا خلاصہ اور شرح لکھی۔ آج کل ہمارے پاس اس نسخے کا صرف دسواں حصہ موجود ہے، باقی غائب ہو چکا ہے۔ اس دسویں حصہ میں کچھ چیزیں عبادات کے متعلق ہیں اور کچھ دیگر احکام ہیں۔ بہر حال دنیا کی ایک قدیم دینی کتاب کو ہم آوستا کے نام سے جانتے ہیں لیکن وہ مکمل حالت میں ہم تک نہیں پہنچ سکی ہے۔ یہاں ایک چیز کا میں اشارۃً ذکر کروں گا۔ آوستا میں دوسری باتوں کے علاوہ زردشت کا یہ بیان ملتا ہے۔ میں نے دین کو مکمل نہیں کیا۔ میرے بعد ایک اور نبی آئے گا جو اس کی تکمیل کرے گا اور اس کا نام رحمۃ للعالمین ہوگا یعنی ساری کائنات کے لیے باعث رحمت۔

ہندوستان میں بھی کچھ دینی کتابیں پائی جاتی ہیں اور ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے الہام شدہ کتابیں ہیں۔ ان مقدس کتابوں میں وید، پران، اپنشد اور دوسری کتابیں شامل ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ سب کتابیں ایک ہی نبی پر نازل ہوئی ہیں۔ ممکن ہے متعدد نبیوں پر نازل ہوئی ہوں بشرطیکہ وہ نبی ہوں۔ ان میں بھی خصوصاً ''پران'' نامی کتابوں میں کچھ دلچسپ اشارے ملتے ہیں۔ ''پران'' وہی لفظ ہے جو اردو میں پرانا یعنی قدیم ہے۔ اس کی طرف ہمیں قرآن مجید میں ایک عجیب وغریب اشارہ ملتا ہے وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ (26:196) (اس چیز کا پرانے لوگوں کی کتابوں میں ذکر ہے) میں نہیں جانتا کہ اس کا پران سے کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ بہر حال دس پران ہیں، ان میں سے ایک میں یہ ذکر ہے کہ آخری زمانے میں ایک شخص ریگستان کے علاقے میں پیدا ہوگا۔ اس کا نام، قابل اعتماد اور باپ کا نام اللہ کا غلام ہوگا۔ وہ اپنے وطن سے شمال کی طرف جا کر بسنے پر مجبور ہوگا اور پھر وہ اپنے وطن کو متعدد بار دس ہزار [1] آدمیوں کی مدد سے فتح کرے گا۔ جنگ میں اس کی رتھ کو اونٹ کھینچیں گے اور وہ اونٹ اس قدر

---

[1] یہ ایک عدد ہے جس کا اردو میں مترادف نہیں۔ بہر حال متعدد بار دس ہزار کا اشارہ شاید حجۃ الوداع کی طرف ہو نہ کہ فتح مکہ کی طرف۔

Marfat.com

تیز رفتار ہوں گے کہ آسمان تک پہنچ جائیں گے ۲۔ اس کتاب میں مذکور الفاظ ہمیں ملتے ہیں ان سے ممکن ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ مستنبط کیا جا سکے۔

ان پرانی کتابوں کے علاوہ، وہ کتابیں ہیں جو مسلمانوں میں بالخصوص معروف ہیں، یعنی تورات، زبور اور انجیل۔ قبل اس کے کہ قرآن مجید کا آپ سے ذکر کروں بطور تمہید ان کا بھی چند الفاظ میں ذکر کروں گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو کتاب نازل ہوئی وہ ''توریت'' کہی جاتی ہے۔ لیکن دراصل توریت اس کتاب کا ایک جزء ہے۔ توریت کے معنی ہیں ''قانون''۔ یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف پانچ کتابیں منسوب کرتے ہیں۔ پہلی کتاب ''کتاب پیدائش'' کہلاتی ہے۔ دوسری ''خروج'' جو مصر سے نکلنے کے حالات پر مشتمل ہے۔ تیسری کتاب ''قانون'' ہے۔ چوتھی کتاب کا نام ''اعداد و شمار'' ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا تھا کہ یہودیوں کی قبیلے وار مردم شماری کی جائے۔ پانچویں ''تثنیہ'' کے نام سے موسوم ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ پرانی چیزوں کو دوبارہ دہرایا جائے۔ ان کو Up to date کیا جائے یا ان کی تشریح کی جاتی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاں یہ پانچویں کتاب (تثنیہ) نہیں پائی جاتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوئی چھ سو سال بعد ایک جنگ کے زمانے میں ایک شخص ملک کے اس وقت کے یہودی بادشاہ کے پاس ایک کتاب لایا اور کہا کہ مجھے یہ کتاب ایک غار سے ملی ہے۔ معلوم نہیں کس کی ہے۔ مگر اس میں دینی احکام نظر آتے ہیں۔ بادشاہ نے اپنے زمانے کی ایک نبیہ عورت کے پاس اس نسخے کو بھیجا، یہودیوں کے ہاں عورتیں بھی نبی رہی ہیں (یا کم از کم وہ اس کا دعویٰ کرتے ہیں) اس نبیہ نے جس کا نام حلدا Hulda بیان کیا جاتا ہے یہ کہلا بھیجا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی کتاب ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چند سو سال بعد اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیا جانے لگا۔ اس کتاب کو ''تثنیہ'' کا نام اس لیے دیا گیا کہ اس میں پہلی چار کتابوں کے احکام میں سے کچھ احکام خلاصے کے طور پر اور کچھ اضافے کے ساتھ دہرائے گئے ہیں۔ بہرحال ان پانچ کتابوں کی سرگزشت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ

۲۔ یا شاید معراج مبارک کی طرف اشارہ ہو۔

Marfat.com

السلام کی وفات کے بعد آنے والے انبیاء کے زمانے میں یہودیوں نے فلسطین کا کچھ حصہ فتح کیا۔ وہاں حکومت شروع کی تو کچھ عرصے بعد عراق کے حکمران بخت نصر (بنو کدنوصور) نے فلسطین پر حملہ کیا۔ چونکہ اس کا دین یہودیوں کے دین سے مختلف تھا اس لیے اس نے صرف ملک فتح کرنے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ ان دشمنوں کے دین کو بھی دنیا سے نیست ونابود کرنے کے لیے توریت کے تمام قلمی نسخوں کو جمع کر کے آگ لگا دی۔ حتیٰ کہ توریت کا ایک نسخہ بھی باقی نہ رہا۔ یہودی مؤرخوں کے مطابق اس کے ایک سو سال بعد ان کے ایک نبی ''حضرت عزرا Esdra نے (جو شاید حضرت عزیر (Uzair) علیہ السلام ہوں) یہ کہا کہ مجھے توریت زبانی یاد ہے۔ انہوں نے توریت املا کروائی۔ توریت کے اس اعادے کے کچھ عرصے بعد روما کے ایک حکمران نے فلسطین پر حملہ کیا۔ سپہ سالار کا نام انٹیوکس Antiochus تھا اس نے بھی وہی کام کیا جو بخت نصر نے کیا تھا۔ یعنی یہودیوں کی کتابیں جمع کر کے جلا دیں۔ اس طرح دوسری مرتبہ یہ نابود کر دی گئیں۔ اس کے کچھ عرصے بعد ایک اور رومی حکمران نے طیطس (Titus) نامی کمانڈر کی ماتحتی میں ایک فوج بھیجی اور اس نے تیسری مرتبہ فلسطین میں دستیاب شدہ یہودیوں کی تمام کتابوں کو جلا دیا۔ اب ہمیں توریت کے نام سے جو کتاب ملتی ہے وہ بائبل کے حصہ عہد نامہ عتیق (Old Testament) میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب پانچ کتابیں ہیں۔ یہ کتابیں تین چار مرتبہ کی آتش زدگی کے بعد اعادہ شدہ شکلیں ہیں۔ ان کا اعادہ کس طرح ہوا اور کس نے ان کا اعادہ کیا، اس کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں۔ البتہ جو شخص ان کتابوں کو پڑھتا ہے تو اسے دو چیزوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ بعض اوقات اسے ایسی چیزیں نظر آتی ہیں، جو کھٹکتی ہیں اور اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ اصل میں نہ ہوں گی بلکہ بعد کا اضافہ ہیں۔ بعض مقامات پر کمی محسوس ہوتی ہے اور تشنگی باقی رہتی ہے۔ چنانچہ بعض چیزیں جو زیادہ ہوگئی ہیں وہ اس طرح کی ہیں کہ جو کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ہے اس میں وہ باتیں ہیں جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیماری، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تدفین اور اس کے بعد کے واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حصہ بعد کا اضافہ ہے مگر یہ تو ایسی باتیں ہیں

جنہیں ہر پڑھنے والا فوراً محسوس کر لیتا ہے خدا ہی بہتر جانتا ہے اس میں دیگر کتنی چیزوں کا اضافہ ہوا جو غیر محسوس ہوں۔ اسی طرح جن چیزوں کی کمی نظر آتی ہے یا جن کا وہاں ہونا ضروری تھا مگر نہیں ہیں وہ ایسی ہیں کہ کم از کم بیس مرتبہ اس طرح کے الفاظ ملتے ہیں کہ اس حکم کی تفصیلیں فلاں باب میں ملیں گی، جن ابواب کے حوالے دیے گئے ہیں ان میں سے ایک باب کا نام ''خدا کی جنگیں'' اور ایک اور باب کا نام مخلص اور نیک لوگوں کی کتاب ہے اور وہ باب سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ یہ کچھ باتیں توریت کے متعلق تھیں جو میں نے آپ سے بیان کیں۔ توریت ضخیم صورت میں ہمارے پاس موجود ہے اور دنیا کی بیشتر زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

توریت کے بعد مسلمانوں میں عام طور پر زبور کا نام لیا جاتا ہے اور ہمارا تصور یہ رہا ہے کہ یہ بھی توریت اور انجیل ہی کی طرح ایک مستقل کتاب ہے۔ لیکن عہد نامہ عتیق (Old Testament) میں جو چیز حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف منسوب ہے اور جس کو وہ سام Psalm یعنی زبور کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اس میں صرف خدا کی حمد وثنا کی نظمیں ہیں، کوئی نیا حکم نہیں ہے۔ ہمارا یہ تصور ہے کہ ہر رسول یا نبی ایک نئی شریعت لاتا ہے لیکن اس کتاب میں ایسی کوئی نئی شریعت نہیں ملتی۔ تاہم جس طرح پرانی کتابوں میں (کتاب ادریس سے لے کر ایران کے آوستا تک) ایک آخری نبی علیہ السلام کی بشارت ملتی ہے اس طرح زبور میں بھی ایسی چیزیں ملتی ہیں۔ نیز جو سرگزشت توریت کی رہی، وہی زبور کی بھی رہی ہے۔ اس لیے میں اس کو چھوڑ کر اب انجیل کا ذکر کرتا ہوں۔

انجیل کے متعلق مسلمانوں کا تصور عام طور پر یہ ہے کہ وہ ایک مستقل کتاب تھی جو خدا کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ لیکن ہمارے پاس عیسائیوں کے توسط سے جو انجیل پہنچی ہے، وہ ایک نہیں بلکہ چار انجیلیں ہیں، جو یہ ہیں: متی (Matthew)۔ مرقس (Mark)، لوقا Luke، یوحنہ (Iohn)۔ ہر انجیل ایک الگ آدمی کی طرف منسوب ہے۔ یہ چار کتابیں بھی ساری انجیلیں نہیں ہیں۔ بلکہ خود عیسائی مؤرخوں کے مطابق ستر سے زیادہ انجیلیں پائی جاتی تھیں۔ جن میں سے ان چار کو قابل اعتماد اور باقی کو مشتبہ قرار دیا گیا ہے۔ ان کو پڑھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجے

13/251

Marfat.com

ہوئے الہام یا وحی پر مشتمل نہیں بلکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمریاں ہیں۔ چار شخصوں نے یکے بعد دیگرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمری لکھی اور ہر ایک نے اس کو انجیل کا نام دیا۔ لفظ انجیل کے معنی ہیں ''خوشخبری'' اور اس کی وجہ تسمیہ غالباً یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جو حالات زندگی انجیل میں ملتے ہیں، ان کے مطابق عام طور پر وہ کسی گاؤں میں جایا کرتے تھے اور وہاں کے لوگوں سے کہتے تھے کہ میں بشارت دیتا ہوں کہ خدا کی حکمرانی اب جلد آنے والی ہے۔ شاید اس اساس پر کتاب کا نام بھی یہی ہو گیا۔ لیکن اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر کوئی کتاب نازل ہوئی تھی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسے لکھوایا نہیں اس لیے آج دنیا میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ اب جو انجیلیں موجود ہیں، ان کی حقیقت یہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے مختلف زمانوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمریاں لکھیں اور ان سوانح عمریوں کو ہر مولف نے انجیل کا نام دیا۔ ان میں سے چار کو کلیسا نے قابل اعتماد قرار دیا ہے اور باقی کو رد کیا ہے۔ ان چار انجیلوں کے انتخاب کے متعلق کسی کو کوئی علم نہیں کہ ان کو کس نے انتخاب کیا کب انتخاب کیا اور کن معیارات کو سامنے رکھ کر انتخاب کیا؟ فرانس کا ایک مشہور مؤرخ ''والٹیر (Voltaire) کے نام سے گزرا ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کلیسا کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ جو ستر سے زائد انجیلیں ہیں اور ان کے مندرجات میں اختلافات بھی ہیں، ان میں سے صرف ان انجیلوں کا انتخاب کیا جائے جو قابل اعتماد ہوں۔ انتخاب کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ کلیسا میں ساری انجیلوں کو عبادت گاہ کے مقام کے پاس ایک میز پر جمع کیا گیا۔ پھر اس میز کو ہلایا گیا جو کتابیں نیچے گر گئیں ان کو ناقابل اعتماد اور ہلانے کے باوجود جو کتابیں میز پر باقی رہیں ان کو قابل اعتماد قرار دیا گیا۔ یہ والٹیر کا بیان ہے۔ اس نے کس بنیاد پر یہ بات کہی ہے یہ بتانا میرے لیے دشوار ہے۔ ظاہر ہے عیسائی لوگ اس کی تردید کرتے ہیں اور ایسی بات کہنے والا ان کے نزدیک جھوٹا اور بدمعاش تھا۔ بہرحال اس بات پر سب متفق ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی لکھوائی ہوئی کتاب دنیا میں موجود نہیں ہے۔ جو چیز اس وقت ہمارے پاس انجیل کے نام سے ملتی ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمریاں ہیں۔ انہیں

Marfat.com

ہم سیرت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہہ سکتے ہیں، بعینہٖ جس طرح مسلمانوں کے ہاں سیرتِ نبوی کی کتابیں پائی جاتی ہیں۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ پر نازل شدہ احکام کو لکھوایا کیوں نہیں تھا؟ میرے ذہن میں جو جواب آتا ہے (ممکن ہے غلط ہو) وہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ ان سے پہلے کے نبی، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو توریت نازل ہوئی تھی اس کی کیا درگت بنی۔ دشمن حملہ کرتے ہیں، اس کی توہین کرتے ہیں، اسے جلا دیتے ہیں اور نیست و نابود کرتے ہیں۔ غالباً انہوں نے یہ سوچا کہ کہیں میری کتاب کا بھی وہی حشر نہ ہو۔ لہٰذا بہتر ہے کہ اسے لکھوایا ہی نہ جائے۔ اس طرح یہ کتاب لوگوں کے ذہنوں میں رہے گی۔ عبادت گزار نیک لوگ اسے ادب سے یاد رکھیں گے اور اپنے بعد کی نسلوں تک پہنچائیں گے۔ شاید یہی تصور ہو جس کی بنا پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی انجیل کو نہ لکھوایا۔

دوسرا مسئلہ یہ کہ خدا چونکہ ازلی اور ابدی علم کا مالک ہے اس لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ حضرت آدم کو ایک حکم دے اور بعد کے نبی کو کوئی دوسرا اس کے بالکل برعکس حکم دے۔ البتہ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ ایک نبی کو کچھ احکام اور بعد کے نبی کو کچھ اور احکام اضافے کے ساتھ دیے جائیں۔ فرض کیجیے کہ حضرت آدم علیہ السلام پر نازل شدہ کتابیں آج دنیا میں صحیح حالت میں موجود ہوتیں تو (میرا تصور یہ ہے) کہ خدا کو کوئی نئی کتاب بھیجنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ وہی کتاب آج بھی کارآمد ہوتی۔ لیکن جس طرح ابھی ہم نے اس مختصر مطالعے میں دیکھا کہ پرانے انبیاء کی کوئی کتاب بھی، بلا استثناء ہم تک، من وعن کامل صورت میں نہیں پہنچی ہے اس لیے خدا نے چاہا کہ ایک مرتبہ انسان کو ایسی مکمل کتاب دی جائے جس میں تمام احکام ہوں اور اس کی مشیت بھی ہوئی کہ یہ کتاب محفوظ رہے۔ وہ کتاب قرآن مجید ہے۔

اب ہم دیکھیں گے کہ قرآن مجید کس طرح محفوظ حالت میں ہم تک پہنچا ہے۔ اولاً میں اس کی زبان کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ یہ عربی زبان میں ہے۔ اس آخری نبی کی کتاب کے لیے عربی زبان کا انتخاب کیوں ہوا؟ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے

کہ زبانیں رفتہ رفتہ بدل جاتی ہیں۔ خود اردو زبان کو لیجیے۔ اب سے پانچ سو سال پہلے کی کتاب مشکل سے ہمیں سمجھ میں آتی ہے۔ دنیا کی ساری زبانوں کا یہی حال ہے انگریزی میں پانچ سو سال پہلے مؤلف چاسر (Chaucer) کی کتاب کو آج کل لندن کا کوئی شخص، یونیورسٹی کے فاضل پروفیسروں کے سوا، سمجھ نہیں سکتا۔ یہی حال دوسری قدیم زبانوں کا ہے۔ یعنی وہ بدل جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ ناقابل فہم ہو جاتی ہیں۔ اگر خدا کا آخری پیغام بھی کسی ایسی ہی تبدیل ہونے والی زبان میں آتا تو خدا کی رحمت کا اقتضاء یہ ہوتا کہ ہم بیسویں صدی کے لوگوں کو پھر ایک نئی کتاب دے تا کہ ہم اسے سمجھ سکیں کیونکہ گزشتہ صدیوں کی کتاب اب تک ناقابل فہم ہو چکی ہوتی۔ دنیا کی زبانوں میں سے اگر کسی زبان کو یہ استثناء ہے کہ وہ نہیں بدلتی تو وہ عربی زبان ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم عصر عربی یعنی قرآن مجید اور حدیث شریف میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اور جو عربی آج ریڈیو پر آپ سنتے ہیں یا جو آج عربی اخباروں میں پڑھتے ہیں ان دونوں میں بہ لحاظ مفہوم الفاظ، گرامر (صرف نحو، ہجے اور تلفظ) کوئی فرق نہیں ہے۔ آج رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہوں اور میں ایک عرب کی حیثیت سے اپنی موجودہ عربی میں آپ سے گفتگو کروں تو آپ اس کا ہر لفظ سمجھیں گے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے جواب مرحمت فرمائیں تو آپ کا ہر لفظ میں سمجھ سکوں گا۔ کیونکہ ان دونوں زبانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میں اس سے استنباط کرتا ہوں کہ آخری نبی پر بھیجی ہوئی آخری کتاب ایسی زبان میں ہونی چاہیے جو غیر تبدل پذیر ہو۔ لہٰذا عربی کا انتخاب کیا گیا۔ عرض کرنا یہ ہے کہ اس عربی زبان میں دیگر خصوصیات مثلاً فصاحت، بلاغت، ترنم وغیرہ کے علاوہ ایک خصوصیت ایسی ہے جس کا ہم سب مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ عربی غیر تبدیل پذیر اور اس کے لیے ہمیں عربوں کا بھی شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے مختلف علاقوں کی بولیوں کو اپنی زبان نہیں بنایا بلکہ اپنی علمی اور تحریری زبان وہی رکھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے چلی آ رہی تھی۔

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے آپ سب واقف ہیں کہ بیک وقت نازل نہیں ہوا جیسا کہ توریت کے متعلق یہودیوں کا بیان ہے کہ اسے خدا نے تختیوں پر لکھ کر ایک ہی

Marfat.com

مرتبہ دے دیا۔ اس کے برخلاف قرآن مجید تیئس سال تک جستہ جستہ، (نجماً نجماً) نازل ہوتا رہا اور یہ ان مختلف زمانوں میں نازل شدہ اجزاء کا مجموعہ ہے جو قرآن مجید کی صورت میں ہمارے پاس ہے۔ اس کا آغاز دسمبر سنہ میں ہوا جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں معتکف تھے۔ وہاں حضرت جبرئیل علیہ السلام آتے ہیں اور آپ تک خدا کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ وہ پیغام بہت ہی اثر انگیز ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک امی ہیں۔ ''اِقرأ'' یعنی پڑھ اور پھر قلم کی تعریف کی گئی ہے۔ پڑھنے کا حکم دے کر پھر قلم کی تعریف کیوں کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ قلم ہی کے ذریعے سے خدا انسان کو وہ چیز بتاتا ہے جو وہ نہیں جانتا یا دوسرے الفاظ میں قلم ہی وہ چیز ہے جو انسانی تمدن اور انسانی تہذیب کی حفاظت گاہ (Depository) ہے۔ اس کا وجود اس لیے ہے کہ پرانی چیزوں کو محفوظ رکھا جا سکے۔ آنے والے اس میں نئی چیزوں کا اضافہ کرتے ہیں۔ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کا راز یہی ہے اور اس وجہ سے انسان کو دیگر حیوانات پر تفوق حاصل ہے۔ ورنہ آپ غور کریں کہ کوا آج سے بیس لاکھ سال پہلے جس طرح گھونسلا بناتا تھا آج بھی اسی طرح بناتا ہے۔ اس نے کوئی ترقی نہیں کی۔ لیکن انسان وہ جانور ہے جو چاند تک پہنچ چکا ہے۔ اس نے اتنی ترقی کی کہ آج وہ ساری کائنات پر حکومت کر رہا ہے۔ یہ ساری ترقیاں انسان نے اس لیے کی ہیں کہ اس کو اپنے سے پہلے کے لوگوں کے تجربات کا جو علم حاصل ہوا اس کو محفوظ رکھا اور ان میں اس نے اپنے ذاتی تجربوں سے روز افزوں اضافہ کیا اور اس سے استفادہ کرتا رہا اور یہ سب قلم کی بدولت ممکن ہوا آیت، علم بالقلم، علم الانسان مالم یعلم (-) میں اس حقیقت کی طرف قرآن مجید نے بہت ہی بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے۔ جب ''سورہ اقراء'' (یعنی سورہ العلق) کی پہلی پانچ آیات نازل ہوئیں تو رسول کریم غار کو چھوڑ کر گھر واپس آئے اور اپنی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بتایا کہ مجھے آج یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ وہ شاید کسی دن مجھے نقصان نہ پہنچائے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے تسلی دی اور کہا کہ خدا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ضائع نہیں کرے گا۔ ورقہ بن نوفل میرا چچازاد بھائی ہے جو ان معاملات (یعنی فرشتے، وحی وغیرہ) سے واقف ہے۔

Marfat.com

کل صبح جا کر ہم اس سے گفتگو کریں گے۔ وہ آپ کو بتائے گا۔ میں ان چیزوں سے واقف نہیں ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ شیطان کبھی آپ کو دھوکا نہیں دے سکے گا۔ ایک روایت کے مطابق صبح کو وہ اپنے ساتھ ورقہ بن نوفل کے پاس لے جاتی ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے ان کے عزیز دوست ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان کو یہ قصہ سنایا اور کہا کہ انہیں اپنے ساتھ لے جا کر ورقہ سے ملاؤ۔ ورقہ بن نوفل بہت بوڑھے تھے۔ ان کی بصارت زائل ہو چکی تھی، مذہباً نصرانی تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس پہنچے اور یہ قصہ سنایا تو ورقہ نے بے ساختہ یہ الفاظ کہے''اے محمد صلی اللہ علیک وسلم جو چیزیں تم نے ابھی بیان کی ہیں اگر صحیح ہیں تو یہ ناموس موسیٰ علیہ السلام سے مشابہ ہیں''ناموس'' کا لفظ اردو میں عام طور پر عزت کے لیے مستعمل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں یہ مفہوم نہیں ہو سکتا۔ بعض لکھتے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ناموس کا نام دیا جاتا ہے۔ اسلامی ادبیات میں وہ ''روح الامین'' ہیں مگر یہ معنی بھی یہاں کام نہیں دیتے۔ میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ ''ناموس'' اصل میں ایک اجنبی لفظ ہے، جو معرب ہو کر عربی زبان میں مستعمل ہوا۔ یہ یونانی زبان کا لفظ''نوموس''(Nomos) ہے۔ یونانی زبان میں لفظ توریت کو نوموس یعنی قانون کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ورقہ بن نوفل کا بیان ہے کہ یہ چیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توریت سے مشابہ ہے اور یہی معنی زبان قرین قیاس نظر آتے ہیں۔

قرآن مجید کی تبلیغ و اشاعت کے متعلق قدیم ترین ذکر ابن اسحٰق کی کتاب المغازی میں ملتا ہے اور حکومت مراکش نے اس کو شائع بھی کیا ہے۔ اس میں ڈیڑھ سطر کی ایک بہت دلچسپ روایت ہے جسے ابن ہشام نے اپنی سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں معلوم نہیں کس بنا پر یا سہواً چھوڑ دیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید کی کوئی عبارت نازل ہوتی تو آپ سب سے پہلے اسے مردوں کی جماعت میں تلاوت فرماتے پھر اس کے بعد عبارت کو عورتوں کی خصوصی محفل میں بھی سناتے۔ اسلامی تاریخ میں یہ ایک اہم واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتوں کی تعلیم سے بھی اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی مردوں کی تعلیم سے۔ یہ قدیم ترین اشارہ

ہے جو قرآن مجید کی تبلیغ کے متعلق ملتا ہے۔ اس کے بعد کیا پیش آیا، یہ کہنا مشکل ہے لیکن بالکل ابتدائی زمانے ہی سے ہمیں ایک نئی چیز کا پتا چلتا ہے وہ یہ کہ قرآن مجید کو لکھوایا جائے اور غالباً حفظ کرانا بھی اسی ابتدائی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ جب حضرت جبرائیل علیہ السلام نے پہلی وحی کے موقع پر قرآن مجید کی سورہ اقراء کی پہلی پانچ آیتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچائیں تو ایک حدیث کے مطابق حضرت جبرائیل علیہ السلام نے دو کام اور کیے۔ ایک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو استنجاء اور وضو کرنا سکھایا کہ نماز کے لیے کس طرح اپنے آپ کو جسمانی طور پر پاک کریں۔ دوسرے یہ کہ نماز کا طریقہ بھی بتایا۔ خود جبرائیل علیہ السلام امام بنے اور پیغمبر مقتدی کی حیثیت سے پیچھے کھڑے دیکھتے رہے کہ پہلے کھڑے ہوں، پھر رکوع میں جائیں، پھر سجدہ کریں وغیرہ اور ساتھ ساتھ خود بھی وہی کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ نماز میں قرآن مجید کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں۔ لہٰذا ابتدائی زمانے ہی سے جب لوگ مسلمان ہونے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا ہوگا کہ قرآن مجید کو حفظ بھی کرو اور روزانہ جتنی نمازیں پڑھتی ہیں، ان نمازوں میں اس کا اعادہ بھی کرتے رہو۔ گویا اس وقت ہمیں دو باتیں نظر آتی ہیں۔ قرآن مجید حفظ کرنا اور اس کا لکھنا۔ آدمی کو کسی نئی چیز کے ازبر کرنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ اس کے سامنے کوئی تحریری عبارت ہو تو اسی کو بار بار پڑھتا ہے بالآخر وہ حفظ ہو جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں قرآن حفظ کرنا اور لکھنا دونوں ایک ہی زمانے کی چیزیں ہیں۔ ہمارے مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو وہ اپنے صحابہ میں سے کسی ایک شخص کو جسے لکھنا پڑھنا آتا ہوتا یاد فرماتے اور اس کو املا کراتے تھے۔ اہم بات یہ بیان ہوئی کہ لکھنے کے بعد اس سے کہتے کہ ''جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر سناؤ'' تاکہ اگر کاتب نے کوئی غلطی کی ہو تو اس کی اصلاح کرا سکیں۔ یہ قرآن مجید کی تدوین کا آغاز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ لکھوانے کے بعد اپنے صحابہ کو حکم دیتے کہ اسے ازبر کر لو اور روزانہ دو وقت نمازوں میں پڑھو۔ اس وقت دو نمازیں تھیں۔ معراج کے بعد پانچ نمازیں ہوئیں تو دو کے بجائے پانچ مرتبہ اس کو لوگ نماز میں دہرانے لگے۔ اس کا ایک

Marfat.com

عملی فائدہ یہ ہے کہ اگر آدمی کا حافظہ اچھا نہ ہو اور سال بھر میں مثلاً صرف عید الاضحیٰ اور عید الفطر کے دن قرآن مجید کو حافظے کی مدد سے پڑھے تو ممکن ہے کہ اس کو بھول جائے لیکن اگر کوئی آدمی روزانہ پانچ مرتبہ دہراتا رہے تو ظاہر ہے کہ قرآن مجید اس کے حافظے میں رہے گا اور وہ اسے نہیں بھولے گا۔

الغرض قرآن مجید کو لکھنے اور اسے حفظ کرنے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ اس سے پہلے کے انبیاء علیہم السلام کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ اس سے بڑھ کر ایک اور کام بھی ہوا۔ وہ یہ کہ فرض کیجیے میرے پاس ایک تحریری نسخہ موجود ہے جس میں کسی نہ کسی وجہ سے کتابت کی کچھ غلطیاں موجود ہیں۔ اس غلط نسخے کو میں حفظ کر لیتا ہوں۔ اس طرح میرا حفظ بھی غلط ہوگا۔ اس کی اصلاح کس طرح کی جائے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف بھی توجہ فرمائی اور حکم دیا کہ ہر مسلمان کو کسی مستند استاد سے قرآن مجید پڑھنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے بڑھ کر قرآن مجید سے کون واقف ہو سکتا ہے؟ اس لیے ہر مسلمان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سیکھنا اور پڑھنا چاہیے۔ اگر اس کے پاس تحریری نسخہ موجود ہے تو اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تلاوت کرنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر فرمائیں کہ ہاں یہ نسخہ ٹھیک ہے تب اسے حفظ کیا جائے۔ جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تو ظاہر ہے کہ ایک آدمی سارے لوگوں کو تعلیم و تربیت نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند ایسے صحابہ کو، جن کی قرآن دانی کے متعلق آپ کو پورا اعتماد تھا، یہ حکم دیا کہ اب تم بھی پڑھایا کرو۔ یہ وہ مستند استاد تھے جن کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سند دیتے تھے کہ تم پڑھانے کے قابل ہو اور اس کا سلسلہ آج بھی دنیا میں قائم ہے۔ اگر کوئی شخص کسی استاد سے قرآن مجید پڑھتا ہے تو قرات کی تکمیل کے بعد استاد کی طرف سے اسے جو سند ملتی ہے، اس میں وہ استاد لکھتا ہے کہ "میں نے اپنے شاگرد فلاں کو قرآن مجید کے الفاظ، قرآن مجید کی قراءت کے اصولوں کو ملحوظ رکھ کر یہ تعلیم دی ہے۔ یہ بالکل وہی ہے جو میرے استاد نے مجھ تک پہنچائی تھی اور اس نے مجھے اطمینان دلایا تھا کہ اس کو اس کے اپنے استاد نے اسی طرح

پڑھایا تھا''۔ اس کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔

اسلامی روایات (Traditions) کے سوا دنیا کی کسی قوم نے اپنی مذہبی کتاب کو محفوظ کرنے کے لیے یہ اصول کبھی اختیار نہیں کیے تھے۔ یہ چیزیں قرآن مجید کی تدوین کے سلسلے میں عہد نبوی میں ہی پیش آئیں مگر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ ایک اور چیز کی بھی شروع ہی سے ضرورت تھی۔ قبل اس کے کہ میں اس کا ذکر کروں، قرآن مجید کے تحریری نسخوں کے متعلق بھی کچھ آپ کو بتاتا چلوں کہ ان کا کب سے پتا چلتا ہے۔ غالباً نبوت کے پانچویں سال کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلام قبول کیا۔ ان کے واقعہ سے آپ واقف ہوں گے۔ وہ اس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت جانی دشمن تھے۔ ایک دن یہ طے کر کے گھر سے نکلے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) قتل کر ڈالوں۔ راستے میں انہیں ان کا ایک رشتہ دار ملا جس نے اسلام تو قبول کر لیا تھا لیکن اسے چھپا رکھا تھا۔ اُس نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ ہتھیار سے لیس ہو کر کہاں جا رہے ہو؟ چونکہ وہ رشتہ دار تھا اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بتا دیا کہ محمد کو (نعوذ باللہ) قتل کرنے جا رہا ہوں کہ اس نے ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ اس رشتے دار نے کہا کہ اے عمر، اپنے قبیلے کو بنی ہاشم کے قبیلے سے جنگ میں الجھانے سے پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ تمہاری بہن فاطمہ بھی مسلمان ہو چکی ہے۔ اس کا شوہر بھی مسلمان ہو چکا ہے۔ پہلے اپنے گھر کی خبر لو بعد میں دنیا کی اصلاح کرنا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حیران ہوئے اور سیدھے بہن کے گھر پہنچے۔ دروازے کے پاس انہوں نے اندر سے کچھ آواز سنی، جیسے کوئی شخص گا رہا ہے یا خوش الحانی سے کچھ پڑھ رہا ہے۔ انہوں نے بہت زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ گھر سے ایک شخص نکلا اور یہ اندر پہنچے۔ وہاں بہن اور بہنوئی سے جو سخت کلامی ہوئی اس سے آپ لوگ واقف ہیں۔ میں مختصراً ذکر کر رہا ہوں کہ بالآخر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بہن کو اس پر آمادہ کر لیا کہ جو چیز وہ پڑھ رہی تھیں وہ ان کو دکھائیں۔ انہوں نے غسل کرانے کے بعد آپ کو وہ چیز پیش کی۔ یہ قرآن مجید کی چند سورتیں تھیں۔ ان کو پڑھ کر حضرت عمر رضی

Marfat.com

اللہ تعالیٰ عنہ متاثر ہوئے اور مسلمان ہو گئے۔ اس واقعے سے میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن مجید کم از کم چند سورتوں کی تحریری صورت میں پائے جانے کا ذکر ۵ نبوی ہی سے یعنی قبل ہجرت سے ملتا ہے۔ اس کے بعد جس تحریری نسخے کا پتا چلتا ہے اس کا ذکر بھی دلچسپ ہے۔ یہ غالباً بیعت عقبہ ثانیہ کا واقعہ ہے۔ مدینے سے کچھ لوگ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، ان میں سے بنی زریق کے ایک شخص کے بارے میں مؤرخین نے صراحت سے لکھا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی اس وقت تک نازل شدہ سورتوں کا مکمل مجموعہ ان کے سپرد کیا۔ یہ صحابی مدینہ منورہ پہنچ کر اپنے قبیلے میں، اپنے محلے کی مسجد میں اسے روزانہ با آواز بلند پڑھا کرتے تھے۔ گویا قرآن مجید مدون ہونے یا تحریری صورت میں پائے جانے کا یہ دوسرا واقعہ ہے جس کا مؤرخوں نے صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

میں یہ بیان کر رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے قرآن کو کسی مستند استاد سے پڑھنا پہلی خصوصیت تھی۔ دوسری خصوصیت تحریری صورت میں محفوظ رکھنا، تاکہ اگر کہیں بھول جائے تو تحریر دیکھ کر اپنے حافظے کو تازہ کر لیا جائے اور تیسری خصوصیت اسے حفظ کرنا تھا۔ ان تین باتوں کا حکم دیا گیا تھا۔ لیکن اس میں ایک پیچیدگی اس طرح پیدا ہو گئی تھی کہ قرآن مجید کامل حالت میں بہ یک وقت نازل نہیں ہوا تھا بلکہ جستہ جستہ ۱۳ سال کے عرصے میں نازل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو میکانکی طور پر مدون نہیں کیا کہ پہلی آیت شروع میں ہو اور بعد میں نازل شدہ دوسرے نمبر پر رہے بلکہ اس کی تدوین الہام اور حکمت نبوی کے تحت ایک اور طرح سے کی گئی۔ قرآن مجید کی اولین نازل شدہ آیتیں، جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے عرض کیا، سورہ اقراء کی ابتدائی پانچ آیتیں ہیں۔ آیتیں سورہ نمبر ۹۶ میں ہیں جب کہ قرآن مجید کی کل سورتیں ۱۱۴ ہیں۔ ان میں نمبر ۹۶ ابتدائی سورہ ہے۔ قرآن مجید میں اب جو بالکل ابتدائی سورتیں ملتی ہیں، مثلاً سورہ بقرہ وغیرہ وہ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں۔ دوسرے الفاظ میں قرآن مجید زمانی ترتیب کے لحاظ سے مدون نہیں ہوا بلکہ ایک دوسری صورت میں مرتب ہوا۔ اس کی وجہ سے لوگوں کو دشواریاں پیش آ سکتی تھیں۔ یعنی آج

Marfat.com

ایک سورہ نازل ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ اس کو فلاں آیت سے قبل لکھو یا فلاں آیت کے بعد لکھو یا فلاں سورہ میں لکھو۔ اس لیے ضرورت تھی کہ وقتاً فوقتاً نظر ثانی ہوتی رہے۔ لوگوں کے ذاتی نسخوں کی اصلاح اور نظر ثانی کا ذکر ہجرت کے بعد سے ملتا ہے۔ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان شریف کے مہینے میں دن کے وقت قرآن مجید کو، جتنا اس سال تک نازل ہوا تھا، با آواز بلند دہرایا کرتے تھے اور ایسے صحابہ جن کو لکھنا پڑھنا آتا تھا، وہ اپنا ذاتی نسخہ ساتھ لاتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت پر اس کا مقابلہ کرتے جاتے، تاکہ اگر ان سے کسی لفظ کے لکھنے میں یا سورتوں کو صحیح مقام پر درج کرنے میں کوئی غلطی ہوئی ہے تو وہ اس کی اصلاح کر لیں یہ چیز ''عرضہ'' یا پیشکش کہلاتی تھی۔ مؤرخین مثلاً امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ آخری سال، وفات سے چند ماہ پہلے جب رمضان کا مہینہ آیا تو آپ نے پورے کا پورا قرآن مجید لوگوں کو دو مرتبہ سنایا اور یہ بھی کہا میں سمجھتا ہوں کہ میری وفات قریب آ گئی ہے کیونکہ قرآن حکیم کے متعلق جبرائیل علیہ السلام نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں دو مرتبہ پڑھ کر سناؤں تاکہ اگر کسی سے غلطیاں ہوئی ہوں تو وہ باقی نہ رہیں۔ یہ تھی تدبیر جو آخری نبی نے آخری پیغام ربانی کی حفاظت کے لیے اختیار فرمائی۔ اس طرح قرآن مجید کے ہم تک قابل اعتماد حالت میں پہنچنے کا اہتمام ہوا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو شروع میں قرآن کی طرف کسی کی توجہ مبذول نہ ہوئی۔ لوگوں کے پاس جو کچھ موجود تھا اس کو نماز میں پڑھا کرتے تھے اور اس کا احترام کرتے تھے لیکن پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے نہ صرف اسلامی حکومت بلکہ تمام مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ قرآن مجید کی طرف فوری توجہ دیں۔ اس زمانے میں قرآن مجید کا کوئی سرکاری نسخہ موجود نہیں تھا اور غالباً کسی ایک شخص کے پاس بھی کامل قرآن مجید لکھا ہوا موجود نہیں تھا۔ یہ واقعہ حضور اکرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ملک کے چند لوگ مرتد ہو گئے اور مسیلمہ کذاب نے نہ صرف ارتداد کیا بلکہ نئے نبی ہونے کا اعلان بھی کر دیا۔ وہ چونکہ ایک طاقتور قبیلے کا سردار تھا، اس لیے بہت سے لوگ اس کے حامی بھی ہو گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی

Marfat.com

اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے جنگ کی۔ یہ جنگ بہت شدید تھی اور جنگ بھی دشمن کے علاقے میں، یمامہ کے مقام پر ہوئی۔ میں جب وہاں گیا تھا تو وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ یہ جنگ موجودہ شہر ریاض کے مضافات میں ہوئی تھی۔ اس جنگ میں بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ ان شہید ہونے والوں میں چند لوگ ایسے بھی تھے جو قرآن مجید کے بہترین حافظ سمجھے جاتے تھے۔ مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ مدینے کے مسلمانوں کو فتح پر خوشی ہوئی لیکن یہ اطلاع پا کر کہ بہت سے برگزیدہ اور بہترین حافظ قرآن مسلمان اس جنگ میں شہید ہو گئے ہیں رنج ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر قرآن مجید کے تحفظ پر حکومت نے توجہ نہ کی اور حافظ قرآن رفتہ رفتہ آئندہ جنگوں میں شہید ہوتے رہے یا طبعی موت سے اس دنیا سے رخصت ہوتے رہے تو پھر قرآن مجید کے لیے بھی وہی دشواری پیش آئے گی جو پرانے انبیاء علیہم السلام کی کتابوں کے سلسلے میں پیش آئی تھی۔ اس لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ اے امیر المومنین قرآن کے تحفظ پر توجہ فرمایئے۔ یمامہ کی جنگ میں چھ ہزار مسلمان شہید ہو چکے ہیں جن میں بہت سے حافظ قرآن بھی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس تجویز پر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جواب، ان کی سیرت کے ایک خاص پہلو کا مظہر ہے۔ وہ فدائے رسول تھے اور فدائے رسول کا جواب ایسا ہی ہونا چاہیے۔ انہوں نے جواب دیا کہ اے عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ میں کیسے کروں؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بحث کرتے ہیں۔ بالآخر دونوں اس بات پر رضامند ہوے کہ کسی تیسرے شخص کو حکم بنائیں اور وہ جو فیصلہ کر دے اس پر عمل کریں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا حکم بنایا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک کاتب وحی تھے حضرت زید کا فوری جواب بھی وہی تھا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تھا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کریں؟ دوبارہ بحث ہوئی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے کہا اے زید! اگر لکھیں تو اس میں حرج کیا ہے۔ روایت میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ یہ ہیں کہ واقعی حرج تو مجھے بھی نظر نہیں آتا یہ ایک جذباتی رویہ تھا کہ

Marfat.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا تو ہم کیسے کریں لیکن اگر کریں تو اس سے کوئی مانع نظر نہیں آتا۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے حکم دیا کہ یہ کام میں سرانجام دوں تو مجھے یہ اتنا مشکل معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی تدوین کے مقابلے میں اگر مجھے جبل احد کے سر پر اٹھانے کا حکم دیا جاتا تو وہ میرے لیے آسان ہوتا۔

قرآن مجید کی تدوین کے سلسلے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے احکام قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے شہر مدینہ میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ جس شخص کے پاس قرآن مجید کا کوئی حصہ تحریری صورت میں موجود ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ''عرضہ'' کے موقع پر جو تلاوت تھی، اس میں موجود ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھا ہوا نسخہ موجود ہے تو وہ لاکر اس کمیشن کے سامنے پیش کرے۔ کمیشن کے صدر حضرت زید بن ثابت تھے لیکن کئی اور مددگار بھی تھے جن میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شامل تھے۔ اس کمیشن کو حکم دیا گیا تھا کہ قرآن مجید کے جو نسخے پیش کیے جائیں، قابل اعتماد ہوں، عرضہ میں پیش کیے ہوئے نسخے ہوں۔ اگر کوئی آیت کم سے کم دو تحریری نسخوں میں موجود ہو تو اسے لکھا جائے ورنہ رد کر دی جائے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں اس طرح قرآن مجید کی تدوین ہوئی اور اس کو ایک کاتب وحی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگرانی میں انجام دیا گیا۔ یہ بات بھی نہ بھلائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت کم از کم بیس پچیس حافظ موجود تھے، جن میں سے کچھ انصار تھے اور کچھ مہاجرین جنہیں سارا قرآن مجید زبانی یاد تھا۔ ان میں ایک خاتون حافظ حضرت ام ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی تھیں خود اس کمیشن کے صدر، زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی حافظ تھے، اس لیے انہوں نے جو کچھ لکھا، اس یقین کے ساتھ لکھا کہ یہ ان کے ذہن میں بھی اسی طرح موجود ہے۔ یہاں ایک اور چھوٹی سی بات کا ذکر کرتا ہوں جب لوگ نسخہ لاکر پیش کرتے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہیں حکم دیتے تھے کہ قسم کھا کر بتاؤ کہ یہ نسخہ جو تم پیش کر رہے ہو، وہی ہے جس کی تصحیح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوئی ہے۔ وہ قسم کھا کر یقین دلاتے تو پھر اس سے استفادہ کیا جاتا۔ جب پورا قرآن لکھا جا چکا تو

حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اسے شروع سے آخر تک پڑھا، اس میں مجھے ایک آیت نظر آئی یہ آیت میرے حافظے میں موجود تھی مگر کسی تحریری نسخے میں موجود نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے شہر کے چکر لگائے ہر گھر میں داخل ہوا۔ اولاً مہاجرین کے گھر میں، کسی کے پاس تحریری صورت میں موجود نہیں تھی۔ پھر انصار کے گھروں کو گیا۔ بالآخر ایک شخص کے پاس ایک تحریری نسخہ ملا۔ وہ نسخہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھا ہوا تھا لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہدایت تھی کہ جب تک دو تحریری نسخے نہ ملیں اس وقت تک اس کو قرآن کے طور پر قبول نہ کیا جائے جبکہ یہ آیت ایک تحریری نسخہ میں ملی تھی۔ لیکن یہاں مشیت خداوندی اپنا اثر دکھاتی ہے اتفاق سے یہ وہ شخص تھا جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اس کے کسی کام سے خوش ہو کر کہا تھا کہ آج سے تمہاری شہادت دو شہادتوں کے مساوی سمجھی جائے گی۔ غرض یہ کہ قدرت کی طرف سے پیشگی انتظام تھا۔ اس طرح اس آیت کو انہوں نے صرف ایک شخص سے لے کر نقل کیا۔ ان کا بیان ہے کہ اس کے بعد میں نے قرآن کو دوبارہ پڑھا تو ایک اور آیت کی بھی کمی نظر آئی۔ ممکن ہے کہ وہ ایک ہی واقعہ ہو اور آیت کے متعلق راویوں میں اختلاف ہو، بہر حال وہاں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ اس نام والے ایک شخص نے وہ چیز بیان کی۔ یہ آیتیں، جن کا ہمارے پاس صراحت سے ذکر موجود ہے، کہ کون سی آیتیں تھیں، فرض کیجیے کہ اگر آج ہم ان کو قرآن سے خارج بھی کر دیں تو کوئی اہم چیز خارج نہیں ہوتی۔ قرآن مجید کی جن آیتوں کی طرف یہ اشارہ ہے ان کا مفہوم قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں بھی موجود ہے۔ لیکن بہر حال جس احتیاط سے قرآن مجید کی تدوین عمل میں آئی اس کا مقابلہ تاریخ عالم کی دینی کتابوں میں کوئی کتاب بھی نہیں کر سکتی۔

ایک اور نکتہ بیان کرنا خالی از فائدہ نہ ہوگا اور اسی پر یہ تقریر ختم کرتا ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے کا ذکر ہے، جرمنی کے عیسائی پادریوں نے یہ سوچا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں آرامی زبان میں جو انجیل تھی وہ تو اب دنیا میں موجود نہیں۔ اس وقت قدیم ترین انجیل یونانی زبان میں ہے اور یونانی سے ہی ساری زبانوں میں اس کے

ترجمے ہوئے ہیں۔ لہٰذا یونانی مخطوطوں کو جمع کیا جائے اور ان کا آپس میں مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ یونانی زبان میں انجیل کے نسخے جتنے دنیا میں پائے جاتے تھے کامل ہوں کہ جزئی ان سب کو جمع کیا گیا اور ان کے ایک ایک لفظ کا باہم مقابلہ (Collation) کیا گیا اس کی جو رپورٹ شائع ہوئی اس کے لفظ یہ ہیں ''کوئی دو لاکھ اختلافی روایات ملتی ہیں'' اس کے بعد یہ جملہ ملتا ہے ان میں سے 1/8 اہم ہیں۔ یہ ہے انجیل کا قصہ۔ غالباً اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد کچھ لوگوں کو قرآن کے متعلق حسد پیدا ہوا۔ جرمنی ہی میں میونک یونیورسٹی میں ایک ادارہ قائم کیا گیا ''قرآن مجید کی تحقیقات کا ادارہ''۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ساری دنیا سے قرآن مجید کے قدیم ترین دستیاب نسخے خرید کر، فوٹو لے کر، جس طرح بھی ممکن ہو جمع کیے جائیں۔ جمع کرنے کا یہ سلسلہ تین نسلوں تک جاری رہا۔ جب میں 1933ء میں پیرس یونیورسٹی میں تھا تو اس کا تیسرا ڈائریکٹر پرتسل Pretzl پیرس آیا تاکہ پیرس کی پبلک لائبریری میں قرآن مجید کے جو قدیم نسخے پائے جاتے ہین ان کے فوٹو حاصل کرے۔ پروفیسر نے مجھ سے شخصاً بیان کیا کہ اس وقت (یہ 1933ء کی بات ہے) ہمارے انسٹی ٹیوٹ میں قرآن کے بیالیس ہزار (42000) نسخوں کے فوٹو موجود ہیں اور مقابلے (Collation) کا کام جاری ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں اس ادارے کی عمارت پر ایک امریکی بم گرا اور عمارت، اس کا کتب خانہ اور عملہ سب کچھ برباد ہو گیا۔ لیکن جنگ کے شروع ہونے سے کچھ ہی پہلے ایک عارضی رپورٹ شائع ہوئی تھی۔ اس رپورٹ کے الفاظ یہ ہیں کہ قرآن مجید کے نسخوں میں مقابلہ کا کام ہم نے شروع کیا تھا، وہ ابھی مکمل نہیں ہوا لیکن اب تک جو نتیجہ نکلا ہے وہ یہ ہے کہ ان نسخوں میں کہیں کتابت کی غلطیاں تو ملتی ہیں لیکن اختلافات روایت ایک بھی نہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ کتابت کی جو غلطی ایک نسخے میں ہو گی وہ کسی دوسرے نسخوں میں نہیں ہو گی۔ مثلاً فرض کیجیے بسم اللہ الرحیم میں الرحمٰن کا لفظ نہیں۔ لیکن یہ صرف ایک نسخے میں ہے باقی کسی نسخے میں ایسا نہیں ہے۔ سب میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' ہے باقی نسخوں میں نہیں ہے، تو اسے کاتب کی غلطی قرار دیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسی چیزیں کہیں کہیں سہو قلم یعنی کاتب کی غلطی سے ملتی ہیں۔ لیکن اختلاف روایت یعنی ایک ہی فرق کئی نسخوں

میں ہو، ایسا کہیں نہیں ہے۔ یہ ہے قرآن مجید کی تاریخ کا خلاصہ، جس سے ہمیں واضح ہوتا ہے کہ

قرآن مجید میں خدا کا جو فرمان ہے "انا نحن نزلنا الذکرو انالہ لحافظون" (ہم ہی اسے نازل کرتے ہیں اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے)۔ یہ تمام واقعات جو میں نے آپ سے بیان کیے، اس آیت کی حرف بہ حرف تصدیق کرتے ہیں۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

(عزمِ نو۔ قرآن پاک نمبر۔ گورنمنٹ ڈگری کالج شکرگڑھ)

قرآنی تصورِ مملکت

لائق مضمون نگار جامعۂ عثمانیہ میں قانون بین الممالک کے استاذ ہیں اور دنیا کی مختلف قوموں کے تصور مملکت اور دستورِ حکومت پر ان کی نگاہ ہے۔ اس مضمون میں اسی نقطۂ نظر سے اسلامی تصور مملکت کو انہوں نے پیش کیا ہے، موجودہ زمانہ میں اسلامی تعلیمات اور اس کے نظام کو جدید طرز میں اس طرح پیش کرنا جو دوسری قوموں اور جدید طبقہ کے لیے بھی قابلِ توجہ ہو، ایک مفید خدمت ہے۔ یہ مضمون چونکہ اسی نقطۂ نظر سے اور ایک خاص طبقہ کو پیش نظر رکھ کر انگریزی میں لکھا گیا تھا، اس لیے زبان اور طریقہ تعبیر میں اس کے ذوق کا لحاظ رکھا گیا تھا، جس کی کچھ جھلک اس اردو مضمون میں بھی موجود ہے۔

جزیرہ نمائے عرب اسلام سے پہلے کبھی ایک اقتدار کے تحت متحد نہیں ہو سکا تھا اور یہ ایک انوکھا اور عجیب و غریب واقعہ تھا کہ پورے ملک نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو متحدہ طور سے اپنا روحانی اور سیاسی سردار تسلیم کر لیا۔ جس ملک میں نزاج کا دور دورہ ہو وہاں تئیس سال کی کوشش میں ایک مرکزیت اور نظام قائم کر دینا رسول اکرم صلی اللہ علیہ

Marfat.com

وسلم کا عظیم کارنامہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو آسمانی وحی کا تابع قرار دیتے تھے، جو وقتاً فوقتاً آتی تھی اور جس کا مجموعہ اب قرآن کے نام سے دنیا میں موجود و مشہور ہے۔ اگر کوئی شخص سیرۃ نبویہ کا قریب سے مطالعہ کرے، تو اسے ام المومنین حضرت عائشہؓ کے اس قول کی صحت کو باور کرنے میں ذرا بھی دشواری نہ ہوگی کہ قرآن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا آئینہ ہے۔ (کَانَ خلقه القرآن) اسی لیے یہ معلوم کرنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں مملکت کا تصور کیا ہے، بڑی آسانی کے ساتھ قرآن کو دیکھنے سے ممکن ہے۔

یہ چیز قابلِ ذکر ہے کہ قرآن مجید میں نہ صرف ازمنہ سابقہ کے پیغمبروں کے حالات بیان ہوئے ہیں، بلکہ ان کی سیرتوں کو جو قرآن میں ہیں اب بھی ماخذ تسلیم کیا گیا ہے، بجز اس کے کہ صراحت سے قرآن اُسے یا اس کے کسی جز کو منسوخ قرار دے، دوسرے الفاظ میں انبیائے سابقہ کی سنت مسلمانوں پر اب بھی واجب التعمیل ہے بجز اس کے کہ اس کے کسی معین جز کے نسخ کا کوئی حکم قرآن مجید میں یا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال میں صراحت سے ملتا ہو۔ ایک آیت ملاحظہ ہو:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ الخ

یہی وہ لوگ ہیں جنکو ہم نے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی، اگر کوئی لوگ اس کو نہ مانیں تو ہم یہ امانت ایسے لوگوں کے سپرد کریں گے، جو اس سے انکار نہ کریں، یہی وہ لوگ [1] ہیں، جن کی خدا نے ہدایت کی ہے، اس لیے تو ان کی رہنمائی کی پیروی کر۔

(قرآن ۶/ ۸۹ تا ۹۰ نیز دیکھیے ۴۲/ ۱۳)

امام بخاری اور ترمذی نے ایک حدیث روایت کی ہے کہ جب کبھی کسی معاملہ میں براہِ راست آسمانی وحی نہیں آتی، تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عام عربی

۱۔ اس سے اوپر کی آیتوں میں (۱۸) پیغمبروں کے نام لئے گئے ہیں، جن میں نوح علیہ السلام، اسمٰعیل، ہارون، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام شامل ہیں اور انہی کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔

معاملہ جات کے اہل کتاب کے طریقوں کی پیروی فرمایا کرتے تھے۔

یہ چیز سیاسی معاملات کی حد تک بھی اسی طرح صادق آسکتی ہے جس حد تک معاشی و معاشرتی معاملات میں۔

معاشرۂ انسانی کی تاریخ پر نظر ڈالیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ مملکت کا قیام بڑے عرصہ کے بعد ہو سکا۔ قرآن مجید میں واقعات کی جو ترتیب ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہوئے جن کو خدا نے زمین پر نائب یا خلیفہ مقرر کیا۔ وہ نسل انسانی کے باپ تھے اور بزرگ خاندان ہونے میں ان کا کوئی حریف نہیں ہو سکتا تھا، ان کی وفات کے بعد کئی نسلوں تک انکی اولاد میں مختلف قسم کے اختلافات اور برائیاں کم یا زیادہ مقدار میں ساری رہیں، اسی لیے قرآن مجید کے مطابق پیغمبر بھیجے گئے، جو خدا اور عام انسانوں کے مابین واسطے کا کام دیتے تھے اور انسانوں کو یہ بتاتے تھے کہ ان کے خالق کی مشیت اور اسکا حکم کیا ہے اور نیکی کی ترغیب دیتے اور برائی سے روکتے تھے۔ ان پیغمبروں نے خلوص کے ساتھ جو بے غرضانہ نصیحتیں کیں اور ان کی باتوں کو کچھ لوگوں نے مانا بھی تو اس جماعت کی حیثیت کسی مملکت کی قرار دینی مشکل ہے۔ بظاہر قدیم ترین زمانہ میں انبیاء علیہم السلام کی آمد کے باوجود سیاسی نظام اور اقتدار کی ضرورت نہیں پائی جاتی تھی۔ قرآن مجید میں بھی بارہا ذکر ہے کہ ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کو سرفرازی عطا ہوئی، مگر ایک مملکت کو دوسری مملکت کی جگہ قائم کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ان قومی وحدتوں کے غیر سیاسی وجود کے باوجود ان لوگوں کی معاشی اور سماجی سرگرمیوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، لیکن ان چیزوں کا ذکر صرف اس طور سے ہوا ہے کہ لوگ ان کو خدا کی نعمتیں سمجھ کر یاد رکھیں اور خدا کی اطاعت کا فریضہ بجا لائیں۔

بادشاہی کے ذکر کا آغاز قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے ملنے لگتا ہے، جب کہ ایک شخص اپنے ملک کے تمام لوگوں کی جان و مال پر اپنا اقتدار چلاتا ہوا نظر آتا ہے (دیکھیے قرآن مجید ۲/ ۲۵۸ نمرود کا قصہ)۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ سے ادارۂ مملکت میں زیادہ استحکام و ترقی نظر آتی ہے، چنانچہ ان کے

Marfat.com

زمانہ کے حالات میں (دیکھئے قرآن مجید ۱۲/۳۰) بادشاہوں اور وزیروں اور سرکاری قید خانوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ (سورۂ یوسف)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جو حالات قرآن مجید میں ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے ان مقدس رہنما کی تمنا اور کوشش یہ تھی کہ ارضِ موعود میں ایک مملکت قائم کریں، مگر قوم نے نااہلی کے مظاہرے (عدم اطاعتِ احکام الٰہی) سے مایوسی کا سامان کر دیا، آخر ان کی قوم کو چالیس سال تک انتظار کرنے کی ضرورت پیش آئی، کہ ایک بالکل نئی نسل پیدا ہو، جس کی بچپن ہی سے ان کی نگرانی میں تعلیم و تربیت ہو اور پھر اس نئی نسل کی مدد سے وہ ارض موعود کو فتح کریں، گو اسی اثنا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وفات پائی اور ان کی چہل سالہ تربیتی اسکیم ان کے بعض فیض یافتوں نے مکمل کی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جو فرعونِ مصر تھا، وہ قرآنی تذکرے کے مطابق ایک خاصا باقاعدہ حکمران تھا، جس کا ایک وزیر تھا اور جس کے مشورے کے لیے معمرین اور اہل الرائے لوگوں کی ایک مجلس بھی پائی جاتی تھی، اس مجلس کے اجلاسوں کی جو روئداد قرآن مجید میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے اور عاجلانہ فیصلے نہیں کیا کرتی تھی، بلکہ اس کے مشورے مناسب اور قابلِ عمل ہی ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام سے ان کی جدت طرازیوں کے باعث کیا برتاؤ کرنا چاہیے؟ جب فرعون نے یہ سوال پیش کیا، تو مجلس شوریٰ نے نرمی اور اعتدال کا مشورہ دیا تھا، اس زمانہ میں عوام الناس تک ایک حد تک سیاسی شعور رکھتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ (قرآن مجید ۲۸/۱۹) جب ایک شخص نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی سخت گیری کے باعث ملامت کرنی چاہی تو اس نے یہ الفاظ کہے تھے کہ:

"ان ترید الا أن تکون جبارًا فی الارض الخ
تُو تو زمین میں ایک جبار بن جانا چاہتا ہے اور صلاح و فلاح کا کام کرنے والوں میں سے نہیں ہونا چاہتا۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں مجلس دوگانہ یا مرکب بادشاہت کا زمانہ

Marfat.com

نظر آتا ہے[1]

طالوت یعنی بادشاہ ساول کا قصہ قرآن مجید میں ایک خصوصی دلچسپی کا حامل ہے۔ بنی اسرائیل کو ان کے دشمن نے شکست دیکر ان کے گھروں سے جلاوطن کر دیا تھا۔ انتقام کی خواہش نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ اپنے پیغمبر سے یہ خواہش کریں کہ ان پر ایک بادشاہ نامزد کیا جائے جو اُن کو ساتھ لیکر دشمنوں سے لڑ سکے۔

اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّھُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِکًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الخ

یاد کرو جب موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا کہ ہم پر ایک بادشاہ کو مامور کرتا کہ ہم اللہ کی راہ میں لڑ سکیں، اُس (نبی) نے کہا اگر تم لڑنا فرض ہونے کے بعد لڑنے سے انکار کرو تو؟ انہوں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے، کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں جب کہ ہمیں ہمارے گھروں اور ہمارے بچوں سے نکال باہر کر دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود جب لڑنا ان پر فرض کیا گیا تو انہوں نے روگردانی کی، بجز چند لوگوں کے، اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ان کے پیغمبر نے ان سے کہا: دیکھو اللہ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے، انہوں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارا بادشاہ بنے؟ ہم اس سے زیادہ بادشاہت کے مستحق ہیں کیونکہ وہ مالدار نہیں ہے۔ اس (نبی) نے کہا اللہ نے اسی کو تم پر فوقیت دی ہے اور علم اور جسم میں اس کو وافر حصہ دیا ہے۔ اللہ اپنا ملک جس کو چاہتا ہے، دیتا ہے، اللہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے اور ہر چیز کو جانتا ہے۔" (قرآن مجید ۲/ ۲۴۶ تا ۲۴۷)

علاوہ اور اہمیتوں کے اس اقتباس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مال و دولت یا حسب و

---

[1] قرآن مجید ۲۰/ ۳۲ چنانچہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی کے متعلق خدا سے دعا کی تھی کہ وَاَشْرِکْہُ فِیْ اَمْرِیْ (اس کو میرے کام میں شریک بنا)۔

Marfat.com

نسب نہیں بلکہ علم و جسم یعنی سیاست دانی [1] اور بہادری بادشاہت کی اولین ضرورتیں ہیں۔ اس اقتباس سے یہ اہم چیز بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں یہودیوں نے مذہب اور سیاست کو الگ چیزیں ہونا تسلیم کر لیا تھا اور نبی کے علاوہ بادشاہ کی ضرورت سمجھی گئی تھی۔ بادشاہ فرائضِ نبوت بجا نہیں لا سکتا تھا اور نہ نبی فرائض بادشاہت، البتہ یہ چیز قابلِ ذکر ہے کہ طالوت یعنی بادشاہ ساؤل کے فوری جانشین حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام دونوں بادشاہت اور نبوت ہر دو حیثیتوں کے حامل بنے، ان کا کچھ تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

حضرت داؤد علیہ السلام کا قرآنی تذکرہ بے حد اہم ہے کیونکہ اس میں فرائضِ بادشاہت کا (جن میں عدل گستری سب سے اہم ہے) ذکر کیا گیا ہے:

(الف) وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ الخ

اور داؤد نے جالوت کو قتل کیا، پھر خدا نے اس کو بادشاہت اور حکمت عطا کی۔ (قرآن مجید ۲/۲۵۱)

(ب) وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ۝ الخ

ہم نے اسکی حکومت کو مضبوط بنا دیا اور اس کو حکمت اور فیصلہ کرنے والی زبان عطا کی۔ (قرآن مجید: ۳۸/۲۰)

(ج) يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ الخ

داؤد! بیشک ہم نے تجھ کو زمین پر ایک نائب مقرر کیا ہے، اس لیے لوگوں میں حق کے ساتھ فیصلے کیا کر اور خواہشات کی پیروی نہ کر ورنہ وہ تجھے خدا کی راہ سے بھٹکا دیں گے اور جو کوئی خدا کی راہ سے بھٹکے تو اس کا انجام بُرا ہوتا ہے، کیونکہ وہ قیامت کے حساب و کتاب کو بھول جاتا ہے۔ (قرآن مجید: ۳۸/۲۶)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے سلسلے میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ "اور سلیمان

---

[1] معارف: قرآنی اصطلاح میں علم کا مفہوم مرفوع تر ہے۔

Marfat.com

داؤد کا وارث بنا[1]۔" اگرچہ بیٹا اپنے باپ کا جانشین ہوا تھا لیکن اس قرآنی تذکرے کا منشاء یہ بالکل نہیں ہے کہ بیٹا بطورحق کے بادشاہ بنا ہو بلکہ یہ محض خدا کی عنایت تھی کہ باپ کی جگہ بیٹے کو بھی حکومت ملی اور اقتدار کا اصلی سرچشمہ خدا ہی کی مشیت ہے۔

حکمرانی کے کل پرزوں کی حرکت کا سب سے دلچسپ منظر قرآن مجید میں ملکۂ سبا کے تذکرہ میں ملتا ہے، چنانچہ:

قَالَتۡ يٰۤاَيُّهَا الۡمَلَؤُا اَفۡتُوۡنِىۡ فِىۡۤ
اَمۡرِىۡ‌ۚ مَا كُنۡتُ قَاطِعَةً اَمۡرًا حَتّٰى تَشۡهَدُوۡنِ‏

"اُس (ملکہ) نے کہا اے سردارو مجھے میرے اس معاملہ میں مشورہ دو میں تمہاری موجودگی کے بغیر کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرتی، انہوں نے کہا ہم بڑے طاقتور اور بہادر لوگ ہیں، حکم دینا تیرا کام ہے، اس لیے تو سوچ کر فیصلہ کر، اُس (ملکہ) نے کہا جب کبھی بادشاہ کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں، تو اُسے تباہ کر دیتے ہیں اور وہاں کے معززین کو ذلیل بنا دیتے ہیں اور وہ ایسا ہی کریں گے، البتہ میں اُن (حضرت سلیمان کے ملک والوں) کو ایک تحفہ بھیجوں گی اور دیکھونگی کہ سفیر کیا واپس لاتے ہیں۔ چنانچہ جب سفیر سلیمان کے پاس پہنچے تو انہوں نے فرمایا کہ تم مجھے مال کے ذریعہ سے کچھ مدد دینی چاہتے ہو، جب کہ وہ چیز جو خدا نے مجھے دے رکھی ہے، وہ اس سے کہیں بہتر ہے، جو اس نے تمہیں دی ہے۔ تمہیں تو اپنے تحفے ہی پر ناز ہے، ان کے پاس واپس جاؤ، ہم بیشک ان کے پاس ایسی فوجیں لیکر آئیں گے جن کا وہ مقابلہ نہیں کرسکیں گے اور ہم ان کو وہاں سے ذلیل کر کے نکال دیں گے اور وہ پست ہو جائیں گے۔ (قرآن مجید: ۲۷/۳۲ تا ۳۷)

ا۔ قرآن مجید ۲۷/۱۶

ہر زمانہ میں اس امر کی ضرورت تسلیم کیجاتی رہی ہے، کہ ملت کی رہنمائی کے لیے ایک قوانین کا مجموعہ بھی موجود ہو۔ قرآن مجید میں اکثر اس کا ذکر آیا ہے کہ پیغمبروں کو کتابیں یا صحیفے دیے گئے۔ کتاب کے لفظی معنی حکم دینے کے بھی آتے ہیں اور صحیفہ سے مراد دستور العمل ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں خاص طور سے اس کا ذکر ہوا ہے کہ جونہی وہ فرعون کی سرزمین سے نکل کر باہر آ گئے تو خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احکام لکھی ہوئی تختیاں (الواح) عطا کیں، جن کی تعمیل بنی اسرائیل پر فرض قرار دی گئی۔

ظالم بادشاہوں کے ظالمانہ اور نامناسب افعال کی قرآن مجید میں بار بار بُرائی کی گئی ہے (دیکھیے قرآن مجید ۱۸/۸۰، ۲۸/۴ وغیرہ)۔ ایک چیز جو قرآنی تذکروں میں خاص طور سے قابلِ ذکر معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ مملکت سے زیادہ حکمرانِ مملکت کو نمایاں کیا گیا ہے، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مملکت کا ذکر محض ضمناً آیا ہے اور سیاسی وحدت میں بادشاہ کا ذکر ہی سب سے نمایاں ہے، کیونکہ قدیم زمانوں میں یہی صورت حال تھی۔

اسلامی مملکت:

اب تک ہم نے اپنی تحقیقات کو زمانۂ قدیم کی مملکت تک محدود رکھا تھا، اس کے معنی یہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اسلامی مملکت قائم کی تھی، اس کے لیے کوئی خصوصی احکام قرآن مجید میں نہیں دیے گئے، ہمارے تذکرہ کا مدعا یہ تھا کہ چونکہ انبیاے سلف کی سنت بھی مسلمانوں کے لیے واجب التعمیل قرار دی گئی ہے، اس لیے ان کے زمانہ کے احکام کا تذکرہ نہ صرف اسلامی مملکتی تصور کے لیے ایک پس منظر کا کام دیتا ہے بلکہ واقعتہً وہ اسلامی قانون سیاسی و انتظامی کا جز بن جاتے ہیں۔ وہ احکام جو قرآن مجید میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طور پر دیے گئے ہیں، ان کا موضوع وار تذکرہ کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ کے ربانی ماخذ کو کہیں بھی نظر انداز نہیں

کیا گیا ہے اور قیامت کے حساب و کتاب پر بار بار زور دیا گیا ہے تا کہ بادشاہ میں کسی دنیاوی ذمہ داری کے نہ ہونے کے باعث استبداد نہ پیدا ہو جائے، اگرچہ قرآن مجید میں علاقے یا زمین کا ذکر بعض وقت حکمرانی کے ساتھ آیا ہے، لیکن وہ بڑی حد تک ضمنی ہے، بنیادی نہیں مثلاً:

(الف) قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ۫ الخ

کہہ اے خدا ملک کے مالک! تو ہی جس کو چاہتا ہے، ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک واپس لے لیتا ہے، جس کو چاہتا ہے تو عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے تو ہی ذلیل کرتا ہے، بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے، تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔
(قرآن مجید: ۳/۲۶)

(ب) هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓىٕفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ الخ

وہی ہے جس نے تم کو زمین میں نائب مقرر کیا اور تم میں سے چند کو دوسروں پر رتبے میں فوقیت دی تا کہ تمہیں اس چیز کے ذریعہ سے آزمائے، جو اس نے تمہیں دی ہے۔ (ایضاً ۶/۱۶۵)

(ج) وَ لَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِی الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۠ الآیۃ

اور ہم نے تم کو زمین میں اقتدار عطا کیا اور تمہارے لیے وہاں روزی مہیا کی بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔ (ایضاً ۷/۱۰)

جامعۂ روما کے پروفیسر نالینو کو یہ تسلیم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں معلوم ہوتی کہ اسلامی حکمران کی تخت نشینی کے وقت جو بیعت لیجاتی ہے، وہ ایک طرح سے معاہدۂ معاشرتی کہلا سکتا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:

''کسی شخص کو خلافت کا رتبہ عطا کرنا فقہا کے نزدیک ایک معاہدہ ہوتا ہے، جس کا ایک فریق وہ شخص ہوتا ہے جو اس عہدے کو قبول

Marfat.com

کرے اور دوسرا فریق جماعت اسلامی ہوتی ہے، یہ معاہدہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ بیعت یعنی اظہارِ وفاداری امت کے اصحاب حل وعقد کی طرف سے نہ عمل میں آجائے''[1]

لفظ بیعت کے معنی خود ایک معاہدہ کے ہوتے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وفاداری اور اطاعت کی ایک طرف سے پیشکش کی جائے اور دوسرے فریق کی طرف سے اُسے قبول کیا جائے، (دیکھیے قرآن مجید ۴۸/۱۷، ۶۰/۱۲) دوسرے الفاظ میں حکمران کا اقتدار چاہے مشیت عامہ سے پیدا نہ ہوتا ہو لیکن اسی پر مبنی ہوتا اور اسی کا محتاج ضرور رہتا ہے۔

اگرچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مسلمانوں میں یہ چیز جزءِ عقیدہ ہے کہ پیغمبر معصوم ہوتے ہیں اور اگرچہ خلفاء پیغمبروں کے سیاسی جانشین سمجھے گئے لیکن معصومیت کا یہ اعزاز ان کے لیے کبھی تسلیم نہیں کیا گیا، یہی وجہ ہے کہ بعض دیگر قوموں میں ''بادشاہ کوئی غلطی نہیں کرسکتا'' کا جو سیاسی نظریہ یا کلیہ پایا جاتا ہے، وہ مسلمانوں میں کبھی جگہ نہ پاسکا، اسکے برخلاف مسلمانوں کو اسی پر ناز ہے کہ نہ صرف عام حکمران بلکہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھی حقوق العباد کے معاملے میں انہی عام قوانین کے پابند ہیں جن کے عام مسلمان اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھی خود اپنی ذات کے خلاف مقدمات سنے اور منصفانہ فیصلہ کیا[2]، پیغمبروں کی معصومیت کا منشاء اسلامی علم کلام میں صرف یہ لیا جاتا ہے کہ وحی کی تبلیغ اور خدا کے احکام پہنچانے میں ان سے کوئی غلطی یا سہو سرزد نہیں ہوسکتا، اس کے علاوہ دیگر معاملات میں پیغمبر کی حیثیت بھی ایک انسان ہی کی ہوتی ہے اور احادیث میں متعدد مرتبہ بیان ہوا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیاوی معاملات میں میں بھی تمہارے ہی طرح ایک انسان ہوں، سیاسی حیثیت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جماعت اسلامی کے ایک فرد تھے اور ان قوانین کے جن کو آپ نافذ کرتے تھے، خود بھی پوری طرح پابند تھے۔

---

[1] فرانسیسی رسالہ موسومہ خلافت کی عام نوعیت اور سلاطین عثمانیہ کے دعوائے خلافت پر تبصرہ، مطبوعہ روما، ص:۱۱

[2] سیرۃ ابن ہشام ص ۴۴۴، کامل ابن الاثیر ج ۲ ص ۱۴۱ نیز سیرۃ شامی میں متعدد ایسے واقعے درج ہیں۔

Marfat.com

غرض جملہ مخلوقات کی طرح کرۂ ارض اور انسانی بستی کا بھی اصل مالک اور بادشاہ خدا ہی کی ذات ہے اور وہی صلاحیتوں کو دیکھ کر کسی انسان کو اپنی نیابت سے سرفراز کرتا ہے اور پھر دیکھتا ہے کہ وہ عمل کیسا کرتا ہے۔(انّ الارض یَرِثُها عبادِیَ الصّالِحُونَ إنّی جاعِلٌ فی الارضِ خَلِیفة لِیَنظرَ کیفَ تعملُونَ إنّ الارض لِلّٰہ یُورِثُها مَنْ یشآء مِنْ عبادِہٖ وغیرہ) خدا کا خلیفۂ برحق تو نبی ہوتا ہے جس کا براہ راست وحی سے تقرر ہوتا ہے اور وحی ہی سے اسکی رہنمائی ہوتی ہے، اس کے باوجود بھی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اطاعت اور پیروی کی بیعت لیتے رہے، نبی کے دنیا سے پردہ فرمانے پر احکامِ شریعت سے ناواقفوں کو واقف کرانے کی حد تک حدیث شریف میں ہے کہ العُلمآء ورثة الانبیاءِ[1] لیکن سلطنت رانی اور سیاست مدن کے لیے ماوردی، ابنِ خلدون وغیرہ کے الفاظ میں ''اصحاب حل وعقد'' کسی کا انتخاب کرتے ہیں اور یہ انتخاب بمصداق حدیث شریف یَدُ اللّٰہ علی الجَماعة منشاء ربانی کا اظہار اور باعثِ خیر وبرکت ہوتا ہے اور یہی اصحاب حل وعقد انتخاب اور بیعت کے بعد بھی حکمرانی میں مرجع کا کام دیتے ہیں اور ضرورت ہو تو اسے معزول بھی کر سکتے ہیں[2]، حکمران کے حقِ اجتہاد کے حدود، مصالح ملکی اور نظم ونسق میں شوریٰ کا موقف، اصحاب حل وعقد کی دستوری حیثیت، وغیرہ پر تفصیل سے بحث یہاں ممکن نہ ہو گی البتہ اس سوال کا جواب شاید ضروری ہے کہ اصل دنیاوی اقتدار کے استعمال کا حق کس کو حاصل ہوتا ہے، اس کا جواب حضرت امام اعظمؒ کے الفاظ میں:

انّ نواحی دارالاسلام تحتَ ید إمام المسلمین ویدہ یَد جماعة المسلمین۔ (مبسوط سرخسی ج ۱۰ ص ۹۳)	اسلامی سرزمین کے جملہ حصے اسلامی بادشاہ کے اقتدار میں ہوتے ہیں اور اسکا اقتدار مسلمانوں کی جماعت کا ہی اقتدار ہوتا ہے۔

ا معارف: سنداً یہ حدیث ثابت نہیں۔

۲ بدائع الصنائع للکاسانی ج: ۷ ص: ۱۶۔

Marfat.com

امام ابو حنیفہؒ کے دونوں شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد شیبانی نے مزید وضاحت سے کہا ہے کہ کسی ملک کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا امتیاز یہ ہے کہ وہاں غلبہ اور محافظ قوت کس قوم کو حاصل ہے، تعداد سے بحث نہیں "اِنّھما الدار انّما تُنسب إلی اھلِھا الثبوتِ یَد ھِم القاھرۃ علیھا وقیام وَلا یتھم الحافظۃ فیھا (محیط رضی الدین سرخسی مخطوطہ استانبول، ورق نمبر ۷۰۵ ب) اور حنفی علماء متفق ہیں، کہ اسلامی مملکت کا انتظام امام پوری امت مسلمہ کے نائب کے طور پر کرتا ہے چنانچہ شارح شیبانیؒ کے الفاظ میں الامام بمنزلۃ جَماعۃ بِن المُسْلمِینَ فی استیفاء ھذا الحق" (مبسوط سرخسی ج ۹ ص ۲۰۴) یعنی اس حق کے نفاذ میں امام کی حیثیت امت مسلمہ کے قائم مقام کی ہوتی ہے۔

بہرحال یہ اسلامی تصورِ اقتدار اعلیٰ ہے کہ مقتدر اعلیٰ خداوند خلاق کی ذاتِ کبریائی ہے اور حکمرانی شریعت کو حاصل ہوتی ہے۔ اور "خلیفۃ اللّٰہ فی الارض" یا شریعت کے نفاذ کے افسر کا انتخاب بھی خدا ہی کرتا ہے اور اسبارے میں خدا کی مشیت کا اظہار "یَدُ اللّٰہ علی الجماعۃ" اور "لا یجتمع اُمّتی علی الضلالۃ" وغیرہ احادیث شریفہ کے بمصداق اور عہد خلافت راشدہ کے نظائر کے مطابق اصحاب حل وعقد کی بیعت کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔

دین و دنیا کا ملاپ:

قدیم زمانوں میں جب انسانی تمدن نے زیادہ ترقی نہ کی تھی اور تقسیم کار کی اتنی زیادہ ضرورت پیش نہ آئی تھی، کسی ملک میں مرکزی حکومت کے اختیارات یا تو عدل گستری کے متعلق ہوتے تھے (جس میں دشمن سے جنگ بھی شامل ہے اور فقہ کی کتابوں میں باب الجہاد کا ذکر "حدود" یعنی سزاؤں کے سلسلہ ہی میں ملتا ہے) یا قومی معبود کی پرستش وعبادت کے متعلق۔ دیگر سلطنتی نظم ونسق کے مسائل اٹھتے ہی نہ تھے بلکہ وہ عوام کے انفرادی معاملات سمجھے جاتے تھے اور عبادت ہی نہیں عدل گستری اور جنگ بھی مذہبی مراسم کے تابع تھی۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ کشوری اور مذہبی فرائض میں

Marfat.com

دوری پیدا ہوتی جاتی تھی۔ چنانچہ رومیوں نے بس (Gus یا دنیاوی قانون) کو ہمہ گیر فاس (Feas یا مذہبی قانون) سے ایک الگ چیز کے طور پر ایجاد کیا۔ یہودیوں نے

قَالُوا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

(قرآن ۲:۲۴۶)

اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر جس کے ساتھ ہم خدا کی راہ میں جنگ کر سکیں۔

اور نبوت و بادشاہت یا مذہب و سیاست کو جدا کر دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف بھی یہ قول انجیل میں منسوب ملتا ہے کہ قیصر کی چیزیں قیصر کو دیدو اور کلیسا کی کلیسا کو۔ بدھ متیوں اور ہندوؤں کے ہاں بھی ترکِ دنیا ہی انسانیت کا کمال قرار پایا۔

غرض قدیم اہل مذہب نے دنیائے ناپائدار کو دل لگانے کے قابل چیز نہ سمجھا لیکن اس میں دو بنیادی مسائل نظرانداز ہو کر خامی پیدا ہوگئی، ایک تو گنتی کے چند فرشتہ صفت انسانوں کے سوا باقی جو لاکھوں کروروں عامۃ الناس تھے، ان کے معاملات مادیت پسندانہ ہو گئے اور دوسرے سیاست کی اخلاقی بنیاد نہ رہی اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ سابقہ تمام مذاہب اکائیوں یا دہائیوں میں ختم ہو جانے والے فرشتہ صفت انسانوں کے لیے ہوتے تھے اور اسلام ناز کر سکتا ہے کہ وہ اُمیوں اور اوسط درجہ انسانوں کے لیے ایک قابلِ عمل دستور لایا، یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں ایسوں ہی کی بہت بڑی اکثریت ہوتی ہے، انسان نما فرشتے اور انسان نما شیطان دونوں کی تعداد ہمیشہ بہت محدود ہی ہوتی ہے۔

مذہب اور سیاست دو بالکل الگ چیزیں ہیں۔ مذہب خدا اور بندے کے تعلقات کا نام ہے اور سیاست بندے اور بندے کے معاملات کا۔ ان دونوں کو ایک کہنے والا گویا ہاتھ اور پاؤں کو ایک کہتا ہے لیکن جس طرح ایک زندہ اور تندرست انسان میں ہاتھ اور پاؤں دونوں ہی ایک مشترکہ اور مرکزی قوت مثلاً عقل یا ارادے کے تابع ہوتے ہیں بالکل اسی طرح دین اسلام نے مذہب اور سیاست کو ایک مشترکہ دستور العمل

Marfat.com

کے تابع کر دیا جو قرآن یا ربانی کلام تھا اور دونوں ہی کی رہنمائی کے لیے احکام کا ماخذ ایک ہی قرار دیکر سیاست میں اخلاقی اساس اور اخلاق میں حقیقت پسندی باقی رکھی۔ کوئی شخص ہاتھوں کے بل تھوڑی دور ضرور چل سکتا ہے اور پاؤں سے برا بھلا کچھ لکھ بھی ضرور سکتا ہے، اسی طرح عبادت کو سیاست اور سیاست کو عبادت بنا کر انسان چند روز گزار ضرور سکتا ہے لیکن یہ غیر فطری عمل نہ تو سہولت بخش ہوگا اور نہ مفید۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے ایک بزرگ سیرت نگار نبوت کے الفاظ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لیکر آئے۔ آپ نے صرف آسمانی بادشاہت کی خوشخبری نہیں سنائی بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی تا کہ دنیا میں خدا کی بندگی بے خوف وخطر کیجا سکے اور خدا کی بادشاہی دنیا میں قائم ہو:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ الخ

''خدا نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے یہ وعدہ کیا کہ وہ ان کو زمین میں حاکم بنائیگا (جیسا کہ ان کو حاکم بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے) اور اُن کے لیے ان کے اس دین کو جو اُس نے اُن کے واسطے پسند کیا ہے جما دیگا''۔ (قرآن ۲۴ د د)

قرآن نے مطمحِ اور سب سے اچھی دعا انسانوں کے لیے یہ بتائی ہے:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ

''اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھلائی دے اور ہم کو آگ کے عذاب سے (دوزخ) سے بچا۔ (قرآن ۲۰۱:۲)

اور ایک جگہ فرمایا:

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ
وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ

''اور جنہوں نے نیک کام کیے ان کے لیے اس دنیا میں بھلائی ہے اور آخرت کا گھر سب سے اچھا ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کیسا اچھا ہے! (قرآن ۱۶:۳۰)

جن لوگوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگائی ان کو بشارت ہے:

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ

''تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا بھلا ثواب عنایت کیا اور اللہ نیکی کرنے والوں کو چاہتا ہے۔ (قرآن ۳:۱۴۸)

دنیا کا ثواب فتح ونصرت، ناموری وعزت، مال و دولت اور حکومت وسلطنت ہے جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف جھیلی، ان کو دونوں جہان کی نعمتیں بخشیں:

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا الخ

''اور جنہوں نے (ہمارے لیے) ستائے جانے کے بعد گھر چھوڑا ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور بیشک آخرت کا اجر سب سے بڑا ہے۔ (قرآن ۱۶:۴۱)

(اور اولیاء و اتقیاء یعنی فرشتہ صفت مسلمانوں کو ترکِ دنیا کی ہدایت نہ کی بلکہ دنیاداری اور دین داری دونوں کے ملاپ کا حکم دیا):

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ الخ

''وہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں جما دیں تو وہ نماز کھڑی کریں اور زکوۃ دیں اور اچھے کاموں کو کہیں اور بُرے کاموں سے روکیں اور ہر کام کا انجام خدا کے ہاتھ میں ہے۔
(قرآن ۲۲:۴۱)

ان آیتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں خدا کے قانون

Marfat.com

کے اجراء کی طاقت ہونی چاہیے اور یہ اشارہ بھی کہ دین کا امتزاج یا ملاپ ہی انسان کو انسان بناتا ہے اور ''احسن تقویم'' کا مظاہرہ ہوسکتا ہے ورنہ وہ یا تو فرشتہ ہو جائے گا یا شیطان اور ان دونوں اصناف سے جدا ایک خاص مخلوق یعنی انسان کی تخلیق کا مقصد فوت ہو جائیگا۔

ایسی آیتیں قرآن مجید میں بکثرت ملتی ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا نے اپنی ہر مخلوق انسان کی خدمت یا استفادے کے لیے پیدا کی ہے اور انسان اپنے خالق کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے مگر اس کی تفصیل یہاں طول بحث سمجھی جائیگی۔

بیعت:

حکمران کی اطاعت کو جیسی کچھ اہمیت حاصل ہے، ظاہر ہے، قرآن مجید میں بھی اس پر کچھ کم زور نہیں دیا گیا، مثلاً

(الف) يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ الخ

''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے افسرانِ حکومت ہوں، اگر تم میں کسی معاملہ میں آپس میں جھگڑا ہو تو اُسے اللہ اور رسول سے رجوع کرو، اگر تمہیں خدا اور یوم آخرت پر سچا ایمان ہو، یہی بہتر اور مآل کار اچھا طریقہ ہے۔

(قرآن ۴:۵۹)

(ب) إِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ الخ

''اگر امن یا خوف کی ان کو کوئی خبر ملتی ہے، تو اسے مشہور کر دیتے ہیں، بہتر ہوتا کہ وہ اسکی اطلاع رسول کو اور اپنے افسروں کو دیتے تو سمجھدار لوگ اس کو سمجھ جاتے۔ (قرآن ۴:۸۳)

یہ تو افسروں کی اطاعت کا ذکر تھا۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی اطاعت پر تو اس سے بھی زیادہ مواقع پر زور دیا گیا ہے۔ کہیں صرف حکم ہے تو کہیں اس

Marfat.com

کے فوائد بتا کر ترغیب دی گئی ہے۔ رسول کی اطاعت اور پیروی کے ان احکام پر یہ ناگزیر نتیجہ تھا کہ بعد کے زمانہ میں آپ کے ہر قول اور فعل کا تذکرہ محفوظ کرنے کی اتنی عظیم الشان کوششیں اہلِ علم کی جانب سے عمل میں لائی گئیں۔ ایسی بعض آیات حسب ذیل ہیں:

(الف) وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ

جو کچھ رسول تمہیں دیں اُسے لے لو اور جس سے منع کریں اس سے رُک جاؤ، (قرآن ۵۹:۷)

(ب) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

''بیشک اللہ کے رسول میں تمہارے لیے ایک اُسوہ حسنہ پایا جاتا ہے۔ (قرآن ۳۳:۲۱)

(ج) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝ الخ

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور جب وہ کچھ کہے تو سن کر روگردانی نہ کرو .... اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں تاکہ تم کمزور نہ پڑ جاؤ اور تمہاری ہوا نہ اکھڑ جائے [۱] اسکے برخلاف صبر سے کام لو، اللہ صبر سے کام لینے والوں کیساتھ ہوتا ہے۔

(قرآن مجید ۸:۲۱و۴۶)

(د) وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝

''وہ (یعنی رسولِ خدا) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا، بلکہ وہ وحی ہی ہوتی ہے۔ (قرآن مجید ۵۳:۳-۴)

۱۔ ایک بحری محاورہ ہے، بادبانوں سے ہوا نکل جائے تو ملاح بے بس ہو جاتا ہے، اس محاورے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ قدیم عربوں کو سمندر سے کتنا لگاؤ تھا۔

Marfat.com

آرنلڈ نے اپنی کتاب خلافت میں بالکل ٹھیک رائے ظاہر کی ہے کہ اس طرح رعیت کے فریضۂ اطاعت پر زور دیا گیا، مگر اس کے ساتھ ہی حکمران کے لازمی فرائض کا اتنا ذکر نہیں ہوا، اس سے اسلامی حکمران جابر اور استبداد پسند نہیں بن گیا کیونکہ حشر و نشر اور حساب و کتاب کا عقیدہ نیز حکمران کا بھی قانونِ اسلامی کے ماتحت ہونا اس پر گرفت رکھنے کے لیے کافی ثابت ہوئے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ حکمران کے فرائض پر قرآن مجید نے زور نہ دیا ہو۔

(الف) فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ الخ

اس کے لیے بُلا اور (اے محمد) استقامت سے رہ جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر بلکہ کہہ: میں ایمان لاتا ہوں ہر اُس کتاب پر جو اللہ نے اتاری ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تم میں انصاف کرتا رہوں، اللہ ہمارا اور تمہارا آقا ہے، ہم کو ہمارے کام اور تم کو تمہارے کام، ہم میں اور تم میں کوئی حجت نہیں، اللہ ہمیں یکجا کرے گا اور ہمیں اسی کی طرف جانا ہے۔

(قرآن مجید ۴۲:۱۵)

(ب) فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

تب ہم یقیناً ان لوگوں سے دریافت کریں گے جن کے پاس ہمارا پیغمبر بھیجا گیا تھا اور ہم پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے۔

(قرآن مجید ۷:۶)

متعدد آیتوں میں اس پر زور دیا گیا ہے کہ اجتماعی اور حکومتی مفاد کو انفرادی مفاد پر ترجیح دی جائے۔ مثلاً قرآن مجید (۸:۲۷ تا ۲۸ و ۹:۲۴)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ الخ

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے خیانت نہ کرو اور نہ جان بوجھ کر اپنی باہمی امانتوں میں خیانت کرو۔

Marfat.com

واعلموا انما اموالکم واولادکم فتنة، الخ

اور یہ جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایک آزمائش ہے اور خدا ہی کے پاس اجر عظیم پایا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا آیتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ذاتی مفاد کے لیے یا بیوی بچوں کی خاطر بھی ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو نامناسب ہو اور عالمِ آخرت کے حساب و کتاب کے لیے اپنے ہر فعل میں اس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

ضمناً اس چیز کی طرف بھی اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ حُبِ ملی اسلام میں ایک نیم مذہبی نیم سیاسی وحدت کے تصور پر مبنی ہے، جغرافی یا لسانی یا نسلی وحدت سے اُسے کوئی سروکار نہیں، چنانچہ:

(الف) يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا الخ

اے انسانو! ہم نے تم کو مرد اور عورت سے بنایا اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا، تا کہ تم پہچانے جا سکو، لیکن اصل میں تم میں سے سب سے زیادہ بزرگ خدا کے پاس وہی ہوتا ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو، علم اور خبر خدا ہی کو حاصل ہوتی ہے۔

(قرآن مجید ۴۹:۱۳)

(ب) کُلّ مؤمنٍ اخوة

ایمان والے سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ (قرآن مجید ۴۹:۲)

(ج) وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ الخ

اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور تفرقہ نہ کرو اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم آپس میں دشمن تھے اور (ایمان لانے کے

Marfat.com

باعث) اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈالدی اور اس کی عنایت سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم تو آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے اور اسی نے تم کو بچایا۔ اس طرح اللہ اپنی آیتیں تم کو بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاسکو اور تم میں سے ایک ایسی قوم پیدا ہو جو بھلائی کی طرف بلائے، اچھی بات کا حکم دے اور بُری بات سے روکے۔ ایسے ہی لوگ کامیاب ہونگے۔

(قرآن مجید ۳:۱۰۲)

یہ بیان کرنے کی شاید ہی کچھ ضرورت ہو کہ ایمان اور عملِ صالح کی فوقیت کے سوا اسلام حسب ونسب کی کسی برتری کو قطعاً تسلیم نہیں کرتا، انبیاء کی اولاد تک ''عمل غیرِ صالح [1]'' کے باعث عذاب میں گرفتار ہوئی۔

عدل گستری:

یہ حکمران کا اولین فریضہ ہے کہ اُسے ناطرفدار ہونا چاہیے اور انصاف کے ساتھ حسب موقع وضرورت رحم بھی کرنا چاہیے، (دیکھیے قرآن مجید ۱۶:۹۰، ۴:۵۸ و ۱۳۵، ۵:۸، ۱۶:۴۰)۔

غیر مسلم ذمی رعایا کو عدالتی خودمختاری دینے کا قرآن مجید میں حکم ہے جہاں ان کے ساتھ ان کے شخصی قوانین کے مطابق فیصلے انجام پائیں گے، اگر غیر مسلم رعایا اسلامی عدالت میں اپنی مرضی سے مقدمہ یا مرافعہ پیش کرے تو اس کے ساتھ بھی انصاف کیا جانا چاہیے (دیکھیے قرآن مجید ۵:۴۲ تا ۵۰) اس بارے میں مزید تفصیل ایک علیحدہ مضمون کی متقاضی ہے[2] البتہ اتنا اور اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ قیامت کی جزائے اعمال، حساب وکتاب، چشم دید گواہ، تحریری شہادت، کراماً کاتبین کی ڈائری وغیرہ کی جو تفصیل قرآن میں آئی ہے وہ عہد نبوی کے مروجہ امور ہوں گے جن کے ذریعہ سے عالم آخرت

---

[1] قرآن مجید ۱۱:۴۶

[2] ''عدل گستری ابتدائے اسلام میں'' کے عنوان سے ایک مضمون مجلہ عثمانیہ حیدرآباد مارچ ۱۹۳۸ء میں چھپا جس کے حوالے انہیں مضامین سے بھی لیے گئے ہیں۔

Marfat.com

کا خاکہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

شورائیت:

قرآن مجید میں حکم ہے کہ حکمران اپنے فیصلے مشورہ لیکر کیا کرے، چنانچہ:

(الف) وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ الخ

اور اُن سے معاملات میں مشورہ کر پھر جب تو عزم کرلے تو خدا پر توکل کر، بیشک خدا توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

(قرآن مجید ۳:۱۵۹)

(ب) فَمَا أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ الخ

جو کچھ تمہیں دیا گیا وہ دنیاوی زندگی کا ایک حق تمتع ہے اور بس ورنہ خدا کے پاس جو چیز ہے، وہ بہتر اور زیادہ پائندار ہے، یہ ان لوگوں کو ملے گی جو اپنے رب پر ایمان لاتے اور اس پر توکل کرتے ہیں اور جن کے معاملات باہمی مشورہ سے طے ہوتے ہیں اور جو اس چیز کو خرچ (خیرات) کرتے ہیں جو ہم نے اُن کو عطا کی۔ (قرآن مجید ۴۲:۳۶ تا ۳۸)

(ج) طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ

(مشیروں وغیرہ کے لیے فیصلے کے بعد) اطاعت اور فیصلے کے وقت قول معروف ہونا چاہیے اور پھر جب کسی کام کا عزم کر لیا جائے تو اگر وہ لوگ خدا سے اپنے کیے ہوے وعدے کو پورا کریں تو انہی کے لیے اچھا ہے۔ (قرآن مجید ۴۷:۲۱)

غرض اگر مشورہ لینے کی ایک طرف پابندی عائد کی گئی ہے تو دوسری طرف مشورہ

Marfat.com

کے بعد جو بھی چیز قرار پا جائے اسکی تعمیل کرنا بلا لحاظ اس کے کہ وہ اپنی رائے اور مشورے کے مطابق تھی یا مخالف ضروری قرار دیا گیا ہے، ساتھ ہی اس کا بھی ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آخری ذمہ داری چونکہ حکمران پر ہوتی ہے اس لیے اس کو مشورے کے متعلق حق تنسیخ دیا گیا ہے جیسا کہ قرآن مجید ۶:۱۱۷ میں بیان کیا گیا ہے۔

قانون سازی:

قرآن مجید نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول وفعل کو اُسوۂ حسنہ اور قانون کی حیثیت دی ہے: (دیکھیے قرآن مجید ۵۳:۳ تا ۴، ۴:۵۹ و ۷ وغیرہ) اس حکم کے باعث اسلامی فقہاء یا قانون سازوں کا کام آسان تر ہو گیا کیونکہ ایک طرف تو جن چیزوں کا ذکر قرآن مجید میں نہ تھا ان کے لیے حدیث نبوی میں کافی مواد مل گیا اور دوسری طرف یہ بھی دیکھا گیا کہ خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ قیاس اور استنباط سے کام لیا، بلکہ اسکی صراحت کے ساتھ اجازت بھی دی تھی جیسا کہ معاذ بن جبلؓ گورنر یمن کے تقرر نامے وغیرہ میں مذکور ہے، اگرچہ قرآن اور حدیث کی قیاس کے ذریعہ سے تنسیخ نہیں ہو سکتی. لیکن قیاس اور تعبیر کی اجازت سے علماء وفقہاء کو انفرادی رائے سے کام لینے کی خاصی گنجایش مل گئی حتیٰ کہ یہاں تک تسلیم کیا گیا کہ مجتہد سے غلطی ہونے کے امکان کے باوجود اسکو اس کام سے نہیں روکا جا سکتا، چنانچہ ایک حدیث میں مذکور ہے کہ ''اجتہاد کرنے والا خطا بھی کر سکتا ہے، صواب کو بھی پہنچ سکتا ہے اور صحیح فیصلہ کی صورت میں اسے دو ثواب ملیں گے اور خطا کی صورت میں ایک ثواب۔'' اس طرح اس کا بھی موقع نکل آیا کہ ایک مجتہد کے بعد دوسرا مجتہد بھی اجتہاد کرے اور کسی بہتر نتیجہ پر پہنچنے کے باعث سابقہ مجتہد کا فیصلہ منسوخ قرار پائے اور خود اجماع کے متعلق بھی فقہاء نے ایسی ہی سہولت تسلیم کی ہے جب تک ان اجازتوں سے فائدہ اٹھایا جاتا رہا، اسلامی قانون میں زمانہ کا ساتھ دینے کی گنجایش رہی اور وہ ترقی کرتا رہا اور جب سے قدیم فقہاء کے فیصلوں کے خلاف اجتہاد کا دروازہ چند لوگوں نے بند کر دیا تو اس سے قانون اسلامی کو بے حد نقصان پہنچا، لیکن یہ مسئلہ یہاں دائرہ بحث سے خارج ہے۔

جہان بانی کے قواعد:

قرآن مجید میں اندرونی و بیرونی سیاست کے قواعد خاصی تفصیل سے ملتے ہیں جن سے حالتِ امن وصلح وغیر جانبداری میں حکمران کی رہنمائی مقصود تھی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک مملکت قائم کی اور اس ملک میں جہاں ہمیشہ سے نراج سا چلا آ رہا تھا، ایک مرکزیت اور ایک مملکت قائم کی اور عربوں کو خانہ جنگیوں کے ذریعہ اپنی توانائیوں کو ضائع کرنے سے روک کر انہیں اپنے زمانہ میں دنیا کی سب سے بڑی فاتح اور نوآباد کار قوم بنا دیا اور ان کے ذہنوں سے احساسِ کمتری کو کلی طور پر دور کر کے ان میں وہ صحت ور جذبہ بھر دیا، جسے احساسِ برتری یا احساسِ خودشناسی کہا جا سکتا ہے اور جو کسی ترقی پذیر قوم کے لیے اس قدر ضروری ہوتا ہے، چنانچہ:

(الف) كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

تم وہ بہترین قوم ہو جو انسانوں کے لیے پیدا کی گئی، تم اچھی بات کا حکم دیتے ہو اور بُری بات سے روکتے ہو۔

(قرآن مجید ۳:۱۱۰ نیز ۳:۱۹ و ۳:۸۵)

(ب) اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا الخ

ان لوگوں کو جن سے لڑا جا رہا تھا (برابر کا جواب دینے کی) اجازت دیدی گئی، کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا تھا .... یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں تو وہ خدا کی عبادت کو قائم کر دیں اور زکوۃ دیں، اچھی بات کا حکم دیں اور بُری بات سے روک دیں۔ (ایضاً ۲۲:۳۹ تا ۴۱)

(ج) قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ

ان سے اس وقت تک لڑتے رہو تا آنکہ فتنہ باقی نہ رہے اور خدا ہی کا دین چھا جائے۔ (ایضاً ۸:۳۹)

Marfat.com

(د) وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا الخ

اے محمد ہم نے تجھے صرف اس لیے بھیجا ہے کہ تمام لوگوں کے لیے
بشیر و نذیر ہے، گو اکثر لوگ اسے نہیں جانتے۔ (ایضاً ۳۴:۲۸)

غالباً یہی وہ ایقان یا احساسِ فرض تھا جس نے انہیں دنیا میں حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کے لیے اپنی ہر چیز کو قربان کر دینے کے لیے آمادہ کر دیا۔ جہاد کا جو حکم مذکورۂ بالا اور دیگر آیات قرآنی میں ملتا ہے اس کا منشاء یہ بالکل نہ تھا کہ دوسروں کی جائداد لوٹی جائے، بلکہ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ ایک مقدس ترین اور بڑا ایثار طلب فریضہ تھا کہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر دوسروں کی رہنمائی کریں اور ان کو سیدھا راستہ دکھائیں۔ یہ بار جو محض خدا کی راہ میں تھا اسے انہوں نے ہنسی خوشی برداشت کیا۔

قانون بین المما لک کے خاصے تفصیلی احکام ہمیں قرآن مجید میں ملتے ہیں جن پر مختلف مقالے بھی لکھے جاتے رہے ہیں [۱]، یہاں ان کی تفصیل کی گنجایش نہیں، صرف اس قدر اشارہ کافی ہے کہ قرآن مجید میں انتقامی جنگ (۲:۱۹۰ تا ۱۹۵) معاہدات کی تعمیل (۹:۷) مدافعت (۴:۷۵، ۲۲:۳۹ تا ۴۱) ہمدردانہ جنگ (۸:۷۲) فریق ثانی کی طرف سے معاہدہ شکنی کا خوف (۸:۵۸) مذہبی رواداری (۲:۲۵۶، ۱۰۹:۶، ۱۰:۱۰۰) غیر مسلم رعایا سے برتاؤ (۹:۲۹) قیدیوں سے برتاؤ (۴۷:۴ و ۸:۶۷ تا ۹) پناہ جویوں کو امن دینا (۹:۶) مفتوحہ اراضی کا انتظام (۷:۱۰) صلح کرنا (۸:۶۱) غیر جانبداری (۴:۸۸ تا ۹۱، ۵۹:۱۱ تا ۱۲، ۶۰:۸ تا ۹) وغیرہ وغیرہ امور کا اصولی ذکر ملتا ہے۔

<u>قومی دولت:</u>

كَيۡ لَا يَكُوۡنَ دُوۡلَةًۢ بَيۡنَ الۡاَغۡنِيَآءِ مِنۡكُمۡ

تا کہ وہ تم میں سے صرف مالداروں میں گردش نہ کرتی رہے۔

(قرآن مجید ۵۹:۷)

---

[۱] چنانچہ اسلامک کلچر حیدرآباد میں جنوری ۱۹۴۱ء مابعد کے پرچوں میں کئی مضمون کا ایک طویل مقالہ چھپا ہے۔ اگلی کتابیات میں سابقہ اہلِ علم کی کوششوں کی بھی تفصیل ہے۔

Marfat.com

یہ اسلامی اصولِ دولتِ عامہ کا خلاصہ ہے جو قرآن مجید نے پیش کیا ہے، اسلامی معاشیات کے پیش نظر یہ چیز رہی ہے کہ دولت کی ملک کے ہر طبقہ میں تقسیم عمل میں آئے اور وہ یکجا اکٹھی نہ ہو بلکہ گردش کرتی رہے، معیار سے زائد دولت پر لازمی محصول (یعنی زکوٰۃ) وصیت کرنے کے اختیارات کی تحدید اور کسی شخص کی جائداد سے اسکی وفات پر اس کے قریبی رشتہ داروں کو لازمی طور سے حصہ ملنا، نیز غربا اور محتاجوں کے لیے حکومت کی آمدنی میں لازمی طور سے حصہ مقرر کیا جانا، یہ اور اس کے مماثل قاعدے قرآن مجید نے مقرر کیے ہیں جن سے تقسیم وگردشِ دولت کا مقصد پورا ہوتا ہے اور ساتھ ہی انفرادی ملکیت پر کوئی قید عائد نہ ہونے سے ہر شخص کو اپنے قوائے فطری سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کی ترغیب ہوتی رہتی ہے اور سود کی ممانعت اور قرضہ ہائے حسنہ کا انتظام جو قرآن مجید نے کیا ہے، وہ اسلامی قواعدِ معاشیات کو ایک مکمل نظام کی حیثیت دیدیتے ہیں، جو نہ تو سرمایہ داری ہے اور نہ اشتراکیت، بلکہ اس میں ان دونوں کی خوبیاں ہیں اور ساتھ ہی دونوں کی برائیوں سے اس نظام کو محفوظ رکھنے کا انتظام کردیا گیا ہے۔

اخلاق عامہ:

میرے نزدیک مذہب اور سیاست دونوں ایک دوسرے سے ممتاز عمل ہیں ان کو ایک سمجھنا غلطی ہے، مذہب انسان اور خالق کے تعلق کا نام ہے اور سیاست بندوں کے باہمی تعلقات کے لیے برسرکار ہوتی ہے، لیکن اگر ان دونوں میں کوئی رابطہ اور حلقۂ اتصال نہ پیدا کیا جائے تو انسانیت کو لامحدود نقصان پہنچ جاتا ہے، اسلام نے اس کا ایک حل تلاش کرلیا اور اس کو کامیابی سے عمل میں لاکر بھی دکھا دیا اور وہ یہ تھا کہ اگرچہ مذہب اور سیاست دونوں کے دائرہ ہائے عمل بالکل جدا جدا ہیں لیکن دونوں کے قواعد کا ماخذ ایک ہی چیز کو قرار دیا گیا، چنانچہ مسلمانوں کا مذہب اور مسلمانوں کی سیاست دونوں کی رہنمائی قرآن وحدیث، اصولِ انصاف واستحسان اور ہم آہنگی ضمیر سے ہوتی ہے۔

سیاسی اصطلاحات:

اسلامی ادارہ ہائے سیاست نے اپنی بہت سی اصطلاحیں قرآن مجید ہی سے لی

Marfat.com

ہیں، چنانچہ امت اور ملت سے سیاسی جماعت مراد ہوتی ہے، خلیفہ اور امام اس جماعت کے سردار کا نام ہوتا ہے، (دیکھیے قرآن مجید ۴۲: ۸ نیز سیرۃ ابن ہشام ص ۳۴۱ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر مدینہ کے لیے ہجرت کے بعد جو دستور مملکت نافذ فرمایا تھا اور جس کا پورا متن خوش قسمتی سے ہم تک پہنچ چکا ہے، اس کی دفعہ ۲ میں بھی انہی اصطلاحات کو استعمال کیا گیا ہے، لفظ خلیفہ کے لیے دیکھیے قرآن مجید ۳۸: ۲۷ اور لفظ امام کے لیے ۲: ۱۲۴)۔

جانشینی:

لفظ خلیفہ کے ساتھ ہم جانشینی کے خاردار مسئلہ سے دوچار ہو جاتے ہیں، یہی وہ مسئلہ ہے جس نے تیرہ سو سال سے مسلمانوں کو دو بڑی متخاصم جماعتوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جو اسلام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے لیے لائے تھے اور جس کی آپ عمر بھر تبلیغ کرتے رہے، اس کے بنیادی اصولوں میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں ہے کہ آپ کی جانشینی کے لیے کیا اصول ہو اور اس اصول کا ماننا اس سے بھی کم ایک جز عقیدہ امر بن سکتا ہے لیکن بدقسمتی سے اس کے بالکل برعکس صورت حال پیدا ہو گئی اور ہر دو فریقوں کے ہاں غلو رکھنے والے خیالات بھی پھیلتے رہے، حالیہ زمانہ میں ایک حل جو اس کے لیے سوچا گیا ہے وہ سنجیدہ غور کا مستحق ہے، وہ یہ کہ سنی اور شیعہ دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ تاریخی واقعہ کی حیثیت سے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علیؓ پہلے خلیفہ نہیں ہوئے، اسی طرح شیعہ اور سنی دونوں ہی اس پر متفق ہیں کہ روحانی امور میں حضرت علیؓ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ بلافصل[۱] ہیں، چنانچہ چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ وغیرہ قریب قریب تمام صوفی سلسلے اس کو مانتے[۲]

۱۔ معارف: ''خلیفہ بلافصل'' کے معنی گویا یہ ہوئے کہ جس نے براہ راست مشکوٰۃ نبوت سے فیض پایا ہو، اس معنی کے لحاظ سے تمام اکابر صحابہ خلفاء بلافصل تھے اور عالم روحانی میں تعدد خلفاء بلافصل ممنوع نہیں۔

۲۔ اور یوں بھی عالم مادی میں ''دو شاہان در اقلیمے نہ گنجند'' صحیح ہو تو ہو عالم روحانی میں ایک سے زیادہ خلیفہ بلافصل ہونے میں کوئی مانع نہیں۔

ہیں۔ اب رہا یہ امر کہ حضرت علیؓ کو سیاسی جانشینی کا بھی استحقاق تھا یا نہیں، یہ ایک خالص علمی مسئلہ رہ جاتا ہے، جس کو آئے دن کی روزمرہ سیاسی زندگی پر اب تیرہ سو سال بعد اثر انداز کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔

جس طرح ایک نبی کے بعد دوسرے نبی کے آنے تک اوّل الذکر ہی کی شریعت باقی رہتی ہے، اسی پر قیاس کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک حکمران کی وفات کے باوجود اس کے جانشین کے انتخاب تک اوّل الذکر ہی کا اقتدار جاری رہتا ہے اور اسی کے مقرر کردہ افسر اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہنے کے پابند ہیں، چنانچہ:

كَانَ اَبُو حنيفة يقول اذامات الخليفة فالقاضي على قضائه والوالي على ولايته حتىٰ يغيرله القائم بعده۔

(مناقب ابی حنیفہ للموفق ج ا ص: ۸۷-۸۸)

امام ابوحنیفہ فرماتے تھے، اگر خلیفہ کا انتقال ہو جائے، تو قاضی اپنی قضأت پر اور والی اپنی حکومت پر باقی رہتا ہے، جب تک خلیفہ کا جانشین اسے بدل نہ دے۔

اسی مسئلہ کو قاتلِ حضرت عمرؓ کے بعض بے گناہ ہم وطنوں کی شہادت اور ان شہداء کی عدم دارو گیر کے افسوسناک تاریخی واقعہ کے باعث تھوڑی سی اہمیت تھی، اس لیے اس کا بھی ذکر کر دیا گیا۔

یہ سرسری خاکہ زیادہ قابل اہلِ علم کے لیے دعوت ہے، کہ اس اہم موضوع پر توجہ کر کے ملک و ملت کی رہنمائی کریں۔ وآخر دعوانا ان الحَمْدُ للهِ رَبِّ العالمین۔

(معارف اعظم گڑھ- دسمبر ۱۹۴۱ء)

Marfat.com

قرآن مجید اور عورت

نزول قرآن کی جوبلی:

سب سے پہلے ایک حقیر عرض ہے۔ قرآن مجید کی پہلی وحی ۲۷ / رمضان ۱۳ھ قبل ہجرت کو غارِ حرا میں ہوئی۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ ۱۳۸۸ھ میں اس پر چودہ صدیاں گزر چکیں گی۔ ضرورت ہے کہ دنیا میں ہر جگہ اس تقریب کو شایانِ شان طور پر منانے کی تیاریاں ابھی سے شروع کی جائیں۔ علمی نمائشیں ہوسکتی ہیں (قرآن مجید کے قلمی اور مطبوعہ نسخے، تراجم قرآن، تفاسیر قرآن و دیگر علوم قرآن کی کتابیں) تقریریں، مشاعرے میں غرض منصوبہ بندی کے تحت کام ہو تو نتیجہ مفید ہوسکتا ہے۔

عہد نبویؐ میں زمانہ تعلیم قرآن:

ابن اسحاق کی لکھی ہوئی سیرت النبی شہرہ آفاق ہے ان کی وفات ۱۴۸ھ کے لگ بھگ ہوئی۔ ان کی تالیف ناپید سمجھی جاتی تھی۔ مگر اتفاق سے اس کا ایک ٹکڑا فاس (مراکش) میں اور ایک دوسرا ٹکڑا دمشق میں ملا ہے، مراکشی ٹکڑے میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ بیان ہوا ہے لکھا ہے کہ:

> ''جب کبھی رسول کریمؐ پر کوئی وحی نازل ہوتی تو پہلے آپ اسے مردانہ اجتماع میں سناتے پھر زنانہ اجتماع میں خاص عورتوں کو سناتے بار بار عورتیں سوال کرتیں اور جو بات سمجھ میں نہ آتی اس کی

وضاحت چاہتیں۔"

حافظہ قرآن صحابیہ:

قرآن مجید کو حفظ کرنے کا رواج عہد نبوی ہی سے چلا آرہا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ حضرت ام ورقہ انصاریہ رضی اللہ عنہا کا ذکر حدیث کی کئی مستند کتابوں میں ہے۔ لکھا ہے کہ:

یہ حافظہ تھیں اور رسول اکرم نے ان کو ان کے محلے کی مسجد کا امام مقرر فرمایا تھا۔ راوی کہتے ہیں:

میں نے اس بوڑھے مؤذن کو دیکھا ہے جو اس مسجد میں پنج وقتہ اذان دیا کرتا تھا۔ (اور ظاہر ہے کہ وہ بھی اقتداء کرتا تھا)۔

اس بارے میں فقہا نے بڑی بحثیں کی ہیں کہ عورت کی امامت جائز ہے یا نہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ:

"ام ورقہ کا واقعہ ابتدائے اسلام سے ہے بعد میں منسوخ ہو گیا۔"

مگر ایسی کوئی حدیث نہیں ملتی جس میں بی بی کو بعد میں امامت سے ممانعت کر دی گئی ہو۔ کوئی کہتا ہے کہ:

"یہ انفرادی اور خصوصی اجازت ہے۔"

ابھی گزشتہ ہفتے کی بات ہے یہاں اس کی ضرورت پیش آئی۔ ایک افغان لڑکی نے ڈنمارک کے ایک طالب علم سے شادی کر لی اور اس کی کوشش سے شوہر بھی مسلمان ہو گیا۔ وہ مجھ سے پوچھنے آئی۔ میرے شوہر کو ابھی سورہ فاتحہ تک یاد نہ ہو سکا۔ تشہد ثنا وغیرہ بہت دور ہیں۔ کیا میں اس کی امامت کر سکتی ہوں۔ میں نے کہا کہ فقہا تو اجازت نہیں دیتے۔ لیکن جب تک تمہارے میاں کو دو تین سورے یاد نہ ہو جائیں حضرت ام ورقہؓ کی طرح سے تم ہی نماز پڑھا دیا کرو۔ کہنے لگی:

"صدقے جاؤں اس نبی کے جو ہمارے فقہاء سے
زیادہ وسیع النظر ہے۔"

امہات المومنین:

رسول اکرم پر سب سے پہلی وحی سورہ اقراء کی جن آیتوں سے ہوئی ان میں سب سے پہلا لفظ ہے ''پڑھ'' اور پھر قلم کی تعریف ہے کہ اس کی مدد سے انسان وہ ساری چیزیں سیکھتا ہے جو دوسروں کو تو معلوم تھیں لیکن خود اسے معلوم نہیں تھیں۔ رسول کو پڑھ کا حکم ہو اور وہ تعمیل نہ کرے! آپ کی ساری عمر یہی کوشش رہی کہ ملک وملت میں علوم کا رواج ہو۔ اس نعمتِ خداوندی سے عورتیں کیسے محروم رکھی جا سکتیں۔

حضرت عمرؓ کی رشتہ دار شفاء بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے زمانۂ جاہلیت ہی میں لکھنا، پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ حدیث کی کتابوں میں ذکر ہے کہ:

> ''بی بی نے ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو لکھنا پڑھنا سکھایا۔ اور اس پر رسول اکرم بہت خوش تھے....

متعدد دیگر ازواج مطہرات کے متعلق بھی بلاذری وغیرہ مورخوں نے صراحت کی ہے کہ انہیں پڑھنا آتا تھا۔ اور وہ قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول رہا کرتی تھیں۔ بلاذری نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق خاص کر یہ لکھا ہے کہ انہیں پڑھنا آتا تھا۔ لکھنا نہیں آتا تھا۔ اور یہ کہ وہ ہمیشہ قرآن مجید خود بھی پڑھتیں اور لڑکیوں کو بھی اس کی تعلیم دیا کرتیں۔ بعض وقت تو مرد بھی ان سے مسئلے مسائل پوچھنے آیا کرتے۔

قرآن میں عورت کا ذکر:

دیگر ادیان کی کتابوں میں عورت کا ذکر نہیں آتا اور اگر آئے بھی تو ان کی بُرائی کرنے کے لیے۔ عورتوں میں برائیاں ہوں گی تو کیا مردوں میں نہیں؟ اچھے اور بُرے دونوں صنفوں میں ہیں۔ بہر حال قرآن مجید میں ایک پوری ہی سورت سورہ نساء ہے اور ایک اور سورہ مریم بھی ہے! اچھی عورتوں کی مثالوں میں۔ ''امراۃ فرعون'' (فرعون کی ملکہ آسیہ) اور مریم بنت عمران کا صراحت سے ذکر ہے۔

بُری عورتوں میں دو پیغمبروں کی بیویوں (امراۃ نوح وامراۃ لوط) اور آنحضرت

کی چچی امراۃ ابی لہب کی مثال دی گئی ہے۔

حضرت حوا کا قرآنی ذکر خاص کر سبق آموز ہے۔توریت کے پیرووں کا بیان ہے کہ انہوں نے حضرت آدم کو بہلا پھسلا کر شجر ممنوعہ کے کھانے پر آمادہ کیا۔ جس کی پاداش میں جنت سے نکلنا پڑا۔ گویا سارے بنی نوع انسان کی مصیبتوں کی ذمہ دار وہی ہیں۔ انجیل پرستوں کے ہاں عام طور سے یہ مانا جاتا ہے کہ اس حادثے کی بناء پر یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر انسان اپنی فطرت ہی سے گنہگار پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ کہ حضرت مسیح اس کا کفارہ بنے۔لیکن فرقہ لوگومیل نے حد کر دی۔ ان کا عقیدہ ہے کہ:

''حضرت حوا کا بیٹا قابیل (قین) حضرت آدم کے نطفے سے نہ تھا۔ بلکہ اس کا باپ شیطان تھا۔''

(''جن لوگوں کو اپنی دادی پر اتنی بڑی تہمت لگانے کی جسارت ہوئی ہے انہیں حرام زادہ نہیں تو کیا کہا جائے'')

لیکن قرآن نے اس قصہ کا کیا ذکر کیا ہے۔ وہاں بی بی حوا کا کوئی قصور نہیں ہے۔ شیطان نے حسد سے حضرت آدم کو بہکایا۔ شیطان نے ان دونوں کو گمراہ کیا۔ ان دونوں نے اس شجرۂ ممنوعہ کا پھل کھایا وغیرہ۔

توریت و قرآن دونوں میں اس کا ذکر ہے کہ حضرت آدم کے نہ باپ تھا نہ ماں۔ خدا نے انہیں براہ راست مٹی میں روح بھر کر پیدا کیا۔ حضرت عیسیٰ کا زمانہ متاخر ہے۔ اس لیے تورات میں ان کا ذکر نہیں۔ انجیل اور قرآن کے مطابق ان کی صرف ماں تھی۔ اور وہ بن باپ کے بطور معجزہ پیدا ہوے۔

ایک خاص مذہب والے اس سے نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ خدا تھے اور خدا کے بیٹے تھے۔لیکن قرآن نے کیا میٹھا جواب دیا ہے:

ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم۔

عیسیٰ کی مثال اللہ کے ہاں آدم کی مثال کی طرح ہے۔عیسیٰ کے باپ نہ تھے تو آدم کا باپ تو کیا ماں بھی نہ تھی۔

جب آدم اس طرح خدا نہ بن گئے تو حضرت عیسیٰ کو یہ رتبہ کیوں

Marfat.com

دیتے ہو؟

قرآن مجید کے ۲۸ویں پارے کا آغاز بھی دلچسپی سے خالی نہیں:

قد سمع اللہ۔ اللہ نے اس کی بات سن لی جو اے محمد تجھ سے اپنے شوہر کے متعلق جھگڑتی اور اللہ سے فریاد کرتی ہے۔

یہاں بھی عورت کی کوئی بُرائی نہیں ہے۔ بلکہ عورت ہی پر اللہ کو رحم آتا ہے اور مرد کے خلاف اسکی شنوائی کرتا ہے۔

دو قرآنی محاورے بھی قابل ذکر ہیں:

نوشتہ تقدیر کو نام دیا گیا ہے۔ ''ام الکتاب'' (کتاب کی ماں) یا (احکام کی ماں) باپ پر ماں کو ترجیح دی گئی ہے۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ اور معنی خیز لفظ ''ام القریٰ'' (شہروں کی ماں) جو شہر مکہ کا لقب ہے۔

خدا کی ذات ماورائے ادراک ہے۔ اس کی قدرت کو سمجھانے کیلیے اس کا ذکر اسی طرح کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی جانی بوجھی اور اس کے ماحول کی چیزوں سے ماخوذ ہو۔ اسلیے قرآن کہتا ہے کہ خدا بادشاہ ہے۔ اس کے پاس فوجیں ہیں، خزانے ہیں، تخت ہے، یہ تو خیر معمولی باتیں ہیں۔

ضرورت تھی کہ ان تفصیلوں کو اور آگے بڑھایا جائے۔ بادشاہت کیلیے پایہ تخت کی ضرورت ہے اور پایہ تخت ام القریٰ ہی میں ہو سکتا ہے۔ پھر اس ام القریٰ میں جو انگریزی کے مٹروپولس (METROPOLIS) کا لفظی مترادف ہے، قصر شاہی ہونا چاہیے اس کا نام بیت اللہ سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔ اظہار اطاعت کیلیے انسان کو قصر شاہی پر حاضری کی ضرورت ہوتی ہے۔ (حج کیلیے)

آخر میں حضرت بلقیس کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید میں ذکر ہے کہ یہ یمن میں ریاست سبا کی حکمران تھیں اور مجلس شوریٰ کی مدد سے حکومت کرتی تھیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت پر ان سے ملنے بیت المقدس گئیں۔ اور وہاں ان کے ہاتھ پر اسلام بھی لے آئیں۔ غرض قرآن مجید کے مطابق عورت سماج کے بلند ترین

Marfat.com

مرتبے یعنی بادشاہت تک پہنچ سکتی ہے۔ اور قرآن اسے بُرا نہیں قرار دیتا۔

عورت کے متعلق احکام:

پرانے زمانے میں عورت کی کوئی مستقل شخصیت نہ تھی۔ دھرم شاستر میں اب تک عورت کو اپنے شوہر کی وراثت تک میں کوئی مستقل حصہ نہیں ملتا۔ وہ اس ترکے کے ایک حصے سے تاحیات استفادہ کر سکتی ہے اور بس۔

اسلام سے قبل مدینہ منورہ کے عربوں میں یہ رواج تھا کہ کسی شخص کی وفات پر اس کی بیوی بیٹی تو کیا نابالغ بیٹے کو بھی کوئی حصہ نہ ملتا۔ قریبی رشتہ داروں میں جو بالغ مرد ہوتے وہ ساری جائداد کے وارث بن جاتے۔

اس طرح کا ایک واقعہ آنحضرت کے علم میں آیا۔ کسی غزوے میں ایک صحابی شہید ہو گئے۔ یہ کھاتے پیتے شخص تھے۔ بیوہ اور کم عمر بچوں کی پرورش تھی کہ اس کیلیے ایک پیسہ تک ہاتھ میں نہ تھا۔ رسول اکرمؐ بے چین ہو گئے اور خدا سے دعا فرمائی۔ اس پر وہ آیتیں نازل ہوئیں جن پر قرآن مجید کا قانون وراثت مبنی ہے۔ اس میں بیوی، بیٹی اور ماں کو ہمیشہ بہن، نانی، دادی، بھتیجی کو متعدد حالتوں میں حصہ ملتا ہے اور یہ حصہ قطعی ہوتا ہے۔

قرآن کیلیے عورت ایک مستقل شخصیت ہے۔ بیٹی ہو کہ بیوی ہو یا ماں۔ اس کی حیثیت ایک مستقل فرد کی ہوتی ہے کہ نہ باپ کے نہ شوہر نہ بیٹے کے وہ دست نگر ہوتی ہے۔ اسے وراثت اور ہبے میں بھی کوئی جائداد حاصل ہو سکتی ہے۔ اور وہ خود بھی کچھ کما سکتی ہے۔ اسے مہر بھی ملتا ہے۔ اس کی پرورش کیلیے قانون حکماً باپ، شوہر، بیٹے، بھائی وغیرہ سے نفقہ بھی دلاتا ہے۔ اس نفقے کے باوجود بھی اسے وراثت دلائی جاتی ہے۔ قرآن کے مطابق بعد میں اس سے کوئی بھی یہ جائداد اس کی رضامندی کے بغیر لے نہیں سکتا۔

اس کی شخصیت کے مستقل ہونے کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ نکاح میں اسکی رضامندی بھی لازمی ہے۔ عقد نکاح میں وہ شرطیں بھی شامل کرا سکتی ہے کہ میرا یہ شوہر

میری موجودگی میں کسی اور عورت سے نکاح نہ کرے گا۔ یا یہ کہ مجھے بھی شوہر کو طلاق دینے کا حق ہوگا وغیرہ۔

تعدد ازواج کی قرآن نے اجازت ضرور دی ہے۔ لیکن یہ عورت کی رضامندی پر منحصر ہے۔ اگر کسی کے پاس پہلے سے ایک بیوی ہے تو نئی دلہن ہی پر منحصر ہے کہ ایسے نکاح کو منظور کرے یا نہیں!

میاں بیوی میں جھگڑے ہوں تو قرآن مجید نے تحکم کا ادارہ قائم کر دیا ہے۔

عورت کی عزت وعفت پر الزام لگانے کو قرآن نے انتہائی سنگین جرم قرار دیا ہے۔ کہ مجرم کو نہ صرف سو کوڑے مارے جائیں بلکہ ساری عمر اس کو عدالت میں ناقابل شہادت قرار دیا جائے۔

ایک ہی جرم پر مرد کو جو سزا دی جاتی ہے بعض صورتوں میں اسی پر عورت کو نصف سزا دی جاتی ہے۔

عبادات میں بھی اس کو رعایتیں ہیں۔

نقاب:

قرآن مجید نے خمار اور جلباب دو قسم کے برقعوں کا ذکر کیا ہے، خمار صرف چہرے کو چھپاتا ہے اور جلباب سارے لباس کو ڈھانپ لیتا ہے۔

ایک دن پیرس میں ایک زنانہ انجمن نے (جس میں سفیروں کی بیویاں وغیرہ صرف طبقہ اعلیٰ کی خواتین رکن ہیں) مجھے اس موضوع پر تقریر کی دعوت دی۔ میں نے کہا:

''نقاب عورت پر پابندی کیلیے نہیں بلکہ خود اسی کے فائدے کے لیے ہے (قرآن سے پہلے عہدِ جدید یعنی انجیل نے سینٹ پال نے بھی یہی حکم دیا ہے)۔ عورت فطرۃً بن ٹھن کر رہتی ہے کہ خوبصورت نظر آئے نقاب اسی حسن کی حفاظت کیلیے ہے۔ آپ دیہات میں دھوپ میں کام کرنے والی

Marfat.com

عورتوں کے ہاتھ کا اپنے نازک ہاتھ سے مقابلہ کیجیے۔ اپنے چہرے اور ہاتھ کے چمڑے اور رنگ کا اپنے ہی جسم کے ہمیشہ ڈھکے ہوئے رہنے والے اعضاء کے چمڑے اور رنگ سے مقابلہ کیجیے۔ کسی جانور کو لیجیے اور اس کی پیٹھ اور پیٹ کے چمڑوں کا مقابلہ کیجیے۔ کسی پرندے کو لیکر اس کے بیرونی اور دھوپ کھانے والے پروں کا مقابلہ ان پروں سے کیجیے جو پکوٹھوں کے اندر ڈھکے رہتے اور دھوپ کی مار نہیں کھاتے ہیں۔ جو عورت عادتاً نقاب برتے گی اس کی ملاحت اور اس کے جسم کی ملائمت کا مقابلہ وہ عورت کبھی نہیں کرسکتی جو نقاب کو وبال جان سمجھتی ہے۔''

میں نے دیکھا چہروں پر خفگی کی جگہ مسکراہٹ تھی۔ اور جب میں جانے لگا تو غالباً میکسیکو کے سفیر کی بیوی نے کہا اب میں نقاب شروع کردوں گی۔

(خاتون پاکستان- قرآن مجید نمبر ۱۳۸۴ھ)

Marfat.com

قرآن مجید کے فرانسیسی ترجمے

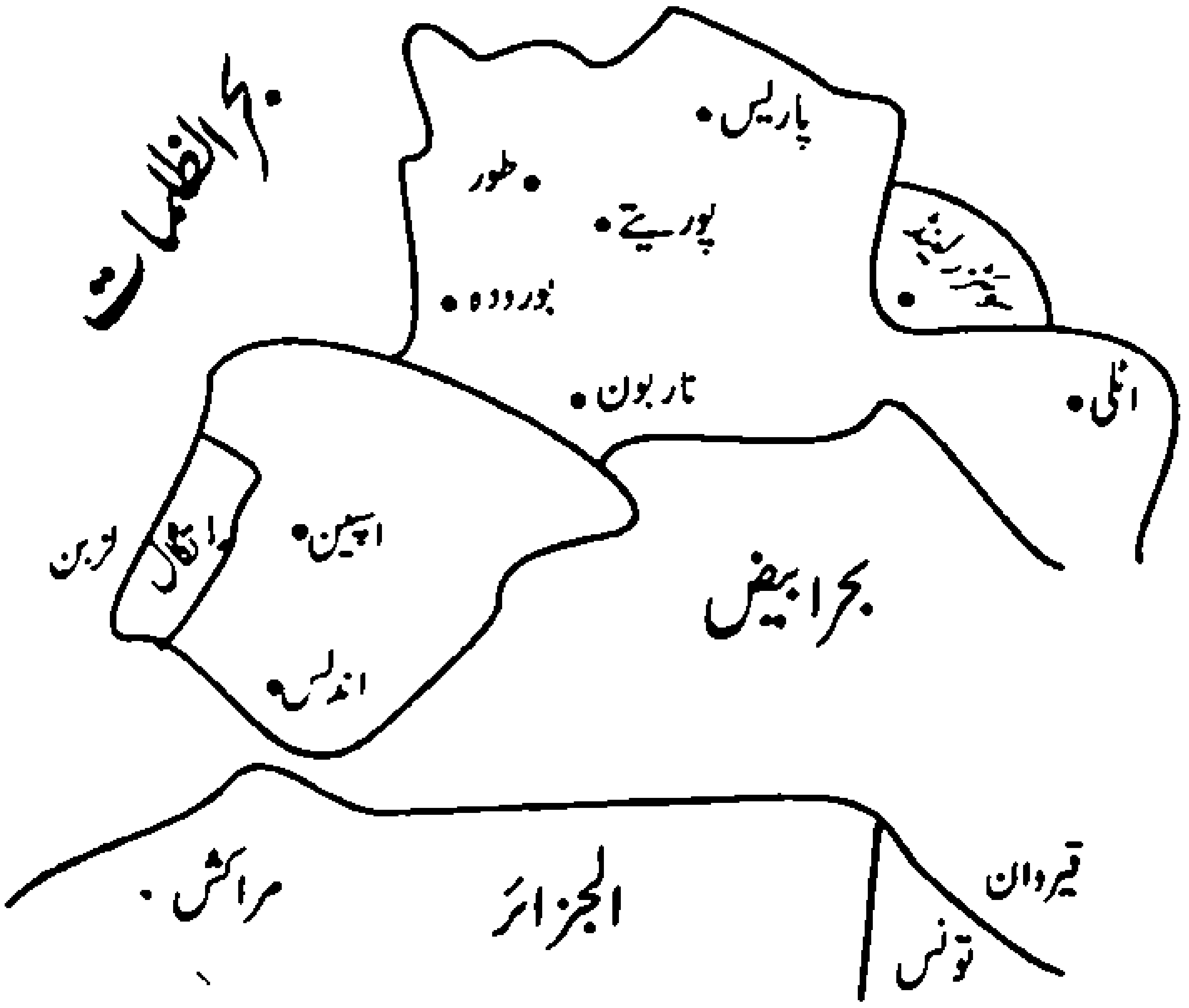

مسلمانوں کی یورپ میں آمد:

قسطنطنیہ (حال استانبول) کے بادشاہ ہرقل کے نام بھیجا ہوا مکتوب نبویؐ ۷ھ کی چیز ہے۔ امام بخاری وغیرہ کی روایت کے مطابق یہ تبلیغی خط جس میں قرآن مجید کی بعض آیتیں بھی ہیں، ہرقل کو اس وقت پہنچا جب وہ حمص میں تھا اور سفیر سے اس نے بیت المقدس پہنچنے پر ملاقات کی۔

تاریخ طبری کے بیان کے مطابق ۲۶ھ، ۶۴۶ء میں حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اسلامی فوجیں اندلس (جنوبی اسپین) میں پہنچ گئیں اور کمک نہ ملنے کے

Marfat.com

باوجود وہیں حاکمانہ و قابضانہ مقیم رہیں تا آنکہ اس کے ستر سال بعد طارق اور موسیٰ بن نصیر نے اس آغاز کو انجام تک پہنچایا۔

فاطمی دور کے ممتاز مورخ القاضی الرشید ابن الزبیر نے اپنی کتاب الذخائر والتحف میں بیان کیا ہے کہ طارق نے اربونہ (حال ناربون، فرانس) پر بھی قبضہ کیا تھا، اس کے کچھ ہی دن بعد عبدالرحمٰن الغافقی نے بورڈو فتح کیا اور وہاں کے حکمران کی لڑکی سے شادی کی۔ اس کے بعد شمال کی طرف کسانوں اور دیگر نوآبادکاروں کی امن پسند مہم کے ساتھ روانہ ہوا لیکن پورتیے اور طور کے درمیان ایک غیرآباد مقام پر جسے اب خندق الملک (فوسے روا) کہتے ہیں شارل مارتل سے مڈبھیڑ ہوئی اور بظاہر کسی جاسوس یا کسی غدار نے رات کو عبدالرحمٰن الغافقی کو شہید کر دیا، اس لیے دوسرے دن بے سری فوج اندلس واپس ہوگئی۔ نئے امیر اندلس نے دوسرے ہی سال دوبارہ طور جانے کی تیاری کی، لیکن خوارج نے بغاوت کر دی، اس لیے مجبوراً فرانس کی نوآبادکاری ملتوی کرنی پڑی۔ میں نے دو تین مرتبہ ان مشاہد شہدا پر حاضر ہو کر فاتحہ پڑھی ہے۔

چند نسلوں بعد تونس کے اغلبی حکمرانوں نے پروانس (جنوبی فرانس)، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی تک اپنا اقتدار پھیلایا۔ اس دور یعنی دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی کی فرانس میں کافی یادگاریں اب تک باقی ہیں۔ مثلاً قلعوں کے کھنڈر، ہتھیار، سکے وغیرہ۔

قرآن مجید کا ترجمہ:

مجریط (میڈرڈ) کے کتب خانوں میں قرآن مجید کے چار ترجمے اب تک محفوظ ہیں، جو اسپینی زبان میں عربی خط میں لکھے ہوئے ہیں۔ پولینڈی اور لتھوانی زبانیں بھی ایک زمانے میں وہاں کے مسلمان عربی خط میں لکھتے تھے۔ ایسے پولینڈی اور لتھوانی (عربی خط والے) تراجم قرآن کے مخطوطے بھی اب تک باقی ہیں۔ حال میں اسی طرح کا ایک یوگوسلافی (عربی خط والا) ترجمہ قرآن کا قلمی نسخہ بھی ملا ہے، ان حالات میں یہ گمان کرنا بے جا نہیں کہ اموی اور عباسی (اغلبی) دور میں جب فرانس کے تقریباً ایک تہائی رقبہ پر کم و بیش سو سال تک مسلمانوں کا قبضہ رہا تو نومسلموں کی ضرورت کے لیے

Marfat.com

عربی خط میں فرانسیسی ترجمۂ قرآن کی اشاعت ضروری ہوگئی، لیکن ابتک کوئی دستاویزی ثبوت ایسے فرانسیسی ترجمے کا نہیں ملا ہے۔ قدیم ترین جس فرانسیسی ترجمہ کا ذکر ملتا ہے وہ اس سے دوصدی بعد کا ہے جیسا کہ ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

فرانسیسی تراجم قرآن مجید:

(۱) قسطیلیہ کے حکمراں الفونسو دہم (حکمرانی ۶۵۰ھ (۱۲۵۲ء) تا ۶۸۳ھ (۱۲۸۴ء) کے حکم سے طلیطلہ کے ایک عالم دون ابراہام نے (جو غالباً یہودی تھا) قرآن مجید کے سورۃ المعارج کا اسپینی میں ترجمہ کیا اور پھر اس اسپینی سے بوناونتورادیسیب (Bonnaventura de seve) نے اس کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا، (جیسا کہ جویش انسائیکلوپیڈیا میں بعنوان ''قرآن'' ذکر ہے) لیکن بظاہر اب اس کا کوئی وجود باقی نہیں۔

(۲) پھر چار سو سال تک سکوت رہا۔ اس کے بعد ۱۰۵۷ھ (۱۶۴۷ء) میں سیور دورئیے (Sieur du ryer) پاریس نے مکمل قرآن مجید کا ایک ترجمہ- Lal Coran de Mahomet کے نام سے شائع کیا، جس کے سوا سو سال میں کم از کم اکیس ایڈیشن چھپے اور اس کی اساس پر متعدد یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔

(۳) ساواری (M. Savary) کا ترجمہ دو جلدوں میں پہلی مرتبہ پاریس میں ۱۱۸۶ھ (۱۷۷۲ء) میں Lekoran کے نام سے چھپا، اس کے بعد اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ اب بھی یہ بازار میں آسانی سے ملتا ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے بہت عمدہ لیکن صحت کے لحاظ سے ناقابلِ اعتماد ہے۔

(۴) رینو (Reinaud) فرانس کے ممتاز ترین عربی دانوں میں گزرا ہے۔ اس کی مشہور تالیف ''عربوں کا حملہ فرانس پر اور پھر وہاں سے سوئٹزرلینڈ اور اٹلی پر'' حال میں پروفیسر ہارون خاں شروانی کے انگریزی ترجمے کے ذریعہ کافی معروف ہو چکی ہے۔ اسی مستشرق نے ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۸ء) میں دو جلدوں میں ایک کتاب شائع کی جس میں ڈیوک De blacas اور بعض دوسرے لوگوں کے

Marfat.com

ذخیروں کی عربی، فارسی اور ترکی چیزوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسکی دوسری جلد میں متعدد آیتوں اور سورتوں کا ترجمہ ہے۔

(۵) گارنیسن دتاسی کے نام سے اردو داں اچھی طرح واقف ہیں۔ اس کی متعدد تالیفوں کے مندرجات سے گمان ہوتا ہے کہ وہ مخفی طور سے مسلمان ہو گیا تھا۔ اس نے فرانسیسی میں ''قرآن سے ماخوذ اسلامی عقائد وفرائض'' کے نام سے ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) میں ایک کتاب شائع کی جس میں بکثرت قرآنی سورتوں کا ترجمہ ہے۔ مولف نے صراحت کی ہے کہ یہ ساواری (نمبر۳) سے ماخوذ ہے۔ لیکن نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ پھر نظر ثالث کے بعد یہی مواد ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں (Isalmisme D apresle Coran) کے نام سے شائع ہوا۔

(۶) کازیمیرسکی (Kasimirsi) اصل میں پولینڈ کا باشندہ تھا۔ پھر جامعہ پیرس میں عربی کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اس نے ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) میں مکمل قرآن مجید کا فرانسیسی ترجمہ شائع کیا۔ اس کے کم از کم پچیس ایڈیشن ہو چکے ہیں اور اب تک مقبول ہے اور دوسرے ترجموں کے مقابلہ میں بہت اچھا ہے۔

(۷) کازیمیرسکی کے ترجمہ پر نظر ثانی کر کے پوتیے (G. Pauthier) نے ایک اڈیشن شائع کیا۔

(۸) ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۶ء) میں مارسل (J.J. Marcel) کے ترجمے کرنے کا ذکر ملتا ہے مگر اشاعت کا پتانہیں چلتا۔

(۹) اسی طرح ایک اور مارسل (Citoyen Marcel) نے مختلف آیات اور سورتوں کا منظوم ترجمہ کیا۔ یہ بھی میری نظر سے نہیں گزرا۔

اس کے علاوہ بعض اور ترجموں کے حوالے ملتے ہیں، مثلاً

(۱۰) گالان (Gallant) نے ایک ترجمہ کیا۔ لیکن اس کی اشاعت سے پہلے فوت ہو گیا۔ اس کا مسودہ لاپتا ہے۔

(۱۱) لبلوا (Le leblois) نے اپنی فرانسیسی کتاب ''قرآن اور عبرانی بائبل'' میں نمبر ۵۷

تا ۶۵ کی سورتوں کا ترجمہ شائع کیا ہے۔

(۱۲) سینٹ ہیلیر (St. Hilaire) نے بھی اقتباسات شائع کیے (جیسا کہ امریکی مشنری رسالہ مسلم ورلڈ نے ۱۹۲۷ء میں بیان کیا ہے)۔

(۱۳) پاریس کے کتب خانہ عام میں مخطوطہ نمبر ۴۶۸ بھی قرآن مجید کا فرانسیسی ترجمہ کہا جاتا ہے۔ مگر اس کی تحقیق میں نہ کر سکا اور ذیل کے جدید تراجم سے میں خود واقف ہوں۔

(۱۴) ژبوت (CH. Gillotte) کے الجزائر کے شہر عنابہ میں ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء) میں فقہ اسلامی پر جو کتاب چھاپی ہے اس میں قرآن مجید کے اقتباس بھی ہیں۔

(۱۵) فاطمہ زاہدہ (Zaida) نے Lakoran کے نام سے فرانسیسی میں ایک کتاب لزبن (پرتگال) میں ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) میں شائع کی ہے۔ مولفہ اپنے کو مسلمان کہتی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اس فرضی نام سے بعض مکاروں نے گپ شپ پر مشتمل ایک کتاب چھاپی ہے۔ سوائے سورہ فاتحہ کے اس میں کوئی اور قرآنی سورت مجھے نظر نہ آئی۔

(۱۶) جنیوا (سوئٹزرلینڈ) کی یونیورسٹی کے قیم (رکٹر) دوار مونتے (Edquard Montet) نے پاریس میں ۱۳۴۴ھ (۱۹۲۵ء) میں ایک ترجمہ شائع کیا، اگرچہ یہ ترجمہ ابتک تین بار چھپ چکا ہے لیکن اتنا ناقص ہے کہ نا قابل اعتنا ہے۔

(۱۷) ماردروس (J.C. Mardrus) نے ۱۳۴۵ھ (۱۹۲۶ء) میں باسٹھ سورتوں کو پاریس میں Chapitres Du Coran کے نام سے شائع کیا۔

(۱۸) دو الجزائری مسلمانوں احمد الاعمش اور ابن داؤد نے دہران (الجزائر) میں ۱۳۵۰ء (۱۹۳۱ء) میں ایک ترجمہ چھاپا جو بہت مقبول ہے۔

(۱۹) پیل (O. Pesle) جو غالباً نومسلم تھے اور احمد تیجانی نے مل کر پاریس میں ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۶ء) میں ایک ترجمہ شائع کیا جس کے تین اڈیشن نکل چکے ہیں، یہ ترجمہ بُرا نہیں ہے۔

(۲۰) ریژی باشیر (Regis Blachere) آجکل جامعۂ پاریس میں عربی کے پروفیسر

ہیں، انہوں نے ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۶ء) تا ۱۳۷۱ھ (۱۹۵۱ء) میں ایک ترجمہ شائع کیا جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۷ء) میں شائع ہوا ہے۔

(۲۱) آں ری پے ریس (Henri Peres) نے الجزائر میں ۱۳۷۱ھ (۱۹۵۱ء) میں سورہ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کا ترجمہ طلبہ کی تدریسی ضرورتوں کے لیے چھاپا ہے۔

(۲۲) ترکی عالم محمود مختار پاشا نے حکمت قرآنی (Sagesse Coranique) کے نام سے پاریس میں منتخبات قرآنی کا ترجمہ شائع کیا ہے۔

(۲۳) قدیرہ (Ghedira) ایک تونسی مسلمان نے فرانس کے شہر لیون میں ۱۳۷۶ھ (۱۹۵۶ء) میں ایک ترجمہ اہتمام سے آرٹ پیپر پر چھاپا ہے۔

(۲۴) آں ری مرسیے (Henri Mercier) نے مراکش کے شہر رباط میں ۱۳۷۶ھ (۱۹۵۶ء) میں منتخبات قرآنی مع ترجمہ شائع کیے ہیں۔ اس میں عربی متن کو عربی خط کے علاوہ لاطینی خط اور موسیقی کی صوتی علامات میں بھی نقل کیا ہے اور چند مہمل اور بھونڈی تصویریں بھی ایک بد بخت مسلمان کی طرف منسوب کر کے درج کی ہیں۔

(۲۵) بشیر الدین محمود احمد امیر جماعتِ قادیان نے بھی ایک ترجمے کا اعلان کیا تھا مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ چھپا یا نہیں۔

(۲۶) راقم الحروف ناچیز کا ترجمہ، پاریس ۱۳۷۹ھ (۱۹۵۹ء)۔

آخر الذکر ترجمے کی سرگزشت:

۱۳۷۷ھ (۱۹۵۷ء) کی بات ہے کہ ایک دن کسی اجنبی نے دروازے پر گھنٹی بجائی، معلوم ہوا کہ رتینے نامی نشریات کے مالک ہیں، کہنے لگے کہ میں قرآن مجید کا عربی متن اور ترجمہ چھاپنا چاہتا ہوں اور پروفیسر مسینیوں نے آپ کا پتا دیا ہے اور یہ فرمایش کی کہ میں ساواری (مذکور الصدر نمبر ۳) کے ترجمہ کی نظرثانی کر دوں۔ دو ہفتوں کے بعد اس کا نمونہ لے گیا اور آج تک پھر اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی۔

اس کے چند ماہ بعد ایک اور کمپنی Club Francais Du Livre کے ڈائرکٹر نے

Marfat.com

پروفیسر ماسینیوں کے ہی حوالہ سے ملاقات کی اور کہا، ہم نے حال ہی میں بائبل کا ایک نیا ترجمہ شائع کیا ہے، جو مقبول ہوا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ قرآن مجید کا بھی ایک نیا فرانسیسی ترجمہ شائع کریں۔ میں نے کہا کہ اگر کوئی فرانسیسی ایک اجنبی کے ترجمے میں ''بوئے کچوری می آید''، کہنے لگے، معیاری ترجمہ تو وہی ہوتا ہے جو کوئی ایسا فرانسیسی ادیب کرتا جو عربی پر بھی عبور رکھتا اور مسلمان بھی ہوتا۔ مگر یہ چیز عنقا ہے۔ اس لیے اس کا حل یہی ہے کہ ایک عربی دان مسلمان اور ایک فرانسیسی ادیب اشتراکِ عمل سے ترجمہ کریں اور ہم آپ کو ایسا آدمی مہیا کریں گے۔

میرے لیے یہ بڑی سعادت تھی۔ اس کا معاوضہ بھی کافی ملا، مگر میں نے یہ پوری رقم یہاں کی اسلامی انجمن ''مرکز ثقافت اسلامی'' کو دیدی، صفر ۱۳۷۷ھ میں معاہدے پر دستخط ہو گئے اور یہ شرط قرار پائی کہ اٹھارہ مہینوں میں ترجمہ پورا کر دیا جائے۔

میں نے پارلیس اور استانبول میں کام جاری رکھا اور میرے مسودے پر ''تمت بحمد اللہ'' پارلیس ۲۰ / صفر ۱۳۷۸ھ اور ٹائپ شدہ مبیضے پر ایک ماہ بعد کی تاریخ ۷ / ستمبر ۱۹۵۸ء درج ہے۔

جیسے جیسے کام ہوتا گیا اپنے رفیق کار موسیو لیتورمی کو بھیجتا رہا، وہ ترمیم کر کے واپس کرتے رہے۔ نظر ثانی میں بھی اسی طرح ان کو بھیجتا رہا، اس کے بعد ان کے مسکن شہر روبے (Roubaix) میں جا کر دسمبر ۱۹۵۸ء اور جنوری ۱۹۵۹ء میں چند ہفتوں تک پاس قیام کر کے شروع سے آخر تک مکرر تصحیح کر کے ناشر کے سپرد کر دیا گیا اور انتظامی مراحل کے گزرنے کے بعد ۱۹۵۹ء میں کمپوز ہونا شروع ہو گیا اور سات سو صفحے کے پروف ایک ماہ میں مل گئے۔ اکتوبر میں طباعت اور جلد بندی ہوئی اور یکم نومبر کو شائع ہو گیا۔ بعون اللہ وفضلہ۔

اس ترجمہ کی بعض خصوصیتیں یہ ہیں:

اس کی طباعت دو رنگی ہے، ترجمہ الگ رنگ میں ہے اور حواشی الگ رنگ میں، تاکہ باطنی تقدس کے ساتھ ظاہری حسن سے بھی آراستہ ہو، حواشی میں اس کی کوشش کی گئی ہے کہ جہاں کہیں توریت، انجیل، زبور کے حوالے ہیں یا قرآنی قصے ان کتابوں میں

ہیں، ان کے مکمل حوالے دیے گئے ہیں۔ حجاب اور تعدد زوجات وغیرہ کے احکام میں توریت وانجیل کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔ "وانہ لفی زبرالاولین" کے سلسلے میں حضرت ادریس سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہما السلام تک کے اقوال اور پارسی اور ہندو کتب مقدسہ کے مکمل حوالے ہیں اور دوسرے جو فوائد ذہن میں آئے وہ بھی درج کیے گئے ہیں۔

شروع میں پچاس ساٹھ صفحوں کا ایک مقدمہ ہے، اس کی اہم ذیلی سرخیاں یہ ہیں:

قرآن کا مولف۔

الہام ربانی کا مفہوم مختلف ملتوں میں۔

نزولِ وحی کی کیفیت۔

قرآن وحدیث کا فرق۔

قرآن کا اسلوبِ بیان اور اس اسلوب کا مقصد۔

مندرجاتِ قرآنی۔

قرآن میں یہودیوں سے زیادہ خطاب کیوں ہے۔

قرآنی تصورِ حیات اور اقسامِ احکام۔

عورت کا ذکر قرآن میں۔

غلامی اور قرآن۔

سیرتِ نبویہ قرآن کی روشنی میں۔ اس سے قرآنی اشاروں کا تاریخی پس منظر سمجھ میں آجاتا ہے۔

قرآن مجید کی تدوین کی تاریخ۔

ترتیب آیات وسورت ہائے قرآنی۔

عربی خط اور اعراب اور دیگر علاماتِ تحریری۔

قرآن کے نسل بہ نسل تحفظ کا دہرا طریقہ یعنی تحریر وحفظ۔

صحتِ متن کے لیے استاذ سے سماع اور اجازت۔

اختلاف روایات۔

Marfat.com

مسئلۂ تنسیخ و تبدیل۔

تجوید و تلاوت۔

تراجم قرآنی، جن کا آغاز صحابۂ کرام نے فرمایا۔

تاریخ (مسلمان مترجمین اور غیر مسلم مترجمین)۔

ایک نئے فرانسیسی ترجمے کی ضرورت۔

یورپی زبانوں میں تراجم قرآنی کی مکمل فہرست۔

کتاب میں جغرافیۂ قرآنی اور مشاعرِ حج کے متعدد نقشے بھی ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

(معارف اعظم گڑھ۔ دسمبر ۱۹۵۹ء)

Marfat.com

ایلاف

جاہلیت میں عربوں کے معاشی وسفارتی تعلقات

کلیۂ ادبیات، جامعۂ استانبول
عرصہ ہوا سورۂ ایلاف کی تفسیر میں نے فرانسیسی میں شائع کی تھی، اب اس کا اُردو ترجمہ جو میں نے ہی کیا ہے، کراچی کے موقر رسالہ ''البلاغ'' کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں تاکہ اگر پسند آئے تو شائع فرمادیں۔ محمد حمید اللہ ۲۳ ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ

شہر مکہ کی تاسیس اور آغاز:

اہل مکہ کی روایتیں کہتی ہیں کہ اس شہر کا آغاز حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوا، (جو تقریباً اٹھارہ سو سال قبل مسیح پیدا ہوئے تھے) شخصی اسباب کی بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی حاجرہ اور دودھ پیتے بچے اسماعیل علیہ السلام کو وادی بکہ (قرآن سورہ ۳، آیت ۹۶) میں لا چھوڑا اور وہیں رفتہ رفتہ شہر مکہ آباد ہوا، یہ مقام اس وقت غیر آباد تو رہا ہو سکتا ہے لیکن قطعاً بے آب و گیاہ اور ناقابل رہائش بہرحال نہ تھا (سیرۃ ابن ہشام، طبع یورپ، صفحہ ۷۱-۷۲) غیر آباد ہونے کے باعث وہاں زراعت نہ ہوتی تھی (قرآن کریم سورہ ۱۴، آیت ۳۷: ''وادٍ غیر ذی زرع'' مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وہاں آبادی کے امکانات اور انسانی زندگی کے ضروری عناصر نظر آئے ہوں گے جبھی تو انہوں نے (مکہ کی قدیم ترین تحریری تاریخی دستاویز یعنی قرآن مجید سورہ ۱۴، آیت ۳۵ تا ۳۷، نیز سورہ ۲، آیت ۱۲۶ کے مطابق) دعا فرمائی۔

Marfat.com

> ''اور جب ابراہیم نے کہا: اے میرے رب، اس مقام کو پُر امن بنا، اور مجھے اور میرے بچوں کو بت پرستی سے بچا...... اے میرے رب میں نے اپنی نسل کے ایک حصے کو ایک زراعت سے خالی وادی میں لا بسایا ہے جو تیرے حرام بنائے ہوئے گھر کے پاس ہے، تاکہ اے ہمارے رب وہ نماز قائم کریں پس ایسا کر کہ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہوں اور انہیں میووں کا رزق عطا فرما، شاید وہ شکر ادا کیا کریں گے۔''

عربی ماخذوں سے پتا چلتا ہے کہ اس وادی بکہ کے آس پاس کے علاقے میں عرب باشندے خانہ بدوش ہی سہی، رہتے تھے۔ ان کا تعلق بڑے اور طاقتور قبیلہ عمالقہ سے تھا (جیسا کہ ابن ہشام صفحہ ۳۹ نے ابن الزبعری کی بیت کو نقل کرتے ہوئے بتایا ہے، نیز دیکھو سہیلی کی الروض الانف جلد اول صفحہ ۵۱) یہ وہی عمالقہ ہیں جن کی ایک شاخ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مصر سے خروج سے قبل فلسطین میں بس چکی تھی۔ یہودیوں نے ان کو وہاں سے نکال کر خود بسنا چاہا، عمالقہ نے حفاظت ذاتی میں مقاومت کی اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کے یہودیوں نے ان بیچاروں کو بائبل میں جتنا کوسا اور بدنام کیا ہے اور ان کو اور انکی عورت، بچوں اور شیر خواروں ہی کو نہیں جانوروں تک کو جس بے دردی سے نیست و نابود کرنے کا حکم دیا ہے (دیکھو توریت کی کتاب تثنیہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کئی سو سال بعد کی تالیف ہے، باب ۲۰ جملہ ۱۶۔ نیز اشموئیل اول ۳/۱۵) وہ انسانی تاریخ کا سب سے شرمناک واقعہ کہا جا سکتا ہے، لیکن اس سے ہمیں یہاں بحث نہیں۔

مذکورہ عربی ماخذوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی عرب کے قبائل میں سے ایک یعنی جرہم کے کچھ لوگ وادئ مکہ میں سے گزرے اور وہاں پینے کا پانی افراط سے چشمے کی صورت میں دیکھا .... جو اب زمزم کا کنواں بن گیا ہے .... نیز ایک جنگل موجود پایا (ابن ہشام صفحہ ۷۱-۷۲) اور ممکن ہے جانوروں کے لیے چراگاہ بھی

Marfat.com

پائی ہو، اس پر وہ وہیں ٹھہر گئے۔ اگر حضرت ہاجرہ کو اپنی تنہائی میں اس قبیلے کی آمد غنیمت معلوم ہوئی تو جرہمیوں کو بھی چشمے کی مالک حضرت ہاجرہ نے وہاں بسنے کی اجازت دی تو شکر گذاری محسوس ہوئی، چنانچہ انہوں نے بی بی اور ان کے ننھے بچے کو اپنی حفاظت اور مہمان نوازی میں لے لیا، جرہمیوں کے دوسرے رشتہ دار خاندان بھی رفتہ رفتہ وہاں آ کر بسے۔ اور بستی وفاقی دستور کا ایک شہر یا ایک شہری مملکت بن گئی۔ اس لامرکزیت کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کنبوں میں اس بات پر اتفاق نہ ہو سکا کہ شہری زندگی سب لوگ ایک ہی ادارے کے تحت گزاریں۔ ابن ہشام (حوالۂ بالا) کے مطابق جُرہم قبیلہ اپنے سردار مُضاض بن عمرو کے ساتھ مَعلات (بالائی رقبے) میں بسا اور ان کا رشتہ دار قبیلہ قطوراء، جس کا سردار سُمیداع تھا مسفلہ (زیرین رقبے) میں قیام پذیر ہوا۔ جو کوئی شمالی راستے سے شہر میں آتا تو اس سے مُضاض عُشر (چنگی) وصول کرتا اور جو جنوبی راستے سے آتا وہ عُشر سُمیداع کو ادا کرتا، کچھ عرصہ بعد ان دونوں قبیلوں میں برادر کشی اور جنگ کا بھی پتا چلتا ہے جس پر کسی کو حیرت نہ ہونی چاہیے۔

مگر اتنے قدیم عہد میں اس شہری مملکت کے "سفارتی" تعلقات کے سلسلے میں معلومات اور تفصیلوں کی تلاش بے سود ہوگی۔

جو بھی ہو، کہتے ہیں چند سال بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام وہاں دوبارہ آئے، تا کہ اپنے بیٹے اسماعیل کو جو اب ایک نوجوان لڑکا تھا، دیکھیں۔ قرآن مجید (سورہ ۲، آیت ۱۲۷ و مابعد) کی شہادت کے مطابق حضرت اسماعیل علیہ السلام کی مدد سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہاں ایک عبادت گاہ تعمیر کی۔ یہ ایک سادہ مکعب کوٹھڑی تھی، جو اب کعبے کے نام سے مشہور ہے۔ اسے آپ نے "بیت اللہ" کا نام دے کر خدائے واحد کی عبادت سے مخصوص کیا، قرآن مجید (سورہ ۳، آیت ۹۶) نے اسے "اوّل بیتٍ وُضعَ للناس" (پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا) قرار دیا ہے، اور یہ بیت المقدس سے کہیں قدیم تر ہے (جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنایا) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبے کے سلسلے میں حج کا بھی حکم دیا کہ لوگ ہر سال عبادت کے لیے اس کی زیارت کو آئیں۔ آس پاس کے لوگ بھی وہاں کشاں کشاں آنے لگے (کوئی عبادت

کے لیے تو کوئی تجارت کے لیے) اور اس طرح شہر کی اہمیت روز بروز بڑھتی ہی گئی۔

اس کا سلسلہ صدیوں جاری رہا، اس اثنا میں بڑے بھی وہاں آ کر ادب سے سر جھکاتے رہے چھوٹے بھی۔ اگر وہاں عرب کے مختلف علاقوں کے "بادشاہ" نظر آتے ہیں تو اجنبی بھی ملتے ہیں، عرب مورخوں (شرح بخاری للعینی ج ۷، ص ۳۶۵، نیز اخبار مکۃ للازرقی، وکتاب التیجان لابن ھشام، برموقع) کو یقین ہے ان اجنبی زائروں میں افسانہ خیز بادشاہ ذوالقرنین (یعنی دو سینگوں والا) بھی شامل تھا۔ اگر اس سے مراد سکندر اعظم ہے تو یونانی تاریخوں میں سکوت ملتا ہے، اگرچہ اس کا مصر سے ہندوستان جاتے ہوئے حجاز سے گزرنا ناممکن نہیں، خاص کر اس بت پرست اور اوہام پسند بادشاہ کے لیے مکے کی عبادت گاہ اتنی مشہور تھی کہ پرانے یونانی جغرافیہ نگار بھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً بطلیموس (جغرافیہ کتاب ۴، باب ۷، فصل ۳۲) اس کو مقربہ (MACORABA) کے نام سے یاد کرتا ہے۔ خوری حطی (کی انگریزی ہسٹری آو دی عربس، طبع ۱۹۵۱ء ص ۱۰۳ میں) لکھا ہے، سبائی زبان میں اس لفظ کے معنے عبادت گاہ کے ہیں (غالباً اس لفظ کو عربی لفظ مُقَرّب سے ربط ہے جو قُرب اور قربان گاہ کے معنے رکھتا ہے یعنی بھینٹ چڑھانے کی جگہ: کعبے کے پاس ایسا ہوا بھی کرتا تھا) اس سے اس روایت کی توثیق ہوتی ہے کہ یمنی قبیلہ جُرہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام واسمٰعیل علیہ السلام کے زمانے میں مکہ آباد کیا تھا، جہاں تک ذوالقرنین کا تعلق ہے مقدونیہ والا سکندر اعظم ایک مینڈھے کی پوجا کیا کرتا تھا اور اس کی سینگیں بطور علامت کے ٹوپی پر لگا کر پہنتا تھا، یہ رواج مقدونیہ (یوگوسلاویہ) میں اب تک رہا ہے اور وہاں کے حکمران عیسائیت کے باوجود دو سینگوں والی ٹوپی درباری مراسم کے وقت پہنتے رہے ہیں، عربوں نے سکندر اعظم اور اس کے ساتھیوں کو اس لباس میں دیکھا تو ذوالقرنین سے بہتر نام اسے اور کیا دیا جا سکتا ہے! مصر میں سکندر اعظم کے جو کتبے ہیں ان سے اس لباس اور اس کے مفہوم کی پوری توثیق ہوتی ہے۔ عبدالمطلب کے زمانے میں کعبے کی آرائش جن قدیم اور قیمتی چڑھاووں سے کی جاتی تھی ان میں دو سینگوں والے سنہری کبش (مینڈھے) کے سر کا بھی ذکر آتا ہے (اخبار مکۃ للازرقی، ص ۱۱۱، سنن ابی داؤد، ۱۱/ ۹۵)۔

Marfat.com

معلوم نہیں ایرانی بادشاہ ساسان کبھی شخصاً مکہ آیا تھا یا نہیں، مگر سہیلی (الروض الانف ۱/ ۹۷) نے لکھا ہے کہ جب خُزاعہ قبیلے نے حملہ آوری کر کے جُرہُم کو مکہ سے نکال باہر کیا تو جرہمیوں نے کعبے کے چڑھاووں کا خزانہ زمزم کے کنوئیں میں ڈال کر اسے پاٹ دیا تھا، عبدالمطلب نے جب زمزم کا خواب میں نشان پا کر اس کو دوبارہ کھودا تو اندر سے خزانہ بھی برآمد ہوا، اس میں دو سنہری ہرنیں اور چند "قلعی" تلواریں بھی تھیں جو ایرانیوں کے بادشاہ ساسان نے کعبہ کو تحفہ دی تھیں۔ بعض روایتوں میں یہ بادشاہ شاہپور کی فرستادہ چیزیں ہیں۔

مختلف خانوادے:

جرہمیوں کے علاوہ جنکا اوپر ذکر آیا مورخوں کا بیان ہے کہ مکے پر قبیلۂ ایاد نے بھی حکمرانی کی ہے (انساب الاشراف للبلاذری جلد اول، ص ۵۱) پھر انہوں نے خزاعہ قبیلے کے لیے اپنی جگہ خالی کی۔ اس عہد کے متعلق زیادہ حالات معلوم نہیں، لیکن جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے قُصَیؒ نے خُزاعی سردار کی بیٹی سے نکاح کیا تو یہ ایک تاریخی زمانے سے تعلق رکھتا ہے جس کا ٹھیک عصر بھی معین کیا جا سکتا ہے۔ خسر کے انتقال پر قُصَی نے وہاں سرداری حاصل کر لی۔ قُصَی کی ماں شمالی عرب کے قبیلہ قضاعہ سے تعلق رکھتی تھی، ابن حبیب (کتاب المنمق، طبع حیدرآباد دکن، ص ۲۷۶) کا بیان ہے کہ اس تبدیلی حکومت کے زمانے میں قضاعہ اور ان کے حلیف اسد کے قبیلوں نے مسلح فوج بھیج کر قصی کی حمایت کی تھی۔ ابن حبیب کے شاگرد ابن قتیبہ (کتاب المعارف، طبع یورپ، ص ۳۱۳) کے مطابق تو قیصر روم (بیزنطینی حکمران) نے قصی کی مدد کی تھی۔ اس زمانے میں پہلا تھیوڈوس (۳۷۹ تا ۳۹۵ء) بادشاہ تھا۔ اس زمانے میں رومی سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے اور قسطنطنیہ کے مشرقی رومیوں (بیزنطینیوں) نے روما کے مغربی رومیوں سے خودمختاری اختیار کر لی تھی، ممکن ہے قصی کی مدد سے تھیوڈوس کا منشا اپنے اقتدار کو مضبوط تر بلکہ وسیع تر کرنا بھی ہو۔

جو بھی ہوا ہو، قصی نے بلدی زندگی کی نئی تنظیم کی اور مکے کی شہری مملکت میں

Marfat.com

متعدد ادارے کارفرمائی کرنے لگے جن میں سے بعض صراحت کے ساتھ قصی کی ایجاد ہونا بتائے گئے ہیں۔ (مثلاً باشندوں پر رفادہ کے نام سے ایک سالانہ ٹیکس عائد کیا جاتا)۔

مکے کی حکومت:

ہر دیگر مملکت کی طرح مکے کی شہری مملکت بھی خودمختار تھی اور اندرونی اور بیرونی اقتدار اعلیٰ سے بہرہ ور تھی۔ چنانچہ وہ اجنبیوں سے معاہدے کر سکتی اور کسی اور اجنبی اقتدار کی ماتحتی کے بغیر ان سے امن یا جنگ کے تعلقات رکھ سکتی تھی۔

ہم یہاں صرف سفارتی اور اجنبی تعلقات سے بحث پر اکتفا کریں گے۔ اس سلسلے میں وہاں ایک موروثی عہدہ دار (وزیر) ''سفیر ومُنافر'' کے نام سے پایا جاتا تھا۔ اس کا پتا نہیں چلتا تھا کہ کس تاریخ سے اس ادارے کا آغاز ہوا، لیکن زمانۂ ماقبل اسلام کے متعلق پرانے مورخوں نے بعض معلومات محفوظ رکھی ہیں۔ چنانچہ ابن عبدربہ (فوت ۳۲۸ھ، ۹۴۰ء) نے العقد الفرید (طبع بولاق ۱۲۹۳ھ، جلد دوم، ص ۴۶) میں اور المقریزی (ف ۸۴۵ھ، ۱۴۴۲ء) نے الخبر عن البشر (مخطوطۂ مصر جلد چہارم، ص ۸۸ تا ۹۰) میں ...... اور ان میں سے اول الذکر نے ابن الکلبی کے حوالے سے ...... بیان کیا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں مکے میں اعیانی حکومت تھی جس میں دس موروثی سرداروں کی مجلس کارفرمائی کرتی تھی۔ وزیر خارجہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ مورخ لکھتے ہیں کہ ''اگر کوئی جنگ چھڑتی تو (حضرت) عمر بن الخطاب کو سفیر بنا کر بھیجا جاتا، اگر کسی اور قبیلے سے فضیلت اور برتری منوانے کے لیے منافرت کی ضرورت پیش آتی تو اس کے لیے بھی قریش عمر بن الخطاب کو اپنا مُنافر بنا کر بھیجتے اور یہ نمائندہ جو بھی کہتا قریش اسے قبول کر لیتے''۔ سارے مؤلف اس پر متفق ہیں کہ اس مجلس حکومت میں دس افسر ہوا کرتے، یہ کہ اسلام کی آمد تک اس کا سلسلہ جاری رہا اور یہ کہ سفیر ومنافر کے عہدے پر اسلام سے عین ماقبل حضرت عمر مامور تھے۔

الازرقی نے اپنی مشہور تاریخ (اخبار مکہ، طبع یوروپ ص ۱۰۷) میں بیرونی تعلقات کے متعلق ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ یہ کہ ایک مرتبہ خانۂ کعبہ میں آگ لگی

Marfat.com

جس سے دیواریں کمزور ہوگئیں، پھر جب ایک موسلادھار بارش ہوئی تو دیواریں گر پڑیں اور دوبارہ تعمیر کی ضرورت پیش آئی۔ اس طوفان سے سمندر بھی محفوظ نہ رہا اور ایک رومی (بیزنطینی) جہاز جو سامان لے کر (مصر سے) یمن جا رہا تھا، شعیبہ (موجودہ جدہ) کے سامنے خشکی پر چڑھ گیا، خبر ملی تو مکے والے وہاں گئے اور جہاز کا جو سامان بچ سکا تھا خاص کر لکڑی کے تختے خرید لیے اور جہاز والوں کو اجازت دی کہ مکہ آئیں اور بچا کھچا سامان وہاں بیچیں اور انہیں عُشر (محصول درآمد) بھی معاف کر دیا، ورنہ عادت یہ تھی کہ رومی تاجر مکہ آئے تو ان سے وہاں عُشر (دس فیصد چنگی) وصول کیا جائے جس طرح کہ رومی اپنے علاقہ میں مکی تاجروں سے وصول کرتے تھے۔'' یہ ۶۰۵ء کا واقعہ ہے جبکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پینتیس (۳۵) سال کی تھی اور اس میں شبہ نہیں کہ مکی قانون بین الممالک کا خاصا قدیم قاعدہ تھا۔

یہاں ایک اور واقعے کا ذکر کیا جا سکتا ہے جسے کسی قدر اہمیت حاصل ہے، وہ یہ کہ قدیم زمانے میں مکہ مشرق و مغرب کی بین الممالک تجارت کی شاہراہ پر واقع تھا۔ یمن بلکہ خود ہندوستان کی پیداوار شام اور قسطنطنیہ جانے کے لیے مکے سے گذرتی تھی۔ اس عبور و مرور کے لیے ہر مقام (بشمول مکہ) کے لوگوں کی اجازت ناگزیر تھی۔ اسی طرح عرب بھی (بشمول اہل مکہ) تجارت کے لیے بیرونی ممالک کا سفر کیا کرتے تھے، اور سر برآوردہ لوگ جہاں بھی جاتے وہاں کے اعلیٰ افسروں سے ضرور ملتے تھے۔ خاص کر شاعر بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہوتے اور مدح و ستائش کے قصیدے گاتے۔ ابن عبد ربہ وغیرہ کی کتابوں میں ''وفادات'' پر مستقل باب بھی ہیں کہ کس طرح مختلف عرب افراد بیرونی حکمرانوں کے ہاں باریاب ہوتے رہے۔ اس سلسلے میں مکہ کے سر برآوردہ لوگ حبش کے نجاشی، فارس کے کسریٰ، مصر کے گورنر، یمن، غسان (شام) اور حیرہ (عراق) کے بادشاہوں وغیرہ کے ہاں حاضر ہوتے نظر آتے ہیں۔

اس طرح کی ایک سفارت قبل اسلام کی عربی تاریخ میں بڑی مشہور ہے۔ اسے ایلاف کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر کثیر مواد کے باوجود، مشرق میں ہو کہ مغرب میں، کسی نے اب تک توجہ نہیں کی یہاں اسی کا کچھ ذکر مطلوب ہے۔

Marfat.com

ایلاف:

سب سے پہلے یہ یاد دلانا ہے کہ قرآن مجید میں ایک چھوٹا لیکن پورے کا پورا سورہ اس موضوع پر ہے جسے کبھی سورۂ قریش اور کبھی سورۂ ایلاف کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

رحمان اور رحیم اللہ کے نام سے!

۱۔ قریش کے ''ایلاف'' کے باعث،

۲۔ ان کے ''ایلاف'' کے باعث سرما اور گرما کا کارواں چلتا ہے۔

۳۔ پس چاہیے کہ وہ اس گھر (کعبہ) کے آقا کی عبادت کریں۔

۴۔ جس نے بھوک پر انہیں کھانا کھلایا۔

۵۔ اور خوف پر انہیں امن مہیا کیا ہے۔

(سورہ ۱۰۶، آیات ۱ تا ۵)

سورے میں مذکورہ اس ''ایلاف'' سے کیا مراد ہے؟ اولاً ایک پرانے واقف کار مورّخ ابن حبیب (فوت ۲۴۵ھ) کی طرف رجوع کریں، وہ اپنی کتاب المحبر، ص ۱۶۲ میں) بیان کرتا ہے کہ "ایلاف العھود" (یعنی ایلاف کے معنی معاہدوں کے ہیں)، سہیلی نے (اپنی سیرت نبوی الروض الانف، ۱/ ۲۸ میں) اس کی تائید کی ہے، اور مختلف شواہد سے استناد کیا ہے۔ لغت نویسوں کو بھی اس سے انکار نہیں۔ ایلاف کا مادہ ''الف'' الفت اور دوستی کے معنے رکھتا ہے اور اس کا فعل متعدی یعنی ایلاف دوستی کرانے، اور الفت پیدا کرنے کے معنے رکھ سکتا ہے۔ لسان العرب اور تاج العروس جیسی بڑی اور مستند لغتوں میں مادہ الف کے تحت مزید برآں یہ بھی صراحت ہے کہ ''قرآن مجید میں آئے ہوئے لفظ ایلاف کے معنے معاہدوں اور سمجھوتوں کے ہیں'' لیکن بطور اسم علم کے ایلاف کا اطلاق ان معاہدوں پر ہوتا ہے جو چند سرآوردہ اہل مکہ نے ہمسایہ حکمرانوں سے طے کیا تھا (جن کی تفصیل نیچے آتی ہے)۔ ایلاف کے اس مفہوم کی مزید توثیق اس طرح بھی ہوتی ہے کہ ان ایلاف نامی معاہدوں کو بعض مؤرخوں نے عصم اور عہود کے نام سے اپنی کتابوں میں

ذکر کیا ہے۔ ان الفاظ کے بھی معنے ہیں معاہدے، یا اطمینان دہانیاں۔

ان معاہدوں کا قصہ:

تاریخ یعقوبی (۱/۲۷۰ تا ۲۸۲) میں لکھا ہے: اہل مکہ مصیبت زدہ تھے اور ان کے تاجروں کا کاروبار حدود شہر سے باہر نہ جاتا تھا۔ ایک سال قحط پڑ کر حالت ابتر ہو گئی تو ہاشم (آنحضرتؐ کے دادا) نے تجارت کے لیے شام کا سفر کیا، کارواں کے سردار کے اچھے طرزِ عمل کی اطلاع قیصر روم تک پہنچی، وہ فیاض، مہمان نواز اور دیگر اچھے اخلاق کا حامل ہے۔ اپنے استعجاب کی تشفی کے لیے قیصر نے ہاشم کو حضور میں طلب کیا اور گفتگو کے بعد اسے اجازت دی کہ تجارتی کارواں شام لایا کرے اور وہاں اپنے ملک کی پیداوار بیچے، مثلاً حجاز کے چمڑے اور یمن کے کپڑے، سفر واپسی میں ہاشم نے شام سے مکے تک راستے میں پڑنے والے قبیلوں سے (عبور و مرور کی سلامتی کے) معاہدے کیے .... یعقوبی نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ ہاشم نے ایک مماثل معاہدہ حبش کے نجاشی سے بھی کیا، پھر ہاشم کی وفات پر (اس کے بھائی) عبد شمس نے حبش کا سفر کیا کہ اس اجازت نامے کی تجدید کرائے۔

ایک اور مورخ ابن حبیب نے اپنی کتاب (المنمق ص ۳۱ تا ۴۰ باب "حدیث الایلاف") میں اس کی مزید تفصیلیں دی ہیں اور الکلبی کے حوالے سے ہاشم اور قیصر کی گفتگو نقل کی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ ہاشم نے قیصر سے کہا کہ اگر حجازی پیداوار خود لا کر بیچے تو (درمیانی واسطے نہ ہونے کی وجہ سے) وہ تمہیں سستی پڑ یگی" (فھو أرْخَصُ عَلَيْكُمْ) قیصر کی اجازت ملنے پر ہاشم مکہ واپس آیا ایک بڑا تجارتی کاروان تیار کیا اور شام لے گیا۔ ابن حبیب لکھتا ہے کہ اس دوسرے سفر کی اثنا میں ہاشم نے شہر غزہ میں (جو عرب کے انتہائی شمال میں علاقہ فلسطین میں بحر متوسط پر واقع ہے) وفات پائی اور اسے وہیں دفن بھی کر دیا گیا۔ یہ کہ ایک مماثل مقصد کے لیے ہاشم کے بھائی المطلب نے یمن کا سفر کیا اور رَدمان (یمن) میں وفات پائی: تیسرا بھائی نَوفل کارواں لیکر عراق گیا کیونکہ کسریٰ ایران نے اسے اس کی اجازت دی تھی۔ نوفل کی وفات سلمان

Marfat.com

(عراق) میں ہوئی: صرف چوتھا بھائی عبدشمس حبش کے کاروان سفروں کے باوجود اپنے گھر میں فوت ہوا اور مکے میں دفن کیا گیا، شاعر مطرود الخزاعی نے اس کا ذکر اپنے مرثیے میں یوں کیا ہے (ترجمہ از عربی):

ایک قبر سلمان میں، ایک قبر۔
رَدمان میں اور ایک قبر غزات (غزہ) میں۔
اور ایک جس کی وفات
حجون کے قریب شنیات کے مشرق میں ہوئی۔

طبقات ابن سعد (طبع یورپ جلد اول، حصہ اول ص ۴۳ تا ۴۶) میں کئی ماخذوں کی مدد سے تفصیل دی گئی ہے، چنانچہ الکلبی کے مطابق سب سے بڑے بھائی المطلب نے نجاشی حبش سے، ہاشم نے شام کے ہرقل سے .... (گویا ہرقل رومی شہنشاہوں کا لقب ہو)، نوفل نے کسریٰ عراق سے اجازت حاصل کی کہ ان کے علاقوں میں تجارتی کارواں لایا کریں۔ ابن عباس کی روایت کے مطابق سردیوں میں کاروان یمن جاتے اور گرمیوں میں غزہ بلکہ انقرہ تک چلے جاتے۔ آگے چل کر ابن سعد نے لکھا ہے کہ قیصر نے نہ صرف ہاشم کو رومی علاقے میں کارواں لانے کی اجازت دی، بلکہ ایک سفارشی خط نجاشی کے نام بھی دیا جس میں حبش کے بادشاہ سے سفارش کی تھی کہ وہ بھی مکی تاجروں کو مماثل اجازت دے، ابن سعد نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہاشم نے راستے پر پڑنے والے قبیلوں سے بھی معاہدے کیے جن میں یہ قرارداد تھی کہ ان قبیلوں کا سامان قریش رومی منڈیوں تک خود مفت لیجائیں گے اور جو قیمت وصول ہو وہ کمیشن لیے بغیر ان کو ادا کر دیں گے (معاوضہ میں قبیلہ کارواں کی سلامتی کا ذمہ دار ہوگا) ابن سعد نے مزید برآں یہ بھی صراحت کی ہے کہ قیصر سے اجازت ملنے کے بعد ہاشم جب مکرر (آخری مرتبہ) شام کے سفر پر روانہ ہوا تو اثناء راہ میں مدینے سے گزرتے وقت وہاں ایک نوجوان بیوہ سے نکاح کیا پھر آگے روانہ ہو کر یکایک غزہ میں وفات پائی۔ چند ماہ بعد سوگوار بیوی کو عبدالمطلب نامی لڑکا پیدا ہوا (یعنی آنحضرت کا دادا)۔

Marfat.com

تاریخ طبری (طبع یورپ سلسلہ اول صفحہ ۱۰۸۹) میں لکھا ہے کہ یہ معاہدہ شام کے رومی اور غسانی افسروں سے طے ہوا تھا، یہ کہ ہاشم کے بھائی عبدشمس نے حبش کا سفر کیا کہ نجاشی سے مماثل معاہدہ کرے، یہ کہ ایک اور بھائی نوفل کسریٰ ایران سے ملنے عراق گیا تا کہ عراق اور ایرانی سرزمین میں آنے کی مماثل اجازت حاصل کرے، اور یہ کہ ایک اور بھائی المطلب نے یمن کا سفر کیا تا کہ وہاں کے حمیری بادشاہ سے بھی اسی طرح کا اجازت نامہ حاصل کرے۔

ابن حبیب کی کتاب المنمق (ص ۲۶۲ تا ۲۶۴) میں اسی موضوع پر ایک دوسرا باب بھی ہے جس کا عنوان ہے ''حدیث الرحلتین'' اس میں الکلبی کی روایت نقل ہوئی ہے کہ ابتداءً قریش کی یہ عادت تھی کہ ہر سال دو مرتبہ کاروانی سفر کریں: سردیوں میں یمن کا گرمیوں میں شام کا۔ رفتہ رفتہ یہ ان کے لیے دوبھر ہو گیا...... (اس لیے کہ وہ مالدار اور آرام طلب ہو گئے تھے؟ یا اس لیے کہ اصل کارپرداز تاجر بوڑھے ہو گئے تھے؟)...... اس پر تبالہ اور جرش نیز یمن کے بعض دیگر ساحلی رقبوں کے باشندے سامان پہنچانے کا کام خود انجام دینے لگے۔ بری تاجر (جنوبی مشرقی مضافات مکہ یعنی) الحصب تک سامان پہنچاتے، اور بحری تاجر بندرگاہ جدہ تک۔ اس طرح اہل مکہ کو خود سفر کرنے کی حاجت نہ رہی، مگر ایک مرتبہ ایسا قحط پڑا جو مسلسل کئی سال تک جاری رہا اور اہل مکہ کے سارے سرمائے خرچ ہو گئے، اس وقت ہاشم نے شام کے سفر کا ارادہ کیا۔ وہاں اس نے بڑی مقدار میں روٹیاں خریدیں اور انہیں مکہ لا کر چور چور کیا (کہ سخت ہو گئی تھیں) اور انہیں ایک گرم شوربے میں ڈال کر اہل مکہ کی ضیافت کی، اسی سبب سے اسے ہاشم کے لقب سے یاد کیا جانے لگا (جس کے معنی ہیں ''چور چور کرنے والا'') ورنہ اس کا نام اصل میں عمرو تھا۔

نظام الدین القمی نے اپنی تفسیر میں سورۂ ایلاف کی بحث میں ان معلومات کا اضافہ کیا ہے کہ مذکورۂ بالا بحری تاجر حبشی تھے، یہ کہ مکے والے جدے تک اپنے گدھے لیجاتے تا کہ کشتیوں سے اتارا ہوا مال مکے تک لائیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان حبشی تاجروں نے بعد میں اپنا حلقۂ عمل وسیع تر کر لیا اور

Marfat.com

اپنا درآمد کردہ مال خود ہی مکے تک پہنچانا شروع کیا۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹے سے واقعے کا بلاذری (انساب الاشراف، مخطوطہ استانبول ۲/ ۴۲۵) اور ابن عبد ربہ (العقد الفرید، ۲/ ۴۷) نے ذکر کیا ہے وہ یہ کہ ایک مرتبہ قحط سالی کے زمانے میں حبشی تاجر سامان مکہ لائے مگر وہاں چند نوجوانوں نے اسے فوراً لوٹ لیا، اہل مکہ (قریش) ڈرے کہ کہیں اس کے بُرے نتائج میں حبشی سامان کی درآمد ہی بند نہ ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے نجاشی کے ہاں ایک سفارت بھیجی اور چند آدمی بطور یرغمال بھی اس کے سپرد کیے، تا کہ اسے اپنی حسن نیت کا یقین دلائیں۔ نجاشی ابو یکسوم[1] نے ان یرغمالوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا۔

ابن ہشام (سیرۃ رسول اللہ، طبع یورپ، صفحہ ۳۶ تا ۳۸، ۸۷ تا ۸۹، اور ۱۱۳ تا ۱۱۴) کے ہاں کوئی خاص نئی چیز نہیں۔

وہ مذکورہ قصے کا خلاصہ بیان کرتا اور چند اشعار نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہے، اس کتاب کے شارح سہیلی (الروض الانف ۱/ ۴۸، ۹۴ تا ۹۷، ۱۱۷) نے کوئی نئے معلومات نہیں دیے ہیں، البتہ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس مولف کے ہاں (ص ۴۸ پر) جن حکمرانوں نے کارواں لانے کی اجازت دی تھی ان میں مصر کے بادشاہ کا ذکر ہے، یمن کے حکمران کا نام نہیں ممکن ہے سہوِ قلم ہو۔

البلاذری (انساب الاشراف، طبع مصر ۱/ ۵۹) میں مختصر ذکر ہے اور لکھا ہے کہ ہاشم نے شام وغیرہ کے حکمرانوں سے ''عِصَم'' یعنی حفاظت کی اطمینان دہانیاں) حاصل کیں۔

آخر میں مسعودی (مروج الذہب، طبع یورپ ۳/ ۱۲۱ تا ۱۲۲) قابل ذکر ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ''قریش نے بادشاہوں سے ایلاف حاصل کیا اور یہ کہ اس لفظ کے

---

[1] اس زمانہ میں یکسوی خانوادے کی حبش میں حکومت تھی۔ معلوم نہیں اسی کی طرف اشارہ ہے، یا واقعی اس نجاشی کے بیٹے کا نام بھی یکسوم تھا، یمن کے سد مارب پر ابرہہ کا جو کتبہ ہے اس میں ابرہہ کے ایک بیٹے کا نام یکسوم ہی لکھا ہے۔ اور اس ابرہہ کو بھی عرب مورخ ابو یکسوم کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آیا نجاشی یعنی حبش کے بادشاہ کا بھی یہی نام تھا، یہ معلوم نہیں۔

Marfat.com

معنے ہیں امن"۔ پھر اس مؤلف نے تائید میں مطرود الخزاعی کی بیتیں نقل کی ہیں جن میں ان مذکورہ معاہدوں کو لفظ "عہد" سے موسوم کیا گیا ہے۔

ان واقعات کی توقیت اور حکمرانوں کا تعین:

جیسا کہ نظر آئیگا سارے ہی مؤلف اس پر متفق ہیں کہ یہ معاشی و سفارتی کارنامہ ہاشم نے انجام دیا تھا۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہیں، ہمارے ماخذوں میں واقعے کی تاریخ بیان نہیں ہوئی ہے لیکن اس کا متعین کرنا دشوار نہیں معلوم ہوتا۔

ابن ہشام (صفحہ ۱۰۸) کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کی وفات کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر آٹھ سال تھی۔ انساب بلاذری (۸۴/۱) میں وہ ساری روایتیں جمع کی گئی ہیں جن میں عبدالمطلب کی عمر کا ذکر ہے وفات ۸۲ یا ۸۸ یا ۱۱۰ سال کی عمر میں ہوئی۔ بلاذری (حوالۂ بالا) ابن حبیب (کتاب المُحَبَّر ص ۱۷۴) نیز دیگر بعض مؤلفوں نے تو عبدالمطلب کی وفات ۱۴۰ سال کی عمر میں قرار دی ہے۔ ان سب کا اوسط یعنی ۱۱۰ سال قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اور عام طور پر مورخ یہی عمر بیان کرتے ہیں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ مورخوں (انساب البلاذری ۸۴/۱ اور محبر لابن حبیب، ص ۲۹۶) کے مطابق سن رسیدگی کے باعث عبدالمطلب کی بصارت بالکلیہ زائل ہوگئی تھی۔

چونکہ رسول اکرم کی ولادت ۵۶۹ء میں ہوئی اور جب آپ کی عمر آٹھ سال کی تھی تو عبدالمطلب نے وفات پائی ۵۷۷ء میں اور ولادت اس سے ۱۱۰ سال قبل ۴۶۷ء میں ہونی چاہیے۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ عبدالمطلب کی ولادت مذکورۂ بالا معاہدات کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد ہوئی اس طرح ایلاف کا زمانہ کم و بیش ۴۶۵ء کا سمجھا جا سکتا ہے۔

اس زمانہ میں کون کہاں کا بادشاہ تھا؟

رومی:

قسطنطنیہ کا بیزنطینی (رومی) حکمراں اس زمانے میں لیون اعظم (پہلا لیون) تھا

Marfat.com

جس نے ۴۵۷ء تا ۴۷۴ء حکومت کی۔ اس کے زمانے میں افریقہ میں شدید جنگیں ہوئیں۔ اس کے عہد میں ایران سے تعلقات پُرامن تھے اس لیے ہر قسم کی معاشی سرگرمی کا موقع ملا ہوگا۔ سلطنت روما کے جب دو ٹکڑے ہوئے تو مصر بیزنطینیوں کے قبضے میں رہا اور کہتے ہیں کہ انہوں نے تجارتی حمل و نقل کو خشکی کے کاروانوں کی جگہ سمندری جہازوں کے ذریعے سے انجام دینا شروع کیا۔ افریقہ میں جنگ چھڑی تو لازماً سارے بحری وسائل فوج اور ہتھیار روانہ کرنے میں لگا دیے گئے ہوں گے، ان حالات میں یمن، ہندوستان اور باقی مشرقی ممالک سے جن چیزوں کی درآمد ہوا کرتی تھی اس کے لیے یہ قابلِ فہم اور معقول چیز ہے کہ ان خشکی کے کاروانوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے جو مکہ سے گزرا کرتے تھے۔

ایرانی:

۴۶۵ء کی تاریخ پر ایران میں خسرو پرویز تخت پر نظر آتا ہے۔ نویلڈکے اور کرشتسن کے مطابق یہ ۴۵۵ء تا ۴۷۲ء حکمران رہا مگر اس میں سہو معلوم ہوتی ہے۔ ابن حبیب (کتاب المحبر، ص ۳۶۱ و مابعد) کا بیان زیادہ قرین قیاس ہے کہ پرویز نے ۴۵۹ء سے ۴۸۴ء تک حکومت کی۔ مندرجہ ذیل واقعے سے معلوم ہو سکے گا کہ اس بادشاہ کو بیرونی کاروانوں اور درآمدوں کی کیوں ضرورت پیش آئی:

> اس کی حکومت کے زمانے میں ایک قحط پڑا لیکن بادشاہ نے اس سے اچھی طرح نبٹ لیا۔ جو کچھ خزانہ شاہی میں تھا وہ اس نے بانٹ دیا اور محصول (ٹیکس) کی وصولی بند کر دی۔ اور جتنا ہو سکتا تھا نظم و نسق کو بہتر بنا دیا۔ صرف ایک شخص کو مستثنیٰ کر دیں تو کوئی آدمی اس زمانے میں قحط کی وجہ سے نہ مرا دیگر راویوں کے مطابق یہ قحط مسلسل سات سال تک جاری رہا، نہروں اور چشموں کا پانی سوکھ گیا، درخت اور جنگل خشک ہو گئے، زراعت اور نباتات عام طور پر مر گئے، چاہے میدانوں میں ہوں کہ پہاڑوں پر، پرندے اور جنگلی

Marfat.com

جانور بھوک سے ہلاک ہو گئے، گھریلو جانور قحط زدگی سے اتنے کمزور ہو گئے کہ حمل ونقل کے لیے ان پر کوئی چیز لادی نہیں جا سکتی تھی۔ دریائے دجلہ میں پانی اتر گیا اور غذا کی کمی مایحتاج کی قلت اور ہر قسم کی مشکلوں کے باعث لوگ عام طور پر قحط کا شکار ہو گئے۔ اس پر بادشاہ (پرویز) نے رعایا کے نام فرمان صادر کیا اور انہیں اطلاع دی کہ انہیں محصول مالگذاری جزیہ (محصول جنگی) اور نائبہ (دیگر عارضی محصولوں) اور بیگاری سے معاف کیا جاتا ہے، یہ کہ اب وہ اپنے مالک آپ ہیں۔ اور یہ کہ وہ انہیں حکم دیتا ہے اپنی بقا وگذر کے لیے غلہ فراہم کرنے کی ساری ممکنہ کوشش کریں، بادشاہ نے ان کے نام ایک اور فرمان بھی جاری کیا، اس میں انہیں حکم تھا کہ چھپائے ہوئے، جمع کیے ہوئے اور غلے کے دیگر ذخیرے نکالیں جو کہ انسانوں کے لیے غذا کا کام دیتے ہوں، آپس میں مساوات ملحوظ رکھیں، ترجیحات کو نظر انداز کریں، امیر اور غریب میں یکسانی پائی جائے، چھوٹے بڑے میں تفریق نہ ہو۔ بادشاہ نے انہیں متنبہ کیا کہ اگر کہیں کوئی شخص فاقہ کشی سے مرے تو اس پورے شہر یا گاؤں کے باشندوں کو سزا دی جائے گی اور بہت سخت سزا دی جائے گی۔ پرویز نے اس قحط کے زمانے میں نظم ونسق اس طرح چلایا کہ کوئی شخص بھوک کی وجہ سے ہلاک نہ ہونے پایا۔ صرف "اردشیر خرہ و فیروز" نامی مقام پر ایک واردات ہوئی۔ پھر اس زمانے میں بادشاہ نے خدا سے رجوع کیا اور برسات کے لیے دعا کی، خدا نے اس کی دعا قبول فرمائی اور ملک حسب سابق سرسبز ہو گیا پانی کو افراط ہو گیا اور درخت ہرے بھرے ہو گئے۔"

(تاریخ طبری، طبع یوزپ سلسلہ اول صفحہ ۱۰۴۲ تا ۱۰۴۷، کرسٹنسن کی فرانسیسی تاریخ ساسانیاں، ص ۴۸۵ تا ۴۸۶)۔

Marfat.com

یمنی:

جہاں تک یمن کے حکمران کا تعلق ہے اس سے مراد غالباً تبع بن حسان بن تبع ہے جس نے مشہور الحارث بن عمرو الکندی (مشہور شاعر امراؤ القیس بن حُجر کے دادا) کو اپنا نائب اور سپہ سالار بنا دیا تھا۔ اس کے متعلق تاریخ طبری (ص ۸۸۱ تا ۸۸۲) میں لکھا ہے: ''اسے جنات نے (ویران صحرا میں) بھٹکا دیا تھا، مگر وہاں سے وہ صحیح سلامت واپس آ گیا وہ علم نجوم کا سب سے بڑا ماہر اور اپنے زمانے کے عالموں میں سب سے زیادہ عقلمند تھا، اور تاریخ گذشتہ اور آئندہ واقعات کو پیشین گوئی کی واقفیت بھی سب سے زیادہ اس کو تھی پھر وہ تبع بن حسان بن تبع بن ملکیکرب بن تبع الاقرن کے نام سے حکمران بنا۔ حمیری (جنوبی عرب والے) ہوں کہ دیگر عرب، سب اس سے تھراتے تھے۔ اس نے اپنے بھانجے الحارث بن عمرو بن حجر الکندی کو ایک بری فوج کا سپہ سالار بنا کر قبائل مَعَد اور شہر حیرہ اور اس کے آس پاس علاقے کی طرف روانہ کیا، اس زمانے میں حیرہ کا بادشاہ النعمان بن امراؤ القیس (المعروف بہ ابن الشقیقہ) تھا، حارث وہاں پہنچا اور لڑائی کے بعد نعمان اور اس کے چند رشتہ داروں کو قتل کیا اور اس کی فوج کو شکست دی صرف بادشاہ کا بیٹا جو قبیلہ نمر کی ماء السماء نامی بیوی کے بطن سے پیدا ہوا تھا، اس قتل عام سے جان بچا کر بھاگ نکلا المنذر کا خانوادہ حکومت سے محروم ہو گیا اور الحارث بن عمرو اس کے علاقے کا بھی مالک ہو گیا۔'' یہ حارث بہت دن تک حکمران رہا۔ اس نے اپنے بیٹوں کو فوج دے کر بھیجا کہ شام اور غسانیوں کی حکومت بھی چھین لے۔ سویڈن کے مستشرق اولنڈر نے اپنی انگریزی کتاب:

(OLINDER, THE KINGS OF KINDA OF THE FAMILY OF AKILAL MURAR)

یعنی خانوادۂ آکل المرار کے حکمرانان کندہ، مطبوعہ لوند، ۱۹۲۷ء ص ۲۸) میں اس کے متعلق لکھا ہے: ''یہاں جس حمیری حکمران کی طرف اشارہ ہے اس سے مراد ہارتمان صفحہ ۴۹۷ (HARTMANN, ARABISCHE FRAGE) کے مطابق شرحبیل یکف بن شرحبیل یعفر ہے جس کا ذکر ۴۶۷ء کے ایک کتبے میں ملتا ہے (اس بارے میں دیکھو گلازر، ص ۲۶)

Marfat.com

(GLASER ZWEI INSCHRIFTEN) اس شرحبیل یعفر کا ذکر ریکمانس (GRYKMAN) نے بھی مجلہ موزیون (MUSEON) جلد ۶۱، شمارہ ۳، ۴، ۱۹۴۸ء ص ۲۳۳ میں اپنے فرانسیسی مضمون (احمد فخری کے دریافت کردہ یمنی کتبے) میں کیا ہے، اس گماں کی تائید اس واقعے سے بھی ہوتی ہے کہ حضرموت میں بمقام رابیہ ہر سال ایک میلہ لگتا تھا جس کے متعلق مورخ لکھتے ہیں:

"وہاں جانا ہوتا تو قریشی تاجر تو خانوادہ آکل المرار سے خفارہ (بدرقہ) حاصل کرتے اور اس میلے کو جانے والے دوسرے لوگ حضرموت کے قبیلہ آل مسروق بن وائل سے خفارہ حاصل کرتے، یہ دونوں قبیلے خفارہ مفت مہیا کرتے لیکن قریش کی سرپرستی کے باعث قبیلۂ آکل المرار سب پر غالب ہوگیا۔"
(ابن حبیب کی کتاب المحبر، ص ۲۶۷، اور المرزوقی کی الازمنہ و الامکنہ، ۲/۱۶۵، ہر دو مطبوعہ حیدرآباد دکن)

حبشی:

حبش کے سلسلے میں ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ اس زمانے میں مشہور یکسومی خانوادہ وہاں حکمران تھا، لیکن ان بادشاہوں کے سلسلے میں زیر بحث زمانے کے متعلق کوئی تاریخی معلومات حاصل نہیں۔ اگر بعد کے زمانے کے واقعات کو معیار قرار دیا جائے تو اس میں عربی مورخوں کی بیان کردہ باتوں کو ناممکن قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی۔

مصری:

باقی رہتا ہے بادشاہ مصر، جس کا ذکر صرف سہیلی کے ہاں ہے، اگر یہاں کوئی غلطی یا سہوِ قلم نہیں ہے تو اس سے مراد کوئی یونانی گورنر ہوگا، بعد کے زمانے میں مکے والے تاجر اکثر مصر جایا کرتے نظر آتے ہیں لیکن مصر کے کسی بادشاہ کا، جیسا کہ سہیلی نے ذکر کیا ہے، کوئی پتا نہیں چلتا۔

مکی تجارت کا نظام:

مکی تاجروں نے بین الممالک تعلقات کا جو وسیع اور حیرت انگیز سلسلہ قائم کیا اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہوگی۔ جب تک پرانی صدیوں کی تجارتی روایتیں اور تجربے نہ رہے ہوں، ایسا نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے تجارت کے سلسلے میں جو تعلقات پیدا کیے اور (ایلاف کے ذریعے سے) جو اجازت نامے حاصل کیے وہ کوئی بے معنی اور مردہ چیز نہ ثابت ہوئے بلکہ ایک زندہ حقیقت تھے، اس کا ثبوت قدیم قومی تاریخ کے متخصص ابن الکلبی کے ہاں موجود ہے۔ اور ''اسواق الغرب'' کا اس نے جو جیتا جاگتا تذکرہ کیا ہے، دیکھو ابن حبیب کی کتاب المحبر، ص ۲۶۳ تا ۲۶۸۔ المرزوقی کی الازمنہ والامکنہ ۲/۱۶۱ تا ۱۶۸ - الیعقوبی کی تاریخ، طبع یورپ ۱/۳۱۳ تا ۳۱۵۔ قلقشندی کی نہایۃ الارب، طبع مصر ص ۴۶۴) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ کے تاجر بیزنطینی علاقے میں جاتے تھے، اور ایرانی بستیوں میں بھی جہاں وہ مقامی باشندوں اور تاجروں کے علاوہ ہندوستانی اور چینی تاجروں سے بھی ملتے تھے۔ یہ میلے ایک مستقل ادارہ تھے اور ہر سال معینہ وقت پر شروع ہوتے تھے، ایک مقام کے بعد دوسرے مقام کا میلہ کچھ اس جغرافی ترتیب سے مقرر تھا کہ سارے عرب کی چکر ہو جاتی تھی نیز جنوبی فلسطین اور جنوبی عراق کی بھی۔ ان میلوں کا آغاز (ماہ محرم میں) عرب کے شمال سے شروع ہوتا۔ پھر بعد کے مہینوں میں وہ مشرق میں لگتے، پھر جنوب میں، پھر مغرب میں سال کے اواخر (ذی الحجہ) میں۔ مزید برآں خفارے (بدرقے) کا مؤثر نظام موجود تھا جس کے ذریعے سے کاروان والوں کی جان و مال کی بخوبی حفاظت ہوتی، عرب کے مختلف علاقوں (قبیلوں) میں حفاظت کا اطمینان حاصل کرنے کے لیے ظاہر ہے کہ پیشگی ان قبیلوں سے سفارتی کارکردگی کے ذریعے سے معاہدے کیے جائیں۔ اس پر مستزاد حرام مہینوں (أشہر حرم) کا ایک ادارہ بھی پایا جاتا تھا جس کے باعث ہر سال دو مرتبہ مکہ کا راستہ سارے عرب کے لوگوں کے لیے کھل جاتا اور پُر امن ہو جاتا تھا، حج اکبر کے زمانے میں مسلسل تین مہینے تک یعنی ذیقعدہ، ذی الحجہ اور محرم میں، اور حج اصغر یا عمرے کے زمانے میں ایک ماہ کے لیے

Marfat.com

پورے رجب میں لڑائی بھڑائی حرام سمجھی جاتی اور قافلوں تک کو کوئی چھیڑ نہ سکتا، جہاں تک خود اہل مکہ کا تعلق ہے، ان کے لیے بسل کا مشہور ادارہ پایا جاتا تھا (جس کا ذکر سیرۃ ابن ہشام ص ٦٦ میں اور فیروز آبادی کی القاموس میں مادہ ''ب س ل'' کے تحت ملے گا) اور چند مکی قبیلوں کو پورے آٹھ مہینے ....اور ہمارے خیال میں اشہر حرم کے چار مہینوں کے علاوہ کہ اس سے سارے ہی لوگ متمتع ہوتے، گویا سال تمام ......سارے عرب میں امن حاصل رہتا۔ اور وہ جہاں اور جس قبیلے کے علاقے میں چاہتے جا سکتے، یہ امتیاز اصل میں تو مکے کے چند خانوادوں کو حاصل ہوا تھا۔ لیکن اس سے دوسرے لوگ بھی بہ آسانی استفادہ کر سکتے۔ یعنی وہ ان خاندانوں کے کسی فرد کا خفارہ حاصل کر لیں تو وہ ان کے ساتھ ہر جگہ جاتا اور حفاظت مہیا کر سکتا۔ اس خدمت کا اس شخص کو حسب معمول کوئی معاوضہ دیدیا جاتا۔

خلاصہ:

اس بحث سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے جزیرہ نمائے عرب اسلام سے پہلے تجارتی اغراض کے لیے ایک وفاق میں منسلک ہو کر متحد ہو چکا تھا، اس سے اس سیاسی اتحاد کا راستہ بن گیا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کارنامہ ہے۔ مذکورہ بالا تاریخی واقعات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قریش مکہ نے جو وسیع اور بارآور سفارتی سرگرمی دکھائی وہ عرب ہی نہیں عربوں کے نسلی وجغرافیائی وسیاسی حدود کے باہر تک بھی مؤثر ہو چکی تھی۔

ان سارے بیانات کو کوئی شخص چاہے تو محض خیالی کہہ کر رد کر سکتا ہے، ہمارا مقصد یہاں یہ ہے کہ اس مواد کو جو منتشر پایا جاتا تھا یکجا، ابرا اکٹھا کر دیں، محض گمان کے ذریعے سے واقعات تراشنے ''خواہش'' کو ''حقیقت'' سمجھنے اور ''ہوا ہونا چاہیے'' کہنے کے مقابلہ میں دستاویزوں اور تاریخی بیانوں کو بہرحال زیادہ وقعت دینی پڑے گی، ہماری رائے میں یہ ناممکن نہیں کہ ان عربی بیانات میں کہیں کہیں کچھ مبالغہ کیا گیا ہو، لیکن ان کو محض بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا۔

Marfat.com

ضمیمہ:

اوپر کتاب المنمق مؤلفہ ابن حبیب کا ذکر آیا اسے حال میں دائرۃ المعارف نے چھاپ بھی دیا ہے، جن لوگوں کی اس تک دسترس نہ ہو ان کے فائدے کے لیے اس کے دونوں بابوں کو یہاں مع ترجمہ نقل کیا جاتا ہے:

(۱) حدیث الایلاف

عن ابن الکلبی قال: کان من حدیث الایلاف ان قریشا کانت تجارا، وکانت تجارا تھم لا تعدد مکۃ، انما یتقدم علیھم الاعاجم بالسلع فیشترون منھم ثم یتبا یعون بینھم و یبیعون من حولھم من العرب فکانت تجارتھم کذلک حتی رکب ھاشم بن عبدمناف الی الشام فنزل بقیصر واسم ھاشم یومئذ عمرو، فکان یذبح کل یوم شاۃ فیصنع جفنۃ ثرید وید عومن حولہ فیا کلون وکان ھاشم فیمازعموا احسن الناس عصبا واجملھم فذکرلقیصر

(۱) ایلاف کا قصہ

ابن الکلبی کی روایت ہے کہ ایلاف کا قصہ یوں ہوا کہ (مکے کے باشندے یعنی) قریش تاجر لوگ تھے لیکن ان کی تجارتی سرگرمیاں مکے سے آگے نہ بڑھتی تھیں بلکہ اجنبی لوگ سامان لیکر آتے تو یہ ان سے خریدتے، پھر مکے والوں کو بھی بیچتے اور آس پاس رہنے والے عربوں کو بھی۔ ان کی تجارت کا یہی حال رہا تا آں کہ ہاشم شام کے سفر پر روانہ ہوا اور قیصر؂ کے سکونتی علاقے میں ٹھہرا، اس وقت تک ہاشم کا نام عمرو تھا۔ وہ ہر روز ایک بکری کاٹتا اور گوشت اور روٹی سے پکائے جانے والے ثرید کے پیالے دسترخوان پر رکھے جاتے اور دعوت عام ہوتی کہ آس پاس کا ہر شخص آ کر کھائے۔ کہتے ہیں کہ ہاشم گٹھے ہوئے بدن کا اور بہت خوبصورت شخص تھا، اس کی اطلاع قیصر تک پہنچائی گئی کہ یہاں ایک قریشی آیا

Marfat.com

وقيل: ههنا رجل من قريش
يهشم الخبز ثم يصبت
عليه المرق و يفرغ عليه
اللحم وانما كانت الاعاجم
تصنع المرق فى الصحاف
ثم يوقدم بالخبز فلذلك
سمّى هاشم- وبلغ ذلك
قيصر فدعا به فلما رأه
وكلمه آعجب به- فكان
يرسل اليه فيدخل عليه،
فلما رأى مكانه منه قال له
هاشم: "ايهاالملك ان لى
قوماً وهم تجار العرب فان
رأيت ان تكتب لهم
كتاباتؤ منهم وتؤ من
تجارتهم فيقد موا عليك
بما يستظرف من ادم
الحجاز وثيابه فيكونوا
يبيعونه عندكم فهو
ارخص عليكم" فكتب له
كتابا بأمان من أتى منهم
فاقبل هاشم بذلك الكتاب
فجعل كلمامرّ بحىّ من
العرب بطريق الشام اخذ
من اشرافهم ايلافا فالايلاف

ہے جو روٹی کو چورا چورا کر کے اس پر
شوربا ڈالتا پھر اس میں گوشت ملاتا ہے۔
بات یہ ہوئی کہ عجمی لوگوں کی عادت یہ تھی
وہ شوربا تھالیوں میں رکھتے اور تھوڑی سی
روٹی بطور سالن کے چکھتے۔ اور اسی لیے
اسے ''ہاشم کا لقب دیا گیا جس کے معنی
ہیں چورا چورا کرنے والا۔ قیصر کو اطلاع
ملی تو اسے بلایا۔ جب ملاقات اور گفتگو کی
تو بہت اچھا اثر لیا چنانچہ وہ اسے اکثر بلایا
کرتا اور ملاقات کرتا۔ جب ہاشم نے اپنا
رسوخ دیکھا تو ایک دن اس سے کہا
''اے بادشاہ، میری بھی ایک قوم ہے جو
سارے عرب کی تجارت کی مالک ہے،
اگر مناسب معلوم ہو تو انہیں نوشتہ دے کر
جان کی حفاظت کا بھی یقین دلا اور تجارتی
مال کی حفاظت کا بھی، تاکہ وہ حجاز کے
اچھے چمڑے اور کپڑے لاکر تمہارے ہاں
بیچا کریں اور یہ تمہیں زیادہ سستا پڑے گا''
چنانچہ قیصر نے اسے ایک نوشتہ دیا کہ جو
بھی عرب آئے حفاظت سے رہیگا۔ ہاشم
یہ نوشتہ لے کر واپس روانہ ہوا شام کے
راستے میں جس جس عرب قبیلہ سے گزرتا
اس کے سرداروں سے ایلاف حاصل کرتا،
ایلاف کے معنے ہیں ان کی سرزمین میں

ان يامنوا عندهم في ارضهم بغير حلف عليهم، و انما هوامان الناس وعلى ان قريشا تحمل لهوبضائع فيكفونهم حملانها ويردّون اليهم راس مالهم وربحهم فاخذهاشم الايلاف ممن بينه وبين الشام حتىٰ قدم مكة فاتا هم باعظم شئی اتوابه۔ فخرجوا بتجارة عظيمة وخرج هاشم يجوزهم ويوفيهم ايلافهم الذی اخذلهم من العرب، فلم يلرح يوفيهم ذلك ويجمع بينهم وبين اشراف العرب حتی ورد بهم الشام واحلهم قراها فمات في ذلك السفربغزة من الشام۔

کسی حلیفی کے بغیر (رہ گزر کا) امن حاصل ہو، اور یہ امن سب لوگوں کو حاصل ہو، اس کے معاوضے میں قریش ان قبائل کا سامان تجارت خود لیجائیں گے حمل و نقل کے مصارف نہ مانگیں گے اور بیچنے کے بعد قیمت اور نفع دونوں ان کو واپس ادا کردیں گے، اس طرح ہاشم نے اپنے اور شام کے درمیان جتنے قبیلے تھے سب سے ایلاف حاصل کیا اور جب وہ مکہ پہنچا تو (خوشخبری) لایا اس سے بڑی کوئی چیز ممکن نہ تھی پھر سب لوگ ایک بڑا تجارتی کاروان لے کر نکلے۔ ہاشم عربوں کے جس جس قبیلے سے گزرتا اس سے ایلاف کی شرط کی وعدہ وفائی کرتا رہا اور یہ وعدہ وفائی سب کے ساتھ ہوئی اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ قبائلی سرداروں کو بھی جمع کرتا رہا اور سب کو ساتھ لیکر شام پہنچا اور وہاں کے شہروں میں ٹھہرا لیکن وہ اسی سفر میں شام (فلسطین) میں بمقام غزہ فوت ہوگیا۔

(حذفنا المراثی)

(اصل میں یہاں کئی مرثیے ہیں جو حذف کیے جاتے ہیں)

فلما مات هاشم، خرج المطلب بن عبدمناف الی

جب ہاشم کی وفات ہوگئی تو اسکا بھائی مطلب بن عبدمناف یمن گیا اور وہاں

Marfat.com

اليمن فاخذمن ملوکهم عهد المن تجر قبلهم من قريش، ثم اقبل ياخذ الايلاف ممن مربه من العرب حتى اتى مكة على مثل ماكان هاشم اخذ وکان المطلب اکبر ولد عبد مناف وكان يسمىٰ الفيض- فهلك المطلب بردمان من اليمن وهوراجع الى اليمن و خرج عبدشمس بن عبدمناف الى ملك الحبشة فاخذمنه كتابا و عهد المن تجر قبله من قريش، ثم اخذ الايلاف ممن بينه وبين العرب حتى بلغ مكة وهلك عبدشمس بمكة فقبر بالحجون، وكان اكبر من هاشم-

وخرج نوفل بن عبدمناف وکان اصغر ولد عبد مناف ....فخرج الى العراق فاخذ عهدا من كسرىٰ لتجار قريش ثم اقبل ياخذ

کے حکمرانوں سے عہد لیا کہ جو قریش ان کے ہاں تجارت کے لیے آئے اسے امن رہیگا پھر راستے میں جتنے عرب قبیلے پڑتے تھے ان سے ایلاف حاصل کرتا گیا اور ویسے ہی معاہدوں کے ساتھ مکہ آیا جیسے ہاشم نے کیا تھا، عبدمناف کے بچوں میں مطلب سب سے بڑا بیٹا تھا اسے فیض کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ جس وقت (مکرر) یمن کو جا رہا تھا تو یمن میں بمقام رَدمان فوت ہو گیا۔ عبدشمس بن عبد مناف حبش کے بادشاہ کے پاس روانہ ہوا اور اس کے ہاں تجارت کے لیے آنے والے قریشیوں کے حق میں ایک نوشتہ اور عہد حاصل کیا، پھر ان (قبائل) سے بھی ایلاف لیا جو راستے میں پڑتے ہیں اور وہ اس طرح (کامیاب) مکہ واپس آیا۔ عبد شمس کی وفات مکے میں ہوئی اور اسے حجون میں دفن کیا گیا۔ عمر میں یہ ہاشم سے بھی بڑا تھا۔

اور نوفل بھی سفر پر نکلا، یہ عبدمناف کے بیٹوں میں سب سے چھوٹا تھا...... وہ عراق روانہ ہوا اور کسریٰ سے قریشی تاجروں کے حق میں عہد حاصل کیا۔ پھر ان سب عرب (قبائل) سے بھی ایلاف حاصل

Marfat.com

الايلاف ممن يمر به من العرب حتى قدم مكة ثم رجع الى العراق فمات بسلمان من ارض العراق۔ وكان بنو عبدمناف هؤلاء اول من رفع الله به قريشا۔ لم ترالعرب مثلهم قط اسمع ولا اعلم ولا اعقل ولا اجمل۔ انما كانو انجوما من النجوم...... كتاب المنمق (ص ۳۱ تا ۴۰)

کرتا گیا جن کے علاقوں سے گزرنا پڑا۔ اور اس طرح مکہ واپس آیا پھر جب وہ (مکرر) عراق روانہ ہوا تو عراقی سرزمین میں بہ مقام سلمان فوت ہوگیا۔ عبدمناف کے یہ بیٹے وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھوں ہی سب سے پہلے خدا نے قریش کی قدرومنزلت بلند کی، ان لوگوں سے زیادہ فیاض، عالم، عقلمند اور خوبصورت عربوں نے کبھی نہ دیکھے تھے، حقیقت میں یہ آسمان کے تارے ہی تارے تھے۔

(۲) حدیث الرحلتین

الكلبي قال: كانت قريش تعودت رحلتين احد اهما فى االشتاء الى اليمن والاخرى فى الصيف الى الشام۔ فمكثوا بذلك حتى اشتد عليهم الجهد۔ واخصب تباله و جرش واهل ساحل البحر من اليمن، فحمل اهل الساحل فى البحر و حمل اهل البر با لمخصب فامتار اهل مكة ماشاوا، وكفاهم

(۲) دو کاروانی سفروں کا قصہ

کلبی کا بیان ہے کہ قریش کو (سالانہ) دو کاروانی سفروں کی عادت تھی ایک سردیوں میں یمن کی طرف، دوسرے گرمیوں میں شام کی طرف وہ اسی عادت پر قائم رہے تا آں کہ یہ محنت ان پر بار گزرنے لگی پھر تبالہ اور جُرش نیز یمن کے ساحلی علاقے کے باشندوں کی بن آئی، چنانچہ ساحلی علاقے کے لوگ سامان تجارت سمندری راستوں سے، اور اندرونی علاقے والے اونٹوں پر سامان لاد کر آنے لگے۔ ساحل والے جدہ میں

الله الرحلتين كانوا يرحلون الى اليمن والشام فانزل الله عزو جل: "لایلاف قریش ایلافهم رحلة الشتآء والصیف" وقوله: "امنهم من خوف" يريد خوف العدو، وخوف الجذام فليس فى الارض قرشى جذّم۔ وايلاف قريش يعنى داب قريش رحلة الشتاء والصيف فاصابت قريش سنوات ذهبن بالاموال فخرج هاشم الى الشام فامر
بخبز كثيرفخبرله، فحمله فى الغرائر على الابل حتى واتى مكة فهشم ذالك الخبز ونحر تلك الابل ثم طبخها والقى تلك القدور على ذلك الخبز فاطعم اهل مكة و اشبعهم وكان ذلك اول الحيا۔
(كتاب المنمق (ص ٢٦٢ تا ٢٦٣)

لنگر ڈالتے اور خشکی والے (کمے کے مضافات میں) محصب تک سامان پہنچاتے۔ اور یوں کمے والے جو چاہتے مایحتاج سامان حاصل کر سکتے، اور وہ یمن اور شام کے جو دو سفر کیا کرتے تھے ان سے خدا نے انہیں نجات دلائی۔ قرآن میں خدا نے یہی یاد دلانے کے لیے وحی فرمائی ہے کہ "قریش کے ایلاف کے باعث، ان کے ایلاف ہی کے باعث سرما اور گرما کا کاروان چلتا ہے۔ نیز یہ آیت "اور اس نے خوف پر انہیں امن مہیا کیا"۔ مراد یہ ہے کہ دشمن اور جذام کے خوف سے چنانچہ ساری سرزمین میں کوئی جذام زدہ قریشی نہیں ملے گا۔ اور ایلاف کے معنے ہیں قریش کی سردی اور گرمی کے کاروانی سفر کی عادت۔ پھر قریش کے لیے مسلسل کئی سال قحط پڑا جس سے ان کا سارا اندوختہ ختم ہو گیا۔ اس پر ہاشم شام روانہ ہوا اور وہاں بڑی مقدار میں روٹیوں کی فرمائش دی اور جب روٹیاں تیار ہوئیں تو اس نے انہیں تھیلیوں میں بار کر کے اونٹوں پر لادا اور لیکر مکہ آیا یہاں اس نے ان روٹیوں کو چورا چورا کیا اور (ان لانے والے) اونٹوں کو ذبح

Marfat.com

کر کے پکوان کیا (گوشت اور شوربے)
یہ دیگیں اس روٹی پر انڈیلی گئیں اور یہ اس
نے مکے والوں کو کھلایا اور پیٹ بھر کر کھلایا
اور یہ (وہاں) نئی زندگی کا آغاز تھا۔

(ابتدائی فرانسیسی اشاعت ۱۹۵۷ء ضروری تصحیحات
کے ساتھ مؤلف ہی نے ترجمہ کیا)

(ماہ نامہ البلاغ - کراچی - جون ۱۹۶۸ء)

Marfat.com

کلام اللّٰہِ ازلی
ذکر من الرحمٰن مُحدَث
تراجم قرآن مجید تازہ بتازہ نو بنو

تمہید:

تیس ۳۰ برس ہوتے ہیں، موقر رسالہ معارف کے دسمبر ۱۹۵۹ء کے شمارے میں میرے ایک مضمون کو اشاعت کی عزت بخشی گئی تھی۔ "قرآن مجید کے فرانسیسی ترجمے۔" اس میں اس وقت تک کے سارے معلوم فرانسیسی ترجموں کا تاریخ وار ذکر کیا گیا تھا اور ان چھبیس ۲۶ تراجم کی فہرست میں سب سے آخری وہ تھا جسے اس سے ایک ہی مہینہ پہلے یکم نومبر ۱۹۵۹ء کو شائع کرنے کی مجھے سعادت حاصل ہوئی تھی، اس مضمون میں خاص کر اس آخری ترجمے کی سرگزشت بھی درج تھی کہ کن حالات میں وہ کام ہاتھ میں لیا گیا اور کس طرح جلد اجلدی میں تکمیل کو پہنچایا گیا۔

ان تین دہ سالگیوں میں بہت سے نئے ترجمے بھی شائع ہوئے ہیں اور اپنی بعض پرانی معلومات کی اصلاح بھی کرنی پڑی ہے۔ جس سے ناظرین معارف کو ناواقف نہیں رہنا چاہیے۔ اجازت ہو تو آج اسی موضوع پر عود بھی کروں اور نظر ثانی بھی اور اس کی ایک ضمنی ذیلی تقریب یہ بھی ہوئی ہے کہ خود میرے ترجمہ کا خدا کی ششدر کرنے والی عنایت سے پندرہواں اڈیشن اس وقت مطبع میں ہے۔ پروف دیکھ

چکا ہوں، سابق میں کچھ نہیں تو اڑھائی لاکھ نسخوں کی نکاسی ہو چکی ہے اور مانگ کی کثرت سے اس دفعہ نیا اڈیشن ناشر ایک لاکھ کی تعداد میں چھاپ رہا ہے۔ وللہ الحمد والمنۃ۔

اس تمہید کی تتمیم کرتے ہوئے عرض کروں گا کہ مقالہ ہٰذا کی تدوین کے لیے جب معارف موقر کا متعلقہ پرانا شمارہ نکالا تو کچھ عجیب باتوں سے بھی دوچار ہوا۔ اس میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب بھی مقالہ نگاروں میں تھے اور ان کا نام اب رسالے کے ٹائٹل کو زیب دے رہا ہے۔ اسی ٹائٹل کے آخری صفحہ پر خطبات مدراس اور ''رحمتِ عالم'' جیسی شہرۂ آفاق کتابوں کا اشتہار بھی تھا۔ ابھی ابھی اطلاع آئی ہے کہ میری ''خطباتِ بہاولپور'' کا نظر ثالث شدہ اڈیشن اسلام آباد میں چھپ گیا ہے جو ''خطباتِ مدراس'' ہی کا خوشہ چین اور گویا تکملہ ہے۔ اس طرح میری فرانسیسی سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پانچویں اڈیشن کے پروف بھی آئے ہوئے ہیں اور ان شاء اللہ چند ماہ میں چھپ جائیں گے۔

اسی شمارہ معارف میں جگن ناتھ آزاد کی منظوم تاریخ انسانیت سے ختم الرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا متعلقہ اقتباس بھی پڑھا۔ بے اختیار آنسو بہ نکلے۔ معلوم نہیں موصوف ابھی بقیدِ حیات ہیں یا نہیں [1]۔ جی چاہتا ہے کہ اس نظم کا فرانسیسی ترجمہ کر کے یہاں کے کسی رسالہ میں شائع کروں۔ واللہ المستعان، یہ ہو سکا تو ان شاء اللہ اطلاع دوں گا۔

آمدم بر سر مطلب:

تصحیح:

دسمبر ۱۹۵۹ء کے معارف کے محولہ پرانے مضمون میں پرانی معلومات کی اساس پر (جو ''جیولش انسائیکلوپیڈیا'' پر مبنی تھیں) عرض کیا تھا کہ اولین معلوم فرانسیسی ترجمہ قرآن مجید طلیطلا (اندلس) کے عالم دون ابراہام Don Abraham (غالباً یہودی) کا ہے۔ قشطیلہ

---

[1] بقید حیات ہیں اور علمی سرگرمیوں میں مشغول بھی۔ (معارف)

Marfat.com

کے حکمراں الفونسو دہم (حکمرانی ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء تا ۶۸۳ھ/۱۲۸۴ء) کے حکم سے یہ کام اسپینی زبان میں کیا گیا اور پھر اسی اسپینی سے بون آوین تورادے سیوے (Bonaventura De Seve) نے اس کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔

مگر روما کے آنجہانی فاضل پروفیسر لیوی ڈیلّا وِیدا (Levi Della Vida) نے اپنے ایک عنایت نامے میں مجھے لکھا تھا کہ یہودی انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگار اشتائن شنائڈر (Steinschnider) کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ دون ابراہام نے سورۂ معارج کا نہیں بلکہ ایک عربی معراج نامے کا اسپینی میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ اس کا لاطینی اور فرانسیسی میں (Bonaventura De Sienne) نے ترجمہ کیا اور یہ کہ اس کا نام De Seve غلط ہے۔ یہ ایک شہر ہے جو اٹلی میں ہے اور اطالوی میں Siena لکھا جاتا ہے (یعنی سے ناوالا) اس موضوع پر دیکھو چیرول لی کی اطالوی کتاب معراج E. Cerulli Il Libro Della Scalla.

میری تازہ معلومات کے مطابق قدیم ترین فرانسیسی ترجمہ قرآن دون ابراہام کا نہیں بلکہ میشائیل بوڈے (Michael Baudier) کا ہے (جس کا زمانہ ۱۵۸۰ء تا ۱۶۴۵ء کا ہے)۔ یہ مستقل ترجمہ قرآن تو نہیں ہے بلکہ اس کی کتاب "ترکوں کے مذہب کی تاریخ" (Histoire De La Religion Des Turcs) مطبوعہ پاریس ۱۶۲۵ء میں بکثرت آیات قرآن کا کامل مفہوم یا تلخیص وخلاصہ دیا گیا ہے۔ اچھا ہو یا برا یہ سب سے پرانا ترجمہ ہے جو فرانسیسیوں کو ان کی اپنی زبان میں پڑھنے کو ملا تھا۔

معارف کے محولہ پرانے مضمون میں فرانسیسی تراجم کی مجموعی تعداد چھبیس (۲۶) دی گئی تھی۔ میرے زیر طبع فرانسیسی ترجمہ قرآن کے دیباچے میں فرنگی زبانوں کے تراجم قرآن کی جو فہرست ہے، اس میں فرانسیسی میں اب پورے ستر ترجمے بلکہ کچھ زائد ہی دیے گئے ہیں۔ آج اس پر پوری تفصیل سے بحث نہیں کروں گا، صرف اپنے ترجمے کی سرگزشت عرض کروں گا۔

اس کے پہلے اڈیشن کی ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو طباعت مکمل ہوئی تھی۔ اس میں سے چھبیس (۲۶) نسخے خصوصی عمدہ کاغذ پر چھپے اور ان پر حروف (A) تا (Z) بھی درج کیے گئے

Marfat.com

ہیں (یہ ناشر نے خاص لوگوں کو دیے) مزید ایک سو نسخے بھی اچھے کاغذ پر چھپے اور ان پر اعداد (i,ii تا C) درج ہیں اور یہ ناشر کمپنی کے مالکوں اور حصہ داروں کے لیے مخصوص کیے گئے۔ ان کے علاوہ بارہ (۱۲) ہزار نسخے چھپے جن پر ہندسے (1,2 تا 12000) درج ہیں اور یہ ناشر کمپنی کے شرکاء کے لیے فروخت کے لیے پیش کیے گئے۔ (ناشر کا نام ہے "کتابوں کا فرانسیسی کلب Club Francais Du Livra اور اس کی نشریات صرف ان لوگوں کو فرخت کی جاتی ہیں جو اس کلب کے ممبر بنیں عام خریداروں کو نہیں)۔ ترجمہ چھپتے ہی ممبر ٹوٹ پڑے اور یہ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور ناشر ان کو ہر کتاب کی اشاعت کی اطلاع اور تفصیل دیتا ہے۔ چنانچہ اس ترجمہ کی خوبصورت طباعت اور خوبصورت زریں جلد کے باعث سارے بارہ (۱۲) ہزار نسخے صرف دو ہفتوں میں بک گئے۔ خفیف اصلاح کے بعد دوسرا اڈیشن نومبر ۱۹۵۹ء میں کلب ہی نے چھاپا۔ اس کا ایک چوری کا عکسی اڈیشن قم میں بلا تاریخ چھپا، تیسرا اور چوتھا اڈیشن ناشر کی اجازت سے پاریس کے مطبع قرطاجہ کے مسلمان مالک نے ۱۹۶۳ء میں چھاپے۔ ان میں سے ایک میں عربی متن بھی ہے۔

پاریس کے ایک غیر مسلم ناشر کتب پادو (Padour) نے ۱۹۶۵ء میں ایک نیا پانچواں اڈیشن بہ اجازت چھاپا۔ اس میں جو عربی متن ہے وہ ترکی کے ایک مشہور خطاط کا لکھا ہوا ہے اور ترکی کے محکمہ امور مذہبی نے اس کا عکس چھاپا تھا مگر اس فرانسیسی ناشر نے ترکی حکومت سے اجازت لینی ضروری نہ سمجھی۔ اس اڈیشن کی دو جلدیں ہیں۔ ایک میں قرآن کا متن و ترجمہ اور دوسری میں کچھ لغو تصویریں ہیں اور گویا ترجمے کی ہمراہی جلد ہے۔ یہ مولف سے پوچھے بغیر نئے ناشر نے کیا تھا۔ چھٹا اور ساتواں اڈیشن مولف کی نظر ثانیوں کے بعد اصل ناشر ہی نے ۱۹۶۶ء اور ۱۹۷۱ء میں چھاپے۔ آٹھواں نظر ثانی شدہ اڈیشن عربی متن کے ساتھ ۱۹۷۳ء میں بیروت میں چھپا۔ اس کے ناشر نے اس کے دو مزید اڈیشن بلا ترمیم چھاپے۔ مگر ان پر تاریخیں درج نہ کیں، نواں چوری کا اڈیشن جو تیسرے اڈیشن کا عکس ہے کتب خانہ اشاعت اسلام دہلی نے عربی متن کے ساتھ چھاپا اور اس کے دو مزید اڈیشن بلا تاریخ طبع ہوئے اور یہ جزیرہ موریشس کے ایک مسلمان تاجر کے مصارف پر نکلے۔ دسواں اڈیشن مولف کی نظر ثانی سے عربی متن کے ساتھ بیروت میں دو جلدوں میں

Marfat.com

چھپا، اسی کو ۱۹۸۰ء میں حکومت قطر نے مکرر چھپوایا۔ گیارہواں اڈیشن بلاترمیم بیروت میں ۱۹۸۱ء میں ایک جلد میں طبع ہوا۔ بارہواں اڈیشن بعد نظر ثانی ۱۹۸۳ء میں انقرہ میں چھپا ہے۔ ایک چوری کا اڈیشن جس میں باہر دسواں اڈیشن لکھا ہے اور اندر گیارہواں اڈیشن لکھا گیا ہے بیروت میں چھپا ہے مگر یہ حقیقت میں بیروت کے آٹھویں اڈیشن کا عکسی چھاپا ہے۔ تیرہواں اڈیشن مولف کی نظر ثانی کے بعد ۱۹۸۵ء میں پچاس (۵۰) ہزار کی تعداد میں امیرکا میں چھپا۔ چودہواں اڈیشن مولف کے علم و اجازت کے بغیر ۱۹۸۵ء ہی میں ہینین Le Hennin نامی کمپنی نے شائع کیا جو غالباً ایک پرانے اڈیشن کا عکسی چھاپا تھا اور جس میں عربی متن بھی لگایا جانا معلوم ہوا۔ یہ کمپنی افلاس کے باعث جلد ہی ٹوٹ گئی اور مولف کو اس اڈیشن کی صورت دیکھنے کا بھی موقع نہ مل سکا۔ اللہ کی مرضی۔ پندرہواں اڈیشن مولف کی نظر جدید کے بعد آج کل (یہ مضمون لکھتے وقت اکتوبر ۱۹۸۸ء میں) امیرکا میں زیر طبع ہے اور اس کے مسلمان ناشر کا بیان تھا کہ مانگ کی کثرت کے باعث اس کے ایک لاکھ نسخے چھاپے جارہے ہیں، وللہ الحمد۔

اپنے اس ترجمے کی خصوصیتیں پرانے مضمون میں لکھ چکا ہوں۔ نئے ناظرین سے معذرت کرتا ہوں کہ اس کی تکرار نہیں کرسکتا۔ اس میں سو (۱۰۰) صفحے سے زائد کا ایک مقدمہ ہے جس میں خاص کر قرآن مجید کی تدوین کی تاریخ اہمیت رکھتی ہے۔ نئے زیر طبع اڈیشن میں اس سند کا فوٹو بھی شامل کررہا ہوں جو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے شیخ القراء نے اس گناہگار کو شروع سے آخر تک پورا قرآن مجید ان کو سنانے کے بعد عطا فرمائی تھی۔ اس میں نسلاً بعد نسلٍ سارے اساتذہ کا ذکر ہے اور آخری مرحلے میں حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابی بن کعب اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم پانچ صحابیوں سے سننے کا ذکر ہے اور اس سے اوپر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آتے ہیں۔ اس مقدمہ کے بعد فرنگی زبانوں کے سارے تراجم کا ذکر ہے یہ اُنچاس (۴۹) زبانیں ہیں اور بعض میں کامل نہیں صرف جزئی ترجمہ ہوا ہے۔ ضخامت کے خیال سے مشرقی زبانوں کا اس فہرست میں ذکر نہیں ہے۔ کتاب میں تین انڈیکس ہیں۔ ایک مقدمہ کا، دوسرا مترجمین کی فہرست کا اور تیسرا ترجمہ و حواشی قرآن

Marfat.com

کا۔ خطا و نسیان سے مبرا نہیں ہوں، عفو مولا کا فقیر و محتاج ہوں۔

ترجموں کی فہرست:

دنیا میں جتنی بھی عجمی (غیر عربی) زبانیں ہیں ان میں سے ہر ایک میں قرآن مجید کے ترجمے کی ضرورت ہو گی تا کہ جن کو عربی نہیں آتی وہ بھی احکام خداوندی سے واقف ہو سکیں۔ اسے وہی شخص کر سکتا ہے جسے دونوں زبانیں آتی ہوں اور اچھی آتی ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ہی زبان میں کئی کئی لوگ ترجمہ کرتے ہیں۔ قرآن مجید کے ترجمہ کا آغاز عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہے۔ مشہور حنفی فقیہ شمس الائمہ سرخسی اور امام تاج الشریعہ بیان کرتے ہیں کہ چند نو مسلم ایرانیوں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے خواہش کی کہ وہ ان کو نماز کے لیے لابد عنصر یعنی سورۂ فاتحہ کا فارسی ترجمہ مہیا کریں۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے اس کو انجام دینے کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہ فرمایا تو وہ ترجمہ ان کو بھیج دیا اور یہ لوگ اس کو اس وقت تک نمازوں میں پڑھتے رہے جب تک کہ عربی متن ان کو یاد نہ ہو گیا اور یہ کہ اس فارسی ترجمے کا پہلا جملہ تھا: "بنام خداوند بخشایندۂ مہربان"۔

جیسے جیسے اسلام پھیلتا گیا، عام تعلیم کے لیے کامل قرآن مجید کے ترجموں کی ضرورت ہونے لگی۔ دوست ہی نہیں دشمنوں کو بھی تا کہ اسلام کی تردید کر سکیں۔ نو مسلموں میں فارسی اور ترکی سرفہرست نظر آتے ہیں تو معترضین میں سریانی اور یونانی۔

مجھے معلوم نہیں ساری زبانوں کے معلوم تراجم قرآنی کی فہرست سب سے پہلے کس نے مدون کی البتہ یہ جانتا ہوں کہ دیگر اسلامی چیزوں کے ساتھ فرنگیوں نے خاص کر گزشتہ صدی میں اس سے بھی دلچسپی لی۔ مثلاً وکتور شووین (Victor Chauvin) کی فرانسیسی کتاب (مطبوعہ بلجیم) ہے جس کے عنوان کا ترجمہ ہو گا: "ان کتابوں کی فہرست جو عربی میں یا عربوں سے متعلق ۱۸۱۰ء سے ۱۸۵۰ء تک عیسائی یوروپ میں چھپیں"۔ (مخفف نام بلیو گرافی (Bibliograane) کی دسویں جلد قرآن اور حدیث سے متعلق ہے۔ اس میں تراجم قرآن مجید کا کافی مواد ہے۔ یوروپ اور امیرکا کے بڑے کتب خانوں کی

Marfat.com

فہرستوں سے مدد ملتی ہے۔ امیر کا کے مشنری رسالے ''مسلم ورلڈ'' نے اس بارے میں ایک خصوصی اور طویل مقالہ شائع کیا۔ غالباً اسی سے لے کر مصر کے عربی رسالے الہلال میں جرجی زیدان نے بھی ایک مقالہ چھاپا۔ مگر یہ سب سوکھی پھیکی فہرستیں تھیں جن میں زبان وار مترجموں کے نام اور زیادہ سے زیادہ ترجمے کی تاریخ طباعت درج تھی۔ مگر میں شروع میں ان سے بھی واقف نہ تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ خود توریت وانجیل کے تراجم کی بھی مکمل فہرستیں میرے علم میں نہیں پائی جاتی ہیں۔

مجھے اس سے دلچسپی ایک انگریزی کتاب دیکھ کر ہوئی۔ اس کا نام ہے ''انجیل بہت سی زبانوں میں'' (Gospel In Many Tongues)۔ اس میں کئی سو زبانوں کا نام اور ہر ایک میں انجیل کا ایک مختصر اقتباس بطور نمونہ دیا گیا ہے۔ اس میں عربی بھی ہے، اردو بھی اور ایسی زبانیں بھی جن کا نام بھی مجھے پہلی دفعہ اس کتاب سے معلوم ہوا۔ یہ کوئی پانچ سات سو زبانوں کے مواد پر مشتمل کتاب تھی جس سے مجھے تاسف ہوا کہ ہم نے قرآن کی کیا خدمت کی ہے؟ اس میں صرف تراجم کے اقتباس ہیں، مترجموں سے بحث نہیں ہے۔

آمدم برسر مطلب، حیدرآباد دکن میں مرحوم ابو محمد مصلح صاحب نے (جو غالباً بہار کے باشندے تھے اور ''بچوں کی تفسیر'' کے مولف، لاہور وغیرہ میں عرصہ تک قرآن مجید کی خدمت میں سرگرم رہ چکے تھے) ''عالمگیر تحریک قرآن مجید'' کے نام کی ایک انجمن ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء میں قائم کی۔ اس کا مقصد دنیا کی ساری زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمے شائع کرنا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے بھی اس سے واقفیت ہوئی اور موسس کا ہاتھ بٹانے کی تھوڑی بہت مجھے بھی سعادت حاصل ہوئی۔ چنانچہ ۱۳۶۴ھ/ ۱۹۴۵ء میں ''القرآن فی کل لسان'' (Quran In Every Language) نامی کتاب اسی انجمن نے شائع کی۔ اس میں ۲۳ زبانوں کے بارے میں مواد تھا۔ ہر زبان کے سارے معلوم ترجموں اور ترجموں کی فہرست اور بطور نمونہ سورۂ فاتحہ کا ترجمہ ہر زبان کے ساتھ شامل کیا گیا۔ کتاب بہت مقبول ہوئی، والحمدللہ اور دوسرے ہی سال ۱۳۶۵ھ/ ۱۹۴۶ء میں وہیں اس کا دوسرا

Marfat.com

اڈیشن نکلا اور اس دفعہ ۴۳ زبانوں کا ذکر کیا جا سکا ۔ پھر مانگ کی کثرت سے ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء میں تیسرا ایڈیشن بھی نکلا جس میں ۶۷ زبانوں کے ترجموں کا پتا چلا تھا ۔

پھر مشیت الٰہی یہ ہوئی کہ انگریز بھی ملک بدر ہوں اور سلطنتِ آصفیہ بھی بڑے خون خرابے کے ساتھ ختم ہو۔

اس کے بعد سے مجھے اس کا موقع تو نہ ملا کہ کتاب کا نیا اڈیشن نکال سکوں، لیکن معلومات جمع کرنے کا شوق برقرار رہا۔ اس کا بھی موقع ملا کہ عالم دوستوں اور ملاقاتیوں کی مدد سے سورۂ فاتحہ کے نئی نئی زبانوں میں ترجمہ کرا کرا پنے ذخیرے کا حجم مصنوعی طور پر بڑھا سکوں، آج کل میرے پاس ڈیڑھ سو سے زیادہ زبانوں کا مواد فراہم ہو گیا ہے۔ جن میں سے تقریباً اسی میں کامل ترجمہ قرآن ہے باقی میں جزئی۔

یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ تراجم قرآن کی کثرت کے لحاظ سے مشرقی زبانوں میں اردو کا نمبر سب سے پہلے آتا ہے کہ اس میں پانچ سات سو ترجمے بتائے جاتے ہیں۔ پھر ترکی اور فارسی کا نمبر آتا ہے ۔ فرنگی زبانوں میں انگریزی ، فرانسیسی اور جرمن فائق ہیں۔

جو یندہ یابندہ ، کتاب کی اشاعت کے وسائل نہ ہونے پر یہ سوچا کہ کتاب کی جگہ مقالے چھاپوں ، اتفاق کے بات ہے کہ ۱۹۶۰ء میں ایک ایرانی صاحب سے ملاقات ہوئی جو پاریس سے فرانسیسی زبان میں ''افکار شیعہ'' (La Pense Chi ites) t نامی ایک دوماہی رسالہ نکالنے لگے ۔ مجھے کچھ حرج نہ معلوم ہوا کہ اس کے ہر نمبر میں حروف تہجی پر ایک ایک زبان کا مواد شائع کروں اور ساتھ ہی حسب سابق سورۂ فاتحہ کا ترجمہ بھی اس زبان میں دیتا جاؤں لیکن دو ہی سال بعد بارہ ہی نمبر نکلے تھے کہ ۱۹۶۲ء میں یہ رسالہ بند ہو گیا ، اس میں فرانسیسی ، افریقائی ، البانی ، الخمیادو ، المانی (جرمن) ، عربی ، ارمنی ، آسامی اور آذری کا ذکر آیا تھا ۔ پھر ایک تونسی مسلمان پاریس ہی سے ''فرانس اسلام'' نامی ایک ماہوار رسالہ ۱۹۶۷ء سے فرانسیسی زبان میں شائع کرنے لگے ، میں نے اس سے بھی استفادہ کیا ، پچاس ایک نمبر نکلنے کے بعد مالی دشواریوں سے یہ رسالہ

Marfat.com

بھی بند ہوگیا۔ رسالہ افکار شیعہ کچھ عرصہ بند رہنے کے بعد ۱۹۸۰ء میں دوبارہ "بنیش اسلام" (Connaissance De L'Islam) کے نام سے شائع ہونا شروع ہوا۔ پھر ۱۹۸۳ء میں مکرر بند ہوگیا، مرضی مولا از ہمہ اولیٰ۔

اس سلسلہ کی ایک آخری چیز یہ ہے کہ بعض عربی سلطنتوں اور ترکی حکومت نے استانبول میں ایک ادارہ قائم کیا ہے جو اسلامی تاریخ، فنون لطیفہ اور ثقافت (تہذیب و تمدن) پر تحقیقاتی کام کرتا ہے۔ وہاں کے مواد کی کثرت کے باعث استانبول سے بہتر اس کا کوئی مرکز نہیں ہوسکتا۔ اس کے ناظم اعلیٰ (ڈائرکٹر جنرل) ایک ترکی فاضل ڈاکٹر اکمل الدین احسان اوغلو ہیں۔ اس نے ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء میں ایک کتاب انگریزی میں چھاپی ہے جس کا نام ہے: (World Bibliography of Translations of the Meanings of the Holy Quran, Printed Translations 1515-1980) یعنی مطبوعہ تراجم قرآن مجید کی عالمگیر فہرست از ۱۵۱۵ء تا ۱۹۸۰ء۔ اس میں ۸۸۰+۳۴ صفحے ہیں۔ قلمی تا حال شائع نشدہ ترجمے اس فہرست سے خارج ہیں۔ لعل الله يحدث بعد ذلك أمرا۔

یہ بیان کرنا شاید ضروری ہے کہ یک لسانی فہرستیں بھی ہیں۔ صرف فارسی ترجموں پر، صرف ترکی ترجموں پر (از ناچیز حمیداللہ)، وغیرہ، نیز یہ بھی کہ جب ۱۹۵۹ء میں میرا فرانسیسی ترجمہ قرآن مجید شائع ہوا، تو اس کے فرنگی ناشر کے اصرار پر میں نے اس کے مقدمے میں صرف یوروپی زبانوں کے ترجموں کی مکمل فہرست شامل کی (مولف کا نام، مقام اشاعت، تاریخ طباعت ہائے مختلفہ وغیرہ)۔ اس میں بہ شمول ترکی والبانی اٹھائیس (۲۸) زبانوں کا مواد تھا۔ اس کے پندرہویں اڈیشن میں جو ان سطروں کی تحریر کے وقت (۱۴۰۹ھ/۱۹۸۸ء) مطبع میں ہے چھیالیس (۴۶) زبانوں کا ذکر ہے۔ ان میں سے متعدد کئی کئی خطوں میں لکھی جاتی ہیں۔ مثلاً یوگوسلاوی، بوشناق زبان عربی، لاطینی اور روسی تین خطوں میں ملتی ہے۔ ترکی زبان اویغوری، عربی، لاطینی اور روسی چار خطوں میں، یونانی زبان عربی اور یونانی خطوں میں، پولینڈی زبان عربی اور لاطینی خطوں میں وغیرہ۔ ایک زمانے میں اندلسی زبان صرف عربی خط میں لکھی جاتی تھی، مسلمانوں میں بھی عیسائیوں میں بھی اور اسے نام دیا جاتا تھا "الخمیادو"

حرف "ل" (ہے) کا تلفظ "خ" اور یہ نام ہے "الاَعجمیۃ" کا ہسپانی تلفظ اور (Aljamiado) اس زبان میں متعدد تراجم قرآن مجید تاحال کتب خانوں میں محفوظ ہیں اور میرے پاس ان کے مائکروفلم وسائل کا انتظار ہے کہ ان کو چھاپ دوں۔

ایک نئی کتاب کا تعارف:

۱۹۸۷ء میں اسلام آباد میں ایک نئی کتاب ہمارے موضوع پر چھپنے لگی اور ابھی ابھی شائع ہوئی ہے۔ یعنی" قرآن کریم کے اردو تراجم، کتابیات، مرتبہ ڈاکٹر احمد خان"۔ ناشر:"مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد۔"

اس کے مولف جو فاضل بھی ہیں، سابق میں عرصے تک پاکستان کے ادارۂ تحقیقاتِ علمیہ کے کتب خانے کے ناظم بھی رہے ہیں اور میرے بہت عزیز دوست بھی ہیں۔ اس لیے ان سے گلے اور شکوے سے آغاز کرتا ہوں۔

کتاب کے مقدمے میں (ص۱۶ پر) وہ مجھ ناچیز کی کتاب "القرآن فی کل لسان" کا ذکر واقفانہ انداز سے کرتے ہیں لیکن جب صفحہ ۲۹۱ و مابعد میں مآخذ و مراجع کا ذکر کرتے ہیں تو یہ کتاب نظر نہیں آتی ذکر آتا ہے تو صفحہ ۲۹۵ پر مغربی زبانوں کی کتابوں میں میرے فرانسیسی ترجمہ قرآن مجید طبع دہم کے مقدمے میں مندرج فہرست تراجم کا حالانکہ اس فہرست میں اردو تراجم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی تالیف کے وقت "القرآن فی کل لسان" ان کے سامنے نہ تھی اور انہیں تکلف ہوا کہ مجھے لکھ کر اس کے دیکھنے کا موقع حاصل کر سکیں۔ اس میں اردو تراجم کی طویل فہرست ہے اور میں نے دیکھا کہ اس میں ایسے ترجمے بھی مذکور ہوئے ہیں جن کا مواد انہیں زیر تبصرہ تالیف کے لیے کسی اور ماخذ سے نہ مل سکا۔ اس پر میں نے اپنی پرانی کتاب کی فوٹو کاپیاں لے کر فوراً انہیں ہوائی ڈاک سے بھیج دیں تاکہ کسی آیندہ اڈیشن میں ان سے استفادہ کر سکیں۔ ہمارے مولف امیرکا کی نیشنل یونین کٹیلاگ (National Union Catalog) سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں جو کئی سو جلدوں میں ہے اور بہت اہم اردو ماخذوں میں خود پاکستان میں چھپی ہوئی کتاب "تذکرۃ المفسرین" مولفہ قاضی زاہد الحسینی بھی مفقود ملی۔

Marfat.com

بہر حال زیر نظر کتاب ان تالیفوں میں تازہ ترین ہے جو ایک ہی زبان کے تراجم قرآن سے بحث کرتی ہیں ۔ جیسا کہ عرض ہوا اردو اس بارے میں سب سے باثروت ہے اور خوش قسمتی سے اس کتاب کو ایسے فرد نے مرتب کیا ہے جو اس فن کا ماہر اور تجربہ کار ہے ۔ یقین ہے کہ جلد ہی اس کی طباعتِ جدید کا موقع ملے گا اور اس وقت اس میں مزید اصلاحیں بھی عمل میں آئیں گی ۔

کتاب تاریخ وار نہیں بلکہ مولف وار ہے اور مولفوں کے نام حروف تہجی پر مرتب ہیں ۔ میں شخصی طور پر اس کو پسند کروں گا کہ تراجم کو تاریخ تالیف پر مرتب کیا جائے یعنی سب سے قدیم معلوم مترجم کا ذکر سب سے پہلے آئے اور اسی اندراج میں اس کی جملہ طباعتوں کا ذکر کر دیا جائے اور کتاب میں ایک اشاریہ ہو جو مترجموں کے ناموں کا حروف تہجی پر ذکر کرے ۔ اس میں فائدہ یہ ہے کہ بعض ناموں کا اشاریے میں کئی بار ذکر کیا جا سکتا ہے ۔ مثلاً اس دفعہ پہلا نام آغا قزلباش دہلوی کا ہے ۔ میرے مجوزہ اشاریے میں وہ آغا اور قزلباش دو جگہ آ سکتا ہے ۔ اس دفعہ امام غزالی کا ذکر حرف الف میں ہے ۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں ان کی تلاش کبھی حرف الف میں نہ کر سکتا امام فخر الدین رازی کا ذکر حرف الف میں نہیں ، حرف ر میں ہے ۔

اس دفعہ مکمل اور جزوی (جزئی ؟) اردو تراجم کی مجموعی فہرست نمبر ۱۰۱۱ پر ختم کی گئی ہے ۔ لیکن نظر یہ آیا کہ ایک ہی ترجمہ کئی بار کئی مقاموں پر چھپا ہو تو نمبر برقرار رکھنے کی جگہ نیا نمبر دیا گیا ہے ۔ اس سے معلوم نہیں ہو سکتا کہ حقیقت میں اردو میں کتنے ترجمے ہوے ۔ شاید مشکل سے اس کے ایک تہائی ہوں ۔ جدتوں میں سے ایک یہ ہے کہ ایک اشاریہ مطبعوں کے ناموں کا دیا گیا ہے ۔ دوسری یہ کہ ایک اشاریہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے اردو ترجمہ راست اصل عربی سے نہیں کیا ۔ بلکہ کسی اور زبان کے ترجمے کو ''اردو میں ڈھالا'' ۔ اچھا ہوتا اگر وہیں قوسین میں مزید وضاحت ہوتی کہ اس سے کیا مراد ہے ۔ اشاریے میں مندرج ''ف'' سے مراد غالباً فارسی ہے لیکن ''ع'' سے کیا عربی مراد ہے ؟ سارے ہی ترجمے عربی سے ہوئے ہیں ۔ نمبر (۱۴۶) پر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ترجمے کا ذکر ہے اور تفصیل میں اسے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی

Marfat.com

تفسیر کا ترجمہ بتایا ہے صحیح کون ہے؟

معمولی طباعتی غلطیاں بھی ناگزیر تھیں، مثلاً مترجم نمبر ۲۲۹ کو ۶۲۹ لکھا گیا ہے۔

مگر ان معمولی چیزوں سے قطع نظر کتاب خوش آمدید کہے جانے کے لائق ہے اور اپنے موضوع پر فی الوقت حرف اخیر ہے۔ خدا کرے جلدنئی اور مکمل تر اشاعت کا موقع ملے، موضوع ہی ایسا ہے کہ ہر روز نئے تراجم قرآن کی اشاعت سے ترمیم وتکمیل کی ضرورت رہے گی۔ شاذ و نادر تبدیل و تصحیح کی بھی۔ مثلاً موجودہ اڈیشن کے صفحہ ۲۹۵، سطر ۱۷ میں لکھنا یہ چاہیے تھا کہ ''یوروپی زبانوں کے تراجم قرآنی کی فہرست جو مذکورہ ماخذ کے دسویں اڈیشن کے مقدمے میں شامل کی گئی ہے''۔ نہ یہ کہ ''فہرست تراجم قرآن، دسواں اڈیشن ۱۹۸۰ء'' اور ظاہر ہے کہ یہ ماخذ اردو تراجم سے قطعاً غیر متعلق ہے۔

کتاب میں اس کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ ہر اردو ترجمے خاص کر پرانے ترجمے کے متعلق یہ بھی بیان کریں کہ وہ اب کہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سے ہمارے فاضل مولف کی انتھک کوشش، عظیم محنت اور اس اصول عمل کا پتا چلتا ہے کہ محض سنی سنائی باتوں پر اکتفا نہ کریں۔

کتاب میں کوئی تین سو صفحے ہیں اور ٹائپ پر خوبصورت چھپائی ہوئی ہے، جزاہ اللہ خیراً۔

(معارف اعظم گڑھ-نومبر ۱۹۸۸ء)

قرآن مجید
کی سالگرہ مبارک

مسلمان قرآن مجید کی سالگرہ منانے کی عزت و سعادت حاصل کر رہے ہیں۔
خدا مبارک فرمائے اور رجوع الی القرآن کی توفیق مرحمت ہو۔ یہ سالگرہ منانے کی تحریک مقبول تو ہوئی ہے لیکن دل کو خلش ہوتی رہی کہ کہیں یہ بدعت تو نہیں، کہیں بے ادبی تو نہیں۔

ابھی شعبان ۱۳۸۷ھ میں سوچ رہا تھا تو خدا نے کچھ باتیں دل میں ڈالیں۔
علماء کرام کی خدمت میں غور کے لیے عرض کرتا ہوں۔

پہلی وحی سورۂ اقراء کی پانچ پہلی آیتوں پر مشتمل تھی۔ اس میں اُمیّوں کو لکھنا پڑھنا سیکھنے کا حکم دیتے ہوے یہ ولولہ انگیز چیز، گویا بطورِ دلیل اور ثبوت کے، بیان ہوئی ہے کہ خدا قلم ہی کے ذریعے سے انسان کو وہ چیز سکھاتا ہے جو اسے معلوم نہ ہوتی ہے۔ گویا سارے تمدن اور ساری تہذیب انسانی کی حفاظت قلم کے سپرد ہے اور شاید اسی لیے حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ "اوّل ما خلق اللہ القلم" (خدا نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا)

اس کے بعد تین سال تک فترت رہی اور کوئی تازہ وحی نہ آئی۔ اور مکرر آغاز ہوا تو سورۂ والضحیٰ نازل ہوا جس کی آخری آیت ہے وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ

Marfat.com

(رہی اپنے رَبّ کی نعمت، سو (اسے) بیان کر) اسلام اور قرآن سے بڑھ کر انسان پر خدا کی نعمت کون سی ہو سکتی ہے؟ ابدی نجات اور دنیوی فلاح غرض حسابِ دارین کی اسی سے رہنمائی ہوتی ہے۔ مفسر بیان فرماتے ہیں کہ یہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ کا حکم تھا۔ درست ہے لیکن خدا کے کلامِ بلاغت نظام میں اور بھی پہلو ہو سکتے ہیں۔ میلاد شریف کی محفلیں منانا، قرآن مجید کی سالگرہ منانا بھی خدا کی نعمت کو یاد کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ ساری عمر ہر روز چوبیس گھنٹے ایک ہی چیز بیان کریں اوسط آدمی تھک کر بیزار ہو جائے اس لیے سالگرہ منانا سال میں ایک بار سوچنا سہولت بخش ہو سکتا ہے مگر اس آیت میں مدت کا ذکر نہیں ہے، سال میں ایک بار ہو یا کسی اور مدت میں۔

پھر سورۂ صافات کی آیت (۱۰۷ تا ۱۰۸) اللہ نے ذہن میں ڈالی "وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ" (یعنی جب خدا کے حکم کی تعمیل میں حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے کو قربان کرنا چاہا تو خدا فرماتا ہے: اور ہم نے ایک بڑے ذبیحے کے ذریعے سے اس کا فدیہ دیا اور اسے بعد والوں پر واجب کر دیا)" اب عید الاضحیٰ میں ہر سال ہر ملت ابراہیمی و محمدی کا تابع یہ فدیہ برابر ادا کیا کرتا ہے۔ اس آیت میں نجاتِ اسماعیلی کی سالگرہ منانے کا خود خدا نے، خود قرآن نے حکم دیا ہے، ہر اپنے حوصلے اور اپنی سمجھ کے مطابق یہ عید، یہ سال بہ سال عود کرنے والی تقریب مناتا ہے۔

اس پر غور ہی کر رہا تھا کہ سورۂ زُخرف کی چند آیتیں (۲۶ تا ۳۲) ذہن میں آئیں: اور جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ میں اس چیز سے بیزار ہوں جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ بجز اس ذات کے جس نے مجھے پیدا کیا کیونکہ وہی میری رہنمائی کرتا رہے گا۔ اور (خدا) نے اسے اس (ابراہیم) کی اولاد میں ایک باقی رہنے والی بات بنا دیا، کہ شاید وہ (گمراہی سے) رجوع کریں، بلکہ میں (یعنی خدائے تعالیٰ) نے ان (مشرکینِ مکہ) کو اور ان کے آباؤ اجداد کو مال و متاع بھی دیا تا آں کہ ان کے پاس حق بھی آیا اور ایک واضح رسول بھی، اور جب وہ ان (مشرکینِ مکہ) کے پاس آیا تو وہ کہنے لگے کہ یہ تو جادوگر ہے اور ہم اسے نہیں مانتے اور یہ بھی کہا۔ یہ قرآن دو مشہور شہروں کے کسی بڑے شخص پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟ کیا یہ لوگ تیرے رب کی

رحمت کو خود بانٹنا چاہتے ہیں؟ یہ ہم (یعنی اللہ تعالیٰ) ہیں جنہوں نے دنیوی زندگی کے لیے ان کے اسباب معیشت کو بانٹا ہے اور ہم ہی بعض کو بعض پر درجے کی فوقیت دیتے ہیں اور ان میں سے بعض دوسروں سے جبری کام لیتے ہیں۔ مگر (یاد رکھو کہ) خدا کی رحمت (یعنی قرآن واسلام) اس (مال) سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔''

اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ ہے کہ مجھے اب وہ خلش بھی نہ رہی جس کا اوپر ذکر کیا۔

ایک غیر متعلق مگر دلچسپ چیز پر اسے ختم کرتا ہوں۔ سنا گیا ہے کہ دین دار صدر پاکستان کی سرپرستی میں قرآن مجید کو ریشمی کپڑے پر سنہری تاروں سے کاڑھا جا رہا ہے۔ چند ماہ ہوئے کتب خانۂ پیرس کے ایک مسلمان افسر مصر بھیجے گئے تو انہوں نے وہاں بالکل ایسا ہی ایک پرانا قرآن مجید دیکھا جو ایک ٹن وزنی ہے اور ہندوستان سے آیا ہے۔ گمان ہوتا ہے کہ بغداد کی تباہی کے بعد جب مصر میں نئی خلافتِ عباسیہ قائم ہوئی اور محمد تغلق نے ایک سفارت بھیج کر بیعت بھی کی، اور اپنی حکومت کی دربار خلافت سے توثیق بھی کرائی تو یہ شاندار اور متبرک تحفہ وہاں بھیجا۔ والحمدللہ یہ بھی ایک سالگرہ اور توارد ہے۔

(خاتون پاکستان، کراچی۔ نزول قرآن مجید ۱۳۸۷ھ)

Marfat.com

سیرت

Marfat.com

Marfat.com

سرورِ کائناتؐ کی حکومت

مندرجہ عنوانِ بحث پر روشنی ڈالنے سے پہلے چند امور صاف کرنے ضروری ہیں:
کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حکومت قایم کرنی چاہتے تھے یا اس سے بھی کسی بڑے مطمحِ نظر کے حصول کے لیے حکومت کا قیام ایک ناگزیر چیز تھا؟ عام طور پر حکومت کے قیام کے ذرائع کیا سمجھے جاتے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ماحول، جس میں حکومت قایم کی گئی، کیا تھا؟

آنحضرت کا ماحول:

چودہ سو برس پہلے عرب کی سیاسی حالت کا عام نقشہ یہ تھا کہ گو عرب طبعًا ایک ہی ملک تھا، جغرافیائی، لسانی، نسلی یک جہتی موجود تھی۔ رسم و رواج یکساں تھے مگر کوئی متحد کرنے والی مرکزی قوت موجود نہ تھی۔ ڈاکہ، لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا، جُوا، زنا، شراب نوشی ہر قسم کی برائیاں پھیلی ہوئی تھیں (تفصیل صبح الاعشیٰ از قلقشندی وغیرہ میں دیکھیے) خانہ جنگیاں عام تھیں، جن کے باعث ساحلی و سرحدی مقامات پر طاقتور ہمسایہ حکومتوں کی حمایتیں (PROTECTORATES) قایم ہو گئی تھیں۔ ایک حصہ پر رومن اثر تھا، تو دوسری طرف ایرانی گرفت بھی تھی! اور یہ اجنبی تسلط و نفوذ ہر قسم کے اثرات ڈال رہا تھا۔ چنانچہ ملک میں عیسائی مذہب کی تبلیغ ہو رہی تھی۔ عربی زیرِ حمایت حکومتوں میں شاہانہ طمطراق اور کرّ و فر پیدا ہو گئے تھے مگر گورنر یمن ابرہہ حبشی کی تباہی کے بعد (جو عربوں کی

Marfat.com

روایات اور قومی معبد کو تباہ کرنے آیا تھا) ۲؎ ''یوم ذی قار'' میں اجنبی استعمار کو ایک زبردست دھکا لگا تھا جس سے عربوں کے ولولوں میں ایک خاموش محرک پیدا ہو گیا تھا اور وہ اپنی برتر قابلیتوں کو محسوس کرنا شروع کر چکے تھے۔ قسمت سے ان استعماری قوتوں (روم و ایران) میں مسلسل جنگیں ہوتی رہیں جس سے دونوں کمزور ہو گئے۔ قبیلہ واری حکومت تھی لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات کے اثر سے ملک میں ایک طرح کی مرکزیت بھی تھی۔ چنانچہ سب عرب حج کو مکہ معظمہ آتے تھے، جہاں قریش اور قریش بھی عبد مناف کا خاندان سب سے بااقتدار تھا۔ حج اور دیگر میلے وحدت لسانی و خیالی میں بہت مددگار تھے۔ ان میں ایک طرح کی جمہوریت موجود تھی۔ دارالندوہ میں وقتِ ضرورت ان کی ''پارلیمان'' کا اجلاس ہوتا تھا ۳؎۔ ان کے خطیب، سفیر، حکم یا ثالث خزانہ دار وغیرہ بھی منتخب ہوتے تھے ۴؎۔ ملک میں چیکے ہی چیکے ذہنیت ترقی کر رہی تھی اور بیرونی ممالک کے سفر وغیرہ سے ان کے چند اعلیٰ تر دماغوں میں تلاش حق پیدا ہو گئی تھی۔ بعض لوگ شراب چھوڑ چکے تھے۔ متعدد لوگ بت پرستی سے خود بخود نفور ہو گئے تھے۔ موحدین بھی غیر موجود نہ تھے۔ انسانی قربانی بند ہو چکی تھی اور ایسی منت کا معاوضہ سو اونٹ مقرر ہو چکے تھے ۵؎۔ انسانیت پروری کا خیال پھیلنے لگا تھا اور متعدد قبائل نے معاہدۂ ''حلف الفضول'' کے ذریعے ایک انجمن مظلوموں کی مدد کے لیے قایم کی تھی۔ غرض اس قسم کی قابلیت ملک میں پیدا ہو چکی تھی کہ انہیں ایک متمدن اور منضبط قوم بنا کر ان کی عملی قوتوں سے کام لیا جائے اور ساتھ ہی ہمسایہ اجنبی حکومتیں اوجِ کمال کو پہنچنے کے بعد تیزی سے رو بہ انحطاط تھیں۔

ظہورِ قدسی:

ان حالات میں ۹ ربیع الاوّل ۵۳ھ قبل ہجرت (۲۰/اپریل ۵۷۱ء) مولانا شبلی کے الفاظ میں ''شاہ حرم، حکمران عرب، فرمانروائے عالم، شہنشاہِ کونین، عالمِ قدس سے عالمِ امکان میں تشریف فرمائے عزت و اجلال ہوا۔ اللھم صل علیه وعلی اله واصحابه وسلّم۔ ۶؎

Marfat.com

سرورِ کائنات کا مقصدِ رسالت:

عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کو باور نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری کوشش اور جدوجہد کا منشا فقط یہ تھا کہ خدائے واحد ہی کا بول بالا ہو۔۶ اور ایک ایسی حکومت کا قیام عمل میں آئے، جس میں ظلم معدوم ہو۔ ہر شخص اعتقاد کی کامل آزادی سے بہرہ ور ہو۔ دنیا سے بدامنی وفساد دور ہو تاکہ ہر شخص کو اپنی قابلیت کے مطابق خدا کی پیدا کردہ چیزوں سے زیادہ سے زیادہ استفادے کا موقع ملے اور نیز محتاجوں کو ممکنہ حد تک حکومت کی جانب سے امداد دی جائے۔ پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن اسی طرح پورا ہو سکتا تھا کہ تمام انسان ایک مذہبی وسیاسی معاشرے یعنی حکومت کے تحت لائے جائیں، جس کے بغیر امن انتظام اور خودداری ممکن نہیں۔ آپؐ کے مشن کے خالص مذہبی اغراض سے یہاں ہمیں بحث نہیں ہے۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ابتدائی دورِ رسالت میں اہلِ مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مال و دولت کی، حسین عورتوں کے ساتھ عقد کی اور امارت وحکومت کی چاٹ دی تاکہ آپؐ نبوت کے دعوٰی سے باز آجائیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ٹھکرا دیا اور کہا کہ اگر چاند سورج بھی مجھے توڑ کر لا دیے جائیں، تو میں تبلیغ حق سے باز نہیں آسکتا۔۸ اس واقعہ سے کم از کم اتنا ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ چالیس پچاس برس کی عمر تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کی کوئی خواہش نہ تھی، اس کے بعد بھی آپ میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور بقیہ چند سالہ زندگی گو سیاسی واقعات سے پُر ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخر تک یہی فرماتے رہے کہ ''میں مکارم اخلاق کے اتمام کے لیے بھیجا گیا ہوں اور بس''۔

حکمرانی کی تربیت:

پیدائش سے چند ماہ قبل باپ کا سایہ سر سے اُٹھ جانا، بچپن قبیلہ بنی سعد کے پہاڑوں میں گزارنا، چند ہی سال کے اندر ماں اور دادا کا بھی دنیا سے کوچ کر جانا، ایک جنگ (حرب فجار) میں بعض بزرگ رشتہ داروں کے تیر بردار کی حیثیت سے شامل ہونا،

Marfat.com

دو ایک تجارتی سفر شام کے اختیار کرنا، ایک معمر بیوہ سے شادی کرنے کے بعد غریب پروری اور نیکوکاری کرتے کرتے بلند تر جذبات کے اثر سے خلوت گزینی پر مائل رہنا --- یہی وہ چند باتیں ہیں، جو اس دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ البتہ یہ امر قابل ذکر ہے کہ آپ کے دادا قبیلہ قریش کے سردار تھے۔ یہ قبیلہ مکہ معظمہ میں آباد تھا، جو قدیم سے ملک عرب کا مرکز تھا۔ آپؐ کے دادا کے انتقال پر سرداری دوسرے خاندان میں چلی گئی۔ آپؐ کے متعدد چچا بھی زندہ تھے، اس لیے آپ کو سرداری حاصل کرنے کا خیال نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی وجہ سے بہ ظاہر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سلطنت کے قیام کی تحریک اس زمانے میں دل میں پیدا ہوگئی تھی۔

حکومتیں کس طرح قایم ہوتی ہیں؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت:

قیامِ حکومت کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندانوں سے قبائل اور قبائل سے شاہی پھر شہنشاہی بنتی ہے۔ قبائلی دور تک ارتقاء طبعی ہوتی ہے اور بلا مخالفت، لیکن قبائل کے شیوخ کو کسی مرکز (بادشاہ) اطاعت پر جمع کر لینا آسان نہیں۔ شاہی سے شہنشاہی مملکت مختلف طور سے بن سکتی ہے اور جدید اضافۂ ملک یا تو ایسے ممالک کا ہوتا ہے، جس میں کوئی حکومت اور انتظام پہلے سے موجود ہوتے ہیں، یا محض خودسر قبائل کے مقبوضات ہوتے ہیں۔

خودسر قبائل کے ملک کا الحاق دو طور سے ہو سکتا ہے: یا تو بزورِ شمشیر یا بذریعہ تدبیر۔ یہ تو ظاہر ہے کہ موروثی طور سے کسی کو تاجِ شہریاری حاصل ہو جائے تو اس کو محفوظ رکھنا اتنا مشکل نہیں جتنا بزور بازو کوئی مملکت قایم کرنا۔ مملکت قایم کر کے اسے مستحکم اور پائیدار کرنا، حکومت عدل و انصاف سے کرنا اور نیک نام چھوڑ جانا، بہرحال ان کے برعکس امور سے بہتر ہیں اور مشکل تر بھی۔

محض حسن ظن سے نہیں بلکہ استقراء و تفحص کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عرب میں کسی مملکت کا قیام ایک واقعی مشکل

کام تھا۔ ملک میں کوئی حکومت نہ تھی۔۔بے شبہ بعض خطوں پر چھوٹی چھوٹی شاہی حکومتیں حکمران تھیں اور وہ بھی اجنبی استعماریت کا شکار۔ (ان کو اپنے ماتحت بنانا، ان کی حامی و محافظ قوی استعماری شہنشاہیتوں سے مقابلے کرنے کے بغیر ناممکن تھا) ان حیرہ وغیرہ کی حکومتوں کے قطع نظر عرب میں عام طور سے صرف قبائلی حکومت تھی۔ جن میں آپس میں سخت رقابتیں اور موروثی جھگڑے صدیوں سے بیش از بیش ہی ہوتے چلے آرہے تھے۔

غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قبائل کی ان مرکز گریز قوتوں کو یکجا کرنا، ان میں معاشرتی اور اخلاقی کایا پلٹنے والی اصلاحات کو رائج کرنا، عرب کو غیر ملکی حمایتوں سے آزاد کرا کے ان کا الحاق کرنا، ایک حکومت کی جملہ ضروریات قانونی و انتظامی کو بالکل نئے سرے سے مہیا کرنا اور اندرونِ ملک کی یہودی اور نصرانی مخالفتوں سے روبراہ ہونا تھا (یہودی مخالفتیں، مذہبی، معاشی، سیاسی ہر قسم کی رہیں اور بہت سخت جیسا کہ آیندہ بھی اشارۃً ذکر ہوگا) اس مہم کو سر کرنے اور مملکت عرب کو قایم کرنے کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو مضبوط اور گہری بنیاد پر مستحکم حالت میں چھوڑ جاتے ہیں۔ رہا آپ کا نیک نامی سے مملکت کو قایم کرنا اور نیک نامی سے حکومت کرنا اور اپنے بعد بھی نیک نام چھوڑ جانا، اس سلسلے میں کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔

ان سب کے علاوہ قیام کے دو بڑے ذریعے یعنی زر اور زور (فوج) میں سے ایک بھی آپؐ کے پاس نہ تھا اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ حکومت کا قیام کرنے کی غرض سے نہیں چاہتے تھے۔ آپؐ کا پہلا اور آخری مقصد بُرے رسم و رواج کو مٹانا اور مذہب اسلام کی تبلیغ کرنا۔ غرض مقصدِ وحید اصلاحِ قوم تھا۔ اسی وجہ سے لوٹ مار، ظلم، طمع، لالچ، مکروفریب، دغا وغیرہ (جن سے اپنے گرد جتھے جمع کیے جاسکتے ہیں اور دولت جمع کی جاسکتی ہے) آپؐ کے طریق عمل سے خارج تھے۔ آپ کو تبلیغ دین کر کے متبعین فراہم کرنے تھے اور اصولاً اور حسب معمول یہ متبع ابتداءً عموماً مفلسوں، غریبوں، مسکینوں وغیرہ ہی پر مشتمل تھے، جن سے معمولی امداد تو کجا، خود ان کی جانی و مالی حفاظت مشکل تھی۔ ان سب امور کے باعث قیام حکومت میں آپ کے لیے بے اندازہ اور بے انتہا مشکلیں پیش آنی تھیں اور آئیں بھی۔ اس پر آپ کس طرح غالب آئے، آیندہ مذکور ہوگا۔

Marfat.com

ابتدائے کار:

چالیس سال کی پختہ عمر میں عرفان سے مالا مال ہو کر اور ربانی ہدایت کے ماتحت (ہونے کا دعویٰ فرماتے ہوئے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اس سے سخت تر کام نہ کبھی ہوا اور نہ ہوگا۔ عربوں کی سی اجڈ اور پُر نفاق قوم کو خدائے واحد کی پرستش پر یکجا کرنا، مکارم اخلاق سکھانا اور تمام ساتھ دینے والے متبعین کو بھائی بھائی بنا دینا9، یہ آپ کا منشا تھا۔ متلاشیانِ حق دوڑ پڑے کہ چشمۂ حیات کا پتا لگ گیا۔ غرض چند سال کی خفیہ اور پھر علانیہ کوشش اور تبلیغ سے دنیا کے چند اعلیٰ ترین دماغ مل گئے، جو آپ کی تعلیم کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ تن من دھن سے اس کی توسیع پر آمادہ ہو گئے۔ زبردست ہم خیالوں کا پیدا کرنا آئندہ ہونے والے کام کی مضبوط بنیاد تھی۔

جب اس کا چرچا پھیلا اور کچھ اہل مدینہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تو آنحضرتؐ نے ان سے عہد لیا کہ "اگر آپ کو مدینہ آنا پڑے، تو یہ لوگ پوری امداد دیں گے اور حفاظت کریں گے۔"10

حریتِ خیال اور آزادی تبلیغ میں جب مزاحمت ہوئی، تو اس کی شدت کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ترکِ وطن پر مجبور ہوئے اور بظاہر یہ واقعہ حکومت کے قیام کی تحریک کا پہلا باعث ہوگا، یعنی دشمنوں کو شکست دے کر فاتحانہ وطن کو لوٹنا، ہر ایسے جبری تارکِ وطن کی فطری خواہش ہوتی ہے۔ غرض جو بھی ہو، مکہ معظمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ میں قیام اختیار کیا گیا، جہاں سیکڑوں ہی متبعین موجود تھے اور جن سے مدد کا معاہدہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کو وطن چھوڑنے پر مجبور کرنا قریش کی جانب سے عملاً ایک اعلانِ جنگ تھا۔ اس پر مستزاد انہوں نے اسلام کو تباہ کرنا اپنا قومی مقصد بنا لیا، جیسا کہ بعد کے حالات سے ثابت ہوتا ہے۔

آپ کی مخالفت جو اہل مکہ کر رہے تھے، اس پر بنو امیہ کا خاندان پیش پیش تھا۔ اور یہ مخالفت پشتینی تھی، کیونکہ عبد مناف کی زندگی میں ان کے فرزندِ اکبر عبد شمس کا انتقال ہو گیا تھا، اس لیے فرزندِ اصغر اور ان کے بعد ان کی اولاد نے سرداری حاصل کی، لیکن

Marfat.com

عبدشمس کی اولاد کا دعوٰی باقی رہا اور ہاشم سے ان کا جھگڑا عبدمناف کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا۔ آخر عبدالمطلب اور ابو طالب کی وفات پر بنو امیہ نے مکمل اقتدار حاصل کر لیا۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت گویا دوبارہ بنو امیہ کے لیے بنو ہاشم کی اطاعت پر مجبور ہونا تھا۔ چونکہ بنو امیہ اب قریش کے سردار تھے، اس لیے ان کا مخالفت پر تلنا گویا پورے اہلِ مکہ کا تلنا تھا۔

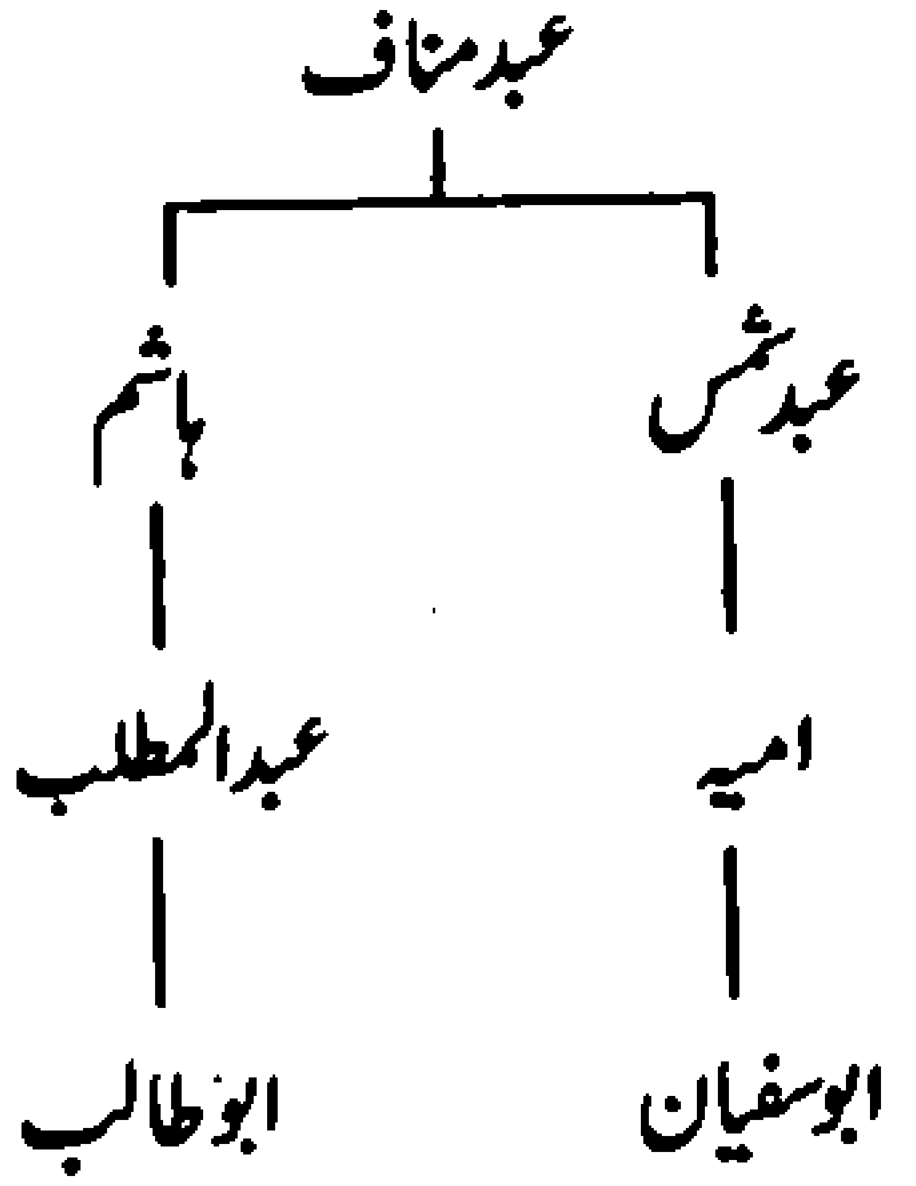

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ آتے ہی اس بات کی کوشش کی کہ اپنے تمام ساتھیوں میں اتحاد و اتفاق کی روح کو ترقی دیں۔ اس سے پہلے عربی قبائل میں باہم چشمک رہا کرتی تھی۔ خصوصاً اہلِ مکہ تو سب کو حقیر سمجھتے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتظام فرمایا کہ تمام اہلِ مکہ کا، جو مدینہ منورہ ترک وطن کر کے آئے ہوئے تھے، مسلمانانِ مدینہ کے ساتھ بھائی چارہ (عقدِ مواخات) کرا دیا۔[10]

یہ فقط برائے نام نہ تھا۔ یہ کارروائی اس جوش و خروش سے قبول کی گئی کہ اہلِ مدینہ نے اہلِ مکہ کو ہر چیز میں اپنا شریک بنا لیا۔ اپنی دولت کا آدھا حصہ انہیں دے دیا۔ ان میں سے کوئی مرتا تو اس کا ساتھی وارث بھی ٹھہرتا۔[11]

اس سے متعدد فائدے ہوئے۔ بے گھر و بے بس اہلِ مکہ چین سے بس گئے۔ قبائلی تعصب اور علیحدگیوں کا ایک قلم خاتمہ ہو گیا اور تمام مسلمانوں میں بلا امتیاز رنگ و زبان اخوت اور امداد باہمی کی حقیقی روح کام کرنے لگی۔

Marfat.com

لیکن پھر بھی جو بے اطمینانی اور خوف و دہشت پھیلی ہوئی تھی، اس کا کسی قدر اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مسلمان مسلح سر بکف ہوتے تھے۔

غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام موجودہ قوتوں کو نہ صرف ایک مرکز کے تحت قایم کرلیا بلکہ ان میں اعلیٰ درجے کا ضبط (ڈسپلن) اورمل کر کام کرنے اور اُبھرنے کا غیر مختتم جوش بھی پیدا کر دیا۔ عرب یوں بھی ایک جنگجو قوم تھی، اب ان کی قابلیتوں کو ابھار کر ان سے بہتر فائدہ اٹھایا جانے لگا۔

اس کے ساتھ ہی آس پاس کی اجنبی قوتوں سے (یہودی و دیگر عرب قبائل سے) معاہدے کرنے شروع کر دیے[۱۲]۔ ان معاہدوں کا مقصد یہ تھا کہ قریش کے منصوبوں کے خلاف حلیف پیدا کر کے قومی حفاظت کا مقصد حاصل کیا جائے۔ چنانچہ یہودیوں کے معاہدے کا متن یہ تھا:

''۱۔ خون بہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے قایم چلا آتا ہے، اب بھی قایم رہے گا۔

۲۔ یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے مذہبی امور سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ یہود اور مسلمان باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔

۴۔ یہود یا مسلمان کو کسی سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کرے گا۔

۵۔ کوئی فریق قریش کو امداد نہ دے گا۔ (شبلی نے امداد کی جگہ امان لکھا ہے)

۶۔ مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا، تو دونوں فریق شریک یکدگر ہوں گے۔

۷۔ کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرے گا، تو دوسرا بھی شریک صلح ہوگا۔ لیکن مذہبی لڑائی اس سے مستثنیٰ ہوگی۔''

بنی ضمرہ کے معاہدے کے یہ الفاظ تھے:

''یہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تحریر ہے بنوضمرہ کے لیے۔

Marfat.com

ان لوگوں کا جان اور مال محفوظ رہے گا اور جو شخص ان پر حملہ کرے گا،
اس کے مقابلے میں ان کی مدد کی جائے گی بجز اس صورت کے کہ یہ
لوگ مذہب کے مقابلے میں لڑیں اور پیغمبر خداؐ ان کو مدد کے لیے
بلائیں گے، تو یہ مدد کو آئیں گے۔"

اسی زمانے میں عید رمضان کے دن فطرہ یعنی غلہ خیرات کرنے کا حکم ہوا جس پر آیندہ بحث ہوگی۔

ان انتظامات کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقصد و فرض یعنی تبلیغ اسلام کا کام بھی برابر جاری رہا اور روز بروز حلقہ بگوشوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اہلِ مکہ کو کچھ تو اس بات کی جلن تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاتھ سے صحیح سلامت نکل گئے تھے اور اس سے زیادہ یہ خوف تھا کہ آپ کی روز افزوں طاقت کسی نہ کسی دن مکہ معظمہ پر حملے کا باعث ہوگی۔ اس لیے سردارانِ قریش مخالفت کا سامان کرنے لگے۔ ادھر سے بھی کوئی غفلت نہیں برتی گئی۔ تجسس اور خبر رسانی کا کافی انتظام کیا گیا۔ پتا چلا کہ مکہ والوں کا ایک تجارتی قافلہ شام جا رہا ہے، جس کے سردار طے کر چکے تھے کہ جملہ منافع "خلاف مسلمانانِ مہم" کی سربراہی کے لیے مخصوص کر دیا جائے گا۔ وجہ کافی تھی۔ اس کو روکنے کی کوشش کی گئی مگر اسلامی دستہ دیر سے پہنچا۔ اس سے مکہ اور مدینہ کے سیاسی تعلقات کی فضا اور بھی مکدر ہوگئی۔ دو ایک چھوٹی مقامی جھڑپیں رہیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگ کو برابر ٹالتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر جب مسلمانوں کے ایک خبر رساں دستے نے لوٹ مار کی اور دو ایک آدمیوں کو مار ڈالا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے[۱۳]۔

آخر جب شام سے قریش کا مذکورہ بالا تجارتی قافلہ واپس ہونے لگا (جس کا نفع مسلمانوں کے خلاف مہم کی تیاریوں میں صرف کیا جانے والا تھا) تو خطرے کے احساس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے چل پڑے اور چاہا کہ اسے روک لیں۔ قافلے کی مدد کو مکے سے کمک پہنچ گئی۔ قافلہ راستہ کترا کر نکل گیا، لیکن اس کی مدد کے لیے جو فوج آئی تھی، اس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں سے مڈبھیڑ ہوگئی۔

Marfat.com

باوجود ایک اور تین کے تناسب کے اعلیٰ تر حربی انتظام اور فوجی ضبط کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شاندار فتح ہوئی ۱۳۔ اہل مکہ شکست کا بدلہ لینے کے لیے بے چین ہو گئے۔ جلدی ہی وہ مدینہ منورہ چڑھ دوڑے۔ وہاں بھی خبر لگ گئی تھی اور گو اس مقابلے میں مسلمانوں کو شکست ہوئی،۱۳، لیکن مکہ والے اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے اور ان کے لیے فتح وشکست برابر رہی۔

اس عرصے میں حلیف یہودیوں کی بدعہدی ناقابل برداشت ہو گئی اور ان کی اچھی طرح سرکوبی کی گئی ۱۳، مگر اس کے بعد ایک خطرناک ترین دور شروع ہوا۔ شکست خوردہ یہودیوں نے قریش کے ساتھ اتحاد کر لیا اور ایک انتہائی آخری کوشش مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے شروع ہوئی۔ اس واقعہ کو جنگِ احزاب یا جنگ خندق کہتے ہیں۔ اس کی شدت کا خود قرآن شاہد ہے ۱۴۔ مگر اب کی بھی برتر فوجی قوت اور سیاست دانی سے حریفوں کو محاصرہ اٹھا کر واپسی پر مجبور کر دیا گیا ۱۳۔ اور مدینہ منورہ سے غدار یہودی عنصر کو بھی اس کے بعد ہی خارج کر دیا گیا۔ ۱۳

مگر یہودیوں کا غرور اور ان کی قوت پوری طرح نہ ٹوٹی تھی اور وہ خیبر کی نوآبادی میں آمادۂ جنگ ہو رہے تھے۔ اس لیے ایک طرف تو ان کی قوت کا قطعی طور پر استیصال کر دیا گیا ۱۲ اور دوسری طرف صلح حدیبیہ میں قریش سے ایک معاہدۂ امن ہو گیا۔ ۲ لیکن چند روز میں اُدھر سے بدعہدی ہوئی تو اِدھر سے ایک لشکر جرار نے جا کر مکہ معظمہ پر قبضہ کر لیا۔ ظالم مگر بے بس حریفوں کو عام معافی دے دی گئی اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر تھا کہ فاتح لشکر نے (جسے کبھی دیس سے نکلنا اور انتہائی تکالیف و آلام برداشت کرنا پڑا تھا) اپنے سابقہ دشمنوں کے قصوروں کو یک لخت نسیاً منسیاً کر دیا ۱۳ اس کی نظیر سے ہمارے علم میں تاریخِ عالم تہی مایہ ہے۔

مکہ معظمہ کی فتح حکومت عرب کے بنیادی استحکام کا آخری مرحلہ تھا۔ اس کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں طوعاً و کرہاً ۱۵ عربوں کو مرکزی حکومت کا فرمانبردار بننا پڑا۔ ہر طرف سے اطاعت کے وفود آنے لگے اور مرکزی حکومت کی جانب سے ہر جگہ ٹیکس یا مالگزاری (زکوٰۃ) وصول کرنے والے اور مذہبی و سیاسی فرائض انجام دینے والے افسر

مقرر کیے جانے لگے۔ ١٠ اور آپؐ کے تدبر و انتظام کا نتیجہ تھا کہ عرب جیسے ملک میں ہر طرف امن و امان کا دور دورہ ہو گیا۔

فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدار جزیرۂ عرب پر پوری طرح قایم ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے صلح حدیبیہ کے دوران میں اپنی عالمگیر تعلیم سے دنیا کو مستفید کرنے کے لیے آپ نے سفارتیں روانہ فرمائیں ١٢۔ اور بین الاقوامی (یا صحیح تر اصطلاح میں بین الممالک) تعلقات کی بنا پڑی۔

اجنبی استعمار پر حملہ:

عربی سلطنت پر اب اجنبی استعمار کی نظریں پڑنے لگیں۔ یہ تصادم ناگزیر تھا۔ اس کی نمایاں صورت جنگِ تبوک و موتہ میں ظاہر ہوتی ہے، جس کے ذریعے عرب کی آیندہ سیاست معین ہو گئی اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے چند ہی دنوں بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ایک اور زبردست مہم کشور کشائی کے لیے فلسطین روانہ ہونے ہی کو تھی۔ ١٣

حقوقِ شہریت کا منشورِ اعظم:

حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبے دیے، وہ تاریخ تمدن میں نہایت اہم درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں تفصیل سے رعایا کے حقوق و فرائض کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ تفصیل سیرت شبلی، تاریخ ذہبی، ابن ہشام وغیرہ میں ملے گی۔ مختصراً تمام جاہلیت کے دستور پامال ہیں۔ سب انسان برابر ہیں، عرب کو عجم پر، عجم کو عرب پر کوئی فوقیت نہیں۔ فقط پرہیزگاری وجہ کرامت ہے۔ سب مسلمان بھائی بھائی ہو، غلاموں کو وہی کھلاؤ، جو خود کھاؤ، وہی پہناؤ جو خود پہنو۔ موروثی جاہلانہ انتقام باطل ہیں۔ جاہلیت کے سود لغو ہیں۔ عورتوں سے برتاؤ میں خدا سے ڈرو۔ تمہارا ان (عورتوں) پر ان کا تم پر حق ہے۔ ہر شخص کا جان و مال و آبرو محفوظ ہے۔ ضابطۂ قرآنی کو ملحوظ رکھ کر گمراہ نہ ہو گے۔ حقوقِ ترکہ و میراث متعین ہو گئے۔ وارث کے لیے (مزید) وصیت نہیں۔ بچہ بستر والے کا ہے، زانی کے لیے پتھر ہیں، جو بچہ اپنے ماں باپ کے سوا غیر اور جو غلام

Marfat.com

اپنے مالک کے سوا دوسرے کا ہونے کا دعویٰ کرے، اس پر خدا کی لعنت ہے۔ عورت اپنے ''شوہر کے مال'' سے اس کی اجازت کے بغیر کسی کو کچھ نہ دے۔ قرض ادا کیا جائے۔ عاریت واپس کی جائے۔ عطیے کا بدلہ دیا جائے۔ ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے۔ باہم خونریزی نہ کرو۔ ہر شخص اپنے فعل کا ذمہ دار ہے۔ بیٹا باپ کا، باپ بیٹے کا جوابدہ نہیں، اپنے امیر کی اطاعت کرو، چاہے وہ نکٹا حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ خدا کی عبادت کرو، پانچ وقت نماز پڑھو، مہینا بھر کے روزے رکھو۔ میرے احکام کی اطاعت کرو۔ جنت میں جاؤ گے۔

اسی زمانے میں قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی: ''آج تمہارا دین مکمل ہو گیا''

حکومت کے ارادے:

حکومت اگر باقی نہ رہ سکے، تو اس کے حصول سے کیا فائدہ۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کس طرح اوامرِ الٰہیہ کے تحت عدالت و صداقت کے ذریعے قایم فرمائی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت کی استواری و پائیداری کے متعلق کیا ارادے قایم کیے گئے۔ اس بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر ایک نظر ڈالنی چاہیے۔

استقرار سے پتا چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ''دنیا و آخرت'' دونوں کی بھلائی پر مشتمل ہے اور اس کے ذرائع (۱) علم (۲) جسم (۳) اخلاق قرار دیے گئے ہیں۔ علم سے مراد اپنے حقوق و فرائض کا علم ہے، یعنی ہر چیز تو (فقط میری نہیں) ہماری ہے لیکن ہم (اور ہیں بھی) خدا کے۔

چنانچہ اسلام کے ارکان (ایمان کے بعد) پانچ ہیں: نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد۔ ان میں آخر الذکر فرض کفایہ ہے یعنی اگر کافی تعداد اس میں حصہ لے، تو باقی سے ساقط ہو جاتا ہے۔ باقی چار فرض عین ہیں۔ ان پر غور کرنے سے اس دعوے کی تصدیق ہو سکتی ہے کہ دین و دنیا کی بھلائی ان سے حاصل ہو سکتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ عمومی فرائض ہر مسلمان پر واجب ہیں۔ ان کے علاوہ جو خصوصی فرائض حاکم وقت کے ہیں، وہ

Marfat.com

علیحدہ بیان ہوں گے۔

چونکہ ایک حکومت کے لیے افراد رعایا کے غالب حصے کا متحد ہونا ضروری ہے، اس لیے اس اتحاد کی روح کو ابھارنے کا لحاظ ہر حکم میں شامل رہا اور مذہبی احکام میں بھی اسی چیز کی آبیاری کی گئی۔ چنانچہ عمومی فرائض سے (سوائے بچوں اور دیوانوں کے جو مرفوع القلم طبقہ ہے) کوئی مستثنیٰ نہیں۔ راعی، بادشاہ، اور ادنیٰ مزدور سب کو ایک ہی قسم کے فرض کی ادائیگی کا حکم دیا گیا۔ ہر روز پانچ مرتبہ محلے والوں کو، ہر ہفتے شہر والوں کو اور ہر سال دو مرتبہ شہر و مضافات کے باشندوں کو جمع ہونے کا حکم دیا گیا۔ ایک حربیاتی نے غالباً صحیح لکھا ہے کہ اسلامی نماز ایک طرح کی فوجی پریڈ اور عسکری تربیت ہے۔ صف بندی قائد (امام) کے احکام پر متفقہ حرکت، وقت کی پابندی، صفائی و طہارت، صبح تڑکے اُٹھنے کی عادت یہ سب نماز کے جز ہیں۔ ایک حدیث میں (غالباً ابوداؤد میں) ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کو نکلتے تو بلندی پر چڑھتے وقت اللہ اکبر کہتے، نشیب آتا تو سبحان اللہ فرماتے۔ اسی پر نماز کے قیام و قعود اور رکوع و سجود کے اوراد مقرر کیے گئے"۔ نماز ایک ورزش اور کسرت بھی ہے، کیوں نہ ہو عماد الدین یعنی دین کا ستون ہے۔

جنگی ضروریات میں سفر کی عادت بہت ضروری ہے۔ حج اسی کا موقع بہم پہنچاتا ہے اس میں ہر سال مکہ معظمہ میں تمام دنیا کے مسلمان جمع ہوتے ہیں۔ یہ عالمگیر اخوت اور انسانی برادری (یا دوسرے الفاظ میں تمام رعایا کی یگانگی) کی یاد تازہ کرنے کا بھی بہترین وسیلہ ہے۔ جملہ صوبہ جاتِ مملکت اور اقطاعِ عالم کے مسلمانوں کی ایک سالانہ موتمر بھی ہے۔ خلیفہ اسلام کا ایک دربار عام بھی ہے، جس میں ہر حصے کی بہترین نمائندگی کی گئی ہے۔ زکوٰۃ کو لیجیے۔ حکومت بغیر مالیے کے عضو معطل ہے۔ زکوٰۃ اور عشر زراعت حکومتِ اسلامیہ ہی نہیں، ہر حکومت کے لیے لابدی اور ضروری ہیں۔ مگر تاریخ میں پہلی مرتبہ حکومت کی آمدنی کو بادشاہ کے صرف خاص کی جگہ ملکیت عامہ **(Public Property)** قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کا مصرف یوں معین کیا گیا کہ صدقات (یعنی زکوٰۃ، عشر، خمس، غنیمت وغیرہ) فقراء و مساکین کی امداد، عہدہ دارانِ متعلقہ کی تنخواہ، غلاموں کو آزاد کرانے، قرضداروں کو قرض سے نجات دلانے اور فی سبیل اللہ یعنی فوجی تیاری،

Marfat.com

رفاہِ عام، سڑکوں، پلوں کی تعمیر وغیرہ میں اور راہگزاروں کی امداد میں صَرف ہوں گے۔ انفرادیت و اجتماعیت کا بین بین، محنت اور سرمائے اور زمین کی اصلاح، سرمایہ داروں اور مزدوروں کے حقوق کا بہترین محافظ، ملک سے افلاس کو دور کرنے اور معاشی حالت کو سدھارنے کا علاج اگر کوئی اسلامی ادارہ کرتا ہے، تو یہی ادارۂ زکوٰۃ و صدقات ہے اور برنارڈ شا کے الفاظ میں اس سے بہتر کوئی امر ممکن نہیں۔[۲۰]

جہاں دنیاوی کاروبار کی تکمیل کے بہت سے ادارے قایم کیے گئے اور رہبانیت کو مردود ٹھہرایا گیا، وہیں متعدد احادیث و آیات کے ذریعہ خیرات کی انتہائی تاکید کرکے روحانی و مادی جذبات میں توازن قایم کیا گیا اور "فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنه" "دین و دنیا کی بھلائی" عام طور پر ہر فرد کا مطمح نظر قرار دیا گیا اور اسی سلسلے میں ہر سال مہینا بھر روزے رکھنے کا حکم دیا گیا، جس میں خود ضبطی، ایثار، امیروں اور مفلسوں میں یکسانیت غرض بہت سے مصالح پوشیدہ ہیں اور یہ سب امور شہریت کی تربیت کے لیے واجب قرار دیے گئے۔ ء

فرائض و مقاصد حکومت کی انجام دہی:

جدید اصول قانون میں حکومت کے اعلیٰ ترین فرائض صرف دو قرار دیے ہیں: جنگ اور عدل گستری۔ یہ دونوں دراصل حفاظتِ حقوق ہی کے دو ذریعے ہیں، جنگ غیر عدالتی ذریعہ ہے اور عدل گستری عدالتی۔ جنگ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوجی خدمات ہر مسلمان پر اسی طرح لازم کر دیے جس طرح اب بھی CONSCRIPTION کے نام سے اکثر یورپی ممالک میں ہے۔ حسب معمول طبیعت میں راسخ کر دینے کے لیے اسے بھی مذہبی رنگ دے دیا گیا، ورنہ جنگی تیاریوں کے لیے قوم کو عام رغبت[۲۰] دلانا کوئی آزاد و مختار قوم بے جا نہیں ٹھہرا سکتی۔ الفاروق میں شبلی صاحب لکھتے ہیں کہ اسلام سے قبل عام جبری فوجی خدمت کا طریقہ نہ تھا۔ اس کی ابتداء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہوئی۔ اس کا مزید تذکرہ آگے آئے گا۔ یہ یاد رہے کہ تبدیل مذہب کے لیے جنگ یا جبر کرنا اسلام میں جائز نہیں، لیکن حکومت الٰہیہ (سلطنتِ اسلامیہ) کے

Marfat.com

قیام کو مذہب سے (اس کے محدود معنوں میں) کوئی تعلق نہیں۔

حکومت کا دوسرا بڑا فریضہ عدل گستری ہے تا کہ ''امن'' انتظام اور تمدن کا دور دورہ ہو اور خوشحالی اور ترفہ کا زمانہ آئے۔ عدل گستری کے معنی یہ ہیں کہ ''جماعت، قوم اور اس کے افراد کے صحیح حقوق کی نگہداشت''۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عدالت کا جو مستحکم اور ترقی یافتہ ادارہ قایم کیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امیر و غریب سب کا قانون ایک رکھا گیا، جس کے اصول غیر متبدل تھے۔ قاضیِ وقت کے روبرو خود بادشاہِ اسلام پر مقدمہ دائر ہوسکتا تھا۔ تاریخ یہ واقعہ محفوظ رکھتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری عمر میں مجمع عام میں اعلان فرمایا کہ جس کسی کا آپؐ پر حق ہو، وہ طلب کرے اور جس کسی کو آپؐ سے تکلیف پہنچی ہو، وہ انتقام لے۔ صرف ایک شخص نے چند درہم کا مطالبہ کیا جس کی آپ نے فوری ادائی فرمائی۔ شاید حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کا اپنے دورِ خلافت میں قاضی کی عدالت میں حاضر ہو کر جواب دہی کرنا، یہاں ایک تذکرہ بے محل ہوگا، یہاں صرف اسلامی عدلیے کے خدوخال بیان کرنے ہیں کہ وہ عاملہ یا تنفیذیت سے مکمل اور قطعاً آزاد تھا۔ یہاں تک کہ قاضی کا فیصلہ نافذ ہونے سے بادشاہِ اسلام بھی نہیں روک سکتا تاوقتیکہ قاضی کا فیصلہ شرع و قانون کے صریح خلاف نہ ہو۔ قرآن مجید میں ہے کہ:

''خدا تم کو عدل کرنے کا حکم دیتا ہے۔''

نیز ''اور جب تم لوگوں میں فصلِ مقدمات کرو، تو عدل سے فیصلہ کرو۔''

ایسی احادیث بے شمار ہیں، جن میں عدل و انصاف کی تاکید اور ظلم و ستم پر دھمکی وارد ہے۔ غرض اسلام میں امیر و غریب، آقا و غلام، مسلم و غیر مسلم سب عدالتی نقطۂ نظر سے برابر کے حقوق اور وجوہات رکھتے ہیں۔

جس حکومت میں حقوق کی حفاظت اور انصاف ہو اور وہاں کی رعایا کے کلیات خمس ۲۲ (یعنی دین، عقل، نفس، نسب، مال) کی آزادانہ اور مکمل نگہداشت ہو، تو ان کی وفاداری اور امداد میں کیا شبہہ رہتا ہے؟ عدلیے کے لازمی جزو ''شرع اور تشریع''

(قانون و قانون سازی) ہیں۔ اسلامی قانون ''شخصی قانون'' ہے، یعنی مسلمان جہاں بھی ہو اسی کا پابند ہے۔ سائمنڈ ''اصول قانون'' میں لکھتا ہے کہ:

''مقامی قانون روز بروز بے وقعت بنتا اور کم ہوتا جا رہا ہے اور شخصی قانون بڑھتا جاتا ہے۔''

قانون کے استحکام اور تبدل پذیری کے متعلق ابھی تک بڑی بحث ہے۔ سائمنڈ کی رائے یہ ہے کہ قانون کا کچھ اصولی حصہ غیر تبدل پذیر ہونا چاہیے جس سے ذیلی قواعد حسب ضرورت بنائے اور بدلے جا سکیں تا کہ قانون ضروریاتِ زمانہ کا ساتھ دے کر تمدن کی ترقی میں معاون ہو نہ کہ خارج اسلامی قانون۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قسم کا قانون مقرر فرمایا۔ قرآن مجید میں غیر متبدل اصولی احکام ہیں احادیث میں قطعی اور متواتر بہت ہی کم ہیں۔ اس لیے کتاب و سنت سے مسائل قیاس و اجتہاد کی پوری اجازت دی گئی۔ مگر واضح رہے کہ متعدد قوانین و ضوابط کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے میں تدوین ہو چکی تھی، چنانچہ تعزیرات، ٹارٹ (ہرجے اور دیتیں) تحریری صورت پا چکی تھیں ۲۳۔ انہی چیزوں کو بعد میں ترقی دی گئی اور اس میں استنباطی ترقی کی پوری اجازت دی گئی۔ اسلامی ضابطہ قانون و تشریع کی ابتداء اس مشہور حدیث سے ہوتی ہے، جس میں معاذ ابن جبلؓ کو یمن کا عامل (گورنر) بنا کر بھیجتے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ وہ بطور قاضی کس طرح فیصلے صادر کریں گے، تو انہوں نے کہا کہ قرآن کے مطابق اور اگر اس میں نہ ہو، تو سنتِ نبویؐ کے موافق اور اس میں بھی پتا نہ چلے تو ''اجتهد برائي'' یعنی میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صحیح قرار دیا اور ان کی تعریف کی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ آپؐ کی امت میں ایسے صائب دماغ پیدا ہوئے ہیں (ترمذی)۔ ظاہر ہے کہ مختلف حکام عدالت کا اجتہاد مختلف ہو گا اور ایک مسئلے کے متعلق متضاد احکام بھی ہو سکیں گے اور غالباً اسی وجہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

اختلافُ أمتي رحمةٌ

(یعنی میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔)

Marfat.com

اور الدین یسرٌ۔ دین آسان چیز ہے۔ غرض یہ کہ اسلامی قانون میں ہر ملک اور ہر زمانے میں کارآمد ہونے کی صلاحیت ہے اور مسلمانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعت کے ہر زمانے کا ساتھ دے سکنے کے متعلق یہ صریح خوشخبری بھی دی ہے کہ ہر سو برس کے بعد ایک مجدد پیدا ہوگا، جو اس امت کے دین کی تجدید کرے گا[۲۴] اور واقعۃً ایسا ہوتا رہا ہے۔

مزید برآں قانون کا تبدل پذیر ہونا گو نظریے کی حد تک اچھا ہو، لیکن یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ عملاً قانون اسلامی کے اصول میں کسی ترمیم یا اصلاح کی ضرورت ہی اب تک نہیں پائی گئی بلکہ دنیا اسی کی طرف کھنچی چلی آ رہی ہے[۲۵]، اور مسئلہ توریث، ازدواج و طلاق اور ترکِ مسکرات میں خاص کر یورپ و امریکہ کا میلانِ طبع قابل ذکر ہے۔

قانون اور انصاف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بڑی ترقی دی تھی اور یہ امر کہ جواب دہ صرف خاطی اور مجرم ہی ہو، سب سے پہلے توریت میں اس کا حکم ہوا[۲۶]۔ قدیم تر زمانے میں ملزم کے اہلِ خاندان بلکہ اہلِ قوم بھی جواب دہ ہوتے تھے۔ اسلام نے ایک اور زبردست نظریہ قانون میں پیدا کر کے کروڑوں بے گناہوں کو محفوظ کر دیا اور وہ نیت کا مسئلہ تھا۔ حدیث کی کتابوں میں سب سے مشہور حدیث یہی مروی ہوتی ہے کہ:

"انما الاعمال بالنیات"

یعنی کام نیت کے مطابق ہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وقف، توریث، طلاق وغیرہ متعدد نئی چیزوں کو قانونی حیثیت عطا فرمائی اور "جائیداد" یا "دولت" کے متعلق ایسا انتظام فرمایا کہ دولت کی تقسیم میں توازن ہو، لا یکون دولۃً بین الاغنیاء منکم (تاکہ مال مالداروں ہی میں نہ پھرتا رہے) زکوٰۃ، مالگذاری، توریث، تحدید وصیت اس کے خاص اجزاء ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فصل مقدمات کا نہ صرف مستقل اور باقاعدہ انتظام فرمایا تھا اور نہ صرف قاضیوں کے تقرر اور ان کے لیے شہادت و قضا کے دستور العمل مرتب کیے گئے تھے، بلکہ ساتھ ہی افتاء (یعنی پبلک کو قانونی احکام دریافت کرنے پر مستند معلومات بہم پہنچانا) اور اصلاح بین الناس (یعنی بیرونِ عدالت جھگڑے رفع

Marfat.com

کرنے) کے انتظامات شروع فرمائے تھے۔ (سیرۃ النبیؐ۔شبلی)

عدالتوں کے ساتھ سزا دہندہ عملہ (جلاد وغیرہ) اور پولیس اور احتساب یعنی تجارتی و غیرتجارتی ہر قسم کے کاروبار کی نگرانی اور انسپکشن کی طرح بھی پڑ چکی تھی۔ (ایضاً) اسی سلسلے میں قانون شہریت اور رعایا کے باہمی برتاؤ پر روشنی ڈالنی چاہیے، جو حکومت کے استحکام میں بہت اہم حصہ رکھتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رعایا میں مسلمان اور ذمی (امان دادہ غیر مسلم) دو حصے قرار دیے۔ حفاظت حقوق کی حد تک سب برابر تھے۔ البتہ مسلمانوں پر جنگی خدمات فرض تھیں اور ذمیوں کو اس سے نیز دیگر بہت سے مسائل سے مستثنیٰ کیا گیا۔ صرف ان سے ایک حفاظتی ٹیکس لیا جاتا تھا، اسے جزیہ کہتے تھے۔ مسلمان رعایا کو اپنی قومیت کی فلاح و بقا کے لیے یہ تعلیم دی گئی کہ ''غیروں پر سخت اور باہم رقیق القلب'' نیز مومنوں پر نرم اور غیروں پر سخت ۲۷۔ سیاسیات کے اس عام اصول پر مزید بحث ضروری ہے۔ اسلام چونکہ محض خدا کا بول بالا کرنے کے لیے آیا تھا، اس لیے اکثر فقہاء کا یہ خیال ہے کہ صرف خدا کے قائل یعنی اہلِ کتاب کو اسلامی عملداری میں جزیہ دے کر رہنے کی اجازت ہے (مثلاً یہود، نصاریٰ، مجوس) بُت پرستوں کو اجازت سکونت نہیں۔ مگر اس پر عملدرآمد عرب کے باہر کبھی نہیں رہا۔ یہاں تک کہ ہندوؤں تک کو مشابہ اہلِ کتاب قرار دے لیا گیا۔

رعایا کے فرائض ''امداد، وفاداری و اطاعت حکومت ہیں'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت احتیاط سے نہ صرف اس کے احکام اور ترغیبات دیے بلکہ مسلمانوں کا ماحول ہی ایسا پیدا کر دیا کہ جس میں خود بخود ان فرائض کی تعمیل پر اُبھارنے والے جذبات کی آبیاری ہوتی ہے ۲۸، مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ جو ارکانِ مذہب ہیں۔ اس سے عملاً خود بخود امداد، وفاداری اور اطاعت کی تربیت ہوتی ہے۔ نیز ایک جگہ قرآن میں ہے: ''اور نزاع نہ کرو ورنہ فشل پیدا ہو جائے گا اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ ۲۹۔ اسکی فوجی اور ملکی یعنی سول ضبط یا ''ڈسپلن'' میں جیسی اہمیت ہے ظاہر ہے، ان کے علاوہ تمدنی فرائض بھی ہیں مثلاً حلال و حرام غذائیں، درست و غلط معاملات وغیرہ۔ ان کی

Marfat.com

تفصیل یہاں بے محل ہے، صرف اتنا تذکرہ کیا جاتا ہے کہ ان کی سائنٹیفک تقسیم کی گئی ہے یعنی حلال و حرام، مکروہ و مستحب اور مباح اور یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ انسان ملکی قانون سے زیادہ مذہبی اور ضمیری قانون کی تعمیل کرتا ہے۔ اس لیے فرائض شہریت کو مذہبی رنگ دے کر ذہنیت میں رچا دیا گیا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کی تعمیل حسب دلخواہ ہوئی، ورنہ امریکہ کا صرف قانوناً شراب حرام کر دینا عملاً بے اثر ثابت ہوا ہے۔ اسلام میں جس طرح شراب بند کی گئی، اس نظریہ سے امریکہ اور دنیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہی حال ہر قسم کی اصلاحات کا ہے، جس میں تدریج اور ذہنی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

حکومت کے لیے دستور لازمی چیز ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ''منتخبہ ذمہ دار ملوکیت'' "ELECTED RESPONSIBLE MONORCHY" قایم فرمائی، جو ایک بالکل نیا لیکن مسلمہ طور سے بہترین نظریہ ہے کیونکہ موروثی کی جگہ منتخبہ ہونے سے بہترین صلاحیت و قابلیت کا فرد حاکمِ اعلیٰ بنے گا۔ اسی طرح ہر فرد رعایا کے روبرو بالراست ہو یا بالواسطہ جوابدہ ہونے کے فوائد ظاہر ہیں ۳۰۔ ملوکیت بالاتفاق اس طرز حکومت پر بہ لحاظ افادہ مرجح ہے جو ایک جماعت پر مشتمل ہو، مگر شرط یہ ہے کہ فرد مستبد'' بہی خواہ و بے غرض ہو''۔ ذمہ دار شاہی جو مشورہ لینے کی پابند ہو، وہ پروفیسر لاسکی کے الفاظ میں اس مقصد کو بہترین طور سے پورا کرتی ہے ۳۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ عالمگیر حکومت قایم کرنی چاہتے تھے، اس لیے ایک زبان بولنے یا ایک ملک میں رہنے یا ایک قوم سے ہونے کو عقبی حصے میں ڈال دیا اور ہر رنگ اور ہر ملک کے مسلمانوں میں ایک ایسا رشتہ قایم کیا، جو خاندانی یا نسلی یا لسانی یا ملکی رشتوں سے کہیں مستحکم اور دیرپا تھا اور بتایا گیا کہ یہی حبل اللہ ہے، اسی کو تھامے رہنے میں مسلمانوں کی فلاح و بقا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے (شرعی) قانون اور خارجہ سیاست کے، جو مرکزی حکومت سے متعلق تھے اور امور میں بڑی حد تک صوبہ داری خودمختاری رکھی اور عامل یعنی گورنر کی ذات (جو بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں فرائض کی کثرت کے باعث عامل، قاضی، تحصیلدار مال تین افراد میں منقسم ہوگئی) صوبے میں

Marfat.com

بالکل خودمختار تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نیابت اور منصری کا طریقہ بھی ڈال دیا تھا۔ جب بھی آپؐ مستقر سے باہر جاتے، کسی کو اپنا نائب بنا کر چھوڑ جاتے ۵، تاکہ کاروبار عادی میں ابتری نہ پیدا ہو۔ مختلف انتظامی ادارے مثلاً خفیہ پولیس کا انتظام بھی قایم ہو گیا تھا۔ چنانچہ فتح مکہ سے قبل حضرت عباسؓ مکہ معظمہ میں خفیہ پرچہ نویس مقرر تھے ۱۵ دیگر اداروں کی بھی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ چنانچہ اسی سلسلے میں اوپر متعدد صیغوں کا تذکرہ ہو چکا ہے، جن میں سے عدالت، احتساب، پولیس، افتاء وغیرہ پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ ان کے سوا تبلیغ، تعلیم، سول و ملٹری سروس اور قوانین منضبطہ متعلقہ معاملات وغیرہ، فوج، صیغہ خارجہ (دارالانشا وغیرہ) اور صیغہء داخلہ (مہمانداری، عدالت، احتساب وغیرہ) اور صیغہء مالیہ کا مختصر تذکرہ کیا جائے گا۔

تبلیغ و تعلیم:

اسلام کے سب سے مقدم ادارے رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی مذہبی اور عام تعلیم کے لیے خاص ذرائع اختیار فرمائے۔ چنانچہ علاوہ ترغیب و تشویق کے خود معلم جا بجا بھجوائے۔ تعلیم یافتہ جنگی قیدیوں کا فدیہ یہ مقرر کیا کہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ (تشویق کے سلسلے میں اطلبوا العلم ولو کان بالصین، طلب العلم فریضةٌ علی کل مسلم و مسلمہ، والذین اوتوا العلم درجات، فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین وغیرہ قابلِ ذکر ہیں)۔

غیر مسلموں میں تبلیغ کے وسیع انتظامات مستقل طور سے قایم فرمائے۔ چنانچہ سرکاری آمدنی کی ایک اہم مد اس کے لیے مختص تھی۔ وقت بے وقت جو غیر معمولی آمدنی ہوتی تھی، اس سے بھی تالیف قلبی کی جاتی تھی۔ بے شبہ جبری اسلام پر کبھی کسی کو مجبور نہیں کیا گیا اور نہ قرآن اس کی اجازت دیتا ہے۔ البتہ مسلمانوں کا فریضہ قرار دیا گیا کہ ہر شخص تبلیغ دین کرے اور اعلائے کلمۃ اللہ میں حصہ لینے کی سعادت حاصل کرے۔ اس

Marfat.com

کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف عرب کے مختلف حصوں اور مصر و شام وغیرہ بلکہ کہتے ہیں کہ دُور دراز ممالک مثلاً چین وغیرہ تک بھی تبلیغ کے لیے خاص خاص صحابہ کو روانہ فرمایا۔

مساجد مسلمانوں کی بزم گاہیں ہیں اور ان کی ہر قسم کی دینی و دنیوی سرگرمیوں کا مرکز اور جزو غیر منفک۔ ان کی تعمیر و ترمیم، ائمہ و مؤذنین کے تقرر وغیرہ کی طرف بھی خاص توجہ فرمائی اور خاص احکام دیے۔

سول سروس:

ان سب کے ساتھ سول سروس کا ادارہ بھی قایم ہو گیا۔ جہاں گورنروں، قاضیوں، اماموں، مبلغوں، معلموں وغیرہ کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی اور ان کا امتحان لیا جاتا تھا۔ جن لوگوں کا کسی عہدے پر تقرر ہوتا تھا، انہیں زبانی اور تحریری دستور العمل اور ہدایات دیے جاتے تھے۔ عہدیدارانِ مال کو ہر قسم کے مداخل (زکوٰۃ، عشر، خراج، جزیہ وغیرہ) کی شرحیں تحریری طور پر لکھ کر دی جاتی تھیں۔ مخارج کا بھی ایک باقاعدہ دفتر تھا۔ چنانچہ ایک رجسٹر میں سرکاری وظیفہ یا تنخواہ پانے والوں کے نام تحریر تھے۔ مجرد و متاہل کی شرح میں ایک و دو کا تناسب تھا۔ بندوبست و مالگزاری کی طرح پڑ چکی تھی اور جاگیرات نوآبادی بسانے کے لیے ملنے لگے تھے۔ اس میں اصول یہ تھا کہ چشمے وغیرہ مفاد عامہ کی چیزیں شخصی ملک نہ ہو جائیں (شبلی صفحہ۲)۔ قاضیوں کو خاص کر فوج داری (تعزیری) اور دیوانی ضابطے مہیا کیے جاتے تھے اور ٹارٹ (ہرجے اور دیت) کے متعلق معلومات بہم پہنچائے جاتے تھے۔ جن امور میں متضرر قصاص معاف کر دے، وہاں متضرر کو کیا معاوضہ دلایا جائے، معاملات و معاہدات (خرید و فروخت، سود وغیرہ) اور سماجی تعلقات (مثلاً نکاح، طلاق وغیرہ) کے متعلق بھی آپ نے اصولی طور سے قوانین و قواعد مرتب فرما دیے تھے جن کی ضروری تفصیل و تشریح و ترمیم بھی وقت بوقت ہوتی گئی۔ ان تمام کی تدوین مسلمانوں نے بعد میں مکمل کی۔

فوج:

حکومت کی بقا اور ترقی کے لیے فوج ناگزیر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام فوجی تعلیم اور مستعدی اور تیار باشی کے زبردست احکام دیے۔ وقت بوقت تیراندازی، گھوڑ دوڑ، نیزہ بازی وغیرہ میں حصہ لے کر شوق بڑھایا۔

سپہ سالاروں کو بھی آگاہ کیا جاتا تھا کہ غیر جانب داری، جنگ اور اس سے پہلے اور اسکے بعد کیا امور ملحوظ رہیں۔ مثلاً آدابِ سفر و قیام، مختلف طبقوں کی مختلف پلٹنیں، صف آرائی، دشمن کو پہلے اطاعت کی دعوت دینا، غیر جنگی عنصر کو قتل نہ کرنا، نہ زراعت و عمارات وغیرہ کو تباہ کرنا، تقسیم غنائم، تبادلۂ قیدیاں، قیدیوں سے سلوک، زخمیوں کے لیے دواخانے اور مقتولین سے برتاؤ وغیرہ وغیرہ۔

دارالانشا:

میں فراین، توقیعات، معاہدے، مراسلتیں، احکام وغیرہ لکھائے جاتے تھے اور قرآن مجید مدوّن کرایا جاتا تھا (قرآنِ موجودہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پوری طرح مدوّن ہو چکا تھا۔ تاریخ القرآن۔ پروفیسر مفتی عبداللطیف جامعہ عثمانیہ)

صیغہ داخلہ:

مہمانداری، مریضوں کی عیادت پر توجہ کی جاتی تھی۔ عدالت و قانون و خفیہ پولیس کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے۔ یہ ہے حکومتِ اسلامیہ کے قیام اور اس کی تنظیم و تشکیل کا خلاصہ۔

حوالے

۱۔ شبلی۔ سیرۃ النبیؐ جلد اوّل NOLDKE DAS LEBAN MUHAMMAD سدیوکی (فرنچ تاریخ عرب باب ۸)

۲۔ ابن ہشام نیز صبح الاعشیٰ قلقشندی

Marfat.com

۳ عرب اور ایران کی مشہور جنگ، جو عین زمانۂ ولادت نبوی میں ''ذی قار'' نامی چشمے کے کنارے ہوئی اور جس میں عرب کامیاب رہے۔ دیکھئے سدیو SEDILLOT کی کتاب YLISTORIC GENERALE DES ARABES, LEW EMPIRE, LEW CIVILISATION اور ایام عرب مولفہ شرر وغیرہ۔

۴ شبلی وغیرہ

۵ عرب قبل اسلام، شام، ہند، چین وغیرہ سے تجارت کرتے تھے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے تمدن عرب مترجمہ سید علی بلگرامی اور مضمون حکیم شمس اللہ قادری ''تجارت العرب قبل الاسلام'' رسالہ دبدبۂ آصفی بابت رجب و شعبان ۱۳۲۳ھ۔

۶ قرآن مجید: لتکون کلمة اللّٰہ ھی العلیا

۷ ابن ہشام

۸ حدیث: بعثت لاتمم مکارم الاخلاق

۹ قرآن مجید: اذ کنتم اعدآء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا۔

۱۰ ابن ہشام

۱۱ تفسیر بیان القرآن از محمد علی۔ آیت: واولوا الارحام بعضھم اولی ببعض۔

۱۲ شبلی صفحہ ۱ ۸۱ھ میں یہودیوں اور ۸۲ھ میں بنی ضمرہ و بنی مدلج وغیرہ سے معاہدے ہوئے۔

۱۳ ابن ہشام

۱۴ قرآن مجید: اذ جاؤکم من فوقکم ومن اسفل منکم واذ زاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجر وتظنون باللّٰہ الظنونا ھنالک ابتلی المومنون وزلزلوا زلزالاً شدیدا۔ (۳۳: ۱۰-۱۱)

۱۵ اشارہ ہے بت شکنی کی مہموں اور جنگ حنین وغیرہ کی طرف۔ تفصیل ہر سیرت کی کتاب میں ملے گی۔

Marfat.com

۱۶ فوائد بدریہ از'' قاضی الملک بدرالدولہ۔ شبلی وغیرہ۔

۱۷ قرآن مجید: انما الصدقات للفقرآء والمساکین والعاملین علیھا والمؤلفة قلوبھم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللّٰہ وابن السبیل۔

۱۸ مضمون انگلستان کا مذہب آیندہ صدی میں حسب بیان برنارڈ شا بحوالہ رسالہ اشاعت الاسلام۔ لاہور

۱۹ سامند کی کتاب "JURISPRUNDENCE" حصہ اوّل

۲۰ قرآن مجید: (الف) ان اللّٰہ اشتری من المؤمنین انفسھم واموالھم۔

(ب) واعدّوا لھم ما استطعتم من قوة۔

(ج) لا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللّٰہ اموانا وغیرہ وغیرہ

۲۸ قرآن مجید: اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللّٰہ والرسول۔ الآیہ (۵۹:۴)

۲۹ قرآن مجید: ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم۔ الآیہ

۳۰ حدیث: کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔

۳۱ "THE NATIONOF LEAVING THE GOVERNMENT OF THE STATE TO DECIDE AND COMPELLING IT ONLY TO CONSULT, SEEMS PREFERABLE ...."

GRAMMAR OF POLITICS BY H. LASKI P.82 CH. SOVEREIGHTY.

ایچ لاسکی کی کتاب گریمر آف پالیٹکس باب ساورینٹی یعنی اقتدار اعلیٰ:

'' یہ خیال بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی حکومت کو فیصلے کا اختیار دے دیں اور اسے صرف مشورے لینے پر مجبور کیا جائے ....''

(نقوش لاہور۔ رسول نمبر (۳) جنوری ۱۹۸۳ء)

Marfat.com

عہدِ نبویؐ کی سیاستِ خارجہ کا شاہکار

پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تاریخِ عالم میں ایک انقلابی نقطہ اور ایک عہد آفریں دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایران اور روم کی سلطنتیں دنیا پر چھا جانے کی کوشش میں باہم زندگی و موت کی آویزش میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ اگرچہ چین اور ہند میں بھی متمدن قومیں حکمران تھیں لیکن بحرِ متوسط اس زمانے میں بھی نہ صرف جغرافیائی اعتبار سے بلکہ سیاسی و معاشی حیثیت سے ''وسط الارض'' (میدی ترانین) تھا۔ یونان اس سمندر پر آباد ہے، تو روم بھی، مصر و شام بھی اس کے ساحل پر ہیں، تو خود عرب کی شمالی سرحدیں اسی پر ختم ہوتی ہیں۔ ایران بھی اپنے حدودِ مملکت اس تک پہنچانے کی کوشش میں تھوڑی تھوڑی مدت کے لیے کئی بار کامیاب ہو چکا تھا۔ قدرت نے عرب کو ایشیا، یورپ اور افریقہ کے تینوں براعظموں کے بیچوں بیچ پیدا کیا ہے اور اس عرب میں بھی مکہ آباد ساحلی علاقے کے وسط میں واقع ہے اور یہ کوئی شاعری نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے کہ مکہ معظمہ نافِ زمین پر آباد ہے اور پرانی دنیا کی کوئی عالمگیر تحریک اس سے بہتر مرکز مشکل سے پا سکتی ہے۔ یورپ کی سردیوں، افریقہ کی گرمیوں اور ایشیا کی سرسبزیوں میں سے ہر ایک کا کچھ نہ کچھ حصہ حجاز کو ملا ہوا ہے اور اس امر نے وہاں والوں کو تینوں براعظموں کی اخلاقی خوبیاں عطا کر دی تھیں۔ جنگی نقطۂ نظر سے بھی اس سے محفوظ مقام کم

Marfat.com

مل سکتے ہیں۔ ۱۳ ق، ۶۱۰ء میں پیغمبر اسلامؐ نے اپنے آبائی شہر مکہ میں اصلاح دین کی کوشش شروع فرمائی۔ اور معدودے چند لوگوں کے ہم خیال ہونے کے ساتھ ساتھ عام اہلِ ملک کی دشمنی اور عملی مخالفت میں روزافزوں اضافہ ہوتا گیا۔ آخر تیرہ کٹھن سالوں کے اختتام پر ۱ ھ، ۶۲۲ء میں آپ کو وطن سے بے وطن ہوکر مدینہ منورہ جا رہنا پڑا۔ جیسا کہ معلوم ہے، نراج میں آپ نے ایک تنظیم پیدا کرنے اور ایک شہری مملکت کے قائم کرنے میں کامیابی حاصل فرمائی۔ جس کا تحریری دستور تاریخ نے آج تک (۵۲) دفعات کی ایک دستاویز کی صورت میں محفوظ رکھا ہے [۱]۔ مدینہ آنے کے چند ہی مہینوں بعد آپ آس پاس کے قبائلی علاقوں کا دورہ فرمانے اور ان سے حلیفانہ تعلقات فرمانے لگے۔ چنانچہ مدینے سے ینبع تک جو علاقہ ہے، وہاں کے قبائل (بنی ضمرہ، مُدلج وغیرہ) نے باوجود اسلام قبول نہ کرنے کے اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ اگر کوئی مدینہ پر حملہ آور ہو تو یہ مسلمانوں کو مدد دیں اور اگر ان کے علاقے پر کوئی چڑھائی کرے، تو مسلمان ان کو مدد دیں۔ البتہ جارحانہ پیش قدمی میں غیر جانبداری برتی جائے [۲]۔ یہ وہی علاقہ ہے، جہاں سے کاروانی قافلے گزرا کرتے تھے۔ اور مکے والے اگر شام، مصر یا عراق جانا چاہتے تو اسی راستے سے گزرتے تھے۔ اس راستے کی بندش قریش پر معاشی دباؤ ڈالنے میں اتنی مؤثر ثابت ہوئی کہ بدر کی فاش شکست بھی انہیں اتنا بے بس نہ کرسکی۔ ۳ ھ میں احد میں مسلمانوں کو صدمہ پہنچا، لیکن فوراً ہی انہوں نے اس کی تلافی یوں کی کہ نجد کے علاقے میں جو مدینے کے مشرق میں ہے، اپنے اثرات پھیلا دیے اور مکے والوں کو عراق جانے کا جو متبادل گو تکلیف دہ راستہ باقی رہ گیا تھا، وہ بھی بند ہوگیا۔ اسی اثنا میں بنی قینقاع اور بنی النضیر کے یہودی مضافاتِ مدینہ سے جلاوطنی پر مجبور ہوئے، تو انہوں نے مدینہ کے شمال میں خیبر وغیرہ کی یہودی بستیوں میں جا کر بسنا اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنی شروع کیں اور قریش وغطفان وغیرہ

---

۱ اس پر میرا مضمون ''دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور'' مجلہ طیلسانین حیدرآباد دکن جولائی ۱۹۳۹ء ملاحظہ ہو۔

۲ ان کے متن کے لیے دیکھیے میری عربی تالیف الوثائق السیاسیہ (قاہرہ ۱۳۶۰ھ)

قبائل کو ورغلانا آغاز کیا۔ عرب کے شمال میں دومتہ الجندل ایک بڑا اہم کاروانی جنکشن تھا۔ مدینہ آنے والے کاروانوں کو یہاں چھیڑا جانے لگا [1]۔ جو کوئی تعجب نہیں کہ یہودی سرمایہ داروں کے اثرات ہی کے باعث ہو اور انہی یہودیوں کی کوشش سے غطفان و فزارہ نے ایک طرف سے اور قریش اور ان کے حلیفوں نے دوسری طرف سے خندق کے معرکے میں مدینے کا محاصرہ کیا اور انتظام کرلیا گیا کہ عین نازک لمحے میں مدینے کے اندر کے باقی یہودی یعنی بنی قریظہ بھی غداری کریں جب کسی طرح یہ بلا ٹلی اور بنی قریظہ کو اپنے کیے کی سزا بھگتنی پڑی، تو خیبر و تیماء اور وادی القریٰ و مقنا وغیرہ کے یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف نئے سرے سے شدید جدوجہد کا آغاز کیا۔

یہ مسلمانوں کے لیے بڑا نازک زمانہ تھا۔ شمال میں خیبر وغیرہ یہودی قوت کے مرکز تھے۔ شمال مشرق میں فزارہ وغطفان کے قبائل خیبر والوں کے حلیف تھے اور ان کی مسلمانوں سے بنتی نہ تھی اور جب موقع ملتا، یہ مسلمانوں کی تاخت کے درپے رہتے تھے [2]۔ جنوب میں مکہ تھا، جس کی قوت چاہے معاشی طور سے متاثر ہوئی ہو، جنگی حیثیت سے برقرار تھی اور یہ سب کے سب غم وغصہ سے بیقرار اور مسلمانوں کے خلاف خار کھائے بیٹھے تھے اور سابقہ ناکامیوں کی خلش الگ تھی۔ آثار یہ نظر آرہے تھے کہ خیبر میں جا بسے ہوئے (جلاوطنانِ مدینہ یعنی) بنی النضیر کی کوششیں رنگ لائیں گی اور یہودی غطفان اور قریش سہ گانہ قوت مدینے پر ہلہ بول دے گی۔ جس کی مدافعت آسان نہ تھی۔ معرکہ خندق میں دس ہزار کا لشکر مدینہ پر چڑھ آیا تھا جس میں یہود شریک نہ تھے۔ مجوزہ حملے میں کچھ نہیں تو تین چار ہزار مزید سپاہیوں کا اضافہ ہو جاتا۔ خندق میں جوان اور بچے ملا کر مسلمانوں کے پاس کوئی تین ہزار آدمی تھے۔ اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔

ضرورت تھی کہ خیبر اور مکہ دونوں کی قوت کا استیصال کیا جائے۔ مگر مسلمانوں کے پاس اتنی قوت نہ تھی کہ وقت واحد میں ان دونوں مرکزوں پر حملہ کر سکتے یا کم از کم مدینے کی مدافعت کے قابل محافظ دستہ چھوڑ کر کسی ایک مرکز کو تباہ کر سکنے والی فوج روانہ

---

[1] التنبیہ والاشراف للمسعودی ص: ۲۴۸

[2] عیینہ بن حصن الفزاری کی تاخت مدینہ کی طرف اشارہ ہے

Marfat.com

کر سکتے۔ ساتھ ہی اس کا بھی خوف لگا ہوا تھا (جیسا کہ شمس الائمہ سرخسی نے کتاب المبسوط[1] میں نہایت بالغ نظری اور تہ بینی سے واضح کیا ہے) کہ اگر مسلمان مکہ جاتے ہیں، تو خیبر و غطفان مدینے پر چڑھ نہ دوڑیں اور اگر مسلمان خیبر جائیں تو مکہ والے اپنے مواشی و موالی کے ساتھ آ کر مدینہ لوٹ نہ لیں۔ کیونکہ مدینہ بیچوں بیچ واقع ہے۔ خیبر اس کے شمال میں کوئی آٹھ منزل کی مسافت پر ہے تو مکہ اس کے جنوب میں بارہ منزل پر ہے۔

ان حالات میں سیاست دانی کا اقتضاء یہی ہو سکتا ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک دشمن سے صلح کر کے دوسرے کے مقابلے میں اس کو دوست ورنہ کم از کم ناطرفدار بنا دیا جائے اور جب ایک سے فراغت ہو جائے گی، تو دوسرا خود ہی ہتھیار ڈال دے گا اور اسے پھر سرزوری کی جرأت نہ ہو گی۔ سوال یہ تھا کہ صلح مکے والوں سے کی جائے یا خیبر والوں سے؟ خیبر کے حلیف و معاون یعنی فزارہ و غطفان محض لوٹ مار کے شائق اور بالکل بے اصول خانہ بدوش عرب تھے۔ خیبر میں یہودی تھے، جو تمدنی اور نسلی وجوہ سے عربوں سے الگ تھے۔ ان کو اپنی جلاوطنی اور جائیداد کے لٹنے کا داغ تھا۔ جو جائیداد کی واپسی کے بغیر مٹ نہ سکتا تھا۔ سرمایہ داری کی وجہ سے کوئی معمولی ''مابہ الاحتظاظ'' ان کو مطمئن نہ کر سکتا تھا اور نہ ہی ان کی بات پر کوئی اعتماد کیا جا سکتا تھا شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ خیبر کا مالدار مرکز ایک نسبتۃً غیر جنگ جو قوم کے قبضے میں ہونے سے آسان تر مالِ غنیمت بھی تھا۔

دوسری طرف مکہ مسلمانوں کے لیے بہت سی رعایتوں کا متقاضی تھا۔ مسلمان مہاجرین سب مکی ہی تھے اور اہلِ مکہ ان کے رشتہ دار۔ کعبہ مسلمانوں کی نماز کا قبلہ اور حج کی منزلِ مقصود تھا۔ اہلِ مکہ کی تباہی سے زیادہ ان کا اسلام زیادہ مفید ہو سکتا تھا۔ کیونکہ قریش کے معاشی اور تمدنی تعلقات تمام عرب سے تھے اور ان کی صلاحیتیں تمام عرب میں سب سے زیادہ تھیں۔ کیونکہ ان میں بات کا پاس تھا، وہ دھن کے پکے تھے، قومی مفاد کے لیے تن من دھن سے لگ جاتے تھے۔ طبیعت مہمات پسند تھی، ادبی ذوق اور

---

[1] جلد ا ص: ۸۶

انتظام ملک کی قابلیت و ملکہ بھی عام بدویوں کے مقابلے میں ان میں کہیں بڑھا ہوا تھا اور شاید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے معاشی دباؤ کے باعث اب وہ واقعی صلح پر آمادہ بھی ہو چکے تھے اور صرف لاج رکھنے کے لیے کسی اچھی شرط کے منتظر تھے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں حجاز میں سخت قحط پڑا تھا۔ اور مکے والوں کی رسد کے مرکز یمامہ پر بھی مسلمانوں کا (ثمامہ بن اثال کے اسلام لانے کے باعث) قبضہ ہو کر درآمد بند ہو گئی تھی [1]۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بندش کا اثر محسوس کرا دینے کے بعد اپنی مرضی اور اختیار سے ممانعت اٹھا [2] کر نیز مکے والوں میں سے غربا و فقراء کی امداد کے لیے سرمایہ قحط میں اس زمانے میں پانچ سو اشرفیاں روانہ کر کے [3] وہاں کے عوام کے دل موہ لیے تھے اور مکے کے سب سے بڑے اور بااثر سردار ابوسفیان کی لڑکی بی بی اُم حبیبہؓ سے، جو حبشہ گئی ہوئی تھیں، اس زمانے میں عقد غائبانہ کر لیا تھا۔ نیز مختلف سامانِ ضرورت (کھجور وغیرہ) ابوسفیان کو "ہدیہ" بھیج کر معاوضہ میں جانوروں کی کھالیں طلب کی تھیں [4] غرض باوجود حالتِ جنگ قائم رہنے کے یہ خاموش دلدہی کے کام جاری تھے۔ قریش کے حج کا زمانہ بھی آ گیا تھا جس میں وہ مسلسل تین ماہ تک لڑائی بھڑائی حرام سمجھتے اور اس میں ان کا سخت ترین دشمن بلکہ قابل قصاص ملزم بھی ان کے شہر میں انہیں ملتا، تو اس پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ مسلمانوں نے بھی قریش ہی کے کعبے کو اپنا قبلہ بنا لیا تھا اور حج کعبہ کو بھی اپنے دین کا جز بنا لیا تھا۔ جس کا نفسیاتی اثر قریش پر پڑے بغیر رہ نہ سکتا تھا۔

ان حالات میں معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سوچا کہ اگر حج کے مہینوں میں مکہ جائیں اور ارادہ طواف کعبہ اور قربانی و عمرہ کے لیے ہو اور قریش کو منہ مانگی شرطیں پیش کی جائیں، تو کوئی تعجب نہیں جو وہ صلح پر آمادہ ہو جائیں اور اتفاق

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ص: ۹۹۷ تا ۹۹۸۔ استیعاب ابن عبدالبر، سوانح عمری ص: ۲۷۸

[2] ایضاً

[3] مبسوط سرخسی جلد ۱۰ ص: ۹۱ تا ۹۲۔ شرح السیر الکبیر سرخسی جلد ا ص: ۶۹

[4] مبسوط سرخسی جلد ۱۰ ص: ۹۲ شرح السیر الکبیر سرخسی جلد ا ص: ۷۰

سے اسی زمانے میں نینوا کے مقام پر ایران و روم کی صدیوں سے چلی آنے والی جنگ ایران کی مکمل اور قطعی شکست پر منتج ہوئی تھی [1]۔ اور کچھ اور نہیں تو عرب میں جو "لاوارث" ایرانی صوبے مثلاً یمن، بحرین، عمان تھے، ان کے متعلق حسب دلخواہ کارروائی کرنے کا اس بین الاقوامی صورت حال کے باعث ایک خداداد اور نادر موقع بھی ہاتھ آ گیا تھا۔ یمامہ پر قبضہ کے باعث مسلمان پہلے ہی بحرین و عمان کے قریب پہنچ گئے تھے۔ قریش کا ہموار ہونا یمن کا راستہ بھی کھول دیتا تھا اور رومیوں کی نینوا میں کامیابی ابھی فی الحال شمال میں کسی بڑی کارروائی میں مانع تھی۔

ہمیں معلوم ہے کہ مدینے میں قابل کار مسلمان مرد تقریباً تین ہزار تھے۔ اب ذی قعدہ کے مہینے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو آدمیوں کے ساتھ مدینے سے چلتے ہیں۔ حج کا احرام بندھا ہوا ہے اور ساتھ قربانی کے جانور ہیں اور ارادہ محض سالمانہ ہے اس لیے ساتھ جنگی ہتھیار تک نہیں ہیں۔ (البتہ کچھ دور جانے کے بعد حضرت عمرؓ کے مشورے سے احتیاطاً مدینے سے فوجی مخزن منگا لیا جاتا ہے [2]۔ جو ساتھ رہتا ہے مگر بند حالت میں) مسلمان کافی فوج مدینے میں چھوڑ گئے تھے اور خاموشی کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں سے حدودِ حرم شروع ہوتے ہیں۔ جہاں سے ساحلی میدان ختم ہو کر دشوار گزار وادیاں اور پہاڑی سلسلے شروع ہوتے ہیں۔ مکے والوں کو اطلاع مل گئی تھی اور جنگی نقطہ نظر سے حدیبیہ کے درّے کے دہانے پر حریف کو روکنے سے بہتر ان کے لیے کوئی اور مقام نہیں مل سکتا تھا۔ یہ جگہ مکہ سے صرف دس بارہ میل پر واقع ہے اور ایک طرح قریش اپنے گھر ہی میں رہ کر دُور دراز سے آئی ہوئی اور ہر طرح کی رسد اور مدد سے منقطع اسلامی فوج سے لڑ سکتے تھے۔

حدیبیہ آتے ہی سفارتی سرگرمی شروع ہو گئی۔ قریش کے نمائندے اور کارندے آ آ کر مقصد معلوم کرنے لگے آخر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے داماد حضرت عثمانؓ کو مکہ بھیجا کہ مختار کل کی حیثیت سے گفت و شنید کریں۔ مکے میں عجیب بدنظمی تھی اور

۱۔ دیکھیے گرلانڈ کی جرمن کتاب "قیصر ہرقل کی جنگی مہمیں"

۲۔ تاریخ طبری ص: ۱۵۳۱

Marfat.com

کوئی مرکزیت نہیں پائی جاتی تھی۔ ان کا سب سے باا‌ثر سردار ابوسفیان بھی کسی نامعلوم راستے سے چھپ چھپا اور بچ بچا کر ان دنوں شام گیا ہوا تھا۔ اسی لیے حضرت عثمانؓ نظر بند ہو گئے اور ان کی واپسی میں دیر ہوئی تو مسلمانوں کو خوف ہوا کہ کہیں انہیں شہید نہ کر دیا گیا ہو۔ اب مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور حدیبیہ میں انہوں نے مرنے مارنے کا اقرار کیا جس کا "إذیبا یعونك تحت الشجرة" کے الفاظ میں قرآن مجید میں بھی ذکر ہے۔ قریش کو خبر ملی تو وہ گھبرائے آخر صلاح کر کے انہوں نے سہیل بن عمر کو مختار کل کر کے سفیر بنا کر حدیبیہ بھیجا اور تھوڑی سی رد و قدح کے بعد صلح نامہ طے ہو گیا۔ قریش کو اطمینان ہو گیا کہ ان کا مطالبہ کہ:

۱۔ مسلمان اس سال مکہ آئے بغیر واپس ہو جائیں اور سال آئندہ عمرہ کرنے آئیں۔

۲۔ کوئی مسلمان بھاگ کر مکہ آئے اور پناہ گزیں ہو، تو اس کی تحویل عمل میں نہ آئے لیکن کوئی مکی بھاگ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو مطالبے پر اس کی قریش کے ہاتھ تحویل عمل میں آ جائے۔

۳۔ دس سال تک باہم صلح رہے۔ ایک دوسرے کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں اور تجارت وغیرہ مسالمانہ ضرورتوں سے ایک دوسرے کے علاقے سے گزرنے کی اجازت ہو۔

اسے جب مسلمانوں نے منظور کر لیا اور معاہدہ کے متن میں بجائے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم" کے خالص فارمولے کے قریش فارمولا "باسمك اللّٰهم" لکھا جانا اور "مُحَمَّدٌ رسُول اللّٰه" کی جگہ "مُحَمَّد بن عَبدُاللّٰه" لکھا جانا طے ہوا تو گویا فتح قریش ہی کی ہوئی اور انہیں دبنا پڑا اور بظاہر یہ صحیح بھی تھا اور مسلمان سپاہیوں میں عام طور پر رنج کی لہر دوڑ گئی۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ جیسے دقیقہ رس مدبر بھی اپنی بے چینی کو چھپا نہ سکے۔ لیکن مسلمانوں میں نظم وضبط اتنا کچھ آ چکا تھا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ طے ہو چکا ہے اور آپؐ اس کو پسند کرتے ہیں، تو پھر کسی کی مجال نہ تھی کہ سوائے خاموشی اور اطاعت شعاری کے کچھ اور کریں۔

Marfat.com

حدیبیہ کی اس صلح (یا بقول قریش "شکست") کو قرآن مجید میں مسلمانوں کے لیے "فتح مبین" اور "نصر عزیز" کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ بادی النظر میں حیرت ہوتی ہے کہ یہ "برعکس نہند نام زنگی کافور" کیوں؟ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلامی حکومت تو قریش کی منہ مانگی شرطیں منظور کرنے کو تیار تھی۔ صرف خیبر میں جنگ سے ان کی غیر جانبداری مطلوب تھی۔ اسے قریش نے منظور کر لیا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ رعایتیں منظور کر لی تھیں۔ "باسمك اللھم" کے فارمولے میں کوئی شرک یا بت پرستی نہیں ہے اور اس کو نیز "محمد بن عبداللہ" کو منظور کرنے میں مسلمانوں کا کوئی نقصان نہ تھا۔ اسی طرح عمرے میں رکاوٹ معمولی امر ہے اور "من استطاع الیہ سبیلا" کے باعث اس وقت وہ مسلمانوں پر فرض ہی نہ تھا۔ یک طرف تحویل ملزمین کی توجیہ خود جناب رسالتمآب نے یہ فرمائی کہ ہمارے پاس سے بھاگ کر جانے والا کافر ہی ہوگا۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ اور قریش کے پاس سے بھاگ کر آنے والا مسلمان ہی ہوگا اور اگر وہ اپنے ہم وطنوں کے مظالم پر صبر کرے گا تو خدا اسے اجر دے گا۔ یوں بھی چند ہی دنوں میں اسلامی عملداری کے باہر نومسلموں نے قریشی کاروانوں کا کچھ وہ ناطقہ تنگ کر دیا کہ خود قریش نے جناب رسالتمآب سے التجا کی کہ اس شرط کو منسوخ کر کے ان نومسلموں کو مدینہ بلا لیں اور تیسری شرط تو مسلمان خود ہی چاہتے تھے کہ قریش مسلمانوں سے صلح کر لیں اور مسلمانوں کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں اور اس میں ذرا بھی شبہ نہیں رہتا کہ مسلمانوں کے لیے سخت ترین نازک زمانے میں حدیبیہ میں قریش کا اس صلح پر آمادہ ہو جانا اسلامی سیاستِ خارجہ کی ایک واقعی "فتح مبین"، "نصر عزیز" تھی جس کے باعث ان کے ہاتھ کھل گئے اور فوری خطرات پر نجات ملنے پر انہوں نے آزادی کے ساتھ تین ہی سال میں پُرامن ذرائع سے اپنی مملکت کو تقریباً دس گنا پھیلا کر پورے جزیرہ نمائے عرب کو اپنا مطیع بنا لیا اور وہاں سے رومی اور ایرانی اثرات بالکل خارج کر کے ایک ایسی مستحکم حکومت قائم کر دی، جو پندرہ ہی سال میں تین براعظموں پر پھیل گئی اور جو اس سے ٹکرایا، پاش پاش ہو کر رہ گیا اور جس نے سرِ تسلیم خم کر دیا، وہ اسلام کے رنگ و زبان سے بالا قومیت میں برابری کے حصے کے ساتھ شریک ہو گیا۔

Marfat.com

یہی وہ صلح حدیبیہ ہے، جسے عہدِ نبویؐ کی سیاست خارجہ کا شہ کار کہنا چاہیے۔ اس معاہدہ کا متن عربی ماخذوں میں کہیں تو پورا پورا، کہیں جستہ جستہ ملتا ہے، جس کی تفصیل میں نے الوثائق السیاسیہ (مطبوعہ مصر ۱۳۶۰ھ) میں دستاویز نمبر ۱۱ کے تحت دی ہے۔ یہاں اس کا ترجمہ کافی ہوگا۔

معاہدہ حدیبیہ:

۱۔ تیرے نام سے اے اللہ!

۲۔ یہ وہ معاہدہ ہے، جو محمدؐ بن عبداللہ اور سہیل بن عمرو میں طے ہوا،

۳۔ ان دونوں نے اس بات پر صلح کر لی ہے کہ دس سال تک جنگ روک دی جائے، جس دوران میں لوگ امن سے رہیں اور ایک دوسرے سے رُکے رہیں۔

۴۔ یہ کہ محمدؐ کے ساتھیوں میں سے جو حج یا عمرے یا تجارت کے لیے مکہ آئے، تو اس کی جان و مال کا امان ہوگا اور قریش کا جو شخص تجارت کے لیے مصر یا شام (بروایت ابوعبیدہ عراق یا شام) جاتے ہوئے مدینے سے گزرے، تو اسے جان و مال کا امان حاصل ہوگا [1]۔

۵۔ یہ کہ قریش کا جو شخص اپنے ولی (سرپرست) کی اجازت کے بغیر محمدؐ کے پاس آئے گا، تو آپؐ اسے ان کے سپرد کر دیں گے اور محمدؐ کے ساتھیوں میں جو شخص قریش کے پاس آجائے گا، وہ اسے آپؐ کے سپرد نہیں کریں گے۔

۶۔ یہ کہ ہم میں باہم سینے ہر طرح بند رہیں گے (جن میں باہر سے کوئی غداری داخل نہ ہو سکے گی) اور نہ تو خفیہ کسی دوسرے کو مدد دی جائے گی نہ علانیہ خود خلاف عہد دغا کریں گے۔

۷۔ یہ کہ جو محمدؐ کے معاہدہ اور ذمہ داری میں داخل ہونا چاہتا ہے، وہ بھی ایسا کرے گا

۱۔ یہ دفعہ ابن اسحٰق اور ابن ہشام میں نہیں ہے۔ نہ ہی تاریخ طبری میں ہے۔ لیکن تفسیر طبری، ابو عبید کی کتاب الاموال، فتوح بلاذری اور بکری وغیرہ میں ہے۔

Marfat.com

(اس پر قبائل خزاعہ نے اُٹھ کر کہا کہ ہم محمدؐ کے معاہدہ اور ذمہ داری میں شریک ہوتے ہیں اور بنی بکر نے کہا کہ ہم قریش کے معاہدہ اور ذمہ داری میں شریک ہوتے ہیں۔)

۸۔ یہ کہ تو اس سال ہمارے پاس سے واپس چلا جائے گا اور ہمارے ہاں مکہ نہ آئے گا۔ البتہ سال آئندہ ہم باہر چلے جائیں گے اور تو اور تیرے ساتھی وہاں (مکے میں) داخل ہو کر تین راتیں ٹھہر سکیں گے۔ تیرے ساتھ سوار کا ہتھیار ہو گا یعنی تلوار میان میں پڑی ہوئی۔ اس کے سوا کوئی اور ہتھیار لے کر تو وہاں نہ آسکے گا۔

۹۔ یہ کہ یہ قربانی کے جانور وہیں رہیں گے، جہاں ہم نے ان کو پایا (یعنی حدیبیہ میں) اور ان کو حلال کر دیا جائے گا اور ان کو ہمارے پاس (مکہ قربانی کے لیے) نہیں لایا جائے گا۔ اور صراحت کہ ہمارے اور تمہارے حقوق اور واجبات برابر کے ہوں گے۔

(غالباً) مہر نبویؐ

(غالباً) مہر سہیل بن عمرو

گواہانِ اسلام: ابوبکرؓ، عمرؓ، عبدالرحمٰن بن عوف، عبداللہ بن سہیل بن عمرو، سعد بن وقاص، محمود بن مسلمہ، ابوعبیدہ بن الجراح وغیرہ

گواہانِ قریش: مکرز بن حفص، وغیرہ

کاتب: علیؓ بن ابی طالب

Marfat.com

ماخذ ہائے متن:

تفسیر طبری ص ۲۶، ص ۶۱، سیرۃ ابن ہشام ص ۷۴۷ تا ۷۴۸، فارسی ترجمہ سیرۃ ابن اسحٰق ورق ۱۷۰/الف (مخطوطہ پاریس) مغازی واقدی (مخطوطہ برٹش میوزیم) ورق ۱۴۰/الف (طبقات ابن سعد ج۱) حصہ نمبر۲ ص ۴۷ نیز ج ۲ حصہ نمبر۱ ص ۷۰ تا ۷۱، تاریخ طبری ص ۱۰۴۶ تا ۱۰۴۷، سیرۃ طبری بروایۃ الکبریٰ (مخطوطہ آیاصوفیاء) فصل حدیبیہ تاریخ ابن کثیر ج ۴ ص ۱۶۸ تا ۱۶۹، تاریخ الخمیس للدیار بکری ج ۲ ص ۲۳، تاریخ ابن الاثیر ج ۲ ص ۱۵۶، سیرۃ حلبی ج ۳ ص ۲۳۔

ماخذ ہائے اقتباس متن:

کتاب الاموال لابی عبید ص ۴۴۱ تا ۴۴۴۔ صحیح البخاری ۶۴/۴۳، ۶۴/۳۵-۲۹، ۶۴، ۶/۷، ۵۴/۱، ۵۴ وغیرہ۔ عن کتب سید المرسلین لابن طولون نمبر ۲۶۔ فتوح بلاذری ص ۳۶۔ تاریخ الیعقوبی ج ۲ ص ۵۵۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد۔

جدید بحث و ترجمہ:

کائتانی کی اطالوی تاریخ اسلام حالات ۶ھ ص ۳۴۔ ہیفنگ کی جرمن کتاب ''اسلام کا قانون خارجہ'' ضمیمہ دوم۔

اشپرنگر کی جرمن ''سوانح و تعلیمات محمدیؐ'' ص ۳، ص ۲۴۶ جہاں تمی کے ایک اور متن کا ذکر ہے۔ نقل نہیں۔

مجید خدوری کی انگریزی کتاب ''اسلام کا قانون جنگ و امن'' ص ۸۹

مزید حوالے فنسنک کی مفتاح کنوز السنہ میں تحت عنوان حدیبیہ ہیں۔

(نقوش لاہور - رسول (۳) جنوری ۱۹۸۳ء)

Marfat.com

عہدِ نبویؐ کے اصولِ سیاسیات

ایک شخص جس کو وطن میں جان کے لالے پڑے ہوں۔ صرف ایک رفیق کے ساتھ غاروں میں چھپتا، نامانوس اور دشوار گزار راستوں پر چلتا سیکڑوں میل دور جا پناہ گزیں ہوا ہو۔ وہ دس ہی سال بعد جب انتقال کرتا ہے تو دس لاکھ مربع میل کے علاقے پر حکمران ہو چکا تھا۔

پھر اس علاقے میں جہاں اس سے پہلے کبھی سیاسی مرکزیت آئی ہی نہ ہو اور ملک قبائلی سطح تمدن سے بلند نہ ہو سکا ہو، اس مزاج میں ایک راج قائم کرے اور بغیر نمونے کے ایک باقاعدہ مملکت کی ضرورت کی ہر چیز رائج کرے اور ایک ایسی حکومت قائم کرے جس کا آغاز ایک شہر کے چند محلوں سے ہو اور جو ۲۷ ہی سال میں دنیا کی دو عظیم ترین شہنشاہیوں میں وقت واحد میں لڑکر اور بیسیوں دیگر سلطنتوں کو شکست دے کر ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے تین براعظموں پر پھیل جائے۔

اس سیاست کا مطالعہ صرف ایک عظمتِ ماضیہ کا مطالعہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک ایسی شخصیت کے کارناموں کا مطالعہ ہے جس کے ہر قول وفعل کو اب بھی دنیا کی چوتھائی آبادی اپنا قانون اور اپنا اسوۂ حسنہ سمجھتی ہے۔ اگرچہ انسانوں کا یہ گروہ دنیا کی چوتھائی آبادی ہی پر مشتمل ہے لیکن ایک تو یہ ''مشارق الارض'' سے ''مغارب الارض'' تک پھیلا ہوا ہے۔ دوسرے پرانی دنیا کی اکثر اہم شاہراہوں پر سیاتا نہیں تو سکونتہ قابض ہے۔ تیسرے زیادہ تر جنگی نسلوں پر مشتمل ہے۔ چوتھے عظیم الشان اور قابلِ رشک تاریخ رکھتا ہے۔ جس کے پچھلے کارہائے نمایاں ہمیشہ امکانات کے خوش آئند

Marfat.com

ارادے اور ولولے پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پانچویں یک نسلی نہ رکھنے کی وجہ سے ہمیشہ اس کا کوئی نہ کوئی جز ''میقاتی انحطاط'' کو ختم کر کے نئی زندگی کا ثبوت دیتا رہتا ہے۔ چھٹے ابھی تک اس کا پھیلاؤ رکا نہیں اور انتہائی ناسازگار مقاموں میں زبردست ترین اور منظم حریفوں کو شکست دے رہا ہے اور ساتویں اس کے پرانے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کے قاعدے متمدن ممالک میں بھی ضروریات حاضرہ کے مطابق خیال کیے جا رہے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

سیاست کاری:

عہد نبویؐ کی سیاستِ خارجہ کے اصول دو حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں بعض ایسے تھے جو عام اور ہمہ گیر تھے اور ہر حال میں اور ہر کسی کے ساتھ ملحوظ رہتے تھے اور بعض ہر انفرادی وحدت کے ساتھ بدلے ہوئے تھے اور یہ ناگزیر بھی تھا کہ:

۱۔ اپنے ظالم وطن مکہ

۲۔ عرب کے غیر عربی عناصر خاص کر یہودی قبائل

۳۔ خانہ بدوش عرب قبائل

۴۔ عرب کے حضری زندگی رکھنے والے شہر یا شہری مملکتیں (City States) مثلاً طائف۔

۵۔ عرب میں بیرونی دخل انداز یعنی ایرانی اور رومی صوبے، محفوظات، نوآبادیاں وغیرہ۔

۶۔ عرب کے ہمسایہ ممالک وغیرہ میں سے ہر ایک کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ''سیاست کاری'' خصوصی مسائل سے دوچار ہو اور ان کو حل کرنے کے لیے وہ ہر جگہ الگ اور بدلی ہوئی رہے۔ بطور ذیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف مکی سیاست سے بحث کی جائے گی۔

مکہ کی اہمیت:

شہر مکہ قدیم جغرافیہ نگاروں کے الفاظ میں ''ناف ارض'' پر ہونا چاہیے۔ اسلام کی

Marfat.com

عالمگیر توسیع میں کتنا ہی ممد و معاون رہا ہو لیکن یہاں زمانہ ہائے مابعد سے ہمیں کوئی بحث نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ عہدِ نبویؐ میں اس کو کیا اہمیت حاصل تھی۔ ہمیں ان مشنری پادریوں کا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں جو مصلحتہً مکہ اور مکہ والوں کو کوئی اہمیت دینا نہیں چاہتے اسی طرح ان روحانی عظمتوں یا دیگر لاحاصل قصوں سے بھی یہاں سروکار نہیں جو کرۂ ارض کے بننے میں مکہ کے حصے وغیرہ سے متعلق ہیں۔

شہر مکہ میں جو عرب بستے تھے وہ قریش کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ان کے تجارتی تعلقات کی اہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ چونکہ اس زمانے میں جزیرہ نمائے عرب میں کوئی مرکزی حکومت نہ تھی اور ہر قبیلہ اور اس کے علاقے سے گزرنے کے لیے زمانہ حال کے پاسپورٹوں سے بھی زیادہ دشواریاں تھیں اس لیے کاروانوں کے سفر کرنے اور بین الممالک تجارت کے عرب سے گزرنے کے لیے خفاروں اور بدرقوں کا ایک وسیع اور ترقی یافتہ نظام وجود میں آ گیا تھا۔ اس نظام نے عرب میں سیاسی تو نہیں ایک معاشی وفاق ضرور قائم کر دیا تھا۔ اس وفاق میں قریش کے موقف کا اندازہ مشہور مؤرخ محمد بن حبیب (فوت ۲۴۵ھ) کے اس بیان سے ہو سکتا ہے:

''ہر تاجر جو یمن یا حجاز سے وہاں (دومتہ الجندل جو عرب کے شمال میں ہے) جانا چاہتا تو جب تک قبائل مُضر کے علاقہ سے گزرتا ہو قریشی خفارے کے خدمات حاصل کرتا کیونکہ نہ کوئی مضری اور نہ مضریوں کا کوئی حلیف قریشی خفارے کو تکلیف دیتا چنانچہ قبائل کلب (بنی الجُشم سے حلیفی کے باعث) اور قبائل طے (بنی اسد سے حلیفی کے باعث) قریشیوں کو نہیں چھیڑتے تھے۔ قبائل ربیعہ کے پورے علاقہ میں تاجر اپنے لیے بنی عمرو بن مرشد کا خفارہ حاصل کرتے تھے .... بحرین کے صدر مقام المشقر کو جانے کے لیے بھی قریشی خفارہ حاصل کیا جاتا تھا .... جنوبی عرب میں مہرہ جانے کے لیے بنی محارب کا خفارہ لیا جاتا تھا ....

Marfat.com

حضر موت کے سوق رابیہ جانے کے قریشی کارواں بنی آکل المرار کے خدمات حاصل کرتے تھے .... جس کے باعث آکل المرار جلد اپنے حریفوں پر غالب ہو گیا .... عکاظ عرب کا سب سے بڑا سالانہ میلہ تھا جس میں تمام عرب کے قبائل سامان لاتے تھے۔ مثلاً قریش، ہوازن، غطفان، عضل، ویش، جبار، مصطلق، احابیش وغیرہ۔''

اس کے سوا زمانہ جاہلیت میں قریش اپنے حج کے سلسلے میں مکے کے مضافات میں منا میں جمع ہوتے تھے۔ ۱۳ھ میں بیعت عقبہ کے سلسلے میں مؤرخین نے ذکر کیا ہے کہ اہلِ مدینہ سے ملنے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پندرہ قبائل کے پڑاؤوں میں تبلیغ کے لیے گئے تھے۔ ان میں سے کندہ عرب کے انتہائی جنوب میں رہتے تھے۔ کلب انتہائی شمال میں دومتہ الجندل میں بستے تھے۔ بنی حنیفہ بحرین کے پاس انتہائی مشرق میں آباد تھے۔ ان کے علاوہ وہاں یمن کے مدینے کے غرض عرب کے ہر حصے کے لوگ آتے تھے اور یہ ہر سال ہوتا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو ۹ھ تاریخ اسلام میں ''عام الوفود'' (سفارتوں کا سال) کے نام سے مشہور ہوا کیونکہ عرب کے ہر حصے سے مدینے میں سفارتیں ٹوٹ پڑیں اور فاتح مکہ کے مذہب اور فاتح مکہ کی حکومت کو ماننے کا اعلان کرتی گئیں اور یہ سفارتیں بھی عرب کے ہر حصے سے آئی تھیں۔

جیسا کہ اوپر عرض ہوا۔ سیاستِ نبویؐ کے چند اصول عام اور ہمہ گیر تھے پہلے ان ہی کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے یہ مکے سے مقابلہ کرنے میں بھی اتنے ہی ملحوظ رہے جتنے دیگر سیاسی وحدتوں کے سلسلے میں۔

تبلیغ رسالت:

سب سے پہلا اصول جو ہر حالت میں پیش نظر رہا وہ یہ تھا کہ جس مشن اور مقصد کو لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے تھے اس کی اشاعت ہو۔ اس غرض کے لیے مالی

Marfat.com

منفعت اور خواہش انتقام کو نظر انداز کرنا بھی گوارا کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر مکہ کو بلا شرط اور بزور فتح کر لیا تو یہ بہت آسان تھا کہ اس مالدار شہر کو آپ لوٹ لیتے اور مہاجرین کی مغصوبہ جائیدادوں اور دیگر کثیر جسمانی اور مالی نقصانوں کا بدلہ لیتے۔ ابوسفیان گرفتار ہو کر ہاتھ آئے تو کچھ نہیں تو ان سے چند ہزار کا فدیہ ہی طلب کرتے۔ اس کی مزید مثالیں جمع کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

اندرونی استحکام:

کوئی بڑی سے بڑی سلطنت بھی جو سخت اندرونی خلفشار میں مبتلا ہو اکثر حقیر اور کمزور دشمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ تاریخِ عالم اس کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں اس اصولِ مسلمہ کا بیان مقصود نہیں ہے۔ بلکہ یہ دکھانا ہے کہ ناگزیر باہمی اختلافات کو کس طرح روکا یا دور کیا جاتا تھا اور کس طرح اختلافات کو مٹانے سے اپنی قوت میں اضافہ ہوتا تھا۔

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینے آئے ہیں تو مسلمانانِ مدینہ اوس اور خزرج کے دو رقیب اور خون کے پیاسے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور ابھی بُعاث کی معرکہ آرائی کا خون بھی خشک نہیں ہوا تھا۔ ان دونوں متصادم قوموں کی سرداری کوئی قابلِ رشک حالت نہیں کہی جا سکتی جس طرح آج اسلامی مبلغین کو ممالک متحدہ امریکہ میں ایک حل نہ ہونے والی گتھی سے سابقہ ہے کہ وہاں حبشیوں میں تبلیغ کرو تو وہ کہتے ہیں۔ آمنّا لیکن آپ گوروں کی لنچنگ پر اتر آنے والی ننگِ انسانیت قوم کو اسلام کے برکات سے ہرگز متمتع نہ ہونے دیجیے اور گورے نومسلم نہیں چاہتے کہ حبشی بھی مسلمان ہو کر ان سے سماجی مساوات حاصل کر لیں۔

عرب کے خانہ بدوش بدو آج بھی اپنے حضری اور بستیوں میں رہنے والے بھائیوں کو سخت حقارت سے دیکھتے ہیں۔ عہد نبویؐ میں تو حضری آبادی آج سے بھی فوجی مہموں میں بدوی رضا کاروں کا ضبط جیسی صبر آزما چیز ہو گی محتاجِ بیان نہیں۔

سب سے مقدم یہ کہ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو وہاں ایک مزاج تھا ایک شہری

مملکت تک نہیں پائی جاتی تھی۔ چند مدنی عرب قبائل مسلمان ہو گئے تھے اور چند میں ابھی تک اسلام پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ ان کے ساتھ ہمسائے میں ہزاروں کی تعداد میں یہودی رہتے تھے جو زراعت، تجارت، صنعت غرض جملہ معاشی زندگی پر حاوی تھے ان میں بھی آپس میں خون ریز اور امٹ رقابتیں تھیں اور ان کا اپنا ایک مذہب اور تمدن تھا اور ان کے اسلام قبول کرنے کی اتنی بھی توقع نہ تھی جتنی لامذہب بدوؤں کی۔ ان سب کے ساتھ سیکڑوں مہاجرین تھے جو مکے کے بیسیوں قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان تمام عناصر میں ایک وفاقی وحدت پیدا کرنا اور مدینے میں ایک شہری مملکت قائم کر کے اس کا ایک دستور مرتب کرنا اور اس کے ذریعے راعی و رعایا کے حقوق و فرائض کا تعین کرنا اور پھر ان تمام متصادم اور ضائع ہونے والی توانائیوں کو ایک مرکز پر لا کر ان سے مفید کام لینا یہ ابتدأ سیاستِ خارجہ ہی کے مسائل تھے اور طے ہو چکنے کے بعد اندرونی مسائل بن گئے۔

مدینے کی حفاظت کے لیے علاوہ اس اندرونی استحکام کے اس کی ضرورت تھی کہ آس پاس کے قبائل سے دوستی کی جائے۔ چنانچہ ہجرت کے چند مہینے بعد ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینے کے جنوب مغربی اور ساحل سے متصل علاقے کا بار بار دورہ شروع کرتے ہیں اور ینبوع وغیرہ میں رہنے والے قبائل سے حلیفی کرتے ہیں کہ ان پر کوئی حملہ کرے تو مسلمان اُن کو مدد دیں گے اور مسلمانوں پر کوئی حملہ کرے تو یہ مدد کو آئیں گے۔ بعض معاہدات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں سے دوستی نہ رکھنے کی شرط منظور کی گئی تھی بعض میں اتنی پابندی بھی نہ تھی اور قبیلہ غیر جانبدار رہنے پر آمادہ ہوا تھا بعض میں مسلمانوں کی دینی لڑائیوں میں ان قبائل کو مدد دینے کی پابندی سے مستثنیٰ کیا گیا تھا۔ بہرحال مدینے کے چاروں طرف دوستوں میں اضافہ اور مخالفوں میں کمی کی مسلسل کوشش کی جارہی تھی۔

ایک اور اصول یہ قرار دیا گیا کہ عرب میں جو شخص یا خاندان یا قبیلہ مسلمان ہو وہ ہجرت کر کے مدینہ یا مضافات میں آبسے۔ یہ سیاست فتح مکہ تک باقی رہی (لا ہجرة بعد الفتح مشہور حدیث اسی سیاست کے اختتام کا اعلان تھی)اور بہت کم اس سے

Marfat.com

استثنا منظور کیا جاتا تھا۔ اس سیاست کا نتیجہ دو گونہ تھا۔ مسلمان فوج کے لیے محفوظ رضا کاروں میں روز افزوں اضافہ اور ان نو مسلموں میں اسلام کی گہرائی۔

انسانی خون کی عزت:

عہد نبویؐ میں دس سال میں دس لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح ہوا جس میں یقیناً کئی ملین آبادی تھی۔ اس طرح روزانہ تقریباً ۲۷۴ مربع میل کے اوسط سے دس سال تک فتوحات کا سلسلہ ہجرت سے وفات تک جاری رہا۔ ان فتوحات میں دشمن کا ماہانہ ایک آدمی قتل ہوا۔ اسلامی فوج کا نقصان اس سے بھی کم ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے أنانبی الرحمہ انا نبی الملحمہ (میں رحمت کا پیغمبر ہوں میں جنگ کا پیغمبر ہوں) اس کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے۔ دشمن کے ۷۰ آدمیوں کا مارا جانا (جنگ بدر میں) سب سے بڑی تعداد ہے۔ یاد رہے کہ یہ عہد نبویؐ کی سب سے پہلی جنگ تھی۔

فنونِ حرب کی ترقی و استفادہ:

دشمن کو بے بس کر دینے اور ساتھ ہی خونریزی کو کم ترین حد تک گھٹا دینے کے لیے ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ فنونِ حرب میں اتنا کمال حاصل کیا جائے کہ حریف مقابلہ ہی نہ کر سکے۔ اس غرض کے لیے ہر اچھی چیز چاہے کسی ملک کی ہو اختیار کی گئی۔

عربوں میں صف بندی کا رواج نہ تھا۔ جوش کا بے وقت اور بے محل استعمال اور اسلحہ کا بیکار خرچ بھی عام چیز تھی۔ جنگ بدر ہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سپاہیوں میں صف بندی شروع کر دی تھی اور معائنہ میں جو آگے پیچھے نظر آتا تھا اسے درست کیا جاتا تھا۔ فتحِ مکہ کے وقت تو صف آرائی ایک مخصوص افسر کے سپرد ہو گئی تھی جو وازع کہلاتا تھا۔ ہر فوج کا مہم پر روانگی سے پہلے شہر کے باہر معائنہ ہوتا تھا اور کم عمر رضا کار یا سواری یا اسلحہ نہ رکھنے والے یا اور طور پر نامناسب افراد (مثلاً مشرکین، یہودی وغیرہ) واپس کر دیے جاتے تھے۔ جنگ بدر میں صف آرائی کے بعد جو جامع ہدایات دی گئی تھیں وہ یہ تھیں کہ ''جب تک میں حکم نہ دوں کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ

Marfat.com

کرے دشمن دور ہو تو تیر چلا کر بیکار ضائع نہ کرے۔ بلکہ اوپر آئے تو مارے اس سے قریب آئے تو پتھر پھینک کر مارے اس سے بھی قریب آئے تو نیزہ اور پھر تلوار چلائے۔" وردی کی غیر موجودگی میں اور شب خون کی ضرورتوں کے لیے اسلامی سپاہیوں کے لیے "شعار" (واچ ورڈ) مقرر کیے گئے تھے اور ہر دو بدو کے مقابلہ کے وقت سپاہی اسے دہراتا اور حریف وہ لفظ نہ دہراتا تو اطمینان ہو جاتا کہ وہ رفیق نہیں ہے بلکہ دشمن۔

خندق کے ذریعے محصور شہر کی مدافعت اسی اصول کی ایک دوسری مثال ہے۔ چنانچہ جنگِ خندق میں شہر مدینہ پر دشمن کو حملہ آور ہونے سے اسی کے ذریعہ سے روک کرنا کام واپس کیا گیا۔

خیبر کی لڑائی میں منجنیق سے دشمن کے محصور قلعہ میں پتھر برسائے گئے تھے۔ طائف کے محاصرہ میں مزید برآں دبابے بھی استعمال کیے گئے تھے۔ جو ترقی پا کر زمانۂ حال میں خود بخود حرکت کرنے والی ٹینک کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

دبابہ ایک پہیے والی گاڑی ہوتی ہے جس کے اوپر بیل کا یا کوئی اور موٹا چمڑہ منڈھ دیا جاتا تھا کہ تیروں سے اندر رہنے والے آدمیوں کو صدمہ نہ پہنچایا جا سکے۔ فصیلوں کو کھودنے اور مماثل کام کرنے کے لیے اسے کام میں لایا جاتا تھا۔ طائف میں منجنیق کے علاوہ عرادہ بھی برتا گیا تھا۔ جو منجنیق ہی کی طرح پتھر وغیرہ دور پھینکتا تھا۔

فوجوں کی مشقیں، گھوڑوں، اونٹوں، گدھوں وغیرہ کی دوڑ، تیر اندازی کے مقابلے اور فوجی اسپورٹ وغیرہ ایک مستقل مضمون کے محتاج ہیں۔ نمازوں کے ذریعے صف بندی، روزے کے ذریعے ہر موسم میں سپاہیوں کو بھوک پیاس کی مشق، حج کے ذریعے عرفات وغیرہ کے بے آب و گیاہ علاقوں میں کوچ اور قیام کی عادت وغیرہ ان کے علاوہ ہیں۔ سرکاری اصطبلوں، محفوظ چراگاہوں اور اسلحہ خانوں کا قیام بھی اسی سلسلے میں قابلِ ذکر ہے۔

خبر رسانی اور ناکہ بندی:

ایک اور چیز جو عام تو تھی لیکن جس کا قریش کے سلسلے میں بہت مکمل مظاہرہ ہوا

Marfat.com

وہ یہ ہے کہ دشمن کی ہر نقل و حرکت سے پوری طرح باخبر رہیں اور اپنی نقل و حرکت سے اسے آخر وقت تک بے خبر رکھیں۔

اس غرض کے لیے مکہ میں بھی آپ کے نامہ نگار متعین تھے۔ خندق کے معرکے میں قریش نے مدینہ کے شمال کے قبائل غطفان وغیرہ کے دس ہزار کے جم غفیر کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ اتنا بڑا لشکر عرب میں غیر معمولی بات تھی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے شمال میں دومتہ الجندل کی طرف گئے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آدھے راستے سے واپس آ جانا اور محاصرہ کنندوں کے پہنچنے سے پہلے دو ہفتہ کی مہلت پاکر خندق کی کھدائی کو مکمل کرنا خبر رسانی کے عمدہ انتظام پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح فتح مکہ کی تیاری ایک شخص نے مدینہ سے قریش کو لکھ کر بھیجی تو پیام رساں راستے میں پکڑا گیا۔ اپنی خبروں کو پھیلنے سے روکنے کے لیے ناکوں کی بندش (حبس طرق) جتنی مکمل ہو چکی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دس ہزار کا لشکر مدینہ سے مکہ کی طرف چلتا ہے اور مضافات مکہ میں پڑاؤ ڈالنے سے پہلے دشمن کو خبر نہیں ہوتی۔ اس کا ایک اور طریقہ غلط سمت میں جانے کی خبر مشہور کرنا تھا کہ دشمن مغالطہ میں مبتلا ہو اور غلط سمت میں سفر کر کے چکر کھا کر منزل مقصود پر پہنچنا بھی ہر وقت زیر عمل تھا اور مورخین نے صراحت سے لکھا ہے کہ ''صرف تبوک'' کی مہم میں سفر کی درازی اور موسم کی خرابی کے باعث سپاہیوں سے پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا کہ کہاں جانا ہے ورنہ ہمیشہ توریہ (دکھاوا) کیا جاتا تھا۔

معاشی دباؤ:

یہ سب جانتے ہیں کہ قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین کو کس طرح تکلیفیں دے کر ترک وطن پر مجبور کیا تھا اور کس طرح ان مہاجرین کی جائیداد منقولہ وغیر منقولہ پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ اسی طرح سب لوگ اس سے بھی واقف ہیں کہ قریش کا روزگار زیادہ تر تجارت سے حاصل ہوتا تھا اور تبادلہ اشیاء کے ذریعے وہ نفع کمایا کرتے تھے اور اس غرض کے لیے سردیوں میں جنوب یعنی یمن وغیرہ کو کارواں

Marfat.com

لے جاتے تھے اور گرمیوں میں شمال یعنی شام، فلسطین، مصر، عراق وغیرہ جایا کرتے تھے۔

شمالی راستہ اس علاقے سے گزرتا تھا جو مدینہ اور ینبوع کے مابین ہے۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ہجرت کے چند مہینے بعد ہی اس علاقے کے باشندوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مخالفے پیدا کرنے شروع کر دیے تھے اور جب اس کی ایک حد تک تکمیل ہو گئی تو قریشی کاروانوں کو حق غنیم کے تحت لوٹ لیا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے ساحلی راستہ مجبوراً ترک کر دیا اور صحرا میں سے ہو کر عراق جانے لگے، لیکن جلد ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر نجد تک پھیل گیا تو وہ راستہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ قریش کو بحرین اور یمامہ سے بھی غلہ ملتا تھا۔ ان علاقوں پر اسلامی اثر کے پھیلنے خاص کر ثمامہ بن اُثال کے مسلمان ہونے پر غلہ کی برآمد مکہ کو روک دی گئی تھی۔

متعدد قیمتی کاروانوں کے لٹنے کے علاوہ ذرائع معیشت کا بند ہو جانا قریش کو مطیع کرنے کا سب سے مقدم اور سب سے مؤثر ہتھیار ثابت ہوا۔

غنیم کے دوستوں کو توڑ لینا:

دوسری اہم تدبیر یہ اختیار کی گئی تھی کہ مختلف وسائل سے قریش کے دوستوں کو اس دوستی کے توڑنے اور مسلمانوں سے جوڑنے پر آمادہ کیا جائے۔ یہ طریقہ بہت آہستہ چلا مگر بالآخر بہت کارگر ثابت ہوا۔

بیعت عقبہ میں جو مدینے والے مسلمان ہوے تھے۔ وہ اصل میں قریش سے حلیفی کرنے آئے تھے۔ دستور مملکت میں مدینے کے یہودیوں کو اسی شرط پر کسی حملہ آور کے خلاف مدد دینا منظور کیا گیا تھا کہ وہ قریش کو کبھی مدد نہ دیں۔ نہ ان کے جان و مال کو کوئی پناہ دیں۔ اس دستور میں مدینے کے غیر مسلم عربوں کی حفاظت اس شرط سے منظور کی گئی تھی کہ وہ قریش کو نہ تو خود کوئی مدد دیں اور نہ ان کی جان و مال پر مسلمان حملہ کریں تو آڑے آئیں اطراف مدینہ کے قبائل سے بھی معاہدات میں اسے ملحوظ رکھا گیا۔

کاروانی اسٹیشنوں پر جو لوگ رہتے ہیں۔ انہیں کاروانوں کے ٹھہرنے کے

Marfat.com

زمانے میں کھانے پینے کی چیزیں پانی اور دیگر ضروریات کے فروخت سے روزگار نکلتا ہے، آج کل بھی حجاج کا قافلہ اونٹوں پر جائے تو کئی کئی دن پہلے سے منزلوں پر تیاریاں ہونے لگتی ہیں اور دور دور سے بدوی تربوز، گھی، بھیڑ، بکری وغیرہ وہاں لے جاتے ہیں۔ قریشی کاروانوں کے رک جانے سے متعدد قبائل نے روزگار کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد طلب کی تھی اور آشجع وغیرہ اسی طرح حلیف بنے تھے۔ (حوالہ ابن سعد)

اس سلسلے میں سب سے اہم کارنامہ صلح حدیبیہ ہے۔ ۶ھ میں مدینہ میں مسلمانوں کو دو خطرے تھے۔ شمال میں خیبر اور جنوب میں مکہ دونوں سے ایک ہی وقت میں مقابلہ ممکن نہ تھا۔ دونوں کی بڑھنے والی دوستی کو روکنا اور ہم خیالی کو ہم عملی کی صورت اختیار نہ کرنے دینا بھی ضروری تھا۔ یہ بھی خوف تھا کہ اگر مسلمان خیبر پر حملہ کرنے جائیں تو مدینہ کو فوج سے خالی پا کر مکہ والے آ کر نہ لوٹ لیں اور مکہ پر حملہ کریں تو یہی خدشہ خیبر سے تھا۔ صلح حدیبیہ میں قریش کو اس بات پر آمادہ کر دینا کہ وہ مسلمانوں کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں گے (اور اس کے معاوضہ میں مسلمان قریش کا تجارتی راستہ کھول دیں گے اور دس سال تک باہم صلح رہے گی) ایک زبردست سیاسی فتح تھی جو مسلمانوں نے حاصل کی کیونکہ قریش کو اس وقت مؤثر مدد دے سکنے والے صرف خیبری ہی رہ گئے تھے۔ ان کو بچھڑا دینے اور پھر تباہ کر دینے سے قریش کا آئندہ کوئی مددگار نہ رہا۔

<u>دشمنوں سے گھیرنا:</u>

مذکورہ بالا اصول کا ناگزیر نتیجہ یہ تھا کہ رفتہ رفتہ قریش کے اطراف چاروں طرف مسلمان یا مسلمانوں کے حلیف ممالک اور قبائل جمع ہو جائیں۔ قبائل اسلم وخزاعہ اس کی بہت نمایاں مثال ہیں جو مکہ کے اطراف رہتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ابتداء سے یہ اصول تھا کہ بات کا پاس رہے اور حلیفوں کی مدد سے کبھی غفلت نہ کی جائے۔ اس کے ساتھ اسلامی فوجوں کی جنگی برتری فتوحات کی دھاک، معاشی وسائل پر زبردست اقتدار، ان تمام امور نے چوطرف کے

Marfat.com

چھوٹے چھوٹے قبائل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطیع کر دیا تھا۔

دِعایہ کاری:

دشمنوں میں پھوٹ ڈالنا بھی ایک مفید اصول کے طور پر اکثر عہدِ نبویؐ میں برتا گیا تھا۔ جنگ خندق اس سلسلے میں کئی نظیریں پیش کرتی ہے۔ محاصرہ کرنے والے متحدین میں سے قبیلہ غطفان کو اس پر آمادہ کر لیا گیا تھا کہ وہ بعض شرائط پر محاصرہ اٹھا کر اور قریش کا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں۔ مگر ان شرائط پر خود مسلمان افسر آمادہ نہ ہوئے گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان پر راضی تھے۔

دوسری نظیر اسی جنگِ خندق میں قریش اور مدینے کے یہودیوں میں پھوٹ ڈالنا تھا۔ اس میں جتنی زبردست کامیابی ہوئی اس سے سب واقف ہیں کہ قریش نے بیزار ہو کر محاصرہ اٹھا دیا اور بے نیل مرام واپس چلے گئے۔

دشمن کے ایک طبقے کو موہ لینا:

یہ اصول بھی بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ اوپر بیان ہوا کہ قریش کے غلہ کی منڈی جو یمامہ میں تھی بند کرا دی گئی تھی۔ مورخ بیان کرتے ہیں کہ اس سے مکہ میں قحط نمودار ہو گیا۔ اس سال عرب میں بارش نہ ہونے سے عام کال بھی تھا۔ اس دباؤ کی قوت کا جب قریش کو اندازہ ہو گیا تو پھر یہ بندش اٹھا لی گئی اور وہ بہت ممنون ہوئے یہی نہیں بلکہ اسی زمانے میں پانچ سو اشرفی کی خطیر رقم مکہ کے سردار ابو سفیان کو بھیجی گئی کہ مکہ کے فقراء میں تقسیم کر دے۔

ان کارروائیوں سے مکہ میں بیسیوں بہی خواہ پیدا ہو گئے اور اس طرح کی سیاست سے مختلف مواقع پر اور مختلف ممالک میں مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا۔

معزز دشمنوں کا اسلام میں بھی اعزاز:

اس مختصر تبصرہ کے آخر میں اس اصول کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو حدیث میں ہے کہ خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام اذا فقہوا (غیر مسلم معزز

اسلام لانے پر بھی معزز رہیں گے۔ اگر وہ اسلامی قوانین سے بھی واقف ہو جائیں) یہی وجہ تھی کہ عمر بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اسلام لانے پر انہیں سابقین اولین کا سردار بنا کر فوجی مہموں میں بھیجا گیا۔ ابوسفیان نے اسلام قبول کیا تو نہ صرف انہیں انعام و اکرام دیا گیا بلکہ ان کا گھر امن گاہ قرار دیا گیا۔ انہیں لشکروں کی سرداری اور صوبوں کی گورنری بھی فوراً دی جانے لگی۔ خالد ابن الولید کو (باوجود احد میں مسلمانوں کی شکست کا واحد سبب ہونے کے) اسلام لاتے ہی سیف اللہ کے قابلِ رشک خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

اگر سیرت النبی کا ان امور کی تلاش کے لیے مطالعہ کیا جائے تو نہ صرف مذکورہ بالا اصولوں کی مزید نظیریں ملیں گی بلکہ اور نئے سیاست کاری کے اصول بھی نظر آ سکتے ہیں۔ یقین ہے کہ اہل علم ان سے مستفید ہو کر اوروں کو محروم نہیں رکھیں گے۔

(نقوش لاہور۔ رسول نمبر (۳) جنوری ۱۹۸۳ء)

Marfat.com

عہد نبویؐ کے عربی ایرانی تعلقات

قبل اسلام:

جزیرہ نمائے عرب زیادہ تر صحرا ہے۔ اس لیے وہاں کی آبادی اپنی غذا تک کے لیے قدیم سے بیرونی درآمد کی محتاج رہی ہے۔ تعداد ازدواج سے آبادی میں تیز اضافہ اور ذرائع معیشت میں خانہ جنگیوں وغیرہ کے باعث روز افزوں انحطاط عربوں کو اکثر ترکِ وطن پر قدیم سے مجبور کرتا رہا ہے۔ ایک طرف وہ خطرناک بحری راستہ سے مشرقی افریقہ جاتے رہے، تو دوسری طرف شمال مشرق میں عراق کی طرف اور شمال مغرب میں فلسطین کی طرف بھی خشکی کے راستے سے ہمیشہ [1] ان کا رخ رہا۔ بعد میں ملاحی مہارت بڑھنے پر وہ ہند اور چین تک تجارت کے لیے آنے جانے لگے۔

جہاں تک ایران کا تعلق ہے، اس کو سب سے پہلے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ طے ہی سے سابقہ پڑا۔ چنانچہ اب یہ مسلمات سے سمجھا جاتا ہے کہ فارسی لفظ تازی اور اسی کا بگڑا ہوا چینی لفظ ''تاشی'' [2] (جس سے عرب مراد لیتے ہیں) اسی لفظ ''طی'' کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

---

[1] اس کی قدامت اور وسعت کے لیے دیکھیے میرا مقالہ ''عربوں کے تعلقات بیزنطینیوں سے'' مجلہ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ سالنامۂ سوم۔ مختصر یہ کہ سینٹ پاول کے زمانہ میں دمشق میں ایک عرب بادشاہ حارث حکمران تھا، تو حلب جیسے شمالی علاقوں تک میں عرب کی راجدھانیاں قایم ہو چکی تھیں۔

[2] برنٹ شنائدر کا انگریزی رسالہ ''عربوں کے متعلق چینیوں کی معلومات'' (ص ٦)

Marfat.com

ان تارکانِ وطن کی تعداد ایرانی صوبہ عراق میں اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ انہوں نے عہد نبویؐ سے صدیوں قبل حیرہ (کوفہ) میں ایک طاقتور سلطنت قایم کر لی تھی اور لخمی قبیلہ کے ان عرب حکمرانوں پر ماحول کا کچھ اتنا اثر پڑا کہ شام کی طرف جانے والے غسانیوں کے برخلاف انہوں نے خانہ بدوشی تک ترک کر دی اور بستیوں میں بس کر عربی تہذیب کی عظیم الشان خدمت انجام دینے لگے۔

ایرانی شہنشاہوں نے مختلف مصلحتوں سے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ چنانچہ ایک طرف تو یہ عرب اور ایران (عراق) کے مابین حدِ فاصل اور حاجز مملکت (Buffer-State) بنے اور خانہ بدوش بدویوں کی عراق میں لوٹ مار کی مہمیں خود یہ لوگ جھیلنے لگے[1] اور ایرانی امن میں ہو گئے تو دوسری طرف ایرانی جو روز افزوں آرام طلب ہوتے جا رہے تھے، مفت کے عرب رضا کاروں سے اپنی فوج میں کثیر تعداد میں کام لینے لگے۔ اس سے عربوں میں جنگجوئی اور فوج آرائی کی روح نہ صرف تازہ رہی بلکہ صیقل پاتی اور فطرت میں رچتی گئی، تو ساتھ ہی ایرانی روز بروز جنگ سے ڈرنے لگے اور بزدل ہوتے گئے۔ ایرانی بیزنطینی جنگوں میں ایک سے زیادہ مرتبہ ان عربی فوجوں نے جو فیصلہ کن اور عظیم الشان حصہ لیا اور ایرانی حکومت کے لیے صرف اپنے بل بوتے پر جو وسیع فتوحات حاصل کیں، ان سے ہر کوئی واقف ہے، ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ امر البتہ نمایاں کیے جانے کے قابل ہے کہ بیزنطینی قیصروں نے ضجعمیوں اور پھر غسانیوں سے جنگی معاہدہ کر لیا اور ایرانی کسراؤں کے لیے بھی ناگزیر تھا کہ اسی کے مماثل طاقتور عربوں کو اپنا حلیف بنائے رکھیں۔

عرب کے جانوروں تک کی وفاداری ضرب المثل ہے۔ پھر حیرہ کے حکمرانوں پر کسرایان ایران کا اعتماد کیوں نہ بے پایاں ہوتا۔ کسی اور ملک میں یہ نظیر نہ ملے گی، جیسی یہاں ملتی ہے کہ کسرائے ایران اپنے ولی عہد کو اپنے جونیر حلیف بلکہ ماتحت حکمران حیرہ کے ہاں بھیج دے تاکہ وہیں اس کی تعلیم و تربیت ہو۔ بعد میں بدوی روایات کے حامل اس شہزادے نے حکمران بن کر دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ حیرہ کا عربی ماحول مدائن کے

---

[1] تنبیہ مسعودی ص ۱۸۶

Marfat.com

ایرانی ماحول سے کہیں زیادہ مفید و کردار ساز تھا۔

حیرہ والوں کی خدمات خود عرب کے لیے کچھ کم اہم نہ تھیں۔ عربی شعرا اور تاجر ہمیشہ ان کے دربار میں بھرے رہتے تھے اور غیر محسوس طور سے تاثر و تاثیر کرتے چلے جاتے تھے اور غالباً صحرانشینوں سے اس مسلسل تعلق ہی نے باوجود عیش و ترفہ کے لخمی حکمرانوں میں بہت سی اچھی بدوی صفتیں مثلاً بات کا پاس اور آن کے لیے جان تک کی پروا نہ کرنا، بہت کچھ برقرار رکھیں۔

عربی رضا کاروں کی وفاداری اور اطاعت شعاری نے رفتہ رفتہ دربار مدائن کو یہ بھلا دیا کہ حیرہ کمزور اور جونیر حلیف سہی لیکن ماتحت اور غلام نہ تھا۔ مجوسی و مزدکی روایات نے عصمت و ناموس کا تصور ہی ایرانی دربار سے مٹا دیا تھا[1]۔ اسی لیے انہوں نے اس میں کوئی برائی ہی نہیں سمجھی، کہ انہی اصول کا اطلاق عرب حکمران کی بہو بیٹیوں پر کیا جائے۔ اس کے نتیجہ سے سب واقف ہیں کہ حکمرانِ حیرہ کو مدائن طلب کیا گیا اور اس وفاشعار نے جانتے بوجھتے اس کی تعمیل کی، تو تحفظ عصمت کے جرم میں اس کا سر قلم کیا گیا اور نشۂ غرور میں چور شہنشاہ نے حاجز مملکت کو بھی فنا کر دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ حیرہ میں ایرانی افسر آدھمکے اور گوبراے نام ایاس بن قبیصہ نامی ایک عرب کو بھی وہاں کے عربوں کا سردار بنایا گیا، لیکن سلطنت حیرہ کا ایران سے الحاق کر کے ایک معمولی صوبہ بنا دیا گیا۔ یہ قصہ یہیں ختم نہ ہوا، بلکہ حکمرانِ حیرہ نے اپنے پاس کا بعض امانتی مال اصل مالکوں کو پہنچانے کے لیے بعض بدوی قبائل کے سرداروں کے سپرد کیا تو شہنشاہی احکام اس کی فوری حوالگی کے لیے پہنچے اور انکار پر سزا دہی اور عربوں کی بالکلیہ تباہی کے لیے ایک عظیم الشان ایرانی لشکر روانہ کیا گیا مگر اب کی دفعہ قدرت نے ایران کو ایک تنبیہ کرنی چاہی اور ذی قار کی جھیل پر ان کی فوج کو جان پر کھیلے ہوئے بدوؤں نے کاٹ کر رکھ دیا مگر دربار ایران نے بجائے سبق لینے اور اپنی اصلاح کرنے کے عربوں پر مزید ستم آرائی شروع کر دی اور انہیں روز افزوں اپنا دشمن بنانا شروع کیا (اب جناب

---

[1] مزدک نے ملکہ ایران کے متعلق بھرے دربار میں شہنشاہ سے جس بے باکانہ بے حمیتی کا اظہار کیا تھا، اس سے عربی خوان بے خبر نہ تھے۔

Marfat.com

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا مدنی دورِ زندگی شروع ہو چکا تھا) اور خلافتِ صدیقی کے آغاز پر اسی ایرانی سرحد کے ستم رسیدہ مثنیٰ شیبانی کا ایران پر حملے کے لیے اپنی رضا کارانہ خدمات کا پیش کرنا زیادہ تر ایران کی اسی عرب کُش سیاست کا ردِ عمل تھا۔ اس واقعہ سے چند ہی سال قبل یمنیوں کی دعوت اور تعاون سے ایرانیوں نے حبشیوں کو نکال کر یمن پر قبضہ کر لیا تھا اور وہرز کی فوجی گورنری کے بعد لائق باذان وہاں گورنر بنا لیکن پایۂ تخت ایران میں کچھ ایسی تیزی سے شاہ گردی ہو رہی تھی کہ مٹھی بھر ایرانی فوج کے لیے کسی مزید کمک کی غیر موجودگی میں یمن پر قبضہ رکھنا بڑا دشوار ہو گیا تھا۔

حیرہ اور یمن کے علاوہ مشرقی اور جنوب مشرقی عرب کے ساحلی علاقوں یعنی عمان اور الحسا میں بھی (جسے اس زمانہ میں بحرین کہا جاتا تھا) ایرانی اثرات مستحکم ہو گئے تھے۔ عمان میں جلندی بن المستکبر کا خاندان کسریٰ ایران کی طرف سے حکمران نامزد ہوا تھا، جس کے کچھ حالات محمد بن حبیب (التوفی ۲۴۵ھ) نے اپنی مشہور کتاب المحبر (مخطوطہ دائرۃ المعارف حیدر آباد) میں لکھے ہیں اور بعد میں اسی جلندی کے بیٹوں جیفر اور عبد سے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے تخاطب فرمایا تھا۔ عمان وسیع ملک ہے، وہاں کے ایک اور عرب سردار ہوذہ بن علی کو کسریٰ نے ایک جواہر نگار ٹوپی عطا کی تھی، اس لیے اس کا لقب ذوالتاج یا صاحب التاج مشہور ہو گیا تھا (دیکھیے اشتقاق ابن درید ص ۲۰۹، عقد الفرید ابن عبدربہ جلد ۲ ص ۶۷) الحسا میں کسی عرب ریاست کا بظاہر پتا نہیں چلتا اور وہاں کے صدر مقام ہجر میں ایرانی فوجی گورنر (مرزبان) رہا کرتا تھا۔ بعض غیر موروثی عرب افسر بھی تھے۔

عرب مولفوں کے ہاں اس قسم کے تذکرے کثرت سے ملتے ہیں۔ فلاں عربی شیخ نے فلاں بادشاہ (کسریٰ، قیصر، نجاشی وغیرہ) کے ہاں باریابی حاصل کی۔ ابن عبدربہ نے اس کا ایک مستقل باب (الوفادات) ہی قایم کیا ہے۔ ایسے ہی ایک شخص سے خوشنودی کے سلسلہ میں کہتے ہیں کہ شیخ کی خواہش پر کسریٰ نے ایک مہندس (انجینئر) بھیجا جس نے وادی وج میں ایک فصیل دار قلعہ تعمیر کیا، جسے طائف کہنے لگے (کتاب الاغانی جلد ۱۲ ص ۴۸-۴۹)۔ اس کے استحکام کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا

Marfat.com

ہے کہ فتح مکہ و حنین کے بعد طائف کو اسلامی فوجوں نے آ گھیرا تھا اور باوجود منجنیق اور دبابوں کے استعمال کے محاصرہ ختم ہوتا نظر نہ آیا اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید جانی نقصان نامناسب سمجھ کر محاصرہ اُٹھا لیا تھا۔

ابتدائے اسلام:

ایران آتش پرست تھا۔ انتہائی جنسی اباحیت رکی بھی تو حقیقی بہنوں اور صلبی بیٹیوں تک کو وہاں ازدواجی اغراض کے لیے محرمات میں نہیں شامل کیا جاتا تھا۔ غالباً اسی قسم کے معاملات ہوں گے، جس نے مشرک عیسائیوں کو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں مجوسیوں پر قابل ترجیح بنا دیا تھا۔ قرآن مجید کی سورہ روم بھی انہی جذبات کی ترجمان ہے۔

ابن ہشام (ص ۲۷۸) وغیرہ نے روایت کی ہے کہ ابتدائے اسلام میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مختلف قبائل کو اسلام کی دعوت اور اسلام کی مدد کی ترغیب دیتے تو علاوہ اخروی روحانی ثواب کے وعدے کے یہ پیش گوئی بھی فرماتے کہ کسریٰ و قیصر کی دولت تمہارے قدموں پر نچھاور ہوگی۔ جنگِ خندق میں سنگِ مرمر کی چٹانوں کو توڑتے وقت چنگاریاں اڑنے پر اسی پیش گوئی کا اعادہ فرمایا گیا تھا۔ (دیکھو طبری وغیرہ)

میں نے ایک مستقل مضمون میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے[1] کہ ۶ھ کی صلح حدیبیہ کو قرآن مجید نے ''فتح مبین'' اور ''نصر عزیز'' کیوں کہا ہے اور کس لیے اسے اسلام اور مسلمانوں کی سیاسی کامیابیوں کا شہ کار سمجھا جاتا ہے (مشہور عام خیال تبلیغ کی سہولت کچھ دل کو نہیں لگتا) یہاں اس کا دہرانا غیر ضروری ہے۔ بہرحال اس صلح سے جہاں مسلمانوں کے ہاتھ کھل گئے اور وہ خیبر کے نمو پذیر خطرے کا دو ہی تین ماہ میں استیصال کے قابل ہو گئے، وہیں انہیں نینوا میں ایرانیوں کی بیزنطینیوں (رومیوں) کے ہاتھوں عہد آفرین شکست کے سلسلہ میں بین الممالک صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا

---

[1] دیکھیے رسالہ سیاحت حیدر آباد دکن اپریل ۱۹۴۲ء

Marfat.com

موقع مل گیا۔ (نینوا کی لڑائی شعبان ۶ ھ میں ہوئی، اس کے بعد ہی صلح حدیبیہ ہوئی)

بلاذری (فتوح ص ۷۹) اور ابن الاثیر (کامل ۲/۱۷۵) نے بیان کیا ہے کہ ایرانی مقبوضہ بحرین کے ایک عربی النسل افسر منذر بن ساوی کو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلا خط ۶ ھ ہی میں روانہ کیا تھا۔ غالباً کسرٰے ایران کا خط بھی اسی نامہ بر کے ذریعہ سے بھیجا گیا ہوگا، جس نے بحرین کے حاکم سے خواہش کی کہ اسے کسرٰی کے پاس مدائن بھیج دے۔

یہاں اس کی غالباً ضرورت نہیں کہ ساوہ، بحرین، عمان، یمن وغیرہ عرب کے جملہ ایرانی مقبوضات سے عہدِ نبویؐ میں جو اسلامی تعلقات رہے، ان کی پوری تفصیل اور ان کا ارتقاء بتایا جائے ورنہ ان علاقوں کے ایرانی افسروں یا عرب شیوخ کے نام لکھے ہوئے کئی درجن نامہ ہائے نبویؐ تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں۔ ایک منذر رضی اللہ تعالٰی عنہ ہی کے نام کے نو خط ملتے ہیں۔ جن میں بحرین کی سیاسیات کی پوری تاریخ محفوظ ہے۔ ان کے متن کے لیے میری حقیر تالیف ''الوثائق السیاسیہ'' دیکھی جا سکتی ہے (جس کی طباعت کے بعد اوائل ۱۳۶۱ھ میں کتب خانہ خدا بخش مرحوم پٹنہ میں قبیلہ عبدالقیس سے کیا ہوا اور ایک اور معاہدہ کتاب وسیلۃ المتعبدین میں دستیاب ہوا ہے) یہاں صرف شہنشاہ ایران سے خط و کتابت پر کچھ بحث کی جائے گی جس میں متعدد گتھیاں سلجھانی ہیں۔

تمام اسلامی مورخوں، محدثوں اور دیگر مولفوں نے متفقہ طور سے بیان کیا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد ہی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہمسایہ ممالک کے حکمرانوں کے نام اسلام کے تبلیغی خطوط بھیجے تو ان میں سے ایک کسرٰے ایران کے نام بھی تھا۔ اس کا متن جس میں کچھ لفظی اختلافات پائے جاتے ہیں، یہ ہے:

۱۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۔ من محمد رسول اللہ الی کسری عظیم فارس۔

۲۔ محمد رسول اللہ کی طرف سے سردارِ ایران کسرٰی کے نام

۳۔ سلامٌ علیٰ من اتبع الھدیٰ وآمن باللّٰہ ورسولہ

۳۔ ہدایت پر چلنے اور خدا و رسول پر ایمان لانے والے کے لیے سلامتی ہو۔

۴۔ وادعوك بدعایة اللّٰہ فانی انارسول اللّٰہ الی الناس کافة

۴۔ میں تجھے خدا کا بلاوا دیتا ہوں کیونکہ مجھے خدا نے تمام انسانوں کی طرف بھیجا ہے۔

۵۔ لانذر من کان حیاً و یحق القول علی الکافرین

۵۔ تاکہ میں ہر زندہ شخص کو ڈراؤں، کافروں کے متعلق خدا کی بات پوری ہو کر رہے گی۔

۶۔ فاسلم تسلم

۶۔ اسلام لا سلامت رہے گا۔

۷۔ فان ابیت فان إثم المجوس علیك

۷۔ اگر تو انکار کرے تو تمام مجوسیوں کا وبال تجھی پر پڑے گا۔

یہ متن تاریخ طبری ص ۱۵۷۱، ص ۱۵۷۲ (دو روایتیں) صبح الاعشیٰ قلقشندی جلد ۶ ص ۲۹۶، کتاب الصناعتین لابی ہلال العسکری، نیز جلد ۶ ص ۳۷۸، اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین لابن طولون مکتوب ۳، المواہب اللدنیہ للقسطلانی جلد نمبر ا ص ۲۹۱، تاریخ الیعقوبی جلد ۲ ص ۸۳، نصب الرایۃ الاحادیث الہدایۃ للزیلعی مکتوب نمبر ۹، مفید العلوم ومبید الہموم، للقزوینی مکتوب نمبر ۲، دلائل النبوۃ لابی نعیم جلد ۲ ص ۱۲۲، المنتقی لابی نعیم ورق ۳۵/ب (مخطوطہ حیدر آباد دکن) لفریدون بک جلد ا ص ۳۱، وسیلۃ المتعبدین لعمر الموصلی جلد ۸ ورق ۲۷/ب (مخطوطہ بانکی پور) میں مکمل ملتا ہے اور طبقات ابن سعد، اموال ابی عبید، صحیح البخاری، صحیح مسلم، مسند ابن حنبل وغیرہ میں جستہ جستہ ملتا ہے۔ اس پر کائتانی نے اپنی اطالوی تاریخ اسلام میں اور اسپرنگر نے اپنی جرمن کتاب سوانح و تعلیمات محمدؐ میں بحث کی ہے۔ ادارہ معارف اسلامیہ لاہور کے اجلاس دوم کی روداد میں

Marfat.com

میرا بھی ایک انگریزی مضمون اس خط کے متعلق ملے گا۔

جیسا کہ ابھی بیان ہوا، یہ متن مختلف تاریخوں نے لفظی اختلاف کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اہم تر یہ ہے، بعض روایتوں میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' حذف ہوگیا ہے، اس کی کوئی اہمیت نہیں، کیونکہ حذف عبارت کا عام رواج رہا ہے۔

قلقشندی نے ابو ہلال عسکری سے جو متن نقل کیا ہے، صرف اسی ایک روایت میں ''کسرٰے ابرویز عظیم فارس'' کے الفاظ ہیں اور باقی کسی نے بھی پرویز کا نام نہیں لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پرویز کا نام بعد کا قیاسی اضافہ ہے، واللہ اعلم

ف۳: میں طبری کی ایک روایت میں واشهد ان لااله الا الله وحدهٗ لاشريك له وان محمداً عبدهٗ ورسوله کے الفاظ زاید ہیں، جو اصل فقرے کی صرف شرح معلوم ہوتی ہے۔

ف۴: میں دعاء اللہ اور دعایۃ اللہ کی روایتیں عام ہیں۔ رسالات نبویہ مولفہ عبدالمنعم خاں ٹونکی نے دعاء الاسلام کہیں سے نقل کیا ہے۔ مطلب سب کا ایک ہی ہے۔

ف۵: میں قرآنی آیت کے لحاظ سے بعض روایتوں میں 'لینذر' بھی مروی ہے، جو عربی کے لحاظ سے ذرا تکلف سے ٹھیک ہوگا۔

ف۷: میں ''فان'' کی جگہ ''وان'' اور اسی طرح ''ابیت'' کی جگہ ''تولیت'' نیز ''اثم المجوس عليك'' کی جگہ ''عليك اثم المجوس'' وغیرہ فرق بھی ملتے ہیں، جو روایت بالمعنی کا نتیجہ ہیں۔ ان سے مطلب پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

غرض یہ خط عبداللہ بن حذافہ السہمی بحرین کے حاکم کے پاس لے گئے تھے، یہ ٹھیک طور سے نہیں معلوم ہوتا کہ آیا عبداللہ بن حذافہ ہی مدائن گئے تھے یا حاکم بحرین نے اپنے کسی آدمی کے ہاتھ اسے پایۂ تخت روانہ کیا تھا۔ بہر حال تمام اسلامی مولف بیان کرتے ہیں کہ کسرٰی (خسرو پرویز) نے طرزِ تخاطب دیکھتے ہی پورا خط پڑھے بغیر چاک کر دیا اور نامہ بر کو سامنے سے نکلوا دیا۔ اس کے علاوہ یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسرٰی نے یمن کے گورنر باذان کو حکم بھیجا کہ دو آدمی مدینہ روانہ کرے اور نبی صلی اللہ

Marfat.com

علیہ وسلم عربی کو برضامندی ورنہ گرفتار کر کے مدائن روانہ کرے۔ جب یہ لوگ مدینہ آئے تو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ آج رات میرے رب نے تمہارے رب کو قتل کر دیا۔ اس پر وہ یمن چلے آئے اور جلدی ہی مدائن سے کسریٰ شیرویہ نے سرکاری اطلاع بھیجی کہ اس نے مصلحت عامہ کے تحت اپنے باپ کو قتل کر دیا اور خود تخت نشین ہو گیا ہے اور کہتے ہیں کہ شیرویہ کی پدرکشی کی تاریخ وہی تھی، جو حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی اور اس معجزہ کو دیکھ کر باذان اور بہت سے یمنی مسلمان ہو گئے۔

یہ واقعہ سیرت ابن ہشام (ص ۴۶) پر مذکور ہے جو بہ ظاہر ابن اسحاق کا بیان نہیں ہے بلکہ ابن ہشام نے زہری کی روایت خود اضافہ کی ہے۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۹۷۱ میں جہاں بادشاہوں کے نام خطوط کا ذکر ہے وہاں کسریٰ کے سلسلہ میں یہ قصہ بیان نہیں ہوا ہے۔ تاریخ طبری (ص ۱۵۷۲ تا ۱۵۷۴) میں جہاں اس سفارت کا ذکر ابن اسحاق کے حوالہ سے نقل ہوا ہے، وہیں زہری کی روایت صرف اتنی بیان ہوئی ہے کہ کسریٰ کے نامہ مبارک کو پارہ پارہ کر ڈالنے کی اطلاع ملی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا اس کے ملک کو بھی پارہ پارہ کر دے اور طبری نے شیرویہ کی پدرکشی کا قصہ زہری کے اس قطع کلام کے بعد یزید بن حبیب کی روایت کی بناء پر نقل کیا ہے اور وہاں زہری کا اس سے تعلق نہیں ہے۔

اس اختلاف کو ہم کوئی خاص اہمیت عام حالتوں میں نہیں دیتے لیکن طبری نے جہاں یہ قصہ ۶ھ کے حالات میں حدیبیہ کے بعد بیان کیا ہے وہیں ایران قدیم کے حالات ہیں (ص ۱۰۰۹ پر) یہ جملہ بھی عکرمہ کے حوالہ سے ایک غیر مربوط قصہ کے آخر میں لکھا ہے:

فاھلک اللہ کسریٰ وجاء الخبر الی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یوم الحدیبیۃ ففرح و من معہ۔

چنانچہ خدا نے کسریٰ کو ہلاک کر دیا اور اس کی اطلاع جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو حدیبیہ کے دن پہنچی جس سے آپ

Marfat.com

کو اور آپ کے ساتھیوں کو خوشی ہوئی۔

جب خسرو پرویز کے مرنے کی اطلاع حدیبیہ کے دن آ چکی تھی، تو پھر بعد میں پرویز کے نام خط لکھنا اور پدر کشی کی اطلاع بطور معجزہ دینا سب بے بنیاد قصے بن جاتے ہیں۔ کثیر نویسی کی وجہ سے طبری کے ہاں بلا تنقید متضاد روایات کا آ جانا اور روایات میں بھی بے احتیاطی سے قطع و برید ہو جانا ایک معروف واقعہ ہے، جس سے ہر وہ شخص واقف ہے، جس نے طبری کا غور سے مطالعہ کیا ہے۔

اسی بنا پر ابو نعیم کی دلائل النبوۃ (جلد ۲ ص ۱۲۴) کی یہ روایت خاص توجہ کی مستحق ہے کہ:

> ''رومیوں کے ہاتھوں ایرانیوں کو اسی دن شکست ہوئی تھی، جس دن حدیبیہ کی صلح ہوئی اور جب اس کی اطلاع پہنچی تو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی خوشی ہوئی (کہ قرآن مجید کے سورۂ روم کی کئی سال قبل کی پیشگوئی پوری ہو گئی۔)''

نینوا کی لڑائی شعبان ۶ھ (دسمبر ۶۲۷ء) میں ہوئی تھی، جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا۔ عام طور سے اسلامی مورخ یہ بیان کرتے ہیں کہ مہم حدیبیہ کے لیے مسلمان مدینہ سے ذی قعدہ ۶ھ میں نکلے لیکن امام ابو یوسف نے کتاب الخراج (ص ۱۲۸) میں روایت بیان کی ہے کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے لیے رمضان میں نکلے۔ تاریخ ابن کثیر (البدایہ والنہایۃ جلد ۴ ص ۱۶۴) میں حدیبیہ کے ذی قعدہ میں پیش آنے کا ذکر کر کے اس بات پر تعجب ظاہر کیا گیا ہے کہ عروہ کے بیان کے مطابق صلح حدیبیہ ماہِ شوال میں منعقد ہوئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمعصر زمانہ کی تاریخیں نہ تو بیزنطینیوں کے ہاں محفوظ رہیں، نہ ایرانیوں کے ہاں اور نہ حبشیوں کے ہاں۔ ان حالات میں ایک واحد استثناء خاص توجہ کا محتاج ہے، وہ یہ کہ قیصر ہرقل اور کسریٰ پرویز میں جب آخری فیصلہ کن لڑائی ہوئی، تو قیصر میدان جنگ سے وقتاً فوقتاً اپنے بیٹے کو خط روانہ کرتا رہا۔ اتفاق سے یہ اب تک محفوظ ہیں اور انہی میں سے ایک میں قیصر نے اپنے بیٹے کو لکھا ہے کہ

Marfat.com

''خبر آئی ہے کہ خسرو پرویز کو اس کے بیٹے شیرویہ نے ۲۷ فروری ۶۲۸ء کو قتل کر دیا ہے۔''[۱] (جو وسط رمضان ۶ھ کے مطابق ہے) قرآنی شہادت قیصر کے اس خط کی صحت کی تائید کرتی ہے۔ شعبان میں نینوا میں فیصلہ کن شکست کھانے کے بعد وسط رمضان میں اس کا مارا جانا کوئی تعجب کا حامل نہیں اور بظاہر قیصر کو اس واقعہ کے بیان کرنے میں عمداً جھوٹ پر آمادہ کرنے کی کبھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اسی وجہ سے واقدی کا یہ بیان کرنا کہ:

> ''شیرویہ نے اپنے باپ کسریٰ کو منگل کی رات ۱۰ جمادی الاولیٰ ۷ھ کو قتل کیا جب کہ چھ گھڑی رات گزر چکی تھی۔''
>
> (تاریخ طبری ص ۱۵۷۴)

اپنے اندر مقابلۃً کم کشش رکھتا ہے۔

غرض اس وقت جو گتھیاں نظر آتی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

---

[۱] قیصر ہرقل کی جنگوں کے متعلق بھی بڑی پیچیدگیاں ہیں۔ اس موضوع پر سب سے مستند کتاب جرمن زبان میں گیرلانڈ (Gerland) کی ہے جس کا نام ''قیصر ہرقل کی ایرانی مہمیں'' Die Persiscke Peldzuge Des Kaisers Heraklius ہے۔ یہ واقعہ اس کتاب میں یونانی مورخ تیوفان کے حوالہ سے نقل ہوا ہے۔

Marfat.com

واقعہ	طبری فی روایۃ	ابونعیم	ابویوسف	واقدی	ابن کثیر فی روایۃ	ہرقل کا خط یونانی تاریخ میں	عام مورخین
نینوا میں ایرانی شکست	-	-	-	-	یوم الحدیبیہ	-	شعبان ۶ھ
کسریٰ پرویز کا قتل بیٹے کے ہاتھ	یوم الحدیبیہ	-	-	۱۰ جمادی الاولیٰ ۷ھ	-	وسط رمضان ۶ھ	
اس قتل کی اطلاع جناب رسالتمآب کو پہنچنا	-	یوم الحدیبیہ	-	-	-	-	حدیبیہ کے کئی ماہ بعد تقریباً ربیع الثانی یا جمادی الاولیٰ میں
حدیبیہ کے لیے روانگی	-	-	رمضان ۶ھ	-	-	-	ذی قعدہ ۶ھ
صلح حدیبیہ	-	-	-	-	شوال ۶ھ	-	تقریباً اواخر ذی قعدہ یا اوائل ذی حجہ ۶ھ

Marfat.com

ان میں ممکن ہو تو باہم تطابق دینے ورنہ کسی ایک کے بیان کو ترجیح دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس طرف توجہ کرنے سے قبل دو اہم امور بطور تمہید ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے:

۱۔ واقدی اور ان کے شاگرد ابن سعد نے سیرۃ نبویہ کے واقعات کو کبھی تو ہجری سنہ سے بیان کیا ہے اور کبھی ہجرت کے وقت سے اور سب جانتے ہیں کہ ہجرت ۱۲ ربیع الاول کو ہوئی اور سنہ ہجری اس سے کوئی دو ماہ اٹھارہ دن قبل یکم محرم سے شمار کیا جاتا ہے۔ اسی لیے مثلاً جنگ بدر کا ذکر کرنا ہو تو ماہ نہم (رمضان) ۲ھ یا ہجرت سے ایک سال چھ ماہ بعد کہنا پڑے گا۔ واقدی نے کسی ایک طریقہ شمار کا چونکہ شروع سے آخر تک لزوم نہیں رکھا ہے، اسی لیے من الہجر ۃ (ہجرت کے وقت سے) اور للہجر ۃ (ہجری سنہ سے) کہنے سے بآسانی غلط ملط ہو سکتا ہے۔ مزید برآں اگر راوی کی صرف روایت پہنچی ہو اور اس سے بالمشافہ جرح اور تعین کا موقع نہ ہو اور راوی نے ہجری سنہ مراد لیا ہو اور واقدی نے وقت ہجرت سے مدت مراد ہونی سمجھی ہو، تو نادانستہ تین ماہ کا بڑی آسانی سے فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ خاص کر اس لیے کہ واقدی نے مہینے کا نام لینے کے لیے اکثر مہینوں کی گنتی دی ہے کہ ہجرت کے اٹھارہ یا بیس مہینوں بعد، وغیرہ

۲۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی حجہ ۱۰ھ میں سال کبیسہ کو عربی مہینوں کے لیے ہمیشہ کے واسطے منسوخ فرما دیا اور خطبہ حجۃ الوداع میں اس کی قرآنی ممانعت (انما النسیئ زیادۃ فی الکفر الآیہ) کو دہرانے کے بعد ارشاد فرمایا تھا:

وان الزمان قداستدار کھیئۃ یوم خلق اللّٰہ السموات والارض۔

زمانہ چکر کھا کر پھر وہی شکل اختیار کر چکا ہے جیسا خلقتِ آسمان و زمین کے وقت تھا۔

(سیرۃ ابن ہشام۔ص ۹۶۸، تاریخ طبری ص ۱۷۵۴ وغیرہ)

اور متفقہ طور سے اس کی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ اس وقت ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر قمری اور کبیسہ دونوں لحاظ سے ذی حجہ باہم جمع ہو گئے تھے۔ قمری اور کبیسہ مہینوں

Marfat.com

کے متعلق عربی مورخوں نے جو بیانات چھوڑے ہیں، ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر تیسرے سال قبیلہ بنی فقیم کا سردار (جس کا لقب قلمس ہوا کرتا تھا) حج کے موقع پر منیٰ میں ایک خاص رسم کی انجام دہی کے ذریعہ سے اعلان کرتا تھا کہ اب جو ذی حجہ چل رہا ہے، اس کے بعد نیا چاند نظر آئے، تو وہ محرم الحرام کا نہ ہوگا (بلکہ ایک گمنام اور محترم مہینا ہوگا) اور اس کے بعد کا نیا چاند محرم الحرام کا ہوگا۔ (جدید علم ہیئت بھی یہی کہتا ہے کہ قمری سال میں شمسی سال سے دس دن کم ہوتے ہیں اور ہر تیسرے سال ایک مہینا کا فرق پڑ جاتا ہے) اس بیان کے بموجب اگر ۱۰ھ میں دونوں قسم کے مہینے یکجا ہو گئے تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ:

Marfat.com

سنہ ۶		سنہ ۷		سنہ ۸		سنہ ۹		سنہ ۱۰	
ہجری مدنی	مکی کبیسہ	ہجری مدنی	کبیسہ مکی	ہجری مدنی	کبیسہ مکی	ہجری مدنی	کبیسہ مکی	ہجری مدنی	کبیسہ مکی
محرم	ربیع ۱	محرم	صفر	محرم	صفر	محرم	صفر	محرم	محرم
صفر	ربیع ۲	صفر	ربیع ۱	صفر	ربیع ۱	صفر	ربیع ۱	صفر	صفر
ربیع ۱	جمادی ۱	ربیع ۱	ربیع ۲	ربیع ۱	ربیع ۲	ربیع ۱	ربیع ۲	ربیع ۱	ربیع ۱
ربیع ۲	جمادی ۲	ربیع ۲	جمادی ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	ربیع ۲	ربیع ۲
جمادی ۱	رجب	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۱
جمادی ۲	شعبان	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	جمادی ۲
رجب	رمضان	رجب	شعبان	رجب	شعبان	رجب	شعبان	رجب	رجب
شعبان	شوال	شعبان	رمضان	شعبان	رمضان	شعبان	رمضان	شعبان	شعبان
رمضان	ذی قعدہ	رمضان	شوال	رمضان	شوال	رمضان	شوال	رمضان	رمضان
شوال	ذی حجہ	شوال	ذی قعدہ	شوال	ذی قعدہ	شوال	ذی قعدہ	شوال	شوال
ذی قعدہ	-	ذی قعدہ	ذی حجہ	ذی قعدہ	ذی حجہ	ذی قعدہ	ذی حجہ	ذی قعدہ	ذی قعدہ
ذی حجہ	محرم	ذی حجہ	محرم	ذی حجہ	محرم	ذی حجہ	-	ذی حجہ	ذی حجہ

Marfat.com

اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ذی قعدہ ۶ھ ملی میں جب صلح حدیبیہ ہوئی، تو رمضان ۶ھ ہجری چل رہا تھا اور اس طرح عروہ کا یہ کہنا کہ مہم حدیبیہ شوال میں ختم ہوئی یا امام ابو یوسف کا کہنا کہ حدیبیہ کے لیے مسلمان رمضان میں نکلے تھے اور عام مورخین کا اس واقعہ کو ذی قعدہ میں قرار دینا، ان میں باہم کوئی تضاد نہیں، چونکہ اُس وقت تک سال کبیسہ منسوخ نہیں ہوا تھا اور مکہ پر قریش ہی قابض تھے، اس لیے ان کے حج کا موسم ان کے ذی قعدہ سے شروع ہوا تھا۔ حالانکہ خالص قمری حساب سے ابھی رمضان ہی کا مہینا چل رہا تھا۔

سنہ ہجری اور وقت ہجرت کے فرق کے تین مہینے اور قمری اور کبیسہ سالوں کے فرق کے تین مہینے جملہ چھ مہینوں کا فرق، یہ بڑی آسانی سے واقدی کی اس ۶ھ میں روایت کی توجیہ کر دیتا ہے کہ پرویز کا قتل ذی قعدہ (ملی) کی جگہ جمادی الاولیٰ میں کیوں بیان کیا گیا، دوسرے الفاظ میں راوی نے کہا ہوگا کہ سنہ ہجرت اکہترویں مہینے میں اور واقدی نے وقت ہجرت (ربیع الاوّل) سے حساب کیا اور نہ تو دو کبیسہ سالوں کا خیال رکھا اور نہ ہجرت اور سنہ ہجری کے فرق کا لحاظ کیا اور سنہ ہجرت کے اکہترویں مہینا یعنی ذی قعدہ ۶ھ ملی کی جگہ جمادی الاولیٰ ۷ھ بیان کر دیا۔

واقدی نے یہ نہیں بیان کیا ہے کہ خسرو پرویز کے اپنے بیٹے کے ہاتھوں مارے جانے کی تاریخ انہیں کس ماخذ سے معلوم ہوئی۔ اگر اس تاریخ کے متعلق یونانی مورخ کا بیان (خود قیصر ہرقل کے خط کی بنا پر) صحیح مانا جائے تو یہ واقعہ ۲۷ فروری ۶۲۸ء (مطابق وسط رمضان ۶ھ م وسط ذی قعدہ ۶ھ ملی) کو ہوا ہوگا اور یہ روایت قطعاً رد کر دینی پڑے گی کہ کسریٰ کے حکم سے جب یمن سے دو ایرانی افسر مدینہ آئے تو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ ''آج رات میرے رب نے تمہارے رب کو قتل کر دیا۔'' اور یہ کہ اس پیش گوئی یا غیب گوئی کے صحیح ثابت ہونے پر گورنر یمن مع حوالی موالی مسلمان ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اپنی عظمت کی برقراری کے لیے ایسے کسی معجزہ کی محتاج نہیں، خاص کر جب کہ اس معجزہ کا حال کچھ بہت زیادہ مستند ذرائع سے بھی معلوم نہیں ہوتا ہے اور اس کے متعلق خود عرب

مولف متضاد باتیں بیان کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر واقدی کی روایت کہ یہ قتل ۱۰ جمادی الاولیٰ کو ہوا، صحیح بھی مانی جائے تو متعدد علمی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور پرویز کے قتل کی جو تاریخ ایرانی اور رومی ذرائع سے متعین ہے، اسے نظرانداز کرنا آسان نہیں ہے۔

اسی لیے طبری کی روایت کہ کسریٰ کے قتل کی اطلاع حدیبیہ کے دن آئی، اصل میں اس روایت کی بگڑی ہوئی شکل ہے، جو ابونعیم نے بیان[1] کی ہے کہ نینوا کی شکست کی خبر حدیبیہ کے دن آئی اور اس میں کوئی امر مانع نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یہ حدیبیہ سے مہینا بھر پہلے کا واقعہ تھا اور اس عرصہ میں ایران کی خبر اس زمانہ میں مکہ تک آ سکتی تھی۔

مجھے اپنے ان اخذ کردہ نتائج پر اصرار نہیں ہے اور اگر کوئی اہل علم ان کی اصلاح کر سکیں اور گتھیوں کو سلجھا سکیں تو سیرۃ نبویہ کی ایک الجھن رفع ہو سکے گی۔

واللہ الھادی الی الصواب وھو الموفق والیہ المآب۔

تتمہ:

جیسا کہ عرض کیا گیا جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ''کسریٰ عظیم الفرس'' کے نام خط روانہ فرمایا تھا، ابو ہلال عسکری کی روایت کہ خط میں ''کسریٰ ابرویز'' لکھا ہوا تھا، ممکن ہے کہ صحیح ہو اور باوجود پرویز کے قتل ہو چکنے کے اس کی اطلاع اس وقت تک مدینہ منورہ نہ آئی ہو، لیکن پرویز کے قتل کے بعد مداین میں جو شاہ گردی شروع ہوئی، اس کے باعث یہ معلوم نہیں کہ وہ نامۂ مبارک دراصل کس نے وصول کیا۔

بہرحال ایران کی پریشان صورت حال کے باعث جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے براہِ راست ایرانی مقبوضات عرب کے افسروں سے مخاطبت شروع فرمائی۔ چونکہ ان مٹھی بھر ایرانیوں کو اب مداین سے کسی کمک اور مدد کی توقع نہ رہی تھی جیسا کہ طبری نے (تاریخ ص ۱۹۹۰ میں) بیان کیا ہے کہ کم از کم یمن میں ایک وطنیت پسند تحریک زور وشور سے اٹھ چکی تھی کہ مداخلت کنندہ ایرانی غیر ملکیوں کو نکال باہر کیا جائے، اس لیے علاوہ اور اسباب کے کوئی تعجب نہیں کہ اپنی جان و مال کے اس خطرہ کو دیکھ کر ان ایرانیوں

---

[1] گو ابونعیم کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نینوا کی شکست ہی حدیبیہ کے دن ہوئی۔

Marfat.com

نے اسلام قبول کرنے اور حکمران عرب صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت حاصل کرنے کی جانب ترغیب پائی ہو اور ہم دیکھتے ہیں کہ یمن، عمان، بحرین، وغیرہ کے ایرانی مقبوضات دیکھتے کے دیکھتے مداین سے ٹوٹ کر مدینہ سے جڑ گئے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاستِ خارجہ کچھ اتنی کامیاب ہو رہی تھی کہ باقی علاقوں کے لیے مداین کو فکر ہونے لگی۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں جب قسمت نے بوران دخت کو تخت کیانی پر پہنچایا، تو اس نے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تحفے تحائف بھیج کر دوستی کی طرح ڈالنی چاہی (جیسا کہ تاریخ طبری ص ۳۱۶۳ میں صراحت سے اور ترمذی شریف جلد۲ ص ۲۹۶ باب قبول الهدایا میں بلاصراحتِ نام اس کا ذکر ملتا ہے)

ضمیمہ:

نسی کے متعلق عرب مولفوں میں سے البیرونی وغیرہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ سال قمری کو سال کبیسہ بنانے کا نام ہے تو بعض مولف یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ اشہر حرم کی طوالت سے گھبرا کر غیر حرام مہینا بیچ میں شامل کیا جانے کا نام تھا تا کہ اس زمانہ میں لوٹ مار کی جا سکے۔ غور کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ "نسی" کی حرمت کے کئی سو سال بعد جب خالص قمری سنہ میں پلے ہوئے بعض عرب مولف اس کو سمجھ نہ سکے اور جس طرح قمری و شمسی سال میں سالانہ دس دن کا فرق قدیم زمانہ میں عام بدویوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا اور وہ قلمس کی کبیسہ گری کو محض یہ سمجھتے تھے کہ مسلسل تین حرام مہینوں کی دل برداشتہ کر نے والی طوالت کو توڑنے کے لیے ایک غیر حرام مہینا لایا گیا ہے، بالکل اسی طرح ان بدویوں کی اولاد اور ان کی کہاوتوں اور روایتوں کے حامل مسلمان علماء بعد کو زیادہ غور کیے بغیر بدویوں کی روایتوں کو اسلامی ادبیات میں شامل کرنے لگے۔ نسی کے متعلق سویڈن کے پروفیسر موبرگ (Moberg) نے جرمن زبان میں ۱۹۳۱ء میں جو مقالہ لکھا ہے، وہ چاہے نتائج کے لحاظ سے غیر تشفی بخش ہو لیکن مواد اور حوالوں کے اعتبار سے بہت مفید ہے، اس کا خلاصہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں بھی دیا گیا ہے۔

(معارف اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۴۲ء)

نوٹ: بعد میں یہ مضمون نقوش لاہور رسول نمبر جلد ۳ میں بھی شائع ہوا۔

Marfat.com

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک
کسریٰ کے نام
ایک نئی دریافت

دریافت:

مئی ۱۹۶۳ء کی دسویں یا اس کے لگ بھگ زمانے میں ساری دنیا کے اچھے اخباروں نے بیروت کی یہ اطلاع شائع کی کہ وہاں کے سابق وزیر خارجہ ہنری فرعون کے موروثی ذخیرے میں اصل مکتوب نبویؐ بنام کسریٰ دستیاب ہوا ہے۔

اس سے چند ماہ پہلے اس کا فوٹو راز میں پاریس کے کتب خانۂ عام کو رائے کے لیے بھیجا گیا تھا اور مجھ سے بھی وہاں رائے طلب کی گئی تھی۔

پھر ۲۲ رمئی ۱۹۶۳ء (مطابق ۲۷ رذی الحجہ ۱۳۸۲ھ) کو بیروت کے روزنامۂ الحیاۃ میں ڈاکٹر صلاح الدین المنجد نے اس نامۂ مبارک کا فوٹو بھی چھاپا اور اس پر ایک تحقیقی مضمون بھی شائع کیا۔ چونکہ یہ دریافت انہی نے کی اس لیے یہاں اس کے ضروری اقتباس درج کیے جاتے ہیں۔ ضمناً یہ اشارہ کرتا چلوں کہ اس کے کوئی دو سال بعد مجھے بیروت جانے کا موقع ملا تو وہاں ہنری فرعون صاحب کی وفور عنایت سے اصل کے دیکھنے کا مجھے بھی شرف حاصل ہوا اس لیے کہیں کہیں اپنے مشاہدے کی کیفیت بھی بڑھاتا جاؤں گا۔

صلاح الدین منجد صاحب لکھتے ہیں:

Marfat.com

(الف) ہنری فرعون کے والد نے پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر یہ دستاویز دمشق میں ڈیڑھ سو اشرفی میں خرید کی یا تو خود اسے معلوم نہ تھا، یا یہ کہ اس نے اپنے اہل خاندان کو نہ بتایا کہ یہ کیا چیز ہے، بہرحال ہنری فرعون کو ۱۹۶۲ء تک معلوم نہ تھا کہ یہ ایک مکتوب نبویؐ ہے۔ نومبر ۱۹۶۴ء کے آخر میں اس نے یہ صلاح الدین منجد کے سپرد کیا کہ اس کو پڑھنے کی کوشش کریں۔

(ب) یہ ایک رَق (جھلی) ہے جو ایک سبز کپڑے [1] پر جس کا رنگ مرور زمانہ سے تبدیل ہو گیا ہے، چسپاں ہے اور کپڑا بھی مالیدہ ہو گیا ہے، اور یہ سب ایک کانچ کے فریم میں جڑا ہوا ہے۔ مزید برآں:

(۱) جھلی پرانی اور نرم ہے، اور گہرے خاکی رنگ کی ہے، اس کے کنارے کالے پڑ گئے ہیں۔ یہ (۲۸) سنٹی میٹر لمبی اور ($۲۱\frac{۱}{۲}$) سنٹی میٹر چوڑی ہے۔

(۲) یہ جھلی مستطیل سی ہے مگر چوڑائی یکساں نہیں، اوپر زیادہ چوڑی ہے نیچے کم۔

(۳) اس پر عبارت (۱۵) سطروں میں ہے مگر کوئی سطر ($۳\frac{۱}{۲}$) سم ہے تو کوئی ($۲۱\frac{۱}{۲}$) سم۔

(۴) عبارت کے نیچے ایک گول مہر ہے جس کا قطر (۳) سم ہے۔

(۵) جھلی کے نچلے حصے نے پانی کا مار کھایا ہے جس کے باعث بعض جگہ (حروف یا الفاظ مٹ گئے ہیں اور بعض جگہ مدھم ہو گئے ہیں۔ مہر کی عبارت مٹ گئی ہے بجز حرف ''ر'' کے جو مہر کے وسط میں ہے جو غالباً لفظ ''رسول'' کی بقایا ہے [2]

(۶) اس جھلی کو کسی نے پھاڑنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ وہ تیسری سطر دائیں طرف سے وسط تک چیری گئی ہے پھر طولاً دسویں سطر تک پھٹی ہے، اس پھٹن کی شکل (⌐) ہے۔

---

[1] جب میں نے ۱۹۶۵ء میں دیکھا تو یہ کپڑا نکال دیا گیا تھا اور صرف جھلی دو شفاف کانچوں کے بیچ میں رکھ کر بند کر دی گئی تھی۔

[2] خوردبین سے ذرا غور سے پڑھیں تو پورا لفظ ''رسول اللہ'' پڑھا جاتا ہے اور پانی کا مار صرف نچلے حصے میں نہیں اوپر سے نیچے تک جا بجا ہے۔

(۷) اس پھٹن کو بعد میں کسی نے مہین جھلی سے ٹانکے لگا کر سی دیا ہے۔

(۸) قدیم ترین عربی کتبہ اسلامی عہد میں وہ ہے جو مدینہ منورہ میں جبل سلع پر ہے اور جس میں ابو بکرؓ، عمرؓ اور علیؓ کا نام ہے اور جو ۴ھ ہجری کا ہے۔ ۳

صلاح الدین منجد نے لکھا ہے کہ وہ علم رسم الخط کے نقطۂ نظر سے اس اصل مکتوب کے متعلق ایک تحقیقی مقالہ مکرر لکھیں گے اور اس کے ہر ہر حرف کی جانچ کریں گے (مگر تاحال اس مضمون کے چھپنے کی اطلاع نہ ملی) ان کی رائے میں یہ مکتوب اصلی ہے۔ (اسی مضمون کا خلاصہ انہوں نے کراچی کے ماہنامہ ''الوعی'' میں بھی مع فوٹو کے شائع کیا ہے اور خود میں نے روما کے رسالہ RSO جلد ۴۰، ۱۹۶۵ء میں فرانسیسی میں ایک مقالہ چھاپا ہے جو وہاں صفحہ ۵۷ تا ۶۹ آیا ہے اور اس میں چار فوٹو ہیں)۔

اس اصل کی عبارت یوں پڑھی جاتی ہے۔

(۱) بسم الله الرحمن

(۲) [ا] لرحيم من محمد عبدالله و

(۳) رسوله الى كسرى عظيم فا

(۴) رس سلام على من اتبع الهد

(۵) ى و آمن بالله ورسوله و

---

۳ صلاح الدین صاحب نے حوالہ نہیں دیا ہے، بظاہر وہ میرے مضمون کی بنا پر ہے جو رسالہ اسلامک کلچر حیدرآباد دکن ۱۹۳۹ء، صفحہ ۴۲۷ تا صفحہ ۴۳۹ پر بعنوان ''چند عربی کتبے مدینے میں ہجرت کے ابتدائی سالوں کے'' چھپا ہے۔ صلاح الدین صاحب دو کتبوں کو خلط ملط کر رہے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کا نام ایک کتبے میں ہے، اور حضرت علیؓ کا دوسرے میں (تینوں نام ایک ہی کتبے میں نہیں ملتے) اور یہ ۴ھ ہجری کا نہیں بلکہ ۵ھ ہجری کا غزوۂ خندق کے زمانہ کا ہے اس مضمون میں فوٹو کی اساس پر میں نے لکھا تھا کہ کتبے میں ''علی بن ابو طالب'' درج ہے لیکن ۱۹۴۶ء میں مکرر زیارت کا موقع ملا تو دیکھا ہے وہاں ''علی بن ابی طالب'' لکھا ہے اور میرے سابقہ فوٹو میں روشنی کے پھیلنے سے ''ابی'' کی جگہ ''ابو'' بن گیا ہے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔

(۶) شهد ان [لا] اله الا اللّٰه و

(۷) حده لا شريك له وان محمد [ا]

(۸) عبده ورسوله ادعوك

(۹) بدعاية اللّٰه فانني انا رسو

(۱۰) ل اللّٰه الى الناس كافة

(۱۱) الا عذرمن كان حيا ويحق

(۱۲) القول على الكافريت

(۱۳) اسلم تسلم فان ابته

(۱۴) نما عليك اثم المجو

(۱۵) س

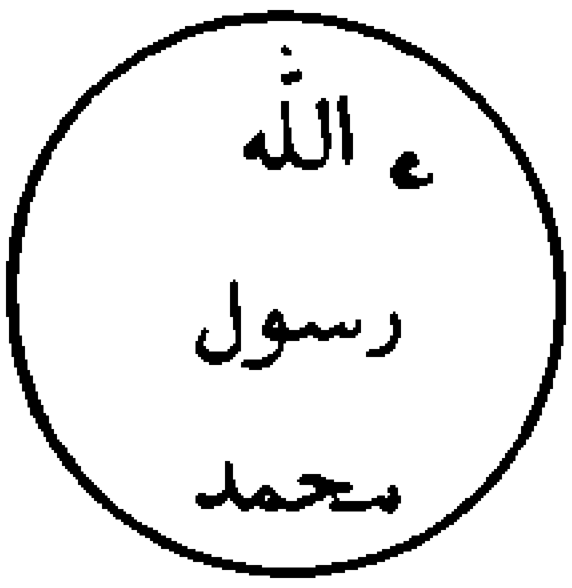

میری کتاب ''سیاسی زندگی'' ؎ میں دیکھا گیا ہوگا سطر ۲-۳ کی عبارت پرانے ماخذوں میں سے بعض میں محمد رسول اللہ ہے تو بعض میں محمد رسول اللہ النبی الامی۔ یہاں محمد عبداللہ و رسولہ ملتا ہے۔ سطر ۸ میں یہاں صرف ادعوک ہے۔ ماخذوں میں وادعوک مروی ہے۔

سطر ۱۳ میں یہاں صرف اسلم ہے، تاریخوں مین واسلم نیز فاسلم کی روایت ہے یہاں ابیتہ پڑھا جاتا ہے، تاریخوں نے عام طور پر ابیت لکھا ہے۔

سطر ۱۳-۱۴ میں یہاں فانما علیک اثم المجوس ہے، طبری میں فانما اثم المجوس علیک آیا ہے۔

؎ کتاب کا پورا نام ''رسول اکرم کی سیاسی زندگی'' ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

عکس مکتوب نبویؐ
بنام کسریٰ پرویز

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحمٰنِ الرَّحيم
مِنْ مُحَمدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُولِهٖ اِلیٰ
کِسْریٰ عظیم فارس، سَلامٌ
علیٰ مَنِ اتبَعَ الھُدیٰ وَاٰمَنَ باللّٰهِ
وَرَسُولِهٖ وَ شھدَ اَنْ لَا اِلٰهَ الاَّ اللّٰهُ
وَحْدَهٗ لَاشَرِیْك لَهٗ وَاِنَّ مُحَمدً
عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَدْعُوك بِدِعَایَةِ
اللّٰهِ فَانِّیْ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلیٰ
النَّاسِ کَافَّةً لِاُنْذِرَ مَنْ کَانَ حَیًّاوَّ
یَحَقَّ الْقَوْلُ عَلیٰ الْکَافِرِیْنَ،
اَسْلِمْ تَسْلَمْ فَاِنْ اَبَیْتَهٗ فَاِنَّمَا
عَلَیْك اِثْمُ الْمَجُوْسِ۔

محمد رسول الله

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے بندے اور اس کے رسول محمد کی طرف سے فارس کے بادشاہ کسریٰ کے نام، سلامتی ہو اس شخص پر جو ہدایت کی پیروی کرے اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمد اللہ کا رسول ہے، میں تمہیں اللہ کی دعوت پہنچاتا ہوں، اس لیے کہ میں تمام انسانوں کی طرف اللہ کا رسول ہوں تاکہ جو زندہ ہو اسے ڈراؤں، اور کافروں پر (خدا کی) بات سچی ہو جائے۔ تم اسلام لے آؤ، سلامتی پاؤ گے، پھر اگر تم نے اس سے انکار کیا تو تم پر تمام مجوسیوں کا گناہ ہوگا۔

محمد رسول اللہ

Marfat.com

ان اختلافات میں جو روایت بالمعنی کی وجہ سے ہیں مطلب کہیں نہیں بدلتا۔

رسم الخط کے نقطۂ نظر سے یہ عجیب چیز ہے کہ کاتب:

سطر ۳-۴ فارس کی جگہ فارسـ لکھتا ہے

سطر ۱۰ الناس کی جگہ الناسـ لکھتا ہے

سطر ۱۲ الکافرین کی جگہ الکافرینـ لکھتا ہے

سطر ۱۴-۱۵ المجوس کی جگہ المجوسـ لکھتا ہے

اسی طرح سطر ۱۳ میں فا کی جگہ ڡا لکھتا ہے

مزید برآں ۶ تا ۷ نیز ۸ میں وحدہ، عبدہ کی جگہ وحده عبده ہے جو خاص اس کاتب کی خصوصیت ہے کہیں اور اس کا رواج نظر نہیں آتا۔

ایک اور خصوصیت ہے کہ درمیانی ھ کو ..... لکھا جاتا ہے مثلاً

سطر ۳-۴ میں الھدی کی جگہ الـعـدی

سطر ۶ میں شھد کی جگہ سـعـد

لیکن یہ خصوصیت تینوں دوسرے اصل نامہ ہائے نبویؐ میں بھی ہے مثلاً

مکتوب مقوقس میں:

سطر ۳ میں الھدی کی جگہ الـعـدی

سطر ۱۱ میں اشھدوا کی جگہ اسـعـدو

مکتوب المنذر میں:

سطر ۳ میں اشھد کی جگہ اسـهـد

سطر ۶ میں امرھم-لھم کی جگہ امرعم-لعم

سطر ۸ میں اھل کی جگہ اعـل

سطر ۹ میں منھم-مھما کی جگہ معمم-معما

مکتوب نجاشی میں:

سطر ۴ میں الھدی کی جگہ الـعـدی

سطر ۶ میں المھیمن کی جگہ الـعـمن

Marfat.com

سطر ۷ میں اشھد کی جگہ اسـد

سطر ۱۷ میں الھدی کی جگہ الـدی

اور کہنا پڑتا ہے کہ عہد نبویؐ کا رسم الخط وہی تھا، کم از کم دربار رسالتؐ کے کاتبوں کے ہاں وہی رواج تھا۔

بعض تحقیقات میرے بس کی نہیں مثلاً کہتے ہیں ''ماتحت احمر "INFRARED" شعاعوں سے مٹی ہوئی عبارتیں پڑھی جاتی ہیں نیز بعض اور شعاعوں سے قدیم اور جدید سامان میں امتیاز ہو جاتا ہے، یہ کام جھلی کے مالک اور تجربہ خانوں کا ہے۔

جھلی کا پھٹا اور سلا ہوا ہونا بھی قابل ذکر ہے۔ تاریخوں کا بیان اوپر گزشتہ باب میں دیکھ چکے کہ کسریٰ نے جب خط کا پہلا جملہ سنا کہ رسول اللہ کا نام پہلے اور کسریٰ کا بعد میں ہے تو اسے اپنی ہتک سمجھ کر خط کو پھاڑ دیا، معلوم ہوتا ہے کہ کسی درباری نے اسی کو اٹھا لیا اور محفوظ رکھا (ممکن ہے خود ایلچی نے ایسا کیا ہو)۔

بہرحال بہ حیثیت مجموعی قرائن اس خط کے اصلی ہونے کی تائید میں ہیں۔

آخر میں یہ کہتا چلوں کہ ہنری فرعون عیسائی ہیں لیکن غیر متعصب، انہوں نے اپنے گھر کو ایک عجیب خانہ بنا دیا ہے جس میں تقریباً ساری کی ساری چیزیں اسلامی ہیں، صرف ایک جگہ صلیب وغیرہ کچھ عیسائی آثار قدیمہ ہیں اور مجھ سے کہنے لگے ''میں نے یہ چیزیں یہاں بے جوڑ ہونے کے باوجود عمداً اس لیے لگائی ہیں کہ عیسائی لوگ کہیں یہ الزام نہ لگائیں کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔

لبنان و شام میں بہت سے خاندان مخلوط مذہب کے ہیں کچھ ''شہابی'' مسلمان ہیں تو کچھ عیسائی۔ خاندان فرعون کا بھی یہی حال ہے، ہنری فرعون عیسائی ہیں، لیکن رشاد فرعون جو سعودی عرب میں وزیر ہیں مسلمان ہیں اور شامی الاصل ہیں اور بہت دنوں پیرس میں سعودی سفیر رہے ہیں۔

Marfat.com

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط

(قیصرِ روم کے نام)

آغازِ اسلام کے وقت شام کا زرخیز علاقہ بیزنطینی سلطنت کے ماتحت تھا۔ اس کے جنوب میں جزیرہ نمائے عرب کی سرحد پر بہت سے بدوی قبائل بستے تھے جو آزاد تو تھے، لیکن بیزنطینی اثرات ان پر کارفرما تھے، انہیں قیصرِ روم کی جانب سے معقول معاش مقرر تھی۔ [۱] اس کے معاوضے میں وہ حاجز کا کام دیتے اور خانہ بدوش عربوں کو بیزنطینی علاقے پر چھاپہ مارنے سے روکتے تھے۔

عرب بہت قدیم زمانے سے شام کے ساتھ تجارتی تعلقات رکھتے تھے اور ہر سال گرمی کے موسم میں ان کے کاروان اور قافلے شام پہنچتے تھے۔

ایرانی اور بیزنطینی سلطنتوں میں نسلاً بعد نسل سے برابر جنگ کا سلسلہ جاری تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت تو اس میں اور تیزی پیدا ہو گئی تھی، اس سے متحاربین میں سے کسی کو بھی کیا فائدہ پہنچتا دونوں روز بروز کمزور ہوتے ہی چلے گئے۔ ہجرت نبوی سے کچھ پہلے (۶۱۳ء تا ۶۱۶ء میں) ایرانی فوجوں نے دمشق، بیت المقدس اور اسکندریہ پر قبضہ کر لیا، مگر ہجرت کے پانچویں سال (۶۲۷ء) میں نینوہ کے مقام پر ایرانیوں کو کچھ ایسی زبردست اور مکمل شکست ہوئی کہ لڑائی کا پانسہ ہی پلٹ گیا اور بیزنطینیوں نے نہ صرف اپنا کھویا ہوا سب علاقہ واپس لے لیا، بلکہ حریف سے من مانی شرطیں بھی منوالیں۔ [۲]

۱۔ De Goeje memite our la conquete de la syriezeed P29DEA pmicephore cpolitane de re bus post mauriciumgestise p 27.

۲۔ Nolde Ke Encycalo paedia Brita anica SV Peroia

Marfat.com

مسلمان مورخ ۱؎ بیان کرتے ہیں کہ ۶ ھ کے اواخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیزنطینیوں کے سردار (عظیم الروم) کے نام ایک نامہ بھیجا ۲؎ اور سفیر کو حکم دیا کہ شہر بصری (علاقہ حوران) کے حاکم کے حوالے وہ خط کر دے۔ گورنر بصری نے اس کا انتظام خود کیا ۳؎ کہ وہ خط قیصر ہرقل کے پاس جو ان دنوں ایشیائے کوچک میں مقیم تھا، بھیج دے۔

اگرچہ گولٹ سی ہر ۴؎ جیسے مولفوں کو اس واقعے کی صداقت کے تسلیم کرنے میں تامل نہیں، لیکن ہم یہاں ان اعتراضات کی چھان بین کریں گے جو مختلف یورپی علماء کی طرف سے اٹھائے گئے ہیں۔

چنانچہ سویڈن کے مشہور مؤلف بول ۵؎ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت لکھتے ہوئے ان خطوط کا بھی ذکر کیا ہے جو ہمسایہ فرمانرواؤں کے نام تبلیغ اسلام کی غرض سے بھیجے گئے تھے، مگر اسے اس واقعہ کی صحت میں شبہ ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ مسلمان مورخوں کی روایت کے بموجب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرستادہ سفیر معجزانہ طور سے ان ممالک کی زبانیں بولنے لگ گئے، جہاں انہیں بھیجا گیا تھا، یہ قصہ اصل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے متعلق مشہور ہے کہ انہیں دنیا کے مختلف حصوں میں جانے کے لیے نامزد کیا گیا، اور ان کے عذر پر کہ انہیں ان ملکوں کی زبانیں نہیں آتیں، حضرت عیسیٰ نے دعا کی اور ہر حواری خود بخود اس ملک کی بولی بولنے

۱؎ مثلاً تاریخ طبری ص (۱۵۵۹)

۲؎ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مکتوب کا متن حسب ذیل کتابوں میں ملتا ہے:
صحیح بخاری کتاب نمبر۱ باب نمبر۱۶، کتاب نمبر۵۰ باب نمبر۱۰۲، کتاب نمبر۶۵، باب نمبر۳ حدیث نمبر۴، تاریخ طبری ص ۱۵۶۵، مسند احمد بن حنبل جلد نمبر۱ ص ۲۶۳، جلد نمبر۳ صفحہ ۴۴۱، تاریخ یعقوبی جلد دوم ص نمبر۴، صبح الاعشیٰ مولفہ قلقشندی جلد نمبر ۶ صفحہ نمبر۳۷۶، تا ۳۷۷، مفید العلوم و بلید الہموم، مؤلفہ قزوینی، باب ہشتم نمبر۱۔ زاد المعاد، مولفہ ابن القیم، جلد نمبر۳، ص نمبر۶۰، رسالتِ نبویہ مؤلفہ عبدالمنعم خان نمبر۱۱۶، وغیرہ وغیرہ

۳؎ صحیح بخاری کتاب نمبر۱، باب نمبر۶ نیز کتاب نمبر۵۶، باب نمبر۱۰۲۔

۴؎ Goldziher die Religion de Islam Kultur den Gegenwart IIII Yeubner Kab. P. 96

۵؎ Buhl. Das lebon hiohammed P. 245

Marfat.com

لگ گیا جہاں اسے بھیجا جا رہا تھا، دوسرے الفاظ میں مسلمان مورخوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمسایہ ممالک میں سفیروں کے بھیجنے اور ان سفیروں کے نئی زبانوں کے خود بخود سیکھ جانے کے قصے کو محض اس لیے گھڑ لیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی بات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کم نظر نہ آئیں۔

لیکن بول کو غلط فہمی ہوئی ہے اگرچہ اس سلسلے میں اس نے اپنے کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے لیکن کوئی تعجب نہیں۔ جو خدا بخشے واقدی کی کسی افسانہ نگاری سے اسے سابقہ پڑا ہو، چنانچہ ابن سعد نے بھی طبقات (جلد اول حصہ دوم ص نمبر ۱۹) میں واقدی کی ایک روایت نقل کی ہے جس میں واقعے کے بعض اہم جزئیات کو نظر انداز کر دینے سے مطلب خبط ہو گیا، یہ واقعہ پورے تفصیلات کے ساتھ ہمیں ابن ہشام کی سیرۃ رسول اللہ (ص ۹۷۱) اور طبری کی تاریخ (سلسلہ اول ص ۱۵۶۰) میں ملتا ہے[1] وہاں تو کچھ اور ہی ذکر ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طے فرمایا کہ متعدد ہمسایہ فرمانرواؤں کے پاس تبلیغِ اسلام کے لیے سفارتیں بھیجی جائیں، سفیروں کو نامزد کرنے سے پہلے آپ نے احتیاطاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے اور فرستادہ حواریوں کا قصہ بیان فرمایا اور ارشاد کیا کہ اگر میں بھی کچھ سفیر بھیجنا چاہوں تو تم لوگوں کو ان حواریوں کی طرح ہچکچاہٹ اور پس و پیش نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے بعد اعلان فرمایا کہ فلاں شخص فلاں حکمران کے پاس خط لے جائے اور فلاں شخص فلاں کے پاس۔

اس روایت میں نہ تو کوئی خارق العادۃ واقعہ ہے اور نہ کوئی خلاف عقل یا غیر قرین قیاس امر حواریوں کا قصہ بیان کیے جانے کی ضرورت بھی واضح ہے، کہ کسی صحابی کو ذرا بھی تردد نہ پیدا ہو، اس واقعے سے شاید ہم یہ بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمسایہ ممالک میں تبلیغ کرنے کا خیال کس طرح پیدا ہوا۔ وہ کون شارع مذہب ہوگا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بیان کردہ فرستادگی اور حواریین کی اقتدا کا خیال

---

[1] نیز دیکھیے تاریخ مصر مولفہ ابن عبدالحکیم (طبع لائڈن) ص ۴۵

نہ کرے، فبھدا ھم اقتدہ [1] تو خود قرآنی حکم ہے۔

اب کچھ کائتانی کے اعتراضات [2] بھی سنیے:

۱۔ ''مسلمان مورخ سفراء کے بھیجنے کا واقعہ ٦ھ کے اواخر کا قرار دیتے ہیں اور پھر بھی مورخین کائتانی نے واقدی، ابن ہشام، یعقوبی طبری جیسے متقدمین کے نام اس تذکرے کے آخر میں بطور ماخذ واقعہ گنائے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت دحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مال ومتاع پر قیصر کی سفارت سے واپسی پر جو ڈاکہ پڑا وہ ٦ھ کے وسط میں پیش آیا، ٦ھ کے اواخر میں روانگی اور اسی سال کے وسط میں واپسی بدیہی طور پر ناممکن ہے۔

۲۔ حضرت دحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قیصر کے پاس جانا بیان کیا جاتا ہے اور وہ خیبر کی مہم میں بھی شریک رہتے ہیں، یہ مہم سفارت کی روانگی کے بعد ہی پیش آئی۔ اور یہ غیر قرینِ قیاس ہے کہ حضرت دحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سفارت کو سرانجام دے کر اس قدر جلد واپس ہو گئے ہوں۔

۳۔ مسلمان مورخ بیان کرتے ہیں کہ اسلامی سفیر نے قیصر سے بیت المقدس میں ملاقات کی جب کہ وہ (قیصر) صلیب مقدس کے ایرانیوں سے واپس مل جانے کی خوشی میں وہاں آیا ہوا تھا۔ قیصر کی آمد ٦٢٩ء کی ابتداء یعنی ٧ھ کے اواخر میں ہوئی نہ کہ ٧ھ کے اوائل میں جیسا کہ مسلمان موَرخین کے بیان سے مترشح ہوتا ہے۔

۴۔ سیرت ابن ہشام حقیقت میں سیرت ابن اسحاق کی تہذیب دادہ صورت ہے، مگر ان سفارتوں کی روانگی کا واقعہ ابن اسحاق کی اصل کتاب میں نہیں ہے، کیونکہ روایت کی ابتداء میں ابن ہشام نے ابن اسحاق کا نام نہیں لیا ہے، (یعنی یہ واقعہ ابن ہشام نے خود گھڑ لیا ہے)۔

۵۔ سفیروں کی روانگی اگرچہ اتنا اہم واقعہ ہے لیکن عربی تاریخوں اور حدیث کی

---

[1] قرآن مجید سورہ ٦ آیت ٩٠

[2] Caetani annalidell. Islam. (1905) 6th : 50

Marfat.com

کتابوں میں جملہ روایتیں صرف ایک ابن عباس ہی سے منقول ہیں، دیگر صحابہ کے بیانات بالکل مفقود ہیں۔

کائتانی کا پہلا اعتراض:

کچھ ٹھیک نہیں، سیرۃ ابن ہشام (ص ۹۷۶) اور تاریخ یعقوبی (جلد دوم ص ۷۴) میں جہاں حضرت دحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مال لوٹنے وغیرہ کی مہم کا ذکر ہے، بلا تعین تاریخ واقعہ بیان کیا گیا ہے، جیسے اور بہت سے واقعات کا ان میں تذکرہ ہے، ظاہر ہے کہ اس سے کوئی استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ طبری میں (ص ۱۵۵۵ پر) بے شبہ ۶ھ کے وسط کا ذکر ہے، مگر یہ واقدی کی روایت ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ طبری نے خود اس کو قبول نہیں کیا ہے، کیونکہ تھوڑی دور آگے چل کر طبری نے (ص ۱۷۴۱ پر) اپنی تاریخ میں مکرر اس مہم کا اس کے موقع پر ذکر کیا ہے، اگرچہ اس جگہ طبری نے تاریخ نہیں بیان کی ہے، لیکن واقعات اپنی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں، طبری کا واقدی کی روایتوں کے متعلق جو رجحان ہے، وہ معروف ہے۔ ان روایتوں کے ساتھ اکثر زعم الواقدی کا ایک حد تک طنزیہ فقرہ ضرور ہوتا ہے، اب رہتی ہے ایک واقدی کی روایت، سو واقدی کی حیثیت ایک تاریخی فسانہ نگار سے بڑھ کر نہیں، اس بیان کو بے پس وپیش رد کر دیا جا سکتا ہے [1] واقدی کی توقیتی غلطی کو مصری مورخ زینی دحلان نے

---

[1] اصل میں واقدی نے واقعات کے وقت کے ذکر میں سہواً اس بات کا لحاظ نہیں کیا ہے کہ حجاز میں سنہ کبیسہ رائج تھا، اور ہر تین سال میں ایک مہینہ بڑھایا جاتا تھا، پھر بعض وقت سنہ ہجری سے وقت مقرر کیا ہے اور بعض وقت تاریخ ہجرت سے (دیکھیے کائتانی کی تاریخ اٹالی ۱ھ ف ۱۳ نوٹ نمبر ۱) سب جانتے ہیں کہ ہجرت نبوی اور سنہ ہجری میں ۳ ماہ کا فرق ہے اور ۶ھ میں حجاز کے مروجہ سنہ اور ہجری سنہ میں دو ماہ کا فرق ہو جاتا ہے، اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ واقدی نے حضرت دحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مہم کا وقت بیان کرتے وقت مروجہ عربی سنہ کی جگہ سنہ ہجری بیان کر دیا اور کبیسہ مہینوں کے بڑھانے کا خیال نہ رکھا، تو پھر اس پانچ ماہ کے فرق کا اصلی باعث معلوم ہو جاتا ہے۔

[2] السیرۃ الاحمدیہ مؤلفہ زینی دحلان جلد نمبر ۲ ص نمبر ۳۷۔

Marfat.com

محسوس کرلیا تھا، چنانچہ سیرت نبویؐ لکھتے ہوئے اس واقعے کے تذکرے میں واقدی کی روایت کو اسی بناء پر رد کر دیا ہے کہ سفیر کی روانگی سے پہلے واپسی ناممکن ہے۔ [2]

عرب مورخ [1] یہ ضرور بیان کرتے ہیں کہ حضرت دحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب قیصر روم کو مکتوب نبوی پہنچا کر شام سے واپس آ رہے تھے تو ان پر چند بدوی قبائل نے ڈاکہ ڈالا، مگر معلوم ہوتا ہے، کہ مورخین کو ایک غلط فہمی ہوئی ہے، کیونکہ حضرت دحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۶ھ کے اواخر میں شام کو روانہ ہوئے، اور جب وہ قبیلہ جذام کے علاقے میں تھے تو اس قبیلے کے چند رہزنی پیشہ افراد نے اُن پر حملہ کیا، اس قبیلہ میں چند خاندان مسلمان ہو چکے تھے جب انہیں اطلاع ملی تو فوراً دوڑے اور حضرت دحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مال جو وہ تجارت کے لیے لے جا رہے تھے [2] نہ کہ وہ جو قیصر نے بطور انعام و اکرام دیا تھا، جیسا کہ کائتانی نے واقدی کے افسانے سے اخذ کر کے لکھا ہے، ڈاکوؤں کے ہاتھ سے چھڑایا۔ حضرت دحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ غضبناک ہو کر مدینہ منورہ واپس آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ اس کو بعض افراد عوام نے یہ سمجھ لیا کہ سفارت پوری کر کے واپس آ گئے اور انہی کی روایت مسلمان مورخین کے پاس جگہ پا گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً ایک تنبیہی مہم روانہ فرمائی اور چند دن بعد خود بھی خیبر کی جنگ پر روانہ ہو گئے جہاں حضرت دحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ساتھ رہے اور خیبر کی فتح کے بعد وہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ شام کو روانہ ہو گئے تاکہ قیصر کو نامۂ مبارک پہنچائیں۔ یہ یاد رہے کہ اس واقعے کے جزئیات سب حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے ماخوذ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر اس واقعے کے وقت دس سال سے زیادہ نہ تھی، انہیں یہ حالات بعد میں اور لوگوں کی زبانی معلوم ہوئے ہوں گے، اس لیے واقعے کے جزئیات میں بعض کوتاہیوں یا غلطیوں کا امکان ضرور رہتا ہے۔ گو اس کے ذمہ دار وہ خود نہیں۔ اس سے ضمناً یہ بھی معلوم ہو

---

1. مثلاً سیرۃ ابن ہشام (طبع یورپ ص ۹۷۱۔)
2. ایضاً۔

Marfat.com

جاتا ہے کہ فرستادگی سفارت کا واقعہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے زمانے میں بھی ملک میں مشہور تھا گو ایک سرکاری اور حکومتی معاملہ ہونے کے باعث اس کے تمام جزئیات سے عوام کو واقفیت نہیں ہو سکتی تھی۔

حضرت دحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ڈاکے کے سلسلے میں جو مہم بھیجی گئی تھی وہ حسمیٰ نامی مقام پر پہنچی۔ حسمیٰ کا مقام وادی القریٰ کے پرے مدینے سے آٹھ دن کے [1] فاصلے پر واقع ہے، یلغار کرتے آئیں تو بعض وقت اونٹ یہاں سے مدینہ کو تین ہی دن میں پہنچ جاتے ہیں۔[2] بعض حالیہ یورپی سیاح بھی تبوک کے اطراف میں اس نام کے ایک پہاڑ کا ذکر کرتے ہیں۔[3] غرض یہ مقام مدینہ سے اتنا قریب ہے کہ حضرت دحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سفارت پر روانگی و واپسی اور تنبیہی مہم سب اس مدت کے اندر وقوع میں آ سکتے ہیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح حدیبیہ سے واپسی اور خیبر کی روانگی کے مابین پائی جاتی ہے، ابن ہشام [4] کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ سے ذی قعدہ ۶ھ کے آخری دنوں میں مدینہ واپس آئے، اور محرم ۷ھ میں خیبر روانہ ہوئے۔ ابن سعد [5] کے مطابق خیبر کو روانگی اور چند ماہ بعد عمل میں آئی، غرض حدیبیہ سے واپسی اور خیبر کو روانگی کے مابین کم از کم پانچ ہفتوں کا وقفہ پایا جاتا ہے اور یہ مدت حضرت دحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روانگی اور حسمیٰ کی تنبیہی مہم کے پیش آنے کے لیے کافی ہے۔

کائتانی کا دوسرا اعتراض:

کائتانی کا دوسرا اعتراض بھی مذکورہ بالا توضیح کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ کائتانی کی حضرت دحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جنگِ خیبر میں شرکت صرف واقدی میں ملی ہے، مگر یہ

---

[1] معجم البلدان مؤلفہ یاقوت لفظ حسمیٰ۔

[2] سیرۃ ابن ہشام ص ۹۷۸۔

[3] Jaussen et Savignac, mission archeologique enarabie Peris 1909 Vol. 1.P. 64

[4] سیرۃ ابن ہشام ص ۷۵۵ تا ۷۵۶ نیز تاریخ طبری ۶ھ کے واقعات کا آخری حصہ۔

[5] طبقات ابن سعد جلد دوم حصہ اول ص ۷۷۔

[6] صحیح بخاری کتاب نمبر ۶۴ باب نمبر ۳۸، حدیث نمبر ۶ نیز کتاب نمبر ۳۴ باب نمبر ۱۰۸ حدیث نمبر ۲۔

واقعہ ابن ہشام، طبری اور بخاری ۶ نے بھی بیان کیا ہے تاہم جیسا کہ ہم دکھا چکے ہیں، صرف دحیہ کا مہم خیبر میں شریک رہنا ناممکن نہیں اور نہ ہی وہ اس بات کے لیے کوئی ثبوت بن سکتی ہے کہ سفارت شام کا واقعہ من گھڑت ہے۔

تیسرا اعتراض:

تیسرا اعتراض بھی برقرار نہیں رہ سکتا کیونکہ سفیر مذکور کا ۷ھ کے اواخر میں بیت المقدس میں رہنا کسی طرح بھی غیر قرین قیاس نہیں۔ علاوہ براں یہ امر قابل ذکر ہے کہ واقعات زیرِ بحث کے اسلامی ماخذوں میں امام بخاری کی شخصیت سب سے ممتاز ہے اور انہیں بہرحال واقدی پر ترجیح دینی ہوگی، خاص کر اس لیے کہ دونوں نے واقعات کو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت سے بیان کیا ہے۔ امام بخاری کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سفیر کو حکم دیا تھا کہ خط گورنر بُصری کے حوالہ کرے اور اس خط کو گورنر بُصری نے قیصر کے پاس حمص خود بھیجا، قیصر بیت المقدس جا رہا تھا تاکہ وہاں صلیب مقدس کی واپسی کے شکرانے کی تقریب میں حصہ لے، چنانچہ گورنرِ بُصری کا خط ملنے پر قیصر نے جسے اسلام اور بانی اسلام کے متعلق کوئی معلومات نہ تھے حکم دیا کہ رومی علاقے میں اگر حجازی تاجر آئے ہوئے ہوں تو انہیں حاضر کیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان تاجروں کو بیت المقدس میں باریابی کا موقع حاصل ہوا۔

رہا قیصر کا سفر سو ۶۲۵ء کی روایت یونانی مورخ تیوفان ۱ نے بیان کی ہے مگر مورخ نقیفور Nicephore لکھتا ہے کہ قیصر ہرقل ۶۲۸ء میں بیت المقدس آیا، وہاں کے گرجے کی یادداشت بھی اسی کی تائید میں ہے اور اس سے یہ تعین ہوتی ہے کہ ۶۲۸ عیسوی میں وسط ستمبر میں ہرقل نے عید واپسی صلیب میں شرکت کی۔

چوتھا اعتراض:

چوتھا اعتراض بھی درست نہیں کیونکہ گو ابن ہشام ۲ نے سفیروں کے واقعے کو

---

۱ Sptenger, das leben und die lebre des hioh ammed III p. 261 N.I.

۲ سیرۃ ابن ہشام ص ۹۷۱ تا ۹۷۲۔

Marfat.com

بیان کرتے وقت شروع میں ابن اسحاق کا نام نہیں لیا ہے لیکن اس روایت کے سلسلے میں ذرا نیچے اس نے دو مرتبہ ابن اسحاق کا حوالہ دیا ہے، ابن ہشام نے یہ بھی لکھا ہے کہ یمن اور بحرین کی سفارتوں کا حال اس کی ذاتی تحقیق کا نتیجہ ہے جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہیں کہ باقی دیگر سفارتیں خود ابن اسحاق کی بیان کردہ ہیں۔ مزید براں اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ ابن اسحاق نے قیصر و نجاشی کے پاس بھیجے ہوئے سفیروں اور خطوں کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے کیونکہ اگرچہ ابن ہشام نے اپنی کتاب میں ان خطوط کے متن حذف کر دیے ہیں لیکن طبری [1] بیہقی [2] اور قلقشندی [3] نے ان خطوط کے متن ابن اسحاق کے حوالہ ہی سے درج کیے ہیں۔

کائتانی کا پانچواں اور آخری اعتراض:

کائتانی کا پانچواں اور آخری اعتراض یہ تھا کہ سفارت کا اہم واقعہ صرف حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے بیان کیا ہے اگرچہ اس سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا، مگر یہ اعتراض بھی کائتانی کی تحقیقات کا سطحی ہونا ثابت کرتی ہے کیونکہ علاوہ دیگر مؤلفین کے [4] بلاذری [5] اور احمد بن حنبل [6] نے قیصر کی سفارت حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کی بناء پر بھی بیان کی ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو ہمارے ماخذ معلومات ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص صحابہ میں سے ہیں۔ ایک آپ کے چچا زاد بھائی ہیں تو دوسرے شخصی خادم۔ ان دونوں نے شام و مصر کے فتوحات اپنی آنکھوں سے دیکھے، ان کے متعلق اس بات کا کس طرح

---

[1] تاریخ طبری ص ۱۵۶۵، ۱۵۶۹، ج ۱۵۷۰۔

[2] منقول از رسالات نبویہ مؤلفہ عبدالمنعم خان نمبر ۱۰۹۔

[3] صبح الاعشیٰ جلد ۶ ص ۳۷۹، ۳۶۶۔

[4] ابن حبان (منقول از السیرۃ الحمد مؤلفہ زینی دحلان جلد دوم ص نمبر ۲۴۵۔

[5] فتوح البلدان مؤلفہ بلاذری (طبع یورپ) ص ۲۶۱۔

[6] مسند احمد ابن حنبل جلد ۳ ص ۱۳۳۔

Marfat.com

گمان ہو سکتا ہے کہ ان میں اپنے آپ کو حقیر سمجھنے کا جذبہ پایا جاتا ہو جس کے تحت انہوں نے اپنے بانی مذہب کی بڑائی دکھانے کے لیے قیصر روم سے خط و کتابت کا واقعہ گھڑ لیا ہو، ان دونوں بڑی عمر پانے والے صحابیوں کی نوجوانی ہی میں قیصر ہرقل کی فوجوں کو مسلمان متعدد فاش شکستیں دے چکے تھے اور اس کی سلطنت کے چند نہایت زرخیز صوبے چھین چکے تھے۔

یہ تو جواب تھے اعتراضوں کے انہوں نے عدم امکان کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے علاوہ بعض اور وجوہ ہیں، جو ہمیں ارسال سفیر کے واقعہ کی صحت کا یقین دلاتے ہیں۔

اولاً یہ واقعہ ہے کہ ہمعصر بیزنطینی تاریخیں موجود نہیں ہیں۔ بیزنطینی حکومت کے دربار میں بھی سرکاری وقائع نگار ہوا کرتے تھے، مگر ایک زمانے میں ایک صدی تک ان میں فصل پڑ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دور بھی اس وقفہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر بعد کے بیزنطینی مورخوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خط کا تذکرہ نہ کیا ہو[1] تو کوئی حیرت نہیں کیونکہ وہ عیسائی تھے اور اُن کے بادشاہ کو اگر کسی نئے مذہب

---

[1] زوناراس Zonaras بارہویں صدی عیسوی کا مشہور یونانی مورخ ہے وہ قسطنطنیہ میں حکومت کا میرمنشی تھا، پھر سیاسیات سے کنارہ کشی کر کے راہبانہ زندگی اختیار کر لی اور اسی سلسلے میں ایک تاریخ عالم لکھی۔ اس نے بعض اہم اور ایسی کتابوں کے اقتباسات اپنی تاریخ میں دیے ہیں جو آج مفقود ہیں۔ اس ایک مؤلف نے البتہ لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیصر سے ملنے کے لیے خود تشریف لائے تھے اور یہ کہ قیصر نے آپ کو کچھ زمین جاگیر میں دی زوناراس کے متعلق دیگر معلومات کروم باخر کی کتاب تاریخ ادبیات یونان (Krumbacher Geochichte der by zantinischen Literatu P. 348-44) میں ملیں گے زوناراس کی کتاب کا یونانی متن مع لاطینی ترجمے کے شہر بون واقع جرمنی میں ۱۸۹۷ء میں چھپا ہے، اس کتاب کے متعدد یورپی زبانوں میں ترجمے ہوئے مگر میرے پیش نظر صرف لاطینی ترجمہ تھا جس کا ضروری اقتباس دیا جاتا ہے:

Ineodem registriumpaliex Persia reditu regenics nvenit maometus Saracenoreem princeps is igitur ex Aethribo Progressus regenicon venit et regionemad habitandum petitam acceppit joames zonaras Epitomae Historiarum Epit xiv 17, 12 P, 214 نیز دیکھیے: Dictionnaired Histoire et de Geographie Eddlesiastiques (Paris 1914) Vol III S.Varabic Col 1289.

Marfat.com

کے بانی نے تبلیغ کی ہو تو ان کی نظروں میں اس خط کو کیا اہمیت ہو سکتی ہے مسلمانوں سے بعد میں ان کی لڑائیاں رہیں۔ اسی لیے یہ بیزنطینی مورخ جنگ موتہ کا ضرور ذکر کرتے ہیں۔[1] جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روانہ کردہ فوجوں کو ملا کر بیزنطینی فوجوں نے شکست دی تھی۔

دوسرے یہ کہ جملہ مسلمان مورخ جن میں امام بخاری جیسی محتاط شخصیت شامل ہے، اس سفارت کا ذکر کرتے ہیں:

تیسرے خود نفسِ معاملہ میں کوئی امر غیر قرینِ عقل نہیں۔ ایک بانی مذہب اپنی کامیابیوں سے حوصلہ و ہمت پا کر اپنے ایک ہمسایہ حکمران کو تبلیغ دین کرنے کی خواہش کرتا ہے اور اس حکمران کے ایک صوبہ دار کے توسط سے جس سے اس کے ہم وطن تجارت کے سلسلہ میں اچھی طرح واقف تھے، اس حکمران کے نام ایک خط روانہ کرتا ہے کیونکہ حکمران مذکور کا قیام اکثر سمندر پار قسطنطنیہ میں رہتا ہے۔ اس کی کہاں توقع کی جا سکتی ہے کہ نبی حجازی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مرسلہ خطوط میں ان ظاہری اور رسمی امور کی پابندی ہو، جو سلاطین عظام اپنی خط و کتابت میں ملحوظ رکھتے ہیں۔ قیصر ہرقل کا نام عرب میں ہر شخص جانتا تھا۔ یہ وہی بادشاہ تھا جس نے اکتیس سال ۶۱۰ء تا ۶۴۱ء حکومت کی اور عربوں کی گرمائی تجارت گاہ شام و فلسطین و مصر کو ایرانیوں کے ہاتھوں سے دوبارہ چھین لیا تھا، یہ بات نہ بھلائی جائے کہ خط گورنر بصریٰ کے پاس بھیجا گیا تھا سفیر کے ذمے یہ فریضہ بالکل نہ تھا کہ وہ قیصر سے بھی ملاقات کرے۔

چوتھے خود اصل خط کی موجودگی ہے، چنانچہ سب سے پہلے چھٹی صدی ہجری کے مراکشی مورخ سُہیلی [2] نے چشم دید گواہوں کی شہادت پر یہ واقعہ بیان کیا ہے، کہ ان کے زمانے میں اسپین (قسطیلہ) کے حکمران الفونسو [3] نے جس کے قبضے میں

---

[1] دیکھئے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لفظ محمد بحوالہ Theophanes Chrono Graphie ed De Boer vol 1. P. 335.

[2] روض الانف مؤلفہ سہیلی جلد دوم ص ۳۲۱۔

[3] اس نام کو عرب مؤلفوں نے معرب کر کے اذفونش بنا لیا ہے۔

Marfat.com

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط بنام ہرقل موجود تھا، ایک مسلمان سپہ سالار عبدالملک ابن سعید کو دکھایا، نیز یہ کہ الفونسو کی وفات کے بعد یہ نامہ مبارک اس کے نواسے کو وراثت میں ملا۔ اس سے ایک صدی بعد علامہ عینی کا زمانہ آتا ہے۔ وہ مصر کے مملوک سلاطین کے دربار میں بڑا رسوخ رکھتے اور اعلیٰ سرکاری خدمت پر مامور تھے[1] وہ بھی لکھتے ہیں کہ
[2] مملوک سلطان قلاوون نے اسپین کے عیسائی بادشاہ کے پاس ایک سفارت بھیجی تھی اور اس بادشاہ نے سلطان کے سفیر سیف الدین قلیج کو نامہ مذکور بتایا تھا۔

یہ سفارت ۶۸۲ء میں بھیجی گئی تھی [3] ابن فضل اللہ العمری (فوت ۷۴۸ھ) مصر کے میر منشی کا زمانہ اس کے بعد آتا ہے۔ اس نے بھی اپنی کتاب میں سلاطین عالم کے القاب کے سلسلے میں شاہ اسپین کا ذکر کیا ہے [4] اور بتایا ہے کہ شاہ اسپین کے سفیر نے اس سے گفتگو کی اور کہا کہ شاہ اسپین قیصر ہرقل کی اولاد[5] میں سے ہے اور یہ کہ نامہ نبویؐ بنام ہرقل اس وقت تک شاہ اسپین کے پاس محفوظ وموجود ہے۔

مراکش کے مشہور امیر و عالم شیخ عبدالحی کتانی نے حال میں ایک دلچسپ کتاب[6] شائع کی ہے جس میں عہد نبویؐ کے جملہ سیاسی اور سماجی اداروں اور پیشوں کے متعلق کتب حدیث وتاریخ وغیرہ کا مواد اکٹھا کر دیا ہے۔ اس کتاب کی جلد اول صفحہ (۱۵۶ تا ۱۶۸)

---

[1] ان کے حالات کے لیے دیکھیے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام۔

[2] عمدۃ القاری مولفہ عینی جلد اول ص ۱۱۶، نیز دیکھیے فتح الباری مولفہ ابن حجر عسقلانی شرح حدیث بخاری کتاب نمبر ۱، باب نمبر ۶، المواہب اللدنیہ مولفہ قسطلانی جلد دوم ص ۲۹۰، السیرۃ النبویہ مولفہ دحلان جلد دوم ص ۱۴۴۔

[3] قلاوون کے خارجہ سیاسی تعلقات کے لیے دیکھو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام۔ خاص اس سفارت کے مزید حالات کے لیے دیکھیے تشریف الایام والعصور بسیرۃ السلطان الملک المنصور (مخطوطہ کتب خانہ عام پاریس کتاب عربی نمبر ۱۷۰۴ اورق ۲۳ ب تا ورق ۲۳۴ ب۔

[4] التعریف بالمصطلح الشریف ص ۶۲، مطبوعہ مصر ۱۳۱۲ھ۔

[5] اس کی تائید میں دیکھیے نفح الطیب مولفہ مقری جلد دوم ص ۱۵۸۔

[6] التراتیب الاداریہ والعمالات والصناعات والمتاجر والحالۃ العلمیہ التی کانت علی عہد تاسیس المدینۃ الاسلامیۃ فی المدینۃ المنورہ العلیۃ مطبوعہ شہر رباط۔

Marfat.com

میں خاص اس خط کے متعلق ایک باب باندھا ہے۔ انہوں نے خفاجی (فوت ۱۰۶۹ھ) کی کتاب شرح شفاء جلد سوم صفحہ ۴۷ طبع اول پر یہ عبارت ڈھونڈ نکالی ہے۔

"کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط اب تک اسپین کے بادشاہوں کے پاس موجود ہے، وہ اس کی عزت کرتے ہیں اور ایک سنہری صندوق میں حفاظت سے رکھتے ہیں اور نسلاً بعد نسلٍ اس کی نگہداشت کی وصیت کرتے آتے ہیں۔ ۱

اسی طرح شیخ کتانی کی تحقیقات ۲ سے مراکش کے ایک مشہور مولف شیخ ابوراس بن احمد بن ناصر الراشدی المعسکری (فوت ۱۲۳۸ھ) کی کتاب الخبر المعرب عن الاحر المغرب الحال بالاندلس وثغور المغرب میں بھی اس خط کے وجود کا ذکر پایا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کتانی کو اس خط سے خاص دلچسپی رہی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں ۳ کہ جب وہ ۱۳۲۱ھ میں اسپینی مراکش کے پایہ تخت تطوان گئے تو وہاں کے اسپینی ریسیڈنٹ جنرل (مقیم عام) سے اس بارے میں گفتگو کی مگر جب سے مسلمان اسپین سے جا چکے ہیں اس کا کوئی پتا نہیں چلتا چنانچہ مقیم عام مذکور کو بھی اس بارے میں کوئی علم یا اطلاع نہیں تھی۔ مراکش کے سلطان مولیٰ اسمٰعیل بن الشریف نے بھی اپنے ہمعصر شاہ فرانس سے اس بارے میں خط و کتابت کی تھی کیونکہ سنا جاتا تھا کہ وہ اب فرانس میں ہے مگر ۱۳۳۲ھ میں جب رئیس جمہوریہ فرانس مراکش کے دورے پر آیا تو اس نے مقامی مسلمان علماء کی دریافت پر کہا کہ فرانس میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے اور نہ اس نے اس سے پہلے اس بارے میں کچھ سنا

---

۱ بحوالی کتانی جلد اول ص ۱۶۰، ۱۶۱۔

۲ بحوالہ کتانی جلد اول ص ۱۶۱۔

۳ بحوالہ کتانی جلد اول ص ۱۶۱ تا ۱۶۲۔

۴ الکواکب الدراری مولفہ الکرمانی نور النبراس مولفہ البرہان الحلبی حاشیۃ الصحیح مولفہ ابن غازی تنشیف المسلمع مولفہ ابو زید الفاسی، سمط اللآل مولفہ شیخ قویسم التونسی، روض القرطاس مولفہ ابن ابی زرع حواشی العارف الفاسی علی الصحیح وغیرہ۔
ابن ابی زرع کی کتاب کے صفحہ ۱۶۸ میں البتہ یہ لکھا ہے کہ ۶۰۶ھ میں ملک الناصر لدین اللہ محمد بن یعقوب المنصور الموحدی نے جب اسپین پر چڑھائی کا ارادہ کیا تو شاہ الفونسو (اذفونش) نے ؟؟

ہے۔ شیخ کتانی نے چند اور مسلمان مولفوں کے حوالے☆ دیے ہیں۔ جنہوں نے اس خط کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ مگر ان کے بیانات سے کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوتی۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اسلامی مورخون ۱ کے بیان کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ تبوک کے وقت قیصر ہرقل کو ایک اور خط بھیجا تھا۔ بعض بیانات ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دفعہ بھی حضرت دحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سفیر تھے۔ بعض متاخر مولف ۳ قیصر اور ہرقل میں فرق کرتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ ہرقل شام کے گورنر کا نام تھا اور قیصر قسطنطنیہ کے بادشاہ کا لقب تھا اور یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط قیصر کے نام نہیں بلکہ ہرقل گورنر شام کے نام تھا، مگر شاید اسے غلط فہمی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں سلطنت رومہ دو خود مختار مملکتوں پر مشتمل تھی۔ ایک کا پایۂ تخت رومہ تھا تو دوسرے کا قسطنطنیہ۔ قیصر عموماً رومہ کے شہنشاہ کا لقب ہوتا تھا، مگر اسلامی مورخ قسطنطنیہ کے بادشاہ کو بھی قیصر ہی کہتے آئے ہیں اور قسطنطنیہ کی بیزنطینی حکومت ہی شام کی مالک تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وہاں ہرقل ہی حکمران تھا اس لیے قیصر اور ہرقل کا امتیاز کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

اس بحث کے بعد اب شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیزنطینی شہنشاہ ہرقل کو تبلیغی خط لکھنا ناممکن نہیں ہے بلکہ حالات اس کی تائید ہی میں ہیں۔

(معارف اعظم گڑھ - جون ۱۹۳۵ء)

☆ خود حاضر ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ بنام ہرقل ملک الناصر کے ملاحظہ میں پیش کیا، اور اس کی وساطت سے رحم کی درخواست کی۔

۱ صبح الاعشیٰ مولفہ قلقشندی جلد نمبر ۶ صفحہ ۳۷۷ بحوالہ ابو عبید، التنبیہ والاشراف مولفہ مسعودی ۲۷۱ السیرۃ النبویہ مولفہ دحلان جلد دوم صفحہ ۲۴۵، روض الانف مولفہ سہیلی جلد دوم ص ۳۲۰۔

۲ مسند احمد بن حنبل جلد سوم ص ۴۴۱۔

۳ التصریف بالمصطلح الشریف مولفہ ابن فضل اللہ ص ۱۶۱۔

Marfat.com

سیرتِ طیّبہ صلی اللہ علیہ وسلم

کا پیغام

عصرِ حاضر کے نام

ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم ومغفور نے 30/اپریل 1992ء کو اقبال اکادمی، پاکستان کے زیرِ اہتمام "الحمرا" ہال، لاہور میں سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر ایک تقریر کی تھی، جس کا عنوان تھا:

"سیرتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام، عصرِ حاضر کے نام"

یہ تقریر یہاں من وعن ہدیۂ قارئین ہے۔

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام زمانۂ حال کے مطابق ایک ایسا موضوع ہے جس کا مفہوم مختلف لوگوں کے لیے مختلف ہے۔ اس لحاظ سے اس وسیع موضوع سے متعلق کچھ بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ کچھ ہچکچاہٹ یہ ہوتی ہے کہ سیرتِ طیبہ کے بے کنار سمندر میں سے کیا چیز منتخب کر کے آپ کے سامنے پیش کی جائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ایک حل یہ کیا جا سکتا ہے کہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آغاز کے سلسلے میں آج کے ماحول اور دنیا پر نظر ڈالیں، یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دنیا کو کس حالت میں پایا اور پھر اُس کی اصلاح کے لیے خدا کے احکام کے مطابق کیا کام انجام دیے۔ یہ شاید ہمارے لیے ایک نمونہ ہی بنے گا کہ آیا زمانۂ حال کے حالات اور آغازِ عہد نبوت کے حالات یکساں ہیں یا مختلف ہیں۔ اگر یکساں ہیں تو وہ حل ہمارے لیے کام دے گا اور اگر یکساں نہیں ہیں تو جزواً اسوۂ حسنہ کی چیزوں سے ہم استفادہ کر سکیں گے اور نئی چیزوں کے لیے شاید ہمیں کوئی نئی تدبیر اختیار کرنی پڑے گی، جس کے متعلق میں آپ سے وہ مشہور حدیث بیان کر سکتا ہوں، جس سے آپ واقف ہیں۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے ایک شخص (معاذ بن جبل) کو منتخب فرمایا اور یمن کے گورنر کے طور پر بھیجا، جب وہ رخصتی سلام کے لیے حاضر ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے پوچھا:

اے معاذ! تمہارے پاس اگر مقدمات آئیں تو تم کس طرح انہیں حل کرو گے؟

انہوں نے فوراً جواب دیا:

''جیسے قرآن میں احکام ہیں۔''

جواب بالکل صحیح تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دانست میں وہ جواب ناکافی تھا، اس اعتبار سے کہ اگر صرف وہ جواب اور لوگوں کے سامنے آئے تو شاید وہ اس سے استفادہ نہ کر سکیں، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ:

''اگر تم قرآن میں کوئی حکم نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟''

Marfat.com

اس جواب کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو یہ ہے کہ میں یا آپ نہیں، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ یہ ممکن ہے کہ بعض تفصیلیں اور ذیلی باتیں قرآن مجید میں نہ ملیں۔ یہ خیال نہ کرنا کہ قرآن میں ہر چیز موجود ہے، اہم چیزیں ضرور ہیں، لیکن ہر چیز ملے، یہ ضروری نہیں، اس لیے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ:

اگر قرآن میں وہ معاملہ نہ ملے تو کیا کرو گے؟ انہوں نے فوراً جواب دیا کہ:

''اس صورت میں میں سنت کے مطابق کام کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو طرزِ عمل رہا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اقوال ہیں، میں ان کے مطابق کام کروں گا۔''

یہ جواب بھی ٹھیک تھا، اس میں بھی وہی نکتہ پیشِ نظر رہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ:

''اگر تم سنت میں بھی نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟''

یہ چیز خاص کر زمانۂ مابعد کے لیے ہوتی ہے کہ عہدِ نبوی موجود نہ ہو، اس کے بعد کے زمانے آئیں اور لوگ براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ پوچھ سکتے ہوں تو کیا کریں گے؟ اس لیے یہ سوال بہت اہم تھا اور یہ دانستہ طور پر، کہنا چاہیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سوال کیا اور حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا جو جواب دیا، پہلے وہ اور اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ردِعمل، یہ دونوں ہمارے لیے سبق آموز ہیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ:

اگر قرآن و حدیث میں تفصیل نہ ملے تو میں اپنی ذاتی رائے سے کوشش کروں گا اور کوئی جدوجہد نظر انداز نہ کروں گا۔ اجتھد برأ ولا آلو۔

اس جواب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ردِعمل سبق آموز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آسمان کی طرف، اللہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ:

''اے اللہ تیرے رسولؐ کے رسول نے جو جواب دیا ہے وہ مجھے پسند ہے، میں اس پر خوش ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ وہ ٹھیک جواب ہے۔

آدمی کو چاہیے کہ اولاً قرآن و حدیث پر نظر ڈالے، اپنی گتھی کے حل کے لیے،

Marfat.com

اس کے بعد ہر شخص کو بلا استثنا کہنا چاہیے کہ حق بات یہ ہے کہ خدا نے اُسے جو عقل عطا کی ہے، خدا نے اُسے جو صلاحیتیں دی ہیں، اُن کی بنا پر جو چیز بھی اچھی ہو اسے اختیار کرے عمداً بُری چیز کو اختیار نہ کرے۔ کم ہی لوگ ہوں گے جو عمداً بُری چیز اختیار کرتے ہوں۔

بہرحال خدا کی بیان کردہ چیزوں کے بعد ہم خدا ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں، اپنی انفرادی صلاحیتوں کے مطابق۔ اے اللہ مجھے سیدھے راستے پر چلا، اے اللہ مجھے ایسی بات کی تلقین کر جس میں تیری رضا مندی ہے۔

تو اس طرح وہ بھی بالواسطہ خدائی احکام بن جاتے ہیں اس معنی میں کہ اگرچہ پیغمبر جیسی شخصیت کے ذریعے سے وہ ہم تک نہیں پہنچے، ہم عام انسانوں کی حیثیت سے خدا کی عطا کردہ صلاحیتوں کے مطابق خدا ہی کی طرف رجوع ہو کر، جو حاضر و ناظر اور راستہ بتلانے والا ہے، اس کے ہاں درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں صحیح راستہ بتائے۔ اس کے بعد میں دوسرے پہلو پر آتا ہوں۔

عہدِ نبویؐ کے آغاز میں دُنیا کی صورتِ حال:

''عہدِ نبوی میں دُنیا'' ایک وسیع موضوع ہے۔ اگر صرف یہ پوچھا جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وطن میں یعنی مکہ معظمہ میں کیا صورتِ حال تھی تو (اسے بیان کرنا) شاید آسان ہے، لیکن یہ کہنا کہ ساری دنیا میں کیا حال تھا اتنا آسان نہیں رہتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جزیرہ نمائے عرب کے اندر ایک ابتری پائی جاتی تھی۔ سیکڑوں قبیلے تھے جو روزانہ آپس میں لڑائی بھڑائی کیا کرتے تھے۔ اُن میں اخلاقی بُرائیاں بھی تھیں اور سیاسی بدتمیزی بھی تھی کہ آپس میں لڑ کر اپنے آپ کا بھی نقصان کریں اور اہل ملک کا بھی نقصان کریں۔ بہرحال عرب کے اندر افراتفری تھی اور وہاں ایک ایسی صورتِ حال تھی جو انسان کے شایانِ شان نہیں تھی۔

عرب کے باہر پر نظر ڈالیے، وہاں ایک طرف ایران کی عظیم الشان سلطنت پائی جاتی تھی۔ دوسری طرف بازنطینی یونانیوں کی حکومت پائی جاتی تھی اور آگے بڑھیں تو

مصر میں ایک صورت حال، جنوبی عرب میں ایک صورت حال، ہندوستان میں ایک صورت حال، چین میں ایک صورت حال، غرضیکہ افراتفری ساری دنیا میں پائی جاتی تھی اور امن ناپید ہو چکا تھا اور ہمسایہ ممالک ہر وقت لڑائی بھڑائی میں مشغول رہتے تھے۔

اس کے بعد جب عہدِ نبوی شروع ہوا تو پہلے دن تو لوگوں نے اُس کو محض استعجاب کے طور پر دیکھا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ جلد ہی جب اُس میں بت پرستی کی بُرائی اور دیگر بُرائیوں کا جو ملک میں پائی جاتی تھیں، ذکر سنا تو اُن میں استعجاب کے بعد قبولیت کی طرف میلان کی بجائے نفرت پیدا ہوئی۔ خاص کر اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم جو بت پرستی کرتے ہو نہ صرف وہ تمہارے لیے بُری (بات) ہے بلکہ اور لوگ بھی، تمہارے آبا و اجداد بھی اگر بت پرستی کرتے رہے ہیں تو خدا ان کو جہنم میں بھیجے گا، سزا دے گا۔

''کیا میرے باپ، میرے دادا کو (تم) جہنم میں بھیجتے ہو؟''

یہ ایک احمقانہ طریقہ تھا سوچنے کا، مگر یہی ہوا۔ چنانچہ اس کے ردِعمل کے طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دی جانے لگی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو اذیت دی گئی، بلکہ ان میں سے بعض کو قتل بھی کیا گیا۔ ایک عورت خاص طور پر قابل ذکر ہے سمیہ اس کا نام تھا جو اصل میں ترک تھی اور ایک لونڈی کے طور پر ایران میں پہنچی تھی اور ایران کے گورنر کے تحفے کے طور پر وہ مکے آئی تھی۔ بہرحال وہ ایک ترک بہن تھی، مسلمان ہوئی، اُس کو ابوجہل نے قتل کر دیا۔

غرضیکہ اذیت دہی کا سلسلہ ایک بحران کی شکل میں ملک میں پایا جاتا تھا اور ابتدائی دنوں کے بعد ہی ایک واقعہ پیش آیا جس کا یہاں ذکر کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرپرست اور بہی خواہ چچا حضرت ابو طالب کا انتقال ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزیز بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات ہو گئی۔

عرب کے نظام میں معیشت کے لحاظ سے ایک دوسرا چچا قبیلے کا سردار بنتا ہے، یہ تھا ابولہب، اس نے یہ اعلان کیا کہ میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو (اپنے قبیلے

Marfat.com

سے) خارج کرتا ہوں۔ اگر کوئی انہیں (ہلاک) بھی کر ڈالے تو میں اور میرا قبیلہ اس میں دخل نہیں دے گا اور اس طرح سے گویا ملک سے باہر جانے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجبور کر دیا گیا۔ ان حالات سے آپ واقف ہیں، میں تفصیل میں نہیں جاتا صرف آخری نکتے پر پہنچتا ہوں۔

ان حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوچنے لگے کہ اللہ کے احکام کی تبلیغ کس طرح کروں۔ شہر مکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تقریر کرنے کی ممانعت ہے، مکہ کے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سننے کے لیے بھی آمادہ نہیں، تو اتفاق سے ایک موقع تھا جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے استفادہ فرمایا۔ وہ یہ کہ حج کے زمانے میں لوگ مکے اور اُس کے مضافات، منیٰ و عرفات میں سارے عرب سے آتے تھے، جن میں سے ظاہر ہے کہ سب کی اہلِ مکہ کے ساتھ دوستی نہیں تھی، مخالفین بھی کبھی آتے تھے، تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے میں حج کے دنوں میں منیٰ اور عرفات میں اُن بیرونی مہمانوں سے ملاقات کا سلسلہ شروع کیا۔

ہر شخص کے پاس جاتے تھے اور پوچھتے تھے کہ تم کس قبیلے کے ہو، پھر اُس کو تبلیغِ اسلام فرماتے تھے اور جو نکتہ میں خاص طور پر بیان کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ کہتے تھے کہ اگر تم میری بات مانو، —— یعنی خدا کے احکام کی تبلیغ میں میری مدد کرو تو جلد ہی قیصر اور کسریٰ کے خزانے تمہارے قدموں پر نچھاور ہو جائیں گے۔

یہ تھا وہ عزم اور وہ ہمت جو کہنا چاہیے کہ ہمارے لیے سبق آموز ہے۔ مصیبتوں سے نہ گھبرائیں اور مصیبتوں کی کثرت سے ہم مایوس نہ ہو جائیں، بلکہ وہ کریں جو اللہ جل شانہٗ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ وہ یہ کہ ان لوگوں سے کہتے ہیں کہ کام کرو، کام شروع کرو، اللہ جل شانہٗ تمہاری مدد کرے گا اور ان بڑی بڑی مشکلوں سے تم نہ گھبراؤ۔ یہ سبق آموز چیز ہے۔

آج بھی ہمارے لیے وہی مسئلہ پیش ہے۔ ہمارے دشمن لاتعداد بھی ہیں، ہم سے قوی تر بھی ہیں اور سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم میں اندرونی جھگڑے بھی

ہیں۔ بجائے اس کے کہ متحد ہو کر اپنے دفاع کی کوششوں میں مصروف ہوں ہم آپس کی لڑائیوں میں مشغول ہیں۔ یہ چیز اُس وقت بھی پائی جاتی تھی۔ عرب میں، عرب کے باہر ساری دنیا میں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمت دلاتے ہیں، اور کام شروع کرو۔ دنیا کی جو سپر طاقتیں ہیں یعنی قیصر اور کسریٰ وہ تمہارے قبضے میں آ جائیں گی۔

جیسا کہ میں نے کہا کہ ہمارے دشمن بہت سے ہیں۔ ہم سے قوی تر بھی ہیں لیکن اُس سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوسری چیز جس کا میں ذکر کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر ہم تاریخ عالم پر نظر ڈالیں تو ایک حدیث میں ذکر آیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر خدا جل شانہٗ نے بھیجے۔ ان ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کے ہمیں نام بھی معلوم نہیں، مقام بھی نہیں معلوم ہیں اور کاموں کی تفصیل بھی معلوم نہیں ہے۔ لیکن یقیناً کئی سو مذہب پیدا ہوئے ہوں گے۔

ایک دلچسپ حدیث فتوحاتِ مکیہ میں حضرت ابن عربی نے لکھی ہے۔ معلوم نہیں کس حد تک صحیح ہے لیکن دلچسپ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ جل شانہٗ نے ایک لاکھ آدم پیدا کیے اور ہم آخری آدم کی اولاد میں ہیں۔ اس سے آپ اندازہ کیجیے کتنے کروڑ کتنے ارب سالوں سے انسانیت پائی جاتی تھی کہ ایک لاکھ آدم پیدا ہوے ہوں اور ان کی ذریت (اولاد) پھیلی ہو۔ بہرحال عرض کرنا یہ ہے کہ ہم سابقہ پیغمبروں کے حالات پر نظر ڈالیں جس حد تک بھی ہمارے امکان میں ہے، جس حد تک بھی معلومات ہم تک پہنچی ہیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ اسلام اور اسلام سے قبل کے مذاہب میں بعض چیزوں کی حد تک تو اتفاق پایا جاتا ہے۔ مثلاً خدا کو ایک ماننا، لیکن بعض چیزوں کی حد تک اس میں فرق بھی نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے پاس صحیح معلومات موجود نہیں ہیں جو قابل اعتماد ہوں۔ لیکن جس حد تک بھی ذرائع معلومات سے معلوم ہوتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو لیجیے۔ انجیل جو ہمارے پاس عیسائیوں کے ذریعے سے پہنچی ہے اُس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے کہ مجھے دنیا کی حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ گویا ان کی تعلیم روحانی ہوگی، روحانی معاملات کے لیے ہوگی۔ شاید عقائد کے لیے ہوگی۔

لیکن عام معاملات خاص کر سیاسی اور حکومتی معاملات میں انہیں نہ کوئی دلچسپی ہے اور نہ وہ اُس کے لیے کوئی احکام دیتے ہیں۔

آج ہم سوچیں کہ اگر ہم اپنے کاموں سے حکومت کا حصول اور سیاسیات کو خارج کر دیں تو شاید کوئی دلچسپی کی چیز ہمارے پاس باقی نہیں بچے گی۔ آج ہر شخص حکومت کے متعلق ہی کوشش کرتا ہے۔ پارلیمنٹ کے انتخاب میں اس کا چناؤ ہو جائے، وزیر بنے، صدر حکومت بنے، وغیرہ وغیرہ۔

ہم دیکھیں گے مقابلہ کرتے ہوئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے آپ کو سیاسی معاملات سے بالکل خارج رکھتے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ پہلے ہی دن سے نام لیے بغیر حکومت قائم کرنے کی کوشش فرماتے ہیں۔ ابھی تھوڑی سی تفصیل میں آپ سے عرض کروں گا۔ یہ ایک طرف، دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک قول انہی عیسائیوں کی فراہم کردہ انجیل میں یہ بیان ہوا ہے۔

''میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لیے آیا ہوں، غیر قوموں سے مجھے کوئی تعلق نہیں ہے''۔ حتیٰ کہ ایک دن ایک غیر یہودی عورت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئی اور چاہا کہ ان کا دین قبول کرے۔ ان کے الفاظ جو انجیل میں ہیں ان سے ہمیں حیرت ہی ہوتی ہے، وہ یہ ہیں کہ بچوں کی روٹی کتوں کے سامنے نہیں ڈالی جا سکتی ہے۔ اُس کا ایمان قبول کرنے سے آپ نے انکار کر دیا۔

اُس کے برخلاف ہم اپنے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے خاندان کے لوگوں کے لیے ہی کام نہیں کرتے بلکہ سبھی لوگوں کے لیے کام کرتے ہیں۔ اولین مسلمانوں میں کالے بھی ہیں، گورے بھی ہیں، ایرانی بھی ہیں، ترک بھی ہیں، غرضیکہ ساری دنیا کے لوگوں کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کام کرتے ہیں۔ جس سے ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ کیوں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت (طیبہ) ہمارے لیے قابلِ عمل نمونہ ہے اور کس طرح ہم اُس سے آج بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا کہ ہجرت سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمایا

Marfat.com

کرتے تھے کہ اگر تم مجھ پر ایمان لاؤ، میری مدد کرو تو قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے قدموں پر نچھاور ہو جائیں گے۔ اس سلسلے میں ایک پس منظر یاد آتا ہے اُس کا میں آپ سے ذکر کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر مسلمانوں کی حکومت اور قیصر کی حکومت، یعنی بازنطینی یورپ کے یونانی حکمرانوں میں جھگڑے پیدا ہو گئے تھے۔ اس نے ایک مسلمان سفیر کو قتل بھی کر دیا تھا۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک سفارت بھیجی قیصر سے ملاقات کرنے کے لیے، تاکہ اُس سے کہیں کہ لڑائی بھڑائی کی جگہ دوستانہ تعلق رکھو۔ تمہارے لیے بھی یہ بھلائی کی چیز ہو گی اور ہمارے لیے بھی بھلائی کی چیز ہو گی، کیوں آپس میں لڑیں۔ یہ پیغام بھیجنے کے وقت جن لوگوں کو روانہ کیا گیا تھا، ان کی روایت کردہ تفصیل میں آپ کو سناتا ہوں۔

ایک سرکاری تقریب ہوئی، وہاں گفتگو ہوئی، وہاں بحث ہوئی اور اسکے بعد قیصر نے اس سفیر کو ایک دن پرائیویٹ ملاقات کے لیے اپنے گھر بلایا۔ جب وہ بادشاہ کے محل میں پہنچے تو اُس نے ایک خادم کو حکم دیا کہ ایک صندوق لاؤ۔ صندوق لایا گیا، صندوق میں ڈبے بہت سے پائے جاتے تھے۔ اُس نے ان کو کھولا اور اس میں سے ایک تصویر نکالی اور سفیر سے پوچھا:

تم جانتے ہو یہ کس کی تصویر ہے؟

جواب دیا نہیں۔

اُس نے کہا کہ یہ حضرت آدم علیہ السلام کی تصویر ہے۔

پھر اُس کے بعد ایک دوسری تصویر نکالی، اس میں بھی دریافت کیا شاید حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ہو (تصویر ہو) پھر اس نے ایک اور تصویر نکالی، پوچھا:

تم جانتے ہو یہ کون ہیں؟

سفیر نے فوراً جواب دیا: ہاں یہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ تو قیصر اچنبھے میں پڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور کہا تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ واقعی یہ تمہارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر ہے، انہوں نے کہا ہاں

Marfat.com

بالکل اُسی طرح جیسے ہم آپ کو دیکھا کرتے تھے، تو اس وقت اُس نے اقرار کیا کہ صندوق میں جو ڈبے ہیں، یہ آخری ڈبے کی چیز تھی صرف تمہاری آزمائش کے لیے اُسے میں نے پہلے نکال کر پوچھا، ورنہ اگر ترتیب سے آتا تو آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور فلاں اور فلاں تو تم اندازہ کر لیتے کہ یہ تمہارے پیغمبر کی تصویر ہو گی۔ لیکن اب تمہارے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بہت سی اسلامی تاریخی کتابوں میں یہ قصہ موجود ہے۔ بہت سی اور تفصیلیں ہیں میں اس میں نہیں جاتا، لیکن یہ تصویریں کہاں سے آئیں، شاید یہ دلچسپی کا موجب ہو۔

چنانچہ واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ قیصر روم کے ہاں، فرنگی بیان کے مطابق ایک کتاب تھی، ''ہمارے ملک کا مستقبل باتصویر'' اس میں ہر زمانے کے حالات کا ذکر تھا۔ دونوں کو اگر ملائیں تو معلوم ہوتا ہے شاید اُسی بڑی (مصور) کتاب کا ایک جزو تھا جو بادشاہ نے مسلمان سفیر کو دکھایا تھا۔ اس کی تاریخ پر جائیں تو فرنگی مولوی بیان کرتے ہیں کہ حضرت دانیالؑ ایک پیغمبر تھے، انہوں نے اللہ جل شانہٗ سے دعا فرمائی سکندر اعظم کی درخواست پر کہ مجھے فلاں چیز دکھائی جائے۔ حضرت آدم علیہ السلام کا خزانہ کہاں تھا وہ بتایا جائے تو کہتے ہیں کہ حضرت دانیالؑ کے ذریعے سے حضرت آدم علیہ السلام کے خزانے میں جو (دفینہ) چلا آرہا تھا اُس کے اندر سے لی ہوئی چیزیں تھیں۔ یہ تصویریں تو جیسے ہمارے ہاں بھی یہ روایت ہے، ایک مرتبہ حضرت آدم علیہ السلام نے خدا جل شانہٗ سے دعا فرمائی تھی کہ میری اولاد میں جو پیغمبر ہوں گے، مجھے بتایئے وہ کون ہوں گے۔ اس طرح کی حدیث مسلمانوں کے ہاں بھی ملتی ہے۔ ان دونوں کو ملائیں تو باہمی ربط نظر آتا ہے۔

بہر حال قصہ مختصر یہ کہ انتہائی مصیبتوں کے زمانے میں مایوس کن حالات میں آس پاس کے دشمنوں کی عظیم الشان قوت کی موجودگی کے باوجود عزم راسخانہ رکھنا اور ہمت بے پایاں کو رکھ کر کام کیے چلے جانا، نتیجہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے لیکن ہمارا فریضہ صرف یہ ہے کہ کام کیے جائیں تو خدا تعالیٰ اس میں کامیابی دیتے ہیں۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جامع دین پیش کیا

Marfat.com

اور اس کے لیے ایک ہمہ گیر کوشش کا آغاز فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ وہ کوشش کامیاب ہو۔ ورنہ سیکڑوں پیغمبر ایسے گزرے ہیں جن کی قوم نے انہیں قتل کر دیا اور ان کے متعلق ان کے احکام، ان کی تعلیم، کوئی آثار اب باقی ہی نہیں ہیں۔

اس کے برخلاف جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے کے حالات میں مایوسی پائی اور کہنا چاہیے ادب کے ساتھ کہ مجبور ہو گئے کہ اپنے وطن کو ترک کر دیں، مدینے تشریف لے جائیں اور مدینے میں کوشش کا آغاز کریں تو وہاں ہمیں یہ چیز نظر آتی ہے کہ سب سے پہلا کام جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں پہنچ کر فرمایا وہ یہ تھا کہ بے وطن پناہ گزینوں کی گزر بسر کا انتظام کیا۔ یعنی جو مکے کے مسلمان یا نومسلم تھے اور مدینے پہنچے تھے ان کے پاس ذرائع معیشت نہیں تھے تو ان کے لیے کوئی گزر اوقات کا انتظام فرمائیں۔ مواخات (بھائی چارے) کے ذریعے سے یہ کام انجام پایا۔ یعنی مہاجرین کو ملک کی معاشرت اور معیشت میں ضم کر دینا۔ پلک جھپکانے کا وقت لیا اور کام پورا ہو گیا۔

اس کے بعد دوسرا کام جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں وہ یہ تھا کہ بیرونی حملوں کے خدشے سے اپنے مستقبل کی حفاظت کے متعلق تدبیر اختیار کریں۔ چنانچہ حقیقتاً اہل مکہ، مشرکین مکہ نے یہ خط لکھا' مدینے کے مسلمانوں، انصار کے نام کہ تم نے ہمارے ایک دشمن کو پناہ دی ہے یا تو اُسے قتل کر ڈالو یا اُسے اپنے ملک سے نکال باہر کرو ورنہ ہم تمہارے متعلق وہی کام کریں گے جو ہمیں مناسب معلوم ہو گا یعنی حملے کی دھمکی دی۔

ان حالات میں دفاع کا انتظام مقدم ترین تھا اور ملک کی صورت حال یعنی مدینہ منورہ کا حال یہ تھا کہ وہاں یکجہتی نہیں پائی جاتی تھی۔ وہاں عرب بھی تھے، وہاں یہودی بھی تھے، وہاں عیسائی بھی تھے، وہاں یہ نوآمد مسلمان اور اجنبی پناہ گزین بھی تھے، تو کیا کیا جائے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعوت بھیجی شہر کے تمام عناصر کے سرکردہ لوگوں کو کہ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اس میں یہودی بھی آئے، نصرانی بھی آئے، نومسلم بھی آئے اور غیر مسلم بھی آئے۔ اُن سے مخاطب ہو کر حضور صلی

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ملک کی افراتفری کے باعث، آپس کے لڑائی جھگڑوں کے باعث ہمارے لیے خطرہ ہے کہ اگر کوئی اجنبی ہم پر حملہ کرے تو ہم نقصان اٹھائیں اور ہم اُن کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ ایک چھوٹی سی حکومت، سلطنت قائم کی جائے، ہر قبیلے کو آزادی رہے گی لیکن ایک مرکز بھی ہوگا اور وہ مرکز ان کے مفاد کے لحاظ سے تدبیریں اختیار کرتا رہے گا۔

اس کو سب لوگوں نے قبول کیا۔ یہودیوں نے بھی قبول کیا، اور بت پرست عربوں نے بھی قبول کیا اور مسلمان تو ظاہر ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کو دیکھ کر اس سے متفق تھے۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر مدینہ کے ایک جزو میں، مدینہ بہت چھوٹا شہر ہے۔ شہر مدینہ میں نہیں بلکہ شہر مدینہ کے ایک جزو (حصے) میں ایک حکومت قائم فرمائی، ایک سلطنت قائم فرمائی شاید چند مربع میل کا رقبہ ہوگا اور جو چیز قابل ذکر ہے اور جو حیرت انگیز ہے وہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس سلطنت کا دستور تحریر فرمایا۔ تاریخ عالم میں نہ ایران وروما میں، نہ چین میں، نہ ہندوستان میں، نہ امریکہ میں، کسی بھی سلطنت کا دستور تحریری طور پر مرتب نہیں پایا جاتا تھا۔

تاریخ عالم میں پہلی دفعہ اُمّی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سلطنت کا دستور تحریری طور پر مدون فرمایا جو ہم تک پہنچا ہے۔ اس کی دفعات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ہر قسم کی تفصیلات موجود ہیں جو اس زمانے کی ضرورتوں کے لیے بھی کافی تھیں، اُن میں سے بہت سی آج بھی ہمارے لیے کارآمد ہیں۔

جب یہ سلطنت قائم ہوئی تو اس میں چند یہودی قبیلے بھی شریک ہوئے، سب نہیں ہوئے۔ عیسائیوں کی تعداد کم تھی وہ شخصی جلن کے باعث، کہنا چاہیے کہ اس میں شریک نہیں ہوئے، لیکن جو باقی عرب تھے، مسلمان اور غیر بھی وہ اس میں شریک ہوئے اور جس چیز پر ہمیں حیرت ہوتی ہے وہ یہ کہ یہودیوں نے بھی جو مدینے میں تھے پسند کیا کہ اس سلطنت کے صدر یہ اجنبی شخص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔ انہیں اہلِ مدینہ پر اعتماد نہیں تھا۔ لیکن خیال کیا کہ یہ شخص اجنبی ہے، غیر جانبدار رہے گا اور وہ ہمارے

Marfat.com

ساتھ انصاف کرے گا۔ چنانچہ وہ اس سلطنت میں شریک ہوتے ہیں اور انہیں اُس کے حقوق بھی دیے گئے ہیں۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ اندرونی عبادت کی آزادی دی گئی، بلکہ دستور میں لکھا ہے کہ انہیں عدل و انصاف کی بھی آزادی ہوگی یعنی اگر کوئی جھگڑا دو یہودیوں میں پیدا ہو جائے تو حاکم عدالت بھی یہودی ہوگا اور قانون بھی یہودی ہوگا اور فریقین مقدمہ بھی یہودی ہوں گے۔ انہیں کلیتاً آزادی ہوگی اور مرکزی حکومت کی طرف سے اُس حاکم عدالت کے فیصلے میں کوئی دخل اندازی نہیں کی جائے گی، اُس کو بعینہٖ نافذ کیا جائے گا۔

اس کام سے فراغت پانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے ہیں کہ مدینے کی قوت محدود ہے اور مکہ مقابلتاً زیادہ قوی ہے۔ اگر وہ حملہ کرے تو ہم اپنی مدافعت نہیں کر سکیں گے اس کا حل آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً یہ سوچا کہ مدینے کے آس پاس شمال جنوب، مشرق مغرب ہر مقام پر جو آزاد عرب قبیلے رہتے ہیں ان سے تعلق پیدا کیا جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جاتے ہیں جہینہ کے قبیلے کے پاس۔ مثلاً جو مدینے کے شمال میں بستا تھا اور ان سے کہتے ہیں:

دوستو! تم اس وقت آزاد ہو، جو چاہے کرو، جو چاہے نہ کرو۔ کوئی تمہیں مجبور نہیں کرتا۔ لیکن تم ہو تنہا۔ اگر کوئی تمہارا دشمن تم پر حملہ کرے اور تمہاری ذاتی قوت اتنی نہ ہو کہ اس قوی تر دشمن سے مقابلہ کر سکو تو تمہیں کوئی مدد دینے والا بھی نہیں ہوگا۔ ان حالات میں کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم دونوں میں حلف (معاہدہ) ہو جائے۔ اگر کوئی تم پر حملہ کرے تو تم ہمیں اطلاع دو، تو ہم دوڑے ہوئے آئیں گے اور تمہاری مدافعت میں تمہارے ساتھ شریک رہیں گے۔ اگر اسی طرح کوئی ہم پر حملہ آور ہو، اپنے طور پر نہیں بلکہ اگر ہم تم کو بلائیں تو تم بھی ہماری مدد کو آؤ گے۔ یہ باہمی حلف ہمارے لیے، تمہارے لیے، ہم دونوں کے لیے مفید ہوگا۔ بات معقول تھی، انہوں نے قبول کر لی۔

اس میں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ وہ قبیلہ تھا غیر مسلموں کا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی حکومت کی مدافعت کے لیے غیر مسلموں سے حلف (قائم) کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں پاتے تھے۔ یہ ایک پہلو تھا۔ پھر اسی طرح مختلف مقامات پر تشریف

لے گئے اور ایک طرح سے کہنا چاہیے کہ اسلامی مملکت جو شہر مدینہ کے ایک گوشے میں پائی جاتی تھی، اس کے اطراف میں دوستوں کا ایک حلقہ ڈال دیا۔ کوئی اجنبی حملہ آور ہو تو اس کو عملاً مسلمانوں کے دوست قبائل سے گزرنا پڑے گا اور اس کے بعد مدد کے لیے یہ سب لوگ بھی دوڑیں گے انہیں بچانے اور انہیں روکنے کے لیے۔ تو غرضیکہ ایک جال ڈال دیا گیا حلیفوں اور دوستوں کا۔

یہ ایک طرف، دوسری طرف اسلام کی تبلیغ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشغول رہے اور اسلام کی تبلیغ اس معنی میں اہمیت رکھتی ہے کہ ساری چیزیں بیک وقت نافذ نہیں ہوئیں۔ رفتہ رفتہ ایک کے بعد ایک اور تجربوں سے فائدہ اٹھا کر۔ اگر چاہیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ نئے احکام دیے گئے۔

اب آغازِ اسلام پر ہمیں صرف دو چیزیں ملتی ہیں۔ شہادت لا اِلٰہ الا اللّٰہ ، بت پرستی سے انکار ایک چیز —— دوسری طرف نماز۔ صرف یہ دو واجبات تھے باقی چیزیں روزہ اور حج اور زکوٰۃ وغیرہ وہ نہیں پائی جاتی تھیں۔ یہ بعد میں رفتہ رفتہ آتے ہیں، تو یہ بھی ہمارے لیے سبق آموز ہے کہ ان سارے کاموں کو بیک وقت شروع کرنے کے بجائے تقسیم کار بھی کرو اور بتدریج بھی کرو۔ یہ بھی ہمارے لیے ایک سبق آموز نمونہ ملتا ہے۔ ایک چیز پر میں (اس بیان کو) ختم کرتا ہوں۔

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ حکومت جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی، کچھ اس کی تحلیل کریں کہ وہ کیسی تھی؟ کیا وہ بادشاہت تھی؟ کیا وہ جمہوریت تھی؟ کیا وہ یونیٹری (وحدانی) حکومت تھی؟ کپموزٹ حکومت تھی؟ اگر ان چیزوں کو سوچیں تو اس میں بھی ہمارے لیے سبق ہے۔ خیال فرمائیے کہ میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا کہ مسلمانوں پر مصیبت کا زمانہ تھا، خاص کر مکے میں اور اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی نومسلموں سے فرمایا تھا کہ اگر تمہارے لیے یہ صورت حال، یہ اذیت دشمنوں کی ناقابل برداشت ہو چکی ہے تو تم ملک چھوڑ کر حبشہ چلے جاؤ جہاں ایک عیسائی حکمران ہے لیکن اس کے ملک میں انصاف ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو غیر مسلم علاقے میں جا کر پناہ گزین ہونا یہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اور یہ بھی فرماتے ہیں

کہ اُس ملک میں انصاف ہوتا ہے۔تو معیار کیا ہونا چاہیے، اُس کی ہمیں تفصیل ملتی ہے۔

اس کے بعد اور آگے چلیے۔ جب مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی وہ شاید چند مربع میل کے رقبے پر مشتمل تھی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی دس سال بعد وفات ہوئی تو اس مملکت کا رقبہ پھیلتے پھیلتے دس لاکھ مربع کلومیٹر (کذا) کا ہو گیا۔ سارا جزیرہ نمائے عرب، جنوبی عراق، جنوبی فلسطین، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاقے کے اجزا تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کو مانتے تھے اور اس اسلامی حکومت کے اجزا تھے، جو شاید چار مربع میل ہو —— ایک ملین مربع میل (کذا) کا فرق فوراً ہمارے سامنے آتا ہے کہ یہ اُس کوشش کا نتیجہ تھا۔

ایک دوسری چیز لیجیے، تعداد میں مسلمانوں کی، آغازِ اسلام پر سوائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی مسلمان نہیں تھا۔ ایک دن بعد ایک کا اضافہ ہوا۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزیز بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں۔ ایک سے بھی ظاہر ہے کام نہیں بنتا، پھر اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ رفتہ رفتہ ایک دو تین چار، تعداد بڑھتی گئی مگر مصیبتیں بھی بڑھتی گئیں۔ جیسا میں نے ابھی آپ سے بیان کیا کہ حضرت سمیہؓ جو ترک تھیں اُن کو قتل بھی کر دیا گیا، تو عرض کرنا یہ ہے کہ تبلیغ اسلام کی کوشش جاری رہی۔ آغاز پر مٹھی بھر مسلمان تھے لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ایسا نظر آتا ہے کہ میرے اندازے میں نصف ملین لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔

یہ اندازہ میں نے کس طرح لگایا ابھی آپ سے بیان کروں گا لیکن حال ہی میں پیرس میں میں نے ایک عیسائی پادری سے سوال کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب دنیا میں تھے تو اس وقت کتنے لوگ عیسائی تھے، آج کل کتنے ہیں؟ یہ نہیں پوچھا بلکہ حضرت عیسیٰ کی دنیاوی زندگی میں کتنے لوگوں نے ان کا دین قبول کیا تو کچھ ناپسندیدہ حالات میں اس نے کہا کہ شاید تیس چالیس ہوں گے۔ خیال فرمایئے تیس چالیس، اور دوسری طرف نصف ملین لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایمان قبول کرتے ہیں۔

Marfat.com

یہ نصف ملین کی تعداد میں نے کیسے سوچی، وہ بھی آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں۔

اس زمانے میں کوئی اعداد و شمار اکٹھے نہیں کیے جاتے تھے اور کوئی مردم شماری نہیں ہوتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی تعداد کا ذکر آتا ہے مختلف سلسلوں میں۔ مثلاً اس جنگ میں اتنے سپاہی تھے، دشمن کے اتنے اور ہمارے اتنے وغیرہ وغیرہ۔ تو اُسی سلسلے میں لکھا ہے کہ حجتہ الوداع کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے چند مہینے پہلے جو حج ہوا تھا اور جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہوئے تھے، ایک لاکھ چالیس ہزار لوگ شریک تھے۔ یہ سب مسلمان تھے۔ ایک لاکھ چالیس ہزار وفات سے چند مہینے پہلے مسلمانوں کی تعداد نہیں ہے، بلکہ اس حج میں آنے والوں کی تعداد ہے۔

ظاہر ہے کہ سارے لوگ نہیں آئے ہوں گے۔ کوئی بڈھا ہے، کوئی بیمار ہے، کسی عورت کی زچگی ہوئی ہے۔ غرضیکہ مختلف عناصر آبادی کے ایسے ہیں جو نہیں آئے ہوں گے اور حج ہر سال فرض بھی نہیں تھا، اس کے متعلق حکم تھا کہ عمر میں ایک بار حج کرو اگر اس کا امکان پاؤ۔ مفلسوں کے لیے اس سے معافی ہے۔ وہ ایک لاکھ چالیس ہزار حاجیوں کی موجودگی سے میں نے گمان کیا کہ شاید پانچ لاکھ مسلمان ہوں اُس سارے ملک میں، حجاز میں، نجد میں، شمال عرب میں، جنوب عرب میں اور ممکن ہے کہ ہندوستان اور چین میں بھی، ایک مختصر ذکر اس کا بھی کرتا ہوں۔

ہندوستان کے سلسلے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ہجرت سے قبل ایک رات مالیبار کا ایک راجہ رات کو کسی ضرورت سے آسمان پر نظر ڈالتا ہے تو ششدر ہو جاتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ شق القمر کا ہمارا جو معجزہ ہے راجہ نے یہ ماجرا اپنے وزیر سے بیان کیا، اس نے کہا میں تو کچھ نہیں جانتا، لیکن ایک چیز مجھے معلوم ہے۔ حضور (بادشاہ) کے آباواجداد جو حکمران گزرے ہیں انہوں نے کسی ذریعے سے کچھ چیزیں معلوم کی تھیں راز کی۔ ان کو ایک ڈبے میں رکھ کر اُن پر مہر لگائی ہے جو سرکاری خزانے میں موجود ہے اور حکم ہے کہ اسے کبھی نہ کھولو۔ شاید اس ڈبے کے اندر اس کا کچھ ذکر ہو۔ میں اگر خزانچی سے کہوں گا تو مجھے نہیں دے گا۔ اگر حضور فرمائیں تو وہ ڈبہ لائے گا اور ہم کھول کر دیکھ سکیں گے۔

چنانچہ واقعتاً ہوا یہی۔ اُس ڈبے کو منگوایا گیا، اسے کھولا گیا۔ اس کے اندر ذکر تھا پرانے راجہ کا، اس موجودہ راجہ کے آباواجداد میں سے کسی کا، جس میں لکھا تھا کہ آخری پیغمبر کے زمانے میں ایک مرتبہ چاند کے دوٹکڑے ہو جائیں گے۔ وہ آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے یہ اس کا معجزہ ہے۔ تم اس کی خلاف ورزی کبھی نہ کرنا، اس کی بات ماننا۔

اس پر راجہ نے اپنے بیٹے کو اپنی جگہ حکمران بنا دیا اور (خود) چلا گیا مکہ معظمہ، وہاں اس نے اسلام قبول کیا۔ اس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ یہاں نہ رہو شاید اس لیے کہ عرب میں امن نہیں تھا۔ مسلمانوں پر ظلم وستم ہو رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنے ملک ہی کو واپس جاؤ، اپنے ملک ہی میں اس مذہب کی تبلیغ کرو۔

چنانچہ وہ مکے سے واپس ہوتا ہے خشکی کے راستے سے یمن تک، تاکہ یمن میں کسی جہاز پر سوار ہو کر مالیبار واپس جائے، لیکن وہاں وہ بیمار پڑا، وہیں اس کی وفات ہوئی اور صدیوں تک اس کا مزار ایک عام زیارت گاہ بنا ہوا تھا۔ اسے لوگ ملک الہند کہہ کر پکارتے تھے کہ ہندوستان کے بادشاہ کا مزار ہے۔ یقیناً اس کے جو ساتھی ہوں گے وہ واپس گئے ہوں گے۔ وہاں ان چیزوں کا ذکر کیا ہوگا اور ممکن ہے کہ وہاں عہد نبوی ہی سے اسلام پھیلنا شروع ہو گیا ہو۔

اسی طرح چین کے مسلمانوں میں ایک روایت ہے جس سے ہم عام طور پر واقف نہیں ہیں۔ وہاں کے چینیوں میں یہ قصہ مشہور ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفیر (چین میں) بھیجا تھا، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا یا خالو کوئی قریبی رشتہ دار تھے۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا کوئی اور صحابیؓ —— انہوں نے وہاں اسلام کی تبلیغ کی تھی۔ اس کے حالات کی تفصیل ہمیں عام تاریخوں میں نہیں ملتی صرف چینی روایتوں میں اس کا ذکر ملتا ہے، اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس طرح اسلام کی تبلیغ کی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ واجبہ یہ بیان کیا گیا کہ وَلِتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا (الانعام: ۹۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شخصی طور پر

Marfat.com

تبلیغی کام انجام دیتے رہنا یہ شہرام القریٰ میں یعنی مکہ اور اس کے آس پاس کے علاقے میں۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا: ۲۸) ساری دنیا کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے گئے ہیں اور قیامت تک کے لیے، تو اس کا حل کیا کریں۔

دو چیزیں نظر آتی ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائیں۔ ایک تو چھوٹی چھوٹی جماعتوں کو مختلف علاقوں میں تبلیغ کے لیے بھیجا جاتا تھا، اس میں کچھ کامیابی بھی ہوتی تھی اور ناکامی بھی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور تدبیر اختیار فرمائی جو دل چسپ ہے۔ وہ یہ کہ دنیا کے مختلف ملکوں کے حکمرانوں کو خط لکھ کر انہیں اسلام کی دعوت دی۔ ایسے کتنے خطوط تھے، صحیح معلوم نہیں، لیکن کم از کم چھ خطوط اصلی دستاویزیں ہم تک پہنچی ہیں۔ چنانچہ ایک قیصرِ روم کے نام تھا، ایک کسریٰ ایران کے نام تھا، ایک حکمران مصر کے نام تھا، ایک نجاشی حبشہ سے متعلق تھا، اس طرح مختلف حکمرانوں کو خطوط بھیجے گئے تھے، انہیں اسلام کی تبلیغ کی گئی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ تبلیغ کا ایک ہی طریقہ نہ ہو، ہر ممکن طریقہ کوشش کر کے دیکھا جائے۔

یہ ایک نمونہ ہے ہمارے لیے، اس معانی میں کہ اگر ہم اپنے زمانے میں اور چیزوں کے ساتھ تبلیغ کرنا چاہتے ہیں تو کس طرح کریں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اس بارے میں کیا رہا ہے۔

میں آپ سے ذکر کر رہا تھا کہ جب اسلامی حکومت قائم ہوئی تو اس کا تجزیہ کر کے دیکھیں کہ کس طرح کی حکومت تھی؟ ظاہر ہے وہ خانوادہ قسم کی بادشاہت نہیں تھی، شاید اس لیے (خدا میرا قصور معاف کرے) کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی بیٹا زندہ نہ تھا۔ اگر نرینہ اولاد موجود ہوتی تو شاید مسلمان اُس کو اپنا جانشین بناتے۔ اپنا خلیفہ اوّل مقرر کرتے، پھر اُس کے بیٹے کو.........اور یوں ایک خانوادہ بن جاتا مگر اللہ جل شانہٗ کو کچھ اور منظور تھا، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد نرینہ زندہ نہ رہی۔ وہاں بادشاہت کا سوال نہیں تھا، جمہوریت کا سوال بھی نہیں پیدا ہوتا، اس معنی میں کہ جمہوریت میں عوام الناس اپنے صدر کا انتخاب خود کرتے ہیں اور پیغمبر، خدا جل شانہٗ کی

طرف سے نامزد ہوتا ہے، انسانوں کی طرف سے اس کا انتخاب نہیں ہوتا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک حکومت تھی اس معنی میں کہ ایک فرد (بطور سربراہ مملکت موجود) تھا جس کے احکام جس حد تک انسانی سوسائٹی میں ممکن ہے، سارے لوگ مانتے تھے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اُس وقت چند چیزیں خاص طور پر ممتاز نظر آتی ہیں، وہ یہ کہ ایک حکمران، دوسرے ایک قانون —— قرآن ایک قانون تھا جس کی تعمیل سارے مسلمانوں کے لیے واجب تھی۔ ایک حکمران —— ایک قانون —— اس کے بعد اُن افراد میں اور رعیت میں ایک رابطہ اور ربط قائم تھا۔ کہنا چاہیے کہ ایک تنظیم موجود تھی۔ لیکن کسی حکومت اور مملکت میں زمین کی ضرورت ہوتی ہے۔ زمین مسلمانوں کے پاس شروع میں نہیں تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسلموں کے ملک میں، مکے کے مشرکوں اور بت پرستوں کی حکومت کے اندر ایک سکونت پذیر شخص کی حیثیت سے موجود تھے۔ جو مٹھی بھر افراد مسلمان ہوئے وہ بھی وہیں کے باشندے تھے، لیکن حکومت ان کے ہاتھ میں نہ تھی۔ البتہ ایک حکومت کے جتنے عناصر ہوتے ہیں ان میں سے چند موجود تھے جنہیں فوراً اختیار کرلیا گیا، جو چند عناصر موجود نہیں تھے ان کے لیے انتظار کرنا پڑا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو وہاں ایک چھوٹی سی مملکت قائم ہوئی اور اس مملکت کی وسعت چار پانچ مربع میل کے رقبے سے شروع ہو کر دس لاکھ مربع میل تک عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں پھیل گئی تھی۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے فوراً بعد جو چیزیں رونما ہوئیں وہ اور بھی زیادہ حیران کن ہیں۔ مثلاً ۲۷ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں مدینہ منورہ کا حکمران تین براعظموں پر حکومت کر رہا تھا۔ مسلمانوں کی فوجیں نہ صرف ایشیا اور افریقہ میں تھیں بلکہ یورپ کے اندر بھی وہ لوگ داخل ہو چکے تھے۔

لیکن میں یہاں عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کر رہا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کیا صورت حال تھی، اس میں ایک چیز قابل ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ عرب میں نہ صرف قبیلے تھے بلکہ کچھ سلطنتیں بھی تھیں، ان میں سے عمان کا علاقہ جو شرقِ اردن کا پایۂ تخت ہے، مشرقی عرب میں بحرین کے پاس کا علاقہ ہے، وہاں ایک

بادشاہت قائم تھی۔ بادشاہ نے اپنی وفات کے وقت اپنے دو بیٹوں کو اپنا ولی عہد مقرر کیا، بجائے ایک کے دونوں بیٹوں کو۔ ایک کا نام جیفر اور دوسرے کا نام تھا عبیص۔ بادشاہ کا اپنا نام جولندا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر جیفر اور عبیص دونوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ یاد رہے کہ حکمران ہوتے ہوئے انہوں نے اسلام قبول کیا (جب کہ رعیت میں غیر مسلم بھی شامل تھے) اس کا کیا نتیجہ ہوا؟ ان کا تعلق مدینے کی اسلامی حکومت سے کس طرح ہوا؟

وہ اس طرح کہ مدینہ منورہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک افسر روانہ کیا جسے شاید آپ ریذیڈنٹ (Resident) کہہ سکتے ہیں۔ وہ ان کے دربار میں رہا۔ اس ریذیڈنٹ کے فرائض میں اسلام کی تبلیغ اور اسلام کی تعلیم بھی شامل تھی، لیکن اُس کو ملک کے عام نظم ونسق میں دخل دینے کی اجازت نہیں تھی۔ ملک کی رعایا خاص کر غیر مسلم رعایا کے سارے معاملات براہ راست جیفر یا عبیص یا دونوں کے پاس تھے اور دونوں مسلمان تھے اور .... اسلام کے احکام کی تعمیل کرتے تھے، لیکن غیر مسلموں کی آزادی برقرار رکھی گئی تھی۔ ان حالات میں شاید زمانۂ حال کی تعبیر کے لحاظ سے میں کہہ سکوں کہ وہ ایک طرح کا کنفیڈریشن تھا، یونیٹری (وحدانی) حکومت نہیں تھی، اس میں آزاد سلطنتیں بھی بعض شرائط کے ساتھ داخل ہوئی تھیں، چنانچہ اومان کی سلطنت (بھی اپنی اندرونی آزادی کے ساتھ) اس بڑی اسلامی سلطنت کا ایک جزو تھی۔

ایک دوسری مثال لیجیے، حبشہ کا بادشاہ جس کے متعلق ایک قصہ ہماری حدیث کی کتابوں میں ملتا ہے کہ حکمران نجاشی کی وفات ہوئی، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے میں اذیت سہنے کے زمانے میں مکی نومسلموں کو جا کر پناہ گزین ہونے کی ہدایت فرمائی تھی، ان میں سے ایک نجاشی کا انتقال ہوا۔ کئی نجاشی مختلف زمانوں میں ہوئے ہیں، ان میں سے ایک کا انتقال ہوا۔ اس کی مدینے خبر آئی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بادشاہ کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھائی، جس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ وہ بادشاہ مسلمان تھا اور آزاد بھی تھا۔ اس کی حکمرانی میں مدینے کی طرف سے کوئی دخل اندازی نہیں ہوتی تھی۔ بادشاہ کا انفرادی اسلام تھا۔ اس کے بعد وہاں جو حکمران

Marfat.com

ہوا وہ مسلمان نہیں تھا۔

غرضیکہ ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ غیر مسلم حکمرانوں کو دوست بنایا جا سکتا ہے اور ان کے ممالک سے تعلقات قائم کیے جا سکتے ہیں۔ نیز ایک حکمران اپنی شخصی حیثیت میں دوسری سلطنت کی رعیت بن جائے، لیکن اپنی سرکاری حیثیت میں آزاد اور خودمختار رہے، یہ بھی ہمیں صورت نظر آتی ہے۔

عہدِ نبوی کی اسلامی مملکت کے عناصر میں سے ایک اومان کی حکومت ہے۔ ایک حبشہ کے نجاشی کی حکومت بھی ہے۔ اس کے علاوہ قبائل بھی آزاد تھے۔ حالانکہ ان قبائل کی حد تک مرکز کی جانب سے زیادہ مطالبات کیے جا سکتے تھے، لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ قبائل کے سرداروں کو بھی قبول کیا جاتا تھا، اگر مرکزی حکومت کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو قبیلے کے سردار کے ذریعے سے وہ کام انجام دیا جاتا تھا، غرضیکہ یہ اسلامی حکومت جو عہد نبوی میں قائم ہوئی، یونیٹری (وحدانی) قسم کی نہیں ہے، اس میں مختلف قسم کے عناصر پائے جاتے ہیں، اس میں افراد بھی ہیں، قبائل کے سردار بھی ہیں، بادشاہتیں بھی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ایک چیز کا اور ذکر کروں، وہ ہے سلطنت کی بقا کے متعلق تدبیریں:

دوسرے انسانوں کی طرح پیغمبر بھی انسان ہوتا ہے۔ قُلْ اِنَّمَا انا بَشر مثلکم۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ناگزیر تھی، اس لیے وہ ہوئی بھی۔ وفات کے بعد کے کاموں کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ میں بہت ادب کے ساتھ یہ الفاظ استعمال کر رہا ہوں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سلطنت اور حکومت قائم فرمائی تھی، اس کی وراثت یا جانشینی کے متعلق کوئی ایسی چیز نہ ارشاد فرمائی، نہ اس پر عمل کیا، جو اُس دَور میں پائی جاتی ہے مثلاً انگلستان میں بادشاہ کے بعد اس کا بیٹا یا پہلی بیٹی خود بخود جانشین بن جاتے ہیں۔ اگر بیٹا نہ ہو تو بھائی بھتیجا وغیرہ جانشین مقرر ہو جاتے ہیں۔ گویا اُس دور میں جانشینی کے قواعد پائے جاتے ہیں، لیکن ایسی کوئی چیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم نہیں فرمائی، جس کے معنی میں یہ لیتا ہوں کہ ہمیں اجازت دی گئی ہے کہ حسب ضرورت ہم خود کوئی طریقہ اختیار کر لیں،

Marfat.com

چاہے وہ خانوادہ وار بادشاہت ہو، چاہے جمہوریت ہو، چاہے جماعتی حکومت ہو، سب کی ہمیں اجازت دی گئی ہے اور اس کے لیے ہمیں یہ بشارت بھی دی گئی ہے۔

یدُ اللّٰہِ علی الجماعۃ۔

یعنی اگر سارے مسلمان متفق ہو کر کوئی کام کرتے ہیں تو اللہ جل شانہٗ کا ہاتھ اُن پر ہوتا ہے۔ اس لیے یَدُ اللّٰہ علی الجماعۃ کی خوشخبری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم اپنی ضرورت کی لحاظ سے اور اپنے حالات کے لحاظ سے جمہوریت بھی قائم کر سکتے ہیں، خانوادہ حکومت بھی قائم کر سکتے ہیں اور جو بھی مناسب سمجھیں کر سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ وفات سے دو تین دن پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی تھکن کی حالت میں تھے۔ فرمایا کہ اللہ کا حکم ہے کہ تمہیں آخری احکام دوں۔ چنانچہ ظہر سے پہلے خطبہ شروع کیا، ظہر کے لیے وقفہ کیا، ظہر کے بعد دوبارہ خطبہ جاری رکھا اور اس اثنا میں جب انتہائی تھکن محسوس کرنے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام نے کمرے میں پہنچا دیا۔ اس خطبے میں یہ صراحت تھی کہ جلد ہی میں رحلت کرنے والا ہوں لہٰذا تم فلاں کام کرو، فلاں کام کرو۔ یہ نصیحت کی باتیں تھیں۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے اور مزاج وطبیعت کے متعلق معلوم کرنے کے لیے جاتے ہیں۔ اس وقت جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذرا بہتر حالت میں پایا تو کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم آج آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں بہت سی چیزیں بتائی ہیں ....اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) املا کروائیں اور کوئی ان چیزوں کو لکھ دے تو ہمارے لیے یہ وصیت کا کام دے گی اور یہ اچھی بات ہوگی۔

یہ مشہور قصہ ہے لیکن وہ پورا نہیں ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانشینی کے متعلق نہ اس آخری خطبے میں کوئی صراحت فرمائی اور نہ اس سے چند مہینے پہلے حجۃ الوداع کے موقع پر جو مشہور عام

Marfat.com

خطبہ دیا، اس میں کوئی صراحت فرمائی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ذیلی طریقے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معین کر دیا کہ کیا ہونا چاہیے۔ وہ ہے نماز کی امامت۔ اسے اسلام میں جماعت کا سرکردہ اور حاکم شخص ہی انجام دیتا ہے۔ قبیلے میں قبیلے کا سردار، کسی شہر میں وہاں کا گورنر اور خود مدینے میں حکمرانِ وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امامت کراتے تھے۔ ایک دن جب آپ انتہائی تھکن محسوس کر رہے تھے تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دینے کے لیے آئے کہ جماعت تیار ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہو کہ وہ امامت کریں۔ یہ ایک ذیلی طریقہ تھا یہ کہنے کا کہ میرے بعد سب سے ممتاز شخص ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہوں گے۔ صراحت نہیں تھی، لیکن ایسا ہوا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کام کو جاری رکھتے ہیں - پنج وقتہ نماز میں وہ امامت کراتے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک دلیل کے طور پر، خاص طور پر ان لوگوں کو جو انصارِ مدینہ کو چاہتے تھے کہ خلیفہ ان میں سے ہو، یہ کہا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امام بنایا ہے، کیا تم امام کو بدل کر کوئی دوسرا امام مقرر کرنے کی جرأت کرو گے؟

گویا اُن لوگوں سے ایک دلیل کے طور پر کہا گیا اور انہوں نے قبول بھی کیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امامت ایک معنی میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی پر دلالت کرتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد ایک طرف انصارِ مدینہ تھے جو چاہتے تھے کہ اسلامی حکومت برقرار رہے اور اس کا خلیفہ یا حکمران ان میں سے ہو، انصار میں پھوٹ تھی لہٰذا ان کی خواہش ایک ایسی خواہش تھی جس میں کوئی جان نہ تھی۔ اگر اوس کے قبیلے سے سردار لیا جاتا تو خزرجی اسے قبول نہیں کرتے، خزرجی ہوتا تو اوسی قبول نہیں کرتے۔ چنانچہ ان میں اتفاق نہیں ہو سکتا تھا۔ پہلے ہی دن سے خانہ جنگی اور پھوٹ پڑ جاتی۔ بہرحال اس موقع پر ایک قبیلے کے سردار نے اپنے محلے کی انجمن کے دفتر میں لوگوں کو جمع کیا اور یہ کوشش کی کہ ایک شخص کا انتخاب بطور خلیفہ کے کیا جائے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر یہ کام ہو جائے تو پھر دوسرے لوگ بھی قبول

Marfat.com

کرلیں گے۔ اگر نہ ہوا تو لوگ ہچکچاہٹ محسوس کریں گے۔ اس کی اطلاع جب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہنچی تو آپ فوراً اٹھے اور اپنے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابن جراح اور دو ایک ساتھیوں کو لیا اور سقیفہ بنی ساعدہ پہنچے، جہاں انصار کے قبیلے کے لوگ جمع ہو کر کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین بنانے پر غور کر رہے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں بلا اطلاع پہنچتے ہیں مگر وہ لوگ یہ نہیں کہتے کہ جاؤ تمہاری ضرورت نہیں ہے، بلکہ کہتے ہیں تشریف لائیے۔ وہ لوگ انہیں ادب کے ساتھ سمجھاتے ہیں، کہتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ اسلامی حکومت برقرار رہے اور چونکہ انصاریوں کی مدد سے اسلامی حکومت پھیلی ہے، لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین خلیفہ بھی انصار میں سے ہونا چاہیے، بس یہی ہم سوچ رہے تھے۔

اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اٹھتے ہیں اور اُن کو مخاطب کر کے مختلف چیزیں بتاتے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ تم نے خود سنا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار (یا بارہا) فرمایا ہے کہ خلیفہ قریشی ہونا چاہیے، لہٰذا وہ کوئی مکے کا مہاجر ہوگا، تم میں سے یعنی انصار میں سے نہیں ہوگا۔

انصار کی دین داری کی داد دینی پڑتی ہے کہ یہ بات سنتے ہی سب حیرت زدہ ہو جاتے ہیں اور اس ایک ہی لفظ پر سارا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ انصار کہتے ہیں بے شک سر تسلیم خم، ہم مانتے ہیں کہ مہاجرین میں سے کوئی شخص خلیفہ بنایا جائے۔

اس کے بعد کا واقعہ اس سے بھی زیادہ اثر انگیز ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اٹھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر چاہا کہ بیعت کریں، تو ایک انصاری سردار چلاتا ہے، ٹھہرو! تم سے پہلے میں بیعت کروں گا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ انصار اس کے خلاف نہیں ہیں بلکہ انصار ہی نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ بنایا ہے۔

یہ طریقہ بھی ہمیں نظر آتا ہے کہ جانشینی کے لیے عوام الناس سے استصواب کیا جائے، اور جو لوگ اسے قبول کریں اس کو سب لوگ مانیں۔

ایک آخری بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ بننا نہیں چاہتے

Marfat.com

تھے، مجبور ہو گئے تو گھر آ کر عام لوگوں کو بلایا، اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی ہے کیا کرنا چاہیے؟ وہاں پر گفتگو ہوئی اور اس کے بعد حاضرین نے مسجد میں بیعت کی تجدید کی۔

اس واقعہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان نظر آتی ہے، آدمی مدہوش ہو جاتا ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے خلیفہ بناؤ، چنانچہ تاریخ میں لکھا ہے کہ تین دن تک شہر کی گلی گلی میں، محلے محلے میں ڈھنڈورا پٹوایا گیا، لوگ بیان کرتے گئے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں خلیفہ نہیں ہونا چاہتا، تم مجھ سے بہتر کسی شخص کا انتخاب کر لو اور تمہیں تمہاری بیعت سے سبکدوش کرتا ہوں۔ کیا ہم ایسے بے نفس شخص کو خلیفہ بنائیں؟ یا حکومت کے خواہش مند کسی شخص کا انتخاب کریں؟ بالکل نتیجہ ظاہر ہے۔

بہرحال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت قائم فرمائی، وہ کس طرح پھیلی؟ یہ بیان کر چکا ہوں اور کس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانشینی کا انتظام فرمایا؟ یہ بھی آپ کے سامنے رکھ چکا ہوں۔ آج کل ہماری ضرورتیں بے شمار ہیں۔ ہر چیز کے متعلق میں آپ کے سامنے سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ پیش نہیں کر سکتا۔ حکومتوں کے سلسلے میں اور خاص کر آج کل کی اسلامی حکومتوں کی مصیبتوں کے سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں ہمارے لیے ایسے سبق ہیں کہ اگر انہیں تلاش کیا جائے تو ہم اپنے ہر معاملے کو حل کرنے کی اس میں تدبیر پائیں گے۔

اگر ہم میں حقیقی اور مخلصانہ خواہش ہو کہ ہم خدا جل شانہٗ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر عمل کریں، ذاتی خواہشوں کو چھوڑ دیں اور اسلامی طریقے کو اپنائیں تو ہمارے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

یہ تھیں چند چیزیں جو میں نے عرض کیں۔ میری کوتاہیوں کو معاف فرمائیں۔

میں آپ سے ذکر کر رہا تھا کہ جب اسلامی حکومت قائم ہوئی تو اس کا تجزیہ

لیکچر کے بعد حاضرین میں سے بعض حضرات نے ان سے مختلف قسم کے بہت سے سوالات بھی کیے، جن کے انہوں نے جواب دیے۔ سوالات اور جوابات بھی یہاں درج کیے جا رہے ہیں۔ سوالات اور جوابات سے ادارہ "المعارف" کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ (ادارہ)

کر کے دیکھیں کہ کس طرح کی حکومت تھی؟ ظاہر ہے وہ خانوادہ قسم کی بادشاہت نہیں تھی، شاید اس لیے (خدا میرا قصور معاف کرے) کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی بیٹا زندہ نہ تھا۔ اگر نرینہ اولاد موجود ہوتی تو شاید مسلمان اُس کو اپنا جانشین بناتے۔ اپنا خلیفہ اوّل مقرر کرتے، پھر اُس کے بیٹے کو......... اور یوں ایک خانوادہ بن جاتا مگر اللہ ج کو کچھ اور منظور تھا، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولادِ نرینہ زندہ نہ رہی۔ وہاں بادشاہت کا سوال نہیں تھا، جمہوریت کا سوال بھی نہیں پیدا ہوتا، اس معنی میں کہ جمہوریت میں عوام الناس اپنے صدر کا انتخاب خود کرتے ہیں، اور پیغمبر، خدا کی طرف سے نامزد ہوتا ہے، انسانوں کی طرف سے اس کا انتخاب نہیں ہوتا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک حکومت تھی اس معنی میں کہ ایک فرد (بطور سربراہِ مملکت موجود) تھا جس کے احکام جس حد تک انسانی سوسائٹی میں ممکن ہے، سارے لوگ مانتے تھے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اُس وقت چند چیزیں خاص طور پر ممتاز نظر آتی ہیں، وہ یہ کہ ایک حکمران، دوسرے ایک قانون - قرآن ایک قانون تھا جس کی تعمیل سارے مسلمانوں کے لیے واجب تھی۔ ایک حکمران - ایک قانون - اس کے بعد اُن افراد میں اور رعیت میں ایک رابطہ اور ربط قائم تھا۔ کہنا چاہیے کہ ایک تنظیم موجود تھی۔ لیکن کسی حکومت اور مملکت میں زمین کی ضرورت ہوتی ہے۔ زمین مسلمانوں کے پاس شروع میں نہیں تھی۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسلموں کے ملک میں، مکے کے مشرکوں اور بُت پرستوں کی حکومت کے اندر ایک سکونت پذیر شخص کی حیثیت سے موجود تھے۔ جو مٹھی بھر افراد مسلمان ہوئے وہ بھی وہیں کے باشندے تھے، لیکن حکومت ان کے ہاتھ میں نہ تھی۔ البتہ ایک حکومت کے جتنے عناصر ہوتے ہیں ان میں سے چند موجود تھے جنہیں فوراً اختیار کر لیا گیا، جو چند عناصر موجود نہیں تھے ان کے لیے انتظار کرنا پڑا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو وہاں ایک چھوٹی سی مملکت قائم ہوئی اور اس مملکت کی وسعت چار پانچ مربع میل کے رقبے سے شروع ہو کر دس لاکھ مربع میل تک عہدِ نبویؐ ہی میں پھیل گئی تھی - عہد نبویؐ کے فوراً بعد جو چیزیں رونما ہوئیں وہ اور بھی زیادہ حیران کن ہیں۔ مثلاً ۲۷ھ میں حضرت عثمانؓ کے زمانے میں

Marfat.com

مدینہ منورہ کا حکمران تین براعظموں پر حکومت کر رہا تھا۔ مسلمانوں کی فوجیں نہ صرف ایشیا اور افریقہ میں تھیں بلکہ یورپ کے اندر بھی وہ لوگ داخل ہو چکے تھے۔

لیکن میں یہاں عہدِ نبویؐ کا ذکر کر رہا ہوں کہ رسول اللہ کے زمانے میں کیا صورتِ حال تھی، اس میں ایک چیز قابلِ ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ عرب میں نہ صرف قبیلے تھے بلکہ کچھ سلطنتیں بھی تھیں، ان میں سے عمان کا علاقہ جو شرقِ اردن کا پایہ تخت ہے، مشرقی عرب میں بحرین کے پاس کا علاقہ ہے، وہاں ایک بادشاہت قائم تھی، بادشاہ نے اپنی وفات کے وقت اپنے دو بیٹوں کو اپنا ولی عہد مقرر کیا، بجائے ایک کے دونوں بیٹوں کو۔ ایک کا نام جیفر اور دوسرے کا نام عبیس - بادشاہ کا اپنا نام جولندا تھا - رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر جیفر اور عبیس دونوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ یاد رہے کہ حکمران ہوتے ہوئے انہوں نے اسلام قبول کیا (جب کہ رعیت میں غیر مسلم بھی شامل تھے) اس کا کیا نتیجہ ہوا؟ ان کا تعلق مدینے کی اسلامی حکومت سے کس طرح ہوا؟

وہ اس طرح کہ مدینہ منورہ سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک افسر روانہ کیا جسے شاید آپ ریذیڈنٹ (Resident) کہہ سکتے ہیں۔ وہ ان کے دربار میں رہا۔ اس ریذیڈنٹ کے فرائض میں اسلام کی تبلیغ اور اسلام کی تعلیم بھی شامل تھی، لیکن اُس کو ملک کے عام نظم ونسق میں دخل دینے کی اجازت نہیں تھی۔ ملک کی رعایا خاص کر غیر مسلم رعایا کے سارے معاملات براہِ راست جیفر یا عبیس یا دونوں کے پاس تھے اور دونوں مسلمان تھے اور .... اسلام کے احکام کی تعمیل کرتے تھے، لیکن غیر مسلموں کی آزادی برقرار رکھی گئی تھی۔ ان حالات میں شاید زمانۂ حال کی تعبیر کے لحاظ سے میں کہہ سکوں کہ وہ ایک طرح کا کنفیڈریشن تھا، یونیٹری (وحدانی) حکومت نہیں تھی۔ اس میں آزاد سلطنتیں بھی بعض شرائط کے ساتھ داخل ہوئی تھیں، چنانچہ اومان کی سلطنت (بھی اپنی اندرونی آزادی کے ساتھ) اس بڑی اسلامی سلطنت کا ایک جزو تھی۔

ایک دوسری مثال لیجیے، حبشہ کا بادشاہ جس کے متعلق ایک قصہ ہماری حدیث کی کتابوں میں ملتا ہے کہ حکمران نجاشی کی وفات ہوئی۔ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے میں اذیت سہنے کے زمانے میں کئی نومسلموں کو جا کر پناہ گزین ہونے کی ہدایت

Marfat.com

فرمائی تھی، ان میں سے ایک نجاشی کا انتقال ہوا۔ کئی نجاشی مختلف زمانوں میں ہوے ہیں، ان میں سے ایک کا انتقال ہوا۔ اس کی مدینے خبر آئی تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بادشاہ کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھائی، جس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ وہ بادشاہ مسلمان تھا اور آزاد بھی تھا۔ اس کی حکمرانی میں مدینے کی طرف سے کوئی دخل اندازی نہیں ہوئی تھی۔ بادشاہ کا انفرادی اسلام تھا۔ اس کے بعد وہاں جو حکمران ہوا وہ مسلمان نہیں تھا۔

غرضیکہ ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ غیر مسلم حکمرانوں کو دوست بنایا جا سکتا ہے اور ان کے ممالک سے تعلقات قائم کیے جا سکتے ہیں۔ نیز ایک حکمران اپنی شخصی حیثیت میں دوسری سلطنت کی رعیت بن جاے، لیکن اپنی سرکاری حیثیت میں آزاد اور خودمختار رہے، یہ بھی ہمیں صورت نظر آتی ہے۔

عہدِ نبویؐ کی اسلامی مملکت کے عناصر میں سے ایک اومان کی حکومت ہے۔ ایک حبشہ کی نجاشی کی حکومت بھی ہے۔ اس کے علاوہ قبائل بھی آزاد تھے۔ حالانکہ ان قبائل کی حد تک مرکز کی جانب سے زیادہ مطالبات کیے جا سکتے تھے، لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ قبائل کے سرداروں کو بھی قبول اسلام کیا جاتا تھا، اگر مرکزی حکومت کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو قبیلے کے سردار کے ذریعے سے وہ کام انجام دیا جاتا تھا، غرضیکہ یہ اسلامی حکومت جو عہدِ نبوی میں قائم ہوئی، یونیٹری (وحدانی) قسم کی نہیں ہے، اس میں مختلف قسم کے عناصر پاے جاتے ہیں، اس میں افراد بھی ہیں، قبائل کے سردار بھی ہیں، بادشاہتیں بھی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ایک چیز کا اور ذکر کروں، وہ ہے سلطنت کی بقا کے متعلق تدبیریں:

دوسرے انسانوں کی طرح پیغمبر بھی انسان ہوتا ہے۔ قُلْ اِنَّمَا انا بَشر مثلکم - آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ناگزیر تھی، اس لیے وہ ہوئی بھی۔ وفات کے بعد کے کاموں کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ میں بہت ادب کے ساتھ یہ الفاظ استعمال کر رہا ہوں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سلطنت اور حکومت قائم فرمائی تھی، اس کی وراثت یا جانشینی کے متعلق کوئی ایسی چیز نہ

Marfat.com

ارشاد فرمائی، نہ اس پر عمل کیا، جو اس دور میں پائی جاتی ہے مثلاً انگلستان میں بادشاہ کے بعد اس کا پہلا بیٹا یا پہلی بیٹی خود بخود جانشین بن جاتے ہیں۔ اگر بیٹا نہ ہو بھائی بھتیجا وغیرہ جانشین مقرر ہو جاتے ہیں۔ گویا اس دور میں جانشینی کے قواعد پائے جاتے ہیں، لیکن ایسی کوئی چیز حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم نہیں فرمائی، جس کے معنی میں یہ لیتا ہوں کہ ہمیں اجازت دی گئی ہے کہ حسبِ ضرورت ہم خود کوئی طریقہ اختیار کر لیں، چاہے وہ خانوادہ وار بادشاہت ہو، چاہے جمہوریت ہو، چاہے جماعتی حکومت ہو، سب کی ہمیں اجازت دی گئی ہے اور اس کے لیے ہمیں یہ بشارت بھی دی گئی ہے۔

یدُاللّٰہِ علی الجماعۃ۔

یعنی اگر سارے مسلمان متفق ہو کر کوئی کام کرتے ہیں تو اللہ کا ہاتھ اُن پر ہوتا ہے۔ اس لیے یدُاللّٰہِ علی الجماعۃ کی خوشخبری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم اپنی ضرورت کے لحاظ سے اور اپنے حالات کے لحاظ سے جمہوریت بھی قائم کر سکتے ہیں، خانوادہ وار حکومت بھی قائم کر سکتے ہیں اور جو بھی مناسب سمجھیں، کر سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ وفات سے دو تین دن پہلے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی تھکن کی حالت میں تھے۔ فرمایا کہ اللہ کا حکم ہے کہ میں تمہیں آخری احکام دوں۔ چنانچہ ظہر سے پہلے خطبہ شروع کیا، ظہر کے لیے وقفہ کیا، ظہر کے بعد دوبارہ خطبہ جاری رکھا اور اس اثنا میں جب انتہائی تھکن محسوس کرنے لگے تو آپ کو صحابۂ کرام نے کمرے میں پہنچا دیا۔ اس خطبے میں یہ صراحت تھی کہ جلد ہی میں رحلت کرنے والا ہوں لہٰذا تم فلاں کام کرو، فلاں کام کرو۔ یہ نصیحت کی باتیں تھیں۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ آپؐ سے ملنے اور مزاج و طبیعت کے متعلق معلوم کرنے کے لیے جاتے ہیں۔ اس وقت جب رسول اللہ کو ذرا بہتر حالت میں پایا تو کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آج آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بہت سی چیزیں بتائی ہیں .... اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم املا کروائیں اور کوئی ان چیزوں کو لکھ دے تو ہمارے لیے یہ وصیت کا کام دے گی،

Marfat.com

اور یہ اچھی بات ہو گی۔

یہ مشہور قصہ ہے لیکن وہ پورا نہیں ہوا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانشینی کے متعلق نہ اس آخری خطبے میں کوئی صراحت فرمائی اور نہ اس سے چند مہینے پہلے حجۃ الوداع کے موقع پر جو مشہور عام خطبہ دیا، اس میں کوئی صراحت فرمائی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ذیلی طریقے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معین کر دیا کہ کیا ہونا چاہیے۔ وہ ہے نماز کی امامت -! اسے اسلام میں جماعت کا سرکردہ اور حاکم شخص ہی انجام دیتا ہے۔ قبیلے میں قبیلے کا سردار، کسی شہر میں وہاں کا گورنر اور خود مدینے میں حکمرانِ وقت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امامت کراتے تھے۔ ایک دن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی تھکن محسوس کر رہے تھے تو حضرت بلالؓ آپ کو اطلاع دینے کے لیے آئے کہ جماعت تیار ہے رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ابوبکرؓ سے کہو کہ وہ امامت کریں۔" یہ ایک ذیلی طریقہ تھا یہ کہنے کا کہ میرے بعد سب سے ممتاز شخص ابوبکرؓ ہوں گے۔ صراحت نہیں تھی۔ لیکن ایسا ہوا اور حضرت ابوبکرؓ اس کام کو جاری رکھتے ہیں۔۔ پنج وقتہ نماز میں وہ امامت کراتے ہیں اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک دلیل کے طور پر، خاص طور سے ان لوگوں کو جو انصارِ مدینہ کو چاہتے تھے کہ خلیفہ ان میں سے ہو، یہ کہا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو امام بنایا ہے، کیا تم امام کو بدل کر کوئی دوسرا امام مقرر کرنے کی جرأت کرو گے؟

گویا اُن لوگوں سے ایک دلیل کے طور پر کہا گیا اور اُنہوں نے قبول بھی کیا کہ حضرت ابوبکرؓ کی امامت ایک معنی میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی پر دلالت کرتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد ایک طرف انصارِ مدینہ تھے جو چاہتے تھے کہ اسلامی حکومت برقرار رہے اور اس کا خلیفہ یا حکمران ان میں سے ہو، انصار میں پھوٹ تھی لہٰذا ان کی خواہش ایک ایسی خواہش تھی جس میں کوئی جان نہ تھی۔ اگر اوس کے قبیلے سے سردار لیا جاتا تو خزرجی اسے قبول نہیں کرتے، خزرجی ہوتا تو اوسی

قبول نہیں کرتے۔ چنانچہ ان میں اتفاق نہیں ہو سکتا تھا۔ پہلے ہی دن سے خانہ جنگی اور پھوٹ پڑ جاتی - بہرحال اس موقعے پر ایک قبیلے کے سردار نے اپنے محلے کی انجمن کے دفتر میں لوگوں کو جمع کیا اور یہ کوشش کی کہ ایک شخص کا انتخاب بطور خلیفہ کے کیا جائے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر یہ کام ہو جائے تو پھر دوسرے لوگ بھی قبول کر لیں گے۔ اگر نہ ہوا تو لوگ ہچکچاہٹ محسوس کریں گے۔ اس کی اطلاع جب حضرت ابوبکرؓ کو پہنچی تو آپ فوراً اُٹھے اور اپنے ساتھ حضرت عمرؓ، حضرت ابو عبیدہؓ ابن جراح اور دو ایک ساتھیوں کو لیا اور سقیفہ بنی ساعدہ پہنچے، جہاں انصار کے قبیلے کے لوگ جمع ہو کر کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین بنانے پر غور کر رہے تھے۔ حضرت ابوبکر وہاں بلا اطلاع پہنچتے ہیں مگر وہ لوگ یہ نہیں کہتے کہ جاؤ تمہاری ضرورت نہیں ہے، بلکہ کہتے ہیں تشریف لائیے۔ وہ لوگ انہیں ادب کے ساتھ سمجھاتے ہیں، کہتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ اسلامی حکومت برقرار رہے اور چونکہ انصاریوں کی مدد سے اسلامی حکومت پھیلی ہے، لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین خلیفہ بھی انصار میں سے ہونا چاہیے، بس یہی ہم سوچ رہے تھے۔

اس پر حضرت ابوبکرؓ اُٹھتے ہیں اور اُن کو مخاطب کر کے مختلف چیزیں بتاتے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ تم نے خود سنا ہوگا کہ رسول اللہؐ نے ایک بار (یا بارہا) فرمایا ہے کہ خلیفہ قریشی ہونا چاہیے، لہٰذا وہ کوئی مکے کا مہاجر ہوگا، تم میں سے یعنی انصار میں سے نہیں ہوگا۔

انصار کی دین داری کی داد دینی پڑتی ہے کہ یہ بات سنتے ہی سب حیرت زدہ ہو جاتے ہیں اور اس ایک ہی لفظ پر سارا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ انصار کہتے ہیں بے شک سرِ تسلیم خم، ہم مانتے ہیں کہ مہاجرین میں سے کوئی شخص خلیفہ بنایا جائے۔

اس کے بعد کا واقعہ اس سے بھی زیادہ اثر انگیز ہے۔ حضرت عمرؓ اُٹھے اور حضرت ابوبکرؓ کا ہاتھ پکڑ کر چاہا کہ بیعت کریں، تو ایک انصاری سردار چلاتا ہے، ٹھہرو! تم سے پہلے میں بیعت کروں گا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ انصار اس کے خلاف نہیں ہیں بلکہ انصار ہی نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ بنایا ہے۔

Marfat.com

یہ طریقہ ہمیں نظر آتا ہے کہ جانشینی کے لیے عوام الناس سے استصواب کیا جائے، اور جو لوگ اسے قبول کریں اس کو سب لوگ مانیں۔

ایک آخری بات یہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ خلیفہ بننا نہیں چاہتے تھے، مجبور ہو گئے تو گھر آکر عام لوگوں کو بلایا، اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی ہے کیا کرنا چاہیے؟ وہاں پر گفتگو ہوئی اور اس کے بعد حاضرین نے مسجد میں بیعت کی تجدید کی۔

اس واقعہ سے حضرت ابو بکرؓ کی شان نظر آتی ہے، آدمی مدہوش ہو جاتا ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے خلیفہ بناؤ، چنانچہ تاریخ میں لکھا ہے کہ تین دن تک شہر کی گلی گلی میں، محلے محلے میں دھنڈورا پٹوایا گیا، لوگ بیان کرتے گئے کہ حضرت ابو بکرؓ کہتے ہیں کہ میں خلیفہ نہیں ہونا چاہتا، تم مجھ سے بہتر شخص کا انتخاب کر لو اور تمہیں تمہاری بیعت سے سبکدوش کرتا ہوں۔ کیا ہم ایسے بے نفس شخص کو خلیفہ بنائیں؟ یا حکومت کے خواہش مند کسی شخص کا انتخاب کریں؟ بالکل نتیجہ ظاہر ہے۔

بہر حال رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت قائم فرمائی، وہ کس طرح پھیلی؟ یہ بیان کر چکا ہوں، اور کس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانشینی کا انتظام فرمایا؟ یہ بھی آپ کے سامنے رکھ چکا ہوں۔

آج کل ہماری ضرورتیں بے شمار ہیں، ہر چیز کے متعلق میں آپ کے سامنے سیرت کا نمونہ پیش نہیں کر سکتا۔ حکومتوں کے سلسلے میں اور خاص کر آج کل کی اسلامی حکومتوں کی مصیبتوں کے سلسلے میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں ہمارے لیے ایسے سبق ہیں کہ اگر انہیں تلاش کیا جائے تو ہم اپنے ہر معاملے کو حل کرنے کی اس میں تدبیر پائیں گے۔

اگر ہم میں حقیقی اور مخلصانہ خواہش ہو کہ ہم خداؑ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر عمل کریں، ذاتی خواہشوں کو چھوڑ دیں اور اسلامی طریقے کو اپنائیں تو ہمارے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

یہ تھیں چند چیزیں جو میں نے عرض کیں، میری کوتاہیوں کو معاف فرمائیں۔

Marfat.com

سوال و جواب

سوال : کیا ہر شخص یا ادارہ اجتہاد کا حق رکھتا ہے، خواہ اس کا مَبلغ علم کچھ ہی ہو؟ اسلام کے احکام کے مطابق اجتہاد کا حق کس کو حاصل ہے؟

جواب : گذشتہ چند دنوں میں مجھ سے یہ سوال بارہا کیا گیا ہے، میرا خیال ہے کہ اجتہاد کا حق ہر شخص کو ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص ہر قسم کے معاملات میں اجتہاد کر سکے یا اس کی بات کو دوسرے لوگ بھی قبول کریں۔ اجتہاد کرنا ایک بات ہے۔ اس اجتہاد کو قبول کیا جانا دوسری بات۔ اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑی اہم بات بیان فرمائی ہے کہ المجتہد یخطی ویصیب۔ یعنی اجتہاد کرنے والا صحیح نتیجے پر بھی پہنچ سکتا ہے اور غلطی بھی کر سکتا ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اضافہ فرماتے ہیں۔ اگر وہ صحیح نتیجے پر پہنچتا ہے تو اللہ اُس کو دوہرا ثواب دیتا ہے۔ اگر اس نے نیک نیتی کے باوجود غلطی کی ہے تو بھی اُس کو نیک نیتی اور کوشش کی وجہ سے ثواب ملتا ہے۔ اس کے معنی میں یہ لیتا ہوں کہ اجتہاد کرنے کا حق ہر شخص کو ہے، لیکن یہ بھی سوچ لیجیے کہ ہر شخص ہر چیز کی اہلیت نہیں رکھتا۔ مثلاً میں نان بائی ہوں تو اپنے پیشے کے بارے میں کسی ڈاکٹر کے پاس جا کر مشورہ نہیں لوں گا۔ میں بیمار ہوں تو اپنے علاج کے لیے کسی نوبل پرائز یافتہ ماہر ادب کے پاس نہیں جاؤں گا۔

اجتہاد کا حق اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو دیا ہے، یعنی عقل دی ہے اور اس عقل کے ذریعے سے ہم کسی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ہمیں اعتماد ہے تو ہم اُس پر عمل کریں گے، لیکن ہماری بات دوسرے لوگ بھی قبول کریں، یہ ضروری نہیں ہے۔ اچھی ہو گی تو سب لوگ قبول کریں گے۔ یہ

Marfat.com

میری رائے ہے، مجھے اس پر اصرار بالکل نہیں ہے۔ لیکن میں عرض کروں گا کہ اجتہاد سے مراد اگر آپ قانونی چیزیں لیتے ہیں تو اُسی شخص کو اس میں دخل دینا چاہیے اور وہی دخل دے گا جسے قانونی مسائل سے دلچسپی اور واقفیت ہو، کسی دوسرے فن کا ماہر شخص قانونی مسائل میں اپنی رائے ظاہر نہیں کرے گا۔

سوال : کیا اسلام میں بادشاہت جائز ہے؟ آپ نے اس کے جواز کی طرف اشارہ کیا ہے۔

جواب : جی ہاں! میں عرض کرتا ہوں، مثلاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ خلیفہ بنے۔ ان میں کوئی بادشاہت نظر نہیں آتی کہ باپ کے بعد بیٹا حکمراں بنا ہے، لیکن وہاں بھی ہمیں یہ امتیاز نظر آتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو ایک جماعت نے منتخب کیا، لیکن حضرت عمرؓ کو حضرت ابوبکرؓ نے نامزد کیا، حضرت عمرؓ نے خود نامزدگی کرنے کی بجائے ایک کمیٹی مقرر فرمائی تاکہ وہ کمیٹی کسی جانشین کا انتخاب کرے، تو یہ بادشاہت نہیں تھی۔ بعد میں ہم بنی اُمیہ کی خلافت دیکھتے ہیں جو اسلام کے دعوے دار تھے، ان کے زمانے میں علما بھی تھے، علما نے بھی اُن کو حکمران تسلیم کیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز اُسی خاندان کے ایک فرد ہیں، ان کو لوگ خلفائے راشدین میں شامل کرتے ہیں، تو یہ تھی ایک خاندان کی حکومت۔ بعد میں بنی عباس کی حکومت آئی، وہاں بھی یہی چیز نظر آتی ہے۔ بعد میں ہم ترکی سلاطین کو دیکھتے ہیں، جو اسلامی حکومت تھی۔ وہاں بھی ہمیں ایک طرح سے بادشاہت نظر آتی ہے۔ یہی نہیں، ایک اور چیز -- شاید میری طرف سے گستاخی ہوگی، عرض کروں کہ اسلامی حکومت کی تقسیم بھی ہم کو کافی پرانے زمانے سے ملتی ہے۔ حضرت عثمانؓ کی وفات پر کچھ لوگ حضرت علیؓ کے لیے اور کچھ لوگ حضرت معاویہؓ کے لیے میلان رکھتے تھے۔ ایک زمانے میں دونوں فریقین میں مصالحت

Marfat.com

ہوئی اور یہ قبول کیا گیا کہ حضرت علیؓ اپنے علاقے پر حکومت کریں، حضرت معاویہؓ اپنے علاقے پر حکومت کریں، باہم امن وامان سے رہیں، اگرچہ یہ چلا نہیں لیکن یہ معاملہ سامنے آیا تھا۔ اس میں ایک وسیع اسلامی حکومت کے ٹکڑے کر کے دو حصوں میں تقسیم کر دینے کا قابل ترجیح طریقے کے طور پر نہیں بلکہ ایک واقعی طریقے کے طور پر ثبوت ملتا ہے۔

یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ آج ایک نہیں پچاس اسلامی حکومتیں ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ یہ سب ممالک ایک حکومت بن جائیں۔ ساری دنیا میں ایک اسلامی حکومت ہو۔ لیکن وہ کس طرح ہو، یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے حکمرانوں، جمہوریتوں کے صدروں اور بادشاہوں وغیرہ کے باہم اختلافات کی وجہ سے یہ ناممکن چیز نظر آتی ہے۔ میں نے پہلے اشارۃً عرض کیا تھا کہ یہ طریقہ اختیار کریں کہ مسلمان حکمرانوں کی ایک مجلس بنائی جائے۔ اس کے رکن صرف حکومتوں کے سربراہ ہوں۔ مثلاً سعودی عرب کا بادشاہ، مصر کا صدر اور اسی طرح دیگر ممالک کے سربراہ وغیرہ۔ اس مجلس کا طریقہ یہ ہو کہ باری باری کسی ملک کا سربراہ مخصوص مدت کے لیے صدر نشین مقرر ہو۔ اس شخص کو ہم تشبیہی طور پر اپنا خلیفہ قرار دیں۔ ظاہر ہے کہ اُس جماعت کی باہمی مشاورت کے ذریعے جو بھی فیصلے ہوں گے ان کا اثر بیرونی دنیا سے تعلقات قائم کرنے میں انفرادی کوششوں کی بہ نسبت زیادہ ہوگا مثلاً پاکستان کی حکومت اگر کوئی مطالبہ کرتی ہے تو اس کا وہ اثر نہیں ہوگا جو حکمرانوں کی ایک جماعت کا ہوگا۔

سوال : آپ کے خیال میں پاکستان میں نظام حکومت کیسا مناسب رہے گا؟

جواب : یہ آپ لوگوں پر منحصر ہے، مجھے کوئی فرق نظر نہیں آتا کہ بادشاہت قائم کریں، ڈکٹیٹرشپ قائم کریں، کوئی مغربی قسم کی جمہوریت قائم کریں، جو جی چاہے کریں بشرطیکہ آپ اسلام پر عمل کریں۔ افراد ہوں، حکمران ہوں، سب اللہ کے احکام پر عمل پیرا ہوں۔

سوال : اسلام میں جمہوریت کے تصور کی کیا اہمیت ہے؟ کیا امیر کا چناؤ یا سربراہ کا انتخاب اشرافیہ طرز حکومت سے منسلک نہیں ہونا چاہیے؟

جواب : اس کا انحصار عوام کی رائے پر ہے۔ مثال کے طور پر ایک زمانے میں فرانس میں بادشاہت قائم تھی لیکن بادشاہ اور بادشاہ کا خاندان اس طریقے سے اپنی زندگی گزار رہا تھا کہ اہل ملک کو نفرت پیدا ہوگئی، لہٰذا انہوں نے بادشاہ کو ایک مجمع عام میں قتل کیا اور جمہوریت قائم کی۔ یہ عوام الناس کی رائے پر منحصر ہے، اسے کوئی لازمی یا واجبی طریقہ نہیں کہا جا سکتا۔ جمہوریت میں بھی برائیاں پائی جاتی ہیں۔ دونوں (صورتوں میں) عوام خود ہی دیکھیں گے اور خود ہی فیصلہ کریں گے۔ اس میں میرے نزدیک کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

سوال : خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب : اس مسئلے کا جواب دینا ذرا مشکل ہے کیونکہ اصولی طور پر ہر شخص کو آزادی ہے کہ میں شادی کروں یا نہ کروں، شادی کے بعد میں اولاد حاصل کروں یا نہ کروں، لیکن کچھ اشارے ہمیں احادیث میں ملتے ہیں جس پر مسلمانوں کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک حدیث اور ہے جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں کہ "تنا کحوا تنا سلوا....." نکاح کرو، اولاد حاصل کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ دوسرے پیغمبروں کے مقابلے میں اپنی اُمت کی کثرتِ تعداد پر فخر کر سکوں۔ ان حالات میں میں سمجھتا ہوں کہ ممکن ہے منصوبہ بندی ایک ملک میں مفید ہو، لیکن دوسرے ملک میں مضر ہو۔ مثلاً فرض کیجیے کہ آپ ایک ایسے ملک میں ہیں جہاں وسائل معیشت بہت کم پائے جاتے ہیں، ہر شخص چار چار بیویاں کرے اور دس دس بچے پیدا کرے تو جلد ہی وہ مقام ناقابلِ رہائش ہو جائے گا۔ عرض کرنا یہ ہے کہ منصوبہ بندی میں جبر کا سوال نہیں ہے۔ عورت چاہتی ہے کہ بچے نہ ہوں تو اس کا شوہر یہ سوچے کہ کیوں نہ ہوں، کیا یہ طبی وجوہ سے ہے یا کسی اور وجہ سے؟ یا مرد چاہتا ہے کہ اس کے بچے نہ ہوں تو عورت سوچے۔ غرضیکہ یہ انفرادی

معاملات ہیں، میرے خیال میں ایک قاعدہ سب پر عائد نہیں کیا جا سکتا۔

سوال : دورِ حاضر میں مثالی اسلامی ریاست کی ضرورت کس حد تک ہے؟ اگر ہے تو اس ریاست کی تشکیل کے لیے افراد کہاں سے آئیں گے؟

جواب : "لا یکلف اللہ نفساً اِلّاوسعھا" آپ کوشش کریں جس حد تک ممکن ہے۔ رسول اللہ کی سیرت ہمیں یہی بتاتی ہے کہ ایک منزل مقصود معین کرو، اس کے لیے کوشش شروع کر دو۔ خدا تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا۔ یہی نمونہ ہمارے لیے ہر چیز میں ہے۔ آج کل کی حکومت کے لیے بھی، آج کل کی تجارت کے لیے بھی، آج کل کی طبابت کے لیے بھی، ہمیں مقصد معین کر کے اس کے لیے کوشش کرنا چاہیے، ہوگا وہی جو اللہ نے مقدر کیا ہے، وہی اپنی مشیت کو نافذ کراتا ہے۔

سوال : پاکستان کی موجودہ صورت حال میں کنفیڈریشن کے مطالبے کی کیا اہمیت ہے؟

جواب : میں اسے اس لیے غیر ضروری سوال سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارے صوبے پنجاب، بلوچستان اور سندھ میں علیحدگی کی خواہش پیدا ہو جیسا کہ بدقسمتی سے بعض اسلامی ملکوں میں نظر آ رہا ہے۔ کرد اور ترک یک جا نہیں رہنا چاہتے تو اس وقت یہ سوال پیدا ہوگا۔ لیکن ہمارے عوام کم از کم ان کی اکثریت موجودہ طرز حکومت سے متفق ہے اور ملک کے حصے بخرے کرنا نہیں چاہتی ہے تو کنفیڈریشن کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یونیٹری (وحدانی) حکومت ہی چل سکتی ہے۔ البتہ جس حد تک اصلاحات کی ضرورت ہے وہ کی جا سکتی ہیں۔ کنفیڈریشن کے ذریعے سے بھی اور یونیٹری طرز حکومت کے ذریعے سے بھی۔ دونوں ممکن ہیں۔

سوال : ایک شخص کو ایک گروہ یا جماعت حکمران مقرر کرتی ہے کہ وہ اسلام کے مطابق حکومت چلائے، اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟

Marfat.com

جواب : اُس کو معزول کر دیا جائے گا۔ جنہوں نے حکمران بنایا ہے وہی معزول کر سکتے ہیں۔ یہ قدیم مسلمہ چیز ہے، جو شخص کسی کو کسی عہدے پر مامور کر سکتا ہے وہی اس کو اس عہدے سے معزول بھی کر سکتا ہے۔ ہماری تاریخ بتاتی ہے کہ حکمرانوں کو معزول کیا جاتا تھا۔ مثلاً آپ نئے انتخابات میں اُسے ووٹ نہ دیجیے، اس طرح یہ گتھی خود بخود حل ہو جاتی ہے۔

سوال : ''ھوالذی ارسل رسولہ بالھدٰی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ'' کی روشنی میں کیا یہ ہماری ذمہ داری نہیں ہے کہ ہم دین اسلام کو پوری دنیا میں Dominate (غالب) کریں اور اس کے لیے کیا بذریعہ جہاد انقلاب کا راستہ اپنائیں یا پُر امن جمہوری جدوجہد کا راستہ اختیار کریں؟

جواب : بھائی صاحب! مجھے اس سوال سے تھوڑی سی تکلیف ہوئی۔ آپ کہتے ہیں کہ اسلام Dominate کریں یعنی Impose کریں۔ یہ قرآن کی آیت ''لااکراہ فی الدین'' کے خلاف ہوگا۔ اس کی قطعاً اسلام میں اجازت نہیں ہے کہ کسی شخص کو دین اسلام کے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اسلام کے پھیلانے کی کوشش ضرور کریں اور اس کے لیے اپنی زندگی، اپنا مال اور جان نثار کریں۔ لیکن Impose کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی اسلام اجازت نہیں دیتا اور خود اللہ تعالیٰ اس اسلام کو قبول نہیں کرتا جو مجبوری کی حالت میں اختیار کیا گیا ہو۔

سوال : سود سے متعلق سوالات ہیں کہ: کسی صورت میں سود جائز ہے؟ موجودہ دور میں معاشی نظام سود کے بغیر کیسے چل سکتا ہے؟ بے شک سود حرام ہے لیکن جب حکومتی سطح پر سودی لین دین ہو رہا ہو تو کیا عام آدمی حالت اضطرار میں یہ سود لے سکتا ہے؟

جواب : یہ سوال بارہا مجھ سے کیا گیا.........ذرا تحمل کی ضرورت ہے، لفظ سود پر ہم مطلق نہ جائیں۔ ہم سوچیں کہ کون سی چیز کیسی ہے؟ چنانچہ میں آپ کو ایک

مثال دیتا ہوں کہ میں مکان خریدنے کے لیے قرض لیتا ہوں، وہ سودی قرض بھی ہوسکتا ہے لیکن اسی کو ہم اس طرح بھی Arrange (برت) کر سکتے ہیں کہ رقم دینے والا شخص شریک خریدار بنے۔ اُس کا ایک حصہ میری رقم سے ادا ہوگا، دوسرے حصے کی رقم دوسرے شخص کی طرف سے ہوگی۔ جب وہ شریک مِلک ہے تو اس کو کرائے کے متعلق بھی تناسب کے لحاظ سے حق حاصل ہوتا ہے، تو دوسرا شخص جو وہاں رہتا ہے وہ رقم کی ادائی کا ایک طرف سلسلہ جاری رکھے اور جس مقام پر وہ رہتا ہے اس کا کرایہ بھی ادا کرے۔ یہ کرایہ جسے ہم سود کا نام دیتے ہیں، کرایہ بنے گا، سود نہیں رہے گا۔ بہرحال ان کی تفصیلوں میں ہر قسم کے Transaction (تبادلے) کے معاہدات ہم آسانی سے کر سکتے ہیں۔ مجھے عملاً اس میں کوئی دشواری نظر نہیں آتی، باقی ساری تفصیلات اور تمام قسموں کا ذکر میں آپ سے نہیں کر سکتا۔

سوال : پراویڈنٹ فنڈ پر ملنے والا نفع کیا سود میں داخل ہے؟

جواب : میں اسے سمجھا نہیں۔ عہد نبویؐ میں ایک چیز پائی جاتی تھی جس کو ''معاقل'' کا نام دیا گیا ہے۔ یہ ایک طرح سے سوشل انشورنس کی صورت تھی، وہ یہ کہ ملک میں آئے دن ایسے حالات و واقعات پیش آتے ہیں، جن میں رقم ادا کرنے کے متعلق کسی شخص پر ایک بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ مثلاً کسی نے کسی کو عمداً نہیں اتفاقاً قتل کر دیا، یا اسی طرح کا کوئی اور واقعہ -- لیکن قاتل خون بہا کے سوا ونٹ دینے کی طاقت نہیں رکھتا تو متاثرہ شخص کو محروم ہونے کی ضرورت نہیں معاقل (خون بہا) کا جو ادارہ ہوگا اس کی طرف سے رقم ادا کی جائیگی۔

سوال : فنون لطیفہ مثلاً موسیقی، مصوری اور رقص وغیرہ کے سلسلے میں اسلام ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے؟ کیا یہ چیزیں بالکل حرام ہیں اور اگر حلال ہیں تو کس حد تک؟

جواب : فنون لطیفہ کے متعلق یہاں کچھ مثالیں دی گئی ہیں، میں بطور عمومی کہوں گا

کہ قرآنِ مجید کے مطابق خود اللہ تعالیٰ نے زینت کے طور پر مثلاً ستارے وغیرہ پیدا کیے ہیں تو وہ بھی ایک طرح سے فنون لطیفہ ہی ہے۔ بہرحال عرض کرنا یہ ہے کہ موسیقی کے متعلق امام غزالی نے احیاء العلوم میں ایک باب تفصیل سے لکھا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ سو فیصد (موسیقی) حرام نہیں ہے۔ عہد نبوی میں لوگ عید کے دن ڈھول بجاتے تھے۔ ایک دفعہ حضورؐ کے سامنے حبشی بچوں کا ایک گروہ آیا اور نیزے چلانے کے کرتبوں کے ذریعے سے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ حضرت عمرؓ نے ان کو ڈانٹا، جاؤ یہاں سے نکلو، کیا کر رہے ہو۔ رسول اللہؐ کے الفاظ ہیں، "یا عمر ھذا عید" - آج عید کا دن ہے، لہٰذا عید کے دن خوشی منانے کے جو طریقے ہیں، وہ موجود ہیں یا ذہن میں آتے ہیں اُن سے روکا نہیں جا سکتا۔

مصوری کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ صحیح بخاری شریف میں ایک حدیث ہے، قیامت کے دن سب سے شدید عذاب مصوروں کو ہوگا، اس کی تصریح میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں اس سے مراد ان چیزوں کی تصویر ہے جن میں جان ہوتی ہے، جیسے آدمی اور حیوانات وغیرہ۔ باقی درختوں، مکانوں اور اسی طرح کی چیزوں کی تصویروں کی کوئی ممانعت نہیں ہے، تو عرض یہ ہے کہ آج ہم مصوری سے مراد صرف آدمیوں کے پورٹریٹ بنانے کو لیں تو میرے نزدیک ناجائز ہوگا، لیکن عام تصویر، رنگوں کے ذریعے سے شکلیں بنائیں اور وہ آدمیوں کی نہیں بلکہ چیزوں کی ہوں تو اس میں کوئی عمل مجھے مانع نظر نہیں آتا۔

رقص کے متعلق بھی سوال کیا گیا ہے، ۱۹۴۸ء کی شاید بات ہے، آپ کے ہاں دستور بنانے کا کام شروع ہوا تھا، مجھے بھی اُس زمانے میں دعوت دی گئی تھی، اس میں ایک بنگالی عالم بھی شریک تھے، اُن لوگوں نے یہ کہا کہ رقص حرام ہے۔ لطیفے کے طور پر میں نے عرض کیا کہ بھائی صاحب! اگر میں اپنی بیوی کے ساتھ اپنے گھر میں رقص کرتا ہوں تو تمہیں روکنے کا کیا حق

Marfat.com

ہے۔ کہنے لگے کہاں؟ میں نے کہا گھر میں، پوچھنے لگے لوگوں کی موجودگی میں؟ میں نے کہا بچے ہوں گے، بچے بھی خوشی سے ہاتھ بجائیں گے کہ اماں جان ناچ رہی ہے۔ تو غرضیکہ سو فی صدی رقص حرام نہیں ہے، البتہ اجنبی عورت سے یقیناً حرام ہے۔

سوال : ہمارے آج کے اسلامی ممالک، کیا غیر اسلامی ممالک سے مدد لے سکتے ہیں؟ جس طرح سعودی حکومت نے امریکہ اور فرانس سے کویت کے سلسلے میں عراق کے خلاف مدد لی؟ اور کیا انہیں حلیف بنا سکتے ہیں؟

جواب : میں نے ابھی آپ سے عرض کیا کہ ہجرت کے بعد رسول اکرمؐ نے مدینے کے اطراف میں شمال، جنوب، مشرق اور مغرب کے غیر مسلم عرب خود مختار قبیلوں سے باہمی تعاون کے معاہدات فرمائے تھے۔ میں سمجھتا ہوں یہ جواب آپ کے لیے کافی ہے۔

سوال : کیا حضورؐ کی ذاتِ اقدس کی مختلف حیثیتیں تھیں اور آپؐ صرف نبی کی حیثیت سے ہی مطاع تھے؟ کیا حضورؐ کی حیات طیبہ میں کوئی شخص امورِ دنیا میں حضورؐ سے زیادہ علم والا ہو سکتا تھا؟

جواب : اگر آپ سیرت طیبہ کا غور سے مطالعہ کریں تو جواب مل جاتا ہے۔ اس میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ ایک مشہور حدیث ہے انتم اعلم بامورِ دنیا کم۔ رسول اللہ نے کھجور کے درختوں کے Polynation کے سلسلے میں ایک نامناسب چیز محسوس کی کہ نرینہ چیز کو زنانہ چیزوں میں ڈالیں، اس طرح سے Sexual چیز پیدا ہوتی ہے Polynation سے منع فرمایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس سال کھجور کی فصل بہت ہی خراب رہی۔ لوگ آئے اور شکایت کی یا رسول اللہؐ! آپ کے حکم کے مطابق ہم نے یہ کیا اور اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے، تو رسول اکرمؐ نے اپنے حکم کو منسوخ فرماتے ہوئے یہ الفاظ استعمال فرمائے تھے انتم اعلم بامور دنیا کم۔ میں نبی کی حیثیت سے خدا کے احکام تم تک پہنچاتا ہوں، دنیاوی معاملات میں خدا نے تمہیں آزادی دی ہے،

Marfat.com

اس کا میں متخصص (ماہر) نہیں ہوں، تم اُس میں جو مناسب معلوم ہوتا ہے کرو۔ تو ان حالات میں ہمیں نظر آتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک شخصیت پیغمبر کی ہے، لیکن آپ کی انسانی شخصیت بھی ہے، بھوک آپؐ کو بھی لگتی ہے، نیند آپ کو بھی آسکتی ہے۔ گر کر چوٹ سے زخمی ہونا یہ آپؐ کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ غرض ایک انسانی حیثیت ہے اور ایک ربانی نمائندے پیغمبر کی حیثیت ہے۔ ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں، دونوں وقتِ واحد میں چلتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کسی وقت کسی معین معاملے میں پیغمبر خود اجتہاد کر کے ایک رائے قائم کرتا ہے اور وہ خدا کو پسند نہ ہو تو وحی آتی ہے کہ نہیں ایسا نہ کرو۔ ایسی مثالیں ملتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اور بشریت دونوں آپؐ میں وقتِ واحد میں موجود تھیں، لیکن خدا کی نگرانی رہتی تھی کہ اگر کبھی پیغمبر سے کوئی سہو ہو جائے، اس طرح کا اجتہاد سہو، تو اُمت اس سے متاثر نہ ہو، فوراً وحی کے ذریعے سے خدا صحیح راستہ بتاتا ہے۔ یہ ہے میرا جواب۔ خدا مجھے معاف فرمائے۔

سوال : آج کے مغربی معاشرے میں قلبی اور ذہنی بے اطمینانی بہت زیادہ ہے۔ کیا صوفیہ کا انداز تبلیغ وہاں کتابی تبلیغ کی نسبت زیادہ کامیاب رہے گا؟ مغرب میں کیا انداز تبلیغ اختیار کرنا چاہیے؟

جواب : اس سوال کا جواب اس لیے مشکل ہے کہ ہر قسم کے افراد دنیا میں پائے جاتے ہیں، مغرب میں بھی، مشرق میں بھی۔ جو لوگ اسلام قبول کرتے ہیں ان میں بھی ہر قسم کے لوگ موجود ہیں، ایک مثال آپ کو دیتا ہوں۔ پیرس میں ایک فن موسیقی کا ماہر شخص تھا، ایک دفعہ وہ سیاحت کے لیے استنبول پہنچا اور مسجدوں کی بھی سیر کی۔ اس کے ساتھی ترک بھائی نے اسے ایک چیز بتائی، وہ یہ تھی کہ ترکی میں رواج ہے کہ ہر نماز کے بعد امام بآواز بلند قرآنِ مجید کی کچھ آیتیں تلاوت کرتا ہے، لوگ اسے ادب سے سنتے ہیں، اس ترک بھائی نے اُس فرانسیسی غیر مسلم سیاح سے کہا یہ قرآنِ مجید کی

Marfat.com

تلاوت ہے۔ نثر کی کتاب ہے، لیکن اُسے پڑھ رہا ہے وہ تمہیں عجیب نظر آئے گا۔ واقعی وہ متاثر ہوا، کہا اس نثر میں نظم کی شان نظر آتی ہے، چند دن سوچتا رہا بالآخر مسلمان ہو گیا۔

اس کے بعد وہ دوبارہ استنبول گیا، اتفاق سے میں بھی وہیں تھا، ایک دن وہ گھبراہٹ کی حالت میں کانپتا ہوا میرے پاس یونیورسٹی میں آیا۔ کہنے لگا میرے خیال میں مسلمانوں نے قرآن مجید کو کامل طور پر محفوظ نہیں رکھا ہے کیونکہ اس کی بعض سورتیں اور بعض آیتیں تو بے شک علم موسیقی کے مطابق ہیں لیکن بعض نہیں ہیں، اور موسیقی کے مطابق نظر نہ آنے والی چیزیں میرے خیال میں کسی چیز کے حذف کر دینے کی وجہ سے ہوئی ہیں۔ میں نے پوچھا کیا؟ اس اثنا میں وہ عربی خط سیکھ چکا تھا، فوراً جیب سے قرآن مجید کا چھوٹا نسخہ نکالا اور کہا دیکھو یہ سورت -- وہ سورت تھی اذا جآء نصر اللہ والفتح ....

یہ الفاظ موسیقی کے نقطۂ نظر سے ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ یہاں کوئی چیز تم لوگوں نے حذف کر دی ہے، تمہیں معلوم نہیں ہے لیکن میں بتاتا ہوں کہ علم موسیقی کے لحاظ سے یہاں کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔

میں نے کہا بھائی صاحب اس طرح نہیں پڑھا جاتا جس طرح تم نے پڑھا ہے۔ علمائے قراءت ہمیں بتاتے ہیں کہ اس کو پڑھنا چاہیئے ...... افواجاً فسبح ......

بولا: میں اپنے ایمان کی تجدید کرتا ہوں۔ غرض عرض یہ کرنا ہے کہ افراد ہر قسم کے ہیں، علمِ موسیقی کے ذریعے سے مسلمان ہونے والے بھی ہیں۔ دنیا میں مختلف قسم کے لوگ ہیں، ان میں سے کوئی صوفیانہ طریقے سے مسلمان ہوتے ہیں، کچھ اور طریقے سے اسلام میں شامل ہوتے ہیں، کوئی کسی اور طرح سے۔ اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں آپ کو مثالیں دیتا کہ میرے سامنے کس قسم کے معاملات پیش آئے۔ اس لیے یہی کہنا پڑتا

Marfat.com

ہے کہ قبول اسلام کا کوئی معین قاعدہ نہیں، کسی کو تصوف کے ذریعے سے آپ مسلمان بنا سکتے ہیں، کسی کو کسی اور ذریعے سے۔ مقصد ایک ہی ہے اور دونوں کا ایک ہی نتیجہ ہے۔

سوال : تصوف کو اسلامی کردار سازی میں آپ کس حد تک مناسب سمجھتے ہیں؟

جواب : میں نے اسے مفید پایا ہے۔

سوال : انجیل کے مطابق حضرت عیسیٰ کی نبوت محدود تھی، صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی، کیا احکام الٰہی صرف ایک قوم کے لیے ہو سکتے ہیں؟ اور حضرت عیسیٰ تبلیغ میں امتیاز رکھ سکتے ہیں؟

جواب : بھائی صاحب اس میں دشواری یہ ہے کہ خدا نے ایک لاکھ چالیس ہزار پیغمبر بھیجے ہیں، حضرت آدم سے لے کر ہمارے پیغمبر تک ان کی سوانح عمریاں ہمارے پاس نہیں ہیں۔ لیکن معلومات کے جو وسائل ہمارے پاس ہیں، ان کی اساس پر چاہے وہ ایران کے زرتشت کا قصہ ہو یا مصر کے حضرت موسیٰ کا ذکر ہو یا فلسطین کے حضرت عیسیٰ کا ہو کہ سارے پیغمبر وقت واحد میں ساری چیزوں سے دلچسپی نہیں لے سکتے تھے، اس لیے خدا نے کبھی ایک قوم کے لیے پیغمبر بھیجا اور کبھی دوسری کے لیے، اور ایک پیغمبر ایسا بھی بھیجا جو ساری دنیا کے لیے ہے اور اپنی زندگی تک کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے ہے۔ اس میں کوئی تضاد مجھے بالکل نظر نہیں آتا، ایسا ہو سکتا ہے۔

سوال : جمہوریت میں طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں جب کہ اسلام میں طاقت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ پھر اسلام میں جمہوریت کا کیا جواز ہے؟

جواب : یہ لفظ استعمال نہ کیجیے۔ بجائے جمہوریت کے آپ کوئی ایسا لفظ استعمال کیجیے جو آپ کے خیال میں ناقابل اعتراض ہو، چیز وہی ہو گی جو موجود ہے، لیکن اس کا نام بدلے گا۔ جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کو عبد بھی کہتے ہیں، نبی بھی کہتے ہیں، رسول بھی کہتے ہیں، مرسل بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح جو ہماری اسلامی حکومت ہو گی اُسے ہم جو بھی نام دیں اُس

سے فرق نہیں پڑتا۔ دونوں کی اجازت ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جمہوریت سے مراد صرف طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔ ایک ایسی جمہوریت ہم بنا سکتے ہیں جس میں طاقت کا سرچشمہ عوام نہیں بلکہ خدا کی ذات ہو۔ یہ ہمارے اپنے بنائے ہوئے قانون پر منحصر ہوگا۔

سوال : آج کے یہودی یا عیسائی کیا اہلِ کتاب ہیں؟ ان سے معاملات کیسے ہوں؟

جواب : میں سمجھتا ہوں کہ آج کل کے یہود و نصاریٰ میں اور عہدِ نبوی کے یہود و نصاریٰ .... میں کوئی فرق نہیں ہے۔ عقائد وہی تھے، خود قرآن ان کو اہل کتاب کہتا ہے۔ اگر اہل کتاب اپنی کتاب پر عمل نہ کریں تو بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے ایک مسلمان ہے جو قرآن پر عمل نہیں کرتا۔ اس کے باوجود ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ وہ فاسق ہے، فاجر ہے، جو بھی کہیے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ اسی طرح یہود و نصاریٰ ہیں، وہ اگر اپنے دین کے احکام پر عمل نہیں کرتے اور یقیناً بہت سی چیزوں میں وہ عمل نہیں کرتے تو ان کو ان کی حقیقت سے یعنی خدا کی بھیجی ہوئی کتاب کے ماننے والوں کی جماعت سے خارج نہیں کر سکتے۔

میں مکرر عرض کرتا ہوں کہ جو صورتِ حال آج کل کے یہود اور نصاریٰ کی ہے عہد نبوی میں بھی یہی حال تھا، کوئی فرق ہمیں نظر نہیں آتا، ان کو خدا نے اہلِ کتاب کا نام دیا ہے۔

فقہ

فقہ کی تشکیل اور آغاز کا معمہ

(مترجم ڈاکٹر محمد حمید اللہ)

گ، ہ، بو سکے (G.H. Bousquet) جامعہ الجزائر، شمالی افریقہ میں قانون اور عمرانیات کے پروفیسر رہے ہیں۔ انہوں نے کچھ عرصہ ہوا الجزائر کے ایک قانونی ماہنامے Revue Algerienne Tunisienne et Morocaine de Lagislation et de jurisprudence بابت جولائی، اگست و ستمبر ۱۹۴۷ء میں عنوان بالا پر (جو اصل فرانسیسی میں Le mystare de la formation et des origines du figh کے نام سے چھپا ہے، شائع کیا ہے۔ یہ ایک طرح سے پروفیسر ناتھینو کے اس اطالوی مضمون کا تکملہ ہے جس کا ترجمہ جنوری ۱۹۵۳ء کے معارف میں "رومی اور اسلامی قانون کے تعلقات پر چند ملاحظات" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ موجودہ مقالہ میں بھی فقہ کی تدوین میں بیرونی اثرات کے وجوہ سے انکار کیا گیا ہے اس لیے اس قابل ہے کہ اُردو دان اہل علم اس سے آگاہی حاصل کریں۔ ترجمے کے مؤلف نے ازراہ عنایت اجازت دے دی ہے۔ (مترجم)

فقہ کے آغاز اور اس کے ارتقاء کی تاریخ پر کم از کم تین مختلف جہتوں سے نظر ڈالی جاسکتی ہے:

(ا) پہلے وہ ہے جسے میں اس قانون کے ارتقاء کی سرکاری تاریخ سے موسوم کروں گا جو خاص کر کتب اصول فقہ اور عرب مؤلفوں کے دیگر اشارات سے ہویدا ہوتی ہے یعنی اس کے چار ماخذوں (قرآن، حدیث، اجماع، قیاس (مترجم)) کی توضیح، ان سے

Marfat.com

استفادے کا طریقہ اور رفتہ رفتہ باب الاجتہاد کا قطعی طور پر بند ہو جانا وغیرہ۔ یہ بڑی نفیس چیزیں اور ساتھ ہی بعد کے زمانے میں اس مسئلے کے یوروپی مطالعے کی اساس بھی ہیں لیکن ان کی بڑی خامی یہ ہے کہ ان کا بڑا حصہ بطور دلیل لمی [1] (apesterieri) مرتب ہوا ہے اور وہ ایک تذکرہ تو ہیں لیکن توجیہ نہیں۔

(۲) ان ماخذوں کی یورپی تنقید، دو نام یہاں بیان کرنے ناگزیر ہیں۔ ایک تو اسنوک ہورخرد یے [2] (Snouch-Hurjronge) جس نے تصور ''اجماع'' کی غیر معمولی اہمیت بتائی ہے اور دوسرے گولٹ سیر (Goldziher) جس نے بتایا ہے کہ مروجہ حدیثوں کے عظیم الشان انبار سے علماء وفقہا نے کیا فائدہ اٹھایا اور یہ کہ ان جعلی حدیثوں [3] سے ہمارا کیا مفاد وابستہ ہے۔ ان دونوں مؤلفوں کے باعث ہم اس قابل ہوے ہیں کہ نظریہ اصول فقہ کو ایک نئی روشنی میں دیکھیں۔ گویا ہم اس طرح اس نظام کی موثر قوتوں کو کارکردگی کی حالت میں دیکھ سکتے ہیں چنانچہ اس مفہوم کو ذہن میں لے کر اسنوک ہورخر دیئے نے فاندن برگ (V.den Berg) کے اس نظریے پر آگ بگولہ ہو کر تنقید

---

[1] یعنی وہ طریقہ استدلال جس میں نتیجہ دیکھ کر اس کے سبب کا پتا چلایا جاتا ہے، گویا وہ ''لم'' (کیوں؟) کا جواب ہوتا ہے (مترجم)

[2] ولایتی ناموں کا یہاں صرف صحیح تلفظ درج کیا جاتا ہے علمی حلقوں میں صحیح تلفظ کا پھیلنا ہر طرح قرین صواب ہے۔ ان ناموں کو انگریزی کے اصول پر پڑھنا غلط ہے کیونکہ مختلف حروف کا تلفظ مختلف فرنگی زبانوں میں الگ الگ ہوتا ہے۔ (مترجم)

[3] گولٹ سیر کا پرانا نظریہ (جواب از کار رفتہ ہو چکا ہے) یہ ہے کہ کتب حدیث، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی باتوں کی صحیح ترجمانی نہیں کرتیں، بلکہ ان کتابوں کی تالیف کے زمانے میں مسلمانوں کے جو افکار خیالات تھے ان کو ان کے مؤلف خواہ مخواہ عہد نبوی کی طرف منسوب کرتے رہے ہیں لیکن اب تیسری صدی ہی نہیں بلکہ دوسری اور خود پہلی صدی ہجری کی کتب حدیث کی دستیابی سے اس بدگمانی اور مفروضے کے تار و پود بکھر گئے ہیں۔ چنانچہ صحیفہ ابی ہریرہؓ امام بن منبہ جو (۵۸ھ) سے قبل کی تالیف ہے مل چکا ہے۔ اس کے چوتھے اڈیشن میں جو ۱۹۵۶ء میں حیدرآباد دکن میں چھپا ہے ناشر نے اپنے مقدمے میں تفصیل سے ان مسائل سے بحث کی ہے۔ (مترجم)

Marfat.com

کی تھی کہ [1] فقہ کی تاریخ خاصی واضح ہے اور ایک طرح سے یہ تاریخ مدون بھی ہو چکی ہے۔

(۳) لیکن ایک تیسرے نقطۂ نظر سے یہ ادّعا محض غیر صحیح ثابت ہوتا ہے یعنی ایسے بیرونی اثرات کی موجودگی جو اسلامی نظام قانون کی پیدائش اور حیرتناک تیزی سے اس کی ترقی میں حصہ دار سمجھے گئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ (مسلمانوں کے) ارتقاء قانون کی یہ تیزی (ان کی) ملکی فتوحات کی تیزی سے کسی قدر کم ہے۔ اگر صقلیہ کو چھوڑ دیں تو عربوں کی ساری فتوحات رسولِ خدا کی وفات سے ایک سو سال سے بھی کم عرصے میں حاصل ہو گئی تھیں۔ پھر بھی ارتقاء قانون کی تیزی جاذب توجہ ہے۔

یہ امر نمایاں کیے جانے کے قابل ہے کہ اسلامی قانون کی اہم ترین کتابیں، مذاہب فقہ کی عین پیدائش ہی کے ساتھ یا کم و بیش اسی زمانے میں مرتب ہو گئیں اور ہجرت پر پوری دو صدیاں بھی نہ گزری تھیں کہ مسلمانوں کے ہاں ایسی کتابیں وجود میں آ گئیں جن پر آج تک عملاً کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ بعد کی کتابیں یا تو محض ان کی اعادہ ہیں یا بے مصرف بکواس، شاید ہی ان میں کوئی نئے تصورات یا بارآور ارتقاء کے کوئی جراثیم پائے جاتے ہوں۔

اس کے ثبوت کے لیے مالکی اور شافعی مذاہب کی دو بنیادی کتابیں، المدونہ اور کتاب الام کافی ہیں (مؤلف کو کتب حنفی سے واقفیت نہیں معلوم ہوتی، ورنہ امام محمد شیبانی المتوفی ۱۸۹ھ/۸۰۴ء کی کتاب الاصل، جو المبسوط بھی کہلاتی ہے کیا بہ لحاظ ضخامت اور کیا بہ لحاظ قدر و قیمت مذکورہ دونوں کتابوں سے کم نہیں، پھر وہ ان دونوں سے قدیم تر بھی ہے (مترجم) مالکی مذہب کی کتاب یعنی المدونہ کا مؤلف جو بھی رہا ہو مگر یہ یقینی ہے کہ وہ کم از کم بنیادی حصے کی حد تک امام مالک المتوفی ۱۷۹ھ/۷۹۵ء کے شاگرد ابن القاسم کے دروس پر مبنی ہے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیں کہ اس کا ایک اچھا خاصہ حصہ بانی مذہب (امام مالک) کے بعد کا ہے، تو بھی بہرحال وہ امام شافعی المتوفی ۲۰۴ھ/۸۲۰ء کی کتاب الام کی ہمعصر ہے۔ یہ واضح رہے کہ ایک نئے فقہی مذہب کے

---

[1] یہ مضمون رسالہ De gids ۱۸۸۴ء میں چھپا۔ اسنوک ہورخرونیے کے مجموعہ مقالات موسومہ Verspreide Geschriften کی جلد دوم میں بھی شامل کیا گیا ہے۔

Marfat.com

بانی بننے سے قبل امام شافعی خود بھی امام مالک (نیز امام محمد شیبانی (مترجم) کے شاگرد رہے ہیں۔ اس طرح بہرحال ہم ایک ایسے زمانے میں رہتے ہیں جب کہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات پر جو ۱۱ھ/۶۳۲ء میں ہوئی پوری دو صدیاں بھی نہیں گزری تھیں۔

چنانچہ جو شخص ان دونوں کتابوں (المدونہ اور الام) کی محض ورق گردانی ہی کر لے۔ اسے فوراً پتا چل جائے گا کہ:

(الف) یہ کتابیں اپنی ترتیب اور اپنے افکار علمی میں ان تالیفوں سے کہیں فائق ہیں جو بعد کے زمانوں میں تدریس یا اطلاق قانون کے لیے زیر استعمال رہیں۔ ان میں ایسے استدلال اور ایسی توجیہیں ملتی ہیں جن پر اس وقت سے اب تک کوئی اضافہ نہیں ہو سکا۔ خاص کر المدونہ...... جسے میں زیادہ جانتا ہوں کیونکہ علاوہ اور وجوہ کے اس سے مراجعہ آسان تر ہے...... یہ کتاب بعض وقت واقعی ایک ایسی غذائے ذہنی پیش کرتی ہے جو کسی مختصر خلیل کسی منہاج الطالبین کسی لب اللباب وغیرہ میں کبھی نہیں ملے گی۔

(ب) خود فروعی مسائل کے حل میں ان بنیادی کتابوں کے مؤلف اتنی دور جا چکے ہیں کہ سچ سچ یہ پوچھنا پڑتا ہے کہ متقدمین کے مستند نظریے کے مطابق، بانیانِ مذاہب کے شاگردوں کو جس محدود اجتہاد کی اجازت رہی ہے وہ کس امر کے متعلق رہی ہوگی؟ یہ بات خاص کر آپ پر صادق آتی ہے[1]۔

اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ فقہ نے اپنے آغاز سے لے کر عروج کو پہنچنے تک اپنے ارتقاء میں جو راستہ طے کیا وہ ایک حیرت انگیز تیزی سے طے ہو گیا۔ مگر یہ

---

[1] وہ ساری غیر معمولی نکتہ آفرینی جو رضاعی رشتہ داری کے متعلق ہے، اس میں موجود ہے حتیٰ کہ مسئلہ خنثیٰ بھی ۱۳۲۴ھ کی طباعت کی ج ۵ ص ۳۰ تا ۳۲ میں یہاں کتابیہ عورت سے نکاح کے نتائج کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔ (ایضاً ۶ تا ۸) یہ حصہ واقعی بڑا دلچسپ ہے مثال کے طور پر ایسی عورت کو بعض صورتوں میں مجبور کیا جائے گا کہ مسلمانوں کے قانون کے مطابق پاکی حاصل کرے۔ خود المدونہ سے بھی مماثل مثالیں بہ آسانی فراہم کی جا سکتی ہیں۔

Marfat.com

کیسے ہوا؟ اس مرحلے پر یہ مسئلہ نہایت تاریک ہو جاتا ہے کیونکہ جن یادگاروں (المدونہ اور الام) کا ہم نے ابھی ذکر کیا، ان کے پہلے بہت کم کتابیں ایسی تالیف ہوئیں جو اب تک باقی ہوں۔ مثال کے طور پر بانیانِ مذاہب فقہ کے سر آمد امام ابوحنیفہ کی ۱ (فقہی) تالیفیں ہم تک نہیں پہنچی ہیں۔ اس کے علاوہ جو سب سے قدیم متن ہمیں معلوم ہے بشرطیکہ وہ اصلی بھی ہو، امام زید بن علی (فوت ۱۲۰ھ) کی کتاب المجموع فی الفقہ ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے زیادہ سے زیادہ ایک سو سال بعد کی تالیف ہے۔ اس بحث میں جو متن ہمارے لیے سب سے زیادہ دلچسپی رکھتا ہے، وہ امام مالک کی کتاب الموطا ہے۔ اس کے اصلی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اس میں حدیثیں بھی ہیں اور رواج یا عرف مدینہ کے متعلق مشاہدات بھی۔ رہا قرآن کی تدوین (یعنی نزول (مترجم)) سے لے کر مذاہب فقہ کی بنیاد پڑنے تک کا زمانہ جو ایک سو سال پر مشتمل ہے اس کے آثار اب کچھ بھی باقی نہیں ہیں۔ ۲

بہر حال ۱۱۰ھ/۶۳۲ء میں [رسول اکرم کی وفات کے وقت] عرب عبارت تھے قبائل کے ایک مجموعے سے جس میں ربط (ارتکاز کم پایا جاتا تھا اور جو اسلامیت سے کم یا زیادہ آشنا تو ہو چکے تھے لیکن ان کا معیار ثقافت، خصوصاً مذہبی اور قانونیاتی نقطۂ نظر سے ان ملکوں کے مقابلے میں جنہیں وہ بہت جلد فتح کرنے والے تھے، بہت پست تھا، مگر

---

۱ اُن کے دو بڑے شاگردوں میں سے امام ابو یوسف کی کتاب الخراج باقی ہے اور امام محمد الشیبانی کی من جملہ دیگر تالیفوں کے ایک تالیف کے کچھ ٹکڑے کا جامعہ برلن کے رسالے Mses Mitteilung des seminars die orcextal cochen sprachen میں ترجمہ ہوا ہے لیکن یہ المدونہ اور الام کے مقابلے میں کمتر درجے کی تالیفیں ہیں (مولف کو مجلس احیاء المعارف النعمانیہ، حیدرآباد دکن کے کارناموں سے آگاہی نہیں معلوم ہوتی ہے جس نے صاحبین کی کوئی نصف درجن کتابیں چھاپ ڈالی ہیں۔ اس فرانسیسی مقالے کی اشاعت کے بعد جامعہ قاہرہ سے امام محمد کی کتاب الاصل کی طباعت شروع ہوئی ہے۔ (مترجم)

۲ حضرت جابرؓ کی کتاب الحج حضرت علیؓ کے فتاوٰی حضرت ابن عباسؓ وغیرہ کی کتابیں جو فقہی چیزیں تھیں، ان کا اب صرف نام باقی ہے۔ ۵۸ھ سے قبل کی تالیف صحیفہ ہمام بن منبہ البتہ موجود ہے۔ اسی طرح ہمام کے شاگرد معمر بن راشد کی الجامع لیکن یہ دونوں آخر الذکر کتابیں فقہ سے زیادہ حدیث سے متعلق ہیں۔ (مترجم)

Marfat.com

دو صدیوں سے بھی کم عرصہ بعد اس مذہب کے نام سے جوان کو اتنی مشکل سے اپنے قابو میں رکھے ہوئے تھا، افکار انسانی کی وہ عجیب وغریب پیداوار تشکل پذیر ہوئی، جسے "فقہ" کہتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی ایسا بھی ہو جو اس کی داد نہ دے پھر بھی وہ افکار انسانی کی ایک قابلِ ذکر جدوجہد یقیناً ہے لیکن یہ کیسے اور کن اثرات کے تحت وجود میں آیا، خاص کر پہلی صدی ہجری میں؟ یہ بات ہمیں معلوم نہیں اور فقہ کے آغاز کے سلسلے میں یہ معمہ ہے اگر اس کی پیدائش نفی محض سے ہوئی تو افکار اسلامی کی داد دینی پڑے گی اور چاہے یہ بات کتنی ہی کم قرین قیاس کیوں نہ ہو، اس کی تردید کرنا، اس کے برعکس صورت حال ہونے کا ثبوت دینا، اس کی موجودہ حالت میں سخت دردسری کا باعث ہے۔

(۱)

اس موضوع پر بحث کرنے سے پہلے میں ناظرین کی توجہ تاریخ آغاز فقہ کے سلسلے میں ایک اور معمے کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں جسے داخلی معمہ کہہ سکتے ہیں اور سب سے زیادہ بڑا معمہ یہ سنی اور غیر سنی فقہ کا بالکل ایک ہونا ہے، جسے آج تک کسی نے غالباً معمہ نہیں خیال کیا۔

یہ معلوم ہی ہے کہ شیعہ فقہ، سنی فقہ سے صرف چند اہم باتوں میں مختلف ہے (یعنی قانون وراثت، متعہ، ولد الحرام کا رشتہ اپنی ماں سے) باقی سارا شیعی نظام فقہ سنی فقہ سے اتنا ہی اختلاف رکھتا ہے جتنا سنی مذاہب فقہ خود آپس میں فرق دیکھتے ہیں۔

یہ یکسانی اِباضی (یعنی خوارج) کی فقہ میں اور بھی زیادہ واضح ہے۔ جو کہنا چاہیے سنی فقہ سے تقریباً بالکل ہی اختلاف نہیں رکھتی۔

اب صورت حال اپنے ذہن میں تازہ کیجیے۔ پیغمبر اسلام کی وفات کے تیس ہی سال بعد دو بڑے دینی اختلاف پوری قوت کے ساتھ رونما ہو چکے تھے۔ ان اختلاف کرنے والوں اور سنیوں کے درمیان بڑی خونریز لڑائیاں ہوئیں، یہ تو کوئی بھی قبول نہ کرے گا کہ نظامِ فقہ اس ربع صدی ہی میں شکل پذیر ہو گیا ہو جو (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اور ان دینی اختلافات کے درمیان واقع ہے تو پھر یہ کیا بات ہے کہ

(سنی، شیعہ اور خوارج تینوں کے نظام ہائے فقہ میں) نہ صرف قانونی حل ایک ہی ہیں بلکہ فروعی امور کی حد تک مسائل سے بحث کی تفصیلات، بلکہ کتب فقہ کی تبویب تک میں وہ یکساں ہیں۔ یہ امر مجھے بڑی حیرت میں غرق کر دیتا ہے، یہ فقہ کی تشکیل داخلی کے متعلق ایک نا قابل ادراک معمہ ہے۔

(۲)

اگر اثرات کے متعلق گفتگو کی جائے (خواہ وہ ادبی ہو یا اخلاقی، سیاسی ہو یا مذہبی وغیرہ) تو کم از کم دو چیزوں میں اچھی طرح امتیاز کرنا چاہیے، یعنی جو چیز اخذ یا نقل ہو سکتی ہے وہ یا تو مواد ہو گا یا روح (اسپرٹ) اور بسا اوقات دونوں کو نقل اور بعض وقت چوری کہا جا سکتا ہے مثلاً گوئٹے کی لافانی نظم ''ہرمان اور دوروتیا'' (Hermann und Dorathea) مواد کی حد تک ایک پیش پا افتادہ چند سطری قصے [1] سے ماخوذ ہے۔ بایرن [2] کی قابل تعریف نظم ''قین'' (Cain یعنی ہابیل کا بھائی قابیل) توریت کی کتاب ''پیدائش'' کی چند آیتوں سے ماخوذ ہے، لیکن اس مواد پر جو خیال آرائی کی گئی ہے وہ ان دونوں میں ان کے اصل ماخذ و مصدر سے منتج نہیں ہے۔ لافونتین (La fontaine): کی منظوم اخلاقی کہانیاں [3] (Fables) یا راسین (Racine) کی نظم ''اندروماک''

---

[1] وہ قصہ یہ ہے کہ چند خانماں برباد پناہ گزیں ہرمان کے گاؤں سے گزرتے ہیں تو ہرمان ان میں دوروتیا کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ ہرمان کا باپ ایک مالدار ہمسایہ لڑکی کو بہو بنانا چاہتا ہے لیکن بعد میں گاؤں کے پادری وغیرہ کی کوشش سے باپ رضا مندی دے دیتا ہے اور عاشق و معشوق شادی کے بعد ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگتے ہیں۔ یہ جرمن شاعر گوئٹے (Goethe) ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۳۲ء میں فوت ہوا۔ (مترجم)

[2] (لارڈ بایرن Lord Byron انگریز شاعر زمانہ ۱۷۸۸ء تا ۱۸۲۴ء مترجم)

[3] لافونتین ۱۶۲۱ء تا ۱۶۹۵ء مشہور فرانسیسی شاعر اس نے کلیلہ و دمنہ اور گلستان و بوستان کے انداز پر جو اخلاقی کہانیاں لکھی ہیں ان میں زیادہ تر جانوروں کو ہیرو بنایا گیا ہے۔ بھیڑیا اور بکری کا بچہ، لومڑی اور سارس وغیرہ وغیرہ پر اس کی پر لطف کہانیاں ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ (مترجم)

(Andromaque) ۱ کے مواد کے ماخذوں کے متعلق بھی کوئی چاہے تو اسی قسم کے ملاحظات پیش کر سکتا ہے۔ اس کے برخلاف مثلاً تقلید شکن رومان پسندی بھی، قدامت پسند ''کلاسیکیت'' ہی کی طرح ادبیات میں ایک بڑا روحانی یا جذباتی دھارا رہی ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے مولفوں کو متاثر کیا ہے، بلالحاظ اس کے کہ وہ کس موضوع سے بحث کر رہے ہیں۔ اس لیے یہ خیال کرنا کوئی احمقانہ بات نہیں کہ وکتور ہوگو ۲ کوئی رومان پسندانہ ناٹک تندی ۳ کے نام سے لکھ سکتا تھا یا راسین کسی رومان پسندانہ ناٹک کا موضوع لے کر اسے قدامت پسندانہ ''کلاسیکی'' انداز میں برت سکتا ہے جیسا کہ اس نے ترکی حرم سرا کے ایک واقعہ ۴ کے متعلق کیا ہے۔

قانون میں بھی ہم بالکل اسی طرح کی صورت حال سے دو چار ہو سکتے ہیں مثال کے طور پر برطانوی ہند میں انگریز حکام عدالت بلکہ اس سے بھی زیادہ عجیب بات

---

۱ راسین ۱۶۳۹ء تا ۱۶۹۹ء فرانس کا حزن نگار شاعر۔ اندروماک ایک بیوہ ہے جس پر بادشاہ پیروس (Pyrrus) عاشق ہو جاتا اور دھمکاتا ہے کہ اگر وہ نہ مانے گی تو اندروماک کے بیٹے کو قتل کر دیا جائے گا، مگر پیروس کی منسوبہ ایک دوسری عورت مارے حسد کے بادشاہ ہی کو مروا دیتی ہے اس طرح یہ قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ راسین سے پہلے بھی اس کہانی کو لاطینی میں ورجیل (Virgile) اور یوری پیڈ (Euripide) اپنے اپنے انداز میں لکھ چکے تھے۔ (مترجم)

۲ (Victor Huge) فرانس کا رومان پسند شاعر زمانہ ۱۸۰۲ء تا ۱۸۵۵ء (مترجم)

۳ (کورنئی Corneille) نامی فرانسیسی حزن نگار شاعر زمانہ ۱۶۰۶ء تا ۱۶۸۴ء نے Lecid کے نام سے قدامت پسندانہ انداز میں ایک ناٹک لکھا تھا جس میں ایک اسپینی قصے کو اپنایا ہے جس میں سدی رذریق ایک جاگیردار کی لڑکی پر عاشق ہو جاتا ہے، لڑکی کا باپ لڑکے کے باپ کو کسی بات پر پٹواتا ہے، اس کے انتقام میں لڑکا اس جاگیردار کو مار ڈالتا ہے، اس کے باوجود لڑکی سدی رذریق کے عشق میں مبتلا رہتی ہے جب رذریق عربوں پر ایک بڑی فتح پاتا ہے تو لڑکی اپنے باپ کے قاتل عاشق سے شادی منظور کر لیتی ہے۔ (مترجم)

۴ غالباً ''بایزید'' نامی ناٹک مراد ہے جو راسین نے ۱۶۷۲ء میں لکھا تھا اس میں سلطان ترکی کی بیوی اپنے دیور پر عاشق ہو جاتی ہے اور قتل وخون کے ذریعے ناٹک کے کردار دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔ (مترجم)

Marfat.com

یہ کہ خود مسلمان حکام عدالت جن کی تربیت انگریز اہلِ قانون کی نہج پر ہوئی تھی، فقہ کا اطلاق انگلستان کے قانون نظائر (Case Law) کے انداز پر کرتے تھے، حالانکہ ان دونوں نظام ہائے قانون کا مادہ اور روح دو بالکل ہی مختلف اصلیتیں رکھتے تھے۔

اس تصور کی وضاحت کے لیے ہم اوپر دی ہوئی مذکورہ سادہ مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اسلام نے بھی فکری تصور اور مواد کی حد تک دیگر قانونی یا نیم قانونی اور نیم مذہبی نظاموں سے کوئی چیز مستعار لی ہے؟

اس طرح کی اخذ وعاریت اگر ہوئی بھی ہے تو ظاہر ہے کہ صرف ان ممالک سے ہوسکتی ہے جنہیں نہ صرف مسلمانوں نے فتح کیا تھا، بلکہ جو مدینہ منورہ سے باہر اور اس سے دور افکار اسلامی کے مرکز بھی بن گئے تھے اور اُن نومسلموں کے باعث جو کسی نہ کسی حد تک معیارِ ذہنی کے مالک ہوں اور اس دھارے کے باعث جو ان کا (سابقہ) قانون اور ان کا (سابقہ) مذہب منہاج فکر اور مسائل کے حل کے متعلق مہیا کرتا تھا۔ اسی بنا پر ہماری یہ بحث نظام ہائے قانون کے صرف چار گروہوں [1] کی حد تک محدود رہے گی۔

۱۔ پارسیوں کا نیم قانونی نیم مذہبی نظام

۲۔۳ قانون روما اور قانون کلیسائی جس حد تک وہ شام اور مصر میں معروف تھے۔

۴۔ تالمود (یہودی قانون)

(۳)

(۱) اس بحث میں ہم پارسی مذہب کا زیادہ ذکر نہ کریں گے، اس موضوع پر سب سے اہم تحقیق گولٹ سیہر (Goldziher) کی رہین منت ہے جو فرانسیسی ''رسالہ'' تاریخ

---

[1] گولٹ سیہر نے ایک مقالہ اسلام پر بدھ مت کے اثر پر انگلستان کے رسالہ مستشرقین Iras میں شائع کیا ہے مگر یہ اثر فقہ پر نہیں بلکہ تصوف پر رہا ہے۔

مذاہب Rhr ۱۹۰۱ء جلد ۴۳ صفحہ نمبر ا و مابعد میں شائع ہوئی ہے۔[1] اس کا اثر زیادہ تر مادی ہے اور وہ بھی فقہ کی حد تک بہت قلیل چیزوں تک محدود رہا ہے۔ مثلاً نمازوں کی تعداد کا پانچ ہونا، مسواک، کتے سے حقارت کا برتاؤ۔ اس کے برعکس پارسیوں کے ہاں کتے کا بڑا احترام تھا وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہم گولٹ سیہر کے اس خیال سے بھی اتفاق کر سکتے ہیں کہ ایرانی علمائے دینیات نے اپنے قبول کردہ نئے مذہب یعنی اسلام میں اپنے پرانے روایاتی نقطہ ہائے نظر داخل کر لیے تھے۔[2] لیکن یہی مؤلف فقہ کی جبکہ اس کا بہ حیثیت مجموعی تصور کیا جائے روح پر اپنے ان خیالات کا اطلاق کسی طرح نہیں کرتا۔

غرض اس بارے میں ہمارے موجودہ معلومات بہت محدود ہیں اور غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہ پر پارسی اثرات اصل میں ہیں بھی بہت محدود۔ یوں بھی اس مسئلے پر ہمیں بہت زیادہ معلومات حاصل ہو بھی نہیں سکتیں کیونکہ پارسیوں کی مقدس (یعنی مذہبی) ادبیات کا ایک بڑا حصہ اسلامی[3] حملے کے نتیجے میں ضائع ہو گیا۔ چنانچہ ژند اوستا کے اکیس نسکوں میں سات قانون سے متعلق سمجھے جاتے تھے۔ ان میں بھی صرف ایک کامل ملتا ہے اور باقی کے محض چند ٹکڑے ہیں۔ جو مکمل نسک موجود ہے، وہ بندیداد (Vandidad) ہے جو زیادہ تر عبادتی طہارت اور مختلف دیگر مسائل سے متعلق ہے اور سب انتہائی

---

[1] حال میں اس موضوع پر ایک اطالوی مقالہ بھی شائع ہوا ہے لیکن وہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ مولف نے ہماری دریافت پر جواب دیا کہ انہیں مقالہ نگار یا رسالے کا نام بھی معلوم نہیں جامعہ روما کے پروفیسر لیوی دیل لاویدا (Levi della Vida) نے ازراہ عنایت لکھا ہے کہ غالباً یہ اطلاع غلط فہمی پر مبنی ہے اگرچہ پروفیسر پالیارو (Pagliaro) نے ساسانی قانون پر کئی مقالے لکھے ہیں لیکن ان میں فقہ پر اثر پڑنے کا کوئی ذکر نہیں۔ (مترجم)

[2] یہ صحیح ہے کہ عہد تابعین و مابعد میں بہ کثرت فقہا و علما نو مسلم زادے ملتے ہیں جن کی پوری تربیت اسلامی ماحول میں ہوئی تھی اور جو صرف عربی میں لکھتے پڑھتے تھے۔ لیکن تازہ نو مسلموں میں فقہاء قضاۃ یا متکلمین کا کوئی سراغ کم از کم مجھے نہیں ملا ہمارے کرم فرما اپنی خواہش کو واقعہ قرار دے دیتے ہیں۔

[3] غالباً اصل میں سکندر اعظم مراد تھا، اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ مسلمانوں نے ایرانیوں کی کتابوں کو چھیڑا ہے۔ فتح خیبر کے بعد توریت کے جو نسخے مال غنیمت میں ملے تھے، خود جناب رسالتمآب ☆

Marfat.com

بے ترتیبی کی حالت میں [1] اور یہ بے ترتیبی اس سے کہیں زیادہ ہے جو فقہ میں پائی جاتی ہے۔ اگر سرسری اور سطحی تاثرات کی بناء پر میں کوئی رائے ظاہر کرنے کا مجاز سمجھا جاؤں، تو میری رائے میں فقہ کے تمام ظاہری خط و خال ہوں یا اس کی روح ان دونوں میں کسی حد تک بھی پارسی قانون کے اثرات قابل لحاظ نہیں ہیں۔ اس میں فقہ کے جیسے طویل، دقیق اور مفصل احکام نہیں پائے جاتے، جسے موشگافی کرنے والے (Casuistiques) فقہاء نے قانون ربانی کی اساس پر مرتب کیا ہو۔ کیا پارسیوں کے پاس ایسا کوئی ادب (لٹریچر) پایا بھی جاتا تھا؟ میں اس سے واقف نہیں۔ [2]

(۴)

کیا پھر یہ ممکن ہے کہ کسی ایسے اثر کا پتا چلتا ہو جو قانونِ روما نے فقہ پر ڈالا ہو؟ چونکہ اس قانون کے متعلق پوری واقفیت ہے اس لیے یہ دشوار نہیں کہ اس سے لیے ہوئے مادی حصے کو منصۂ شہود پر لایا جائے مگر ماہرین نے اس وقت تک جو فردِ حساب تیار

☆ نے یہودیوں کو واپس دلا دیے تھے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مذہب اور مذہبی معلومات کو اگر مٹھی بھر پجاری اپنی اجارہ داری بنالیں اور عوام میں ان کے پھیلنے میں مانع آئیں تو چھوٹے سے چھوٹا اتفاقی حادثہ بھی نا قابل تلافی نقصان پہنچا دیتا ہے خود کردہ را چہ علاج (مترجم۔)

[1] ژند اویستا کا فرانسیسی ترجمہ از دارمش تیتر (Darmeteter) جلد دوم ص ۱ تا ۳۰۴ نیز دیباچہ۔

[2] بے شبہہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی تنظیمات میں ساسانی عام شوری قانون سازی کا اثر پڑا، لیکن میرے علم میں اس پہلو کا کسی نے بھی مطالعہ نہیں کیا ہے۔ (مسعودی نے یہ ضرور صراحت کی ہے کہ مثلاً حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے عراق وایران میں وہاں کا پرانا نظام مالگذاری ہی برقرار رکھا، گویا وہ اسلامی قانون میں جذب کر لیا گیا۔ اسی طرح محدثین اور مورخین سب نے بیان کیا ہے کہ ایران میں صرف خاص شاہی کی جاگیریں اور ڈاک وغیرہ دیگر منافع عامہ کی جائدادیں بھی عہد خلافت میں مرکزی حکومت کی ملکیت کبھی جاتی رہیں اور ان کے متعلق خلفاء اپنی صوابدید پر عمل کرتے رہے، ایرانی دراہم اور سکہ سازی بھی برقرار رہی۔ ایسی اور بھی جزئی تفصیلیں مل سکیں گی۔ (مترجم)

Marfat.com

کی ہے۔ وہ کافی مایوس کن ہے۔ یہ نہیں کہ اس امر میں کوئی صداقت نہیں ہے کہ ان میں اور فقہ میں چند مشابہتوں کا پتا چلایا گیا ہے۔ [1] لیکن میری نظر میں یہ آغاز فقہ کی گتھی کو حل نہیں کرتا۔ ایک لمحے کے لیے اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ دونوں نظام ہائے قانون

---

[1] کاروسی (Caruse) کا نظریہ یہ ہے کہ "اسلامی قانون بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ ایک رومی قانون ہے۔ جس میں بہ مشکل کوئی تبدیلی ہوئی ہو (کذا) وہ یہ الفاظ ہیوگ Hugues La france judiciai سے اخذ کرتا ہے۔ جس نے عامیانہ خیالات کے ایک vf. 1878-79 کے ایک مختصر مضمون میں مذکورہ بالا حماقت دکھائی ہے۔ کاروسی کی علمی قدر و قیمت کو نالینو (Nalline) نے پر زور طور سے مشتبہ قرار دیا ہے البتہ بعض معقول مشابہتیں وہ ہیں جو سانشیلا t Santillana نے اپنی فرانسیسی کتاب مسودہ قانون واجبات تونس Avant Imjet du code Tunision des obligationn میں اپنے قابل داد ترجمہ "مختصر الخلیل" میں نہایت محتاط طور پر (مماثل) قانون روما کے حوالوں اور حاشیوں میں بتائی ہیں۔ اس کے علاوہ موزان کی کتاب الجزائر کے اسلامی قانون پر مطالعات (Morand, Etudes da droit muoolman algerian) حبوس یعنی اوقات کے سلسلے میں اشمیت کی قبضہ اسلامی قانون Schmidt Die Occupatie im islamisch on reche مطبوعہ جرمن رسالہ در اسلام (Der Islam) ۱۹۱۰ء بوسی کی اطالوی کتاب "بیز نطینی اور اسلامی قانون شفعہ کے باہمی تعلقات کی تحقیق" Buosi Riceerce interne etterela zione fra vetratto byzantine e musulmane جیر رو سے (roussier) میں فرانسیسی "رسالہ تاریخ قانون" Revue Hist. de droit ۱۹۳۴ء ص ۳۲۳ و مابعد میں تنقید کی ہے۔ فون کریم کی جرمن کتاب "مشرق کی ثقافتی تاریخ عہد خلافت میں۔ Von kremer, Catturge schichte des orients unter den chalifen جلد اول ص ۵۵ و مابعد یہ کتاب اگرچہ اب فرسودہ ہوگئی ہے لیکن اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ فقہ کے تعلقات (یہودی) تالمود اور قانونِ روما کے ساتھ جوڑ رہے ہیں۔ اس نے ان کو اچھی طرح محسوس کیا ہے اور اس مسئلے پر زور دیا ہے کہ حنفی قانون حضانت میں قانون روما سے رہنمائی حاصل کی گئی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس مولف نے یہ خیال کر لیا کہ اس نے اس مسئلے کو حل کر دیا ہے نیز دیکھو کتاب بالا جلد دوم ص ۱۵۸ و مابعد میں ایک اہم عبارت (حوالہ اول میں اس قول کو اساس بنایا گیا ہے کہ یتیم کا مال پچیس سال کی عمر کے بعد اس کے سپرد کیا جانا چاہیے۔ حوالہ دوم میں فون کریم نے یہ لکھا ہے کہ موالی جب قاضی اور مفتی مامور ہونے لگے تو انہوں نے اپنی سابقہ (غیر مسلم) ثقافت کی چیزیں فقہ میں داخل کرنی شروع کی ہوں گی خاص کر نومسلم یہودیوں نے تالمود سے استفادہ کیا ہوگا لیکن فون کریم نے اس دعوے کا کوئی ☆

Marfat.com

کے مماثل قواعد جن کو اگر بہ حیثیت مجموعی جانچیں تو ان میں ایک بہت ہی خفیف تناسب معلوم ہوتا ہے فقہ میں قانون روما کی راہ سے داخل ہو سکے تو اس کے باوجود یہ امر اپنی جگہ برقرار رہتا ہے کہ فقہی مواد کا مجموعہ اس کے اصولی نظریے کم از کم وہ نظریے جو فقہ کو اس کی خصوصی ہیئت عطا کرتے ہیں، قانون روما کے ذرا بھی مرہون منت نہیں ہیں۔ عبادات کا تو ذکر ہی کیا، اگر معاملات میں ان بنیادی خیالات کو لیا جائے جن پر نکاح، طلاق، غلامی، جہاد، ربا (سود) معاہدات غرر (غیر یقینیات کے متعلق) نظامِ وراثت، شہادت و ثبوت، آداب القاضی کے نظریے پر مبنی ہیں، تو ان بنیادی معاملات کے بارے میں فقہی احکام اور قانون روما کے احکام میں قطعاً کوئی تعلق نہیں پایا جاتا۔

یہ تو مواد کا حال ہے رہی روح، تو فقہ اور قانونِ روما کی روح ایک دوسرے سے اور بھی زیادہ دور ہیں۔ فقہ کی دو بنیادی خصوصیتیں ایسی ہیں جو قانونِ روما کی روح سے بالکل ہی مغائر ہیں۔

(الف) اولاً فقہ جسے فقہا نے وضع اور مرتب کیا ہے، ایک الٰہیاتی مجموعہ ہے جس میں قانون اخلاق، عبادات، دینیات، عام معاملات سب ہی غیر منفک طور پر ایک دوسرے سے مربوط اور مخلوط ہیں۔ اس سلسلے میں اسلامی ''قانون'' [1] کا ذکر کرنا خطرے سے خالی نہیں (اگرچہ یہ کہنا درست ہوگا کہ مختلف مسلمان قوموں کے قانونی ادارات موضوعہ (Institutions Juridiques positives) پائے جاتے ہیں کیونکہ قانون کا تصور فقہاء کے ذہن میں [2] کبھی بھی اس الٰہیاتی

☆ ثبوت نہیں پیش کیا کہ کوئی نو مسلم کبھی قاضی و مفتی مقرر کیا گیا ہو نو مسلموں کی اولاد اسلامی مدارس میں تعلیم و تربیت پاتی تھی جس میں بیرونی اثرات اس میں کم و بیش ناپید ہو جاتے۔ مترجم

[1] یعنی خالص دنیادارانہ انسان ساز احکام دیوانی و فوجداری، جن کی اساس میں خدا اور وحی کو کوئی دخل نہ ہو۔ مترجم

[2] اس کی تردید میں یہ یاد دلایا جا سکتا ہے کہ فقہا نے کم از کم قانون فوجداری کے اس حصہ کو جو قتل، زنا، شراب نوشی وغیرہ پانچ سات ''حدود'' سے متعلق ہیں چھوڑ کر غیر محدود مسائل تعزیر کو امام کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے اور یہ ''سیاست شرعیہ'' ترمیم و تبدیل کی اچھی خاصی آزادی ہے۔ مترجم

Marfat.com

مطمح نظر سے (جسے امتِ اسلامی پر حکمراں رہنا چاہیے) جدا نہیں ہو سکتا، ہر فعل، وہ عباداتی ہو یا قانونی، وقت واحد میں ایک اخلاقی اور دینی صفت سے بھی متصف رہتا ہے۔

یہ سب قانون روما کی روح کے شدید مخالف و متضاد ہے [1] اور جو چیز عجیب ہے وہ یہ ہے کہ الپیئن (Ulpien) نے قانون روما کی جو مشہور و معروف تعریف (لاطینی میں) کی ہے، وہ قانون روما سے کہیں زیادہ فقہ پر صادق آتی ہے کہ ''علم قانون کے معنی ہیں خدائی نیز انسانی چیزوں کی معرفت'' کیونکہ اس تعریف کے برخلاف روما میں خالص دنیوی قانون Jus اور ہمہ گیر مذہبی قانون Fas میں ابتدائی زمانے ہی میں اور ہمیشہ کے لیے تفریق ہو گئی تھی اور ایک عظیم ترقی تھی جو انسانی ذہن نے حاصل کی [2]۔ یہ ارتقاء مسلمان فقہا کے ہاں کبھی ہوا ہی نہیں اور ہو بھی نہیں سکتا تھا، کیونکہ یہ ان کے نظام کی اساس ہی سے تضاد رکھتا تھا۔

(ب) استنباطات یا مہمل مفروضات میں موشگافی اور اس کی اساس پر معمولی تفصیلوں تک کی بحث، ایک ایسی چیز ہے جس کے متعلق ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ ابتدا ہی سے فقہ کی ممتاز ترین خصوصیتوں میں رہی ہے اور ہم کو یقین نہیں کہ ایسی کوئی چیز قانون روما کی کتابوں یا خود عہد متاخر کے بیزنطینی قانون کی کتابوں مثلاً ''قوانین شاہی'' (Basiliques) [3] میں مل سکے گی۔ اس

---

[1] دیکھو اہرنگ (Ihring) کی جرمن کتاب ''قانون روما کی روح'' فرانسیسی ترجمہ جلد اول ص ۲۶۶ تا ۲۶۷ نیز ص: ۳۵ تا ۵۲۔

[2] یہ امر دریافت طلب ہے کہ ذہن انسانی کی اس ''ترقی'' سے انسانیت نے فائدہ زیادہ اٹھایا یا نقصان؟ مترجم

[3] اس سے مراد اپنے جسٹی نین کے مجموعہ قوانین کا مرمہ یونانی ترجمہ ہے جو ساٹھ کتابوں پر مشتمل تھا اور شہنشاہ باسیلیوس (فوت ۸۸۶ء) اور اسکے بیٹے ہوف (فوت ۹۱۲ء) کے زمانے میں مکمل ہوا۔ اب صرف جز محفوظ ہے۔ مترجم۔

Marfat.com

(رومی قانون) میں حقایق و واقعات کے ساتھ ربط نہایت عمیق اور مستحکم رہا ہے اور غالباً یہی چیز ہے جس نے اسے دیرپا قدر و قیمت عطا کی ہے[2]۔

اس طرح اب یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہوگا کہ اپنی روح کی حد تک فقہ نے رومی قانون سے کچھ بھی اخذ نہیں کیا۔

اب سوال یہ ہے کہ جو مادی چیزیں اخذ کی گئیں ان کی اہمیت کیا رہی ہے؟ مادی اور روحی امتیاز جو ہمیں اتنا زیادہ اہم نظر آتا ہے، فاضل بزرگ گولٹ سیہر نے بالکل نہیں کیا ہے اور غالباً سانتیلانا کی دکھائی ہوئی قربتوں [یا مشابہتوں] سے متاثر ہو کر اس نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، مادۂ فقہ میں بے تکلف لکھ مارا کہ ''اسلامی قانون سازی کے ماخذ صرف رومی قانون کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتے۔

اتنی مستند شخصیت (گولٹ سیہر) کے خلاف آواز بلند کرنا خطرے سے خالی نہیں، پھر بھی اس دعوے کے متعلق میں مندرجہ ذیل ملاحظات پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں:

اولاً یہ کہ گولٹ سیہر نے (جس نے پارسی مسائل کا بذات خود مطالعہ کیا ہے) اس مسئلے (یعنی رومی قانون سے تعلقات) کا خود مطالعہ نہیں کیا اور اس نظریے کے متعلق اس نے خود اپنی کوئی دلیل نہیں پیش کی ہے اور جو مماثلتیں دکھائی گئی ہیں، اگر وہ دس گنی بھی زیادہ ہوتیں، تب بھی کتب فقہ میں حل کیے ہوئے مسائل کے مقابلہ میں دریا میں قطرے سے زیادہ نہیں ہیں۔ ان حالات میں یہ کیوں نہ خیال کیا جائے کہ اکثر صورتوں میں مماثلت محض اتفاقی ہے، کیونکہ کسی سوال کے ممکنہ حل جو ذہن انسانی میں آ سکتے ہیں وہ محدود ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ ہو سکتا ہے کہ مختلف نظام ہائے قانون یا عبادتی

---

[1] مولف نے اپنے اس حسن ظن کا کوئی ثبوت نہیں دیا۔ کیا دیرپائی کے معنی ہر روز کی تبدیلی کے ہیں؟ شہنشاہ جسٹی نین (Justinian) کی آئے دن کی من مانی تبدیلیوں سے کون نا واقف نہیں۔ مترجم

[2] دیکھو ایرنگ کے ملاحظات (کتاب بالا ج: ۱ص ۴۲ نیز ص ۵۶ تا ۵۷) موشگافانہ مستنباطات کے متعلق ایسے مستنباطات جو کمزوری کی علامت ہیں۔ اسلیے آدمی کو حقائق اور واقعات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

(دینی) ایک ہی حل اختیار کریں ل۔

اور ایسا بارہا پیش آیا ہے، مثلاً سانتیلانا نے مختصر الخلیل (ترجمہ جلد دوم ص: ۸۱، ۷۱۶، ۷۱۸، ۷۱۹) کی ذیل کی عبارت کے متعلق مماثل رومی احکام کا حوالہ دیا ہے:

''اکراہ کسی ضرر مثلاً موت، مار پیٹ یا قید کا ڈر، باندھ دیے جانے یا بیڑیاں پہنا دیے جانے، کسی مردانہ قوت والے آدمی کو سر بازار دھپہ مار دینے، زیر اکراہ شخص کے بیٹے یا اولاد کو موت کی دھمکی دینے، یا اس کی جائداد کو نقصان پہنچانے کی دھمکی دینے پر مشتمل ہے لیکن اس پر اتفاق رائے نہ ہو سکا کہ اکراہ قرار پانے کے لیے آیا یہ ضروری ہے کہ یہ ضرر شدید بھی ہونا چاہیے یا نہیں۔

میری دانست میں اس کا ہر شخص اعتراف کرے گا کہ اکراہ کی تعریف غیر محدود

ل گولٹ سیہر نے پارسیت کے مذہبی اثر کی مثال بطور ردعمل کے دی ہے یعنی پارسیوں کی توڑ پر عمداً ان کے طرز عمل کے خلاف طریقہ اختیار کیا ہے۔ میں نہیں کہتا کہ ایسا نہیں ہوا ہوگا، لیکن اگر کسی طرز عمل کے موافق اور مخالف طریقوں کو اثر پڑنے کا کافی ثبوت خیال کیا جا سکتا ہے، تو اولیاتی یا دلیل انی (a priori) کے طور پر اس طرح اس بات کا امکان دوگنا ہو جاتا ہے کہ جو بات محض اتفاقی بھی ہوئی ہو اسے براہ راست اثر قرار دیا جائے بجز اس کے کہ وہ کوئی بہت ہی چھوٹی ذیلی چیز ہو جو (اسلامی نظام کی اپنی) خصوصیت ہو (اور کسی دوسرے نظام میں اسکے موافق یا مخالف بھی کوئی چیز نہ ملتی ہو)۔ [دلیل انی گویا ''اِن'' (اگر ایسا ہو تو) کے مفروضہ سوال کا جواب دیتی ہے۔ مترجم]

ایک فرضی مثال لو۔ اگر مستقبل کے ماہرین علم یہ خیال کرنے لگیں -- کہ بیسویں صدی کے پروٹسٹنٹ اسکے پابند تھے کہ مقدس جمعہ (گڈ فرائیڈے) کو گوشت ضرور کھائیں، حالانکہ غذا کے متعلق ان پر کوئی مذہبی پابندی تھی ہی نہیں (جو کہ حقیقت میں صحیح ہے) مگر چونکہ مقدس جمعہ کے دن گوشت نہ کھانا تمام کیتھلکوں کے ہاں زیر عمل تھا، اس بنا پر مستقبل کے یہ ماہرین یقینی طور پر یہ نتیجہ اخذ کریں کہ پروٹسٹنٹوں نے کیتھلکوں کی توڑ پر اور کیتھلکیت کی مخالفت میں یہ طرز عمل اختیار کیا تھا۔ اسکے برخلاف پروٹسٹنٹوں کے ہاں طلاق کا وجود اصل میں اس بنا پر ہرگز نہیں ہے کہ باقاعدہ طور پر ہر امر میں رومن کیتھلکوں کی مخالفت کرتے ہیں، بلکہ وہ ایک معاشرتی ادارہ ہے جو اپنی احتیاج کے باعث دنیا میں اچھا خاصا پھیلا ہوا ہے اور پروٹسٹنٹ مذہب نے کسی طرح بھی اس کی سفارش نہیں کی ہے۔

Marfat.com

طریقوں پر نہیں کی جا سکتی۔ یہ ایک معمولی پامال چیز ہے اور جو مثالیں دی گئی ہیں وہ عادۃً ہر شخص کے ذہن میں آ سکتی ہیں بجز سر بازار دھپہ مارنے کے اور واقعہ یہ ہے کہ خاص اس مثال کے متعلق قانونِ روما کے کسی حکم کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔

اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ مسلمان فقہاء نے یہ مثالیں کسی رومی عبارت ہی سے نقل کی ہیں تو اس سے یہ کہاں مترشح ہوتا ہے کہ رومی قانون نے فقہ پر اثر بھی ڈالا ہے (یعنی مثال دینا الگ چیز ہے اور متاثر ہونا اور کسی رومی قاعدے کو قبول کرنا الگ۔ مترجم)

اصل میں اخذ و عاریت قرار دینے سے پہلے ایک دوسری ہی چیز کے ثابت کرنے کی ضرورت ہو گی۔ [1] مثلاً ترکی کا مجموعۂ قانونِ مدنی سوئٹزرلینڈ کے مجموعۂ

---

[1] چند مماثلتوں کے متعلق اس کا ثبوت دے دیا گیا ہے کہ فلاں قاعدہ اسلام میں قانون روما سے تعلق پیدا ہونے کے قبل ہی پایا جاتا تھا، اسی کی ایک مثال برگشٹریسر (Bergstruesser) نے جرمن رسالہ "دیر اسلام" (Der Islam) بابت ۱۹۲۵ء ص ۸۱ میں دی ہے [مولف نے اسکی تفصیل نہیں دی ہے مترجم برگشٹریسر کی محولۂ بالا عبارت جرمن سے ترجمہ کر کے یہاں شامل کرتا ہے۔ رسالہ مذکور کی چودھویں جلد میں ص ۷۶ تا ۸۱ پر "افکار قانونی کا آغاز اور ان کی خصوصیات اسلام میں" کے عنوان سے ایک مقالہ ہے جس کا اختتام مندرجہ ذیل الفاظ پر ہوتا ہے: "خرید و فروخت سے متعلقہ بعض معینہ [اسلامی] احکام کو منظم شکل دینے کے سلسلے میں ہم اس رومی تصور سے دوچار ہوتے ہیں Quae Pondere numero mensura constant (= ایسی چیز جو وزن، عدد اور کیل یعنی ناپ کی حد تک معلوم ہو) (خواہ numero کے بغیر ہی کیوں نہ ہو) مشہور تابعی سعید بن المسیب (۱۹ھ تا ۹۴ھ جو مدینہ کے مشہور فقہائے سبعہ میں سے ایک تھے) کے ہاں مل جاتا ہے۔ اتنے ابتدائی زمانے میں رومی علم کا اثر مدینے کے ایک متقی شخص [سعید بن المسیب] پر پڑنے کو تاریخی نقطۂ نظر سے کیسے معقول قرار دیا جا سکتا ہے؟ جبکہ ہر شخص ایسی کوشش کرے گا کہ پرانے اسلامی علم قانون کے دوسرے رخ، یعنی احکام و قواعد کے ایک نظام کی شکل میں مدون ہونے کو بھی ایک اندرونی (مسلمانوں ہی کی) کوشش سمجھے، جیسا کہ پہلے رخ، یعنی ملک کے موجود الوقت مروجہ [زمانۂ جاہلیت سے چلے آنے والے] احکام کو "مسلمان بنانے" کے متعلق ہوا" مترجم۔ یہ اضافہ کرنا چاہتا ہے کہ سعید بن المسیب کی رائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول پر مبنی تھی۔ چنانچہ صحیح بخاری کی کتاب نمبر ۳۵ باب نمبر ۲ میں ہے "من اسلف فی شئ ففی کیل معلوم ووزن معلوم الی اجل معلوم" یعنی اگر کوئی شخص کوئی چیز ادھار دے تو اسے معلوم ناپ اور معلوم وزن (مقدار) میں معلوم مدت کے لیے ہونا چاہیے)

Marfat.com

قانون مدنی کا ترجمہ ہے، اور وہ اپنی سوئٹزرلینڈی اصل سے بہت ہی شاذ صورتوں میں اختلاف کرتا ہے اور یہ مجموعہ واقعی اہم مسائل کے متعلق ہے۔ اس قانون میں سوئٹزرلینڈ کا اثر ہی نہیں بلکہ اس کی چوری کہی جا سکتی ہے۔ اسی طرح البانیا کا مجموعۂ قانون مدنی فرانسیسی اور اطالوی اور بعض صورتوں میں سوئٹزرلینڈی اور جرمن قوانین سے ماخوذ ہے اور ان کے احکام کو گڈمڈ کر کے مرتب کیا گیا ہے۔ اس سے مستقبل کے یوروپی ماہرین قانون کے لیے یہ ثابت کرنا آسان ہوگا کہ یہ البانوی قانون براہ راست اخذ و عاریت پر مشتمل ہے اور پوری پوری عبارتیں ترجمہ کر کے نقل کر دی گئی ہیں، صرف بعض نادر واقعات اور منسوخی بیع کے قوانین اس سے الگ ہیں۔ چنانچہ مستقبل کے ان ماہرین قانون میں سے ایک عربی دان مصری قاعدے سے واقفیت حاصل کر کے یہ ثابت کر سکتا ہے کہ البانوی قانون اصل میں اس مصری حکم کا لفظی ترجمہ ہے۔ جہاں تک قانون شفعہ کا تعلق ہے ہم کو یہ کہنے کا حق ہے کہ منسوخی بیع میں البانوی قاعدہ پر مصری قانون سازی کا اثر پڑا ہے، مگر ہمارے علم میں موجودہ حالت میں اس نوعیت کی قطعاً کوئی تحقیقات عمل میں نہیں آئی ہے جو فقہ کے کسی حصے پر رومی قانون کے اثر پڑنے کے متعلق رہی ہو۔ ۱

لیکن اگر کسی صورت میں اثر پڑا بھی ہو یا اخذ و عاریت عمل میں آئی ہو تو یہ دیکھنے کی ضرورت ہوگی کہ یہ اخذ و عاریت عمل میں کس طرح آئی۔ کوئی شخص بھی ساری چیزیں اپنے دماغ سے نہیں نکالتا اور نہ نفی محض سے، فقہائے اسلام بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اگر اخذ و عاریت عمل میں آئی بھی ہے تو ایک چیز یقینی ہے جو ہمیشہ یقینی رہے گی، وہ یہ کہ فقہاء نے اپنی تعمیر (یعنی فقہ) کو ایک خصوصی ترتیب اور ایک مخصوص ہیئت عطا کی ہے اور اس بارے میں وہ قانون روما کے ذرا بھی مرہون منت نہیں۔ فقہ نے اپنی جبلت کے متعلق قانون روما سے کچھ بھی نہیں لیا ہے۔

---

۱ میں نے شفعہ کی مثال عمداً اس لیے دی ہے کہ بُسی (Bussi) نے اپنی اطالوی تالیف میں اس سے بحث کی ہے اور البانوی قانون کے ماخذ بتائے ہیں۔ بسی کی اس کتاب پر روسئے کی [مذکورہ صدر] تنقید بھی دیکھی جائے جس میں، عمدہ ملاحظات پیش کیے گئے ہیں، اگرچہ فنی نقطۂ نظر سے وہ ایک بالکل ہی مختلف نوعیت کے ہیں مگر نتیجے کی حد تک دونوں میں اتفاق نظر آتا ہے۔

Marfat.com

(۵)

قانون کلیسائی مسلمانوں کے فتح کردہ رومی صوبوں میں جس صورت میں بھی پایا جاتا تھا، وہ بھی فقہ کی تشکیل میں حصہ لے سکا ہوگا ۲۔ لیکن مختصین نے اس مسئلے کا مطالعہ کیا ہی نہیں ہے ۳۔

اس بارے میں ہم ایک عام ملاحظہ یوں پیش کر سکتے ہیں کہ کسی ''مذہبی'' قانون کا تصور ایک ایسی چیز ہے جو ہم [یعنی عیسائی اہل مغرب] کو فقہ کی روح و رجحان سے

---

۱ بقیہ صفحہ گذشتہ: میں خیال کرتا ہوں کہ اس مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لیے ادبی مماثلتیں بے سود نہ ہوں گی، مثلاً راسین (Racine) کی تالیف Phedre کا شلر (Schiller) نے جرمن میں ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ نہایت ''وفادار'' اور خاصا عمدہ ہے۔ لیکن [فرانسیسی] اصل کے مقابلے میں بہت گھٹیا ہے۔ شلر نے صرف نقل پر اکتفا کیا ہے۔ مگر راسین کے پیش نظر ایک اور ہی چیز تھی۔ راسین نے عہد قدیم سے جو چیزیں مستعار لی ہیں، ان سے ہر شخص واقف ہے لیکن بہرحال اس نے [دوسروں کی چیزیں] حرف بحرف نقل نہیں کی ہیں۔ حال میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے (دیکھو Parris Universelle مورخہ ۱۵راگست ۱۹۳۹ء ص: ۴۹۴) کہ راسین کا جملہ آریان: میری بہن ...... '' اصل میں گارینے (Garnier) کی تالیف Hippolite سے مستعار لیا گیا ہے، لیکن یہ قابل ملاحظہ ہے کہ گارینے کے تین مصرعے راسین نے دو مصرعے بنا ڈالے ہیں: اس طرح دونوں کو ایک ہرگز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے، اس میں نوع اول کی اخذ و عاریت بالکل نہیں پائی جاتی، بلکہ دوسرے نوع کی مثالیں پائی جاتی ہیں، یعنی ذیلی تفصیلات کی اخذ و عاریت لیکن ان کو ایک ایسے نظام قانون میں سمویا گیا ہے جو قانون روما کے نظام سے بالکل ہی مختلف ہے اور یہ ایسے قواعد کے تحت ہوا ہے جو فقہ کی اپنی روح کے مطابق ہیں۔

۲ بعد میں تو ہمیں یہ نظر آئیگا کہ فقہ ہی نے شام کے قانون کلیسا پر ردعمل کیا ہے، دیکھو نالینو کا اطالوی مضمون رسالہ RSO ۱۹۲۳ء ص: ۵۱۲ و مابعد میں۔

۳ البتہ خیال پڑتا ہے کہ میں نے جرمن تالیف Zhisman Bizantinieches Kirechenrocht (بیزنطینی کلیسائی قانون) میں کسی ایسے قاعدے کا حوالہ پڑھا ہے جو حنفی فقہ کے قانون جبر و اکراہ کی مدھم یاد دلاتا ہے مگر یہ تالیف اس وقت میرے پیش نظر نہ ہونے سے کوئی ٹھیک حوالہ نہیں دے سکتا۔

Marfat.com

قریب تر کر دیتا ہے۔ اس لیے اس بات کی اہمیت پر زور دینا چاہیے چاہے باہمی اثراندازیاں کتنی ہی کمزور کیوں نہ رہی ہوں۔ اس طرح قانون کلیسا اور قانون اسلام کے درمیان ساخت و بنیاد کے متعلق چند مماثلتیں نمایاں کی جا سکتی ہیں لیکن اگر اس مذہبی اصل واساس سے قطع نظر کر لیا جائے تو پھر میرا تاثر یہ نہیں ہے کہ ان کی مماثلت و متوازیت زیادہ دور تک جاتی ہے۔ فقہ اور مثلاً رومن کیتھلکوں کے قانون کلیسائی میں اختلافات قابلِ لحاظ ہیں، یہ اختلافات بتاتے ہیں کہ یہ دو ایسے نظام ہیں جن میں موافقت بہت کم پائی جاتی ہے۔ ان اختلافوں میں سے چند یہ ہیں:

(۱) قانون کلیسائی کوئی غیر تغیر پذیر نظام نہیں اور کلیسا کو پوری طرح اعتراف ہے کہ چند موضوعوں کی حد تک وہ ارتقاء حاصل کر سکتا ہے اور اس نے ایسے ارتقاء کا موقع دیا بھی ہے (مثلاً نکاح کے بارے میں) مسلمانوں کے نظام کے ثبات وغیر تبدل پذیری کی سی کوئی چیز اس میں نہیں پائی جاتی۔

(۲) قانون کی تشکل پذیری کی حد تک فقہ اور قانون کلیسا میں بڑا تباین ہے۔ قانون کلیسا محض ماہرین قانون کا وضع کردہ نہیں ہے، بلکہ اس کے دوسرے ماخذ بھی ہیں۔ پوپ کے صادر کردہ اوامر اس بارے میں ایک فیصلہ کن اہمیت رکھتے ہیں، اس کے برخلاف کوئی فقہی حکم کبھی کسی حکمراں کی طرف سے مرتب اور نافذ نہیں کیا گیا ا؎ اور نہ وہ قرآن و حدیث کے سوا کسی اور ماخذ پر مبنی ہے اور کسی کشوری (سیاسی) یا مذہبی اقتدار نے

ا؎ [یہ مفروضہ بھی دلیل کا محتاج ہے، بیشک قرآن و حدیث کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام نہیں کیا جا سکتا لیکن اولاً فقہا کے مستنبطہ حلال و حرام میں اختلاف رائے سے کون واقف نہیں۔ مثلاً جھینگے شافعیوں کے ہاں حلال ہیں، حنفیوں کے ہاں حرام، کیا شراب اور جھینگا حنفیوں کے ہاں مساوی گناہ کا باعث سمجھے جائیں گے؟ استعمالی زیور پر حنفیوں کے ہاں زکوٰۃ ہے، شافعیوں کے ہاں نہیں، کیا اس عدم ادائی زکوٰۃ کی بنا پر شافعیوں کو مرتد قرار دیکر ان سے جنگ کی جائے گی؟ مباحات ہی نہیں مستحب و مکروہ کے متعلق عموم البلویٰ کے اثر سے کون واقف نہیں؟ کیا حضرت عمر نے عراق و ایران میں وہاں کا قدیم نظام مالگذاری بلا ترمیم کے عہد اسلامی میں بھی باقی نہیں رکھا اور مصر و شام میں خفیف ترمیم کی اور ان مختلف صوبوں کے قوانین اختلاف پر مستزاد معاہداتِ اطاعت کا شرطوں سے بعض وقت مزید استثناء نہیں پیدا ہو گئے؟ مترجم]

Marfat.com

بھی کبھی فقہاء کے فیصلوں کو منسوخ نہیں کیا [2]، اسی طرح اسلام میں ایسی عدالتیں بھی نہیں جن کے فیصلے [سب کے لیے] واجب التعمیل ہوں۔

(۳) اسلامی قانون اصولاً ہر مسلمان کی پوری انفرادی زندگی اور امت کی اجتماعی زندگی سب پر حاوی ہے۔ حوائج ضروری اور نماز سے لے کر جہاد اور مالیاتِ عامہ تک، نیز نکاح، بیع وشراء اور وصیت، ہر چیز اس کے احاطہ میں ہے۔ قانون کلیسا میں ایسا نہیں ہے۔ کشوری اقتدار کی موجودگی میں اس نے کبھی مطالبہ نہیں کیا کہ سارے مسائل کا اختیار سماعت مذہبی عدالتوں کو حاصل ہو، یا قانون کلیسا کے احکام ہمہ گیر اور عیسائیوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر مسئلے پر اثر انداز ہوں۔ مثال کے طور پر فقہ کا ایک اساسی مسئلہ احکام وراثت ہے۔ کلیسا اس کو ذرا بھی ناپسند نہیں کرتا کہ کسی کیتھلک کی وراثت اسلامی احکام کے مطابق (جیسا کہ مشرق قریبہ کے اکثر عیسائیوں میں رائج ہے) یا کسی اور نظام قانون کے مطابق وارثوں میں تقسیم ہو۔ اسی طرح کلیسا نے ایسے غیر تبدل پذیر مذہبی احکام بھی نہیں دیے ہیں جو کھانے کے طریقے، دانت کے خلال، اور لباس [3] وغیرہ پر مؤثر ہوں۔

(۴) آخری (فرق) یہ ہے کہ قانون کلیسائی میں، غالباً قانون روما کے اثرات کے تحت [دنیادارانہ] قانونیت، فقہ اسلامی کے مقابلے میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس میں دینیاتی اخلاق الگ چیز ہے، اور قانون کلیسائی الگ چیز۔ کوئی [مسلمان] مفتی کسی ''اخلاقی'' مسئلے کا جواب بھی اسی طرح دے گا جس طرح کسی قانونی مسئلے کا، لیکن یہ نہ کسی ماہر قانون

---

1. متعلقہ صفحہ گذشتہ: [عراق کے قدیم نظام مالگذاری کو حضرت عمرؓ نے قبول کر کے اس کو فقہ کا جز بنا دیا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ قرآن و حدیث کے خلاف نہ تھا لیکن قرآن و حدیث سے ماخوذ و مستنبط بھی نہ تھا۔ انتظامی قوانین کی اکثریت عام فقہا کی مستنبط نہیں بلکہ خلفاء، حکمرانوں کی نافذ کردہ ہے۔ مترجم]

2. [فقہاء میں اختلاف کی کمی نہیں، جو فقہ کو غیر تبدل پذیر بنانے میں مانع ہے۔ اس سلسلہ میں اندرون اسلام کے ''تصادم قوانین'' ل ' ف بھی اشارہ کیا جا سکتا ہے، یوں بھی اجماع کتنے امور پر ہے اور کیا متاخر اجماع سے سابق اجماع منسوخ نہیں ۔۔ ہو جاتا؟ مترجم]

3. [ذنار اور دربار کے لباسی مراسم کو چھوڑ بھی دیں تو خود پادریوں، راہبوں اور راہبات کے لباس کی عیسائی پابندیاں اسلام سے کہیں زیادہ ہیں۔ مترجم]

Marfat.com

کلیسائی کے لیے ضروری ہے کہ وہ دینیاتی اخلاقیات کا بھی متخصص ہو اور نہ کسی رہنمائے ضمیر کے لیے کہ وہ قانون کلیسائی کا ماہر ہو۔ دونوں کے میدان الگ الگ ہیں۔ [1]

ان تمام وجوہ سے میرے خیال میں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اسلامی اور کیتھلک نظام ہائے فکر بہت متغائر ہیں اور ان دونوں نے الگ الگ اصولوں پر ترقی پائی ہے اور ایسے نتیجوں پر پہنچے ہیں جن میں باہم مشابہت نہیں، ان دونوں نظاموں کی روح ایک نہیں ہے۔

(۶)

ہمارا موضوع بحث یہ تھا کہ فقہ کے آغاز کے معمے سے بحث کی جائے، شاید گزشتہ بحث سے یہ خیال کیا جائے کہ ہم اس سے بہت دور جا پڑے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ ہم نے قانون روما بلکہ خود قانون کلیسائی کے عام اصولوں اور فقہ کی روح میں جو تباین نمایاں کیا ہے وہ ہمیں اس کا موقع دیتا ہے کہ یہودی تالمود [2] اور فقہ کی روح میں جو عمیق مماثلت ہے اسے بہتر طور سے سمجھ سکیں۔

جب کوئی ایسا شخص تالمود [1] کھولتا ہے جسے کتب فقہ سے بھی شناسائی ہو تو وہ ان

---

[1] [فتوی اور تقوی میں اسلامی فقہ میں بھی امتیاز کیا جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ عیسائی کلیسائی قانون کے مقابلے میں فتوی کا میدان اسلام میں وسیع تر ہے۔ مترجم

[2] تالمود گویا یہودی فقہ کا نام ہے، اس کے لفظی معنی سیکھنے سکھانے کے ہیں۔ یہ وہی لفظ ہے جو عربی اور اردو کے تلمیذ اور تلمذ میں ملتا ہے، اس سے مراد مشنا اور اس کی شرح گمارہ (جمرہ) کا مجموعہ ہے۔ مشنا سے مراد دوسری صدی عیسوی کے اواخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توریت یا تعلیم کا جو روایاتی مفہوم یہودیوں کے ہاں لیا جاتا تھا اس کا مجموعہ ہے۔ اس کے چھ باب ہیں: (۱) سرائیم یعنی نماز وعبادت اور زراعت و مالگذاری یعنی زکوۃ (۲) معید یعنی یوم سبت ایام عید وصوم کے احکام (۳) نشیم یعنی قانون ازدواج (۴) نسکین یعنی قانون دیوانی و فوجداری (۵) قدیم یعنی قربانی اور مطعومات ومشروبات کا قانون (۶) طهوروت یعنی رسمی پاکی وناپاکی۔ اس تالیف کے دو اڈیشن ہیں، تالمود یروشلم تقریباً چوتھی صدی عیسوی میں لکھی گئی اور تالمود بابل جو اس سے ضخیم ہے پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں۔ مترجم بحوالہ بروکہاوس (Konversationslexikon)۔

دونوں مختلف الصنف تالیفوں کی مشابہت دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے بلکہ ابتداء میں بے اختیار یہی پکار اٹھتا ہے کہ ''یہ تو ایک ہی چیز ہیں!'' یہ تاثر کچھ بھی غلط نہیں ہے[2]۔ میرے علاوہ دوسروں نے بھی یہی محسوس کیا ہے، خود تالمود کے [فرانسیسی] مترجم شواب (Schwab) نے بھی جسے عین اسی زمانے میں منہاج الطالبین [فقہ شافعی، مولفہ نووی] سے بھی اس کے فرانسیسی ترجمے کے ذریعہ واقفیت ہوئی تھی، ان کی مماثلت محسوس کی (اس کا ذکر ترجمۂ تالمود کی جلد نہم کے دیباچہ میں کیا ہے)۔ اسی طرح یہ بے وجہ نہیں کہ [ہالینڈ کے] بڑے مستشرق، اسنوک ہورخرونیے نے جب کبھی فقہاء کا ذکر کیا تو ان کو ''مسلمان ربیوں'' (de mohammadan nsche Rabbijnen) کے نام سے یاد کیا ہے جیسا کہ اس کے مجموعۂ مقالات (Verspveide Gschriften) میں نظر آتا ہے۔

ان کی ذیلی تفصیلات میں پائی جانے والی مماثلتوں سے قطع نظر باہمی مماثلت کے عام نکات حسب ذیل ہیں:

(الف) تالمود اور فقہ دونوں کا دو ایسے احکام دہندہ مذہبی نظاموں سے سابقہ ہے جو بوقتِ واحد عبادت اور قانون دونوں پر حاوی ہیں اور جوامتِ متعلقہ کے لیے زندگی بسر کرنے کا ایک مکمل طرزِ عمل مہیا کرتے ہیں۔

(ب) دونوں صورتوں میں اساس ایک ہی ہے، یعنی وحی الٰہی، دونوں کا پورا ڈھانچہ ایسے ماہرانِ قانون کی کوششوں سے کھڑا ہوا ہے جن کے فرائض منصبی اور جن کا اس کام میں حصہ ہر دو مذہبوں میں مشابہ ہے۔ چنانچہ اسلام اور یہودیت کسی میں بھی نہ پجاری پائے جاتے ہیں نہ خالص دنیادارانہ قانون ساز افسر، اور نہ ایسی عدالت ہائے بالا جن کے فیصلے (عدالتِ مرافعہ کی طرح ماتحت

---

1. میں نے صرف تالمود یروشلم کا حوالہ دیا ہے جس کا ترجمہ شواب نے گیارہ جلدوں (پاریس ۱۸۷۱ء و مابعد) میں کیا ہے۔ گو یہ صحیح ہے کہ اس کی جلد اول میں تالمود بابل کی کتاب برکوت (Berkoth) شامل ہے۔

2. جیسا کہ میرے رفیق کار پروفیسر برون شویگ (Brunschwig) نے مجھے توجہ دلائی، یہ امر اس بنا پر اور بھی حیرتناک ہے کہ اگر توریت اور قرآن کا سرسری مقابلہ کیا جائے تو مماثل متاثر نہیں ہوتا۔

Marfat.com

عدالتوں کے لیے) واجب التعمیل ہوں۔

(ج) دونوں (تالمود اور فقہ) کے ماہرانِ قانون کی روح عمل ایک ہی ہے یعنی موشگافی کا رجحان۔ اس سلسلے میں اگر اسلامیات کا متعلم تالمود [۱] کی ورق گردانی کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ایک مانوس سرزمین میں پاتا ہے۔ وہ اسے سکون و اطمینان کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ اس کے برخلاف قانون

---

[۱] کسی کدوکاوش کے بغیر تالمود کی یہ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں: عورت کے نقائص میں (ج:۸ ص:۱۰۰) ''کھال پر مسہ چاہے بغیر بال کے ہو'' شامل کیا گیا ہے (فتح القریب میں جانوروں سے مقاربت [کی حرمت] کا ذکر ہے، چاہے وہ مچھلی ہی کیوں نہ ہو۔'' یہ بھی وہی طرز استدلال ہے)۔ ''اگر طلاق نامہ کسی بچے کے سپرد کیا جائے اور وہ اسے متعلقہ عورت کے حوالے کرنے سے قبل بالغ یا گونگا گویا، یا اندھا پیام رساں بینا یا مجنون عاقل ہو جائے یا کافر ایمان لے آئے تو بھی طلاق نامہ درست ہوگا، لیکن اگر طلاق نامہ کسی بھلے چنگے گویا شخص کے سپرد کیا گیا تھا جو گونگا بہرا ہو جائے اور پھر بعد میں گویائی بحال ہوئی ہو یا کسی بینا شخص کے سپرد کیا گیا تھا جو اندھا ہو گیا اور پھر بعد میں اس کی بینائی بحال ہوئی ہو، یا کسی عاقل کے سپرد کیا گیا جو مجنون ہو گیا پھر بعد میں اس کی عقل بحال ہوئی، تو ایسا طلاق نامہ درست رہتا ہے'' (ج:۸ ص:۲۷۲) تالمود کی یہ عبارت پڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ وہ ہو بہو فقہ کی کوئی کتاب ہے۔ یہی حال عبارت ہائے ذیل کا ہے: ''اگر شوہر یہ کہے کہ اگر وہ موجودہ بیماری سے مر جائے تو اس کی بیوی کو طلاق ہے پھر اس بیمار کو کفن پہنا کر کسی بڑے پتھر کے نیچے رکھ [کر کچل] دیا جائے، یا اسے سانپ ڈس لے اور اس طرح اس کی موت واقع ہو تو طلاق نامہ بے اثر ہوگا کیونکہ موت اس پہلی [طلاق نامہ بھیجنے کے وقت] بیماری سے نہیں واقع ہوئی لیکن اگر وہ یہ کہے کہ وہ موجودہ بیماری سے چنگا نہ ہو تو طلاق سمجھی جائے پھر اسے کفن پہنا کر کسی بڑے پتھر کے نیچے رکھ دیا جائے یا اسے سانپ ڈس لے اور وہ مر جائے تو طلاق نامہ درست ہے کیونکہ وہ اپنے بستر مرض سے چنگا ہو کر اٹھا ہی نہیں'' (ج:۹ ص:۵۲) ''اگر کوئی شخص اپنی بیوی کی طرف سے جو اس کے گھر میں یا اپنے صحن میں تھی طلاق نامہ پھینکے تو طلاق مکمل ہو جاتی ہے لیکن اگر وہ اس کے گھر یا اپنے صحن میں بیوی کی طرف طلاق نامہ پھینکے خواہ اس وقت وہ بیوی کے ساتھ ایک ہی بستر میں کیوں نہ ہو تو یہ مؤثر طلاق نہ ہوگی، البتہ اگر وہ طلاق نامہ بیوی کی انگیا یا اس کی سوئی دھاگے کی پٹاری میں پھینک دے تو طلاق ہو جائے گی'' (ج:۹ ص:۵۸) اگر بیوی مکان کی چھت پر ہو اور شوہر وہاں طلاق نامہ پھینکے تو جوں ہی طلاق نامہ چھت

(☆)

Marfat.com

روما یا قانون کلیسائی کا کوئی ماہر اسے پڑھتا ہے تو ناگواری اور پریشانی محسوس کرتا ہے۔

غرض دوسرے نظاموں کے برعکس ہمیں یہاں دو ایسے نظاموں میں ایک عمیق ذہنی مماثلت نظر آتی ہے جن میں سے ایک اسی طرح دوسرے پر اثر انداز ہوسکتا ہے جس طرح قانون روما یا قانون کلیسائی۔ اس کو رد کرنا مشکل نظر آتا ہے کہ فقہ میں اسی روح کا بڑا اثر نظر آتا ہے جو تالمود میں جاری وساری ہے اور جو ہمیں دوسرے نظام ہائے قانون میں نظر نہیں آتی۔

اس کے علاوہ مادی اخذ و عاریت کے سلسلے میں لوگوں نے اس کا ثبوت پیش کیا ہے کہ تالمود نے فقہ پر اثرات ڈالے ہیں۔ [1]

علاوہ برآں یہی وہ پہلو ہے جس کے زیر بحث اثر کا معین مسائل کے سلسلے میں مطالعہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ متووخ [2] (Mittwoch) نے نماز کے متعلق، وین زنک [3]

(☆) کی فضا میں پہنچے گا، خواہ وہ چھت پر نہ پڑے تو طلاق ہو جائے گی۔ اگر شوہر اوپر ہو اور بیوی نیچے اور شوہر طلاق نامہ اوپر سے پھینکے تو جیسے ہی وہ چھت کے حیز سے جدا ہوگا طلاق واقع ہو جائیگی چاہے [نیچے پہنچنے سے قبل] وہ پانی سے دھل یا آگ سے جل ہی کیوں نہ جائے'' (ج:۹ ص:۶۴) اس طرح جلدوں کی جلدیں نقل کی جا سکتی ہیں مگر موجودہ مقالہ اسلامیات کے معلموں سے متعلق ہے، اس لیے فقہ کی کتابوں سے اسکے مماثل مثالوں کی نقل غیر ضروری ہے۔

[1] میں قرآن کے بعد کے زمانے کے اثرات کا ذکر کر رہا ہوں، ممکن ہے قرآن میں بھی اس طرح کے کچھ نقوش ہوں، مثلاً فجر کے سلسلے میں خیط ابیض و خیط اسود (سفید اور سیاہ ڈوریوں) میں امتیاز کر سکنے کا مشہور مسئلہ جو قرآن میں بیان ہوا ہے وہ ہمیں تالمود کی کتاب برکوت (Berakoth) (ج:۱ ص:۱۳) کی یاد دلاتا ہے جس میں لکھا ہے ''صبح صادق اس لمحے سے شمار کی جائے جبکہ نیلے کو سفید سے -- یا ربی ایلی عازر (Eliazer) کے مطابق نیلے کو سبز سے (جو کہ زیادہ دشوار ہے) -- امتیاز کیا جا سکے۔''

[2] برلین اکاڈیمی کی روئداد Sitzungsberichte Prtass Akid-d-Wissenschaften

[3] اور جرمن رسالہ ''دیر اسلام'' (Der Islam) بابت ۱۹۱۰ء و ۱۹۱۱ء میں اول الذکر میں (☆)

Wensinck نے طہارت کے متعلق بیالوبلوسکی ا (Bialoblocki) نے نکاح اور امور عائلہ (خاندان) کے متعلقہ، لامنس ۲ (Lammens) نے تصویروں کے متعلق اور وایدہ ۳ (Vajda) نے مختلف چیزوں کے متعلق اس مسئلے کے مطالعے میں حصہ لیا ہے۔

بے شبہہ یہ بات ممکن ہو گی کہ اس تلاش کو مزید وسعت دیجائے، اس موضوع پر تالمود کے سرسری مطالعے میں ذیل کی چیزوں پر میری نظر پڑی ہے اور بے شبہہ ان میں مزید اضافہ ہو سکے گا۔

(۱) اگر کوئی شخص راستہ چلتے روٹی وغیرہ غذا کے ٹکڑوں پر سے گزرے تو انہیں ایک طرف ہٹا دے اور روندنے سے بچائے (ج:۲ص:۱۶۰) اس سے مسلمانوں

(☆) ص:۱۰۱ تا ۱۰۲ پر ایک مختصر رسالہ ہے ''استنجاء یا استطار کے متعلق شرعی احکام کا ماخذ'' اس میں بتایا ہے کہ جب کھلے میدان یا صحرا میں استنجا کیا جائے تو قبلے کی طرف منہ اور پیٹھ نہ کی جائے۔ اس کے مماثل یہودیوں کو یروشلم کے متعلق یہ حکم ہے (کتاب برکوت ۶۱/الف) کہ بیٹھ جانے سے قبل ستر کا کپڑا نہ ہٹائے اور سیدھے ہاتھ سے استنجا کی ممانعت کے مماثل احکام برکوت (۶۲/ب) میں ہیں۔ استنجا کی جگہ ''اعوذ باللہ'' یا ''الخبث والخبائث'' پڑھنے کے بجائے برکوت (۶۰/ب) میں فرشتوں سے حفاظت کی درخواست کی تعلیم دی گئی ہے۔ آخرالذکر جلد میں ص ۲۸۶ تا ۲۹۲ پر لیشنسکی (Leszensky) کی جرمن کتاب ''ملک عرب میں یہودی''، مطبوعہ برلن ۱۹۰۳ء کی تنقید ہے اور ضمناً یہ دعویٰ کر دیا گیا ہے کہ اسلام اصل میں یہودیت اور عیسائیت سے ماخوذ ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں پیش کیا گیا ہے۔ مترجم

ا Materien Zum islam ... Eherecht, etc. (یعنی ''اسلامی قانون وراثت وغیرہ ... کے متعلق مواد) نامی کتاب بہت فرسودہ اور سطحی ہے مجھے تو اس میں خود تالمود کے متعلق ایک غلطی نظر آئی۔ مزید برآں مولف مسلسل ان احکام کو ساری فقہ کی طرف منسوب کرتا چلا جاتا ہے جو محض کسی ایک مذہب فقہ کی خصوصیت ہیں۔

۲ رسالہ ژورنال آزیاتیک ستمبر-اکتوبر ۱۹۱۵ء (پاریس) Journal Asialique

۳ رسالہ ژورنال آزیاتیک (پاریس ۱۹۳۷ء، ہوروویتس (J. Herovitz) (رسالہ دیر اسلام ۱۹۱۸ء) کے مطابق اسناد حدیث اصل میں یہودی چیز ہے مگر پھر وہی کہتا ہے (۴۷) کہ اس کا امکان ہے کہ اس کے برعکس اسلام ہی کا [اس بارے میں] یہودیت پر اثر پڑا ہو (رسالہ مذکور ص ۳۹ تا ۴۷) اس جرمن مقالے کا عنوان ہے ''اسناد روایت کی قدامت اور اصلیت'' مترجم۔

Marfat.com

کی عادت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ لے

(۲) "یوم کفارہ (Kippour) کا روزہ رکھنے پر بچوں کو مجبور نہ کیا جائے، بلکہ روزے کے وجوب کی عمر کو پہنچنے سے ایک یا دو برس پہلے سے رفتہ رفتہ اس کو عادی بنایا جائے، تاکہ وہ مذہبی احکام کی تعمیل کے عادی ہو سکیں۔ (ج ۵ ص: ۲۵۰)۔ اس سے نہ صرف روزہ رکھانے میں مسلمانوں کی عادت یاد آتی ہے، بلکہ نماز کا عادی بنانے کے متعلق [آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے] صریح احکام بھی۔

(۳) تالمود (ج ۵ ص ۱۲۱) اور دیگر مقامات میں نیم آزاد غلام کا ذکر ملتا ہے۔ یہ خصوصیت فقہ اور تالمود میں مشترک ہے۔

(۴) تالمود (ج ۹ ص ۵۴ و مابعد) میں طلاق بالمعاوضہ کا ذکر ہے، جو خلع کی یاد دلاتا ہے۔

(۵) جو چیزیں پڑی ہوئی پائی جائیں (لقطہ) ان کے متعلق تالمود (ج ۱۰ ص ۸۵ و مابعد) کا نظریہ اسلامی قانون کے نظریے سے متعدد مماثلتیں رکھتا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ ہرجانہ اور ضمان (ج ۱۰ ص ۱ و مابعد) میں بھی ایسا ہی ہے۔

(۶) قاضی اور گواہ بننے کی صلاحیت ان لوگوں سے سلب ہو جاتی ہے (ج ۱ ص ۲۵۵) جو نرد کھیلتے ہیں، جو سود پر قرض دیتے ہیں اور جو شرط بد کر کبوتروں کو اڑاتے ہیں، اس طرح کی ممانعتوں کی فہرست فقہ میں بھی ملتی ہے۔ ٢

مگر ہمیں یہ بات چھپانی نہیں چاہیے کہ ان مماثلتوں کی فہرست میں گو کہ مزید اضافہ ہو سکتا ہے پھر بھی حقیر و قلیل ہی رہتی ہے اور اس کی توقع نہ رکھنی چاہیے کہ آئندہ کوئی سنسنی خیز دریافت عمل میں آسکے گی کیونکہ دونوں طرف کی معلومات اچھی طرح

لے عملدرآمد و رواج کے سلسلے میں اس کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے کہ (تالمود ج ۱۰ ص ۹۹) استاد کی عزت باپ سے زیادہ کرنی چاہیے۔

٢ اسی طرح عورت کے نفقے کے سلسلے میں اس کے حقوق کی فہرست (تالمود ج ۸ ص ۸۰) سے اس اسلامی فقہ کے احکام کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، جہاں تک اسلوب بیان کا تعلق ہے، رشتہ داریوں کی چند فہرستیں (مثلاً ج ۷ ص ۱) بالکل اسی طرح دی گئی ہیں جیسی فقہ میں ہیں۔

Marfat.com

معلوم ہیں اور اس سلسلے میں دوبارہ وہ بات دہرائی جاسکتی ہے جو ہم نے اوپر قانون روما کے سلسلے میں بیان کی ہے کہ اتفاقات اور صورت حال کی معروضی یکسانیت کا بھی اس میں حصہ ہوگا کہ یہ مماثلتیں پیدا ہوں اور اسی تناسب سے اخذ و عاریت کی تعداد گھٹ جائے۔

یہ وہ پہلی، خالص اور منفی وجہ ہے جس کے باعث یہ خیال رد کر دینا پڑتا ہے کہ فقہ اصل میں تالمود ہی ہے ا۔ ایک دوسری اثباتی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں مجموعہ ہائے احکام میں نہایت عمیق اختلافات پائے جاتے ہیں جس کی بنا پر یہ کسی طرح نہیں خیال کیا جاسکتا کہ جو چیز زمانے میں موخر ہے وہ خواہ مخواہ قدیم چیز کی نقل ہی ہے۔ یہ اختلاف تین قسم کے ہیں، جن کی چند مثالیں دینے پر ہم اکتفا کریں گے۔

(۱) ادارات کی تشکل پذیری

(۲) خودنفسِ اداارات

(۳) ان اداارات کا طریقۂ اظہار

(۱) اگر چہ ان دونوں (یہودی اور اسلامی قانون کی) صورتوں میں وہ حصہ جو ماہران قانون (ربیوں اور فقیہوں) نے لیا ہے، اساسی اہمیت رکھتا ہے پھر بھی اس تشکیل کا نظریہ باہم مختلف ہے۔ چنانچہ یہودیوں کے ہاں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو اصول فقہ کی یاد دلائے اور ایسی کوئی چیز تو قطعاً نہیں ہے جو احکام میں حدیث جیسا قابل لحاظ حصہ لینے والے امر کے مماثل ہو۔ مسلمان فقہ کے چار ماخذ قرار دیتے ہیں اور یہودی صرف دو تسلیم کرتے ہیں: ایک، کتاب مقدس، دوسرے فقہاء کا اجتہاد اور یہ دونوں ماخذ ہائے قانون یہودیوں کے ہاں کسی نظریے کا موضوع نہیں بنے، یہ چیز اسلامی قانون ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ دوسرے اگر اصول فقہ کا وجود کوئی فضیلت و برتری ۲ ہے تو فقہ کی ایک

ا یہ عمانویل دائچ E. Deutsch کی رائے کا خلاصہ ہے، جو ہیوز (Hughes) کی ڈکشنری آف اسلام میں مقالہ تالمود کے تحت نقل ہوئی ہے۔

۲ [قوانین و احکام تو دنیا کی ہر قوم میں ملتے ہیں لیکن ان سے الگ محض نفس قانون یا علم قانون پر مسلمانوں سے پہلے دنیا کی کسی قوم نے توجہ نہیں کی، نہ یونانیوں نے، نہ رومیوں نے، نہ چینیوں نے، نہ مصریوں نے، نہ بابلیوں نے، نہ ہندوؤں نے۔ مترجم]

Marfat.com

اور برتری یہ ہے کہ اس کی تشکیل حیرت انگیز تیزی سے عمل میں آئی۔ میں نے اوپر بیان کیا ہے۔ وہ درحقیقت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ڈیڑھ یا زیادہ سے زیادہ دوصدی کے عرصے میں تقریباً مکمل طور پر مرتب ہو گئی، جبکہ تالمود کو مکمل ہونے میں بیت المقدس کی تباہی کے بعد تقریباً چار سو برس لگے اور اس کا ابتدائی تحریری آغاز تو اس سے بھی کئی صدی قبل ہو چکا تھا۔

(۲) ان واقعات کے جواب میں یہ کہنا کافی نہ ہوگا کہ فقہ نے تالمود سے اخذ کیا ہوگا کیونکہ تالمود سے مخصوص اداروں میں سے کوئی بھی فقہ میں نہیں پایا جاتا۔ مسلمان اس پر مجبور تھے کہ اپنے سارے ادارے خود ہی وضع کریں اور اگر کہیں فقہ میں کسی قدیم نظام ہائے قانون سے کوئی حقیر اخذ و عاریت نظر آتی ہے تو یہ اخذ و عاریت ایسی ہے جو ان اداروں کو ان کے ماخذ کی مخصوص ہیئت کبھی عطا نہیں کرتی۔

مثال کے طور پر یہودی عبادات میں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آتی جو اسلام نے نقل کی ہو۔ صومِ رمضان اور یوم کفارہ (Kippour) کے یہودی روزے میں نمایاں اختلافات ہیں اور ان دونوں میں ذرا بھی مماثلت نہیں۔[۱] میدان قانون یعنی معاملات کا بھی یہی حال ہے۔ نظامِ وراثت دونوں میں کلیۃً مختلف ہے۔ ادارۂ نکاح میں ان دونوں کی مشابہت اس سے زیادہ نہیں جو کسی دوسرے نظام قانون سے ملتی ہے۔ بیوہ بھاوج سے دیور کا جبری نکاح کرنا Levirath اور Halitza یعنی دیور کے انکار پر بیوہ کا جوتا نکالنا[۲] تالمود کا مخصوص ادارہ ہے جو اسلامی قانون میں بالکل نہیں پایا جاتا۔ یہودیوں کے ہاں طلاق نامے کا جو نظریہ ہے وہ مسلمانوں کے ہاں بالکل نہیں پایا جاتا اور اس بارہ میں مسلمانوں کا نظام طلاق ذرا بھی تالمود کا مرہون منت نہیں، وہ عربی خالص اسلامی اور

---

۱ اسی طرح فقہ میں ایسی کوئی چیز نہیں جو نذر حدا (Oblation) اور کاہن یعنی پجاری سے مشابہ ہو اور جن سے تالمود وغیرہ میں ہر گھڑی سابقہ ہے۔

۲ توریت کی کتاب تثنیہ باب ۲۶ آیات ۵ تا ۱۰ کی طرف اشارہ ہے کہ اگر دیور اپنی بیوہ بھاوج کے ساتھ نکاح سے انکار کرے تو بیوہ جوتا اتارے اور اپنی اس بے حرمتی پر دیور کے منہ پر تھوکے۔ مترجم)

Marfat.com

اپنی آپ نظیر (Suis generis) ادارہ ہے اور اس ادارے میں اسلام خلوت صحیحہ کو قانونی اہمیت دیتا ہے، یہودیوں کے ہاں ایسی کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح جرم زنا کا ذکر (جو بوقت واحد قانونِ عائلہ، قانونِ حدود وتعزیرات اور اخلاق سب ہی سے تعلق رکھتا ہے) جس شدت و کثرت سے مسلمان فقہاء کرتے ہیں، تالمودیوں کے ہاں بالکل نہیں پایا جاتا، اس بحث کو اور بھی طول دیا جا سکتا ہے مگر اسکی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ اس طرح اسلام اور یہودیت میں مختلف مولفوں کی نمایاں کردہ اخذ و عاریتیں نہ صرف تعداد میں قلیل ہیں بلکہ یہ ثابت کرنا آسان ہے کہ ان (دونوں کے) اداروں میں مماثلت پائی ہی نہیں جاتی۔

(۳) ایک تیسرا اختلاف جو ظاہری ہیئت کا ہے جو اس کا ثبوت ہے کہ تالمود کا اثر فقہ پر بس دور ہی سے پڑا ہوگا، چنانچہ دونوں کے مجموعہ ہائے احکام جس طریقہ پر پیش کیے گئے ہیں، ان میں یکسانیت نہیں ہے اور اس بارے میں بھی فضیلت اس کو حاصل ہے جو تیز تر مرتب ہوا۔ (یعنی فقہ)۔

یقیناً مجھے اس بے ترتیبی کی شکایت ہے جو فقہ کی کتابوں میں پائی جاتی ہے پھر بھی اگر کوئی فقہ کے دور آغاز کی کتابوں مثلاً المدونہ یا کتاب الام [1] کو تالمود سے مقابلہ کرے تو ان کی وضاحت بیان اور خوبی ترتیب پر تعجب ہوگا اور دونوں کا فرق آنکھوں کے سامنے نمایاں ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ فقہ کی بے ترتیب سے بے ترتیب کتاب بھی اس بارے میں تالمود سے بہتر ہی ہوگی۔

پروفیسر برون شویگ (Brunschwing) نے بہت صحیح میری توجہ منعطف کرائی کہ اس فرق کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ تالمود میں بحث و استدلال کے مختلف مدارج بیان ہوتے ہیں اور فقہ میں حکم یا احکام، بلکہ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ اگرچہ دونوں مجموعہ ہائے احکام میں قانون، اخلاق اور مذہب گڈمڈ ہیں، جن کے باعث ان میں مشابہت نظر آتی ہے، لیکن یہودی مجموعے میں ہگادہ (Haggada) بھی شامل ہے جس سے مراد زبان زد قصے (Folklore) روایات، متفرق مشاہدات و ملاحظات، اور چھوٹی کہانیوں کا مجموعہ ہے

---

[1] امام ابو یوسف کی کتاب الخراج اس سے مستثنیٰ ہے۔ امام مالک کی موطا بھی خالص حد تک اچھی ترتیب کی حامل ہے۔

Marfat.com

جن کا برائے نام بھی کتب فقہ میں ذکر نہیں ملتا ا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں نظاموں میں سے ایک کو دوسرے کی محض توسیع نہیں خیال کیا جا سکتا، نیز جدید یورپی نقطۂ نظر سے ایک اختلاف کی بنا پر ضمناً جدید تر (اسلامی نظام) کی قدیم تر (یہودی نظام) پر فضیلت بھی ظاہر ہوتی ہے۔

(۷)

اب اس بحث کے نتیجے پیش کیے جاتے ہیں:

جہاں تک رومی، کلیسائی اور پارسی قانونوں کے اثرات کا تعلق ہے، بہت آسان بات ہے۔ میرے نزدیک اصولاً اگر یہ مجموعہ ہائے احکام قطعاً موجود نہ بھی ہوتے تو بھی مادی طور پر فقہ وہی رہتی جو آج ہے۔

لیکن تالمود کے متعلق بھی یہی رائے قرار دینا اتنا آسان نہیں ہے، بلکہ بعض حیثیتوں سے لامنس کی رائے کو صحیح قرار دینے پر مائل ہونا پڑتا ہے، مثلاً جب وہ مدینے کے یہودیوں کے متعلق کہتا ہے ۲۔ کہ: ''ہم خیال کرتے ہیں کہ ان بدنصیبوں کا ایک قابل لحاظ حصہ مسلمانوں کی صف میں چلا گیا اور ان مرتدوں (کذا) اور ان کی اولاد نے اسلامی قانون کی تشکیل میں حصہ لیا جس میں تالمود سے استفادہ t (Inspiration) قابل انکار نظر آتا ہے ۳۔ پھر بھی جب اس کو متعین طور پر بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس

ا۔ بلا کسی کدوکاوش کے جمع کی ہوئی چند مثالیں یہ ہیں: (ج ۵ ص ۲۵۳) دیوانے کتے کی علامتیں (ج ۷ ص ۱۷۴) ایک ربی کا لطیفہ جو خوانچہ فروش کا بھیس بدل کر اپنے ایک محبوس رفیق سے ملنے جاتا ہے (ج ۵ ص ۲۷۶) ایک اغوا شدہ عورت کا اچھا جواب (ج ۱۱ ص ۱۸۳) شہر روما کی تعمیر کا نہایت افسانہ خیز تذکرہ، وغیرہ۔ جہاں تک تالمود کے اسلوب کی بے ترتیبی کا تعلق ہے، خود اس کا ترجمہ اپنے دیباچوں میں لکھتا ہے کہ اس کے ابواب میں منطقی تسلسل بالکل نہیں پایا جاتا۔ اس لیے اسکی مثالیں دینے میں کوئی فائدہ نہیں۔ خود مشنا (یعنی یہودی فقہا کی شرح) میں تو حد سے زیادہ بے ترتیبی ہے مثلاً ج ۸ ص ۲۸۲ کتاب الطلاق کے بعد یک بیک اس قرض کا ذکر آتا ہے جو کسی کاہن یا کسی لیوی (مذہبی عہدیداروں) کو دیا جائے۔

۲۔ لامنس Lammens کا مضمون پاریس کے ژورنال آزیاتیک ستمبر و اکتوبر 1915، ص ۲۷۵ تا ۲۷۶۔

۳۔ یہ ادعا خلاف حقیقت ہے، نو مسلم یہودیوں کی تعداد خاص کر مدینہ میں بہت ہی کم ہے (مترجم)

میں ناکامی ہوتی ہے اور عام تاثرات کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا، کیونکہ نہ صرف اس کی تاریخی شہادتیں مفقود ہیں کہ یہودی اثرات اس طرح سرایت کر سکے ہوں بلکہ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، خود مادی حصہ یعنی مماثلات کی معین صورتیں بھی قلیل بلکہ اقل قلیل ہیں۔ میرے خیال میں یہ معمہ لاینحل ہی رہتا ہے اور ہم دو متبادل صورتوں میں سے کبھی ایک کی اور کبھی دوسری کی طرف بے نتیجہ طور پر مائل ہوتے رہتے ہیں، ان میں سے ایک کو گوئٹے کی نظم ''پرومیتیا (Promotnea) کی یہ بیت خوب واضح کرتی ہے۔

کیا تو نے ہی یہ سب کچھ انجام نہیں دیا — Hast due nicht alles selbst vollendet

اے پیارے دل رعنا؟ — Du heilig gluhend Heraz?

[یعنی مسلمانوں نے سب کچھ تنہا خود ہی انجام دیا۔ مترجم] یہ تصور عمرانیاتی نقطۂ نظر سے کچھ زیادہ صحیح نہیں ہوسکتا، گو یہ حقیقت ہے کہ اس کے خلاف بھی ہمارے پاس کوئی براہ راست شہادت موجود نہیں ہے، اس کے علاوہ یہ بھی بالکل سچ ہے کہ گوئٹے کے ''فاوسٹ'' ا کے برخلاف، فقہ اس پر اکتفا نہیں کرتی کہ تالمود ہی کی کہی ہوئی بات کو ذرا الفاظ بدل کر دہرا دے۔ nur mit ein Bischen andern Worten جن میں فرق اس سے زیادہ نہیں جتنا -- (فاوسٹ کی ہیروئین) مارگریٹ خفا نہ ہو -- مارگریٹ کے عاشق اور اس کی نصیحت کرنے والے پادری کے الفاظ میں!

غرض میں عجب گومگو کی حالت میں ہوں اور بعض وقت اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ بڑی حد تک ٹھیک نہ ہوگا کہ فقہ کو ایک ایسی چیز سمجھا جائے جو خالص اسلامی الاصل اور مسلمانوں کی ساختہ پرداختہ ہو جسے اس کے اولین مفکرین نے قرآن اور پرانے عرب ادارات (رواجات) ۲ کو چھوڑ کر بغیر (یا تقریباً بغیر) کسی بیرونی مادی امداد

(☆) اور پھر عبداللہ بن کعب الاحبار وغیرہ کا اثر تفسیر میں ہے نہ کہ فقہ میں۔ دلی تمنا کو تاریخی واقعہ قرار دینے سے حقائق بدل نہ جائیں گے۔

ا [گوئٹے کی مشہور نظم جس کا اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے، اس میں فاوسٹ اپنی روح جوانی اور مسرت کے حصول کے معاوضے میں شیطان کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ مترجم]

۲ اس بارے میں تیجیو نے بہت ہی اہم ملاحظات پیش کیے ہیں دیکھو اس کا مضمون کتاب Racilta di scritti میں [ترجمہ ماہنامۂ معارف اعظم گڈھ جنوری ۱۹۵۳ء مجھے تو نظر آتا ہے کہ ہم دونوں کے مطالعات ایک دوسرے کی اچھی خاصی تکمیل کرتے ہیں۔

Marfat.com

کے خود وضع کیا ہو؟ اس نقطۂ نظر سے وہ اسلام کا ایک نچوڑ اور ایک شاہکار ہوگا اور اس کی تخلیق اپنی آپ نظیر اور بڑی غیر معمولی چیز ہوگی۔

میرے ان جملوں سے وہ جذبہ منسوب نہ کیا جانا چاہیے جس کے تحت ہر متخصص اپنے ہی مطالعات کی اہمیت اور دلچسپی کے بارے میں مبالغہ آرائی کرتا ہے۔ وہ جذبہ یہاں بالکل نہیں ہے۔ اولاً میں نے ان کا ذکر بہت ہی غیر متیقن طور پر محض ایک محتمل چیز کی حیثیت سے کیا ہے [1]، دوسرے میرا تخصص فقہ میں بہت ہی معمولی اور دوسری چیزوں سے بہت کم ہے اور آخری یہ کہ میں اس کا قائل ہوں کہ (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں) اسلام کی تکمیل میں یہودیت کا بہت بڑا اثر رہا [2] اور بہ حیثیت مجموعی مجھے یہ بداہتہً نظر آتا ہے کہ ترقی یافتہ یہودیت اور ترقی یافتہ اسلام میں جو باہمی مشابہتیں ہیں وہ ہر نقطۂ نظر سے ان سے زیادہ حیرت ناک ہیں جتنی [اسلام اور] عیسائیت میں ہیں۔ بعض نقطہ ہائے نظر سے تو یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ اسلام سے مراد وہ یہودیت ہے جس میں عالمگیری رجحان ہو۔

لیکن جو کچھ بھی کہا گیا، اس سے قطع نظر، اور اگر عربوں اور یہودیوں کی نسلی مماثلت سے استدلال نہ کیا جائے، میں خود عمرانیات میں نسل کے حیاتیاتی اثر کا قائل نہیں، یا بہت کم قائل ہوں۔ حاصل بحث یہ ہے کہ ڈیڑھ صدی سے کچھ ہی مدت میں مسلمانوں نے قرآن اور ماقبل اسلامی ادارات سے، کم و بیش تنہا ایک اثر انداز مجموعۂ قوانین مرتب کر لیا، ممکن ہے کہ تالمود کا اثر اس کی روح پر ہوا ہو لیکن فقہا نے جو کچھ انجام دیا وہ اپنی امتیازی خصوصیتیں رکھتا ہے اور بہ حیثیت مجموعی میری نظر میں ان کی محنت کا ثمرہ یہودی ماہرین قانون سے کہیں برتر نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس طرح فقہ کو اسلام کی ایک ایسی تخلیق قرار دینا چاہیے جو تقریباً اسی کی ساختہ پرداختہ ہے۔

(معارف اعظم گڑھ - مارچ ۱۹۵۸ء و اپریل ۱۹۵۸ء)

---

[1] یہ محسوس ہوگا کہ دلیل انی یا اولیاتی نقطۂ نظر سے a priori تو میری یہ خواہش تھی کہ فقہ اور تالمود میں اس سے بہت زیادہ قریبی رشتہ ثابت کر سکوں مگر یہ واقعہ کہ مجھے اس میں مایوسی ہوئی، شاید میری بیان کردہ باتوں کی قدر و قیمت کا ایک ثبوت ہوا۔

[2] مؤلف نے اس یقین کے وجوہ نہیں بیان کیے ہیں، شاید نارے کی انگریزی کتاب "اسلام کی یہودی اساس" (Torley. Jewish Foundationof Islam) کی طرف اشارہ ہو جس میں بڑی مضحکہ خیز لن ترانیاں کی گئی ہیں۔ مترجم۔

Marfat.com

اسلام اور علم ہیئت کے نئے مسائل

جون ۱۹۶۷ء میں رصدگاہ پاریس کے قیام پر تین صدیاں گزریں، اس تقریب میں وہاں ایک نمائش ہوئی۔ اس علم سے اپنی ناواقفیت کے باوجود اس کی روز افزوں اہمیت مجھے وہاں کشاں کشاں لے گئی۔

نمائش میں پرانا سامان بھی تھا اور جدید ترین آلات بھی مثلاً چاند ہی نہیں دیگر ستاروں کی سطح کے کس طرح فوٹو لیے جاتے اور ان کی مٹی کی تحلیل کی جاتی ہے (ان کی روشنی کے رنگ کی مدد سے) اور وہاں کے پہاڑ اور غار ناپے اور گنے جاتے ہیں۔

نمائش میں ایک عربی اصطرلاب (جس پر کوفی خط کی عبارت سے گمان ہوتا ہے کہ اندلس سے آیا ہوگا) اور علم ہیئت کا ایک فارسی مخطوطہ بھی رکھے گئے تھے۔ جہالت تو نہ ہوگی، تعصب ہی ہوگا کہ اور چیزوں کے برخلاف ان دونوں پر توضیحی چٹیاں نہ تھیں، مگر بہر حال فرنگی سامان کو چھوڑ کر اگر کسی اچھی چیز نے وہاں جگہ پائی تو وہ اسلامی چیزیں ہی تھیں۔

مجھے معلوم نہیں سب سے پہلی اسلامی رصدگاہ کب اور کہاں کھلی تھی۔ کہتے ہیں کہ ابن رشد نے اندلس میں دوربین کے بغیر ہی سورج میں دھبوں کا پایا جانا معلوم کیا تھا۔ بیسیوں ستاروں کے نام آج بھی فرنگی زبانوں میں عربی ہی میں ہیں۔ برطانیہ سے رصدگاہ گرینچ کا ملاحوں کے لیے جو سالنامہ شائع ہوتا ہے اس کا آدھا نام آج بھی عربی میں ہوتا ہے: نائیکل المناک (المناخ عربی لفظ ہے) اس کا ایک نسخہ اتفاق سے میز پر

Marfat.com

ہے اور اس میں دوران سال میں مشہور و ممتاز ستاروں کے نظر آنے کا زمانہ اور آسمان پر مقام ایک جدول میں درج ہیں۔ اس فہرست کے ستاون ناموں میں سے سینتالیس عربی میں ہیں۔ مثلاً Achernar (آخرالنہر) Aldearan (الدبران) Alphard (الفرد) Alphecca (الفکہ) Altair (الطیر) Betelgeuse (ابط الجوزاء) Diphda (ضفدع) Famalhaut (فم الحوت) Markab (مرکب) Minkar (منقار) Suhail (سہیل) Vega (نسر واقع) ____ ایسی ایک مکمل تر فہرست میں نے ابن قتیبہ کی کتاب الانواء کے ضمیمے میں شائع کی ہے ____ اور ہمارے اجداد نے اس طرح آسمان پر اپنے کام سے اپنے امٹ نام لکھ دیے تھے اور اب؟ اب چاند کی بلدیہ اپنے ہاں کی گلیوں کے نام تجویز کر رہی ہے لیکن ہیئت دانوں کی بستی میں ہمارا کوئی ہم مذہب گویا بستا ہی نہیں ہے۔

غالباً وہی چار سال میں آدمی چاند پر چڑھ جائے گا۔ ممکن ہے امریکی ہو یا روسی یا کوئی اور فرنگی ممکن ہے کچھ عرصہ بعد سیاحوں میں کوئی مسلمان بھی آ جائے۔ چاہے وہ اسلامی مملکتوں میں سے کسی کا باشندہ نہ ہو بلکہ روسی یا امریکی رعیت ہو۔ ہمارے ہیئت دانوں اور طیارہ سازوں کو اس میں حصہ لینے کی نوبت نہ بھی آئے تو ہمارے فقہا کو ایک سوال کا جواب جلد دینا ہوگا۔ چاند پر نماز کس قبلے کی طرف رخ کر کے پڑھی جائے؟ زمین کا قبلہ تو میری دانست میں وہاں کام نہیں دے سکتا اَینَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہ: (جدھر بھی مڑو ادھر خدا کا چہرہ موجود ہے) اپنی جگہ صحیح ہے لیکن توحید کے حامل مذہب میں چاند والوں کے لیے بھی کوئی نہ کوئی مرکز یا قبلہ قرار دینا پڑے گا۔ اس سوال کا جواب بعد میں بعید تر ستاروں میں پہنچیں بھی تو کام دے سکے گا۔ دو ایک سوال ہوئے، جامعہ استنبول کے طلبہ نے دریافت کیا تو میں نے عرض کیا تھا کہ چاند کے ہر ماہ روشن ہونے والے حصے کے وسط میں ایک کعبہ قمری قرار دینا، پھر اسے وہاں بنانا مناسب ہوگا۔ یہ کعبہ کم از کم کعبۂ ارضی کے محاذی تو ہو جائے گا۔

Marfat.com

ہوائی مسافروں کا وقت نماز وافطار:

ایک اور عملی مسئلہ اب ہر روز پیش آرہا ہے، زمین کے گول ہونے کے باعث آفتاب کے طلوع وغروب کا وقت ہر جگہ یکساں نہیں ہوتا، استوا پر جہاں محیط ارضی سب سے زیادہ طویل ہے۔ ہر ہزار میل پر ایک گھنٹے کا فرق ہو جاتا ہے۔ اس کے آگے قطب کی طرف جتنا بڑھیں گے، وقت کا اتنا فرق اس سے بھی کم تر مسافت پر ہونے لگتا ہے۔ کلکتہ اور لندن میں طلوع یا غروب آفتاب میں کوئی ساڑھے پانچ گھنٹے کا فرق ہے۔ ہوائی جہازوں کی تیز رفتاری کا اب یہ عالم ہے کہ یہ مسافت سات آٹھ گھنٹوں میں طے ہو جاتی ہے اور موجودہ زیر تعمیر طیارے آجائیں تو شاید تین چار گھنٹے ہی کافی ہو جائیں گے (پیرس سے استنبول کو ایک گھنٹہ کافی ہونا بتایا جارہا ہے) اس کا نتیجہ؟ فرض کیجیے کہ لندن سے سحری کر کے صبح کے سات بجے اڑیں اور سات گھنٹوں کی پرواز کے بعد لندن کے ۱۴ بجے لیکن کلکتہ کے ساڑھے انیس بجے (شام کے ساڑھے سات بجے) کلکتہ میں اتریں تو افطار کس وقت پر کیا جائے؟ لندن کے حساب سے یا کلکتہ کے حساب سے؟ اس پرواز میں غالباً سورج راستے میں طیارہ والوں کو ڈوبتا ہوا نظر آچکا ہوگا، فرض کیجیے کہ آفتاب چھ بجے ڈوبا۔ جب کہ لندنی مسافر نے مشکل سے پانچ چھ گھنٹے امساک کیا ہے۔ تو یہ روزہ بہت مختصر ہوگا، (کلکتہ پہنچنے کے بعد دوسرے دن یہاں بحث نہیں اور نہ یہ ٹالنے والا جواب کافی ہے کہ سفر میں روزہ معاف ہے) اس کے برعکس کلکتہ سے لندن جانے کے لیے صبح سات بجے اڑیں اور سات گھنٹوں کی پرواز کے بعد لندن پہنچیں تو کلکتہ میں تو ۱۴ بجیں گے لیکن لندن میں صبح کے ساڑھے آٹھ ہی بجے ہوں گے۔ اور اگر اس دن لندن میں موسم بہار کے باعث آفتاب شام کے چھ بجے ڈوبتا ہو تو مزید ساڑھے نو گھنٹے انتظار کرنا ہوگا، اور سحری اگر صبح چار بجے کی تھی تو پرواز شروع ہونے تک کے تین گھنٹے، پرواز کے سات گھنٹے اور افطار تک کے مزید ساڑھے نو گھنٹے (۳ + ۷ + ۹½، جملہ) ۱۹½ گھنٹے کا روزہ ہوگا، جو بہت زیادہ ہے۔ یہ تو آج کل پیش آرہا ہے اور وہ دن قریب ہے کہ کلکتہ سے صبح کے سات بجے اڑیں تو چھ گھنٹے کی

Marfat.com

پرواز کے بعد جس مغربی ملک میں پہنچیں گے وہاں بھی صبح ہی کے سات بجے ہوں گے، (بات یہ ہے کہ محیط ارضی چوبیس ہزار میل ہے) اس لیے خط استوا پر فی گھنٹہ ہزار میل کی مسافت سے پرواز کریں تو زمین کی گردش محوری کی رفتار اور ہماری رفتار پرواز یکساں ہونے سے مشرق سے مغرب کی طرف جانے والے کے لیے سورج اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا۔ کلکتہ اور لندن خط استوا سے دور ہیں اس لیے اس سے بھی سست تر رفتار طیارہ سے وہی نتیجہ نکلتا ہے اور اگر طیارے کی رفتار زمین کی اپنی رفتار سے تیز تر ہو جائے، جیسا کہ فوجی طیاروں میں اب ہو بھی چلا ہے۔ تو مسافر کو راستے میں آفتاب ''مشرق'' میں ڈوبتا نظر آئے گا۔ اور مثلاً کلکتہ سے صبح کے سات بجے نکلیں تو سات گھنٹوں کی پرواز کے باوجود مغربی منزل مقصود میں قبل از وقت پہنچیں گے، یعنی صبح کے مثلاً چار بجے ہوں گے اور آفتاب ابھی نکلا ہی نہ ہوگا، اور اگر مغرب سے مشرق کو جائیں تو آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا مشاہدے میں آئے گا۔ جس کا احادیث میں ذکر ہے۔ فتبارك الله احسن الخالقين، اللہ ہی سب سے بہتر خالق ہے، بابرکت وہی ہے۔ بیچارہ انسان تو ناچیز ہی رہے گا۔

گذشتہ سال ایک صاحب رمضان میں شاید ڈھاکہ سے جینوا آئے تھے، انہیں ایسا ہی ''حادثہ'' پیش آیا۔ ان کی فتوی طلبی پر کیا جواب دیں؟ منزل روانگی کے وقت کے حساب سے وہ افطار کریں یا منزل ورود کے؟ اسی طرح سیلون سے روس کو، ارجنٹائن سے کنیڈا کو پرواز کریں تو وقت کا اتنا کثیر فرق ہوتا ہے کہ آدمی دم بخود ہو جاتا ہے۔ غالباً معقول جواب یہی سمجھا جائے گا کہ دوران پرواز میں منزل روانگی کا وقت ہی نماز اور روزہ کے لیے ملحوظ رکھا جائے، مقامی وقت نہیں، یعنی نہ دوران پرواز کے جگہ جگہ بدلنے والے وقت کا، نہ منزل ورود کا، اگر ایسا نہ کریں تو اسپوٹنیک کے مسافر کو جو زمین کے گرد گھومتا ہے روزانہ آٹھ آٹھ مرتبہ سورج کو طلوع اور غروب ہوتے دیکھنے کا موقع ملتا ہے اور تین گھنٹے میں اس کے لیے چوبیس گھنٹوں کی نمازیں اور روزہ رکھنا معقول نہیں ہو سکے گا۔

Marfat.com

ہجری عیسوی تقابلی جنتریاں:

جہاں ان حال و مستقبل کی چیزوں پر توجہ کی ضرورت ہے وہیں ماضی کے تحقیقات کی نظر ثانی و تصحیح کے لیے بھی ہمیشہ تیار رہنا چاہیے، تا کہ اگر کوئی انسانی غلطی ہوئی تھی تو وہ برقرار نہ رہے بلکہ اس کی اصلاح ہو جائے۔ العصمۃ للہ، غلطی سے مبرا تو صرف خدا کی ذات ہے مثلاً ان دنوں میں ہجری سنہ کی مطابق تاریخیں عیسوی سنہ میں معلوم کرنے کے مسئلے پر کام کر رہا ہوں، یورپ میں کم از کم ساڑھے تین برسوں سے اس کام کے لیے تقابلی جنتریاں بنائی جانی شروع ہوئی ہیں۔ گذشتہ چودہ سو برس سے، جب سے کہ ہجری سنہ شروع ہوا ہے، محرم، ربیع الاول، جمادی الاولیٰ، رجب، رمضان اور ذیقعدہ ہمیشہ اور ہر سال تیس ہوتے ہیں، ذی حجہ کے سوا باقی دوسرے مہینے انتیس، اور صرف ذی حجہ بعض قواعد کے تحت کبھی تیسا ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ فرنگی ''تحقیق'' (جس میں اور تو اور خود رمضان بھی ہمیشہ تیسا ہوتا ہے) میں نے انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اسپینی، اطالوی، رومانوی اور روسی (اور ان کے ترجموں) میں پڑھی ہے اس طرح کا ایک ترجمہ اردو میں ایک پرانے رفیق پروفیسر خالدی[1] نے انجمن ترقی اردو کے لیے شائع کیا تھا، وہ اس وقت یہاں نہیں ہے کہ تحقیق کر سکوں، مگر خوف ہے کہ انہوں نے بھی وہی کیا ہوگا جیسا کہ ایک ترکی ''فاضل'' نے کیا ہے۔

اس پر روئیں یا ہنسیں؟ ان مغربی محققوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ بعض وقت مسلسل تین تین مہینے تیسے، یا تین تین مہینے انتیسے بھی ہوتے ہیں اور یہ علم ہیئت کے مسلمات میں سے ہے اور مشاہدہ بھی، رصد گاہ استانبول کے رکارڈ میں لکھا ہے کہ ابھی چند سال قبل ترکی میں ایک مرتبہ مسلسل چار مہینے تیسے ہوئے۔

بہر حال مذکورہ تقابلی جنتریوں کی غلط نویسی کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کسی پرانی اسلامی کتاب میں کسی واقعے کی تاریخ دن کی صراحت کے ساتھ ہو اور ان فرنگی ملاؤں کی

---

[1] تقویم ہجری و عیسوی۔ مرتبہ ابو النصر محمد خالدی ایم اے (عثمانیہ) دہلی ۱۹۳۹ء کراچی ۱۹۵۲ء۔ (مرتب)

Marfat.com

جنتری میں وہ دن مذکورہ نہ ہو تو اسلامی مورخ غلط بیان یا کم از کم سہل انگار قرار پاتا ہے جنتری غلط نہیں سمجھی جاتی (مثلاً میرے سامنے اس وقت کا تنوز کی ایک ایسی فرانسیسی تقابلی جنتری ہے حجۃ الوداع ۱۰ھ میں جمعہ کے دن ہوا تھا، لیکن یہ جنتری کہتی ہے کہ اس سال جمعہ کے دن ذی حجہ کی آٹھویں تھی، یا یہ کہ امام حسینؓ کی شہادت ۱۰ رمحرم ۶۱ھ کو جمعہ کے دن ہوئی۔ لیکن یہ جنتری اسے جمعہ نہیں بدھ قرار دیتی ہے۔

کیا یہ ضرورت نہیں کہ مسلمان ہیئت دان ایسی تقابلی جنتری خود بنائیں اور صحیح تر بنائیں؟

اسی مذکورہ علمی کام کے سلسلے میں محمود پاشا فلکی کی شہرہ آفاق کتاب ''نتائج الافہام'' اور اس کی فرانسیسی اصل کو بھی دیکھا۔ اس کتاب پر ''سیرۃ النبی'' میں شبلی مرحوم اور سید سلیمان ندوی مرحوم نے کافی اعتماد کیا، اور اس کی ثنا خوانی کی ہے، گذشتہ صدی کے اس سب سے بڑے مسلمان ہیئت داں پر مجھ جیسے اس علم سے نابلد شخص کی طرف سے تنقید ایک بیجا جسارت سمجھی جائے گی۔ لیکن میں اپنی تنقید کو تردید نہیں سوال کے طور پر ہیئت دانوں اور مورخوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، گاہ باشد کہ کودک ناداں الخ..........

وہ لکھتے ہیں کہ:

(۱) ولادت نبوی ۲۰ر اپریل ۵۷۱ء کو ہوئی اور یہ کہ اسلام سے پچاس سال قبل سے نسی (کبیسہ گری) کا مکہ میں رواج باقی نہ رہا تھا، بلکہ خالص قمری سال پایا جاتا تھا۔

(۲) ہجرت میں رسول اکرمؐ کا مدینہ میں ورود مبارک یوم عاشورا کو ہوا، جو محرم میں نہیں ربیع الاول میں پایا جاتا ہے اور

(۳) رسول اکرمؐ کے فرزند دلبند حضرت ابراہیمؑ کی وفات ۲۹ر شوال ۱۰ھ کو ہوئی۔

دلیلیں؟ ولادت نبوی کے متعلق چوتھی پانچویں صدی ہجری کے مسلمان ہیئت دانوں نے جو زائچے بنائے ہیں ان سے یہی ثابت ہوتا ہے، ولادت مبارک کے دن غفر ستارے کے طلوع کا ذکر تو میں نے بعض حدیثوں میں پڑھا ہے (جس سے محمود فلکی

Marfat.com

نے بحث نہیں کی ہے) لیکن دوسرے ستاروں کے قران السعدین کا یا ان کے فلاں فلاں مقام پر ہونے کا ذکر نہ قرآن مجید میں ہے نہ کسی حدیث میں میری نظر سے گزرا ہے، گمان یہ ہوتا ہے کہ اولاً ہمارے ان پرانے مسلمان زائچہ نویسوں نے ایک مفروضے کی اساس پر ولادت نبوی کی تاریخ خود معین کی اور پھر اس تاریخ کا زائچہ بنا ڈالا، لیکن اگر ابتدائی مفروضہ ہی غلط رہا ہو تو اس کا نتیجہ کیسے صحیح ہو جائے گا؟ پہلا ہجری سال ۶۲۲ء سے ہونا معلوم و معین ہے، رسول اکرمؐ کی ولادت ربیع الاول کے مہینہ میں ہونی مروی ہے۔ اس مبارک واقعہ کے چالیس سال اور چھ ماہ بعد بعثت ماہ رمضان میں ہوئی۔ پھر مزید بارہ سال چھ ماہ بعد ہجرت نبوی تو ہوئی لیکن سنہ ہجری کا آغاز بعثت کے بارہ سال تین ماہ بعد ہی ہو گیا۔

غرض ۴۰ سال چھ ماہ + ۱۲ سال تین ماہ سے باون ۵۲ سال نو ماہ ہوتے ہیں، ۶۲۲ء میں سے باون سال ہی حذف کریں تو ۵۷۰ء ہونا چاہئیے ۵۷۱ء نہیں، سب لوگ جانتے ہیں کہ کبیسہ گری (نسی) کو منسوخ کرنے کا حکم حجۃ الوداع میں دیا گیا، ولادت نبوی حجۃ الوداع تک نہ بھی لیں تو، ولادت سے ہجرت تک کے باون سالوں میں مکہ میں نسی ہوتی رہی اور اس مدت کو خالص قمری شمار کرنا صحیح نہ ہوگا، کہ باون قمری سالوں کے اکاون شمسی سال قرار دیے جا سکیں اگر زائچہ بنانے والوں نے کسی سہو سے باون کبیسہ والے سالوں کو باون قمری سال فرض کیا اور پھر اس مفروضے کی اساس اس کی معاون چیزیں ڈھونڈھ نکالیں کہ کسریٰ کا سنہ جلوس کون سا تھا، سنہ سکندری کی کیا تاریخ تھی، وغیرہ تو یہ ساری چیزیں ثبوت کی محتاج ہوں گی تاریخی واقعے کی اساس نہیں، گھڑیاں توپ کے چلنے پر درست کی جاتی رہیں اور توپ بھی ان ہی گھڑیوں کی اساس پر چلتی رہے تو وقت کے صحیح ہونے کا کیا ثبوت؟

دوسرا مسئلہ: مدینہ منورہ میں ورود مبارک یوم عاشورا کو ہوا۔ محمود فلکی نے لکھا ہے کہ سیرۃ حلبیہ میں کسی حافظ بن ناصر الدین کا بیان ہے کہ "قدم المدینۃ یوم عاشور" (عاشورا کے دن مدینہ تشریف لائے) اور اس کی صحت کا یہ ثبوت کہ یہ حدیث بخاری اور مسلم میں ہے۔ فلکی پاشا نے اسی پر اکتفا کی اور بخاری و مسلم میں تحقیق نہ کی،

Marfat.com

ان ماخذوں میں باوجود تلاش کے مجھے یہ الفاظ نہ ملے (مفتاح کنوز السنۃ نامی حدیثوں کے انڈکس میں بھی اس کا ذکر نہ ملا) بخاری و مسلم میں ملے تو یہ الفاظ کہ "قدم النبی علیه السلام فرأى اليهود تصوم يوم عاشوراء" (نبی علیہ السلام مدینہ آئے تو دیکھا کہ یہودی عاشورے کے دن روزہ رکھتے ہیں) یا یہ حدیث کہ "دخل المدينة و اذاناس من اليهود يعظمون عاشورا و يصومونه" (مدینہ تشریف لائے تو حال یہ تھا کہ وہاں کچھ یہودی عاشورے کا احترام کرتے اور اس دن روزہ رکھا کرتے تھے) حافظ ناصر الدین صاحب کو غلط فہمی ہوئی اور ان کی عبارت غلط فہمانی کا باعث ہوئی ہے ورنہ بخاری و مسلم کی روایتوں کا اطلاق محرم ۲ھ پر بھی بغیر کسی دشواری کے ہوسکتا ہے اور غالباً ہونا بھی چاہیے۔ بخاری و مسلم کی ایک اور روایت سے بھی اس خیال کی توثیق ہوتی ہے کہ" ارسل النبی علیه السّلام غداة عاشوراء الى قرى الانصار من اصبح مفطرافليتمه بقية يومه ومن اصبح صائما فليصم" (عاشورے کے دن نبی علیہ السلام نے چاشت کے وقت انصار کی بستیوں میں آدمی بھیجے کہ جو کوئی ناشتا کر چکا ہو تو بھی وہ باقی دن روزہ رکھے) ہجرت کے دن ورود نبوی قبا میں دوپہر کے وقت ہوا۔ اسی دن سویرے روزے کا حکم بھیجنا ممکن نہیں اور ساری غلطی حافظ ناصر الدین کے سہو پر مبنی معلوم ہوتی ہے اس پر مزید بحث نیچے آتی ہے۔

تیسرا مسئلہ: فرزند نبوی حضرت ابراہیمؓ کی وفات کے دن سورج گرہن ہوا تھا۔ فلکی پاشا نے اسے ۲۷ر جنوری ۶۳۲ء مطابق ۲۹ر شوال ۱۰ھ کو قرار دیا اور اس پر بہت اصرار بھی کیا ہے۔ کشافہ (اسکاؤٹنگ) کے زمانے میں علم ہیئت کی جو شدید تعلیم حاصل کی تھی وہ اتنے بڑے علمی مسئلے میں کام نہیں دیتی۔ اس لیے خود حساب کر کے علم الیقین کے ساتھ بیان کرنے کی جگہ مجبور ہوں کہ غیروں کی خوشہ چینی کروں، ذمہ داری ان ہی پر ہے بہر حال فرانسیسی میں گمنام پادریوں کی ایک پرانی متداول کتاب ہے۔ "تقابلی تاریخیں معلوم کرنے کا فن" (L-Art de verifrer les dates) اس کی جلد اول میں حضرت عیسیٰؑ کے زمانے سے اب تک سارے چاند گرہنوں کی تاریخ و تفصیل دی گئی

Marfat.com

ہے۔ عہد نبویؐ کے مدنی دور کے گرہنوں کا ذکر اس کتاب میں جلد اول صفحہ (۶۴) پر ہے۔ فی الحال کوئی اور ماخذ معلوم نہیں جس کی مدد سے صحت کی جانچ کر سکوں۔ اس لیے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ محمود فلکی کا بیان کہ حضرت ابراہیمؓ بن رسول اللہؐ کی وفات ۲۹ر شوال ۱۰ھ کو ہونی چاہیے۔ اس کی کوئی سند اسلامی تاریخوں میں نہیں ملتی۔ اس واقعے کے متعلق جو اختلاف رائے ہے، اس کا خلاصہ بلاذری کی انساب الاشراف (ج ا ص ۴۴۹ تا ۴۵۲ طبع مصر) اور ابن عبدالبر کی الاستیعاب فی معرفتہ الاصحاب (ج ا، سوانح نمبر ا طبع حیدر آباد دکن) میں ملتا ہے۔ ابن عبدالبر نے اور روایتوں کے ساتھ یہ ضعیف روایت بھی نقل کی ہے کہ یہ وفات ذی الحجہ ۵ھ میں ہوئی۔ سورج گرہن چونکہ قمری مہینے کے آخر ہی میں ہو سکتا ہے۔ اس لیے مراد ذی الحجہ کی آخری تاریخ ہی ہوگی اگر اس روایت میں مکہ والوں کی کبیسہ گری ملحوظ رکھی گئی ہے تو یہ ۲۱ ریا ۲۲ر مارچ ۶۳۰ء کو ہونا چاہیے اور اگر کبیسہ گری کو ملحوظ نہیں رکھا گیا بلکہ خاص قمری سال کی تاریخ مراد ہے تو یہ ۱۸ر یا ۱۹ر اپریل کو ہوا ہے۔ مگر مذکورہ فرانسیسی کتاب کی جدول میں اگست ۶۲۹ء اور اگست ۶۳۰ء کو تو سورج گرہن بتائے گئے ہیں۔ لیکن مارچ یا اپریل ۶۳۰ء میں کوئی نہیں ابن عبدالبر کی دوسری روایت جس سے سارے ہی سیرت نگار متفق ہیں یہ ہے کہ یہ ذی الحجہ ۸ھ اصل میں صاحبزادے کی ولادت کی تاریخ ہے۔

سورج گرہن بخاری وغیرہ سب کے مطابق ان کی وفات کے دن ہوا، یہ وفات بلاذری کی ایک روایت میں ۷۱ دن کی عمر میں ہوئی۔ یعنی صفر ۹ھ کے آخر میں ملی حساب سے یہ ۱۹ر مئی ۶۳۰ء کو اور خالص قمری حساب سے تقریباً ۱۷ر جون ۶۳۰ء ہوگا۔ ان دونوں تاریخوں میں دنیا میں کوئی سورج گرہن نہیں ہوا، دوسری روایت جو مصعب اور ابن اسحاق کی ہے، وفات کو اٹھارہ ماہ کی عمر میں بتاتی ہے۔ یعنی جمادی الآخرہ ۱۰ھ جو کبیسہ اور غیر کبیسہ دونوں حسابوں سے ایک ہی تاریخ یعنی ۳ر ستمبر ۶۳۱ء کو ہوتی ہے اور اس تاریخ کو بھی کوئی سورج گرہن دنیا میں نہیں ہوا، تیسری اور آخری روایت سولہ ماہ کی عمر میں وفات کی ہے اور بلاذری نے صراحت بھی کی ہے کہ یہ ربیع الثانی کی آخری تاریخ کو پیش آئی۔ یہ تین اگست ۶۳۱ء کے معادل ہے اور واقعی اس تاریخ کو ایک

Marfat.com

سورج گرہن ہوا بھی ہے۔ ابوداؤد کے مطابق سخت گرم دن کا واقعہ ہے اور اگست میں گرمی ہی ہوتی ہے۔ پیش نظر فرانسیسی جدول کے مطابق یہ گرہن ''اسپین کے جنوب اور وسطی افریقا'' میں نظر آسکتا تھا۔ کتاب میں عرب کی صراحت نہیں ہے۔ لیکن غالباً اس میں کوئی مانع بھی نہیں، واحد پیچیدگی یہ ہے کہ بخاری کے مطابق یہ صبح چاشت کے وقت کا واقعہ ہے اور فرانسیسی جدول میں گرہن پاریس کے حساب سے بعد ظہر ڈھائی بجے شروع ہوا، یعنی مدینہ منورہ میں عصر کے وقت، میں نہیں جانتا فرانسیسی جدول میں کوئی سہو ہے یا نہیں، مگر فی الحال اسی کو قبول کرنا پڑتا ہے محمود فلکی نے شوال ۱۰ھ مطابق ۲۷ رجنوری ۶۳۲ء کو جو ذکر کیا ہے، وہ اس فرانسیسی جدول کے مطابق ''جنوب مشرقی افریقا سے مشرقی ایشیا تک'' دیکھا جا سکتا ہے، اور پیرس کے حساب سے صبح ساڑھے چھ بجے شروع ہوا تھا۔ یہ مدینہ منورہ میں کوئی نو بجے چاشت کا وقت ہوگا، لیکن جنوری سخت سردی کا زمانہ ہے اور یہ ابوداؤد کی صراحت کے خلاف ہے۔ معلوم نہیں سہو قلم ہے یا کیا کہ اپنی فرانسیسی اور عربی دونوں کتابوں میں محمود فلکی نے لکھا ہے کہ یہ سورج گرہن آدھی رات کے بعد تقریباً ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوا۔ کیا سورج گرہن کبھی رات کو بھی ہوتا ہے؟ کیا آدھی رات کے بعد کبھی ساڑھے آٹھ بھی بجتے ہیں؟ فرانسیسی کتاب تو ان فرنگیوں ہی کے لیے لکھی اور فرانس اور بلجیم دو مقاموں کے علمی رسالوں میں بیک وقت شائع ہوئی۔ اس میں تو فرنگی حساب ہی ہونا چاہیے، عربی حساب نہیں کہ چھ بجے آدھی رات ہوتی ہو۔

یہودی سنہ:

اوپر محمود فلکی کے اس بیان کا ذکر آیا کہ ہجرت نبوی میں ورود مبارک عاشورا کے دن ہوا، جو یہودیوں کے یوم تشری نہیں بلکہ عید الفصح کے مترادف ہے۔ اور محرم میں نہیں بلکہ ربیع الاول میں ہوتا ہے۔

نفس قصہ یہ معلوم ہوتا ہے بخاری و مسلم وغیرہ کی جن احادیث شریفہ میں عاشورے کے دن مسلمانوں کے روزہ رکھنے کے حکم کا ذکر ہے۔ وہاں نہ صرف اس کی

صراحت ہے کہ اسلام سے پہلے قریش بھی (حتی کہ مسند احمد بن حنبل ج ۶، ص ۱۶۲ کے مطابق خود رسول اکرمؐ بھی) زمانۂ جاہلیت میں مکہ معظمہ میں اس دن روزہ رکھا کرتے تھے، بلکہ یہ بھی کہ یہ حضرت موسیٰؑ کے فرعون سے نجات پانے کے شکرانے میں ہے۔ اور ارشاد نبوی ہوا ہے کہ یہودیوں سے زیادہ مجھے سزاوار ہے کہ اس دن شکرانہ باری تعالیٰ بجالاؤں۔

محمود فلکی نے فرنگی کتابوں سے بہ آسانی یہ معلوم کر لیا کہ یہودیوں کے ہاں دو بڑی عیدیں ہوتی ہیں: ایک یوم کپور (کفارہ) جس میں چوبیس گھنٹے کا طویل روزہ رکھنا فرض ہے۔ یہ تقریب ماہ تشری کی دس تاریخ کو ہوتی ہے لیکن اس کا تعلق فرعون کے ڈوب مرنے سے نہیں ہے۔ بلکہ یہودیوں کے ہاں بحر احمر کو عبور کرنے کی تاریخ ۱۵ نیساں کو ہے، اسے عید الفصح کہتے ہیں۔ لیکن اس دن کوئی روزہ نہیں رکھا جاتا۔

ان حالات میں محمود فلکی نے احادیث میں بیان شدہ فرعون سے نجات کے عنصر کو اہمیت دی، روزہ رکھنے کو نظر انداز کر کے ہجرت نبوی میں مدینہ تشریف آوری کو (جو حافظ ناصر الدین کے مطابق عاشورے کے دن ہوئی) یوم کپور کی جگہ عید الفصح کے مترادف قرار دے دیا، عید الفصح موسم بہار میں آتی ہے۔ ربیع الاول کے لفظی معنی بھی موسم بہار پر دلالت کرتے ہیں۔ لہذا یہ سب ٹھیک بیٹھتا ہے اور چونکہ یکم محرم ۱ھ کا تطابق ۱۶ر جولائی ۶۲۲ء سے سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے دوشنبہ ۸ر ربیع الاول تک (۶۷) دن ہوتے ہیں۔ اور اسے انہوں نے ۲۰ر ستمبر ۶۲۲ء کے مطابق قرار دے دیا۔

مگر اس استدلال میں (غلطیاں تو کہنے کی مجھے جرأت نہیں) کئی گتھیاں مجھے نظر آتی ہیں۔

(۱) یہودی عید الفصح ماہ نیسان میں ہوتی ہے۔ اور نیسان کا مہینہ موسم بہار میں آتا ہے، اور اپنے معنے کے لحاظ سے ربیع الاول بھی موسم بہار پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن خود محمود فلکی اسے ماہ ستمبر کا مہینہ قرار دیتے ہیں۔ ستمبر میں خزاں اور پت جھڑ کا موسم ہوتا ہے بہار کا نہیں۔ بہار کا آغاز تو نوروز یعنی مارچ کے مہینہ میں ہوتا ہے اگر فرض بھی کر لیں (جیسا کہ محمود فلکی کو اصرار ہے کہ اہل مکہ اسلام سے پچاس سال قبل ہی سے نسی کو ترک کر چکے تھے) کہ ربیع الاول کا زیر بحث

زمانے میں موسم بہار کا آنا ضروری نہیں کیونکہ قمری مہینے جگہ بدلتے رہتے ہیں۔ تو بھی یہودی نیسان کا بہار میں آنا ضروری ہے۔ کیونکہ یہودی اپنے قمری سال میں لوند کا مہینہ بڑھاتے رہتے ہیں لہذا ان کا ماہ نیسان ستمبر میں نہیں آسکتا، دوسرے الفاظ میں ان کی عیدالفصح ربیع الاول ۱ھ میں یعنی ستمبر ۶۲۲ء میں ہونہیں سکتی یہاں یہ مکرر کہتے چلوں کہ ربیع الاول ۱ھ اگر تنسیخ نسی کے بعد سے حساب کر کے چلیں تو ۱۳ ستمبر سے شروع ہوتا ہے لیکن اگر مکہ والوں کے نسی والے حساب پر باقی سمجھیں، کہ ابھی اسے رسول اللہؐ نے منسوخ نہ فرمایا تھا۔ تو یہ ربیع الاول ۲۰/ مئی سے شروع ہوا تھا۔ مکی حساب کا محرم واقعی نیسان یعنی عیدالفصح کے مطابق ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محرم میں نہیں بلکہ ربیع الاول (مطابق یہودی ماہ سیوان) میں مدینہ تشریف لاتے ہیں۔

(۲) یہودی عیدالفصح ماہ نیسان میں ہوتی ہے جو ان کے سال کا ساتواں مہینہ ہے، (تشری، ہاشیوان، کسلیو، تیبت، شباط، آوار، نیسان، ایار، سیوان، تموز، آب، ایلول) ان کے ہاں بھی قمری سال رائج ہے اور وہ بھی ہر تیسرے سال ایک تیرہواں لوند کا مہینہ بڑھاتے ہیں۔ یہ اضافہ ماہ آوار کے بعد ویادار کے نام سے ہوتا ہے لیکن چاند ہو کہ نہ ہو، سال کا آغاز کبھی کسی اتوار، بدھ یا جمعہ کے دن نہیں ہوسکتا، اگر رویت ہلال سے ایسا ہو بھی جائے تو نئے سال کی تاریخ ایک دن متاخر کر دیتے ہیں اور سال کبھی ۳۵۳، کبھی ۳۵۴ اور کبھی ۳۵۵ دن کا ہو جاتا ہے۔ چاہے علم ہیئت مانے یا نہ مانے، غرض ان کے سال کا آغاز جو ماہ تشری سے ہوتا ہے۔ کبھی ستمبر اور کبھی اکتوبر میں واقع ہوتا ہے، ہجرت میں رسول اکرمؐ کی مدینہ تشریف آوری اگر واقعی ستمبر میں ہوئی تھی تو یہ ماہ تشری کے مطابق تو ہے، ماہ نیسان کے نہیں، مالر کی یہودی تقابلی جنتری کے مطابق جو جرمن میں ہے، (G.Makler,vergleiahung go tubellen.wien 1888,P77) کیم تشری ۴۳۸۳ یہودی کے مطابق تاریخ ۱۱/ ستمبر ۶۲۲ء ہے۔ بعد کے خاص قمری حساب سے کیم محرم ۱ھ کے مطابق تاریخ ۱۶/ جوالائی ۶۲۲ء سمجھی جاتی

ہے۔ دوشنبہ کا دن لانے کے لیے محمود فلکی نے ورود مدینہ ۸؍ ربیع الاول کو قرار دیا ہے۔ یہ چونکہ یکم محرم سے (٦٧) دن بعد کا واقعہ ہے اس لیے ١٦؍ جولائی کے (٦٧) دن بعد ۲۰؍ ستمبر کو پیش آنا چاہیے۔ یعنی ماہ تشری میں، عید کپّور کے دو دن پہلے، نہ کہ عبور دریا و غرق فرعون کی عید الفصح کے موقع پر، لیکن اگر مکہ کے کبیسہ والے حساب سے لیں تو ہجرت نبوی ماہ مئی میں ہوگی۔ ماہ ربیع الاول ۲۰؍ مئی ۶۲۲ء جمعرات کے دن شروع ہوا تھا، ۱۲؍ ربیع الاول مطابق ۳۱؍ مئی بھی پیر ہی کو ہے۔ لہٰذا اسلامی پرانی روایات کی توثیق ہوتی ہے اور محمود فلکی کے بیانات غلط ثابت ہوتے ہیں۔ ماہ مئی مدینہ منورہ میں خاصی گرمی کا ہوتا ہے اور کتب سیرت میں صراحت ہے کہ رسول اکرمؐ کی آمد کے وقت خاصی گرمی تھی اور انصار دن چڑھنے پر گرمی کے باعث مزید انتظار کیے بغیر گھروں میں واپس چلے گئے تھے۔ جبکہ حضورؐ کی آمد آمد ہوئی، ماہ مئی یہودی ماہ سیوان میں شروع ہوا تھا۔ جس کو نہ تشری کے روزے سے اور نہ عید الفصح کی تقریب سے کوئی تعلق ہے۔

(۳) یہ امر کہ عاشورا کو یوم کپور کے مترادف سمجھنا چاہیے عید الفصح کے نہیں۔ اس کی تائید میں کئی باتیں ہیں:

(ا) یوم کپّور ماہ تشری کی دسویں کو ہوتا ہے اور ''عاشورا'' کے لفظی معنی بھی دسویں دن ہی کے ہیں اور جہاں تک میں جانتا ہوں، اسلامی ادبیات و روایات میں اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ عاشورا محرم کی دسویں کو ہوتا ہے۔

(ب) یوم کپّور کے موقع پر یہودیوں کے ہاں روزہ رکھنا فرض ہے اور حدیث شریف میں صراحت ہے کہ یہودی عاشورا کے دن روزہ رکھتے تھے۔

(ج) یوم کپّور کو فرعون سے نجات پانے سے قطعاً بے تعلق قرار دینا بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا، مجھے عبرانی زبان اور یہودی ادبیات سے واقفیت کا مطلق دعویٰ نہیں، اب سے پینتیس (۳۵) سال پہلے (۱۹۳۳ء میں) جرمنی میں کچھ عبرانی سیکھی تھی۔ اب تو حروف تہجی بھی مشکل سے یاد ہیں، بہرحال میرے سامنے ۱۹۱۱ء میں

پیرس میں چھپی ہوئی ایک کتاب ہے۔ جس میں عبرانی دعائیں فرانسیسی ترجمے کے ساتھ دی گئی ہیں، اور کتاب کا نام ہے: ''سال کے سارے دنوں میں پڑھی جانے والی دعاؤں کی کتاب'' "Docbre, Rtuel de Prierespourtous les joursde lanneer" اس میں ماہ تشری کی دسویں کو یوم کپور کے موقع پر جو دعا پڑھی جاتی ہے اس کے آخری الفاظ (عبرانی میں صفحہ ۶۴۲ پر اور فرانسیسی میں صفحہ ۶۴۳ پر) یہ ہیں: مقرا قدیس ذکر لیصیات مصریم۔ (یعنی اے تو نے اس عید کو ''مقدس گردانا ہے کہ وہ مصر سے نجات کی یاد دلاتی ہے'') جب یہودیوں ہی کے مطابق یوم کپور کو مصر سے نجات کی یاد سے تعلق ہے تو پھر ہمیں تعجب کیوں ہو کہ حدیث شریف میں رسول اکرمؐ نے بھی اس کا ذکر فرمایا ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(د) مشرکین مکہ میں بھی اور یہودیوں کے ہاں بھی قمری مہینہ رائج تھا۔ اس لیے مہینوں کا آغاز مذکورۂ بالا یہودی استثناؤں کے ساتھ ایک ہی زمانے میں ہوتا تھا۔ دونوں کے ہاں لوند مہینہ بڑھانے کا رواج تھا۔ لیکن عرب اسے ختم سال پر ذی حجہ کے بعد اور محرم سے پہلے بڑھاتے تھے تو یہودی وسط سال میں چھٹے مہینے آوار کے بعد اور ساتویں مہینے نیسان سے پہلے، مزید برآں وہ لوند کا تیرہواں مہینہ انیس سال میں چھ مرتبہ (تیسرے، چھٹے، آٹھویں، گیارہویں، چودھویں اور انیسویں سال) بڑھاتے ہیں۔ جس کے بعد زمانہ اپنے پرانے حال پر واپس آجاتا سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف مکہ والوں کی نسی میں یہ عمل کبھی تین برس میں ایک بار اور کبھی دو ہی برس میں ایک بار کر کے تینتیس سال میں بارہ مرتبہ لوند کا مہینہ بڑھایا جاتا اور اس طرح خالص قمری اور لوند والے مہینے مکرر اپنی اصلی حالت پر واپس آتے (اور بظاہر یہ تیسرے، چھٹے، نویں، گیارہویں، چودہویں، سترہویں، بیسویں، بائیسویں، پچیسویں، اٹھائیسویں، تیسویں اور تینتیسویں سال کے اختتام پر بڑھائے جاتے۔ کم از کم فلکیاتی ریاضیات کے نقطۂ نظر سے اسی طرح بڑھانے کی ضرورت ہے۔ تا کہ قمری اور

Marfat.com

شمسی سال میں ایک قمری مہینہ کے اضافے کے ذریعہ سے فوراً تطابق پیدا ہو جایا کرے اور مزید انتظار کیے بغیر جیسے ہی ایک مہینہ کا فرق ہو اس کا اضافہ کر لیا جائے) ان فرقوں کے باعث اگر کسی زمانے میں عربی اور یہودی سالوں کا آغاز ایک ہی زمانے سے ہوا بھی تھا تو یہ ضروری نہیں رہتا کہ وہ ہر زمانے میں یکساں رہیں اور اس میں کوئی امر مانع نہیں کہ مشرکین مکہ کا محرم اور یہودیوں کا تشری الگ الگ زمانے میں آئیں۔ ہم ابھی اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ایک حساب سے (جو ہماری رائے میں غلط ہے) ربیع الاول ۱ھ میں تشری ہی کا مہینہ چل رہا تھا اور اگر محمود فلکی کی اس تجویز کو قبول کر لیا جائے (جو ہماری رائے میں درست نہیں) کہ رسول اکرمؐ کا مدینہ میں ورود مسعود ۸ ربیع الاول ہی کو ہوا، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ تشری کی آٹھویں کو وہاں پہنچے تھے۔ لہذا یوم کپور کو ابھی دو دن باقی تھے۔ حافظ بن ناصر الدین کی روایت پھر بھی غلط ہی رہے گی کہ رسول اکرمؐ کی آمد ہی عاشورہ۹ کے دن ہوئی، ساری مذکورہ دشواریوں کے غیر اہم ہونے کی اساس پر نظر انداز کر کے اگر یہ قرار ہی دے لیا جائے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ منورہ تشریف لانے کے وقت مکہ والوں کا ربیع الاول چل رہا تھا اور یہودیوں کا ماہ تشری، تو اس کی توجیہ دشوار نہ ہوگی آپ ماہ محرم میں مکہ معظمہ میں عاشورا منا کر مدینہ آئے تو دیکھا کہ حقیقی عاشورا ابھی شروع نہیں ہوا ہے تو اس اسلامی اصول کی بنا پر (جو بخاری و ترمذی وغیرہ میں صراحت کے ساتھ مروی ہے کہ براہ راست وحی نہ آتی تو رسول اکرمؐ اہل کتاب کے عمل کے مطابق عمل فرماتے) یہ حکم دیا کہ عاشورے کا روزہ ۱۰ ربیع الاول ۱ھ کو یہودیوں کے یوم کپور کے موقع پر رکھا جائے۔ غرض یہ امکان تو ہے لیکن ہماری ناچیز رائے میں وہ قابل رد ہے صحیح ترتیب یہی ہوگی کہ مدینہ آنے کے کچھ عرصہ (چند ماہ) بعد جب یوم کپور آیا تو رسول اکرمؐ نے مسلمانوں کو بھی اس دن روزہ رکھنے کی ہدایت فرمائی۔ اس کے بعد جلد ہی رمضان ۲ھ میں رمضان کے روزے فرض ہو گئے اور عاشورا کا روزہ

Marfat.com

نوافل میں شامل ہو کر رہ گیا۔

خلاصہ :

اس ساری نظر خراشی کا منشا ایسی مثالیں دینا ہے کہ کس طرح ہمارے علم ہیئت میں بھی ہماری میراث ماضی کی ہر وقت نظر ثانی اور جانچ پڑتال ہمیں کو کرتے رہنے کی ضرورت ہے بے سوچے سمجھے دہراتے رہنا طوطا مینا کا تو کام ہو سکتا ہے۔ مسلمان اہل علم کا نہیں۔

اگر اس مقالے کے ناظرین میں کوئی ہیئت داں ماہر فن بھی ہوں تو ان سے التماس ہے کہ میری غلطیوں پر متنبہ فرمائیں۔ علم کی خدمت بھی ہو گی، میری شکر گذاری کا باعث بھی ہو گا۔

(ہفت روزہ صدق جدید لکھنؤ۔ ۲۹ر ستمبر تا ۱۰ر نومبر ۱۹۶۷ء)
ماخوذ معارف اعظم گڑھ۔ ستمبر ۱۹۶۷ء

Marfat.com

اسلام میں
انسانی خون کا احترام

دنیا کے مدبرین کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ''اگر کسی قوم کی تہذیب اور ثقافت کا معیار معلوم کرنا ہو تو جنگ میں دشمن کے ساتھ اس قوم کے سپاہیوں کے طرزِ عمل کا مطالعہ کرنا چاہیے''۔ چنانچہ جب ہم اس کسوٹی پر اسلام اور اس کے متبعین کو کس کر دیکھتے ہیں، تو مسلمان سب سے ممتاز، بلند حوصلہ اور فیاض دکھائی دیتے ہیں۔ یوں تو آج مغرب اور مہذب دنیا میں بھی ایک باقاعدہ قانونِ جنگ موجود ہے لیکن یہ اس لیے تشنہ اور غیر منصفانہ ہے، کہ اس کا دائرۂ عمل صرف ''مہذب'' یعنی یورپین اقوام تک محدود ہے۔ جہاں تک غیر یورپین اور کمزور قوموں کے ساتھ رواداری اور نرمی برتنے کا تعلق ہے سو اسکی کوئی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ بلکہ اس کے خلاف یہ کمزور قوموں پر انسانیت سوز مظالم کرنا لازمی سمجھتے ہیں۔

اس کے برعکس اسلام کے عقیدۂ عدل و انصاف کی رو سے نہ تو کسی غیر ملکی کو دوسرے پر فوقیت دی جا سکتی ہے اور نہ اپنے فرائض کو ادا کرنے اور نہ کرنے والوں کے مابین کوئی فرق و امتیاز روا رکھا جا سکتا ہے اور اگرچہ یہ امر تعجب خیز معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے اور یہ امر محض نظریہ ہی تک محدود نہیں بلکہ اس پر عمل بھی کیا جاتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر ان لوگوں کے قتل کے معاملے کو لیجیے جنہیں دشمن کی طرف سے

بطورِ ضمانت مسلمانوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور اسلام کے ابتدائی دور میں انہیں قتل کر دینے کے واقعات عام ہو گئے تھے، اُس زمانے میں بازنطینی سلاطین اور مسلمانوں کے مابین جو معاہدات طے ہوا کرتے تھے ان کی تعمیل و تکمیل کی ضمانت کے طور پر فریقین اپنے کچھ لوگوں کو ایک دوسرے کے حوالے کر دیا کرتے تھے اور معاہدات میں خصوصیت کے ساتھ یہ شرط شامل کی جاتی تھی کہ اگر بازنطینی سپرد کردہ مسلمانوں کو شہید کر دیں گے تو مسلمان بھی بطورِ انتقام بازنطینیوں کو ہلاک کر دینے کے مجاز ہوں گے۔

اس سلسلہ میں تاریخ اسلام کے دو واقعات پیش کر دینے کافی ہوں گے۔ ایک واقعہ امیر معاویہؓ کے عہد حکومت میں پیش آیا تھا، اور دوسرا خلیفہ منصور کے زمانے میں اور اُن دونوں واقعات کا خلاصہ یہ ہے کہ ''اگرچہ بازنطینی سلاطین نے معاہدہ کے خلاف فیصلہ صادر کیا اور یہ فیصلہ اس بناء پر کیا گیا کہ مسلمانوں کے قتل کے ذمہ دار وہ بازنطینی نہیں جو دارالخلافہ میں موجود ہیں، بلکہ اس فعل کی ذمہ داری بازنطینی سلاطین پر عائد ہوتی ہے۔ اور قرآن اُن بے گناہ بازنطینیوں کو مستوجب سزا قرار نہیں دیتا۔''

پھر شریعت اسلامی کی رو سے دورانِ جنگ میں عورتوں، بچوں اور اُن لوگوں کا قتل ممنوع ہے جو مقابلہ پر نہیں آتے۔ حتیٰ کہ اگر دشمن مسلمانوں کے بچوں اور مسلمان عورتوں کو قتل بھی کر دیں تو بھی مسلمان ان کے بچوں اور ان کی عورتوں پر تلوار اُٹھانے کے مجاز نہیں۔ مختصر یہ کہ مسلم قوم ہی وہ پہلی اور واحد قوم ہے جس نے دنیا کے روبرو، حقیقی معنوں میں بین الاقوامی جنگی قانون پیش کیا ہے۔

یہ چیز محتاجِ بیان نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی علوم دینیہ میں بہت اہمیت رکھتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی، نظریہ اور عمل کی ایک ایسی مثال پیش کرتی ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر مرحلہ میں شمع ہدایت کی حیثیت رکھتی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صرف ہمارے مذہب اور عقائد یا بالفاظِ دیگر خدا اور بندے کے درمیان تعلقات کی نوعیت ہی سے روشناس نہیں کیا، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ریاست کی بنیاد بھی رکھی، افواج کی قیادت بھی فرمائی اور بین الاقوامی قانون پر عملدرآمد بھی کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امن اور جنگ

Marfat.com

کے زمانوں میں غیر ملکی تعلقات سے متعلق جو طرزِ عمل بھی اختیار فرمایا، وہ طرزِ عمل اسلام کا قانون ہے۔ اس کے برعکس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بات کی ممانعت فرمادی وہ آج بھی ممنوع اور خلافِ شریعت ہے۔

بہرحال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ریاست قائم فرمائی تھی وہ بے مقصد نہیں تھی۔ ہجرت کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو اُس وقت وہاں کوئی حکومت موجود نہیں تھی، بلکہ حکومت کی جگہ یہودیوں، نصرانیوں، بُت پرستوں، مظاہر قدرت کے پرستاروں اور مسلمانوں کے ایسے چھوٹے بڑے قبائل موجود تھے، جو باہم جنگ و جدل میں مصروف رہتے تھے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لے جانے کے چند ہی ہفتہ بعد وادیٔ مدینہ میں آپ کی زیر قیادت وفاقی انداز کی ایک شہری حکومت قائم ہوگئی اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی تو آپ کی قائم کی ہوئی وہ حکومت جو ابتداءً صرف مدینہ طیبہ تک ہی محدود تھی پورے جنوبی فلسطین کے متعدد حصوں اور جنوبی عراق تک وسیع ہوچکی تھی۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم اور قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ اس دس لاکھ مربع میل کے علاقہ کی تسخیر میں دشمن کو جو جانی نقصان پہنچا اس کا اوسط ہر ماہ ایک آدمی کی ہلاکت سے زیادہ نہیں تھا، اور خود مسلمانوں کا نقصانِ جاں تو اس سے بھی کم تھا، اور تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا مذکور نہیں جس سے پتا چلتا ہو کہ ہند اور پاکستان کے مجموعی رقبہ کے برابر رقبہ کو فتح کرنے کے لیے مسلمانوں کو میدانِ جنگ میں اپنے پانچ سو سپاہیوں کا اتلافِ جاں بھی برداشت کرنا پڑا ہو۔ پھر دس سال کی مدت میں دس لاکھ مربع میل کی تسخیر سے یہ نتیجہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ تسخیر کا اوسط روزانہ ۲۷۴ مربع میل رہا ہے مسلمان انسانی خون کے احترام میں جس قدر پیش پیش تھے اُس کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ مفتوح اقوام کو اس امر کا احساس تک بھی نہیں ہوتا تھا کہ اُن پر کسی دوسری قوم کی حکومت قائم ہوگئی ہے، اس کے برعکس وہ خود کو آزاد اور سربلند محسوس کرتی تھیں اور اسی لیے اس تمام زمانہ میں غدر و بغاوت اور سازش کا ایک واقعہ بھی رونما نہیں ہوا۔

بین الاقوامی اسلامی قانون کا مفہوم اور بنیادی مقصد قومی تعصبات کو دُور کر کے

Marfat.com

یہ امر لوگوں کے ذہن نشین کرنا ہے کہ وہ سب آدم وحوا کے فرزند اور ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ اسلام سے قبل مذہب کا تصور بھی قومیت تک محدود تھا مثلاً ہندو ہونے کے لیے کسی ہندو گھرانے میں پیدا ہونا ضروری تھا، اور غیر ہندوؤں کے لیے ہندو مذہب اختیار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی، اور دنیا کے دوسرے بڑے بڑے مذاہب کا بھی، جو انسان کو خدا کی جانب آنے کی دعوت دیتے تھے، یہی حال تھا۔ لیکن اسلام ہی دنیا کا وہ اولین مذہب ہے جس نے رنگ ونسل اور ملک و وطن کی حدود کو نظر انداز کر کے تمام لوگوں کو خیر اور فلاح کی راہ پر چلنے کی دعوت دی۔ اس نے بے وجہ کی خاندانی بزرگی اور بالاتری کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کردار وعمل کی اچھائی کو بڑائی و بزرگی کا معیار قرار دیا۔

اسلام جو دنیا کے سارے باشندوں کو ایک کنبہ اور برادری کے رشتہ میں منسلک کر دینا چاہتا ہے، اس کی نظر میں تمام بنی نوع انسان برابر ہیں۔

اسلام کی اس وسیع النظری کی بدولت ہی اسلام کا جو جنگی بین الاقوامی قانون وضع کیا گیا، اس کے دامن میں سب کو بلا امتیازِ مذہب وملت اور رنگ ونسل کے پناہ دی گئی۔ اور ہمیشہ ہی انسانی خون کے بہانے سے پرہیز کیا گیا کیوں کہ اسلام کے نزدیک کسی ایک بے گناہ کا خون ساری دنیائے انسانیت کا خون ہے۔

(ماہنامہ دارالعلوم۔ دیوبند۔ نومبر ۱۹۵۷ء)

Marfat.com

اسلامی جہاد

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کو ہجرت سے قبل مکہ میں کیا کچھ اذیت نہ دی گئی اور جیسے جیسے یہ ہجرت کرتے جاتے تھے ان کی جائیداد منقولہ کس طرح قرق نہ ہوتی گئی۔ جب خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرماتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو کثیر رقمیں امانت تھیں ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انتقاماً ہی ساتھ لے کر مدینہ فرار ہو سکتے تھے مگر آپؐ نے جو کچھ کیا اس سے خود بیسویں صدی کے مہذب انسان کو (چاہے گورا ہو یا کالا) شرمانا پڑتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم بدر میں تشریف فرما ہیں۔ ابوجہل کی سرداری میں تعداد میں تگنا، ساز و سامان میں دس گنا دشمن کا لشکر چڑھائی کرتا ہے۔ مورخ بلاذری نے ''انساب الاشراف'' میں ایک کم معروف مگر اہم تفصیل درج کی ہے اور لکھا ہے:

> ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے لشکر کو کہلا بھیجا کہ مکہ واپس چلے جائیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ٹکرانا نہیں چاہتے۔ جب ادھر سے انکار ہوا، تو مجبوراً لڑائی کرنی ہی پڑی۔ تگنے دشمن کو شکست فاش دینے کے بعد جب ستر اسی آدمی گرفتار ہوئے تو ان سب کو تلوار کے گھاٹ اتارنے میں کوئی امر مانع نہ تھا اور شاید مسلمان حق بجانب

Marfat.com

ہوتے مگر مقصد انتقام تھا نہ درندگی و خونخواری۔ اگر ان سب کو یونہی چھوڑ دیا جاتا تو شاید وہ بھی افراد کی فطرتوں میں تفاوت کے باعث مقصد کو فوت کر دیتا اس لیے قیدیوں سے برتاؤ بھی مختلف رہا۔ شریفوں کو محض اس وعدے پر چھوڑ دیا کہ آیندہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائیں گے۔ اسلحہ فروش مالداروں سے فدیہ میں ہتھیار مانگے گئے، سرمایہ داروں سے رقم مانگی گئی، پڑھے لکھوں سے کہا گیا کہ ہر شخص دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔ صرف دو قیدیوں کو جو بدر کی چڑھائی کے اصل ذمہ دار تھے اور ہر طرح کے جبر و طنز وغیرہ کے ذریعے سے ہچکچانے والوں کو بھی ورغلا کر لائے تھے اور جن کی افتادِ طبع سے اس کی توقع ہی نہ تھی کہ کسی نرمی یا رعایت سے وہ کچھ بھی متاثر نہ ہوں گے صرف ایسے دو آدمیوں کو مستقبل کے خوف سے سزائے موت دی گئی۔"

بنو نضیر کے یہودیوں نے بدعہدی سے گزر کر غداری کا اقدام کیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انہوں نے ہجرت کے بعد راضی خوشی اپنی شہری مملکت کا سردار تسلیم کیا تھا۔ لیکن جب ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے محلے میں گئے اور دھوپ سے بچنے کے لیے ایک برج کے سائے میں تشریف فرما ہوئے (ان اللہ کے بندوں کو اس کی بھی توفیق نہ ہوئی تھی کہ اپنے صدر مملکت کو کسی گھر میں بٹھا کر گفتگو کریں) تو برج پر سے ایک بڑا پتھر گرا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی تدبیر ہوئی۔ جب ہر طرح کی سرزوری اور جنگی مقاومت کے باوجود ان کو صرف یہ سزا ملی کہ کہیں اور چلے جائیں (اور پورا مال و متاع ساتھ لے جائیں حتیٰ کہ مسلمانوں کے دیے ہوئے قرضے بھی واپس حاصل کرلیں) تو اس رعایت کا بدلہ یوں دیا کہ سارے عرب کو مدینے پر چڑھا لائے

اور معرکہ خندق میں مسلمانوں کے ''کلیجے منہ کو آ گئے۔''

اس انتہائی نازک اور زندگی موت کی کش مکش میں اندرون مدینہ بنو قریضہ نے عین دمِ آخر غداری کی اور چاہا کہ مسلمانوں پر اندر سے ٹوٹ پڑیں (اور خندق وغیرہ کا سارا دفاعی نظام بے کار کر دیں) انہیں بڑی فراست سے ایک دن روکا گیا اور دوسرے یوم سبت (سنیچر) تھا جس میں یہودی اس زمانے میں جنگ نہ کرتے تھے۔ تیسرے دن عربوں کے حرام مہینے (ذیقعد تا محرم) شروع ہو رہے تھے۔ اس طرح لڑائی ختم ہو گئی۔

پروفیسر ونیسنک نے (جو غالباً یہودی تھا) یہ معقول سوال کیا ہے کہ بنو نضیر کے ساتھ رعایت کے تلخ تجربہ کے بعد کیا بنو قریظہ کی قوت بھی انہی مخالفوں کی طاقت میں اضافے کے لیے چھوڑ دی جا سکتی ہے؟ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر بھی نرمی دکھائی اور فرمایا کہ:

> ''ان یہودیوں ہی کے ایک سابق دوست اور حلیف کو پنچ ٹھہرایا جائے اور وہ جو بھی فیصلہ کرے وہ نافذ کیا جائے۔''

اگر بنو قریظہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم بناتے تو شاید رحمۃ للعالمین کا مظاہرہ ہوتا۔ بہرحال اس پنچ نے بھی کوئی خاص سختی نہ کی اور صرف یہ حکم دیا کہ:

> ''توریت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مغلوب دشمن سے برتاؤ کا جو حکم دیا گیا ہے (دیکھو توریت کتاب تثنیہ فصل ۲۰، فقرہ ۱۰ تا ۱۴) وہی عمل میں لایا جائے۔''

گویا یہودی اپنے دشمنوں سے جو برتاؤ کرتے ہیں وہی برتاؤ ان سے کیا جائے۔

فتح مکہ شاید انسانی جہاد کا کمال ہے۔ اکیس سال سے مسلسل اہلِ مکہ مسلمانوں کو روز افزوں بے وجہ ستاتے چلے آ رہے تھے۔ اس کی داستان سے سب واقف ہیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وطن کو جہاں سے جلاوطنی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجبور کیا گیا تھا فاتحانہ واپس آئے جو برتاؤ عمل میں آیا اس کا بیسویں صدی کا

Marfat.com

''مہذب'' انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ فوجی دستے شہر کی طرف بڑھے تو اس منادی کے ساتھ کہ

''جو اپنے گھر میں بیٹھ رہے اسے امان ہے، جو ہتھیار ڈال دے اسے امان ہے، جو حرم کعبہ میں چلا جائے اسے امان ہے جو سردارِ شہر ابوسفیان کے گھر[1] میں چلا جائے اسے امان ہے۔''

شہر پر قبضہ مکمل ہو جانے کے بعد بستی کی ساری آبادی بلائی گئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ وہ کس برتاؤ کی توقع کرتی ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب کے قتل عام کا حکم دے سکتے تھے۔ ساری جائیداد لوٹ کر لے لینے، سارے لوگوں کو غلام بنانے کا بھی فیصلہ فرما سکتے تھے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف یہ فرمایا کہ:

''جاؤ تم، تم پر کوئی گرفت نہیں۔ تمہیں چھوڑ دیا جاتا ہے''

اس نفسیاتی لمحہ میں فوراً ہی بکثرت لوگ مسلمان ہو گئے۔ ان میں سب سے پہلے ایک مشہور متمرد سردار عتاب تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے چند لمحہ پہلے جب حضرت بلالؓ نے کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دی تو عتاب نے کہا تھا:

''خدا کا شکر ہے کہ میرا باپ آج زندہ نہیں ہے ورنہ وہ اس نہیق عمار یعنی حضرت بلالؓ کی اذان کو برداشت نہ کر سکتا۔''

جب عفو عام کے اعلان پر سب سے پہلے عتاب نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرایا اور اپنے اسلام کا اعلان کیا تو اس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] مشہور تابعی ثابت البنانی نے لکھا ہے کہ قبل ہجرت مکی کے اونڈے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیچھا کرتے اور آپ پر سنگباری کرتے اور آپ ابوسفیان کے گھر میں گھس جاتے تو وہاں آپ کو امن مل جاتا۔ فتح مکہ کا یہ اعلان اسی کی شکرگزاری میں تھا۔

''اچھا میں تمہیں مکہ کا گورنر مقرر کرتا ہوں''

تو مفتوحہ شہر وہیں کے ایک نومسلم کٹر دشمن کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور چند دن بعد مدینہ واپسی ہوتی ہے تو مدینہ کا ایک واحد سپاہی تک وہاں احتیاطاً چھوڑنا غیرضروری خیال کیا جاتا ہے۔ ولمثل ھذا فلیعمل العاملون۔

(ہفت روزہ صدق جدید لکھنؤ - ۲۶/جنوری ۱۹۶۸ء
بارِ دگر یہی مضمون ۷/فروری ۱۹۶۹ء میں بھی شائع ہوا)

اکابرین

Marfat.com

Marfat.com

امام محمدؒ کی بارہ سو سالہ یادگار وفات ترکی میں

امام محمد بن الحسن بن فرقد الشیبانی کی ستاون سالہ جوان عمری میں ۱۸۹ھ میں بمقام ری (طہران) وفات ہوئی جب یہ شہر ہارون رشید کا دارالخلافہ تھا، اور امام محمد اس کے قاضی القضاۃ تھے، اس پر اب پورے بارہ سو سال گزر چکے ہیں۔

امام محمد صاحبین یعنی امام ابو حنیفہ کے دو بڑے شاگردوں (اور بازوؤں) میں سے ایک ہیں۔ دوسرے صاحب امام ابو یوسف ہیں، امام اعظم ابو حنیفہ نے فقہ (اسلامی قانون) کی ایسی خدمت کی کہ آسمان پر چڑھ کر ثریا کے تارے توڑ لیے، انہوں نے فقہ کی تدوین کے لیے ایک اکاڈیمی قائم کی، لیکن فقہ پر انہوں نے بظاہر کوئی کتاب نہیں چھوڑی جو ان کی اپنی تالیف ہو، امام ابو یوسف کا تحریری کارنامہ بھی محدود ہے، ایک چھوٹی سی (لیکن اہم) ''کتاب الخراج'' لکھ کر اسمیں اسلامی سرکاری مالیے کی وضاحت فرمائی ہے، ''الرد علیٰ سیر الاوزاعی'' لکھ کر قانون بین الممالک کے مباحث میں حصہ لیا، ان کی طرف منسوب'' المخارج فی الحیل'' کا ایک مخطوطہ استانبول میں ہے، لیکن یہ فقہ کا ایک پہلو یا فقہ کی کسی جامع کتاب کا محض ایک باب ہے۔

Marfat.com

اس کے برخلاف امام محمد نے ایسی کتابیں چھوڑی ہیں جو قانون کے سارے پہلوؤں پر حاوی اور مفصل و ضخیم ہیں، ان حالات میں امام محمد کو فقہ حنفی کا ''تحریری بانی'' کہنا شاید بے جانہ ہوگا۔ بعد کے سارے حنفی فقہاء ان ہی کے خوشہ چیں ہیں۔

ان کے استادوں میں امام مالک ہیں تو شاگردوں میں امام شافعی بھی ہیں (اور امام شافعی کے ایک بڑے شاگرد امام ابن حنبل ہیں) اس طرح تمام فقہی مذاہب کے منتسب آپ کا ادب کرتے اور آپ کی یادگار میں ذوق وشوق سے شریک ہیں۔ ایران کو یہ خصوصیت ہے کہ یہ وہاں کے قاضی القضاۃ تھے اور وہیں جبل طبرک پر دفن ہوئے (بعض روایتوں میں رنبویہ کا بھی ذکر آتا ہے، کوہ طبرک آج تک موجود معروف ہے اور طہران کے مضافات میں وہاں آجکل ایک دوست طالب علم عفان سلجوق کی اطلاع کے مطابق سیمنٹ سازی کا کارخانہ قائم ہے، رنبویہ غالباً رنگ اور بو کا مرکب کوئی گلستاں تھا، اور شاید کوہ طبرک ہی پر ہارون رشید نے اسی پُرفضا مقام پر ان کو دفن کرنے کا حکم دیا ہو)۔

امام محمد ۱۳۲ھ کے ہنگامہ خیز سال میں پیدا ہوئے جب تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء کے مصداق امویوں کے زور کا خاتمہ کر کے عباسی برسراقتدار آرہے تھے، کچھ بڑے ہوئے تو اس زمانہ کے سب سے بڑے علمی مرکز کوفہ (سابق حیرہ) میں تعلیم پائی، پھر جب بغداد بسایا گیا تو وہاں نظر آتے ہیں، مکہ جا کر ابن عیینہ سے، مدینہ جا کر امام مالک سے، دمشق (بیروت؟) جا کر امام اوزاعی سے، ایران جا کر حضرت عبداللہ بن مبارک سے تعلیم پائی (یہ دارالاسلام کی اس زمانے میں بڑی جامعات یعنی یونیورسٹیاں تھیں، امام محمد ان سب کے سند یافتہ تھے) گویا ایک نہیں چھ چھ ڈاکٹریٹ کی تھیں، پھر خود تعلیم دینی شروع کی، غالباً بغداد میں۔

ابن ندیم نے لکھا ہے کہ جس مسجد میں یہ درس دیتے تھے، اور ان کی کتابیں ان کے شاگردان کے سامنے پڑھ کر اپنے نسخوں کی تصحیح کرتے، اور تشریح پوچھ کر پوری طرح مؤلف کا منشاء سمجھتے اور اس سے کتاب کی روایت کی اجازت حاصل کرتے، وہاں ایک

Marfat.com

بدخو ہمسایہ کتاب الدولہ کا مؤلف ابن الراوندی [1] بھی آیا کرتا تھا۔ وہ عمداً وہی دن اور وہی وقت مقرر کرتا جو امام محمد مقرر کرتے۔ جب دونوں جماعتیں مسجد میں ایک ساتھ شروع ہوتیں تو راوندی کے شاگرد چیخ پکار کرتے اور شور مچاتے، اس لیے امام محمد نے اپنی درس گاہ بدل دی اور ایک دوسری مسجد میں درس دینے لگے۔ یہ پچاس سال کے تھے جب قاضی القضاۃ امام ابو یوسف کا انتقال ہو گیا۔ ہارون رشید کو امام محمد سے بہتر کوئی بدل نہ مل سکا۔ اس نے رقہ کو (جو اب شام میں ہے) دارالخلافت بنایا تو یہ بھی ساتھ گئے، اس زمانے میں ایک شیعہ بغاوت ہوئی، اس کے سرغنے کو ہارون رشید نے تحریری اطمینان دلایا کہ اگر وہ ہتھیار ڈال دے تو اس کو جان کی امان دی جائے گی۔ جب یہ لوگ گرفتار ہو کر آئے تو ہارون رشید نے ان کو قتل کرنا چاہا۔ امام محمد نے امان یافتہ کے قتل کو حرام بتایا، ہارون رشید نے لاکھ سیاسی مصلحتیں بتائیں لیکن یہ ٹس سے مس نہ ہوے۔ اس پر خلیفہ نے جھلا کر سامنے رکھی ہوئی دوات ان پر پھینک ماری اور ان کے عہدے سے ان کو برطرف کر دیا۔ چند روز کے بعد جب غصہ ٹھنڈا ہوا اور رقہ کی جگہ ری (طہران) کو دارالخلافہ بنانا طے ہوا تو امام محمد کی طلبی ہوئی۔ چنانچہ وہ ہارون رشید کے ساتھ گئے اور وہیں وفات پائی اور دفن ہوے۔ عام تذکرہ نویس تاریخ وفات ۱۸۹ھ بتانے میں متفق ہیں لیکن میرے علم میں کسی نے دن اور مہینے کی تعیین نہیں کی ہے البتہ کتب خانہ سعیدیہ (حیدرآباد دکن) کے موجودہ ناظم الحاج محمد عبدالغنی صاحب کی اطلاع سے معلوم ہوا ہے کہ کتب خانہ میں ایک قلمی عرائس نامہ (یا اعراس نامہ) ہے جو کم از کم دو سو سال قبل کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں ہے کہ امام محمد کی وفات ۱۴؍ جمادی الآخرہ ۱۸۹ھ دوشنبہ کے دن ہوئی۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس تحریر کو غلط سمجھا جائے گو اس کتاب کے مؤلف کا ماخذ ہم کو معلوم نہیں ہے۔

---

[1] یہ غالباً مشہور ملحد ابن الراوندی نہیں ہے جس کا زمانہ کسی قدر بعد کا ہے۔ اس کا تعلق غالباً اس راوندیہ فرقے سے ہے جس کے متعلق مروج الذہب میں مسعودی نے لکھا ہے کہ اس کے عقیدہ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کا حق (بطور وراثت) حضور کے چچا حضرت عباسؓ اور پھر ان کی اولاد کو حاصل ہوا۔

Marfat.com

امام محمد کو کم عمری ہی سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ کردری، طاشکوپری زادہ وغیرہ متعدد مولفوں نے یہ دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ امام محمد کے ہاں دس رومی (یونانی) لونڈیاں تھیں جو عربی میں اچھی طرح لکھ پڑھ سکتی تھیں۔ جب امام محمد تالیف کے کام میں مشغول ہوتے تو انکے سامنے پانی سے بھرا ایک پیالہ ہوتا اور یہ لونڈیاں ان کو ''علم'' (غالباً فقہ) پڑھ کر سناتی رہتی تھیں۔

امام محمد شیبانی کہلاتے ہیں مگر وہ اس قبیلے کے مولود نہیں مولی تھے۔ معلوم نہیں کسی دوسرے عرب قبیلے کے فرد تھے یا خدا نے انہیں غیر عرب لوگوں میں پیدا کیا۔ ان کے والدین دمشق کے باشندے اور فوج میں ملازم تھے لیکن خود یہ واسط (عراق) میں پیدا ہوئے۔

الکفوی نے (جو کریمیا، روس، کے شہر کفہ کے سپوت گزرے ہیں) حنفی فقہاء کا ایک ضخیم تذکرہ لکھا ہے جو میرے علم میں تا حال چھپا نہیں ہے، استنبول میں اس کے مخطوطے میں لکھا ہے کہ امام محمد نے (۹۹۰) تالیفیں کیں، لیکن اب دس بارہ سے زیادہ نہیں ملتیں، کچھ چھپی ہیں، کچھ چھپ رہی ہیں، اور الامالی الکیسانیات کے سوا (جس کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں ہے اور جو چھپ بھی گئی ہے) باقی کل موجود کتابوں کے نسخے استانبول میں ہیں۔

ترکی جشن اور نمائش مخطوطات امام محمد:

اپنی موجودہ گئی گزری حالت میں بھی ترکی میں اسلامیات کا جتنا ذوق وشوق ہے وہ نہ عرب ممالک میں نظر آتا ہے نہ عجم میں۔ چونکہ جمادی الآخرہ اس سال گرمائی تعطیلات میں پڑ رہا ہے اس لیے بارہ سو سالہ جشن استانبول میں ۱۰ر مئی ۱۹۶۹ء یعنی ماہ صفر میں منایا گیا۔ استانبول یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات، استانبول ہی کے معہد عالی اسلامیات اور ترکی کے سارے معہد ہائے عالی اسلامیات کے طلبہ کے وفاق (فیڈریشن) نے مل کر یہ جشن منایا، اور استانبول کے مرکزی کتب خانہ مخطوطات (سلیمانیہ گنل کتب خانہ سی) میں دو ہفتوں تک کتابوں کی نمائش ہوئی۔

Marfat.com

جشن میں چار پانچ تقریریں ہوئیں، امام محمد کے حالات، امام محمد کا درجہ تدوین فقہ حنفی میں، امام محمد کا ماحول اور علمی کارنامہ، امام محمد کے معاصر، یورپ میں قانون کی حالت، آخرالذکر تقریر اپنی دلچسپی کے باعث ذرا تفصیل کی محتاج ہے۔ ڈاکٹر صالح طوغ جامعہ استانبول کے شعبۂ اسلامیات کے ایک نوعمر استاد ہیں، شعبۂ قانون کے بھی گریجویٹ ہیں اور اسلامی حکومت کے آمد و خرچ (زکوٰۃ) پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ہے، انہوں نے بتایا کہ امام محمد کا معاصر مغربی یورپ (جرمنی، فرانس، اٹلی) میں سب سے بڑا بادشاہ شارلمان تھا، لیکن وہاں کوئی معاصر بڑا ماہر قانون نہیں ملتا۔ اس زمانے میں قانون نام تھا عرف و عادت اور رسم و رواج کا چاہے وہ احوال شخصی (نکاح طلاق) کے متعلق ہو یا کاروبار اور معاملات کے متعلق، مرد کو طلاق کا غیر محدود حق تھا، لیکن مطلقہ عورت کو نکاح ثانی کی اجازت نہ تھی۔ نکاح میں عورت یا تو اس کے سرپرستوں سے خریدی جاتی تھی یا چوری اور لوٹ میں پکڑ لائی جاتی تھی، تعدد زوجات نہ صرف عوام میں بلکہ عیسائیوں اور پادریوں میں بھی رائج تھا۔ جو تحریری قوانین تھے وہ چند شاہی احکام پر مشتمل تھے جو زیادہ تر شارلمان نے اپنی صرف خاص کی جاگیروں کے انتظام کے متعلق دیے تھے ''کاپی پولاریا'' نامی ایک زمانۂ مابعد کی تالیف ہے، ایک باب شارلمان کے ایسے احکام پر بھی ہے، یہ تھی دوسری صدی ہجری (آٹھویں صدی عیسوی) کے یورپی قانون کی حالت۔

ظاہر ہے کہ اس کا امام محمد کی کتاب الاصل سے (جس میں ساٹھ باب ہیں اور جو مخطوطہ مراد ملا استانبول میں آٹھ جلدوں میں اور تقریباً پانچ ہزار صفحوں پر مشتمل ہے) کیا مقابلہ، کتاب الاصل کا مقابلہ رومن قانون کی مشہور کتاب ''مجموعہ قوانین جسٹی نین'' بھی نہیں کر سکتی، جسٹی نین رومی (بیزنطینی) بادشاہ تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارک سے پانچ سال قبل اس کی وفات ہوئی۔ استانبول کی مشہور مسجد آیاصوفیا اسی نے بنائی تھی۔ یہ پہلے ایک بت خانہ تھا۔ جسٹی نین نے جبراً اس پر قبضہ کر کے اسے عیسائی کلیسا بنایا۔ سلطان محمد ثانی نے ۱۴۵۳ء میں استانبول فتح کیا تو صلیب پرستی کے مرکز کو خدا پرستی کا معبد بنایا)۔ جسٹی نین نے رومی قانون کی تالیفوں

Marfat.com

میں اختلافات دیکھ کر ایک کمیٹی بنائی کہ وہ ان سے انتخاب کر کے قابل عمل و مناسب احکام کا ایک مجموعہ تیار کرے (اسے فتاوی عالمگیریہ سے مشابہ کہا جا سکتا ہے) ظاہر ہے کہ اس میں کوئی اپج نہ تھی، اس کے برخلاف امام محمد کے سامنے کوئی نمونہ تھا ہی نہیں، ان کے استاد امام مالک کی موطا فقہ کی کوئی کتاب نہیں، زید بن علی کی کتاب المجموع اگر موجود تھی بھی تو اتنی مختصر کہ روزمرہ کی ضرورتیں بھی اس سے پوری نہیں ہو سکتیں۔

نمائش کتب:

استانبول کی مساجد و مدارس اور خانقاہوں میں ایک سو سے زیادہ کتب خانے تھے۔ اب ان سب کو یکجا کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ سلیمانیہ کتب خانۂ عمومی میں اب (۹۲) کتب خانے اکٹھا ہو گئے ہیں۔ ان کے علاوہ توپ قاپی سرائے، جامعۂ استانبول، ملت، بایزید، کوپرولو، راغب، مراء ملا، نور عثمانیہ، اسکدار، وغیرہ کے کتب خانے ابھی مستقل عمارتوں میں ہیں۔ سلیمانیہ کتب خانۂ عمومی میں اب ڈیڑھ لاکھ سے کم قلمی کتابیں نہ ہوں گی۔ جامعہ کے کتب خانے میں بیس پچیس ہزار مخطوطات ہیں۔ دوسرے کتب خانوں میں سے ہر ایک میں کئی کئی ہزار قلمی کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ آرشیف کے نام سے سرکاری وثائق و دستاویزات کا ایک تاریخی ذخیرہ ہے جس میں چوالیس (۴۴) ملین دستاویزیں اور رجسٹر ہیں۔

امام محمد کی یادگار میں انکی تالیفوں کے جو مخطوطے ہیں ان کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اسکی کچھ تفصیل بے محل نہ ہو گی:

(۱) کتاب الآثار کے (۱۵) نسخے ہیں۔ بروکلمان اور فواد سزگین کی فہرستوں کے مطابق باقی دنیا میں اس کے مزید (۳) نسخے ہیں۔ اس میں فقہی احادیث ہیں اور یہ چھپ بھی گئی ہے۔

(۲) کتاب الاصل جس کو کتاب المبسوط بھی کہتے ہیں، ۲۲ نسخے تھے۔ قدیم ترین نسخہ ۶۳۹ھ کا احمد بن محمد اللطیحی الاصفہانی کا لکھا ہوا ہے، باقی دنیا میں ۱۰

اور نسخے ہیں۔ اسکی ایک درمیانی جلد مصر کے قبطی پروفیسر شفیق شحانہ نے کچھ عرصہ ہوا چھاپی تھی۔ اب دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن میں کامل اشاعت ہو رہی ہے اور تا حال دو جلد چھپ چکی ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس کتاب کے دنیا کے کسی نسخے میں وقف اور ادب القاضی ہی نہیں حج کا باب بھی نہیں ہے حالانکہ سرخسی وغیرہ اپنی شروح میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ کتاب الاصل کا خلاصہ الحاکم المروزی نے المختصر الکافی کے نام سے مرتب کیا، اس کا ایک بہت پرانا ۴۹۶ھ کا لکھا ہوا قلمی نسخہ نمائش میں رکھا گیا تھا۔ دائرۃ المعارف کی تازہ اشاعت میں حج کا باب اسی المختصر الکافی سے لے کر کتاب الاصل میں شامل کیا گیا ہے۔ سیر صغیر کا ذکر نیچے آتا ہے، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کتاب الاصل کے متعدد ابواب (طہارۃ، صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ، جنایات، سیر) سوال جواب کے طور پر مرتب کیے گئے ہیں۔ مثلاً کتاب السیر میں "قلتُ ارایتَ ...... قال......" کر کے امام ابو یوسف کا ایک سوال اور امام ابو حنیفہ کا دیا ہوا اس کا جواب ہوتا ہے۔ اس طرح اس باب میں آٹھ سو سے کچھ زائد سوال اور اتنے ہی جواب ہیں۔ میرا ناچیز گمان یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ کی تدوین قانون کی اکاڈیمی کی یہ رپوٹیں ہیں اور امام محمد نے ان کو بجنسہ محفوظ کر دیا۔ ان میں ان کو کسی حذف یا اضافے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ باقی ابواب میں صرف احکام کا مجموعہ ہے جیسا فقہ کی ہر کتاب میں ہوتا ہے۔ سرخسی نے اپنی کتاب المبسوط میں لکھا ہے کہ امام محمد نے اپنی اکثر تالیفوں کو ایک سے زائد بار از سر نو لکھا اور نئے اڈیشن میں اتنی ترمیم کی کہ اس کو سابق سے کوئی تعلق ہی نہ رہا۔

اس نمائش میں ایک نئی چیز یہ نظر آئی کہ کتاب الاصل کے دو مختلف سٹ ہیں، ایک سٹ میں جو اکثریت پر مشتمل ہے، کتاب السیر اسی سوال و جواب کے نہج پر ہے لیکن دوسرے سٹ مثلاً مخطوطہ جا، اللہ نمبر ۵۷۶ میں یہ

Marfat.com

باب عام ابواب کی طرح احکام کی تفصیلات کا مجموعہ ہے۔ دونوں قسم کے مخطوطوں کا سرسری مقابلہ کیا تو ذیلی ابواب اور فصلوں میں بھی کافی فرق نظر آیا جس میں حذف و اضافہ بھی ہے۔ زندگی ہے تو ان شاء اللہ اس کی مزید تدقیق کی جائے گی۔ دوسرے اہل علم بھی اس گتھی کو حل کرنے کی کوشش فرمائیں۔ ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس کتاب کے ابواب مستقل کتابوں یا رسالوں کے طور پر بھی ملتے ہیں۔ ابن ندیم وغیرہ نے بھی ایسا ہی لکھا ہے اور کتاب الصلوٰۃ، کتاب الکسب، کتاب الحیل وغیرہ اب بھی مستقل مخطوطات کی صورت میں ملتی ہیں۔

(۳) جامع صغیر کے (۱۳) نسخے تھے۔ باقی دنیا میں (۷) دوسرے نسخوں کا پتا چلتا ہے، یہ کئی بار چھپی ہے۔ اس کی بہت سی شرحوں میں ایک سرخسی نے بھی لکھی ہے، جس کا دنیا میں واحد نسخہ استنبول میں ہے۔

(۴) جامع کبیر کے (۴) نسخے تھے۔ (۲) اور نسخے باقی دنیا میں ہیں۔ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد نے اسے بھی چھاپ دیا ہے۔

(۵) کتاب الحج کے یہاں دو نسخے تھے۔ باقی دنیا میں مزید (۲) نسخے ہیں۔ اس میں اہل مدینہ اور اہلِ کوفہ کے فقہی اختلافات کا ذکر ہے جس سے مراد مالکی اور حنفی مذاہب ہیں۔ یہ کتاب بھی حیدرآباد میں چھپ گئی ہے۔

(۶) کتاب الزیادات کے (۴) نسخے تھے، (۲) اور باقی دنیا میں ہیں، یہ آجکل مصر میں وہاں کے ایک نوجوان عالم چھاپ رہے ہیں۔ بہ ظاہر یہ کتاب الاصل کا تتمہ و تکملہ ہے۔

(۷) کتاب زیادات الزیادات کا جس کو سابق الذکر کا ضمیمہ کہنا چاہیے ایک نسخہ تھا، دنیا میں اس کا (۱) مزید نسخہ معلوم ہوا ہے۔ سرخسی کی شرح نکت زیادات الزیادات کے ساتھ اسے بھی احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد نے

Marfat.com

چھاپا ہے۔

(۸) کتاب السیر الصغیر دنیا میں ناپیدسی ہے۔ یہ قانون بین الممالک یعنی جنگ وصلح کے احکام پر مشتمل ہے۔ سرخسی نے لکھا ہے کہ اس کی تالیف پر امام محمد کے استاد امام اوزاعی نے تنقید کی کہ اس میں احادیث کا ذکر اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کا بطور نظائر ذکر نہ ہونے کی وجہ سے کتاب ناقص ہے۔ اس پر امام محمد نے کتاب السیر الکبیر تالیف کی۔ اس کتاب السیر الصغیر کا اب تک پتا کہیں نہ چلا۔ لیکن مذکورۂ بالا کتاب المختصر الکافی الحاکم المروزی نے متعلقہ باب کا عنوان کتاب السیر الصغیر دیا ہے اور اس کی شرح جو المبسوط للسرخسی کے نام سے موجود ومطبوع ہے اسکی جلد دہم صفحہ (۱۴۴) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جہاں لکھا ہے کہ ''سیر صغیر کی شرح مکمل ہوئی''، لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ کتاب الاصل میں سیر کا باب مروزی اور سرخسی کے اس سیر صغیر سے بالکل مختلف ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کتاب الاصل کے باب السیر کے خلاصے میں مروزی کو مناسب یہ معلوم ہوا کہ مولف امام محمد ہی کا مختصر رسالہ سیر صغیر نقل کر دیں۔

(۹) کتاب السیر الکبیر کا اب کوئی نسخہ نہیں ملتا۔ صرف اس کی شرح جو سرخسی نے کی ہے متداول ہے۔ اس کے بیسیوں نسخے ملتے ہیں۔ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن نے عرصہ ہوا اسے چار جلدوں میں چھاپا تھا۔ چند سال قبل سرخسی کی یادگار نمائش میں اس کے سارے نسخے استانبول میں جمع کیے گئے تھے، اس دفعہ اس کا صرف ایک نسخہ جو الحصری کا نقل کردہ بیان کیا گیا ہے، کتب خانۂ داماد ابراہیم پاشا سے لاکر نمایاں کیا گیا تھا۔ یہ ۸۷۲ھ کا لکھا ہوا ہے۔ ممکن ہے نقل النقل ہو۔

(۱۰) امام محمد کی طرف ایک عقیدہ بھی منسوب ہے جسے کسی نے منظوم کیا ہے اسکے

کئی نسخے تھے لیکن یہ ذرا مشتبہ ہی ہے۔

(۱۱) الخارج فی الحیل کا ایک نسخہ کتب خانۂ شہید علی پاشا سے آیا تھا۔ کتاب الاصل میں بھی حیل کا باب ہے۔ لیکن ان دونوں میں مشابہت نظر نہ آئی۔ زیرِ نمائش نسخے میں مسائل عن ابی یوسف عن ابی حنیفہ مروی ہے۔ میں نے تحقیق نہیں کی، اس لیے یہ کہنا دشوار ہے کہ یہ امام محمد ہی کی تالیف ہے۔ یا امام ابی یوسف کی یا خود امام ابوحنیفہ کی، سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ حیلہ ہائے شرعی کی اس کتاب پر کسی نے ہارون رشید کے یہاں چغلی کھائی اور امام محمد کو زندیق قرار دیا۔ پولیس آئی، پنچنامہ ہوا، اور امام محمد کی ساری کتابوں کو ضبط کر کے ان کی فہرست لکھی گئی۔ انسپکٹر نے کتاب الحیل کو کتاب الخیل (گھوڑوں کی کتاب) پڑھ کر غصے سے ایک طرف پھینک دیا، اور اس کو مالِ غنیمت میں داخل نہیں کیا۔ اس طرح امام محمد کی خدا نے لاج رکھ لی، اس کے مماثل ایک قصہ کتاب الاکراہ کے متعلق ہے جس میں یہ بحث ہے کہ اگر کوئی ظالم بادشاہ جان کی دھمکی دے کہ کسی سے اسکی منکوحہ خوبصورت بیوی کو طلاق دلائے تو اس کا کیا اثر ہوگا۔ ہارون رشید سے درباریوں نے کہا اس باب میں امام محمد نے خلیفہ کو ڈاکوؤں سے مشابہ قرار دیا ہے۔ اس پر پولیس نے ان کا گھر محاصرے میں لے لیا، امام محمد کے ایک شاگرد نے کسی ہمسایہ کے مکان کی چھت سے امام محمدؒ کے مکان میں کود کر اس رسالے کو گھر کے کنوئیں میں پھینک دیا اور پولیس تلاشی کے بعد ناکام واپس گئی۔ امام محمد نے دوبارہ وہ مسائل لکھنے چاہے مگر طبیعت مائل نہ ہوئی۔ چند دن کے بعد اس کنوئیں کو صاف کرانے کے لیے مزدور بلایا۔ اس نے دیکھا کہ ایک کتاب ایک ابھرے ہوئے پتھر پر پڑی ہوئی ہے۔ اس طرح یہ کتاب دوبارہ مل گئی اور اس پر امام محمد کو بڑی مسرت ہوئی۔

(۱۲) کتاب الموطا جو امام مالکؒ سے سنی ہوئی فقہی حدیثوں پر مشتمل ہے، اسکے

Marfat.com

(۲۱) نسخے نمایاں کیے گئے تھے۔ دنیا میں اس کے مزید (۳) نسخے ملتے ہیں۔

اس تفصیل سے ناظرین کو استانبول کے کتب خانوں کی ثروت کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔ اگر ساری دنیا کے کتب خانے ایک طرف رکھے جائیں اور استانبول کے کتب خانے ایک طرف تو بھی استانبول کا پلہ بھاری رہے گا۔

امام محمد کی کتاب الامالی جسے الکیسانیات بھی کہتے ہیں استنبول میں نہیں ہے۔ کتب خانۂ آصفیہ کے نسخے کی اساس پر اسے حیدر آباد میں چھاپا گیا ہے۔

دوسری کتابوں میں سے کتاب الرأی اور کتاب الاصول ان کی طرف منسوب ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اب تک لاپتا ہیں۔ کتاب الاصول کا ایک جملہ کہ ''امام محمد کے مطابق فقہ کے اصول یعنی مصادر چار ہیں''۔ ابو الحسین البصری المعتزلی نے اپنی کتاب المعتمد میں نقل کیا ہے، مولانا ابو الوفاء الافغانی مدظلہ نے لکھا ہے کہ سرخسی کی کتاب الاصول اسی امام محمد کی کتاب الاصل کی شرح ہے لیکن مجھے اس میں تامل ہے کیونکہ سرخسی نے اپنی کتاب کے دیباچے میں یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ امام محمد کی کتاب کی شرح ہے (جیسا کہ اپنی دوسری تالیفوں کی تمہید میں وہ ہمیشہ بیان کرتے ہیں) بلکہ یہ لکھا ہے کہ امام محمد کی مختلف کتابوں کی شرح کر چکا ہوں لیکن ان کے طرز استدلال کو سمجھنے کے لیے ایک مستقل کتاب اصول فقہ پر ضروری ہے۔ اس لیے یہ کتاب املاء کراتا ہوں۔ اور کتاب کے اندر امام محمد نے کہا کہ ...... اور ''اس کی اساس یہ ہے کہ ...... '' کا طرز، جو ان کی دوسری کتابوں میں ہے، اس میں نہیں ملتا۔ میری ناقص رائے میں یہ امام محمد کی کتاب کی شرح نہیں بلکہ شمس الائمہ سرخسی کی اپنی تالیف ہے۔

یہ ہیں مختصر حالات امام محمد کے جشن کے جو ترکی میں منایا گیا۔ ممکن ہے، دیگر حنفی، شافعی اور مالکی ممالک بھی اپنا فریضہ یاد کریں۔ جامعہ پاریس کے کلیۂ قانون میں بھی توقع ہے کہ قریب میں مماثل جشن ترتیب دیا جائے گا۔

(معارف اعظم گڑھ۔ جون ۱۹۶۹ء)

Marfat.com

مولانا روم کی سات سو سالہ برسی

معارف وہ پہلا رسالہ تھا جس نے سال بھر سے زیادہ ہوا کہ مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کی متوقع سات سو سالہ برسی پر علمی اداروں کی توجہ منعطف کرائی تھی۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ ۶ ربیع الاول ۶۰۴ھ کو بلخ (افغانستان) میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ ایران میں گزارا، پھر ترکی میں سکونت پذیر ہو گئے اور ۵ جمادی الآخر ۶۷۲ھ کو بمقام قونیہ وفات پائی۔ آپ کا مزار اب تک باعثِ برکات وفیوض ہے۔ کمالی دور کی آندھی جب کچھ تھمی تو حکومت نے اس کے بند دروازے پھر سے کھول دیے اور ''مولانا میوزیم'' کے دیکھنے کے لیے ٹکٹ کے ذریعہ ہزاروں امیر وغریب روزانہ اندر جاتے اور لحد مبارک پر فاتحہ پڑھ کر برکت اندوز ہوتے ہیں۔

معارف میں سال بھر قبل سات سو سالہ برسی کی جانب توجہ دلانے کے باوجود اب تک اس کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں ہوئی اور اس سے دل پر چوٹ لگی کہ خط کے ذریعہ مکرر توجہ دہانی کے باوجود نہ تو زندہ دلانِ پنجاب کو اس قومی میراث کی خبر لینے کی فرصت ہوئی اور نہ علی گڑھ کی جامعہ اسلامیہ اور حیدر آباد اکاڈیمی نے اس کا کوئی جواب دیا۔ یہ ٹیس اس بناء پر اور بھی بڑھ گئی کہ ان خطوط پر روما، جنیوا، گوملنگن اور مائنس نے فوراً توجہ کی اور دھوم دھام سے جلسے کر کے اس کا ثبوت دیا کہ رومی مسلمانوں کا نہیں ان فرنگیوں کا مال ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

آج چند سطریں پاریس کی تقریب کے متعلق لکھی جاتی ہیں شاید ناظرین کے لیے باعث دلچسپی ہوں۔ ۵ جمادی الآخر ۱۳۷۲ھ جمعہ ۲۰ فروری ۱۹۵۳ء کے مطابق ہوتی

Marfat.com

ہے یہاں مسلمانانِ مقیم فرانس کی ایک انجمن ہے جس کا نام .Centre Cultoral Islamico ہے۔ اس نے پارلیس میں اس تقریب کے منانے کا اہتمام کیا اور چند مقامی مسلمان اہلِ علم کے علاوہ فرنگی مستشرقین کو بھی تقریر کرنے کی دعوت دی اور بفضلِ خدا بہت شاندار جلسہ ہوا۔ صدارت انجمن کے ایک ممتاز رکن نجم الدین (افغانی) نے کی۔ ایک رکن علی مظاہری (ایرانی) نے حیاتِ رومی پر مقالہ سنایا۔

پروفیسر ماسینیون نے ''رومی کا حصہ اسلامی تصوف کے ارتقاء میں'' پر تقریر کی۔ پروفیسر فتحی اولکو (ترک) نے ''رومی ترکوں کے ہاں'' اور پروفیسر ماسے صدر کلیہ السنہ شرقیہ واستاذ ادبیات فارسی نے ''فرانسیسی ادبیات میں رومی کا ذکر'' پر مقالہ پڑھا۔ عام دلچسپی کے لیے ایک مقالہ ''قونیہ کی سیر'' پر مادام ویراکوزین نے پڑھا، تمرطاش خانم (ایرانی) نے مثنوی کے اشعار سنائے۔ ان کا فرانسیسی ترجمہ ویراکوزین نے سنایا، گرمی محفل کے لیے حکایت نے بشنو سنی گئی اور ایک مشہور نے نواز نے گراما فون کے ریکارڈ سے لوگوں کو محظوظ کیا۔ سب سے زیادہ مؤثر قرآن مجید کی تلاوت تھی۔ جس سے پتھر کے دل بھی دہل گئے۔ ایک لبنانی عالم شیخ صبحی صالح نے موقع کی مناسبت سے اللّٰہُ نورُ السَّمٰوٰتِ .... الایۃ '' کی تلاوت کچھ اس پر دردلحن سے کی کہ ہفتوں گزر جانے کے بعد بھی لوگ اس کا ذکر کرتے اور داد دیتے رہے۔ آدھی رات کو جلسہ خیر و خوبی سے اختتام کو پہنچا، حاضرین میں کئی سفیر بہ کثرت اساتذہ مختلف ملکوں کے بہت سے گورے، کالے، سانولے، پیلے سب ہی موجود تھے۔ جلسہ میوزے گیمے میں ہوا۔ اس جلسہ گاہ کی اہمیت یہ ہے کہ اس کی اجازت وزیر اعظم فرانس سے حاصل کرنی پڑتی ہے۔ مولانا کے متعلق ایک مختصر نمائش بھی فوٹو کے ذریعہ ترتیب دی گئی۔

صدر جلسہ نے بتایا کہ مولانا روم حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں ہیں۔ اس لیے نسلاً ایرانی بلخ میں پیدا ہوئے۔ (اس لیے وطناً افغانی) ایران میں پرورش پائی اور فارسی میں اظہار خیال کیا، اس لحاظ سے ایرانی اور قونیہ رہ پڑے اور وہاں وفات پائی، اس کے اعتبار سے ترکی ہیں۔ آپ کی تعلیم قرآن مجید کی تفسیر اور حدیث نبوی کی تشریح تھی۔ ایک سچے مسلمان اور صوفی کی حیثیت سے آپ سارے انسانوں کی

Marfat.com

میراث اور ساری دنیا کے لیے باعثِ نازش ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

دوسری تقریروں اور مقالوں کا خلاصہ آسان نہیں۔ تقریریں مختصر اور ٹھوس تھیں۔ ترکی میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ہمیشہ سے جو قدر رہی ہے اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ سلاطین آل عثمان کی تاج پوشی مولانا کے احفاد ہی میں سے کسی نہ کسی بزرگ کے ہاتھوں سے ہوتی تھی۔ مثنوی کا ترکی ترجمہ ہر گھر میں رہتا ہے اور قرآن مجید کے بعد اسی کی سب سے زیادہ تلاوت ہوتی ہے۔

جلسے میں بہت سے بیرونی پیام بھی جو موصول ہوئے تھے سنائے گئے، ایک حضرت ولد چلپی کا تھا جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سب سے معمر اور سب سے زیادہ محترم بزرگ ہیں۔ آپ کا دستخطی پیام عربی خط میں بسترِ علالت سے ترکی سے آیا تھا۔ بلدیہ قونیہ نے مولانا کے ہمسایوں کے جذبات محبت کے اظہار کے لیے ایک طویل تار بھیجا تھا۔ استنبول کے ایک بزرگ نے بھی جو شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں ہیں تار پر پیام بھیجا تھا۔ ترکی، لبنان، اردن، افغانستان و ایران وغیرہ کے وزرائے تعلیم اور اکاڈیمیوں نے اپنی وابستگی کا یقین دلایا۔

پاریس ریڈیو نے اس یادگار کے نظام العمل کو نشر کیا اور سوئٹزر لینڈ کے ریڈیو نے بھی اسے لے کر نشر کیا۔ گوٹنگن (جرمنی) کے جلسے کی یہ خصوصیت قابلِ ذکر ہے کہ اس کا آغاز ایک جرمن پروفیسر کی فارسی تقریر سے ہوا۔ روما میں مولانا روم کے خاص عقیدتمند پروفیسر باوزانی نے مولانا کے ادبی، صوفیانہ اور دوسرے پہلوؤں پر نہایت سیر حاصل تقریر کی جو توقع ہے کہ عنقریب وہاں کے رسالہ مستشرقین میں چھپ جائے گی۔ پاریس کی تقریروں کو بھی ''یادِ رومی'' کے نام سے ایک رسالے کے طور پر یکجا چھاپنے کی تجویز ہے۔

(معارف اعظم گڑھ۔ مئی ۱۹۵۴ء)

Marfat.com

شمس الائمہ السرخسی

مشہور حنفی فقیہ شمس الائمہ سرخسی کی وفات ۴۸۳ھ میں ہوئی۔ سال رواں میں اس پر پورے نو سو سال گذرتے ہیں۔ اُن کی زندگی اور کارناموں کی یاد جہاں ہمارا اخلاقی فریضہ ہے، وہیں بہت سبق آموز بھی ہے۔ کمیت کے لحاظ سے بے شبہ وہ سب سے بڑے حنفی مؤلفِ فقہ ہیں (ان کی کتاب ''المبسوط'' تیس جلدوں میں چھپی ہے) کیفیت کے لحاظ سے کمال پاشا زادہ نے ان کو مجتہدین کے طبقۂ ثالث میں خصاف و طحاوی، اور کرخی وحلوانی کے ہم پایہ تسلیم کیا ہے (۱)۔

وہ اپنا نام اپنی کتابوں یا ان کے ابواب کے آغاز پر خود ہی ابوبکر محمد بن ابی سہل احمد لکھتے ہیں، اس لیے بعض سوانح نگاروں کا یہ بیان سہو سمجھنا چاہیے کہ ان کا نام محمد بن احمد بن ابی سہل تھا۔ غالباً وہ سرخس میں پیدا ہوئے، جیسا کہ ان کی نسبت سے ہویدا ہوتا ہے۔ یہ شہر تاریخِ اسلام میں عرصۂ دراز تک بڑا مردم خیز رہا ہے۔ متعدد مشہور فقہا، طبیب، وزرا وغیرہ یہاں کی خاک سے پیدا ہوئے۔ آج کل یہ ایرانی روسی سرحد پر دونوں مملکتوں میں آدھا آدھا بٹا ہوا ہے؛ دریائے ہری رود اس کے بیچ میں سے گذرتا ہے۔

سوانح نگاروں میں سے متقدمین ان کی تاریخ ولادت بیان نہیں کرتے۔ متاخرین میں فقیر محمد جہلمی (۲) نے اور عبدالحی لکھنوی (۳) نے صراحت کی ہے کہ وہ ۴۰۰ھ میں پیدا ہوئے اور دس سال کی عمر میں باپ کے ساتھ، جو تجارت پیشہ تھے،

Marfat.com

بغداد آئے۔ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی نے اپنی سوانح عمریوں کی مشہور کتاب ''الفوائد البہیۃ''
میں سرخسی کے اور حالات تو دیے ہیں، لیکن تاریخ ولادت بیان نہیں کی۔ لیکن چونکہ مزید
حالات کے لیے انہوں نے اپنی قدیم تر کتاب (مقدمۃ الہدایہ) کا حوالہ دیا ہے، اس
لیے گویا اس تاریخ کی وہ توثیق کرتے ہیں۔ اس تاریخ کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے
کہ سرخسی کے استاد شمس الائمہ حلوانی کی وفات ۴۴۸ھ میں ہوئی، اور مشہور ترین و
ممتاز ترین شاگرد ہونے کی حیثیت سے وہ نہ صرف استاد کے درسگاہ ہی میں جانشین
ہوئے، بلکہ ان کے لقب ''شمس الائمہ'' کے بھی زبانِ خلق سے وارث قرار پائے۔ یہ
بات کسی نوعمر طالبعلم کے لیے کسی طرح ممکن نہیں تھی۔

حلوانی شہر بخارا میں درس دیتے تھے۔ لکھا ہے کہ سرخسی سالہائے دراز تک ان
کے درس میں حاضر رہے۔ سرخسی نے اپنی ''شرح السیر الکبیر'' کے شروع میں صراحت کی
ہے کہ میں نے حلوانی کے علاوہ شیخ الاسلام ابوالحسن علی بن محمد بن الحسین بن محمد السغدی
(ف ۴۶۱ھ) سے بھی کتاب مذکور کا درس لیا۔ اور یہ بات سمجھ میں بھی آتی ہے، کیونکہ
سغدی نے بھی ''السیر الکبیر'' کی ایک شرح لکھی تھی۔ ان کے تیں استادوں میں ابوحفص
عمر بن منصور البزاز بھی ہیں؛ لیکن اُن سے سرخسی نے ''السیر الکبیر'' کا درس اُن کے اس
کی شرح لکھنے سے قبل لیا۔

ان کی ابتدائی زندگی کا ایک واقعہ مولانا فقیر محمد نے انہی کی زبانی نقل کیا ہے۔
انہوں نے اپنے مآخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ لیکن عبارت صاف عربی کا ترجمہ معلوم ہوتی
ہے۔ فرماتے ہیں(۴):

> ''ایک دن کا ذکر ہے کہ طالبعلم آپ سے اس کنوئیں پر جس
> میں آپ قید تھے، سبق پڑھ رہے تھے۔ ایک طالبعلم کی آواز
> آپ نے نہ سنی۔ اس پر آپ نے پوچھا کہ وہ کہاں گیا ہے۔
> ایک طالبعلم نے کہا: وضو کرنے گیا ہے اور میں بہ سبب سردی
> کے وضو نہیں کر سکا۔ امام نے فرمایا کہ: عافاك الله، تجھے

Marfat.com

شرم نہیں آتی کہ اس قدر سردی میں تو وضو نہیں کر سکتا؟ حالانکہ مجھ کو طالبعلمی کے وقت بخارا میں ایک دفعہ عارضہ شکم کا لاحق ہوا تھا، جس سے مجھ کو چالیس دفعہ قضائے حاجت ہوئی۔ پس میں ہر دفعہ نالے سے وضو کرتا تھا؛ جب مکان پر آتا تھا تو میری دوات بہ سبب سردی کے جم گئی ہوتی تھی، پس میں اس کو اپنے سینے پر رکھ لیتا، جب وہ سینے کی گرمی سے حل ہو جاتی، تو اس سے تعلیقات لکھتا تھا۔"

ایک زمانے میں ان کے استاذ حلوانی نے "صفه أشراط الساعة ومقامات القيامة" پر درس کا سلسلہ شروع کیا۔ سرخسی نے اس املا کو قلمبند کیا، اور خوش قسمتی سے یہ کتاب محفوظ رہ گئی ہے۔ اس کا واحد نسخہ پیرس کے کتب خانہ عمومی میں (۵) ہے اس کی تمہید کا ایک فقرہ نقل کرتا ہوں:

سئل الشيخ الامام شمس الائمة (الحلوانی) رحمه الله عن مقامات القيامة و قيام الساعة: هل وردفيها حديث صحيح؟ قال: ورد...... وهذا الحديث الواحد أسلم الأحاديث فی ذلك۔ وهو ماحدثنی الفقيه أبوبكر محمد بن علی سنة خمس و اربع مائة ...... "

تاریخ سے یہ دقیق اعتنا سرخسی نے اپنے استاذ ہی سے سیکھا تھا، جسے انہوں نے خود بھی جاری رکھا۔

ان کے قدیم ترین سوانح نگار ابن فضل اللہ العمری (ف ۷۴۹ھ) نے انہیں "متكلماً فقيهاً اصولياً مناظراً" لکھا ہے (۶)۔ فقہ اور اصول فقہ پر ان کی کتابیں چھپ گئی ہیں۔ "صفة اشراط الساعة" کو شاید علم کلام کی کتاب قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کے اپنے ہمعصروں کے ساتھ علمی مناظروں کے کوئی اور آثار تو محفوظ نہیں

رہے لیکن ان کا قید کیا جانا اسی کا شاخسانہ سمجھنا چاہیے کہ حکمرانِ وقت کی بھی پروانہ کی اور حق کی خاطر قید گوارا کر لی۔ اس کے سوا ہمیں ان کی زندگی کے اور کوئی حالات معلوم نہیں، بجز اس کے کہ ان کے زمانۂ قید کی ایک یادداشت میں (۷) ان کا دردِ دل ان الفاظ میں ظاہر ہوا ہے: ''الممنوع عن الاهل والولد والکتاب المجموعه'' لیکن بیوی بچوں کی کوئی تفصیل نہیں ملتی، حتیٰ کہ قید سے رہائی کے بعد بھی سوانح نگار اس کی طرف اشارہ نہیں کرتے۔

اسباب حبس:

اپنی مختلف کتابوں کے دیباچوں، خاتموں یا دوران میں وہ خود بیان کرتے ہیں کہ یہ زمانۂ قید کا املا ہے، یا کہ میں ان دنوں اُوزجند کے قلعے میں قید ہوں۔ بالآخر جب رہائی ہوئی تو وہاں سے مرغینان چلے گئے، جہاں ایک زیرِ املا کتاب یعنی ''شرح السیر الکبیر'' کا تکملہ مکمل فرمایا۔ لیکن کسی ذریعے سے معلوم نہیں ہوتا کہ اس قید کا باعث کیا تھا۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (زیرِ لفظ ''سرخسی'') میں ہیفینگ نے تحریفِ مآخذ کر کے لکھا ہے ''غالباً انہیں اس لیے قید کیا گیا کہ اُم وَلد کے نکاح کے متعلق انہوں نے حکمران وقت کے فعل پر شرعی نقطۂ نظر سے اعتراض کیا تھا۔'' لیکن یہ گمان قابل رد ہے، اولاً اس لیے کہ سارے مآخذ صراحت کرتے ہیں کہ ان کا یہ اعتراض رہائی کے بعد کا واقعہ ہے؛ دوسرے یہ کہ حکمران خود تو کسی حسینہ سے نکاح کرنے کا خواہش مند تھا نہیں کہ وہ اس فتوے پر ناراض ہوتا، اور تیسرے، مآخذوں سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ امام کی غائر بینی اور نکتہ رسی سے خفا ہونا تو درکنار وہ ان کا اور گرویدہ ہو گیا تھا۔

جامعۂ استانبول کے ''عمومی ترکی تاریخ'' کے پروفیسر احمد زکی ولیدی طوغان نے ایک مرتبہ زبانی گفتگو کے دوران میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اس زمانے میں ابونصر احمد بن سلیمان الکاسانی نامی ایک بدطینت شخص تھا۔ یہ پہلے قاضی القضاۃ بنا، پھر وزیر؛ اور بالآخر بادشاہ کے حکم سے اس نے سزائے موت پائی۔ یہ سب کچھ اُسی کا کیا دھرا ہے۔ لیکن طوغان صاحب کے اس بیان سے اوّل تو قید کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، دوسرے

یہ شخص مغربی قرہ خانیوں کا وزیر تھا، اور ہمارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ اُوزجند (جہاں سرخسی قید رہے، اور جو مشرقی قرہ خانیوں کا پایۂ تخت رہا ہے) اُس زمانے میں مغربی قرہ خانی خاقان کے زیرنگین رہا ہے۔

شہاب الدین المرجانی (ف ۱۳۰۷ھ) نے ''عرفۃ الخواقین فی غرفۃ الخواقین'' کے نام سے ترکستانی حکمرانوں کی جو تاریخ لکھی اور جو ۱۲۸۱ھ میں قازان میں چھپی تھی، اس میں وہ لکھتے ہیں کہ خاقان شمس الملک نصر (۴۶۱ھ - ۴۷۳ھ) جس نے ۴۶۱ھ میں فقیہ ابوابراہیم اسماعیل بن شیث الوائلی الصفار کو سزائے موت دی تھی، غالباً اُسی نے سرخسی کو بھی قید کیا تھا۔ جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے، سرخسی ۴۸۰ھ میں قید سے رہا ہوئے اس اثنا میں ان مغربی قرہ خانیوں کے تین حکمران تخت نشین رہ چکے تھے۔

۱۔	نصر	۴۶۰ھ	تا	۴۷۳ھ
۲۔	اس کا بھائی خضر خان	۴۷۳ھ	تا	۴۷۴ھ
۳۔	اس کا بیٹا احمد بن خضر خان	۴۷۴ھ	تا	۴۸۷ھ

سرخسی کی سی بااثر اور ممتاز شخصیت ان تین حکمرانوں کے دَور میں مسلسل قید رہی ہو، یہ بات کچھ دل کو نہیں لگتی۔

ہیفینگ (حوالۂ بالا) نے قید کو'' خاقان حسن'' کی طرف منسوب کیا ہے اور لکھا ہے کہ جب رہا ہوئے تو انہوں نے مرغینان میں ''امیر حسن'' کے مہمان رہ کر اس کے محل کی دہلیز پر ''شرح السیر الکبیر'' کے باقی حصے کی تکمیل کی۔ خاقان حسن اور امیر حسن کیا ایک ہی شخص ہیں؟ بے شک سوانح نگار ابن قطلو بغا نے امیر حسن کا ذکر کیا ہے لیکن خاقان کو یا تو کاشغر میں رہنا چاہیے تھا یا اُوزجند میں کہ یہی دونوں پایۂ تخت بیان کیے جاتے ہیں۔ مرغینان جیسے صوبائی شہر میں قصرِ شاہی کا ہونا درست نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس زمانے میں ایک خاقان مغربی قرہ خانیوں کا حکمران تھا (۴۶۷ھ - ۴۹۵ھ)۔ اس کا پایۂ تخت کاشغر اور ذیلی پایہ تخت اُوزجند ہی تھا۔ حال میں کچھ پرانے کاغذات دستیاب ہوئے ہیں، جو کاشغر کے انگریز قنصل نے دہلی بھیج دیے تھے (غالباً اب بھی وہیں ہوں

گے)۔ ان میں امیر الحسن بن سلیمان ارسلان قراخاقان نامی حکمران کے ایک شخص کو یارکندہ (یارکند) کا قاضی نامزد کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ اس دستاویز کی تاریخ مٹ سی گئی ہے، ۴۷۴ھ اور ۴۹۴ھ دونوں پڑھے جا سکتے ہیں (۹)۔ لیکن یہ خیال آرائی اس بنا پر قابل قبول نہیں کہ خود سرخسی کے اپنے بیان کے مطابق جب وہ قید سے رہا ہوئے، تو مرغینان میں امام سیف الدین ابراہیم بن اسحاق (بعض مخطوطوں میں: سیف الدین ابوابراہیم اسحاق بن اسماعیل) کے مہمان رہے اور انہی کے گھر پر انہوں نے تدریس و املا کا ماقبی کام سرانجام (۱۰) کیا۔ یہ ممکن ہے کہ مرغینان کے امیر یعنی گورنر کا نام حسن ہو، اور اُم ولد کے نکاح کا مشہور واقعہ بھی اسی سے متعلق ہو۔ لیکن خاقان حسن کے متعلق، جس کا نام ہیفینگ نے لیا ہے، کسی ماخذ میں صراحت نہیں ملتی۔

اس سلسلے میں ممکن ہے کہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم، سابق صدر شعبۂ دینیات، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا خیال صحیح ہو۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں صلیبی جنگوں کے باعث عالم اسلامی میں بحران تھا۔ ہر روز نئے نئے ٹیکس لگ رہے اور بے پناہ مظالم ہو رہے تھے؛ سرخسی نے بعض ٹیکسوں کو ناجائز قرار دیا، اور گویا عدم ادائی محاصل کی تحریک کی قیادت کی تھی۔ اس پر قید ناگزیر تھی۔ مجھے سرخسی کے ایک سوانح نگار محمود بن سلیمان الکفوی کے ہاں اس کا تائیدی مواد ملا ہے (۱۱)۔ فرماتے ہیں: فی فتاوی قاضی خان فی فصل من یوضع فیه النذور: السطان الاجائر اذا أخذ صدقه الأموال الظاهرة، اختلفوا فیه۔ والصحیح ماقال أبو جعفر أنه یسقط الزکاة عن أربابها، ولا یؤمربالاداء ثانیا، لأن له ولایة الاخذ، فصح أخذه و ان لم یضع الصدقة فی موضعها؛ وان أخذ الجبایات أو أخذ مالاً بطریق المصادرة، ونوی صاحب المال عند الدفع الزکاة، اختلفوافیه۔ قال بعضهم: لاتصح۔ وقال شمس الأئمه: الصحیح أنه یجوز فتسقط عنه الزکاة۔" یعنی سرخسی کی رائے میں ناجائز محصول کی ادائی کے بعد جائز محصول کی ادائی کا وجوب باقی نہیں رہتا۔ مولانا فقیر محمد کے الفاظ ہیں (۱۲): ''جب آپ کو ظالم نے قید کر کے اُوزجند کی طرف بھیجا...... الخ'' اس

Marfat.com

سے گمان ہوتا ہے کہ آپ کو بخارا میں قید کر کے اُوز جند جلاوطن کیا گیا تھا۔

زمانۂ قید کی قابلِ رشک علمی سرگرمی:

قلعۂ اوز جند کے سپاہی اور افسر احکام حکومت کے تابعدار تو تھے، لیکن امام سرخسی جیسی زاہد و دیندار شخصیت سے عقیدت اور احترام کے برتاؤ کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔ ابتدائی زمانہ جس نفسی کیفیت میں بھی گذرا ہو، لیکن بعد میں تو کوئی نہ کوئی مشغولیت پیدا کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ سرخسی کی عرصے سے خواہش تھی کہ امام محمد شیبانی کی ''کتاب الاصل'' کا جو خلاصہ ''المختصر'' (نیز ''الکافی''، یا ''المختصر الکافی'') کے نام سے محمد بن احمد الحاکم المروزی نے کیا تھا، اس کی شرح لکھیں۔ زمانۂ قید میں عقیدتمندوں نے اس کی یاد دلائی، اور خود سرخسی کے الفاظ ہیں:

> ''وقد انضمّ الى ذلك سؤال بعض الخواص من أصحابی زمن حبسی، حین ساعد ونی لأنسی أن املی علیهم ذلك۔ فأجبتهم الیه، واسأل الله التوفیق۔''[۱۳]

امام محمد کی ''کتاب الاصل'' ابھی چھپی نہیں (بجز ایک باب کے) مخطوطۂ عاطف واستانبول، (نمبر ۴۲۷ تا ۴۵۷) کی چاروں جلدوں کی ضخامت ۲۵۳ + ۴۳۶ + ۴۷۳ + ۲۴۲ = ۱۴۰۴ ورق ہے۔ مروزی کی ''المختصر الکافی'' کے مخطوطۂ فیض اللہ (نمبر ۹۲۳) میں ۶۰۱ ورق ہیں۔ سرخسی نے اس آخر الذکر کی جو شرح ''مبسوط'' کے نام سے لکھی تھی، وہ مصر میں بڑی تقطیع کی تیس جلدوں میں شائع ہوئی ہے جس کے جملہ ۶۳۳۵ صفحے ہیں۔

اسی طرح سرخسی نے امام محمد کی ''جامع صغیر''، ''جامع کبیر''، ''زیادات'' اور ''زیادات الزیادات'' کی شرحیں بھی اسی قید خانے میں املا کرائیں۔ ان میں سے آخر الذکر احیاء المعارف حیدر آباد کی طرف سے چھپی ہے۔ ''شرح جامع کبیر'' کا ایک ٹکڑا مصر میں مخطوطے کی شکل میں موجود ہے۔

بعد ازاں انہوں نے قید ہی میں اصولِ فقہ پر ایک کتاب املا کرائی، تاکہ امام محمد

Marfat.com

کی کتابوں کی شرح میں جو باتیں بیان کی گئی تھیں، ان کے اصول اور اساسات بھی معلوم ہو جائیں۔ یہ کتاب بھی دو جلدوں میں احیاء المعارف حیدرآباد نے شائع کر دی ہے۔

قید کے آخری زمانے میں انہوں نے امام محمد کی ''سیر کبیر'' کی، جو قانون بین الممالک کی ایک اہم کتاب ہے اور جس کا یونیسکو کی جانب سے ترجمہ بھی ہو رہا ہے، شرح املا کرانی شروع کی۔ اسے دائرۃ المعارف حیدرآباد نے (۳۶۸+۳۱۳+۳۳۹+ ۳۸۸ = ۱۴۰۸ صفحوں کی چار ضخیم جلدوں میں) شائع کیا ہے، اور اب ایک نیا اڈیشن مصر میں بھی چھپ رہا ہے۔ سرخسی کتاب کے باب الشروط تک (جو چوتھی جلد سے صفحہ ۶۰ سے شروع ہوتا ہے، یعنی ۱۰۸۰ صفحات کے اختتام تک) پہنچے تھے کہ بالآخر انہیں رہائی ملی۔ جیسا کہ ذکر ہوا۔ باقی املا کے ۳۲۸ صفحے انہوں نے مرغینان پہنچ کر دس دن میں مکمل کرائے۔

<u>قید کی مدت:</u>

اس عظیم الشان کام کی بعض تاریخیں معلوم ہیں:

۱۔ ''مبسوط''، ج ۲۷، ص ۱۲۴ سے شروع ہونے والی کتاب المعاقل کا آغاز
چہار شنبہ ۱۴ ربیع الاول ۴۶۶ھ

۲۔ ''مبسوط''، ج ۳۰، ص ۲۸۷ سے شروع ہونے والی کتاب الرضاع کا آغاز
پنجشنبہ ۱۲ جمادی الآخرے ۴۷۷ھ۔

۳۔ ''اصول الفقہ'' کا آغاز — شنبہ سلخ شوال ۴۷۹ھ

۴۔ ''شرح السیر الکبیر'' کا آغاز
(ایک روایت میں) دوشنبہ یکم ذی قعدہ ۴۷۹ھ

۵۔ قید سے رہائی — جمعہ ۲۰ ربیع الاول ۴۸۰ھ

۶۔ قید کے مقام یعنی شہر اُوز جند سے روانگی — یکشنبہ سلخ ربیع الاول ۴۸۰ھ

۷۔ مرغینان میں آمد — چہار شنبہ ۱۰ ربیع الآخر ۴۸۰ھ

Marfat.com

۸۔ مکرر آغاز املا، تکمیل کار کے لیے — چہارشنبہ ۲۴ ربیع الآخر ۴۸۰ھ
۹۔ ''شرح السیر الکبیر'' کے املا کی تکمیل — جمعہ ۳ جمادی الاولی ۴۸۰ھ

ان تاریخوں میں پیچیدگیاں بھی ہیں۔ مثلاً نمبر (۳) غالباً ۲۹ شوال ہے، (جسے سلخ آخری تاریخ) سے تعبیر کر کے روز شنبہ تو بیان کیا گیا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ مہینا تیس کا ہوا، اسی لیے نمبر (۴) میں یکم ذی قعدہ یکشنبے کی بجائے دوشنبہ کو لکھا ہے، لیکن نمبر (۳) کی تصحیح نہ کی۔ مزید برآں یہ بھی قرین قیاس نہیں کہ ''اصول الفقہ'' اور ''شرح السیر الکبیر'' دونوں کا املا ایک ساتھ شروع ہوا ہو۔ رہا دنوں کا تفاوت، تو اس کے متعلق فرنگی مؤلفوں نے ہجری عیسوی سنین کے تطابق کی جو جنتریاں شائع کی ہیں وہ پورے طور پر قابل اعتماد نہیں۔ وہ ہجری مہینے کی پوری مدت (۲۹) دن (۱۲) گھنٹے (۴۴) منٹ (۲ ۹/۱۰) سیکنڈ کا حساب کر کے یکم محرم تو ٹھیک بتا دیتے ہیں، لیکن سال کے (۳۵۴) دنوں کو بارہ مہینوں میں بانٹنے کے لیے فرض کر لیتے ہیں کہ ہر سال محرم تیس دن کا ہوگا، جو ظاہر ہے کہ کسی طرح مطابق واقعہ نہیں۔ اس لیے وسٹفلڈ اور کاتنوز کی جنتریوں میں زیر بحث تاریخوں کے جو دن بیان ہوئے ہیں، وہ بعض صورتوں میں سرخسی کے بیان کے مطابق ہیں اور بعض میں نہیں۔ انتیس کو ابر کے باعث رویت نہ ہو، تو سرخسی کے زمانے میں اس کے اثرات بھی پڑنے ناگزیر تھے۔ اس سے قطع نظر، نمبر (۱) اور (۲) بھی دشواری پیدا کرتے ہیں۔ نمبر (۱) کے مطابق کتاب العاقل جو ستائیسویں جلد میں ہے، ۴۶۶ھ میں شروع ہوئی اور نمبر (۲) کے مطابق ''کتاب الرضاع'' جو تیسویں میں ہے، ۴۷۷ھ میں شروع ہوئی۔ گویا تین جلدیں گیارہ سال میں تمام ہوئیں۔ ساری تیس جلدیں اس رفتار سے کہیں (۱۱۰) سال میں پوری ہوتیں پھر یہی نہیں یہ تاریخ ۴۷۷ھ مصر کے ایک مخطوطے [۱۴] میں ہے۔ مصر ہی کے ایک دوسرے مخطوطے [۱۵]، نیز استانبول و دمشق کے [۱۶] مخطوطوں میں سال ۴۷۹ھ ہے۔ دوسرے لفظوں میں تین جلدیں گیارہ نہیں، تیرہ سال میں املا کرائی گئیں، گویا ساری کتاب ''المبسوط'' (۱۳۰) میں پوری ہوئی، یہ سارا عرصہ قید میں گذرا، اور رہائی مزید ایک سال بعد ۴۸۰ھ میں ہوئی، یعنی (۱۳۱)

Marfat.com

سال قید میں گذرے۔ حالانکہ ولادت ۴۰۰ھ میں اور وفات ۴۸۳ھ میں بیان ہوئی ہے۔ اس طرح یہ سارا واقعہ ناممکن ہو جاتا ہے۔

یہ بھی پیش نظر رہے کہ ''اصول الفقہ'' کا آغاز ۲۹ شوال ۴۷۹ھ کو ہوتا ہے اور ایک اور بیان کے مطابق ''شرح السیر الکبیر'' کا آغاز ایک دن بعد یکم ذی قعدہ ۴۷۹ھ کو ہوتا ہے، اور جب اس کے چار ماہ بیس دن بعد رہائی ہوئی ہے، تو اس وقت ''اصول الفقہ'' تمام ہو چکی تھی (اس کے ۸۰۰ مطبوعہ صفحے ہیں)، اور ''شرح السیر الکبیر'' کے (۱۲۸۰) صفحے بھی املا ہو چکے تھے یعنی چار ماہ بیس دن میں دو ہزار سے زائد صفحے املا کرائے گئے، بعد ازاں مرغینان میں مکرر کام شروع کیا، تو صرف دس دن میں (۳۲۸) صفحے املا کرائے گئے۔ اگر روزانہ (۳۲) صفحے املا کرانا ممکن ہے تو مبسوط کی تین جلدوں کے (۸۳۷) صفحے گیارہ یا تیرہ سال (یعنی ۳۸۹۴ یا ۴۶۰۲ دن) میں کسی طرح درست نہیں معلوم ہوتا۔ یہاں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے ''مبسوط'' (۸۰:۸) میں سرخسی خود کہتے ہیں کہ دو سال سے قید میں ہوں ؏ اگر دو سال میں ساڑھے سات، آٹھ جلدیں مکمل ہو سکتی ہیں (جن میں ۱۷۰۲ صفحے ہیں) تو تین جلدوں (کے ۸۳۷ صفحوں) کو گیارہ یا تیرہ سال کیوں لگیں۔

میری رائے میں اصل قصہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ نمبر (۱) کے ۴۶۶ھ کا تعلق اصل میں ''مبسوط'' کے آغاز سے ہے جو کسی سہو سے ستائیسویں جلد میں آ گیا ہے۔ مثلاً ستائیسویں جلد املا کراتے وقت درد دِل کے تحت سوچا کہ کب سے یہ کام چل رہا ہے اور خیال کیا کہ اس ابتلا کی یاد داشت ان آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑی جائے جو اسے پڑھیں گی، اور جب یاد آیا کہ یہ ۴۶۶ھ سے شروع ہوا تو املا کراتے ہوئے کہا ہوگا کہ اسے کتاب کے آغاز میں لکھ لو۔ ظاہر ہے کہ طالبعلموں نے اس وقت تو ستائیسویں جلد ہی میں استاد کے الفاظ نقل کرنا تھے، اگرچہ خواہش یہی ہوگی کہ گھر جا کر مناسب اصلاح کر لیں گے۔ فرض کیجیے کہ ''مبسوط'' کا موجودہ متن اس طالبعلم کی بیاض پر مبنی ہے جو (۱) گھر جانے کے بعد بھول گیا کہ تاریخ کی تصحیح کرنی ہے، یا (۲) وہ خود اس دن موجود ہی نہ تھا اور اس نے کسی رفیق کا نسخہ مستعار لے کر اس دن کا املا نقل تو کر لیا، لیکن رفیق

Marfat.com

سے یہ تحقیق نہ کر سکا کہ استاد نے زبانی کیا کہا تھا، یا (۳) وہ املا میں موجود تو تھا، لیکن کسی وجہ سے استاد کا وہ جملہ کتاب کے آغاز میں نقل کرنے کی ہدایت پر مشتمل تھا، مثلاً اس لیے کہ وہ درس میں کچھ دیر سے پہنچا، یا (۴) ابتدائی مسوداتِ املا کی بعد میں تبیض ہوئی اور یہ تبیض ایک دو نسل بعد ہوئی۔ غرض متعدد امکانات ہیں۔

ان امکانات کی تائید دو تین واقعات سے ہوتی ہے:

(الف) ''مبسوط'' میں تاریخ کے ساتھ دردِ دل کا اظہار تو دو جگہ پر ہے، لیکن بلا تاریخ اپنے قید و بند پر اظہارِ درد، مجھے دو نہیں، مندرجہ ذیل سولہ مقاموں پر ملا ہے:

(۱) آغاز کتاب پر ''مبسوط'' ۱:۲، ۳، ۴

(۲) آخر المناسک ۱۹۲:۴

(۳) آخر النکاح ۲۲۹:۵

(۴) آخر اللعان ۵۹:۷

(۵) آخر الایمان ۲۴۱:۷

(۶) آخر شرکۃ المکاتب ۸۰:۸

(۷) آخر کتاب الولا، عتق ما فی البطن ۱۲۵:۸
(مطبوعہ نسخے میں تو نہیں، لیکن بعض مخطوطوں میں مثلاً کوپرولو، استانبول، کتاب السرقہ کے آخر میں بھی ایک یادداشت ہے)

(۸) آخر کتاب السیر ۱۴۴:۱۰

(۹) دردورانِ بیوع ۱۰۸:۱۲

(۱۰) آغاز کتاب القسمۃ ۲:۱۵

(۱۱) مطبوعہ نسخے میں تو نہیں لیکن توپقائی احمد ثالث کے مخطوطے میں ادب القاضی کے آخر میں۔

(۱۲) ایضاً، در آخر کتاب الرجوع عن الشہادات

(۱۳) ایضاً، در آخر کتاب الاقرار

(۱۴) ایضاً، در آخر کتاب الوکالۃ

(۱۵) آغاز کتاب المعاقل ۲۷:۱۲۴

(۱۶) آغاز کتاب الکسب (۳۰:۲۴۴)، نیز آغاز کتاب الرضاع ۳۰:۲۸۷

(ب) ان میں سے چھٹے مقام پر وضاحت ہے: "با ملاء المحصور المعاتب والمحبوس المعاقب وھو مندحولین علی الصبر مواظب" یعنی دو سال سے قید میں ہیں۔

(ج) جتنے قدیم مخطوطے ملے ہیں، ان سب میں صراحت ہے کہ وہ محمود ابن احمد بن عبدالسید الحصیر ی کا نسخہ ہیں یا اس سے نقل ہوئے ہیں۔ یہ صاحب سرخسی سے تین نسل بعد دمشق میں آ بسے تھے۔ ممکن ہے ان کا تعلق سرخسی کے شاگرد ابو بکر محمد بن ابراہیم الحصیر ی کے خاندان یا کسی شاگردوں کے خاندان سے ہو۔ وہ کسی سیاسی انقلاب میں ترکستان چھوڑ کر شام آئے اور اپنے ساتھ کتابوں کا جو ذخیرہ لائے، اس میں ان کے جد کے مسودات (''کتاب المبسوط'' کے متعلق) بھی ہوں گے، جن کی انہوں نے تبییض کی تا کہ درس و قضات میں کام آئیں؛ ابن قطلو بغا نے تاج التراجم میں لکھا ہے کہ جمال الدین ابو المحامد محمود بن احمد بن عبدالسید بن عثمان بن نصر بن عبدالملک الحصیر ی کی ولادت بخارا میں جمادی الاولی ۵۴۶ھ میں ہوئی اور وفات ۸ صفر ۶۳۶ھ کو، "ونسخ بخطه المبسوط و شرح السیر (الکبیر) وغیرھما......"

غرض گمان ہوتا ہے کہ سرخسی ۴۶۶ھ سے ۴۸۰ھ تک قید کی ابتلا میں رہے۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے کہ ان کا قید کا یہ زمانہ ہم بے قیدوں سے لاکھ درجے بہتر گذرا، اور انہوں نے ہمیں اسیرِ منت فرمایا۔

تاریخِ وفات عام طور پر ۴۸۳ھ بیان کی جاتی ہے۔ بعض جگہ ''فی حدود التسعین'' اور بعض جگہ ''حدود خمس مائۃ'' کے مبہم اور تخمینی الفاظ بھی ملتے ہیں لیکن ابن قطلو بغا، کفوی وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ "فخرج فی اخرِ عمره الی فرغانه" ہم جانتے ہیں کہ خود سرخسی کے بیان کے مطابق وہ ۴۸۰ھ میں علاقہ فرغانہ کے شہر

مرغینان میں جا ٹھہرے تھے، لہٰذا سال وفات ۴۸۳ھ ہی زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی نے تو ماہ جمادی الاولی کی صراحت کی ہے، لیکن اپنا ماخذ نہیں بتایا۔ یہاں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ یہ اختلاف بھی قدیم ہے، استانبول کے مختلف مخطوطوں پر ان کے سابقہ مالکوں نے سرخسی کی تاریخ وفات لکھی ہے، کسی میں کچھ، کسی میں کچھ، مگر بہر حال یہی تین تاریخیں ہر پھر کر سامنے آتی ہیں -- ایک معین اور دو تخمینی۔

قید کی سرگذشت:

سوانح نگار لکھتے ہیں کہ انہیں "فی الجب" ایک کنوئیں میں قید کیا گیا تھا یہ اندھا کنواں، بے آب گڑھا ہوگا جیسا کہ قرآن مجید میں حضرت یوسف کے حال میں مذکور ہے ممکن ہے یہ کسی کمرے کے اندر رہا ہو، تاکہ بارش اور برف باری سے بھی محفوظ رہے، اور قیدی کے فرار کا امکان بھی نہ ہو۔ لیکن خود مؤلف کے درد ہائے دل میں جہاں کئی بار اس کی صراحت موجود ہے، وہاں صرف اتنا ہے:

(۱) فی الحبس بأوزجند (مبسوط، ۱/۲)

(۲) (زمن حبسی (ایضاً)، ۱/۴)

(۳) المحبوس عن الجمع والجماعات (ایضاً، ۴/۱۹۲)

(۴) المحصور عن الا نطلاق للبتلی بوحشة الفرات ...... کتبه العبد البری من النفاق (ایضاً، ۷/۵۹)

(۵) المحصورفی طرف من الآفاق (ایضاً، ۷/۲۴۱)

(۶) المحصور المعاتب والمحبوس المعاقب (ایضاً، ۸/۸۰)

(۷) الممتحن بأنواع البلاء یسأل اللّٰه تعالی تبدیل البلاء والجلاء بالعز والعلاء (ایضاً، ۸/۱۲۵)

(۸) المحصور بتزویر اهل السخف (فی آخر "کتاب السرقة"، ایک مخطوطے میں)

(۹) المتکلم بالحق المنیر المحصور لا جله شبه الاسیر (مبسوط،

Marfat.com

(۱۴۴/۱۰

(۱۰) الملتمس لرفع الباطل الموضوع، المنفی لا جله المحصور الممنوع، عن الاهل والولد والکتاب المجموعه (ایضاً، ۱۰۸/۱۲)

(۱۱) المحبوس فی موضع الاشرار (درآخر "کتاب الاقرار، ایک مخطوطے میں)

(۱۲) أملاه المستخلص من السجن موضع الملالة، المنتظر لتمام الفرج والا قالة (درآخر کتاب الوکالۃ، ایک مخطوطے میں)

(۱۳) املیتها و أنا فی السجن محبوس، وعن أسباب الخلاص فی الدنیا مأیوس، (درآخر "شرح زیادات الزیادات")

(۱۴) أملاءُ یوم السبت سلخ شوال سنة ۴۷۹ھ فی زاویة من حصار أوزجند (درآغاز "اصول الفقہ")

(۱۵) المبتلی بالهجرة الحصیر، المجفو من جهة السلطان الخطیر ...... وقد کان الأفتتاح باوزجند فی آخر أیام المحنة عند هبوب النعمة ...... وکان ابتداء الاملاء باوزجند فی یوم الاثنین غرة ذی القعدة سنة ۴۷۹ھ فی دارالشیخ الصابر الزکی الملقب بأمیر کون أبی علی بن ابی القاسم الی تمام باب الامان، ثم أمرنا بالکتابة فی حصار اوزجند الی أول کتاب الشروط، وتبیّن الخلاص فی یوم الجمعة عشربقین من شهر ربیع الاول سنة ۴۸۰ھ، وقدخرجنا من اوزجند یوم الاحد سلخ شهر ربیع الاول سنة ۴۸۰ھ و دخلنا بمرغینان یوم الاربعا العاشر من شهر ربیع الآخر ونزلنا فی دارالشیخ الامام الاجل الزاهد سیف الدین أبی ابراهیم اسحاق بن اسماعیل ...... فابتدأ کتاب الشروط فی داره یوم الاربعا

الرابع العشرين من شهر ربیع الاخر و تم بعون اللّٰہ وقوتہ فی دارہ یوم الجمعۃ الثالث من جمادی الاولی سنۃ ۴۸۰ھ والحمد للّٰہ تعالیٰ۔ انتھیٰ کلام شمس الائمہ رحمہ اللّٰہ رحمۃ واسعۃ ۔ (''مخطوطہ'' شرح السیر الکبیر'' کتب خانہ عاطف استانبول کا خاتمہ)

ان سارے اقتباسات سے گمان ہوتا ہے کہ اولاً انہیں واقعی ایک اندھے کنوئیں میں پھینک دیا گیا تھا پھر ان کی ریاضت اور صبر سے متاثر ہوکر رفتہ رفتہ حالت میں اصلاح عمل آئی ہوگی۔ ایک زاویے یعنی چھوٹے سے حجرے میں بند رہے، اس کے بعد کسی افسر اور معتمد حکومت کے مکان میں زیر نگرانی رکھے گئے، اور دوبارہ قلعے میں لائے گئے شاید اس لیے کہ ملک کی آئے دن کی جنگوں جھگڑوں میں دشمن انہیں نہ لے اُڑیں۔ بالآخر رہا کیے گئے۔

عام طور پر طریقہ املا کا تھا۔ سوانح نگار لکھتے ہیں کہ طلبہ ''من أعلی الجب'' کنوئیں کے منڈیر پر بیٹھے یادداشتیں لکھا کرتے تھے لیکن مذکورۂ بالا دردِ دل نمبر (۴) میں ''أملاہ المحصور'' کے بعد ''کتبہ العبد البری من النفاق'' کا جملہ تشویش پیدا کرتا ہے۔ کس نے لکھا؟ کیا اس سے وہ شاگرد مراد ہیں جو معتوب شاہی کے پاس حاضر ہونے سے نہیں ہچکچاتے؟ یا اسے ''کتبہ'' پڑھنا چاہیے یعنی ''لکھوایا'' نہ کہ ''لکھا''؟

طریقہ املاء:

مبسوط وغیرہ کتابوں کے کوئی دس ہزار صفحے سرخسی نے شاگردوں کو املا کرائے اوپر دردِ دل نمبر (۱۰) میں وہ صراحت کرتے ہیں کہ بیوی، بچوں اور کتابوں تک سے محروم ہوں۔ ان کی املا کرائی ہوئی کتابیں سوائے ''اصول الفقہ'' کے، ساری کی ساری امام محمد شیبانی کی کتابوں کی شرحیں ہیں۔ امام محمد کی کتابوں میں سے جو ہم تک پہنچی ہیں، ان کا سرخسی کی شروح سے مقابلہ کیا جائے، تو نظر آتا ہے کہ امام محمد ہی کے الفاظ کو سرخسی املا میں دہراتے اور مناسب اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شرح کرتے

Marfat.com

وقت اصل متن سامنے ہو تو بہت سی تحت الشعور باتیں یاد آ جاتی ہیں، اور بات میں بات پیدا ہو جاتی ہے۔ متن کہیں مشکل ہو تو شرح میں اطناب و تفصیل کی گنجائش نکل آتی ہے۔ اس لیے شرح تو شارح کی اپج ہے۔ لیکن امام محمد کے اصل الفاظ کے ہزار ہا صفحات کو کس طرح دہرایا؟ سوانح نگاروں کو اصرار ہے کہ یہ سب انہیں حفظ تھا۔ کیا اسے حسن ظن سمجھا جائے؟ اس سے یہ بات کہیں آسان ہے کہ شاگرد کتاب ساتھ لائیں اور پڑھیں اور استاد اس کی اساس پر شرح لکھوائے۔ نہ درد دل نمبر (۱۰) غلط اور نہ سوانح نگاروں کا بیان غلط۔ کیونکہ شاگردوں کو تو کتاب حاصل کرنے کی ممانعت نہیں تھی؛ اور اگر کنوئیں کے قیدی استاد کی آواز شاگرد سن سکتے ہیں تو شاگردوں کی آواز بھی استاد سن سکتا ہے کہ فاصلہ دونوں طرف سے یکساں ہے۔ ''شرح السیر الکبیر'' میں کئی بار ذکر ہے ''في بعض النسخ'' یا ''في نسخة قديمة'' یہ بھی اسی قیاس کی تائید کرتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ متعدد شاگردوں کے ہاتھ میں کتابیں ہوتی تھیں۔

املا کے وقت کتنے شاگرد حاضر رہتے تھے، معلوم نہیں۔ کفوی نے ان کے بڑے شاگردوں کے نام یہ لکھے ہیں: برہان الائمہ عبدالعزیز بن عمر بن مازہ، شیخ الاسلام الامام محمود بن عبدالعزیز الاوزجندی، الشیخ الامام رکن الدین ابو محمد الخطیب مسعود بن الحسن بن الحسین بن محمد بن ابراہیم الکشانی، عثمان بن علی بن محمد البیکندی (یہ شاگردوں میں سب متاخر فوت ہوئے)۔ ان کے علاوہ اوپر ذکر شدہ الحصیری۔ یہ کہنا دشوار ہے کہ زمانۂ قید میں کون حاضر رہے؛ ان شاگردوں میں شیخ الاسلام اوزجندی کا اس نوع کا تعلق ہونے کا زیادہ امکان ہے۔

ان کی تالیفیں، جو چھپ گئی ہیں، ان میں سے ''مبسوط''، ''شرح السیر الکبیر''، ''اصول الفقہ'' اور ''شرح زیادات الزیادات'' کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ مخطوطات میں سے ''اشراط الساعۃ'' کا پیرس میں اور ''شرح الجامع الکبیر'' کے ایک ٹکڑے کا مصر میں ہونا بھی لکھ چکا ہوں۔

جو کتابیں ناپید ہیں، ان میں سے ''شرح مختصر الطحاوی'' کے متعلق ابن قطلوبغا نے لکھا ہے: ''رأيت قطعة منه''۔ ''شرح الجامع الصغیر'' اور ''شرح الزیادات'' کا

Marfat.com

ذکر خود انہوں نے ''شرح السیر الکبیر'' میں جابجا کیا ہے۔ خصاف کی کتابوں کی جو شرح الصدر الشہید نے کی، اس میں ان کی "شرح النفقات للخصاف" اور ''شرح ادب القاضی للخصاف'' کا ذکر ہے، جیسا کہ مولانا ابو الوفا افغانی نے تحریر فرمایا ہے۔ کشف الظنون میں لکھا ہے کہ ''الفوائد'' سرخسی اور حلوانی کی تالیف ہے؛ اس کا مفہوم واضح نہیں۔ ''کشف الظنون'' میں سہو بیانی کی بھی بہت مثالیں ملتی ہیں۔

بعض وقت اور کتابوں کے بھی حوالے ملتے ہیں، لیکن یہ عام طور پر ''مبسوط'' کے مختلف ابواب ہی کی الگ اشاعت ہوتی ہے مثلاً ''کتاب الکسب''، ''کتاب الحیض'' وغیرہ۔ ان کو مستقل تالیف شمار کرنا درست نہیں۔

مؤلف کی شخصیت:

امام سرخسی کو اہل ہند سے کافی واقفیت معلوم ہوتی ہے۔ ''شرح السیر الکبیر'' وغیرہ میں ایک سے زیادہ مرتبہ وہ مثالوں میں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ سن بلوغ کی قدرتی علامتوں کے متعلق لکھا ہے (۱۶) کہ اس بارے میں ترکوں اور ہندیوں میں فرق ہے ممکن ہے کسی زمانے میں ان کے پاس کوئی ہندی الاصل لونڈی رہی ہو۔

انہیں علم تاریخ سے بڑی دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ سیرت النبی کی قانونی اہمیت سے وہ خوب باخبر ہیں۔ یوں بھی کتاب کے املا میں جابجا خود اپنے حالات کی طرف اشارہ کرنا ذوق تاریخ ہی کی دلیل ہے۔ یہ چیز، ممکن ہے، انہوں نے امام محمد سے سیکھی ہو، جو کثرت سے تاریخی واقعات سے مسائل استنباط کرتے ہیں حتیٰ کہ اپنے کم عمر ہمعصر عالم واقدی کا بھی کثرت سے حوالہ دیتے ہیں۔ کوئی تعجب نہیں جو امام محمد نے یہ ذوق اپنے رفیق درس اور بعد کے استاد امام ابو یوسف سے حاصل کیا ہو۔ ان کا ایک دلچسپ واقعہ ابن خلکان نے ''وفیات الاعیان'' میں لکھا ہے، ایک دن ابو یوسف کو آنے میں دیر ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ ابن اسحاق کے پاس سیرت النبی وغیرہ کے لکچر سننے گئے تھے۔ تو ابو حنیفہ نے طنز سے پوچھا، اچھا یہ بتاؤ کہ طالوت کی فوج کے سپہ سالار کا نام کیا تھا؟ (مراد یہ تھی کہ ان معلومات سے آخر فائدہ کیا ہے؟) ابو یوسف نے کہا، میں مجمع عام میں کہوں گا

Marfat.com

کہ ابو حنیفہ جیسے امام کو یہ تک نہیں معلوم کہ غزوۂ احد پہلے ہوا یا غزوۂ بدر (اور فقہ میں سنتِ نبوی سے استدلال میں مقدم و موخر طرزِ عمل کی بڑی اہمیت ہے) اس پر ابو حنیفہ چپ ہو گئے۔

سرخسی کی کتاب میں ہمعصر معاشرتی اور معاشی معلومات بھی کثرت سے ملتے ہیں، جن سے مورخ بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ بخارا کے مکانوں کا کوفے کے مکانوں سے مقابلہ کیا ہے(۱۷)۔

سرخسی سیاسی قیدی تھے اس لیے جب وہ اپنی سیاسی بصیرت کا جا بجا مظاہرہ کرتے ہیں تو کوئی تعجب نہیں ہوتا مثلاً سب جانتے ہیں کہ رسول اکرم نے صلح حدیبیہ بظاہر دب کر کی تھی لیکن کوئی سیرت نگار یا سیاست نگار مولف ہمیں نہیں بتاتا کہ اس کی وجہ کیا تھی۔ اب امام سرخسی کی توجیہ (۱۸) کو پڑھیے اور سر دھنیے: لأنه كان فيه نظر للمسلمين لما كان بين أهل مكة وأهل خيبر من المواطأة على أن رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا توجه الىٰ أحد الفريقين أغار الفريق الآخر على المدينة۔ فوادع أهل مكه حتى يأمن من جانبهم اذا توجه الى خيبر۔ یعنی مدینے کا محل وقوع مکہ اور خیبر کے بیچوں بیچ ہے اور اس وقت نہ صرف دونوں ہی دشمن تھے، بلکہ ان دونوں دشمنوں کے درمیان سمجھوتا بھی تھا کہ اگر پیغمبر اسلام ایک پر حملہ کریں، تو دوسرا مدینے پر دھاوا بول دے۔ اسی لیے رسول اکرم نے اہل مکہ سے ان کی منہ مانگی شرطوں پر صلح فرمالی، تاکہ خیبر پر حملہ کرتے وقت ادھر سے اطمینان رہے۔

''شرح السیر الکبیر'' میں خاص کر اور اپنی دوسری کتابوں میں بھی عام طور پر سرخسی جب کبھی امام محمد کی کسی ذاتی رائے کی توجیہ کرتے ہیں تو فقہ کے اصول کلیہ سے استدلال کرتے ہیں۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں سرخسی سے متعلق مقالہ نگار ہیفینگ کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ''سرخسی اپنی اس کوشش کے باعث ممتاز ہیں کہ وہ قانون کے عام اساسات (اصول کلیہ) کو نمایاں کرتے ہیں''۔

Marfat.com

خاتمہ:

یہ چند معلومات جو پیچیدگیوں سے خالی نہیں، اہل علم کے ملاحظے میں پیش ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کو دلچسپی ہوئی، اور تلاش کی فرصت بھی، تو اپنی تحقیقات سے وہ ان میں اصلاح و اضافہ کر سکیں گے۔ یہی علم کی ترقی کا واحد ذریعہ ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا بھی میرا اخلاقی فریضہ ہے کہ اس مقالے کے سلسلے میں دارالکتب المصریہ کے محترم مدیر، اور اسی طرح کلیۃ الآداب دمشق کے عزیز پروفیسر صبحی صالح نے قاہرہ اور دمشق کے مخطوطات ''کتاب المبسوط'' وغیرہ کو میری خاطر دیکھنے اور تفصیلات لکھ بھیجنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ جزا هما الله خير الجزاء۔ نیز مجھے معلوم ہوا ہے کہ جامع ازہر میں بھی ''مبسوط'' کے مخطوطے ہیں، لیکن ان سے استفادے کی تا حال کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ وللہ عاقبۃ الامور۔

حواشی

۱۔ ''بیان طبقات المجتہدین والمقلدین'' مخطوطہ انقرہ: ۶۲ ب

۲۔ حدائق الحنفیہ: ۲۰۵

۳۔ مقدمۃ الہدایۃ: ۱۸

۴۔ حدائق الحنفیہ: ۲۰۷

۵۔ عربی نمبر ۲۸۰۰، مجموعہ، ورق ۴۴۲ ب تا ۴۶۵ ب، ۳۱ سطر والی بڑی تقطیع پر

۶۔ مسالک الابصار: مخطوطہ آیا صوفیا ۳۴۱۹، جلد پنجم، ص ۲۸ ب

۷۔ المبسوط: ۱۲: ۱۰۸

۸۔ تاج التراجم، نمبر ۱۵۷

۹۔ دیکھو: BSOS. LONDON. 111. 151.8. BARTHOLD: THE BUGHRA KHAN

Marfat.com

MENTIONED

۱۰۔ شرح السیر الکبیر: جلد چہارم کا خاتمہ

۱۱۔ دیکھیے، کتائب اعلام الاخیار من فقہاء مذہب النعمان المختار، مخطوطۂ اسعد آفندی، استانبول: نمبر ۵۴۸، ورق ۹۱ الف

۱۲۔ حدائق الحنفیہ: ۲۰۵

۱۳۔ المبسوط: ۱: ۴

۱۴۔ دارالکتب، فقہ حنفی ۴۹۰

۱۵۔ دارالکتب، فقہ حنفی، ۹۴۳

۱۶۔ شرح السیر الکبیر، ج۱، ص ۳۶۶

۱۷۔ مبسوط ج ۱۵، ص ۳۰

۱۸۔ شرح السیر الکبیر: ۱: ۲۰۱

کتابیات

- ابن فضل اللہ العمری (ف ۷۴۹ھ): مسالک الابصار (مخطوطۂ آیا صوفیا و توپقاپی، استانبول)
- ابن قطلو بغا (ف ۸۷۹ھ): تاج التراجم (طبع جرمنی)، سوانح نمبر ۳۸
- ابو الوفا الافغانی (ہمارے محترم معاصر) نے ''اصول سرخسی'' اور ''شرح زیادات الزیادات'' کو مرتب کرتے وقت مقدمے میں سرخسی کے حالات دیے ہیں۔
- التمیمی الغزی (ف ۱۰۰۵ھ): الطبقات السنیہ (مخطوطۂ ینی۔ جامع استانبول)
- حاجی خلیفہ (ف ۱۰۶۷ھ) کشف الظنون۔

Marfat.com

- طاشکوبری زادہ (ف ۹۶۸ھ): مفتاح السعادہ (طبع حیدرآباد)، ج ۲، ص ۵۵-۵۶
- عبدالقادر بن ابی الوفا القرشی (ف ۷۷۵ھ)، الجواہر المضیئۃ (طبع مصر) ج ۲، ص ۲۹۔
- عبدالحیٔ لکھنوی (ف ۱۳۰۴ھ): الفوائد البہیۃ (طبع مصر) ص ۱۵۸-۱۵۹؛ انہی کی ''السعایۃ شرح شرح الوقایۃ'' (طبع دہلی) ص ۳۲ انہیں کی: ''عمدۃ الرعایۃ فی حل شرح الوقایۃ'' (طبع لکھنو) ص ۴۱؛ انہیں کی: مقدمۃ الہدایۃ للمرغینانی'' (طبع دہلی)، ص ۱۸
- فقیر محمد جہلمی ثم لاہوری: حدائق الحنفیہ (اُردو) (طبع لکھنو): ص ۲۰۵-۲۰۷
- الکفوی محمود بن سلیمان (ف ۹۹۰ھ): کتائب اعلام الاخیار (مخطوطہ اسعد آفندی، استانبول
- کمال باشازادہ الرومی (ف ۹۴۰ھ): طبقات المجتہدین والمقلدین (مخطوطہ انقرہ ۶۸۷، در مجموعہ)
- الکوثری محمد زاہد (جن کا ۱۹۶۳ء میں انتقال ہوا) بلوغ الامانی فی سیرۃ الامام محمد بن الحسن الشیبانی
- محمد منیب دباغ زادہ عینتابی (ف ۱۲۳۸ھ): تیسیر المسیر فی شرح السیر الکبیر (مخطوطہ جامعہ استانبول) کا دیباچہ؛ انہی کی: ''شرح السیر الکبیر کا ترکی ترجمہ''، طبع استانبول کا دیباچہ۔
- المرجانی شہاب الدین (ف ۱۳۰۷ھ): غرفۃ الخواقین فی غرفۃ الخواقین (طبع قازان) ص ۲۷
- المنجد صلاح الدین (ہمارے معاصر ہیں): شرح السیر الکبیر کے نئے ایڈیشن کا دیباچہ
- Brockelmann, GAL + Supplement, 1, 172, 373 Encyclopaedia of Islam, s.v. Sarakhsiby Heffening.

Marfat.com

۞ Flugel, Classen der hanefitischen Rechtsgelehrten, p. 270-358 (p. 275, 303-4, 301-2, 305-7, 320, 322)

۞ Hamidullah, contributin de l'Iran a la botanique et a la science juridique: Dinawari et Sarakhsi, in: Pensee Chiite, Paris, vol. 1, 13-18.

۞ Heffening, Das islamische Fremdenrecht, appendix.

۞ Scbacht, Sur la transmission de la doctrine dans les ecoles juridiquea de l'Islam, in: Annales de l'Institut d'Etudes Orientales, Algiers, 1952, X, 399-419; : Aus den Bibliotheken von Konstantinopel und Kairo; : Aus Kairiner Bibliotheken; : Aus orientalischen Bibliotheken

ء

(نذرِ عرشی۔ مرتبہ مالک رام و مختار الدین احمد
مجلس نذرِ عرشی، نئی دلی۔ ۱۹۶۵ء)

Marfat.com

امام سرخسی کی نوسو سالہ برسی

اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ بلند بانگ دعوی کرنے والے عمل میں ہیٹے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس دفعہ بھی ایک عظیم ملی میراث پر مطعونِ ملت ترکی ہی نے توجہ کی اور امام سرخسی کی یادگار بین الاقوامی طور پر منائی۔ اس کی روداد لکھنے سے پہلے ایک اور یادگاری جشن کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو گزشتہ سال ترکی ہی میں منایا گیا تھا۔

آج سے بارہ تیرہ سال قبل معارف کے دو نمبروں میں میں نے عرض کیا تھا کہ ابو حنیفہ دینوری اپنے زمانے تک اسلام ہی کا نہیں، ساری دنیا کا سب سے بڑا نباتاتی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی کتاب النبات جو اپنے فن کی ایک جامع انسائیکلو پیڈیا ہے، چھ ضخیم جلدوں میں تھی، جن میں ایک جلد استنبول میں ملی، اس کے بعد ایک اور جلد ییل (Yale امریکہ) میں ملی۔ اس حنفی المذہب مفسر، مورخ، ریاضیاتی (وغیرہ، وغیرہ ہمہ داں عالم) کی وفات ۲۸۲ھ میں ہوئی۔ توجہ دلانے پر بھی اور ملک تو غافل رہے، مگر جامعہ استنبول کے شعبۂ طب نے اس کی وفات کی گیارہ سو سالہ سالگرہ منائی۔ ان تقریروں کے علاوہ جو جامعہ استنبول کے مجلۂ حیاتیات میں چھپ گئی ہیں، اس موقع پر وہاں ایک اعلیٰ نمائش بھی ہوئی تھی جس میں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے وہ تمام نباتیاتی مخطوطے جو استنبول کے کتب خانوں میں تھے، جمع کیے گئے تھے، ان میں بہت سے باتصویر تھے، ابن سینا کی کتاب الشفا کا حصۂ نباتات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے، اس میں سات سو سے زاید جڑی بوٹیوں کی رنگین اور نہایت نفیس مطابق اصل تصویریں

Marfat.com

ہیں۔ یہ کتب خانہ آیا صوفیہ میں ہے۔

بار بار توجہ دلانے کے باوجود حنفی اور عربی ملکوں کو امام سرخسی جیسی عظیم شخصیت کی نوسو سالہ سالگرہ وفات منانے کی توفیق نہیں ہوئی اور اس کو بدنام ترکی کی جامعہ انقرہ کے کلیۂ الٰہیات نے ۳۰رذی الحجہ ۱۳۸۳ھ کو منایا۔ اس میں بیرونی ممتاز اہل علم میں پروفیسر شاخت نے جن کے نام سے معارف کے اکثر ناظرین واقف ہوں گے، شرکت کی۔ اس یادگار جشن میں ''نمائش سرخسی'' بھی ہوئی، جس میں سرخسی کی تالیفوں کے مخطوطے جمع کیے گئے تھے۔ ان کا تذکرہ کرنے سے پہلے امام سرخسی کی مختصر سوانح عمری بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ معارف کے ذریعہ انکی اشاعت سے ہندوستان میں بھی امام سرخسی کی یادگار منانے کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔

سوانح عمری:

ممتاز ترکی فقیہ کمال پاشا زادہ نے اپنی کتاب ''بیان طبقات المجتہدین والمقلدین'' میں لکھا ہے کہ سرخسی کو خصاف، طحاوی، کرخی اور حلوانی کے ساتھ مجتہدین کے طبقۂ ثالثہ میں شمار کیا جا سکتا ہے یعنی امامؒ ابوحنیفہ اور صاحبین (ابو یوسف ومحمد شیبانی) کے بعد ان کا نمبر آتا ہے۔

علمی قابلیت کے لحاظ سے اگر انہیں یہ درجہ حاصل ہے تو علمی پیداوار کے لحاظ سے وہ شاید سب سے آگے ہیں۔ ان کی کتاب المبسوط ہی تیں جلدوں میں بڑی تقطیع کے (۶۳۳۵) صفحوں میں ہے اور جیسا کہ آگے عرض کیا جائے گا، یہ ان کی واحد تصنیف نہیں۔

مولانا عبدالحیؒ لکھنوئ نے مقدمۃ الہدایہ میں اور مولانا فقیر محمد جہلمی نے حدائق الحنفیہ میں صراحت کی ہے کہ سرخسی کی ولادت ۴۰۰ھ میں ہوئی۔ امام سرخسی نے اپنی کتابوں کے دیباچے وغیرہ میں اپنا نام ابوبکر محمد بن ابی سہل احمد سرخسی تحریر کیا ہے۔ اس لیے بعض سوانح نگاروں کا اختلافی بیان ناقابل توجہ ہے۔ مقدمۃ الہدایہ اور حدائق الحنفیہ ہی میں یہ بھی ہے کہ تجارت کے سلسلہ میں انکے والد جب بغداد آئے تو نو عمر (دس

Marfat.com

سالہ) امام بھی ساتھ تھے۔ پھر بخارا میں سالہا سال تک شمس الائمہ عبدالعزیز حلوانی کے درس میں شریک رہے۔ ان کے شاگردوں میں سرخسی کے پایہ کا کوئی نہ تھا۔ اس لیے اہل علم نے انہیں نہ صرف استاد کی مسند درس پر بٹھایا بلکہ استاد کے لقب شمس الائمہ کا بھی وارث قرار دیا۔ اس لحاظ سے وہ شمس الائمہ ثانی ہیں لیکن شمس الائمہ کا نام سن کر اہل علم کا ذہن اولا سرخسی ہی کی طرف منتقل ہوتا ہے، جب تک کہ دوسرے صاحب لقب کی صراحت نہ ہو۔

ان کے سوانح نگاروں میں سے سب سے قدیم ابن فضل اللہ العمری ہے، اس کی مسالک الابصار کی جلد پنجم (مخطوطۂ آیا صوفیہ) میں ان کو فقیہ، اصولی، متکلم، مناظر اور ان علوم میں سارے ہمعصروں پر فائق بتایا گیا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ کسی بات پر خفا ہو کر حکمرانِ وقت نے ان کو شہر اوز جند کے قلعے کے ''جُبّ'' (اندھے کنوئیں) میں قید کر دیا، جہاں وہ سالہا سال محبوس رہے، لیکن پھر کنویں کی منڈیر پر طلبہ کو آنے کی اجازت مل گئی تو سرخسی کنویں کے اندر سے درس املا کرایا کرتے تھے، جس کے مجموعے نے متعدد کتابوں کی صورت اختیار کی۔ مولانا فقیر محمد کے بیان میں اتنا اضافہ ہے کہ بخارا میں گرفتار کر کے اوز جند میں جلاوطن کیا گیا تھا۔

یہ صحیح پتا نہیں چلتا کہ کس حکمران نے اور کس جرم میں امام سرخسی کو قید کیا تھا۔ اس کے لیے صرف قیاس کو کام میں لایا جا سکتا ہے۔ اس زمانہ میں بخارا اور اوز جند علم دوست سامانیوں کے جانشین قرہ خانی خانوادے کے قبضے میں تھے، لیکن اس خانوادے کے نہ سارے حکمرانوں کے نام معلوم ہیں اور نہ تاریخ حکمرانی۔ طرہ یہ ہے کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس خاندان کے افراد میں خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں اور مشرقی اور مغربی قرہ خانی دو خودمختار ملک بن گئے، مگر ان کی سرحدیں اکثر بدلتی رہیں، چونکہ اوز جند انتہائے مشرق میں چین کی سرحد کے قریب ہے، اس لیے گمان ہوتا ہے کہ یہ مشرقی خانوادے کی کارستانی تھی، لیکن قید کی وجہ کا کہیں پتا نہیں چلتا، خود سرخسی نے کتاب المبسوط کے مختلف ابواب کے آغاز یا اختتام پر پندرہ سولہ مرتبہ اصول الفقہ کے شروع زیادات الزیادات کے آغاز اور آخر میں، نیز شرح السیر الکبیر کے آخر میں اپنی قید کا ذکر کرتے ہوئے اس کے اسباب کی طرف مبہم سا اشارہ کیا ہے، مثلاً سلطان کو کلمۂ خیر کی

Marfat.com

نصیحت، زندیق و بدقماش لوگوں کی سلطان کے پاس ان کی جھوٹی چغلی وغیرہ۔ اس سے زیادہ وضاحت نہیں ملتی، اس سلسلہ میں استاذ الاساتذہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا بیان دل کو لگتا ہے کہ اس زمانے میں بدانتظامی اور مالی ابتری کے باعث بے شمار نئے نئے ٹکس لگ رہے تھے، غالباً سرخسی نے فتویٰ دیا کہ وہ ناجائز ہیں اور ان کی ادائی واجب نہیں، اس طرح وہ عدم ادائی محاصل کی تحریک کے ''سرغنہ'' قرار پائے۔ ایسی حالت میں وہ حکومت کی نگاہ میں جس ظلم کے بھی مستوجب قرار پائیں کم ہے۔ کتاب المبسوط جلد دہم صفحہ ۲۱ میں ان کا ایک بیان بھی ہے، جس میں وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ ''ہمارے زمانے کے اکثر محصول ناجائز ہیں، جو ان کی مقاومت کرے اور ادا نہ کرے وہ ثواب کا مستحق ہے''، انسائکلو پیڈیا آف اسلام اور اس کے خوشہ چیں ابوزہرہ اور صلاح الدین المنجد کا یہ گمان یا بیان لغو ہے کہ ام ولد لونڈی کے لیے نکاح سے قبل عدت کے ضروری ہونے کا جو فتویٰ سرخسی نے دیا اس پر وہ معتوب ہوئے تھے، ابن فضل اللہ وغیرہ جو ان معلومات کا ماخذ ہیں، اس واقعہ کے ضمن میں اس کی صراحت کرتے ہیں کہ یہ قید سے نکلنے کے بعد کا واقعہ ہے اور امیر البلد خود کسی کی ام ولد سے نکاح کرنا نہیں چاہتا تھا، بلکہ اپنی امہات ولد کو آزاد کرنا چاہتا تھا، اس لیے اس فتویٰ پر اس کی برہمی کی کوئی وجہ نہ تھی۔

قید کی آپ بیتی کے سلسلے میں مبسوط (جلد ۷ صفحہ ۲۴۱) میں فرماتے ہیں کہ دنیا کے ایک دُوردراز کونے میں مجھے قید کیا گیا ہے (ج ۸ ص ۱۰) میں ارشاد ہوتا ہے کہ دو سال سے صبر پر عامل ہوں۔ (ج ۱۲ ص ۱۰۸) میں ہے کہ بیوی بچوں اور کتاب ہر چیز سے ممنوع ہوں، مبسوط کے مطبوعہ نسخے میں تو نہیں لیکن متعدد قلمی نسخوں میں کتاب الوکالہ کے آخر (ج ۱۹) میں یہ وضاحت ہے کہ

المتخلص من السجن موضع الملالة المنتظر لتمام الفرج والا قالة۔

قید خانہ جیسی ملول کرنے اور تھکا دینے والی جگہ سے تو نجات ملی ہے لیکن کامل رہائی اور معافی کا انتظار ہے۔

(ج ۲۷ ص ۱۲۶) کتاب المعاقل کے آغاز میں تاریخ املا، چہار شنبہ ۱۴ ربیع الآخر ۴۷۷ھ میں بھی ہے لیکن ایک مخطوطے کے سوا باقی سارے بیس پچیس مخطوطے جو میں نے دیکھے ہیں، ان میں ۴۷۹ھ کی تاریخ بتائی گئی ہے، اس مسئلے پر ہم نیچے بحث کریں گے۔

یہ تو مبسوط میں قید کے متعلق اشارات تھے، اصول فقہ کے آغاز میں بھی لکھا ہے "حصار اوز جند کے ایک زاویے میں سنیچر سلخ شوال ۴۷۹ھ کو املا کرایا گیا۔

نکت زیادات الزیادات کے آخر میں تاریخ تو نہیں ہے لیکن یہ دلخراش جملہ ہے "یہ اس زمانے کی تالیف ہے جب میں قید خانہ میں محبوس اور رہائی پانے کے اسباب سے مایوس ہوں۔"

سب سے زیادہ تفصیل اور ساتھ ہی پیچیدگی شرح السیر الکبیر کے خاتمے میں ہے، اس کے بعض مخطوطوں میں لکھا ہے کہ اس کتاب کے املا کا آغاز دوشنبہ غرۂ ذیقعدہ ۴۷۹ھ کو کسی ابوعلی الحسین بن ابی القاسم الملقب بہ امیر گون کے مکان میں ہوا۔ ابواب امان کے اختتام کے بعد حکم ہوا کہ تدریس مکرر اوز جند کے حصار میں ہو، اور جب ابواب شروط کے آغاز پر پہنچے تو ۴۸۰ھ جمعہ کے دن جب ربیع الاول کے دس دن باقی تھے، رہائی عمل میں آئی۔ اس کے دس دن بعد اتوار سلخ ربیع الاول کو اوز جند سے روانہ ہوئے، چہار شنبہ ۱۰ ربیع الآخر کو مرغینان پہنچ کر امام سیف الدین ابوابراہیم اسحاق بن اسماعیل کے گھر مہمان ہوئے اور لوگوں کی خواہش پر چہار شنبہ ۲۴ ربیع الآخر کو ابواب الشروط سے مکرر املاء کرانا شروع کیا اور کل دس دن میں جمعہ ۳ جمادی الاولی ۴۸۰ھ کو پورا کر دیا۔ یہ واضح رہے کہ شرح السیر الکبیر کے حیدرآبادی طباعت اول میں (۱۴۰۸) صفحے اور مذکورہ ابواب الشروط سے کتاب کے آخر تک (جلد چہارم میں) ۳۲۸ صفحے ہیں جو صرف دس دن میں املا کرائے گئے ہیں۔

اس میں پیچیدگیاں یہ ہیں کہ مذکورۂ بالا تصریحات کے مطابق اصول الفقہ کا آغاز سلخ، شوال ۴۷۹ھ کو اور شرح السیر الکبیر کا آغاز اس کے ایک ہی دن بعد غرہ، ذیقعدہ ۴۷۹ھ کو ہوا۔ ایسی حالت میں اصول الفقہ کے مطبوعہ تقریباً ساڑھے سات سو

Marfat.com

صفحے کیا صرف ایک دن میں املا کرا دیے گئے؟ اور اگر اصول اور سیر دونوں کتابوں کا املا ساتھ ساتھ جاری رہا تو ان دونوں کے (۱۴۰۸+۷۳۴) جملہ (۲۱۴۲) صفحے کیا صرف پانچ ماہ میں روزانہ (۱۴) صفحوں کے اوسط سے املاء کرائے گئے؟ جو قیاس میں نہیں آتا، اس لیے خیال ہوتا ہے کہ کہیں آغاز کی جگہ یہ اتمام کی تاریخ تو نہیں؟

یہ بھی یاد رہے کہ مبسوط کا آخری باب (ج ۳۰ ص ۲۸۷) ۱۲ر جمادی الآخرہ ۴۷۷ھ (مگر سارے ہی مخطوطات کے مطابق ۴۷۹ھ) میں املا کرایا گیا، اس تاریخ اور مذکورہ بالا غرۂ ذیقعدہ کے درمیان تین مہینے سترہ دن ہوتے ہیں، اسی وقفے میں کم از کم نکت زیادات الزیادات بھی املاء کرائی گئی اور غالباً جامع صغیر، جامع کبیر اور زیادات کی شرحیں بھی۔

تصنیفیں:

اب تک مبسوط، اصول الفقہ، شرح السیر الکبیر، نکت زیادات الزیادات چار کتابوں کا ذکر ہوا، جو سب چھپ چکی ہیں، شرح جامع صغیر، شرح جامع کبیر اور شرح زیادات، تین اور کتابوں کا ذکر ان کی اصول الفقہ اور شرح السیر الکبیر میں کئی بار آیا ہے، جامع کبیر کا ایک ٹکڑا جو کتاب الدیات پر ختم ہوتا ہے، مصر میں ہے، شاخت نے بروصہ اور آیا صوفیہ (استانبول) میں دو نسخوں کا ذکر کیا تھا، لیکن میری تحقیقات میں یہ غلط ثابت ہوئے۔ شرح جامع صغیر کا ابھی ابھی پتا چلا ہے، آیندہ نمایش کے سلسلے میں اس کا ذکر آئے گا۔ خود سرخسی نے اپنی مبسوط (ج ۲۰ ص ۷ تا ۸) میں مشترکہ کفالت کی متناسب ذمہ داری کے ایک مسئلے پر جو ''فقہی ریاضیات کا سب سے پیچیدہ مسئلہ'' ہے، اپنی ایک تالیف کا ذکر کیا ہے۔

ابن قطلوبغا کی تاج التراجم میں ہے ''میں نے ان کی شرح مختصر الطحاوی کا ایک ٹکڑا دیکھا ہے''۔ لیکن اب تک اس کتاب کا کوئی پتا نہیں چلا، کتاب النفقات للخصاف اور کتاب ادب القاضی للخصاف کی شرحیں بھی سرخسی کی جانب منسوب ہیں، جیسا کہ مولانا ابوالوفاء الافغانی مدفیضہٗ نے اصول سرخسی کے دیباچے میں لکھا ہے، ان کی تالیف

Marfat.com

کا زمانہ معلوم نہیں، یہ تینوں اب ناپید ہیں۔ یہ سب دس کتابیں ہوئیں جن کے متعلق کوئی شبہ نہیں۔

کشف الظنون میں یہ عجیب بیان ہے، ''سرخسی اور حلوانی کی کتاب الفوائد'' معلوم نہیں اس سے کیا مراد ہے۔

سرخسی کی کتاب ''الشرائط الساعۃ و مقامات القیامۃ'' اغلباً قید سے پہلے کی تالیف ہے کیونکہ اس کا جو مخطوطہ پاریس میں ہے اس کے آغاز میں اس کی صراحت ہے کہ یہ سرخسی کے استاد عبدالعزیز الحلوانی کا املاء ہے، جن کی وفات ۴۴۸ھ میں ہوئی اور اس وقت تک سرخسی کی قید کا کوئی سوال پیدا نہ ہوا تھا۔

ان کی طرف کتاب الحیض، کتاب الکسب وغیرہ کی جو شرحیں منسوب ہیں، وہ کوئی مستقل کتاب نہیں، بلکہ ان کی کتاب المبسوط ہی کے مختلف ابواب ہیں۔

وفات:

عام طور پر پرانے سوانح نگار ان کی وفات ۴۸۳ھ میں بتاتے ہیں، عبدالقادر القرشی نے الجواہر المضیۃ میں (فی حدود التسعین واربع مائۃ) چار سو نوے سے کچھ پہلے کا مبہم لفظ استعمال کیا ہے۔ مقریزی کی ''تذکرہ'' کا مجھے پتا نہیں چلا، کیونکہ وہ ناپید ہے، مگر اس کے حوالے سے مولانا ابوالوفاء الافغانی نے اصول سرخسی کے دیباچے میں ''فی حدود الخمسمائۃ'' ۵۰۰ھ سے پہلے کا مبہم بیان نقل کیا ہے، مولانا عبدالحئی لکھنوی نے فوائد بہیہ میں ۴۸۳ھ میں وفات بتائی ہے، لیکن مقدمۃ الھدایہ میں لکھا ہے کہ ''جمادی الاولیٰ ۴۹۴ھ میں وفات پائی اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ ۴۸۳ھ میں۔''

میرے نزدیک ۴۸۳ھ زیادہ قرین قیاس ہے، کیونکہ ابن قطلو بغا اور کفوی وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ ''عمر کے آخری حصہ میں علاقہ فرغانہ تشریف لے گئے''۔ اوپر گزر چکا ہے کہ ۴۸۰ھ میں اوزجند سے نکلنے کے بعد مرغینان بھی جا بسے تھے، جو علاقہ فرغانہ ہی کا ایک شہر ہے، سالہا سال کی قید اور غیر صحت بخش زندگی کو اپنی قوت ایمانی سے وہ تحمل اور صبر کے ساتھ برداشت تو کرتے رہے لیکن اس نے ان کی صحت

Marfat.com

برباد کردی ہوگی، ۸۳ سال اچھی خاصی عمر ہے، اسلیے ۴۸۳ھ میں وفات ہوگئی ہوگی۔

نمائش:

پہلی تجویز یہ تھی کہ پوری مملکت ترکی سے سرخسی کی تالیفوں کے تمام مخطوطے انقرہ لائے جائیں، لیکن مبسوط جیسی ضخیم کتاب کے استنبول ہی میں کوئی تیس نسخے ہیں، ساری تالیفوں کو پورے ملک سے لاتے ایک ویگن بھر کتابیں ہو جاتیں، اس لیے مجبوراً یہ طے ہوا کہ انقرہ میں صرف مطبوعہ کتابوں کی نمائش ہو اور غیر مطبوعہ تالیفوں کے فوٹو رکھے جائیں لیکن غیر مطبوعہ کتابوں میں صرف اشراط الساعۃ کا فوٹو رکھا جا سکا، بڑی نمائش استنبول میں کی گئی، کیونکہ بڑا ذخیرہ وہیں ہے اور شہر کے کتب خانوں سے مخطوطوں کو نمائش گاہ میں لانا آسان بھی تھا۔

انقرہ کی مجلس ۳/ ذی حجہ ۱۳۸۳ھ (۱۵/ اپریل ۱۹۶۴ء) کو ہوئی اور نمائش کا افتتاح استنبول میں ۱۶/ ذی الحجہ (۲۸ اپریل) کو ہوا، جو دس دن جاری رہی، نمائش میں بہ ترتیب حسب ذیل کتابیں تھیں۔

امام محمد شیبانی کی کتاب الاصل کا ایک مکمل نسخہ تھا کیونکہ اساسی کتاب یہی ہے، پھر الحاکم المروزی الشہید کی المختصر الکافی کا ایک مکمل نسخہ جو کتاب الاصل کا خلاصہ ہے اور اسکی شرح سرخسی نے مبسوط کے نام سے املا کرائی تھی، مبسوط کے تیس سے زائد مکمل یا نامکمل مخطوطے تھے، ان میں قدیم ترین مخطوطہ توپ کپوسرائے سے آیا تھا جو صفر ۵۱۶ھ کا مکتوبہ ہے، ۶۲۲ھ وغیرہ ساتویں صدی کے متعدد نسخے تھے۔

اصول فقہ کے (۱۱) نسخے تھے، جن میں سے قدیم ترین نسخہ مکتوبہ ۶۵۲ھ کتب خانہ نور عثمانیہ کا تھا، شرح الزیادات کے (۳) نسخے جن میں قدیم ترین ۶۱۴ھ کا تھا۔

شرح السیر الکبیر مولف کی آخری تالیف ہے، اس کے (۴۵) مکمل یا نامکمل نسخے تھے، ان کو تین زمروں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

(الف) دو ٹکڑے جو کتب خانہ فاتح سے آئے تھے، ان کے آغاز کی عبارت یہ ہے:

Marfat.com

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم مجلس من املاء الشیخ الامام الاجل الزاھد امام الائمۃ ابی بکر محمد بن ابی سھل السرخسیؒ فی غرۃ ذی القعدہ سنۃ تسع و سبعین و اربعمائۃ فی دارالشیخ الصاین (؟ الصابر) الزکی الملقب باسیر کوہ باوزجند فی سکۃ سالار: قال الامام الاجل الزاھدؒ اعلم بان السیر الکبیر آخر تصنیف صنفہ محمد ......

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ امام سرخسی (بالقابہ) کے املاء کی ایک نشست یکم ذیقعدہ ۴۷۹ھ کو امیر کوہ [غالباً امیرگون] لقب والے افسر کے مکان میں جو سکہ سالار نامی گلی میں ہے، [امام سرخسی] نے کہا کہ سیر کبیر امام محمد شیبانی کی آخری تالیف ہے.........

ان دو مخطوطوں میں سے ایک بہت چھوٹی تقطیع کے ۸۷ اوراق پر مشتمل تھا، گویا ایک نشست میں املاء کرائے ہوئے درس کی یادداشت تھا، دوسرے ٹکڑے میں ۴۰۸ اوراق ہیں، چھوٹا ٹکڑا بہت قدیم ساتویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا تھا۔ بدقسمتی سے اس کے آغاز اور وسط کے چند اوراق ضائع ہو گئے تھے، بعد میں کسی نے (غالباً مذکورہ دوسرے ٹکڑے سے) ان کی تکمیل کی تھی۔

(ب) کوئی بیس مخطوطے جن کو اساسی نسخہ قرار دیا جاتا ہے (دائرۃ المعارف حیدرآباد کا ایڈیشن اس کے مطابق ہے) ان میں قدیم ترین مخطوطہ ۸۶۶ھ کا تھا، اسکی خصوصیت یہ ہے اس کے شروع میں مجلس املاء کا کوئی ذکر نہیں بسم اللہ کے بعد ہی اس طرح شروع ہوتا ہے کہ

''سرخسی نے کہا کہ سیر کبیر امام محمد شیبانی کی آخری تالیف ہے''

لیکن کتاب کے خاتمے میں یوں لکھا ہے کہ

''اس کا آغاز اوزجند میں مصیبت کے آخری دنوں میں ہوا، جب

Marfat.com

کہ نعمت کی ہوا چلنی شروع ہوگئی تھی اور اتمام مصیبت کے اختتام
پر مرغینان میں امام سیف الدین ابراہیم بن اسحٰق کے مکان پر ہوا

(ج) تقریباً بیس مخطوطے جن کو امام حصیری کا مرتبہ نسخہ بتایا جاتا ہے، ان میں قدیم ترین مخطوطہ ۱۱۱۰ھ کا تھا، جو کسی زمانے میں استنبول میں قاضی خاں کا دستخطی نسخہ رہ چکا تھا، اسی سے یہ سارے نسخے نقل کیے گئے تھے۔ افسوس ہے کہ چھٹی صدی ہجری کا یہ قدیم نسخہ اب ناپید ہے، اس کے مقدمے میں بھی مجلس املاء کا ذکر نہیں ہے، خاتمہ زیادہ معضل ہے، ''اس کا آغاز اوزجند میں دوشنبہ غرۂ ذی قعدہ ۴۷۹ھ کو الشیخ الصاین (؟)[1] الزکی الملقب بامیر کوہ (ایک اور مخطوطے میں اسیر کوہ، بعض مخطوطات میں امیر گون ہے غالباً یہی صحیح ہے، گون ترکی نام ہے جس کا تلفظ GUN گِون، گاف کے زیر سے ہوتا ہے۔) ابوعلی الحسین بن ابی القاسم کے مکان میں ہوا''۔ یہ اقتباس اوپر دیا جا چکا ہے۔

اس شرح سیر کبیر کا محمد منیب عینتابی نے ترکی میں ترجمہ کیا تھا، جواب سے کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے، عربی اڈیشن سے بھی سو سال قبل استنبول میں چھپ چکا ہے۔ اسی مولف نے تیسیر المسیر فی شرح السیر الکبیر کے نام سے عربی میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں سرخسی کی شرح السیر الکبیر کے بعض مشکل مقامات کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس آخرالذکر کتاب کے چار مخطوطے فراہم کیے گئے تھے، جن میں سے ایک خود مصنف کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔

سب سے اہم علمی خوشخبری اور نادر تحفہ یہ ہے کہ سرخسی کی شرح الجامع الصغیر کا ایک مخطوطہ بھی فراہم کیا گیا تھا، اس کی تفصیل بے محل نہ ہوگی۔

یہ کتاب دنیا میں ناپید سمجھی جاتی تھی، لیکن استنبول کے ایک گمنام کتب خانے بغدادلی رہبی آفندی میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ اس کی فہرست میں اس کا نمبر ۵۶۵

---

[1] ایک مخطوطے میں ''الصابر'' اور کم از کم تین میں الصاین ہے، صاین ایک ترکی لفظ ہے جو احترام کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے اور ہمارے اردو کے ''سائیں'' کا رشتہ دار معلوم ہوتا ہے جو مقدس درویش یا فقیر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ہے، اس میں ۲۷۵ ورق اور ہر ورق میں ۲۵ سطریں ہیں، تقطیع متوسط ۱۰ انچ ہے، ۹۴۸ھ کا نقل شدہ ہے، سرورق پر چند مالکوں نے یہ عبارت لکھی ہے:

(۱) رأیت من هذا الشرح للامام السرخسی نسخة صحیحة فی خزانة الکتب داخل المدرسة التی بناها الوزیر ترزیفونی قره مصطفےٰ پاشا فی سوق ارغاد بازاری بدارالسلطنة وهذا الشرح نادر جداً و صاحب النهایة فی حاشیة الهدایة ینقل مسائل کثیرة من هذا الشرح۔

(۱) میں نے امام سرخسی کی اس شرح کا ایک ضخیم نسخہ وزیر قرہ مصطفےٰ پاشا ترزیفونی کے تعمیر کردہ مدرسے میں دیکھا، یہ پایۂ تخت (استنبول) کے ارغاد بازار نامی محلے میں ہے، یہ شرح بہت نادر ہے ہدایہ کے حاشیہ نہایہ میں اس شرح سے بکثرت مسائل نقل ہوئے ہیں۔

(۲) استصحبه عبدالقادر محمد امین الملسرف (؟) برتبه صدر اناطولی۔

(۲) عبدالقادر محمد امین جو صوبہ اناطولیا کے صدر قاضی کا رتبہ رکھتا ہے، اس کا مالک بنا۔

(۳) المستعطف من عواطف ربه الکریم مصطفےٰ هاشم العصر ابن احمد مختار المسرف (؟) برتبة مکة المکرمة ۱۲۹۱

خدائے کریم کی مہربانی کا طالب مصطفےٰ ہاشم العصر (؟) بن احمد مختار جو مکہ مکرمہ کے قاضی کا رتبہ رکھتا ہے۔ (۱۲۹۱)

(۴) قد اشترایت هذا الکتاب من مخلفات اعلم العلماء

میں نے ممتاز عالم مرحوم مصطفےٰ آفندی المعروف بہ بستان زادہ کے ترکے سے

Marfat.com

المرحوم مصطفٰے آفندی الشهير ببستان زاده۔ قدره اربع مأية درهم۔ نور اللّٰه مرقده و برد مضجعه تحريرافی اوائل رجب سنة عشرة وألف۔	یہ کتاب چار سو درہم میں خریدی، خدا انکی قبر کو روشن اور ان کی آرام گاہ کو ٹھنڈا رکھے، اوائل رجب ۱۰۱۰ھ کی تحریر ہے۔

کتاب کا آغاز اس طرح ہے: "بسم اللّٰه الرحمن الرحيم، قال الشيخ الامام الاجل الزاہد ابو بكر محمد بن ابی سهل السرخسی رحمة الله عليه اعلم بان الجامع الصغير تاليف محمد بن الحسن ......"

تقریریں:

یوم سرخسی میں رسمی تقریروں کو چھوڑ کر حسب ذیل علمی مقالے پڑھے گئے:

۱۔ پروفیسر شاخت : امام سرخسی کے حالات اور فقہاء میں ان کا درجہ۔

۲۔ ناچیز (محمد حمید اللہ) : علم قانون بین الممالک کی تاریخ میں امام سرخسی کے کارنامے۔

۳۔ ڈاکٹر صالح طوغ : امام سرخسی کے خودنوشتہ بیانات کی روشنی میں انکی سوانح عمری۔

۴۔ پروفیسر طیب اوکیچ : امام سرخسی کی شرح سیر کبیر کا ترکی ترجمہ جو محمد منیب عینیابی نے کیا۔

ان تقریروں اور نمائش میں پیش کردہ مخطوطات کی مفصل فہرست وغیرہ کا مجموعہ جامعہ انقرہ کتابی صورت میں (ترکی زبان میں) چھاپ رہی ہے۔

(معارف اعظم گڑھ۔ ستمبر ۱۹۶۴ء)

Marfat.com

مولانا سیّد سلیمان ندویؒ
کی
صد سالہ یادگارِ ولادت

(۲۳ر صفر ۱۳۰۲ھ جمعہ تا ۱۴ر ربیع الاول ۱۳۷۳ھ اتوار
مطابق ۱۲ر دسمبر ۱۸۸۴ء تا ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء)

جشن:

قرآن مجید میں حکم ہے: "وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ"۔ اس کا اولین اطلاق جشن میلاد النبیؐ پر ہوگا کہ کسی نبی کی بعثت سے بڑھ کر کسی قوم کے لیے کیا چیز نعمت ہوسکتی ہے، (اور اس تحدیثِ نعمت کا ایک طریقہ بھی قرآن مجید نے بتادیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ، يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

قرآن مجید میں مصر کے سالانہ "یوم الزینة" کا بھی ذکر ہے، اور مدین کے "ثمنی حجج" میں بھی سالانہ جشنوں کا ذکر ہے اور ان کی قرآن نے تقبیح نہیں کی ہے۔

"العلمآء ورثة الانبیآء" کے مطابق تحدیثِ نعمت کے استحقاق میں علماء کی علمی خدمتیں بھی لازماً داخل ہو جاتی ہیں۔

"یہ تحریر حضرت مولانا محمد اشرف صاحب سلیمانی کے رسالہ 'البیان' (پشاور) میں شایع ہوئی تھی، ہم معارف کے ناظرین کی خدمت میں اس کو پیش کررہے ہیں"
"معارف"

مرحوم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اردو کے علاوہ عربی میں بھی بہت کچھ لکھا ہے، معلوم نہیں عرب ممالک میں کسی کو ان کی یاد تازہ کرنے کی توفیق ہوئی یا نہیں، البتہ فرانس میں ان کی پیدایش کی صد سالہ یادگار منائی گئی ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ جامعہ پیرس نے ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصہ سے اردو کی کرسی قائم کر رکھی ہے، اور گارسین دتاسی سے لے کر وہاں اب تک اردو کی تدریس جاری ہے۔ علی گڑھ، پٹنہ، دہلی اور کراچی میں بھی یادگاری جلسے ہوئے ہیں اور اعظم گڈھ میں ہونے والا ہے۔

فرانس میں:

۲۵/نومبر ۱۹۸۴ء اتوار کو صبح کے نو بجے سے سوا نو بجے تک پندرہ منٹ فرانسیسی ٹیلی ویژن نے مولانا سید سلیمانؒ کی ولادت کی صد سالہ یادگار منانے کے لیے مختص کیے تھے، شروع میں چند منٹ قرآن مجید کی تلاوت مع ترجمہ عمل میں آئی، پھر افغانستان کے ایک سابق سفیر و وزیر عبدالغفور فرہادی رواں صاحب نے مرحوم کے متعلق کچھ باتیں بتائیں اور ان کے مزار کی چند تصویریں دکھائیں اور انکی اہم تالیفوں کے سرورق (ٹائٹل) دکھائے، بعدازاں چند صفحوں کا ایک مضمون فرانسیسی میں جناب سید سالار الدین محمد نے (جو کاریکال کے باشندے اور مدرسۃ السنۃ شرقیہ میں فہرست نگار ہیں) سنایا، اس کے لکھنے میں غالباً ان کی فاضل بیوی بھی شریک رہیں۔

اسی دن ظہر کی نماز کے بعد پیرس کے محلہ اسٹالن گراڈ کی جامع مسجد میں (جو یہاں کے تقریباً تین ہزار مصلیوں کی گنجایش رکھنے والی سب سے وسیع مسجد ہے) رابطة الطلاب الاسلاميين کی طرف سے میرا کوئی دو ڈھائی گھنٹے طویل لکچر فرانسیسی میں ہوا۔ اسکا جملہ بہ جملہ عربی میں ترجمہ بھی ہوتا رہا۔ آخر میں حاضرین نے کچھ سوالات بھی کیے کہ انہوں نے پہلی دفعہ یہ نام سنا اور ان علمی کارناموں سے واقفیت حاصل کی، اس میں گورے، کالے، سانولے ہر ملک کے مسلمان مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔

اس کے چند دن بعد ۱۲/دسمبر ۱۹۸۴ء کو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں جلسہ ہوا، صدر شعبہ جناب محمد عبدالماجد صاحب کے علاوہ اس ناچیز نے بھی فرانسیسی میں مرحوم

Marfat.com

کے حالات بیان کیے اور ٹیلی ویژن والی تصویریں یہاں بھی دکھائی گئیں۔

بریلوی بھائیوں کی ایک تبلیغی انجمن ہے، جس کی شاخیں لندن اور پیرس میں بھی ہیں، آخرالذکر نے بھی اسی زمانہ میں ایک جلسہ کیا، جس میں مجھ سے بھی اردو میں ایک تقریر کرائی گئی، اس سے اہلِ ہندو پاکستان کو بھی بہت سی چیزیں نئی معلوم ہوئیں۔

یہاں جامعات میں چونکہ سیاسیات کی تعلیم بھی ہوتی ہے، اس کے لیے ایک ''مرکز تحقیقات بین الممالک'' نامی بڑا ادارہ معلومات جمع کرنے کے لیے قائم ہے، اس نے بھی طے کیا ہے کہ ماہ آیندہ یعنی فروری میں حضرت ممدوح کے حالات پر ایک جلسہ کرائے، ان شاء اللہ کارآمد ہی ہوگا۔

شخصیت:

ان کے والد بزرگوار جناب سید ابوالحسن اور دادا سید محمد شیر تھے، یہ علاقۂ بہار کے ایک گاؤں دیسنہ میں پیدا ہوئے، جو شہر پٹنہ کے قریب ہے اور بڑا مردم خیز خطہ رہا ہے، نالندہ کی پرانی یونیورسٹی کے آثار قدیمہ اور گوتم بدھ کی تپسیا کا مقام بھی اسی نواح میں بتایا جاتا ہے۔

وہ جمعہ ۲۳؍صفر ۱۳۰۲ھ کو پیدا ہوئے، اس کی معادل فرنگی تاریخ بعض لوگوں نے ۲۲؍نومبر ۱۸۸۴ء لکھی ہے جو غلط ہے، جیسا کہ ابھی نیچے عرض ہوگا، ان کی تاریخِ ولادت پر ایک قطعہ ان کے دادا کی طرف منسوب ہے جس میں کہا ہے:

بگفتا کہ بے داد شد مصرعے ــــــ شدہ مہرِ تاباں ز برجِ کمال

۱۳۱۱

۹-

۱۳۰۲

فرنگیوں نے تقابلی تقویموں کی جدولیں کئی صدیوں سے تالیف کرنی شروع کی ہیں، قدیم ترین لاطینی میں تھے، اب مغرب کی ہر بڑی زبان میں موجود ہیں اور ان ہی کا عربی اور اردو میں ترجمہ بھی ہوا ہے اور فرنگیوں کی غلطیوں کا اعادہ بھی ہوا ہے، بات یہ

Marfat.com

ہے کہ ان فرنگی جاہلوں نے سال بہ سال، ماہ بہ ماہ کی حقیقی رویت ہلال کی جگہ ایک من گھڑت اصول بنا کر اس پر عملدرآمد کیا ہے، وہ یہ کہ محرم، ربیع الاول، جمادی الاولیٰ، رجب، رمضان، ذی القعدہ ہمیشہ تیسے ہوتے ہیں اور صفر، ربیع الآخر، جمادی الاخریٰ، شعبان شوال ہمیشہ اُنتیسے اور ذی الحجہ حسب حساب کبھی انتیسا اور کبھی تیسا ہوتا ہے۔ یہ اس لیے غلط ہے کہ ایسا نہیں ہوتا، بچہ بچہ جانتا ہے کہ رمضان کبھی انتیسا ہوتا ہے، کبھی تیسا، مشاہدہ ہے کہ کبھی چار چار مہینے مسلسل تیسے ہوتے ہیں، تو تین تین مہینے انتیسے بھی ہوتے ہیں، فرنگی جدولوں میں دو تین دن کی غلطی ہوسکتی ہے، مثلاً تاریخ وفات ۱۴ر ربیع الاول مطابق ۲۲ر نومبر ان جدولوں میں نہیں ملے گی، ایک دن کا فرق ملے گا، یعنی ۲۱ر نومبر سنیچر بیان ہوگا۔

جو بھی ہو، ایک فرنگی جدول میں جو سامنے ہے، لکھا ہے کہ ۲۳ر صفر ۱۳۰۲ھ واقعی جمعہ کے دن ہوا اور یہ معادل تھا ۱۴ر دسمبر کا (اتفاق سے پیرس یونیورسٹی کا جلسہ ۱۴ر دسمبر ہی کو ہوا) جو عیسوی تقویم کے لحاظ سے ٹھیک سو سالہ جشن کا دن تھا، ہجری حساب سے تین سال قبل صفر ۱۴۰۲ھ میں یادگار منانے کی ضرورت تھی، کسی کو تب وہ بات ذہن میں نہ آئی، ورنہ پیرس میں جواب ہوا وہ تب بھی ہوسکتا تھا، مرضی مولیٰ۔

سوانح:

ان کی تعلیم وطن میں ہوئی، پھر دارالعلوم ندوہ (لکھنؤ) میں ہوئی، وہ اس زمانہ کی پیداوار ہیں جب ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد انگریز نئے نئے حاکم بنے تھے، ان کو اسلام سے دشمنی بھی تھی اور تبلیغِ عیسائیت کا شوق بھی، ایک طرف اسلامی اوقاف ضبط ہونے لگے، جس کے باعث اسلامی درسگاہیں بند ہونے لگیں اور دوسری طرف انگریزی زبان اور مشنری کالجوں اور کارکردگیوں کا اضافہ ہوا، اللہ جزائے خیر دے ان مسلمانوں کو جنہوں نے مسلمانوں کے دین و ایمان کو بچانے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کیں، دیوبند، علی گڑھ، ندوہ، دارالعلوم حیدرآباد دکن اور جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ دینیات بنا۔ یہ سب اسی کوشش کی زنجیر کی کڑیاں ہیں، ندوہ کی تعلیم کے باعث عربی، فارسی ہی نہیں، سید

Marfat.com

صاحب نے انگریزی بھی سیکھی، کہتے ہیں کہ کچھ عبرانی بھی پڑھی، اچھے مقرر تھے اور طالب علمی کے زمانہ ہی سے عربی کے خطیب بھی تھے۔

وہ جامع الکمالات تھے، صاحبِ دل بلکہ صاحب سلسلہ صوفی بھی تھے، ادیب اور شاعر بھی، علوم دینی (قرآن، حدیث، فقہ، کلام) کی تعلیم پائی، تاریخ ہی نہیں، طب اور ہیئت سے بھی خاصی واقفیت تھی، ان کے علاوہ سیاسیات سے بھی دلچسپی تھی، مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار ''الہلال'' کی ادارت میں بھی شریک رہے، تحریکِ خلافت کے سلسلہ میں مسلمانانِ ہند کے وفد میں شریک ہوکر لندن گئے، پھر ترکی میں جمہوریت قائم ہوئی تو انقرہ میں ''بیوک وطن مجلسی'' یعنی پارلیمنٹ نے قرار دیا کہ چونکہ خلیفہ کے فرائض منصبی اب پارلیمنٹ انجام دیتی ہے، اس لیے اب کسی ایک فرد کو خلیفہ بنانے یا رکھنے کی ضرورت نہیں، اس کے نتیجہ کے طور پر مکہ معظمہ میں ایک عالمگیر کانفرنس ہوئی کہ اب خلیفہ کسے سمجھیں، کسے بنائیں؟ اس میں ہندوستان کا جو وفد گیا اس میں سید صاحب بھی شریک تھے۔

ان کے علم کی شہرت دور دور تک پھیلی، اسی لیے شاہ نادر خان مرحوم نے ان کو کابل بلایا، کہ وہاں کی تعلیم کی تنظیم جدید کے لیے مشورہ دیں، پونا کی یونیورسٹی میں استاد بھی رہے، بھوپال میں مفتی بنائے گئے، انگنت انجمنوں اور اداروں کی طرف سے لکچروں کے لیے بلائے جاتے رہے، یہاں تک کہ مدرسۂ طبیہ جیسے فنی ادارے کے جلسۂ تقسیم اسناد کے لیے مدعو ہوئے، آخر میں خود اپنے ہی قائم کردہ دارالمصنفین اعظم گڈھ کے ہوکر رہ گئے اور اس کے شہرۂ آفاق ماہنامہ معارف کے ایڈیٹر بھی رہے۔

ان کی تالیفوں میں تنوع اور اُپج نظر آتی ہے، قرآن مجید سے آغاز اسلام ہی سے ہر مسلمان عالم کو دلچسپی رہی، مگر ارض القرآن، یعنی قرآن میں جن مقامات کا ذکر ہے ان کے جغرافیہ کی طرف کسی کی توجہ نہیں گئی اور اس پر ان کی تالیف تاحال دنیا میں یگانہ ہی ہے۔ حدیث میں ایک طرف اس کی تدوین وتحریر کی تاریخ پر نئی راہیں کھولیں اور دوسری طرف سیرت النبیؐ پر جو پانچ جلدیں لکھیں (اور جو ہنوز ناتمام ہی کہی جا سکتی ہیں) وہ اردو میں مایۂ ناز ہیں، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ صرف احادیث صحیحہ پر مبنی

واقعات کو درج کیا ہے، دوسری چیزوں کو نہیں۔

فقہ میں وہ حنفی تھے، لیکن وسعتِ قلبی کا یہ عالم کہ سوانح عمری لکھی تو امام مالکؒ کی، جو معلومات سے لبریز ہے۔

ہمالیہ تلے کے براعظم میں مسلمان عورتیں کس مپرسی کے عالم میں تھیں، سید صاحب کو ان پر بڑا رحم آتا تھا اور ہر طرح ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور پرانی مسلمان عورتوں کے کارناموں کو خوب اجاگر کرتے تھے۔ طالب علمی کے زمانہ ہی میں سیرت عائشہؓ لکھی اور ایسی کہ بعد میں اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور تاحال اپنے موضوع کی بڑی مستند کتاب شمار ہوتی ہے۔

طبقات الارض، طب اور علم ہیئت میں مسلمانوں کی خدمات ان کے خاص موضوع تھے، عرب و ہند کے تعلقات پر ظاہر ہے کہ ایک ہندی مؤلف ہی زیادہ بہتر لکھ سکتا تھا، جسے انہوں نے انجام دیا۔ لیکن ''عربوں کی جہاز رانی'' ایک ایسا اچھوتا موضوع تھا، جس پر خود عربی میں بھی کم ہی کچھ لکھا گیا ہے، قرآن مجید میں جہاز رانی کا بکثرت ذکر ہے، فرنگی غیر مسلم مؤلف جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کا نعوذ باللہ مولف سمجھتے ہیں، قرآن میں عام اور طوفانی وقت کی جہاز رانی کے ذکر سے یہ یقین کرتے ہیں کہ وہ رسولؐ اللہ کے شخصی تجارب کا آئینہ دار ہے۔ زمانۂ رسالت میں نہ صرف فوجی حمل ونقل کے لیے (معرکۂ ایلہ میں) بلکہ بحری ڈاکوؤں کو سزا دینے کے لیے (ساحل جدہ پر) جہازوں کا استعمال ہو چکا تھا۔ عہدِ فاروقی میں مسلمان جہازوں نے ہی مسلمانوں کو عمان سے مغربی ہند کے ساحلوں پر پہنچایا تھا۔

ان کے سیکڑوں مضامین علمی رسالوں میں چھپے، مخزن لاہور، علی گڑھ منتھلی اور 'الندوہ' کے ناموں سے اب نئی نسل ناواقف ہو گئی ہے، ان کے چند دلچسپ مضامین یہ ہیں:

(۱) اندھوں کی تعلیم کا طریقہ پہلے مسلمانوں نے ایجاد کیا، (الندوہ ۱۹۱۱ء)
(۲) انجیل برنابا، (ایضاً ۱۹۰۶ء)

Marfat.com

(۳) علمائے روس اور اصلاح نصاب عربی (ایضاً ۱۹۰۶ء)

(۴) مستشرقینِ یورپ، چار قسطیں (ایضاً ۱۹۱۱ء تا ۱۹۱۲ء)

(۵) ملک حبش میں ایک اسلامی حکومت، تین قسطیں (الہلال ۱۹۱۳ء)

(۶) ہندوؤں کی علمی اور تعلیمی ترقی مسلمانوں کے عہد حکومت میں، نو قسطیں،
(معارف ۱۹۱۸ء)

(۷) سلطان ٹیپو کی چند باتیں۔ (ایضاً ۱۹۱۸ء)

(۸) جاپان اور اس کا نظام تعلیم (ایضاً ۱۹۲۵ء)

(۹) کیا رومن حروف ہیرو گلفی سے ماخوذ ہیں؟ (ایضاً ۱۹۳۲ء)

(۱۰) عرب اور امریکہ (ایضاً ۱۹۳۹ء)

(۱۱) معراج منامی یا جسمانی (ایضاً ۱۹۴۳ء)

(۱۲) خطبۂ اسناد طبیہ اسکول پٹنہ (ایضاً ۱۹۴۶ء)

(۱۳) کیا خلقی معذورین کی پیدائش انصاف الٰہی کے خلاف ہے؟
(ایضاً ۱۹۴۵ء)

(۱۴) برمک اور برمکی (ہارون الرشید کے زمانہ والے کا ہندی ''پرمکھ'' سے ماخوذ)
(ایضاً ۱۹۴۸ء)

(۱۵) ایک غلطی کا اعتراف (ایضاً ۱۹۴۰ء)

(۱۶) رجوع اعتراف (ایضاً ۱۹۴۰ء)

ان میں سے آخری دو پر خاص کر ناظرین کی توجہ منعطف کراتا ہوں۔ غلطی ہر کسی سے ہو سکتی ہے، لیکن اس کا برملا اعتراف کرنے کے لیے بڑی اخلاقی بہادری کی ضرورت ہوتی ہے، اس سلسلہ میں ایک لطیفہ بھی پیش آیا، انہوں نے جب اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''عربوں کی جہاز رانی'' شائع کی تو میں نے فوراً خرید کر پڑھی اور اپنے ذاتی معلومات جو اس میں اضافہ طلب معلوم ہوئے، مرتب کر کے محترم سید صاحب کو بھیجے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے ان کو بلاترمیم فوراً رسالۂ معارف میں چھاپ دیا اور مجھے

Marfat.com

بہت ہی محبت سے ایک خط لکھا کہ ''تم نے ہماری داد نہ دی کہ بحرِ عرب میں ہم نے کاغذی کشتی چلا دی''۔ میں بہت شرمندہ ہوا اور عریضہ لکھا کہ وہ مضمون اعتراض کے لیے نہ تھا، بلکہ طالب علمانہ سوال کی حیثیت رکھتا تھا۔

وہ بڑے بذلہ سنج بھی تھے، ایک بار وہ حیدرآباد دکن آئے اور جامعۂ عثمانیہ میں ایک لکچر دیا، انہیں علم اشتقاق سے بڑی دلچسپی تھی، لکچر میں ضمناً ایک جگہ فرمایا کہ انگریزی لفظ ''جار'' اصل میں عربی لفظ ''جرۃ'' سے ماخوذ ہے، میں سامعین میں قریب ہی بیٹھا ہوا تھا، اٹھ کر کہا: مولانا! میری دانست میں تو وہ اردو لفظ ''گھڑا'' سے لیا گیا ہوگا، فوراً فرمایا: ممکن ہے اسی سے گڑھا ہو۔'' ان ہی دنوں میں ایک اور ملاقات کا موقع ملا اور میں نے کچھ علمی سوال کیے، جواب کے بعد فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ تم سیرت النبیؐ پر ایک کتاب لکھو اور ہم بتائیں گے کہ کس نہج پر، میں نے کہا ''کیا آپ کی سیرۃ النبیؐ کے بعد اس کے لیے کوئی جگہ باقی ہے؟'' فرمایا: وہ بہت بڑی ہے، میں نے کہا آپ نے رحمت عالمؐ بھی لکھی، فرمایا: وہ بہت چھوٹی ہے'' میں نے عرض کیا ''سیرت پاک ایک ایسا موضوع ہے جو کسی ایک آدمی کے بس کی چیز نہیں'' اس پر وہ چپ ہو گئے اور دوسرے لوگوں نے ان سے گفتگو شروع کر دی، مجھے بعد میں بہت افسوس رہا کہ ان کے تصور کی کتاب سیرۃ النبی کا خاکہ کیوں نہ معلوم کیا، لیکن یہ اب بعد از وقت ہے، اللہ کی مرضی۔

مجھے حال میں جنوبی افریقہ جانے کا موقع ملا، جہاں مرحوم کے فرزند ارجمند سید سلمان ندوی ڈربن یونیورسٹی میں شعبۂ اسلامیات کے صدر ہیں، انہوں نے ایک بات یاد دلائی جو میں بھول گیا تھا، وہ یہ کہ جب میں ۱۹۵۰ء میں یکسالہ قیام کے بعد پاکستان سے فرانس واپس ہو رہا تھا تو سید صاحب کے ہاں جو اس وقت کراچی آ چکے تھے، الوداعی ملاقات کے لیے گیا، صبح سویرے کا وقت تھا، وہ ناشتے پر تھے، نام سنا تو فوراً اندر بلا لیا اور نوجوان بچے (سید سلمان صاحب) سے فرمایا: ان کے لیے ناشتا لے آؤ، میں نے عذر کیا کہ ناشتا کر چکا ہوں، پھر بھی اصرار کیا، میں نے کہا: کیا یہ ایک حکم ہے یا کوئی اور چیز؟ فرمانے لگے جی نہیں، یہ حکم ہے۔ ناشتا پر محبت سے فرمایا: کیوں جا رہے ہو؟ یہیں رہو، مجھے علمی نشریات میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے'' میں نے عرض کیا نشریات

Marfat.com

کے مالی اور انتظامی حصے سے نپٹنے کا مجھے تجربہ نہیں، رہا علمی عنصر، اس کے لیے خدا ڈاک کو زندہ رکھے، پیرس کے کتب خانے پاکستان سے زیادہ کارآمد اور ضروری ہیں، اس پر وہ چپ ہو گئے، اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے آمین۔

ضروریات:

یہ صد سالہ یا دیگر جلسے نشستند و گفتند و برخاستند ہو کر نہ رہیں، ضرورت ہے کہ ان کا علم پھلے پھولے، اولاً ان کے مقالات کا مجموعہ شایع ہونا چاہیے، جواب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے ہیں، اس کے بعد ان کے عربی اور انگریزی ترجمے ہونے چاہییں، فرانسیسی اور جرمن میں بھی ہو سکیں تو کیا کہنے، تراجم میں مقالے ہی نہیں، کتابیں بھی ہوں، جن میں سے چند کے (انگریزی ترجمے بھی ہو چکے ہیں) وفقنا اللّٰہ لما فیہ رضاہ۔

(معارف اعظم گڑھ۔ مئی ۱۹۸۵ء)

Marfat.com

ابوحنیفہ دینوری کی کتاب النبات

مؤلف:

دینوری نے کتاب النبات کے نام سے نباتیات کی جو انسائیکلو پیڈیا مرتب کی تھی وہ عربی زبان کے اُن شہکاروں میں سے ہے جو عرصہ سے ناپید ہیں۔ اس کا ایک ٹکڑا ابھی ابھی برآمد ہوا ہے اور وہی ان سطروں کے لکھنے کا محرک ہے۔

اس کے مؤلف ابوحنیفہ احمد بن داؤد بن ونند کی ولادت شہر دینور میں ہوئی جو عراق عجم میں ہے۔ صحیح تاریخ تو معلوم نہیں لیکن تیسری صدی ہجری کے پہلے عشرے کا قیاس ہی وفات یا فوت (معجم الادبا) کے بیان کے مطابق ۲۶ جمادی الاولیٰ ۲۸۲ھ کو ہوئی۔ اُن کے دادا کا نام ونند ہے جس کے معنی پرانی فارسی میں ''فتحیاب'' کے بیان کیے گئے ہیں۔

بنوامیہ کے خاتمہ کے بعد جب عباسیوں کی طویل حکومت میں مستحکم امن میسر ہوا تو جہاں کوفے اور بصرے کی علمی خانہ جنگی کم ہوئی وہیں مکتب بغداد کے اصولِ خذ ما صفا میں پلنے والے عربی زبان کی بڑھتی ترقی میں اتنا حصہ لینے لگے کہ یہ دور تاریخ میں سنہرا دور سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے مؤلف کے ہمعصروں میں امام بخاری، امام احمد بن حنبل، امام قشیری، بایزید بسطامی، جاحظ، محمد بن حبیب، ابن قتیبہ، ابو زید بلخی اور دیگر ان گنت ممتاز شخصیتیں نظر آتی ہیں اور اپنے شعبے کی حد تک دینوری کا کارنامہ اور کاوش تحقیق بجز چند محدثین کرام کے کسی بھی بڑے سے بڑے مؤلف سے کم تو کیا کم ہی لوگ اس کی برابری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

Marfat.com

ہمارے ''ہر فن مولیٰ'' مؤلف کو اگر تاریخ اور جغرافیہ سے دلچسپی تھی تو ساتھ ساتھ، ریاضی اور جبر و مقابلہ و ہیئت سے بھی، لسانیات اور بلاغت سے بھی، طب و نباتات سے بھی۔

لسانیات اور صرف و نحو کی تعلیم السکیت اور ابن السکیت سے پانے کا ذکر تو ہمارے مآخذ کرتے ہیں لیکن دیگر علوم کے متعلق وہ خاموش ہیں۔ اگر دینوری کی سب تالیفیں ملتیں تو ان میں ذکر کردہ اسناد سے اُن کے دیگر علوم کے اساتذہ کا بھی پتا چل جاتا۔ جہاں تک نباتیات کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنی کتاب کی تالیف میں اپنے پیش روؤں سے بھی استفادہ کیا ہے اور ہمعصروں سے بھی اور خود ذاتی تحقیق اور مشاہدے سے بھی۔

ابن ندیم کے بیان کے مطابق ابوعلی الحسن بن عبداللہ الاصفہانی کے رفیق درس تھے اور الفرار [1] کے راوی کا فرض بھی انجام دیا۔ یاقوت کے بیان کے مطابق دینوری اپنی زندگی ہی میں بطور انشاء پرداز کے جاحظ کے حریف تسلیم کیے جاتے تھے۔ علم ہیئت کے رصدی مشاہدے انہوں نے پچیس سال کی عمر میں کر کے اپنا سکہ بٹھا دیا تھا اور دینور میں ان کی خانگی رصدگاہ اُن کے بعد بھی صدیوں کام دیتی رہی۔

اصل تالیف:

بعض حوالوں سے پتا چلتا ہے کہ اصل کتاب النبات چھ ضخیم جلدوں میں تھی۔ مجھے اب اس میں کوئی شبہہ نہیں رہا۔ ہمیں اب جو تین باب دستیاب ہوئے ہیں، ان کے اقتباسات ابن سیدہ کی کتاب المخصص میں بھی ہیں لیکن اس تناسب سے کہ ہماری (۷۴۰) سطروں میں سے وہاں صرف (۱۵۰) سطریں نقل ہوئی ہیں اور ابن سیدہ میں دینوری کی کتاب النبات کے جو اقتباسات ہیں وہ کم سے کم دو سو صفحوں کی جلد میں سما

---

[1] ایک غیر متعلق مگر دلچسپ اطلاع یہ عرض کرنی ہے کہ الفرار (المتوفی ۳۰۷ھ) کی تفسیر قرآن مجید مل گئی ہے اور کتب خانہ وہبی آفندی استانبول (تفسیر نمبر ۲۶) میں موجود ہے مشتبہ تفسیر ابن عباس کو چھوڑ کر اب یہ محفوظ و موجود تفسیروں میں قدیم ترین ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ امام زید بن علی سے بھی قدیم تر۔

سکتے ہیں۔ یہ امر قابل وضاحت ہے کہ دینوری نے پودوں کے نباتاتی حالات زیادہ دیے ہیں اور متعلقہ اصطلاحات کی لسانیاتی اور صرفی ونحوی تشریح جو محض ضمنی ہے مختصراً دی ہے اور ابن سیدہ نے زیادہ تر صرف آخری حصہ کو نقل کر کے باقی کو ترک کر دیا ہے۔ ان حالات میں کتاب النبات کا چھ ضخیم جلدوں میں ہونا بعید از قیاس بالکل نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ کشف الظنون کا یہ بیان کہ ابن اخت غانم نے کتاب النبات کی شرح ساٹھ جلدوں میں لکھی تھی۔ حسنِ ظن سے بھی کام لیں تو ساٹھ کراسوں سے عبارت معلوم ہوتی ہیں۔

چند سال قبل ۱۹۱۰ء میں بریسلاؤ (جرمنی) کے ایک طالب علم زلبر برگ نے ابن سیدہ ولسان العرب وغیرہ سے دینوری کے اقتباسات اکٹھے کر کے ایک مقالہ اپنے امتحان ڈاکٹریٹ کے لیے لکھا تھا۔ جو ۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۱ء میں اشٹرا سبورگ کے جرمن رسالے تسائٹ شریفت نیورا ہور یولوگی میں چھپا تھا۔ عربی زبان اور نباتیات دونوں میں درک رکھنے اور بعض اچھے اساتذہ کے خانگی جمع کردہ مواد سے بھی نوازے جانے کے باعث اس کے خیالات اصل تالیف کے متعلق دلچسپی کے حامل ہیں اسے البتہ ہمارے تازہ مخطوطے کا علم نہ تھا۔

اس کے پیشرو:

قبل اس کے کہ زلبر برگ کے کچھ اقتباس دیے جائیں اپنا ایک ناچیز خیال پیش کرنا چاہتا ہوں کہ دیگر علوم وفنون کی طرح مسلمانوں میں نباتیات کا ذوق بھی قرآن مجید ہی سے پیدا ہوا ہوگا۔ دنیا کی مقدس اور الہامی مذہبی کتابوں میں سے کسی میں بھی نباتات کا اتنا کثیر ذکر نہیں ہے جتنا قرآن مجید میں ہے۔ ایک دو گھنٹے کی تلاش میں مجھے ایسے (۱۶۹) مقام ملے۔ ان کی مختصر تحلیل شاید بے محل نہ ہو۔

خدا سارے جہانوں کا آقا (رب العالمین) ہے تو عالم نباتات کا بھی وہی آقا ہے۔ یہی نہیں خدا نے اپنا وصف خود نحن الزارعون، نحن المنشئون [1] کے

---

[1] خدائے ذوالجلال کے یہ اوصاف سورۃ الواقعہ کی آیات نمبر ۶۴ اور ۷۲ میں بالترتیب بیان ہوئے ہیں۔ (مرتب)

Marfat.com

الفاظ میں بیان کیا ہے۔ قرآن میں بہ کثرت تذکرے مردہ زمین، زندہ زمین، ایک کا دوسرے میں مبدل ہونا اور اس کے اسباب دلچسپ انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ آب پاشی کے ذرائع میں سے چشموں، ندیوں، کنوؤں، بارش، شبنم، کاریزوں، بادلوں وغیرہ کا ذکر ہے۔ تو باغوں، کھیتوں، چراگاہوں، جنگلوں، سبزہ زاروں کا اُن کی زندگی کے مختلف اوقات میں بھی قسم قسم اور رنگ برنگ کے میوے کھجور، انجیر، انگور، انار کا نام آتا ہے تو غلوں ترکاریوں میں قثّا فوم، عدس، بصل، خردل، زنجبیل وغیرہ کا نیز چھلکوں، چھالوں کا کھجور کا تفصیلی ذکر، اس کا تنا اس کے گچھے، خوشے، گٹھلی، قطمیر، وغیرہ وغیرہ کا ذکر عرب ناظر و سامع کے لیے ناگزیر ہی تھا۔ انگور کی بیلوں، شراب، شہد، زیتون، روح و ریحان (زہرۃ الحیٰوۃ کے ذریعہ سے) پھولوں، کافور، من، زقوم، سدرہ بھی مذکور ہیں۔ لکڑی وغیرہ سے بننے والے سامان میں کرسی، تخت، دروازہ، سیڑھی، تیر کمان، تکیے، قالین، قلم، ریشم، لباس، کاغذ، پکوان کے برتن کے ساتھ ساتھ چرنے والے جانوروں میں اونٹ، بھیڑ، بکری، گائے، بیل (دودھ) گھوڑے، گدھے، خچر، بندر، سور، ہاتھی، گورخر، ٹڈی، نیز مکھی، شہد کی مکھی، مکڑی بھی مذکور ہیں۔ غلے کے کارواں، کشتیاں، تر و خشک ایندھن، لکڑی کا چقماق، ناگر، کٹائی، قحط، طوفان، طغیانی، غرض بیسیوں اور کے لمبے لمبے تذکرے ہیں۔ اگرچہ ہمارے مؤلف نے پیش نظر مخلوطے میں (جس کو جامعہ کیمبرج یا برلن اکاڈمی شاید شائع کرے گی صرف چار ہی مرتبہ قرآنی آیات سے استدلال کیا ہے لیکن اس ٹکڑے کی واردشدہ اصطلاحات قرآن مجید میں بیسیوں ہی ہیں)۔

جاہلیت کا عرب شاعر باریک بینی کے لیے مشہور ہے تو وہیں اس کی زبان اتنی متمول نظر آتی ہے کہ وہ نباتات کے دقیق سے دقیق مسئلے کے لیے بھی کسی غیر زبان کے الفاظ کا محتاج نہیں ہوتا۔ بعد کے علمی ترقی یافتہ دور میں بھی چاہے فلسفہ منطق وطب وغیرہ میں عربوں کو بیرونی اصطلاحات و الفاظ قبول اور رائج کرنے پڑے ہوں لیکن فقہ ہی کی طرح نباتات میں بھی یونانی اور سنسکرت وغیرہ کا اثر ناپید ہے۔ بجز اس کے کہ عرب یا عربوں کی سفرگاہوں میں پیدا نہ ہونے والے پودوں کے نام ہوں، عربی زبان کا یہ کمال عجیب اور حیرت انگیز تو ہے لیکن لغو اور بے وجہ نہیں، بات یہ ہے کہ یونانیوں کے برخلاف

Marfat.com

جو حضری اور شہ نشین ہو گئے، عرب میں بدویت اور خانہ بدوشی ہمیشہ باقی رہی اور اس بے برگ و گیاہ صحرا میں ہر پودہ، پودے کا ہر جزء وہاں کی انسانی اور حیوانی آبادی کو ہر وقت مطلوب ہوتا تھا۔ اس کے خوردنی یا ناخوردنی ہونے کی تحقیق آخری حد تک پہنچانی ناگزیر تھی۔ پھر کسی اور علمی مشغلے کی غیر موجودگی میں اندرونی لپک حساس طبیعتوں کو ان مشاہدات کو نظم میں منتقل و محفوظ کرنے کی ہر ترغیب بھی موجود تھی۔

دینوری اور اس کے ہم عصر نباتاتیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے جہاں زلبر برگ یہ تسلیم کرتا ہے کہ ان کی تالیفوں میں نہایت ترقی یافتہ فنی اور اصطلاحی الفاظ ہر قدم پر ملتے ہیں، وہیں وہ اس پر حیرت ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح ایک جاہل بدوی ریگستان میں اونٹ کے قدم کے نشان ہی کی طرح پودوں کی ساخت کے نازک سے نازک پہلو اور جزء کو بھی اسی صحت و وضاحت اور پرگو انداز میں منظر عام پر لا سکتا ہے۔'' پھر یہ پوچھتا ہے:

''بہر حال یہ کافی حیرتناک ہے کہ زمانہ قدیم کے سارے نباتیاتی ادب میں ہماری کتاب کے صرف دو ہی مماثل پیشرو ملتے ہیں، یہ کیسے ہو گیا کہ مسلمان اس معاملہ میں اس قدر جلد ابھر بھرے یونانیوں کے برابر ہی نہیں ہو گئے بلکہ اُن سے بڑھ ہی گئے؟ دیگر قوموں کے نباتیاتی ادب نے قوم کی ترقی کے زمانہ میں اپنی الگ فنی زبان پیدا کر لی لیکن یہاں معاملہ الٹا ہے، بدویوں کی زبان اس علم کے وجود میں آنے سے بھی پہلے تفصیلات تک کے لیے ایک خوب ہی پھیلے ہوئے ذخیرہ اصطلاحات کی حامل تھی۔''

فنی لغتیں:

عام لغتوں کے ساتھ ساتھ عربوں میں خصوصی یک فنی لغتوں کا بھی کم از کم اصمعی کے دور سے روز افزوں شوق پیدا ہو گیا تھا۔ کتاب الزرع والنخیل، کتاب الخیل، کتاب الابل کتاب الحیات، کتاب الوحوش، کتاب الحیوان ، کتاب الانوا، کتاب الارض

والسماء، غرض بیسیوں ہی نام اس سلسلہ میں لیے جا سکتے ہیں جن میں سے بعض اب تک محفوظ بھی ہیں۔ اُن کے متعلق زمانہ حال کے سب سے بڑے جرمن وراق یا کتب شناس بروکلمان نے ضمیمہ تاریخ ادبیاتِ عربی ۱/۵۷۲ میں لکھا ہے کہ اس طرح کی یک فنی لغتوں پر لسانیات کے نقطہ نظر سے نہایت قیمتی ہونے کے باوجود یورپین زبانوں میں آج تک بہت ہی کم توجہ ہوئی ہے۔

ابتدائی عربی تالیفیں:

نباتات پر جن ابتدائی عربی تالیفوں کا پتا چلتا ہے، وہ ابن ندیم وغیرہ کے مطابق یہ ہیں:

(۱) ابو عمرو بن العلاء (التوفی ۱۵۹ھ) کتاب (بعد والوں کے ہاں اس کے بکثرت حوالے ہیں)

(۲) ابو زید (التوفی ۲۱۴ھ) کتاب الشجر واالکلاء (بحوالہ مزہر سیوطی)

(۳) ابو زیاد الاعرابی (ہمعصر خلیفہ مہدی) کتاب النوادر (نباتات سے جزءاً بحث)

(۴) الاصمعی (التوفی ۲۱۶ھ) کتاب النبات والشجر (طبع بیروت)

(۵) ابن الاعرابی (التوفی ۲۳۱ھ) کتاب النبات

(۶) ابو نصر الباہلی (التوفی ۲۳۵ھ) کتاب الشجر والنبات

(۷) ابن السکیت (التوفی ۲۴۲ھ) کتاب النبات والشجر

(۸) ابو حاتم السجستانی (التوفی ۲۵۰ھ) کتاب الشجر والنبات

(۹) السکری (التوفی ۲۷۵ھ) کتاب النبات

(۱۰) دینوری (التوفی ۲۸۲ھ) کتاب النبات

ان کے علاوہ عام لغتوں میں بھی نباتات کا کافی ذکر ہے۔ خلیل (التوفی ۱۶۰ھ) سیبویہ (التوفی ۱۶۱ھ) الکسائی (التوفی ۱۸۹ھ) الفراء (التوفی ۲۰۷ھ) ابو عبیدہ معمر (التوفی ۲۰۸ھ) ابو عبیدہ القاسم (التوفی ۲۲۳ھ) ابو عمرا بجری (التوفی ۲۲۵ھ) کے نام خاص طور پر اس سلسلے میں لیے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے ہ

ایک نے اپنے پیشروؤں اور اپنے ہمعصروں کی کتابوں سے استفادہ کیا ہوگا اور حسب عادتِ مالوفہ، ان کی کچھ چیزیں بلا حوالہ نقل کی ہوں گی تو کچھ اپنی طرف سے اضافہ بھی کیا ہوگا اور بہ حیثیت مجموعی علم کو زندہ رکھنے اور اس کی مزید ترقی میں حصہ لینے کا سلسلہ جاری رہا ہوگا۔

افسوس ہے اب صرف تالیف نمبر۴ اصمعی کی کتاب النبات والشجر ملتی ہے۔ کوئی چالیس برس ہوئے جرمن مستشرق ناگلبرگ نے ابوزید کی طرف منسوب کتاب النبات والشجر شائع کی لیکن اب اندرونی شہادت کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ یا تو ابن خالویہ (المتوفی ۳۷۰ھ) کی تالیف ہے یا کسی اور کی۔

خوشہ چین:

ابو حنیفہ دینوری کی یادگار تالیف نے سب کے قلم توڑ ڈالے اور اس کے بعد صرف اسی کے حوالہ سے پودوں اور جڑی بوٹیوں کے ذکر ہونے لگے۔ یہ اقتباسات بہت سے ہیں اور انہی سے ایک ضخیم جلد دو تین سو صفحوں کی تیار ہو سکتی ہے۔

(۱) ابن سیدہ: کتاب المخصص نیز کتاب محکم

(۲) ابن بجون الجامع فی الادویۃ المفردہ

(۳) الغافقی: شرح العقاء (خلاصہ ابن میمون الاسرائیلی)

(۴) الصغانی: العباب

(۵) ابن منظور: لسان العرب

(۶) فیروز آبادی: القاموس

(۷) مرتضی زبیدی: تاج العروس

(۸) ابن البیطار: مفردات الادویہ

(۹) ابن العوام: کتاب الفلاحت

(۱۰) علی المصری المنبہات علی الاغلاط

(۱۱) یاقوت: معجم البلدان

Marfat.com

(۱۲) المرزوقی: الازمنۃ والامکنۃ۔

میں خاص کر دینوری کے اقتباسات ملتے ہیں اور ابن سیدہ کی کتاب المخصص میں سب سے زیادہ ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے اس کتاب میں ایک ایک عنوان لیا گیا ہے جیسے انسان، زمین، اونٹ، پانی وغیرہ اور اُن کے تحت جملہ متعلقہ ہزاروں الفاظ مختصر توضیح کے ساتھ جمع کر دیے گئے ہیں۔ اس کی بارہ پندرہ جلدوں کی ورق گردانی میں مجھے جن جن ابواب میں ابو حنیفہ دینوری کے اقتباس نظر آئے اُن کی بنیاد پر اصل کتاب النبات کی فہرست مضامین یا کم از کم اس کی وسعت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ ابن سیدہ کی جلد (۱۰ تا ۱۲) میں نباتات و متعلقات کا ذکر ہے اور شاید یہ فرض کر لیا جا سکتا ہے کہ اصل کتاب النبات کی بھی ویسی ہی ترتیب ہو گی۔ البتہ ابن سیدہ کا مقصد المخصص میں کتاب النبات سے مختلف ہونے کے باعث کتاب النبات کے مواد کی المخصص میں تقسیم و انتشار بھی ناگزیر ہے، بہر حال المخصص میں دینوری کے اقتباسات زیادہ تر حسب ذیل ترتیب سے ہیں۔

کتاب النبات کی تحلیل:

المخصص جلد (۴) میں نباتی دباغت پر بہت دلچسپ اور اہم مواد ہے۔
المخصص جلد (۵) شہد، شہد کی مکھیاں، کھانا، قے کرنا وغیرہ
المخصص جلد (۶) تیر کمان کا طویل ذکر
المخصص جلد (۷) اونٹوں کا چرنا، اور ان کی بیماریاں
المخصص جلد (۸) ہرن، پرندے، ٹڈی، مکھیاں وغیرہ
المخصص جلد (۹) آب پاشی، اس کے برتن مثلاً ڈول وغیرہ، رسیاں، پانی رکھنے یا لے جانے کا سامان جیسے مشک وغیرہ۔
المخصص جلد (۱۰ تا ۱۱) حسن تفصیل ذیل:

پودوں کے لیے مٹی کی ضرورت ہے حتیٰ کہ آبی نباتات کے لیے بھی زیر آب زمین درکار ہے اور چٹانوں پر اگنے والے پودوں کے لیے بھی پتھر پر جمی ہوئی گرد ناگزیر

Marfat.com

ہے۔ اسی لیے سب سے پہلے مٹیوں اور زمینوں کا تفصیلی ذکر ہے، آباد، غیر آباد، کم آباد، وبائی علاقے اور اس کے اسباب، موسم، اور محل وقوع کا اثر زمین پر وغیرہ بیان کرنے کے بعد ہمارا مؤلف پودوں کی ایک بڑی اور بنیادی تقسیم بوئے ہوئے اور خود رو میں کرتا ہے۔ بونے کے سلسلے میں ناگر اور دیگر ذرائع سے زمین کو تیار کرنے کی تفصیل آئی ہے، پھر وادیوں، طغیانیوں اور سیلابوں کا ذکر ہے۔ آب پاشی کا ذکر ابن سیدہ نے جلد (۹) میں منتقل کر دیا ہے جو غالباً اصل میں یہاں ہونا چاہیے تھا۔ بارش کی پچھتروں کا بھی یہاں ذکر آتا ہے۔ لیکن دینوری نے اس پر کتاب الانواء کے نام سے ایک مستقل کتاب بھی لکھی تھی۔ زمین کا ذکر دوبارہ کرتے ہوئے پھر اس کا ذکر ہے کہ کہاں پودے جلد اُگتے ہیں۔ کہاں دیر سے اور کہاں نباتی زندگی مشکل اور کہاں ناممکن ہے۔ پھر زرخیز زمین کی عام خصوصیتوں کی تفصیل آتی ہے اور مختلف رنگ کی مٹی کے ذکر کے بعد امساک باران، پانی کی قلت، موسم کا اچھا یا بُرا ہونا۔ کاشت میں غیر مطلوب جنگلی خودرو پودوں کا خود بخود اُگ آنا، وغیرہ بیان ہوئے ہیں۔

اس کے بعد گویا اصل کتاب شروع ہوتی ہے اور نباتات میں تر و خشک گھاس کا بیان کرنے کے بعد تنے والی نباتات یعنی درختوں کا ذکر شروع ہوتا ہے اور ان کے وہ اوصاف بھی بیان ہوئے ہیں جو سب خاندانوں میں مشترک ہیں اور وہ بھی جو بعض بعض سے مخصوص ہیں۔ درختوں کا اُگنا، پھولنا اور اُن پھولوں کی خصوصیتیں بیان کرنے کے بعد درختوں کی ذیلی تقسیم یہ کی گئی ہے کہ کون سے پھلتے ہیں اور کن میں پھل نہیں آتا اور اس نوبت پر درخت کی ساخت، جڑ، تنا وغیرہ پر بحثیں کر کے تنے پر ہونے والے مضر اثرات، کیڑے اور گھن وغیرہ کا ذکر ہے اور کم عمر اور پرانے طویل العمر درختوں کی تفصیل ہے۔

تنے سے لیے جانے والے کاموں کی بحث میں بہت سے امور آتے ہیں اور تیر کمان سے بحث کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر شاخوں تنوں کو کاٹنے اور کانٹے پھوڑنے چیرنے کے آلات کی پوری تفصیل ہے اور ایندھن پر گویا یہ بحث ختم ہوتی ہے۔ بات میں بات ایندھن میں آگ کا ذکر آتا ہے۔ ایک باب اس پر ہے کہ کون سی لکڑیوں سے چقماق کا

Marfat.com

کام (بجائے پتھر اور لوہے کے) لیا جاتا ہے اور دوسرے میں آگ کی داستان اس کی ولادت سے وفات تک ہے یعنی چنگاری، دھواں، راکھ، ان کے مختلف رنگ، اُن کے اسباب، گرمی کی زیادتی اور کمی، لکڑی کا جلنے میں چٹخنا اور اس کا سبب، جنگلوں میں بعض وقت خود بخود آگ کا لگ جانا اور اس کے اسباب، آگ کو طویل عرصہ تک محفوظ رکھنا اور اس کے طریقے جن سے بارش اور طوفان میں بھی وہ محفوظ رہے وغیرہ وغیرہ یہ دونوں باب ہمارے مخطوطے میں ہیں اور ابن سیدہ میں بھی اسی ترتیب سے محفوظ ہیں، گو جستہ جستہ جملوں کی صورت میں۔

پھر درختوں کے جھنڈ اور جنگلوں کا ذکر ہے یہاں مؤلف اہم درختوں کا فرداً فرداً ذکر کرتا ہے۔ پھر بوئی جانے والی نباتات کا ذکر اس سلسلہ میں دوبارہ کیا ہے، بعد ازاں زراعت، زرعی امراض، فصل کاٹنے والے اُسانے اور گوداموں میں محفوظ کرنے وغیرہ کی پوری تفصیل ہے۔ اس کے بعد غلوں کا الگ الگ ذکر ہے۔ جیسے گیہوں، جو، سبزیاں، ترکاریاں وغیرہ۔

اس کے بعد پھلوں کا ذکر ہے۔ سب سے پہلے انگور اور اس کی کاشت اور ضمناً شراب سازی، شراب نوشی، بدمستی اور اس کے نتائج بہت تفصیل سے آتے ہیں۔ کوئی زاہد تو اس رند پر کفر ہی کا فتوٰی دے دے کہ درختِ رز کے عین بعد مقدس کھجور کا ذکر آتا ہے۔ عربی میں نخلیات اور ثمریات پر مواد کی کیا کمی ہو سکتی ہے البتہ تفصیل کی نہ مجھے ہمت ہے نہ ناظرین سے صبر و تحمل ہو سکے گا۔ کھجور کے بعد سیب، بادام، پستے، انار وغیرہ بہ کثرت پھلوں اور میووں کا تفصیلی ذکر ہے۔

اس کے بعد گویا کتاب کا حصہ دوم شروع ہوتا ہے اور ایسے پودوں کا ذکر ہے جو چٹانوں، پتھریلی زمینوں، غیر مسطح یا مسطح میدانوں میں اُگتے ہیں، نیز وہ جو پانی میں یا پانی کے بہت قریب ہی اُگ سکتے ہیں، ضمناً اُن کا بھی ذکر آ گیا ہے جو سمندر کے کھاری پانی ہی میں اُگتے ہیں، حالانکہ عام طور پر کھاری پانی پودوں کے لیے زہر قاتل ہے، پھر مختلف ایسے پودوں کا ذکر ہے جن کے لیے محل پیدائش کی خصوصیت نہیں، نیز وہ پودے جن کے پتوں کی سبزی دیر تک رہتی ہے اور ان کی پت جھڑ دھوپ کا لے نے ختم پر

Marfat.com

ہوتی ہے۔ پھر کاٹنے والی جھاڑیوں کا ذکر اور اُن کی ذیلی قسمیں آتی ہیں، بیلوں اور زمین اور زمین پر پھیلنے والے پودوں کا بھی خصوصی ذکر ہے، مسواک اور ان درختوں کا جن سے وہ بنتی ہیں، الگ ذکر آیا ہے، اس کے بعد خوشبو دار پودے آتے ہیں اور یہ تفصیل بھی کہ کون سے عرب میں نہیں ہوتے۔ اس کے ساتھ عطر سازی اور خوشبوؤں کی صنعت کا ذکر ناگزیر تھا اور ذکر آیا ہے۔ اس کے بعد رنگوں کا ذکراور رنگ سازی کی صنعت نیز بالوں کے خضاب میں کام آنے والے پودوں کی تفصیل ہے۔ پھر ایک اہم باب اُن درختوں کے ذکر میں ہے جن سے عرق نکلتا ہے اور مختلف قسم کے گوند، لوبان وغیرہ کی تفصیل ہے۔

اس کے بعد ایسے پودوں کا ذکر ہے جن میں زیر زمین پھل آتا ہے یعنی جن کی جڑوں میں خوردنی و ناخوردنی گڈے نکلتے ہیں۔ یہ باب بھی ہمارے مخطوطے میں ہے۔

حنظل اور دوسرے کڑوے پھلوں والے پودوں کے بعد کدو، کھیرے، پیاز اور دیگر طبی نباتات کا ذکر آتا ہے اور زہریلے پودوں کے ذکر کے بعد جانوروں کی غذا اور چراگاہوں پر دینوری کے اقتباسات ختم ہو جاتے ہیں۔

بعض وقت حیرت بھی ہوتی ہے مثلاً آم کا ذکر دینوری کڑوے اور کھٹے پھلوں (حنظل وغیرہ) کے ساتھ کرتا ہے کیا اب سے ہزار برس پہلے ہمارا تخمی آم واقعی اتنا ہی غیر ترقی یافتہ تھا۔ پان کا ذکر خوشبودار پودوں میں بھی ہے اور یقطین (کدو کی جنس) کے ساتھ بھی اور عجیب عجیب خوش فہمیاں اس سے وابستہ کی گئی ہیں۔

ابن سمجون، الغافقی اور ابن البیطار کے ہاں زیادہ تر طبی مفاد کے اقتباسات ہیں، ان ممتاز طبیبوں نے دینوری کو جو وقعت دی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مختلف جڑی بوٹیوں کے متعلق اقتباسات میں دینوری کا بیان سب سے پہلے آتا ہے، غالباً ہمالیہ تلے کے براعظم کی طرح قدیم ایران واندلس میں بھی ہر پڑھا لکھا مسلمان اپنے نصابِ تعلیم میں طب کی کتابیں بھی پڑھتا تھا۔

پادری خاص کر مشنری آج بھی اس پر عامل ہیں، مجھے اپنے سفروں میں ہمیشہ افسوس ہوتا رہا کہ کیوں میں مبادی طب سے واقف نہیں کہ مریض بندگان خدا کی

Marfat.com

جنگلوں، صحراؤں، وغیرہ میں کچھ ممکنہ خدمت کرنے اور اُن کی تکالیف کم کرنے میں حصّہ لے سکتا، یہ ہماری جدید تعلیم ہے، مگر دینوری طب پیشہ چاہے نہ ہو، طب دان ضرور نظر آتا ہے اور ہر پودے کے ذکر میں اس کی طبّی خاصیت ضرور لکھتا ہے۔

دینوری کا طریقۂ بحث:

عربی تمدن اور ذوق کا عکس دینوری کی سطر سطر میں ہویدا ہے مثلاً جب چقماق کی لکڑیوں کا ذکر شروع ہوتا ہے تو وہ یکے بعد دیگرے ایسے ہر درخت کا نام لیتا ہے اور جن لوگوں نے اس کو دیکھا ہے ان کے منثور و منظوم بیانات درج کرتا ہے اور اگر اشعار اور ضرب الامثال میں کچھ تلمیحیں ہوں یا نامانوس الفاظ و غریب اللغات ہوں تو اُن کی تشریح و توضیح کرتا ہے، جا بجا قصے اور لطیفے بھی آ جاتے ہیں اور چونکہ ہر باب کے متعلق زبان کے جملہ متعلقہ اسماء و افعال کا یکجا کرنا مقصود ہے، اس لیے کچھ فصلیں عام ناظرین کے لیے خشک مگر لسانیات یا صرف ونحو کے طالب علم کے لیے معلومات کی کان بنی ہوئی بھی نظر آتی ہیں۔ مترادفات، اختلافِ روایات، سابقہ مؤلفوں کی تردید و تصحیح سب ہی کچھ آتی ہے اور بعض دلچسپ اور اہم ترین معلومات محض ضمناً اور بہ ظاہر غیر متوقع مقام پر ملتے ہیں۔

موجودہ مخطوطے کی اصلیت:

مجھے یہ مخطوطہ ایک مجموعہ رسائل میں مدینہ منورہ میں ملا، اس کی صحت کو جانچنے کا کوئی ذریعہ ڈھونڈھتا ہوں۔ دنیا میں کہیں بھی اس کے کسی اور نسخے کا تا حال پتا نہیں۔ چند سال قبل کہتے ہیں کہ بیت المقدس میں اس کا ایک نسخہ تھا۔ جو ۱۹۳۹ء میں بھی لا پتا تھا۔ نہ معلوم امریکا پہنچ گیا ہے یا یورپ ابھی ابھی آکسفورڈ کے ایک استاد سے سنا کہ استانبول میں اس کے کسی نسخے کا پتا چلا ہے لیکن وہ استانبول کے دیگر قلمی نوادر کے ساتھ صندوقوں میں بند اناطولیہ میں تہ خانوں میں کسی جگہ چھپا ہوا ہوگا اور مجنون مغرب میں جنگ کا خطرہ گھٹنے تک اس سے استفادہ ممکن نہیں ہوگا۔

میں نے یہ کہا کہ ابن سیدہ، لسان العرب، ابن البیطار وغیرہ (مذکورۂ صدر

خوشہ چینوں) نے دینوری کے اقتباسات جو سیکڑوں ہیں جمع کیے اور مدینہ منورہ کے مخطوطہ میں جو مسائل ہیں ان کو وہاں ڈھونڈنے کی کوشش کی جو کامیاب رہی۔ بیسیوں اقتباسات ایک یا زائد متاخر ماخذوں میں دینوری کے حوالہ سے ملے اور عبارت اتنی ہی ہو بہو اور یکساں ملی جتنی ایک ہی چیز کے متعدد ناقلوں کے ہاں ہو سکتی ہے۔ اس طرح کوئی شبہہ نہیں رہتا کہ مدینہ کا مخطوطہ اصلی اور واقعی دینوری کا ہے، بعد والوں کے ہاں بعض جگہ حذف وخلاصہ ہے لیکن ایسی کوئی چیز نہیں ملی جس سے یہ گمان ہو کہ مخطوطہء مدینہ کے ابواب بھی اصلی نہیں بلکہ اصل کا خلاصہ یا اقتباس ہوں۔

مخطوطہء مدینہ میں صرف تین باب ہیں اور جیسا کہ اوپر بھی اشارہ ہوا، پہلا باب چقماق کی لکڑیوں پر ہے۔ (جس میں آگ جھاڑنے کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے) دوسرا باب آگ اور شعلے اور دھوئیں اور راکھ کے رنگوں اور ان کے اختلاف کے اسباب پر ہے اور تیسرا باب زیر زمین پھلدار پودوں پر ہے۔

میں نہ تو نباتیات کا طالب علم ہوں اور نہ عربی ادب کا۔ محض عربی زبان کی کچھ واقفیت سے اس طرح کی فنی کتاب (جس میں بیسیوں نامعلوم پودوں کے نام اور دیگر اصطلاحیں ہیں) کو واحد مخطوطے کی مدد سے طباعت کے قابل بنانا بڑی جسارت ہے۔ بہرحال کسی اور اہل تر شخص کی آیندہ نظر ثانی کے بھروسا پر خدا کا نام لے کر اُسے ایڈٹ کر دیا گیا ہے۔ کام حسب دلخواہ نہیں ہوا، حوالے کی سب کتابیں نہیں ملیں۔ سفر نے الگ رکاوٹیں ڈالیں جب تک اصل کتاب چھپے یہ تعارف شاید اہلِ علم کے لیے دلچسپی کا باعث ہو۔

(معارف اعظم گڑھ۔ دسمبر ۱۹۴۹ء)

Marfat.com

''امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی''
کچھ اِس تالیف اور اِس کے مؤلف کے متعلق

استاذی المحترم مولانا الحاج الحافظ سید مناظر احسن گیلانی کی تالیف ''امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی'' ابھی ابھی کراچی میں طبع ہوئی ہے[1]۔ عموماً مؤلف اپنے اساتذہ یا مشابہ اساتذہ علماء سے کوئی تعارف یا پیش لفظ حاصل کرتے ہیں۔ فاضل استاذ کی گراں مایہ تالیف ان کے سب سے ادنیٰ وحقیر تلمیذ کے پاس آئی ہے تو ایک پیش لفظ کے ذریعہ سے خود سعادت اندوز ہونے کے سوا اور تو کوئی سوال نہیں۔ اگر ناشر کا بیان نہ ہوتا کہ خود اُستاذ محترم نے مجھ سے کچھ لکھوا لینے کا حکم دیا ہے تو شاید اس طرح کی سعادت اندوزی کو بھی گستاخی سمجھتا۔ ''مشک آنست کہ خود ببوید'' نہ کہ ''شاگردی پراند''

مؤلف کی سوانح عمری:

علماء کی بے نیازی اور کسر نفس شہرہ آفاق ہے۔ اسی لیے باوجود ملک کے مؤلفین کی صفِ اوّل میں ہونے کے استاذ محترم کی سوانح عمری کہیں چھپی ہوئی نہیں ملتی۔ اپنی معلومات درج کرتا ہوں تاکہ بعد والے کے لیے کچھ کام دیں۔

مناظر احسن (۱۳۱۰ھ) آپ کا تاریخی نام ہے۔ (میم کے زبر کے ساتھ) ماشاء اللہ اسم بامسمیٰ ہیں۔ خیال ہوگا کہ ابھی تو ''ساٹھا پاٹھا'' ہونے کو بھی ایک دو سال

---

[1] یہ کتاب نفیس اکیڈیمی کراچی نے اپریل ۱۹۴۹ء میں دوسری مرتبہ شائع کی۔ (مرتب)

Marfat.com

باقی ہوں گے۔لیکن علم کی بدقسمتی ہے کہ مولانا کی صحت بہت کمزور ہے۔قلب کے اور دیگر عارضوں سے بارہا طویل عرصوں تک علیل و فریش رہے ہیں۔ خدا آپ کی عمر و صحت میں برکت عطا فرمائے۔آمین

آپ کی ولادت صوبۂ بہار میں گیلانی نامی گاؤں میں ہوئی۔ یا نسبت کے مزید اضافے کی جگہ آپ اپنے کو گیلانی ہی لکھتے ہیں۔قطب الاقطاب گیلان سے نسبت گویا مقصود تھی۔آپ کا تعلق نہ صرف بلند مرتبت شرفائے سادات سے ہے بلکہ علم و عمل بھی موروثی ہے۔آپ کے بزرگوں کو غالباً علم ہئیت سے بھی خاص لگاؤ رہا ہوگا کیونکہ مکان میں ایک بہت پرانی اور عمدہ سنگ مرمر کی دھوپ گھڑی بھی دستیاب ہوئی تھی جو اوقات الصلاۃ کے لیے فرنگی گھڑیوں کی محتاجی سے بچاتی رہی ہوگی۔

آپ کی تعلیم متعدد دینی درس گاہوں میں ہوئی۔بعض وقت ایسی صورتوں میں آدمی لا الی ھؤلاء ولا الی ھؤلاء ہو جاتا ہے۔مگر مولانا میں علم و سیرت کی بڑی شان نظر آتی ہے کہ دیوبندی آپ کو اپنا کہتے ہیں تو بریلوی اپنا۔ان دونوں مکاتب خیال کی انگریزی دور میں ملک میں جو ''مکافرت'' اور کشمکش تھی اس میں یہ اپنایا جانا حیرت انگیز ہے۔مگر مولانا حقیقت میں ان دونوں سے بھی بالا ہیں یعنی آپ صرف مسلمان ہیں۔رسول اللہ کسی کو نہ سنی شیعہ بنانے آئے تھے نہ حنفی وہابی۔ بلکہ اِنَّ الدِّین عِندَ اللہ الاسلام کے ازلی پیغام کی تجدید کے لیے۔

جہاں حسن جمال سے فائز'سرخ و سپید' ہزاروں میں ممتاز و فائق تھے وہاں حسنِ باطنی ۔

بالائے سرش ز ہوش مندی

می تافت ستارۂ بلندی

(سعدی)

نوعمری ہی سے خطابت، انشاپردازی اور شاعری، تینوں میں ہمسروں میں ممتاز رہے،کبھی گندہ سیاسیات میں حصہ نہ لیا۔اس لیے زورِ بیان و خطابت کے لیے محافل وعظ میں آپ کے لیے زیادہ کشش رہی تو زورِ قلم اور نظم و نثر ٹھوس علمی اور بلند پایہ جرائد

Marfat.com

کے سوا آپ کو کہیں اور نہ لے جا سکے۔

ایک مرتبہ فرما رہے تھے نوعمری میں میری ایک نظم کسی رسالے میں چھپی۔ برسوں گذر گئے میں خود اسے بھول بھلا گیا۔ پھر ایک مرتبہ ایک صاحب سے کہیں ملاقات ہوئی جو شاعر بھی تھے انہوں نے اپنے جس کلام کو فخریہ سنانے کے لیے بیاض میں سے انتخاب کیا وہ وہی بھولی بسری نظم تھی۔ پہلی بیت ہی پر کھٹکا کہ یہ تو پہلے بھی کہیں پڑھی سنی ہوئی نظم ہے۔ دورانِ انشاد میں یاد آ گیا کہ چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد۔ اس سے کیا کہتے۔ صرف یہ کہا کہ ہاں بھئی، نظم بہت اچھی ہے۔

ایک اور دفعہ ارشاد ہوا۔ مجھے ابتداءً علوم عقلیہ کا بڑا شغف تھا۔ حدیث وغیرہ سے دلچسپی نہ تھی۔ دیوبند میں شریک ہوا بھی تو ایک طرح سے غرور کے ساتھ کہ یہ بیچارے ہمیں کیا پڑھائیں گے۔ شیخ الحدیث کے درس میں پیچھے بیٹھتا تھا اور کچھ کھنچا کھنچا سا۔ چند دن گذرے تو استاذ نے خود توجہ کی۔ درس کے بعد ٹھہرایا اور پوچھا کہ کون ہو، تعلیم کا کیا حال ہے وغیرہ۔ میں نے عرض کی کہ علوم عقلیہ پڑھ کر آ رہا ہوں۔ طرح طرح کے وسوسے دل میں ہیں اور حدیث شریف سنتے وقت بھی یہی حال رہتا ہے اس لیے ذرا پیچھے بیٹھتا ہوں۔ کہا اب آئندہ وسوسے نہیں ہوں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ پھر اُس دن کے بعد سے الحمد للہ وسوسوں کا نام ونشاں نہ رہا اور میں روز افزوں دلچسپی سے علومِ حدیث کی تحصیل میں مشغول ہو گیا۔

ملک کے مختلف مراکز علم میں تحصیل، چشم بددور قابل رشک حافظہ اور ان سب کے ساتھ مطالعے کا ذوق اتنا کہ بیان سے باہر، اسی کا نتیجہ ہے کہ قلم برداشتہ لکھتے ہیں اور پھر بھی ایک بحر زخار نظر آتا ہے کہ موجیں مارتا، ناظر کے قلب و دماغ کو غرقاب کرتا سب پر چھاتا نظر آتا ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں درس کے علاوہ مجھے پانچ سات دفعہ آپ کی تقریریں پبلک میں سننے کا موقع ملا ہے۔ کبھی سیرت النبیؐ کے مرغوب موضوع پر، کبھی اشتراکیت کی اسلامی نقطۂ نظر سے چھان بین پر۔ جیسے جیسے تمہید کے بعد آگے بڑھتے تب زور بیان بڑھتا جاتا ہے۔ اور جیسے جیسے زورِ بیان بڑھتا ہے، جوشِ بیان بھی۔ سننے والے مسحور رہتے ہیں تو خود خطیب بھی خطابت کے کیف سے سرشار۔ آواز گونجنے لگتی

Marfat.com

ہے۔ خیالات کی مناسبت سے اعضاء میں تڑپ اور حرکت، گانے میں باجے، یا فوجی بینڈ میں ڈھول کی اثر انداز صداؤں کا آمیزہ کر دیتے ہیں۔ الفاظ ہیں کہ آبشار کی طرح بیش از بیش گرتے چلے جاتے ہیں بلکہ لغت خیالات کا ساتھ نہیں دے سکتی اور ہر قدم پر نئے الفاظ کی ضرورت پیش آتی ہے اور وہ خود بخود ڈھل ڈھل کر زبانِ سخاوت نشان پر نثار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور نئے الفاظ ہونے کے باوجود نامانوس نہیں ہوتے۔ جیسے ایک دن ایسے ہی ایک موقع پر کہا ''ایک بڑا مچھلا ہے کہ چھوٹی مچھلیوں کو نگلتا جاتا ہے'' تقریر کی روانی کا یہ حال ہے کہ ملک کے تیز قلم سے تیز قلم مختصر نویس (اسٹینوگرافر) بارہا کوشش کرتے رہے مگر کبھی کامیاب نہ ہوے کہ آپ کی رفتارِ بیان کا ساتھ دے سکیں۔

حیدر آباد میں آمد:

پہلی عالمگیر جنگ کا زمانہ تھا، انگریز کے دورِ ستم میں ایک سیاسی پناہ گزیں کی طرح پایۂ تخت آصفیہ حیدر آباد دکن میں تشریف لائے۔ بے کس و بے سہارا تھے۔ ذوق و عادت سے مجبور ہو کر حیدر آباد کی مشہور صد سالہ دینی درس گاہ جامعہ نظامیہ میں نام لکھا دیا جہاں تعلیم، قیام، طعام بلکہ کتب ولباس تک سب کو مفت ملتے تھے۔ لیکن حالات نے اس کا موقع نہ دیا کہ ان سہولتوں سے کچھ استفادہ کرتے۔ جلدی ہی جامعہ عثمانیہ قائم ہوگئی اور غالبًا مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (وزیرِ امور مذہبی) کی توجہ سے آپ کو فنون و سائنس کی جماعتوں میں سنی طلبہ کو ''دینیات لازم'' پڑھانے کے لیے بطور لکچرار لے لیا گیا۔ اس کی ماہوار (۲۵۰ تا ۴۰۰) تھی۔

جامعہ عثمانیہ کوئی پھولوں کی سیج نہ تھی۔ ایک خود مختار دیسی ریاست ہونے کے باوجود انگریزی سفیر مقیم (ریذیڈنٹ) کی مرضی کے خلاف کوئی اہم کام مشکل سے ہو سکتا ہے۔ جدید وضع کی جامعہ اور ذریعۂ تعلیم انگریزی نہ ہو بلکہ اردو، یہ گھریلو حیدر آبادی چیز نہ تھی، اس کے اثرات سارے برطانوی ہند کے نظام تعلیم پر پڑتے۔ انگریز کیوں منظور کرتا کہ اس کی بات کے چلتے انگریزی زبان پر کوئی ٹیڑھی نظر بھی ڈال سکے۔ لیکن بہرحال انگریز نے اسے منظور بھی کیا تو اس تصور اور تیاری کے ساتھ کہ ''نظام کے خرچ

پر یہ تجربہ کرایا جائے اور اس کے ناکام ہونے پر برطانوی ہند کے سیاسی شورش کرنے والوں کو بتایا جائے کہ کسی ''کالی'' زبان میں جدید علوم کی تعلیم نہیں ہوسکتی۔''

ملک کے اعلیٰ حکام میں جو رقابتیں ہر جگہ ہوتی ہیں، اس کے تحت بعض نہایت بااثر افسر ہمیشہ اس پر تلے رہے کہ یہ جامعہ چلے نہیں۔

قدامت پسندی اور نئی روشنی کی کشمکش نے نصاب ساز جماعتوں کو اس پر آمادہ نہ ہونے دیا کہ نصاب قومی ضروریات کے مطابق بنایا جائے بلکہ صرف اس پر کہ صرف زبان کی تبدیلی کے ساتھ برطانوی ہند کی جامعات ہی کا نصاب جاری ہو۔ طالب علم چاہے انگریزی میں کتابیں پڑھ کر دہریہ، غلامانہ ذہنیت والا اور اپچ سے عاری بنے یا اُردو میں پڑھ کر --فرق تو کچھ نہیں بلکہ خطرہ ہی بڑھ جاتا ہے کہ دہریت وغیرہ اب عوام کی دست رس میں بھی آ جائے۔ صرف اتنا ہوا کہ جملہ طلبہ کو چاہے فنون کے ہوں یا سائنس کے، مذہب و اخلاق پر بھی ہفتے میں دو گھنٹے لازمی طور پر لکچر ہوا کریں۔ سنیوں کے لیے دینیات لازم کے نام سے اور غیروں کے لیے اخلاقیات کے عنوان سے۔

دینیات لازم کے لکچرار کا فریضہ بڑا کٹھن اور نازک تھا۔ فلسفہ اور سائنس کے طلبہ اس سے آئے دن اور ہر سال سوال کرتے۔ بعض دق کرنے کے لیے اور بعض نیک نیتی سے ازالۂ شبہات کے لیے۔ اور جو شخص خود ان جدید علوم سے بے بہرہ ہو وہ ان کی تشفی کیسے کر سکے۔ ابتداء میں صرف فطری ذہانت کام دیتی رہی ہوگی۔ پھر رفتہ رفتہ علوم کی کتابیں ترجمہ ہو کر لکچرر دینیات کی دست رس میں بھی آتی گئیں اور وہ روز افزوں علوم جدیدہ کے مختلف پہلوؤں سے واقف بھی ہوتے چلے گئے۔ ان کے کمزور پہلوؤں سے آگاہی جوابی اعتراض میں کام دیتی تو ان کے وسائل اور حربوں سے واقفیت کے باعث انہیں حربوں کو اسلام کی تائید میں استعمال کرنا ممکن ہوگیا۔ جو کام اپنے زمانے میں امام غزالی نے کیا، وہی کام اس جماعت کے استاد کو کرنا پڑتا تھا اور کوئی احیاء العلوم ثانی چاہے ابھی تحریر میں نہ آئی ہو لیکن گزشتہ تیس سال سے سال بسال جامعہ عثمانیہ کے طلبہ اس جدید علم کلام سے مستفید و متاثر ہوتے رہے ہیں اور نتیجہ یہ بتاتا ہے کہ ہمالیہ تلے کے براعظم کی ڈیڑھ دو درجن جامعات میں سب سے کم دہریت اگر کسی جگہ پھیل سکی تو

وہ جامعہ عثمانیہ رہی ہے۔ اور اس کا سہرا بہت بڑی حد تک صرف مولانا سید مناظر احسن گیلانی مدظلہ کے سر رہا ہے۔

آپ کچھ عرصہ شعبۂ دینیات میں رہے اور حدیث کا درس دیتے رہے اور غالباً انٹرمیڈیٹ میں مجھے اسی مضمون کے سلسلے میں چند دن شرفِ تلمذ کا راست موقع رہا۔ پھر وہ فنون و سائنس کے شعبوں میں دینیات لازم پڑھانے کے لیے بالکلیہ منتقل ہو گئے تو راست تلمذ کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ بہت برسوں کے بعد مکرر مولانا جواب لکچرار سے ترقی کر کے ریڈر بن چکے تھے، (اور ۳۵۰ تا ۶۰۰ ماہوار پاتے تھے) دوبارہ شعبہ دینیات میں منتقل ہوئے مگر ایم۔اے میں میرا مضمون فقہ تھا۔ اس لیے راست تعلق پھر بھی پیدا نہ ہو سکا۔ مختلف درمیانی اساتذہ کی وفات، پیرانہ سالی کی بنا پر خدمت سے سبک دوشی وغیرہ کے باعث آخر الامر مولانا ہی سب سے سینیئر ہونے کی بنا پر صدرِ شعبہ بنے۔ یہ دوسری جنگ عالمگیر سے کچھ ہی دن پہلے کا واقعہ ہے اس وقت ان کی ماہوار (۵۰۰ تا ۱۰۰۰) ہوگئی۔ اور وہ فرسٹ گریڈ پروفیسر ہو گئے۔ علوم دینیہ کا اعزاز جامعہ عثمانیہ میں کسی اور دنیوی علم سے کم نہ تھا۔

میں ۱۳۵۵ھ (۱۹۳۵ء) میں جامعہ عثمانیہ شعبہ دینیات کا لکچرار فقہ بن کر مامور ہوا۔ لیکن چند ماہ بعد ہی شعبۂ قانون بین الممالک وغیرہ پڑھانے کے لیے منتقل کر دیا گیا۔ اس طرح راست تلمذ کے بعد راست رفاقت بھی زیادہ دن نہ رہی لیکن ایک تو شخصی روابط، دوسرے ایک ہی عمارت میں ہم سب کا خدمتِ علم میں مشغول رہنا اور تیسرے نصابی و انتظامی مختلف کمیٹیوں میں آئے دن ملنے کا موقع اس دوری کو صرف نظری رکھتا ہے، واقعی نہیں۔ اور مولانا کی علمیت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملنے لگا۔

اس پندرہ سولہ سالہ خدمتِ جامعہ نے بڑا فرق پیدا کر دیا تھا۔ اب اس مولوی میں جو دیوبند وغیرہ سے دستارِ فضیلت باندھ کر آیا تھا، اور اس پروفیسر میں جو ایک جدید وضع کی جامعہ میں درس دے رہا تھا، کوئی نسبت تھی تو شاید یہی کہ وہ پہلے بھی پکے مسلمان تھے اور اب بھی -- لیکن جامعہ کے ماحول نے ان کو ایسی چیزوں کا موقع دیا جن کی کسی دینی درس گاہ میں نہ تو ضرورت ہوتی ہے اور نہ سہولت۔

Marfat.com

اوّلاً جدید ذہنیت کے طلبہ کو پڑھاتا تھا جس کا اوپر ذکر آیا۔ دوسرے ایک چھت کے اندر ڈیڑھ دو سو اساتذہ درس دیتے تھے جو بیسیوں ہی علوم و فنون پڑھاتے تھے۔ آئے دن بلکہ ہر روز ان سے علمی مباحث رہتے اور طلبہ سے کہیں زیادہ ان سے باہمی افادے، استفادے اور تبادلۂ خیال کا موقع ملتا۔ مثلاً کبھی کوئی پروفیسر تاریخ پوچھتا، مولانا! مسلمانوں کی بحری زندگی پر میں ایک مضمون لکھ رہا ہوں اور قرآن نیز تاریخ سے میں مواد لے چکا ہوں، اگر حدیث کا کچھ مواد آپ مہیا فرما سکیں .... کوئی پروفیسر فلسفہ، کوئی پروفیسر معاشیات، کوئی پروفیسر قانون آئے دن آپ سے ایسے مسائل پر مواد مانگتا جو کسی عام مولوی کو کبھی ڈھونڈھنا ہی نہیں پڑتا۔ حیدرآباد کے بے نظیر کتب خانے، قلمی بھی اور مطبوعہ بھی اسلامیات کے لیے شاید استنبول اور قاہرہ کے بعد ساری دنیا میں تیسرے نمبر پر تھے۔ اور وہ ہر وقت دست رس میں تھے۔ کسی اور جگہ کے استاذ کو یہ سہولت کہاں ملتی۔

اب ایک نیا واقعہ پیش آیا جس نے آپ کے فیضان کی رفتار و مقدار کو بہت بڑھا دیا۔ ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۰ء) میں بعض شعبوں میں مابعد ایم۔اے تحقیقات علمیہ کا ''ریسرچ ڈپلومہ'' قائم ہوا تھا اور پہلے ہی سال فقہ کے دو طلبہ اس میں لیے بھی گئے تھے لیکن پھر ایک طویل وقفہ رہا۔ مولانا کے صدر شعبہ بننے کے زمانے میں ایم۔اے کے طلبہ کے لیے بھی ریسرچ لازمی کر دیا گیا۔ ہر سال تفسیر، حدیث، فقہ، اور کلام کے دو چار طلبہ ضرور ہوتے تھے۔ ان کے لیے اچھوتے عنوان تلاش کرنے اور ان سے تحقیقاتی کام لینے اور مقالہ لکھوانے کا کام زیادہ تر مولانا اپنے ہی متعلق رکھنے کا ایثار گوارا فرماتے تھے۔ شعبۂ دینیات سے بھی اس طرح کے ڈیڑھ دو درجن مقالے مرتب اور منظور ہو گئے۔ ان میں سے بعض مختلف علمی رسالوں میں بہ اقساط یا کتابی صورت میں چھپے بھی ہیں۔ چند ایک تو کہنا چاہیے کہ لاجواب ہیں۔ مثلاً اصولِ فقہ کی تدوین کی تاریخ، اسلامی اصول معاشیات وغیرہ۔ دوسری عالمگیر جنگ کا زمانہ تھا کہ پی۔ایچ۔ڈی کی جماعتیں بھی کھل گئیں اور کئی سال شوقین طلبہ آتے رہے جن میں سے غالباً دو کے مقالے منظور بھی ہو گئے۔ ایک تو ''قانونِ جنایات بر بنائے غفلت کا تقابلی مطالعہ'' اور دوسرے ''اسلامی

Marfat.com

اصولِ معاشیات"۔ یہ مقالے اصل مع ترجمہ اُردو اور انگریزی دو زبانوں میں تیار ہوتے تھے اور ممتحنوں میں سے ایک یورپ یا امریکہ کا بھی ہوتا تھا۔

طلبہ سے اس طرح کا کام لینے میں اساتذہ کو بھی محنت اور مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور طلبہ کو "تحفہ" دیے ہوئے مواد کے بعد بھی بہت کچھ استاد کے پاس بچ رہتا ہے۔ ایسی ہی چیزوں سے مولانا اپنی بعض تالیفات تیار کرتے گئے اور ان میں سے کئی ایک اہلِ علم کے لیے چھپ کر منظرِ عام پر بھی آ گئی ہیں۔

اس کے علاوہ جامعہ عثمانیہ میں متعدد علمی رسالے تھے نیز علمی انجمنیں اور ادارے یا دائرے بھی۔ خود شہر حیدرآباد میں مزید برآں رسالے اور ادارے تھے۔ ان سب میں مولانا کو حصہ لینا پڑتا اور ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا پڑتا۔ برطانوی ہند کے علمی رسالے ان کے علاوہ تھے۔

میں نے کئی بار مولانا سے عرض کیا کہ اپنے نشریات کا ایک مکمل ذخیرہ کسی کتب خانے میں فراہم کر دیں۔ کم از کم ایسی ایک یادداشت تیار فرمائیں کہ کون سا مضمون کس رسالے کے کس نمبر میں کہاں اور کب شائع ہوا۔ مولانا ان چیزوں سے مستغنی ہیں اور خوف ہے کہ مولانا سے آج کل قریب رہنے والے اس پر فوری توجہ نہ کریں تو بہت سے جواہر ریزے ناپید نہ ہو جائیں۔

<u>کتاب ہذا:</u>

قدیم زمانے کے اسلامی علماء کی طرح زیرِنظر کتاب جامع ضرور ہے، مگر مانع نہیں۔ یعنی اس میں اپنے موضوع پر جملہ متعلقہ مواد تو جمع کر دیا گیا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ دیگر معلومات کا بھی ضمناً آ جانا ممنوع رہا ہو۔ اس میں معلومات کا انبار ہے، لطیف استنباطات کی بھرمار ہے اور صبر سے اور بار بار پڑھنے والے کو ہر قدم پر اور ہر دفعہ نئی نئی چیزیں ملتی ہیں۔

یوں تو کتاب اپنے موضوع پر مفید ترین معلومات کی حامل ہے لیکن اس کی اہمیت چودھویں صدی ہجری کے اس ثلثِ ثالث میں خاص کر اس کے مقامِ اشاعت

Marfat.com

یعنی پاکستان کے لیے غیر معمولی ہے۔

کتاب میں اصل میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ خانوادہ بنی اُمیہ جب اپنی غلطیوں کو نباہنے کے لیے مزید غلطیوں کا حکومت میں عمداً اضافہ کرتا چلا گیا اور بالآخر اپنے خاتمے کے قریب اس کا پورا نظم ونسق پوری طرح از سرتا پا سڑا ہوا جسم بن گیا تو انقلاب ناگزیر بھی تھا اور ضروری بھی۔ خلفاء عباسیہ قوم کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بن کر برسر اقتدار آئے۔ لیکن قوم کو جلدی ہی مایوس ہونا پڑا۔ بات یہ تھی کہ پرانے عہدہ داروں کی جگہ لینے کے لیے نعم البدل نوجوانوں کو منظم طور پر تربیت دینے اور تیار کرنے کی طرف توجہ نہیں کی گئی تھی اور نتیجہ ع۔ گاؤ آمد وخر رفت تھا۔ عوام کی مصیبت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ نئے حکمراں بھی استبداد پسند تھے اور نئے افسر اور حکام عدالت بھی جاہل و رشوت خوار۔

عام حالتوں میں انقلاب اور جوابی انقلابوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا۔ بنی اُمیہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے کے لیے عوام میں جو شوریدہ سری پیدا کی گئی تھی وہ ہر نئے من چلے ہوشمند کو تیار وسائل خانہ جنگیوں کے لیے مہیا کرتی۔

امام ابو حنیفہ نے بنی امیہ کے خلاف تحریک کے آغاز ہی کے وقت اس ضرورت کو بھانپ لیا تھا اور گویا ایک خانقاہ بنا کر وہیں مستقبل کے افسروں کو پوری تن دہی اور بے نفسی سے اپنی بساط بھر تیار کرنا شروع کیا۔ خلافت عباسیہ کے آغاز پر انہوں نے کئی سو افراد ایسے تیار کر دیے جو عالم باعمل تھے یعنی ان میں دین داری، دیانت داری اور ساتھ ہی فرائضِ نظم ونسق کی پنداری بھی تھی۔

جب یہ ہو گیا تو انہوں نے رائے عامہ کو ہم نوا بنایا کہ جاہل و رشوت خوار افسروں کو بھی خدمت سے الگ کیا جائے اور استبداد پسند خلیفہ بھی روزمرہ کے نظم ونسق میں دخل نہ دے کہ دستور وآئین کا پابند رہے۔ امام ابو حنیفہ نے یہ اہم امر بھی طے کر لیا تھا کہ خود کوئی عہدہ بڑے سے بڑا بھی قبول نہ کریں۔ اس چیز کے باعث ان کی آواز میں بھی قوت آگئی اور ان کے مخالفین بھی بوکھلا گئے۔

امام ابو حنیفہ کو شہید ہونا پڑا۔ لیکن ان کے خون سے اسلام کی سوکھی ہوئی کیاری

سنچ گئی اور پیاسی زمین سیراب ہوتے ہی ہری بھری ہو گئی۔ چنانچہ ان کی وفات پر شاید دس سال بھی نہیں گذرے تھے کہ ان کے شاگرد نظم ونسق پر چھا گئے اور امام ابو یوسف کی سرکردگی میں ڈیڑھ سو سالہ اسلامی مملکت کو تباہی سے بچا کر مزید چند سو سال تک ایک نئی اور زیادہ صحت ور زندگی بخشنے کا سامان پیدا ہو گیا۔ اور جیسا کہ مولانا نے واضح فرمایا ہے (ص ۱۴) طبع جدید کا صفحہ، یہ بھی مجدد اوّل حضرت عمر بن عبدالعزیز کے فیض لامتناہی کی ایک اور برکت نظر آتی ہے۔ یہ دور امام ابو حنیفہ کی عمر کے تاثر پذیر دور کا ہم عصر ہے۔

ہوا یہ کہ خلفاء بنی امیہ نے بعض مرتبہ، غالباً نیک نیتی سے، چند ایسے لوگوں کو قاضی مقرر کیا جو کردار تو عمدہ رکھتے تھے اور ہر طرح منصف مزاج اور بے لاگ قاضی بننے کے قابل تھے لیکن قانون سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ قدیم رومی روایات کے تحت (جو شام میں کچھ نہ کچھ باقی رہی ہوں گی) خلفاء نے یہ کیا کہ ان پڑھ قاضی کو پڑھے لکھے مشیر و مفتی مدد دینے کے لیے مہیا کر دیے اور اس طرح مقصد حاصل ہو گیا تھا۔ لیکن بعد میں اس نظیر سے بے جا کام لیا گیا اور جاہل قاضی روز افزوں ہوتے گئے۔ مزید برآں کوئی مجموعۂ قانون و نظائر ملک میں نہ تھا۔ استبداد پسند اموی خلفاء یہ چاہتے بھی نہ تھے۔ قاضیوں کے لیے ابتداءً پوری نیک نیتی سے اجتہاد کی صلاحیت رکھنے کی ضرورت سمجھی گئی تھی تا کہ قرآن و حدیث سے مسائل استنباط کر لیا کریں۔ بعد کے زمانے میں یہ لفظ تو رہ گیا اور معنوں کی طرف توجہ نہ رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شہر کی نظیریں الگ ہو گئیں۔ بلکہ بُرے قاضیوں کی صورت میں خود ان کے اپنے فیصلے مماثل صورتِ مقدمہ کے باوجود فریق مقدمہ کے بدلنے پر مختلف ہونے لگے۔ ابھی انگریزی دور میں کلکتہ، مدراس، بمبئی، لاہور وغیرہ کی عدالت ہائے عالیہ میں دہلی کی مرکزی کنیز لندن کی پریوی کونسل کی ترمیمی و اصلاحی شخصیت کی موجودگی کے باوجود جتنا اختلاف رائے تھا اس سے سب واقف ہیں اور اس سے ایک بہت ہی ہلکا تصور خلافتِ عباسیہ کے آغاز پر اسلامی قانون کے متعلق باہم متعارض نظائر کے متعلق کیا جا سکتا ہے۔

اس صورت حال کا (جس کا ذکر مولانا نے ص ۳۰۲ پر (طبع جدید کا صفحہ؟) ایک جدید مصری تالیف کے واسطے سے کیا ہے لیکن جو رسائل البلغاء میں ابن المقفع کے اصل

رسالے یعنی رسالہ فی الصحابہ کے شائع ہو جانے کے باعث راست و بالواسطہ بھی کیا جا سکتا ہے، امام ابو حنیفہ نے علاج یہ سوچا تھا کہ سیاست باز تو فوجی انقلاب کی تیاریوں میں منہمک رہیں اور یہ اپنے شاگردوں کو لے کر دنیوی جاہ طلبی سے بے پروا ہو کر فقہ اسلامی کے انبار میں (جس میں بے لگام نظائر کے باہمی تعارض نیز علم حدیث کے کامل طور پر تا آں دم مدوّن و منقح نہ ہونے کے باعث متصادم؟ ایک مزید تعارض کے باعث مشکلیں بڑھ گئی تھیں) ایک نظام قائم کرنے کی کوشش کریں۔

انہوں نے اوّلاً حکومتی نقطۂ نظر سے بے ضرر یعنی مسائلِ عبادات پر توجہ اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ایک ایک باب کو لے کر اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ جزئیات کو دلائل و شواہد کے ساتھ معین کرنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ حکومتی مسائل مال گزاری وغیرہ کو بھی مدون کیا۔ یہ یقیناً نقشِ اول تھا۔ لیکن ایک تو ایک کارکرد چیز (ترمیم و اصلاح کے لیے تیار) موجود ہو گئی اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ایک جماعت مہیا ہو گئی جسے اس کام کے کرنے کی تربیت مل چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کی روایات نسلوں تک چلتی اور صدیوں تک کارفرما رہتی ہیں۔

مشکلات کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک خلیفہ کو ایک مرتبہ چالیس ''مولوی نما'' بدمعاشوں نے یہ ''فتویٰ'' دیا کہ خلیفہ قانون سے بالا ہے۔ (کیا انگلستان کا بدنام مقولہ King can do no wrong بادشاہ سے قصور سرزد ہو ہی نہیں سکتا، یہ بھی کہیں اسی کی نقالی تو نہیں تھی؟) ایک اور مشکل یہ تھی کہ فقہ زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ہے۔ اور قانون کے ماخذوں میں قانون کے علاوہ لغت، صرف نحو، تاریخ وغیرہ ہی نہیں حیوانیات، نباتیات، بلکہ کیمیا وطبعیات کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ قبلہ معلوم کرنا جغرافیہ طبعی پر موقوف ہے۔ نماز اور افطار و سحری کے اوقات علم ہیئت وغیرہ کے دقیق مسائل پر مبنی ہیں۔ رمضان کے لیے رویت ہلال کو اہمیت ہے۔ اور بادل وغیرہ کے باعث ایک جگہ چاند نظر نہ آئے تو کتنے فاصلے کی رویت اطراف پر مؤثر ہو گی وغیرہ وغیرہ مسائل کی طرف اشارے سے اندازہ ہو گا کہ نماز روزہ جیسے خالص عباداتی مسائل میں بھی علوم طبیعہ سے کس طرح قدم قدم پر مدد لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کاروبار، تجارت،

Marfat.com

معاہدات، آب پاشی، صرافہ، بنک کاری وغیرہ وغیرہ کے سلسلے میں قانون سازی میں کتنے علوم کے ماہروں کی نہ ضرورت ہوگی! امام ابوحنیفہ ہر علم وفن کے ماہروں کو ہم بزم کرنے اور اسلامی قانون یعنی فقہ کو ان سب کے تعاون سے مرتب و مدوّن کرنے کی کوشش میں عمر بھر لگے رہے اور بہت کچھ کامیاب بھی ہوے۔

کتاب میں قسم قسم کے معلومات یک جا ہو گئے ہیں۔ کسے یقین آئے گا کہ امام ابوحنیفہ (فوت ۱۵۰ھ) زمین کے کروی اور گول ہونے کے قائل تھے؟ صفحہ (۲۳۲) پر جو قصہ لکھا ہے اس سے اس کے سوا کیا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ خلیفہ منصور کی موجودگی میں امام ابوحنیفہ سے کسی نے پوچھا کہ "دنیا کے ٹھیک بیچ میں کون سی جگہ ہے؟" - امام نے فرمایا کہ "وہی جگہ جہاں تو بیٹھا ہے۔" زمین کے ٹھیک کروی الشکل ہوے بغیر نہ تو یہ جواب صحیح ہو سکتا ہے اور نہ سائل اس پر چپ اور قائل ہو سکتا ہے۔ (قطبین پچکنے سے یہاں بحث نہیں)۔

"جریج شاید جارج کے لفظ کی کوئی صورت ہے" اس کا تعلق گریگوری سے سمجھا جاتا ہے۔

امام ابو یوسف سب سے پہلے قاضی القضات تھے بطور واقعہ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ اسی طرح کا کام اولاً امام ابوحنیفہ کو پیش کیا گیا تھا جسے انہوں نے قبول نہیں فرمایا اس کے ماننے سے بھی انکار نہیں۔ لیکن اس سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا کہ اس عہدے کا تصور امام ابوحنیفہ کی (جو ایرانی النسل تھے) تجویز سے ہوا یا خود خلفاء عباسیہ کو اپنے احول کے ایرانی اثرات و روایات سے، قبل اسلام کے عہدۂ موبذ موبذان کے باعث، اس کی تجویز سوجھی، بہرصورت قاضی القضات کا تصور (جو وزیر عدالت اور میر عدل دونوں کے اجتماع کی حیثیت ہے) ایرانی تھا یا نہیں، مولانا کی طویل بحث کے باوجود حل نہ ہو سکا۔ موبذ موبذان آیا خالص مذہبی افسر تھا یا خالص عدالتی یا دونوں کا جامع، جب تک اس کا مواد سامنے نہ آئے خالص عدالتی قاضی القضات کے تصور کا ماخذ معلوم نہیں ہو سکتا۔ میں پورے استناد کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن قدیم تر تمدنوں مثلاً یہودیوں وغیرہ کے ہاں مذہبی اور عباداتی اعلیٰ افسر ہی اعلیٰ ترین افسر عدالت و مرافعہ بھی ہوتا تھا۔ موبذ موبذان

بھی ایسا ہی رہا ہو، قرین قیاس ہے۔ جاحظ نے موبذ موبذان کا ترجمہ اگر قاضی القضاۃ کیا تھا، تو اس مذہبی افسر کے عدالتی شعبۂ فرائض کے ذکر کے سلسلے ہی میں ہو گا۔ ایران میں خالص عدالتی موبذ موبذان کا پتا نہیں چلتا کہ قاضی القضاۃ کو اس کی تتبع قرار دیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ خلافتِ راشدہ و خلافت بنی امیہ میں ایسی کوئی چیز مسلمانوں میں نہ تھی۔ اور یہ امر معنیٰ خیز ہے کہ اس طرح کا عہدہ بغداد اور قرطبہ میں ایک ہی وقت میں قائم ہوا۔ گویا وہ ایک سماجی ضرورت تھی اور مسلمانوں کی عمرانی ضرورتوں نے اس کا قیام بجھایا تھا۔ اور بس۔

کتاب کے بعض اور دلچسپ معلومات میں سے یہ ہے کہ ابو مسلم خراسانی کے زمانے میں بھی چینی کے برتن پائے جاتے تھے۔

وزراء کو نماز با جماعت نہ پڑھنے کی بنا پر عدالت میں مردود الشہادت قرار دیا جاتا تھا۔

ایک بڑی دلچسپ بات یہ کہ امام محمد شیبانی کو تدوین فقہ میں جو مددگار ملے ان میں ان کی اپنی بعض رومی لونڈیاں بھی تھیں اس سے مراد یونانی ہوں گی۔ کیونکہ تاریخ اسلام میں رومی سے مراد عموماً بیزنطینی ہوتے ہیں یعنی قسطنطنیہ کی سلطنت والے۔ اور ان میں یونانی سب سے ممتاز تھے۔ کیا یہ لونڈیاں صرف صاف نویس تھیں یا اس سے زیادہ کچھ اور بھی؟

بنی تغلب کے متعلق ایک معاہدے کا بعض مورخ ذکر کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ وعدہ کیا کہ خود تو عیسائی رہیں گے لیکن اپنے بچوں کو بپتسمہ نہ دیں گے یعنی عیسائی نہ بنائیں گے۔ الوثائق السیاسیہ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدہ کی تدوین کے سلسلے میں پتا چلا کہ یہ اصل میں "لا تقربوا الصلاۃ" کا سا واقعہ ہے۔ مکمل معاہدے سے (طبری خراج ابی یوسف سے) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نومسلم تغلبیوں کی اولاد کے متعلق پادریوں کے اختیار سماعت اور عمل دخل کو روکنا مقصود تھا۔ ورنہ عیسائیوں کو یہ حکم دینا کہ اپنی اولاد کو عیسائی نہ بنائیں لا اکراہ فی الدین کے قرآنی احکام کے مغائر ہو جائے گا۔

ہارون الرشید کے زمانے میں خاندانی ناموں کا رواج نہیں ہوا تھا۔ اور مامون

الرشید اور امین الرشید کا کوئی تاریخی وجود نہیں۔عبداللہ المامون اور محمد الامین صحیح نام ہیں۔امین و مامون زیادہ سے زیادہ لقب ہو سکتے ہیں۔ان میں الرشید کے لفظ کا اضافہ ٹھیک نہیں۔

طبع اول میں کتاب اچھی چھپی ہے لیکن مؤلف کو بروقت پڑھنے کا غالبًا موقع نہیں ملا۔ص......سطر نمبر ا میں کارہ کا لفظ ہے یعنی کراہت کرنے والا۔پروف خواں نے اسے نہ سمجھا اور ''نا کارہ'' بنا کر اپنے نا کافی علم کا ثبوت درج کتاب کر دیا۔

ص......سطر......میں آزمائشوں کی بھٹیوں سے ''کھرا'' ہو کر تو کوئی نکل سکتا ہے ''کھڑا'' ہو کر نہیں جیسا کہ چھپا ہے۔کم یا زیادہ اہم ایسی کچھ اور بھی طباعتی غلطیاں رہ گئی ہیں۔یہ قابل معافی سمجھی جا سکتی ہیں لیکن کاش ناشر کتاب میں ایک اشاریہ لگوا دیں جس کا شاید اب بھی وقت ہے موجودہ فہرست مضامین تک محض نا کافی ہے۔طبع ثانی میں تو اس کی تیاری آسان ہے۔

تمنا و دعا:

مولانا کی اور تالیفوں کا کتاب میں مژدہ ہے مثلاً تدوین فقہ کی تاریخ وغیرہ۔دعا ہے کہ مولانا کا سایہ علم کے سر پر تا دیر صحت و عافیت کے ساتھ باقی رہے۔کہ ان زیر تالیف کتابوں سے دنیا محروم نہ رہ جائے۔براعظم ہند میں اسلامیات کے احیاء میں مولانا نے جو حصہ لیا ہے وہ کفر و جہالت کے منطقہ حارہ میں ٹھنڈی ہواؤں کے مصداق ہے۔جزاہ اللہ عنا احسن الجزاء۔

(امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی۔سید مناظر احسن گیلانی
نفیس اکیڈمی کراچی۔۱۹۵۷ء)

Marfat.com

کتاب النبات دینوری

کچھ عرصہ ہوا [1] معارف میں اس موضوع پر چند باتیں عرض کی گئی تھیں اور مدینہ منورہ کے ایک مخطوطے کا ذکر کیا گیا تھا جو دینوری کی کتاب النبات کے تین بابوں پر مشتمل ہے۔ آج ایک مزید ٹکڑے کی دستیابی کی خوشخبری دینی ہے۔

بمبئی کے مرحوم دولسانی رسالۂ العروۃ کے شمارۂ دوم میں ترمذی صاحب نے بھی اس کا ذکر کیا ہے معلوم نہیں اُن کے معلومات کا ماخذ کیا تھا لیکن وہ زائد چیز نہیں بلکہ مدینہ منورہ کے مذکورہ صدر مخطوطے ہی سے متعلق ہے۔ میں نے ۱۳۶۶ھ کے آغاز میں اس کی نقل لی تھی، ترمذی صاحب اور اُن کے ممدوح کو نہ معلوم اس کا پتا کب چلا۔ البتہ ترمذی صاحب کی یہ اطلاع اُردو دان طبع کے لیے شائع کرنی ہے کہ مصر کے ممتاز عالم نباتات ڈاکٹر احمد عیسیٰ بک نے دینوری کے اقتباسات کو مختلف کتب لغت وغیرہ سے اکٹھا کیے ہیں اور ان کو شائع کرنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ شائع ہو گئے تو انہی کو اولیت حاصل ہوگی باقی اکٹھا کرنے کی حد تک اس سے پہلے بھی متعدد اصحاب نے یہ کوشش کی۔ اس مقالہ کے پہلے نمبر میں زلبربرگ کا ذکر ہے جس نے اب سے کوئی چالیس اکتالیس برس پہلے کوشش کی تھی۔ راقم الحروف نے بھی کئی سو صفحوں میں ایسا ہی مواد جمع کیا ہے لیکن ناتمام ہونے کے باعث اشاعت کی جانب توجہ نہیں کی جا سکی اس کے لیے ہزاروں مطبوعہ اوراق کی دیدہ ریزی سے چھان بین کرنے کے علاوہ مخطوطات سے بھی مواد لینا ہے جن میں سے بعض نہایت نادر ہیں مثلاً ابن تمجون کی جامع الادویۃ المفردۃ یا ابن سیدۃ کی المحکم وغیرہ۔

مجھے آکسفرڈ میں چند ماہ ہوئے اپنے ایک سابق جرمن استاذ کی زبانی معلوم ہوا

---

[1] دسمبر ۱۹۴۹ء

Marfat.com

کہ استانبول میں ایک کامل نسخے کا پتا چلا ہے۔ اس کے متعلق جرمن انجمن مستشرقین شاخ استانبول کے ناظم ڈاکٹر بلموت سے معلومات حاصل ہو سکتے تھے لیکن وہ اب استانبول چھوڑ کر وطن کی خدمت کے جذبہ سے فرانکفورت کنار مائین کی جامعہ میں شعبۂ مشرقیات کے صدر بن کر چلے گئے ہیں انہیں وہیں خط لکھا کچھ عرصہ کے بعد جواب ملا کہ افواہ صحیح ہے لیکن مخطوطہ کامل نہیں بلکہ اصل کا ایک ٹکڑا ہے اور اس پر سویڈن کے ایک مستشرق کام کر رہے ہیں۔

پھر آخر الذکر کو خط لکھا۔ آج کی صحبت میں ماخذ اطلاعات ان ہی کا خط ہے۔ ڈاکٹر برنارٹ لیوین جامعہ اپسالا کے کتب خانہ میں کسی عہدے پر مامور ہیں اور آج کل ابن المعتز کے کلام کی اشاعت میں مصروف ہیں۔ وہ ۷ فروری ۱۹۵۰ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

> ''یہ واقعی ایک حیرت انگیز اتفاق ہے کہ اس قیمتی کتاب (کتاب النبات الدینوری) کے مختلف ٹکڑے تقریباً ایک ہی وقت میں دستیاب ہوئے اور اہلِ علم کے ہاتھوں میں پہنچے ہیں جن میں ایک آپ ہیں اور ایک اس دور دراز سویڈن میں۔''

ڈاکٹر لیوین نے ازراہ عنایت اپنے نسخے کے چند اوراق کا فوٹو بھی خط میں منسلک کیا ہے۔ اب تجویز یہ ہے کہ نئے ٹکڑے پر دونوں کام کریں اور دونوں ٹکڑے ایک ساتھ شائع ہوں۔ اگر کوئی خلافِ توقع حادثہ نہ بھی پیش آئے، تو بھی اس کام میں کچھ عرصہ لگے گا، اس لیے اہل علم کی آگاہی کے لیے فی الحال چند معلومات عرض کیے جاتے ہیں۔

نیا مخطوطہ ایک ضخیم جلد پر مشتمل ہے جس میں (۲۳۴) ورق یا (۴۶۸) صفحات ہیں خط نہایت نفیس اعراب لگا اور جلی ہے، جن چند صفحوں کا فوٹو آیا ہے اس میں کہیں تاریخ نہیں ہے لیکن اندازاً سات آٹھ سو برس پہلے کا نسخہ معلوم ہوتا ہے۔

یہ ٹکڑا کتاب کے جزء خامس پر مشتمل ہے ابتدائی پندرہ ورق غائب بیان کیے جاتے ہیں ورق ۱۶ سے جو متن شروع ہوتا ہے وہ ڈاکٹر لیوین کے الفاظ میں یوں ہے:

Marfat.com

ورق ۱۶ تا ۲۶ ب	ومن الخاء صنعة القسی	(کمان سازی کی قسمیں)
ورق ۲۷ ب تا ۳۵ ب	من صفات النبل	(تیروں کی صفتیں)
ورق ۳۶ تا ۳۸ ب	حمافی القدح	(تیروں کی لکڑی کا حصہ)
ورق ۳۸ ب تا ۵۳	مما یحمل علی القدح	(تیروں میں لکڑی کے حصہ پر چڑھائی جانے والی چیز۔)
ورق ۵۳ تا ۷۱	من اسماء السّہام	(تیروں کے لیے عربی مترادفات)

اس کے بعد مخطوطے میں ایک اچنبھا ہے۔ ڈاکٹر لیوین کے الفاظ میں:

''ورق ۷۱ تا ۲۳۴ میں نباتی نام حروف تہجی پر مرتب ہیں اور اراک سے رُنگ یہی ترتیب ہے۔ اندازہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب النبات دو بڑے حصوں پر مشتمل رہی ہے۔ پہلے حصہ میں مستقل مقالے تھے جو ایک خاص نظام کے تحت مرتب کیے گئے تھے اور دوسرے حصہ میں ایک قاموس تھی۔''

اس تفصیل سے متعدد اہم مسائل حل ہوتے ہیں اگرچہ اپسالا کا نسخہ بھی اپنی جگہ کامل نہیں ہے لیکن خوش قسمتی سے یہ وہ ٹکڑا ہے جہاں کتاب کی ایک اہم خصوصیت یعنی اس کی تقسیم نمایاں ہے۔ اسی طرح اب یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ابن سمجون، الغافقی اور ابن البیطار کی جڑی بوٹیوں میں حروف تہجی کی ترتیب اُن کی جدت نہ تھی بلکہ دینوری ہی کی نقالی اور خوشہ چینی تھی۔ میں اپنے مقالے کی پہلی قسط میں عرض کر چکا ہوں کہ ابن سمجون اور ابن البیطار وغیرہ نباتات پر اپنے پیشرووں کے بیانات جمع تو کرتے ہیں لیکن آغاز عموماً دینوری کے بیان سے کرتے ہیں اور ابن البیطار کے ہاں بعض وقت یہ فقرہ ملتا ہے: قال الغافقی قال ابو حنیفه الدینوری اس کی توجیہ اب یہ کرنی پڑتی ہے کہ ابن بیطار نے دینوری کے اس بیان کو جو حروف تہجی کی ترتیب پر نہیں بلکہ مستقل مقالات کی صورت میں ہے اور جس کی تلاش آسان نہیں ہے کبھی اپنی یادداشت کی مدد سے اور کبھی

Marfat.com

غافقی کے آسان ذریعہ سے کتاب المفردات میں نقل کیا ہو گا۔ کتاب النبات کا نو دستیاب شدہ ٹکڑا اگر پوری طرح سامنے آ جائے خاص کر اس کا حصہ دوم اور اس کا ابن البیطار وغیرہ سے مقابلہ کیا جائے تو اس پہلو پر زیادہ بہتر رائے قائم کی جا سکے گی۔

میں نے مقالۂ گذشتہ میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ کتاب النبات للدینوری کے کون کون سے اقتباس مخصص ابن سیدہ کی کس کس جلد میں ہیں۔ ڈاکٹر لیوین کے بیان کی روشنی میں مخصص کی ورق گردانی سے معلوم ہوا کہ متعلقہ ابواب اس کی چھٹی جلد میں ہیں چنانچہ ص ۳۹ پر بعینہ ہمارے عنوان کا باب ومن انحاء صنعة القسی ہے دوسرا، تیسرا اور چوتھا باب تو مخطوطہ اُپسالا کے الفاظ میں نہیں ہے لیکن باب السہام متعدد فصلوں کے ساتھ موجود ہے۔ ہمارا پانچواں باب من اسماء السہام ممکن ہے وہی ہو جس کو ابن سیدہ نے ص ۵۱ پر اسماء ضروب السہام وصفا تہا کے عنوان سے لکھا ہے۔ ہمارے سامنے مخطوطہ اُپسالا کے پہلے باب کا پہلا ورق ہے ابن سیدہ کے ص ۳۹ سے اس کا مقابلہ کرنے پر نظر آیا کہ مخطوطہ مدینہ منورہ کی طرح اس حصہ میں بھی ابن سیدہ نے بہت ہی کم حصہ نقل کیا ہے اور دینوری کے بے شمار بیانات حذف کر دیے ہیں جو اس لیے ناگزیر تھا کہ ابن سیدہ کا موضوع ومقصد جدا تھا۔

بہرحال اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ مخطوطے اور نئے مخطوطے کا کوئی حصہ مشترک نہیں ہے اور دونوں مل کر کتاب کے معتدبہ حصہ پر مشتمل ہو جاتے ہیں بعض پرانے مؤلفوں نے کتاب النبات للدینوری کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہ ''ست مجلدات کبار'' میں تھی۔ ڈاکٹر لیون کے بیان کے مطابق اُن کا مخطوطہ الجزء الخامس پر مشتمل ہے اگرچہ جزء اور مجلد ایک ہی چیز نہیں ہیں لیکن موجودہ دونوں مخطوطے مل کر ڈیڑھ جلد نہیں تو ڈیڑھ جزء ضرور بن جاتے ہیں۔ گو یہ معلوم نہیں کہ اصل میں کتنے جزء تھے پانچ تھے یا کم یا زیادہ۔

(معارف اعظم گڑھ۔ جون ۱۹۵۰ء)

القاضی الرشید

مؤلف کتاب الذخائر والتحف

تین سال کا عرصہ ہوا، معارف میں عنوانِ بالا پر متعدد اہل علم نے دادِ تحقیق دی تھی، اسکے بعد سے میرے پاس کچھ نیا مواد جمع ہوا ہے۔ معارف کے علم پرور صفات سے توقع ہے کہ یہ معلومات بھی اہلِ نظر تک پہنچائی جائیں گی تاکہ جو لوگ اس سے استنباط کر سکتے ہیں وہ اسے جان لیں۔

البتہ ان ناظرین کے لیے جو پہلی دفعہ اس بحث سے دوچار ہوں گے دو چار تمہیدی باتیں عرض کی جائیں تو تکرار بے محل غالبًا نہ ہوگی۔ قصہ یہ ہے کہ ترکی کے شہر افیون قرہ حصار کے کتب خانے میں ایک نایاب مخطوطہ ''کتاب الذخائر والتحف'' ہے۔ کتاب میں اس کے مولف کا ذکر نہیں۔ ناچیز نے اسے طباعت کے لیے مرتب کیا، اور کویت کی حکومت نے ۱۹۵۹ء میں اسے شائع کیا۔ اس سے بہت پہلے ۱۹۵۳ء میں اس کا ایک اقتباس بر تا'' ملکۂ روما کا خط المکتفی باللہ خلیفۂ بغداد کے نام'' کے عنوان سے کراچی کے انگریزی رسالے ''جرنل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی'' میں شائع کرتے ہوئے میں نے اس مجہول الحال کتاب کو الاوحدی کی طرف منسوب کیا تھا کیونکہ کتاب میں اس کا کچھ مبہم سا ذکر ہے۔ (اس مضمون کے اطالوی اور فرانسیسی ترجمے بھی چھپے اور اس پر علمی حلقوں میں کافی بحثیں بھی ہوئیں، پھر جب ۱۹۵۹ء میں کتاب کے چھپنے کی نوبت آئی تو میں نے اسے بعض حوالوں کی بنا پر القاضی الرشید بن الزبیر کی طرف

Marfat.com

منسوب کرنے کی جسارت کی اور لکھا کہ یہ فاطمی دور کا ایک مؤلف ہے جو ۴۶۳ھ تک زندہ تھا، معارف میں ایک اہل علم نے اس پر تنقید کی اور ضمناً اسے ۵۶۳ھ میں فوت ہونے والے ایک مؤلف کی طرف منسوب کیا۔

میں اس مضمون میں نہ افراد کی بحث میں پڑونگا نہ انفرادی آرا کی تدقیق کی ناخوشگوار خامہ فرسائی میں، صرف تالیف اور مولف کا ایک عام اور ممکنہ حد تک جامع تبصرہ مقصود ہے۔

کتاب کے مندرجات:

کتاب کا پورا نام ہے ''کتاب الذخائر والتحف وما کان بالقصر من ذالک''۔ اس کے دیباچے میں مولف نے بیان کیا ہے کہ اس میں قیمتی تحفوں اور ہدیوں کا، شادیوں، دعوتوں، ختنہ کی رسموں اور بچوں کے ختم قرآن کی تقریبوں کے مصارف کا، یادگار زمانہ دنوں کا، عجائب وغرائب کے ذخیروں کا، دولتمندوں کی وفات کے بعد ان کے یہاں سے برآمد ہونے والے خزانوں کا، غنیمت اور فتوحات میں حاصل ہونے والی قیمتی چیزوں کا اور (فاطمی) امام المستنصر باللہ کے محل سے ۴۶۰ھ اور ۴۶۱ھ کے ہنگاموں کے موقع پر لٹے ہوے نوادرات کا ذکر ہے۔

گر یہی ہوتا تو بھی بڑا دلچسپ مواد تھا، لیکن کتاب اس سے بھی کہیں زیادہ پُر از معلومات ہے، اس میں نہ صرف ترکستان، ایران وغیرہ اسلامی ممالک کے غیر معروف لیکن اہم واقعات کا ذکر ہے، بلکہ چین اور یورپ کے اہم واقعات کا بھی ذکر ہے، یورپ کے (۲۶) واقعات اس کتاب میں ہیں، جن میں گیارہویں صدی عیسوی کے یورپ کی معاشی، صنعتی اور سماجی تاریخ کے متعدد ایسے پہلوؤں کا بیان ہے جن سے خود یورپ کی تاریخیں خالی ہیں، اور یہ خلا اس کتاب سے پُر ہوتا ہے، بلاط الشہداء کے عبدالرحمٰن الغافقی کے بورڈو فتح کرنے کا بھی اس میں ذکر ہے، فرانس، اٹلی، صقلیہ اور اسپین کے بھی ایسے حالات ہیں جو کسی اور ماخذ میں نہیں ملتے، اور یہ سب سرکاری دستاویزوں پر مبنی ہے۔

Marfat.com

مؤلف کا نام:

کتاب کے مولف کا کہیں ذکر نہیں، سرورق پر ایک جدید الخط حوالے میں، بہ ظاہر کتب خانہ افیون قرۃ حصار کے فہرست نگار نے اسے شیخ شہاب الدین احمد بن عبداللہ بن حسن الاوحدی المقرئی الشافعی کیطرف منسوب کیا ہے، وہیں ایک پرانے سے خط میں ہے کہ یہ مولیٰ ابراہیم بن محمد بن آیدمیر العلائی المعروف بابن دُقماق کا نقل کردہ نسخہ ہے، (اوحدی کی وفات ۸۱۱ھ میں اور ابن دقماق کی ۸۰۹ھ میں ہوئی)۔

مگر یہ پیچیدگی کتاب کے آخر کی ایک تحریر سے شروع ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ ''کتاب الہدایا والتحف کا جو حصہ دستیاب ہوا، یہ اس کا انتخاب ہے'' سرورق پر ذخائر وتحف نام تھا، اس تحریر میں اس کو ہدایا وتحف کر دیا گیا ہے۔

اس خاتمۂ کلام کے بعد ایک ضمیمہ ہے، اس میں تحریر ہے کہ کتاب الہدایا والتحف کے دستیاب شدہ حصے پر یہ اضافہ ہمارے صاحب (یعنی رفیق) امیر کبیر شہاب الدین احمد بن عبداللہ ابن الحسن الاوحدی المقرئی الشافعی کے انتخاب کردہ معلومات کے ذریعے سے کیا گیا ہے۔ دو صفحوں کے بعد ''انتہیٰ'' پر اس کو ختم کیا گیا ہے، اس کے علاوہ کوئی حوالہ یا تفصیل نہیں ہے، اگر یہ ضمیمہ اوحدی کا ہے تو پھر اصل کتاب کس کی ہے؟

چونکہ کتاب میں فاطمی خلفاء کے زمانے کے بھی حالات ہیں، اس لیے میں نے مقریزی کی خطط مصر کی طرف رجوع کیا، کیونکہ ''الضوء اللامع'' میں سخاوی نے اوحدی کے حالات میں لکھا ہے کہ اوحدی نے خطط مصر پر بڑی محنت سے ایک کتاب لکھی تھی، اور صرف ایک حصے کا مبیضہ کیا تھا کہ اس کی وفات ہوگئی، اور مقریزی نے اسی کو اپنی طرف منسوب کر لیا، اوحدی فوجی وردی میں رہتے تھے اور بہ حالت افلاس ۱۹ر جمادی الاولیٰ ۸۱۱ھ میں وفات پائی، مقریزی نے اپنی کتاب العقود میں سوانح عمریوں کے ذیل میں ان کا کارآمد ذکر کیا ہے (مقریزی کی درر العقود الفریدہ فی تراجم الاعیان المفیدہ اب ناپید ہے، اس کا صرف ایک ٹکڑا مشرقی جرمنی کے شہر گوتا میں ہے، اگرچہ میں نے اسے دیکھا نہیں لیکن میرے علم میں وہ اوحدی سے متعلقہ نسخے سے خالی ہے)۔

Marfat.com

بہرحال خطط مقریزی (طبع بولاق) میں تلاش سے ہماری پیش نظر کتاب کے کوئی دس بارہ اقتباس ملے (دیکھو جلد اول صفحات ۴۰۸، ۴۱۳، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۹۲) یہ عبارتیں ''کتاب الذخائر'' کے حوالے سے نقل کی گئی ہیں (جو ہماری کتاب کا بھی نام ہے) لیکن مولف کے نام کا کہیں حوالہ نہیں ہے (ص ۴۲۴) پر ایک اور اقتباس ہماری کتاب کا ہے، لیکن مقریزی نے اس میں ماخذ کا بھی ذکر نہیں کیا ہے، البتہ اس قصہ کا تکملہ (جو ہماری کتاب میں نہیں ہے) القاضی المہذب کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

مقریزی پر روسی، جرمن، اطالوی، فرانسیسی، انگریزی وغیرہ میں کافی چیزیں لکھی گئی ہیں اور اس کی کوشش کی گئی ہے کہ مقریزی کے ماخذ معلومات کا پتا چلایا جائے، اس سلسلہ میں لندن کے رسالہ ''JRAS ۱۹۰۲ء صفحہ (۱۰۳ تا ۱۲۳) میں ایک مضمون ہے' [خطط مقریزی میں مذکورہ مولفوں اور تالیفوں کا ذکر''۔ اس میں مضمون نگار گیسٹ (GUEST) نے لکھا ہے ''الذخائر والتحف کے مؤلف کا نام معلوم نہیں، ممکن ہے کہ یہ مجلی بن جمیع کی ذخائر ہو''۔ اگر مضمون نگار صاحب ذرا تحقیق کر لیتے تو کشف الظنون ہی سے معلوم ہو جاتا کہ مجلی بن جمیع کی کتاب الذخائر فقہ شافعی کی کتاب ہے، اس کو تاریخ سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

اوپر میں نے ملکہ برتا کے جس قصے کا ذکر کیا ہے، اس کا مختصر ذکر ابن ندیم نے بھی کیا ہے اور اس کی اساس پر روسی مولف بارتولد نے چیکوسلواکیا کے ایک رسالے میں ایک مضمون لکھا ہے۔ میں نے اسے پڑھا، لیکن اس میں ظاہر ہے کہ مقریزی کے ماخذ پر بحث نہیں ہے، پھر ایک اور روسی مولف انوسترانسیف (INOSTRANCEV) نے روما کے رسالہ BSO ۱۹۱۱ء میں فرانسیسی زبان میں ایک مضمون اسی ملکہ برتا پر لکھا ہے، اور العزلی کی مطالع البدور میں بھی اس قصے کے وجود کا ذکر ہے، جب میں نے اس کتاب کا تفصیلی مطالعہ کیا تو اس میں بھی ہماری کتاب کے ایک دو نہیں بیس تیس مقاموں پر اقتباس نظر آئے اور آٹھ مقاموں پر تو ان کے ماخذ کا ذکر بھی ملا (دیکھو مطالع البدور، جلد اول صفحہ ۵۸، ۶۱، ۱۳۸، ۲۳۳، نیز جلد دوم ص ۴۰، ۶۵، ۱۶۲، ۱۸۹)۔ ان میں سب سے پہلے اقتباس میں ہے: ''دسواں باب مسند، تکیے اور فرش'' القاضی الرشید ابو

Marfat.com

الحسین احمد بن القاضی الرشید بن الزبیر نے اپنی کتاب العجائب والطرف والہدایا والتحف میں بیان کیا ہے کہ ....'' دوسرے حوالوں میں بھی مولف یا عنوان کتاب کا مختصر ذکر ہے۔

اسی کی اساس پر میں نے کتاب الذخائر والتحف کو شائع کرتے وقت اسے القاضی الرشید ابن الزبیر کی طرف منسوب کرنے کی جرأت کی اور چونکہ کتاب میں مولف نے ۴۴۴ تا ۴۶۳ھ تک چشم دید حالات لکھے ہیں، اس لیے میں نے قیاس کیا کہ مؤلف کی وفات ۴۶۳ھ کے بعد ہونی چاہیے، وہ حوالے یہ ہیں:

(۱) بادشاہ میخائیل نے اس سفیر کے ہاتھوں ۴۴۴ھ میں[۱] ...... بہت قیمتی تحفے بھیجے جن کا میں نے خود تنیس میں مشاہدہ کیا، ''شاہدت'' (دیکھو کتاب الذخائر ص ۸۵) [مشاہدہ یقیناً سوا سو سال بعد نہیں ہو سکتا، سفیر کی آمد کے لگ بھگ زمانے ہی میں ہونا چاہیے]۔

(۲) خطیر الملک نے مجھے اطلاع دی (اخبرنی جبکہ وہ شام سے ذیقعدہ ۴۶۲ھ میں تنیس آیا) کہ اندلس کے حکمراں اقبال الدولہ علی بن مجاہد نے المستنصر باللہ (فاطمی) کو ایک تحفہ بھیجا۔ (کتاب الذخائر ص ۹۶)، یہ اطلاع ۴۶۲ھ کی ہے اور اقبال الدولہ اور مستنصر باللہ کا زمانہ بھی یہی ہے، ۵۶۳ھ میں یہ لوگ زندہ نہ تھے۔

(۳) امیر ناصر الدولہ ابو علی الحسن بن حمدان نے ۴۶۳ھ میں بیزنطینی حکمراں رومانوس دو یوجینس کو ایک تحفہ بھیجا ... (دیکھو کتاب الذخائر ص ۱۰۵) اور ابو الفضل ابراہیم بن علی الکلفرتابی نے مجھ سے بیان کیا (حدثنی)، جبکہ وہ ۴۶۳ھ میں قسطنطنیہ سے دمیاط آیا تھا کہ اس نے رومانوس دیوجینس کو دیکھا

---

[۱] اس حوالے میں کوئی سہو ہے کیونکہ پانچواں میخائیل ۱۰۴۲ء میں مر چکا تھا اور چھٹا میخائیل ۱۰۵۶ء سے قبل تخت نشین نہیں ہوا، زیر بحث ۴۴۴ھ (مطابق ۱۰۵۲ء تا ۱۰۵۳ء) میں نواں قسطنطین بیزنطینی حکمران تھا اس لیے یہاں یا تو بادشاہ کے نام میں مولف سے غلطی ہوئی ہے، یا تاریخ میں۔

Marfat.com

کہ...... (کتاب الذخائر ص ۲۶۳) اس حکمران کا یہی زمانہ ہے اس کے سو سال بعد کا نہیں۔

(۴) ایک شخص نے جو جھنڈوں اور بیرقوں سے خوب واقف ہے، مجھے بتایا (اعلمنی) کہ جھنڈوں کے سرکاری ذخیرے میں ......سپہ سالار جوہر کی آمد مصر اور ۳۵۸ھ میں (فاطمی) قصر شاہی کی تعمیر کے بعد سے ابتک (الیٰ ہذا الوقت)، جبکہ ایک سو سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے......(کتاب الذخائر ص ۲۷۵)۔ ۳۵۸ھ کے بعد سے "زائد از صد سال" کے معنی ۴۵۸ھ سے کچھ ہی بعد مثلاً ۴۶۳ھ ہوسکتا ہے، ۵۶۳ھ نہیں۔

ان اقتباسوں سے واضح ہوتا ہے کہ بیان کنندہ راوی یعنی مولف کتاب ۴۴۴ھ اور ۴۶۳ھ کے درمیان دربار فاطمی کے صیغۂ استقبال سفراء میں مامور تھا۔

ایک اور اندرونی شہادت کتاب کے ص ۸۷ میں ہے، جہاں ایک بے حقیقت اور تقریباً گمنام حکمراں کا بڑے طنطنہ خیز القاب کے ساتھ اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

"الملك المعظم شاهنشاه سلطان دين الله ومِلك عبادالله وعضد خليفة الله أبو كاليجار بن سلطان الدولة بن بهاء الدولة بن عضد الدولة بن ركن الدولة بن بويه ......"

مؤلف کا مذہب:

یہ ابوکالیجار تاریخ ابن اثیر، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام وغیرہ کے مطابق بغداد میں امیر الامراء رہا ہے (اور غالباً اسی لیے ہمارے مولف کو، جو اس کی پیشی میں ملازم ہوگا سرکاری محافظ خانے میں ملکہ برتا وغیرہ کے اصل خطوط کے دیکھنے کا موقع ملا ہوگا) ابو کالیجار اور طغرل بیگ سلجوقی میں لڑائیاں رہیں، ابو کالیجار نے اصفہان اور کرمان فتح کرلیا، لیکن ایک وبا میں اسکے بارہ ہزار گھوڑے ہلاک ہوگئے، اس لیے اس نے طغرل بیگ سے صلح کرلی، اور طغرل نے ابوکالیجار کی بیٹی سے، اور ابو کالیجار کے بیٹے نے طغرل کی بھتیجی سے نکاح کر کے آپس میں رشتہ بھی کرلیا، ۴۴۰ھ میں کرمان کے مقام

Marfat.com

جناب میں ابو کالیجار کا انتقال ہو گیا۔

ابو کالیجار کی وفات کے بعد طغرل کا کوئی حریف نہ رہا اور اس کا اثر سارے ایران، عراق وغیرہ میں پھیل گیا، ان حالات میں ابو کالیجار کے کارندوں، خاص کر شیعہ کارندوں کا سنی سلجوقیوں کے ہاں ترقی یا رسوخ کا کیا امکان ہے، ابو کالیجار شیعہ تھا، اس لیے القاضی الرشید کو بھی اصولاً شیعہ ہونا چاہیے، اور تاریخی مواد بھی یہی ثابت کرتا ہے، (جیسا کہ ابھی بیان ہوگا) اس لیے اگر القاضی الرشید نے سلجوقی علاقے کو خیر باد کہہ کر مصر یعنی فاطمی شیعوں کے ہاں قسمت آزمائی کی کوشش کی تو حیرت کی بات نہ ہونی چاہیے۔

''اعیان الشیعہ'' ایک مشہور کتاب ہے، اس کی جلد نہم صفحہ ۸۴ تا ۹۷ میں سوانح نمبر (۱۳۸۶) پر القاضی الرشید کے حالات تفصیل سے ہیں، اس میں لکھا ہے کہ ''نسمۃ السحر نامی کتاب کے بیان کے مطابق القاضی الرشید ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے شیعیت قبول کی، اور وہ اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔''

محمد علی تبریزی نے اپنی ریحانۃ الادب (جلد پنجم صفحہ ۳۵۵ تا ۳۵۶، نمبر ۷۳۰) میں لکھا ہے: ''یہ ظاہر ہے کہ وہ شیعہ تھا اور شیخ محمد محسن طہرانی کی'' الذریعہ الیٰ تصانیف الشیعہ'' اور کتاب اعیان الشیعہ میں اس کی تصریح موجود ہے۔

ایک دوسری لیکن عالمانہ بحث میں جامعۂ ڈھاکہ کے پروفیسر مفیض اللہ کبیر نے کلکتے کے انگریزی رسالے ''انڈو ایرانیکا'' میں ۱۹۵۸ء سے بویہی خانوادے پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا، اس کی ۱۹۵۹ء کی جلد میں صفحہ (۲۷) پر ایک اہم بیان ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:

> ''امیر الامراء بننے سے پہلے ابو کالیجار اسماعیلی فرقے کی دعوت سے متاثر ہو گیا تھا۔ یہ دعوت شیراز میں ایک اسماعیلی داعی دے رہا تھا جو اسماعیلیوں کے ہاں المؤید فی الدین الشیرازی کے نام سے مشہور ہے۔ جب ابو کالیجار بصرہ کی بغاوت فرو کر کے تقریباً

Marfat.com

۴۳۱ھ میں شیراز لوٹا تو المؤید نے اس سے خط و کتابت شروع کی اور اسے اسماعیلیت قبول کرنے کی دعوت دی، اور یہ بھی بتایا کہ ابو کالیجار کے سارے آباء و اجداد اسماعیلی ہی تھے، (جو ظاہر ہے کہ لغو بات ہے) دیکھو سیرۃ المؤید صفحہ ۱۳-۱۴)۔ رفتہ رفتہ ابو کالیجار بھی اس دعوت سے متاثر ہو گیا، جو نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس کی دیلمی فوج میں بھی پھیلائی جا رہی تھی، (دیکھو فارس نامہ ص ۱۱۹) لیکن جلد ہی مختلف وجوہ سے ابو کالیجار کو اس داعی سے قطع تعلق کر لینا پڑا کیونکہ نہ صرف اس کے چند درباریوں نے جس میں شیراز کا قاضی القضاۃ بھی شامل تھا، اسے یقین دلایا کہ یہ داعی اس کی فوج کو بغاوت پر اکسا رہا ہے، بلکہ خلیفہ القائم کو بھی جب داعی المؤید کی سرگرمیوں کی اطلاع ملی تو اس نے ابو کالیجار سے خواہش کی کہ اس داعی سے تعلقات منقطع کر لے، (سیرۃ المؤید صفحہ ۶۳-۶۴) اسی اثنا میں جلال الدولہ کا انتقال ہو گیا اور ابو کالیجار نے کوشش کی کہ جلال الدولہ کی جگہ خود اسے امیر الامرا بنایا جائے اور یہ ممکن نہ تھا کہ عباسی خلفاء کے حریف کے فرستادہ داعی سے تعلقات منقطع کیے بغیر اس کی خواہش پوری ہو سکے (دیکھو سیرۃ المؤید ص ۷۳-۷۴) اس لیے ابو کالیجار نے حکم دیا کہ اس داعی کو دریائے فرات کے پار ملک بدر کر دیا جائے اور داعی سے کہا کہ اگر وہ عباسی خلفاء کی سرزمین میں آیا تو اس کو موت کی سزا دی جائے گی۔ (المؤید نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اس ملک بدری کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ یہ لکھا ہے کہ ''ابو کالیجار نے مجھے ایک خط لکھا کہ مصر میں امام (فاطمی حکمراں) کے ہاں واپس چلا جاؤں، اور کسی دوسرے مناسب وقت پر دوبارہ آؤں (دیکھو سیرۃ المؤید ص ۷۳-۷۴) اسی کتاب میں (ص ۷۶ تا ۷۸) پر ایک اور

Marfat.com

خط ہے جو ابو کالیجار نے داعی کو اس کے مصر جاتے وقت بھیجا تھا، اگر المؤید کے بیان پر اعتماد کیا جائے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ ابو کالیجار دل سے اس داعی ہی کی طرف میلان رکھتا تھا، اگرچہ سیاسی وجوہ سے اس نے اسے رخصت ہونے کی خواہش کی تھی۔"

مؤلف کا عصر:

اوپر جن شیعہ سوانح عمریوں کا ذکر ہوا، ان میں اور ان کے علاوہ دوسری کتابوں میں بھی القاضی الرشید کے حالات ملتے ہیں اور یہ سب اس کی وفات ۵۶۲ھ یا ۵۶۳ھ میں، یعنی کتاب کی تالیف کے ایک سو سال بعد بیان کرتے ہیں، مثلاً:

یاقوت، معجم الادبا (یا ارشاد الاریب) جلد چہارم ص ۵۱ تا ۶۷

ابن خلکان، وفیات الاعیان، نمبر ۶۴

ابن العماد، شذرات الذہب، جلد چہارم صفحہ ۱۹۷، ایضاً خرید:

ج ۱ ص ۲۰۰ تا ۲۰۲

سیوطی، بغیۃ، صفحہ ۱۴۶، ایضاً حسن المحاضرہ جلد دوم ص ۱۲۳

خوانساری، روضات الجنات صفحہ ۷۶ تا ۷۷

یافعی، مراۃ الجنان جلد سوم ص ۳۶۷ تا ۳۶۹

جعفر الادفوی، الطالع السعید، نمبر ۵۲

الاسنوی. طبقات الشافعیہ، ورق ۶۳/الف

الذہبی، سیر النبلاء، ج ۱۲ صفحہ ۲۶۲

ابن سمرہ الجعدی[1]، طبقات فقہاء الیمن صفحہ ۱۳۰ (مخطوطہ) زمانۂ تالیف ۵۸۶ھ

ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، حالات ۵۶۳ھ

---

[1] یہ کتاب ۱۸۵۷ء میں مصر میں چھپی ہے۔ اڈیٹر نے حاشیے میں لکھا ہے کہ القاضی الرشید کے حالات بالخزمہ جلد دوم صفحہ ۴-۶ میں السلوک، ورق ۱۲۳ میں، اور الداعی ادریس کی عیون الاخبار جلد ہفتم ص ۲۰۳ میں بھی ہیں، دیکھو کتاب مذکور ص ۱۶۷

Marfat.com

ابن تغری بردی: النجوم الزاہرہ، بر موقع

ان میں سے متعدد حوالے میرے مکرم دوست بیروت کے پروفیسر صبحی الصالح نے مہیا کیے،، اور جو کتابیں مجھے پاریس میں نہ ملیں ان کی ضروری عبارتوں کی نقلیں بھی بھیجیں، جزاہ اللہ خیراً، مذکورہ حوالوں میں القاضی الرشید کے اشعار بھی ہیں، لیکن ان کو ہماری اس بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے ان کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں، بعض حوالے مولانا عبدالعزیز میمن نے بھی ازراہِ عنایت بھیجے، جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

میں ان میں سے صرف پہلے دو اقتباسوں کو یہاں درج کروں گا۔

(الف) یاقوت نے لکھا ہے: ''احمد بن علی بن ابراہیم بن الزبیر الغسانی الاسوانی المصری جس کا لقب الرشید، اور کنیت ابوالحسین ہے، ......اس کا صعید مصر کے ایک بڑے اور بہت مالدار گھرانے سے تعلق تھا، اسے اسکندریہ کی بندرگاہ اور دواوین سلطانیہ (سرکاری مرکزی دفتر) کا ناظم بنایا گیا، پھر اس کو ظالمانہ طور پر محرم ۵۶۲ھ میں قتل کیا گیا، اس کی تصانیف مصر سے باہر بھی مشہور ہیں۔ ان میں کتب ذیل بھی شامل ہیں:

۱۔ منية الالمعى وبلغة المدعى جس میں کئی علوم کا ذکر ہے۔

۲۔ كتاب المقامات

۳۔ كتاب جنان الجنان وروضة الاذهان چار جلدوں میں مصری شعرا کا تذکرہ

۴۔ كتاب الهدايا والطرف

۵۔ كتاب شفاء الغلة فى سمت القبلة

۶۔ رسائل جو تقریباً پچاس ورق میں ہیں

۷۔ دیوان تقریباً سو ورق میں۔

۱۔ لفظ مصر عربوں کی ایجاد نہیں ہے یہ بڑا پرانا لفظ ہے، چنانچہ توریت میں قبیلۂ مصرایم کا نام آیا ہے، ہندوؤں میں جو خاندان مسر اور مصر جی کہلاتے ہیں، ان کا بھی اس سے رشتہ جوڑا جاتا ہے۔

Marfat.com

وہ صعید مصر میں اسوان میں پیدا ہوا۔ پھر ترک وطن کر کے مصرا(قاہرہ) میں آباد ہو گیا۔ اور وہاں کے حکمرانوں سے توسل پیدا کیا، اور وزرا کی مدح میں قصیدے لکھے جنہوں نے ایسی ترقیاں عطا کیں، چنانچہ اسے ''رسالت'' (یعنی فاطمی دعوت) کے لیے یمن بھیجا گیا، جہاں بعد میں اس کو قاضی اور گورنر بھی بنایا گیا ''قاضی قضاۃ الیمن اور داعی دعاۃ الزمن'' کے لقب سے ملقب کیا گیا، رسوخ و اقتدار حاصل ہونے کے بعد اس کو خلیفہ بننے کی ہوس پیدا ہوئی، اور اس کوشش میں اس کو کامیابی ہوئی، لوگوں نے اس کو قبول کر لیا اور اس نے اپنے نام کے سکے ڈھالے جن کی ایک جانب ''الامام الامجد ابوالحسین احمد'' اور دوسری طرف ''قل ھواللہ احد اللہ الصمد'' درج تھا لیکن بعد میں اسے گرفتار کر کے قوس بھیج دیا گیا...... اس کے قتل کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ اسد الدین شیر کوہ کی طرف مائل ہو گیا تھا چنانچہ جب وہ اس ملک میں آیا تو القاضی الرشید نے اس سے خط و کتابت کی......'' اس اقتباس میں اس کی تالیف نمبر۴ کی طرف خاص کر اشارہ کرتا ہے۔

(ب) ابن خلکان نے اس گتھی کو سلجھانے کی کلید مہیا کی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ''القاضی الرشید ابوالحسین احمد بن القاضی الرشید، ابوالحسن علی بن القاضی الرشید، ابو اسحٰق ابراہیم بن محمد بن حسین بن الزبیر الغسانی الاسوانی، یہ اچھا عالم اور فرزانہ شخص تھا، بڑے عہدہ پر فائز تھا، اس نے کتاب الجنان و ریاض الاذہان تالیف کی جو مشاہیر علماء کی سوانح عمریوں پر مشتمل ہے۔ اس کی نظموں کا ایک دیوان بھی ہے، اس کے بھائی القاضی المہذب کا بھی ایک دیوان ہے، العماد نے السیل والذیل میں لکھا ہے کہ شاور نے اس کا شیر کوہ کی طرف میلان دیکھا تو ۵۶۳ھ میں اس کو ظالمانہ طور سے قتل کر دیا، اس کا رنگ کالا اور سینہ چوڑا تھا، ہمعصروں میں ہندسہ، ریاضی، علم الادیان، ادب اور شاعری میں اس کا کوئی حریف نہ تھا۔

لہٰذا ان تحریروں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس خاندان میں تین نسل تک مسلسل القاضی الرشید کا لقب جاری رہا، قاضی رشید اول کا پوتا باختلاف روایت ۵۶۱ھ یا ۵۶۲ھ یا ۵۶۳ھ میں فوت ہوا۔ ایسی حالت میں کیا یہ ممکن نہیں کہ ہماری کتاب کا مولف پوتا نہیں بلکہ دادا رہا ہو؟ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے فروری ۱۹۶۱ء کے

معارف میں جو تحقیق فرمائی ہے، اس سے اس خاندان کے متعلق کافی حالات معلوم ہوتے ہیں۔ وہ الادفوی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

(الف) ''نمبر ۵۲ احمد بن علی بن ابراہیم بن علی بن الزبیر ابوالحسن القرشی الاسدی الاسوانی المعروف بہ الرشید۔''

(ب) ''نمبر ۲۹۴ علی بن احمد بن علی الاسوانی، الرشید کا باپ، العماد الاصبہانی نے اسکا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ قاہرہ میں ۵۶۳ھ [؟ ۵۳۳ھ] میں فوت ہوا۔''

(ج) ''نمبر ۲۳ ابراہیم بن محمد بن الحسین بن محمد بن الزبیر الاسوانی القاضی، جو قوس اور اس کے نواحی کا ۴۷۲ھ میں قاضی تھا، یہ الرشید اور المہذب کا دادا ہے، جن دونوں کا باپ الزبیر تھا۔ النضر نے اس کا مرثیہ لکھا، اس کا کچھ اقتباس ہم آگے ابن النضر کے حالات کے سلسلے میں دیں گے۔''

شیعہ سنی میلانات اور ابن الوقت لوگوں کے طرزِ عمل پر اس کتاب کے ذیل کے بیانات سے کچھ روشنی پڑے گی:

''نمبر ۲۵۵ عبدالقادر بن مہذب بن جعفر الادفوی جو میرا چچازاد بھائی ہے...... اسمٰعیلی فرقے سے تعلقات رکھتا ہے اور النعمان بن محمد کی کتاب دعائم الاسلام کے مطالعے میں لگا ہوا ہے۔'' نمبر ۱۹ ابراہیم بن محمد بن احمد بن نصر المخاطب بہ فخر الدولہ جو الزبیر کے بیٹوں الرشید اور المہذب کا بھانجا تھا، یہ ادیب، شاعر اور انشاء پرداز تھا۔ سب سے پہلے اسی کو صلاح الدین ایوبی نے کاتب مقرر کیا۔ اس کے بعد صلاح الدین کے بھائی الملک العادل کا کاتب بنا، اس نے اپنے ماموں الرشید کے بعض اشعار کی روایت کی ہے۔''

اس بیان سے گمان ہوتا ہے کہ اس خاندان میں شیعہ سنی دونوں میلانات کے لوگ بیک وقت پائے جاتے تھے کیونکہ سلطان صلاح الدین کا کاتب سنی ہونا چاہیے،

ہمارا مولف ادفوی سنی ہے اور اس کا چچازاد بھائی اسماعیلی شیعہ۔ (ادفوی کی وفات ۷۴۸ھ میں ہوئی)۔

خلاصہ:

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ القاضی الرشید جو اولاً بویہی حکمراں ابوکالیجار کی پیشی میں تھا، ابوکالیجار کی وفات ۴۴۰ھ کے بعد جب بویہیوں کا سقوط ہوا تو وہ مصر چلا آیا، یہاں فاطمیوں نے اس کی قدردانی کی اور اس کو صعید مصر میں ایک جاگیر عطا کی، ۴۴۴ھ تا ۴۶۳ھ وہ دفتر خارجہ میں رہا، پھر ۴۷۲ھ میں قوس کا قاضی مقرر ہوا، اس کے بیٹے اور پوتے ہی نہیں پڑپوتے تک کے حالات ہمیں معلوم ہوتے ہیں کہ وہ سب مصر میں سرکاری ملازم اور خاصے ممتاز رہے۔ اس کا مفصل نسب اسی ادفوی نے یہ بیان کیا ہے ''نمبر ۵ ابراہیم بن احمد بن علی بن ابراہیم بن محمد بن الحسین بن محمد بن فلیۃ بن سعید بن ابراہیم بن حسین القرشی الاسدی ابو اسحاق بن ابو الحسین بن ابو اسحق الاسوانی الکاتب۔ یہ الرشید بن الزبیر کا بیٹا تھا...... میں نے اس کی تاریخ ولادت پوچھی تو ۵۶۱ھ معلوم ہوئی یہ سرکاری دفاتر میں کارگزار تھا۔''

میں ان بیانات سے فی الحال اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ:

(۱) کتاب الذخائر والتحف اپنی موجودہ شکل میں الاوحدی کی تالیف ہے جس نے القاضی الرشید کے مسودے کا جو حصہ بھی دستیاب ہوا اس کو صاف کر کے شائع کیا، اور مقریزی نے اپنی کتاب خطط میں اسی سے استفادہ کیا۔

(۲) لیکن اوحدی کا کام صرف مبیضہ کرنا تھا یا تلخیص و انتخاب، اصل کتاب کا نام الھدایا والطرف تھا، اور اوحدی کے اڈیشن کا نام الذخائر والتحف ہوا۔

(۳) کتاب کا نام چونکہ بہت لمبا تھا اس لیے بعد کے لوگوں نے اس کا طرح طرح کے ناموں میں اختصار کیا۔

(۴) چونکہ القاضی الرشید بن القاضی الرشید تین آدمیوں کا نام ہے،

اس لیے یاقوت کو سہو ہوا اور اس نے دادا کی کتاب کو اس کے مشہور پڑپوتے کی طرف منسوب کر دیا، یہ بھی ممکن ہے دادا کی تالیف کو پوتے نے اپنی طرف منسوب کر لیا ہو، اور بے خیالی میں ان عبارتوں کی اصلاح نہ کی ہو جہاں دادا نے سال اور تاریخ بیان کر کے ضمیر متکلم کے ساتھ کوئی روایت بیان کی ہے (بالکل اسی طرح جس طرح خلیفہ مامون نے بیت المقدس کے قبۃ الصخرہ میں عبدالملک بن مروان کا نام کتبے میں سے نکال کر اپنا نام تو داخل کرا دیا، لیکن سنہ تعمیر بدلنے کا خیال نہیں کیا، اس لیے اب یہ چوری پکڑ لی گئی۔)

(۵) دادا القاضی الرشید اگر پانچویں صدی کے آغاز مثلاً ۴۱۷ھ میں پیدا ہوا ہوتو ۴۷۴ھ تک اس کا برسرکار رہنا اور قوص میں قاضی کے فرائض انجام دینا اور ۴۴۴ھ سے ۴۶۳ھ تک وزارت خارجہ میں رہنا بالکل ممکن ہے۔

ممکن ہے آیندہ اہل علم کی کوشش سے مزید حالات معلوم ہو سکیں کہ فوق کل ذی علم علیم!

(معارف اعظم گڑھ۔ مئی ۱۹۶۴ء)

Marfat.com

تاریخ

Marfat.com

Marfat.com

علمِ تاریخ میں مسلمانوں کا حصہ

تاریخ بہت پرانا علم ہے۔ متمدن، غیر متمدن، ہر قوم میں، ہر زمانے میں اس کے آثار ملتے ہیں۔ تحریری کتابیں نہ بھی ہوں، تو زبان زد قصوں کی صورت میں پرانے بڑے لوگوں کے کارنامے نثر یا نظم میں ضرور ملتے ہیں۔ اس کی ابتدائی غرض کچھ تو اپنے مشاہیر کی بڑائی اور کچھ دل بہلائی، وقت گزاری کا سامان رہی، اور شاذونادر عبرت پذیری یا ہمت افزائی بھی۔ اس کے لیے نہ تو زمانے کے تعین کو کوئی اہمیت ہے، نہ مختلف ہیروؤں میں ترتیب کی خاص ضرورت۔ زیادہ تر لڑائی اور دلیری پر زور دیا جاتا ہے، پھر دولت اور تونگری پر۔ جن و عشق کی چاشنی بھی بہت قدیم سے ملتی ہے۔

جب تمدن ترقی کرتا ہے، حکمرانی کا علاقہ پھیلتا ہے۔ امن اور فراغبالی کی مدت کافی لمبی ہو جائے، تو ہیروؤں کی تعداد کا بڑھنا بھی ناگزیر ہے۔ خود پرستی کا نتیجہ سمجھنا چاہیے کہ حکومت کے ملازموں میں ایک مؤرخ بھی ہوا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ دربار میں حاضر رہتا تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ اپنے حکمران آقا کے کارناموں کو مدوّن کرتا رہے، اور تذکرے میں اس کی تعریف و توصیف بھی کرے۔

Marfat.com

اسلام کا آغاز ۶۱۰ء جیسے متاخر زمانے میں ہوا۔ انسانیت نے ہزاروں سال میں بتدریج جو علمی اور ذہنی ترقی کی تھی، اس نے اس سے استفادہ کیا اور اس پر کچھ نئی چیزوں کا اپنی طرف سے بھی اضافہ کیا۔ یہاں انہی کا مختصر ذکر مطلوب ہے۔

تاریخ:

تاریخ کا لفظ ہمارے ہاں عربی زبان سے آیا ہے۔ اس کا مادہ ''ارخ'' اور ''ورخ'' دونوں بیان ہوے ہیں۔ علم اشتقاق کے بعض قدیم مؤلفوں نے لکھا ہے کہ ''ارخ'' کے معنی حمیری (یعنی یمن کی پرانی عربی) زبان میں ''چاند'' کے ہیں۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ عبرانی میں بھی اس کے یہی معنی ہیں۔ بیسٹن بھی اس کی تائید کرتا ہے اور لکھتا ہے (۱) کہ ''سامی زبانوں میں ورخ کے معنی چاند کے ہیں۔'' اس طرح عربی فعل تاریخ (نیز توریخ) کے معنی ہوں گے: چاند بنانا، یعنی نئے چاند کی مدد سے مہینا شمار کرنا، یا وقت کا حساب کرنا۔ ابن عساکر کی یہ روایت بھی اہم (۲) ہے کہ ''ایک یمنی مسلمان نے حضرت عمر سے کہا: میں نے یمن میں ایک چیز دیکھی، جسے وہاں کے لوگ تاریخ کا نام دیتے ہیں اور یوں لکھتے ہیں کہ فلاں سال کے فلاں مہینے ہیں۔''

کہتے ہیں کہ وقت شماری کے لیے سات دن کا ایک ہفتہ اور بارہ مہینے کا ایک سال سب سے پہلے بابل والوں نے شروع کیا، دوسرے لوگوں نے یہ انہی سے سیکھا اور جاری رکھا۔ سورج کا ہر روز نکلنا اور ڈوبنا، اور چاند کا مہینے بھر تک بڑھ اور گھٹ کر پھر پرانی حالت میں آ جانا، ایسے مناظر فطرت تھے جن کا ہر شہری روزمرہ مشاہدہ کرتا تھا اور ان کے جاننے کے لیے سادہ لوح انسان کو بھی کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ لیکن بارہ چاندوں کے قمری سال کی موسموں سے مطابقت نہیں ہوتی۔ اسی لیے جب انسان نے زراعت کا پیشہ سیکھا، شمسی (سورج کے) سال کی بھی اہمیت پیدا ہوگئی اگرچہ اس کا طریقہ مختلف ملکوں میں مختلف رہا۔

---

(۱) A.F. Beeston, Epigraphic South Arabian Calendars and Dating (London 1956) P-3

(۲) تاریخ دمشق (نشرۂ منجد)، ۱: ۲۷؛ سخاوی، الاعلان بالتوبیخ: ۱۴۲

پرانے عرب میں شمسی سال:

اسلام سے پہلے عربوں میں اس کے دو طریقے رائج تھے، اور سال شماری دو مختلف طرح سے ہوتی تھی: ایک میں انواء کا (یعنی بارش کے ستاروں کا جن کو دکھنی اردو میں کارتی کہتے ہیں) لحاظ ہوتا تھا۔ ایسے اٹھائیس ستارے ہیں جن سے ہر ایک تقریباً تیرہ تیرہ دن کے وقفے سے نکلتا ہے (۴)۔ برسات، سردی، گرمی، بہار، خزاں مختلف موسموں کا ان سے پوری صحت کے ساتھ تعین ہوتا ہے۔

دوسرے طریقے میں محرم، صفر وغیرہ بارہ مہینے تھے۔ غروب آفتاب کے فوراً بعد نئے چاند کے افق مغرب میں نظر آنے سے نیا مہینا شروع ہوتا ہے۔ یہ نیا چاند جو افق پر تقریباً ۱۰ سے ۲۵ درجے کے زاویہ پر نکلتا ہے کبھی ۲۹ دن کے بعد اور کبھی ۳۰ دن کے بعد نظر آتا ہے۔ بعض اوقات پے در پے دو اور کبھی تین تین انتیسے مہینے ہوتے ہیں اور کبھی کبھی مسلسل دو یا مسلسل تین تیسے مہینے بھی؛ ورنہ عام طور پر ایک انتیسا دوسرا تیسا ہوتا ہے بحیثیت مجموعی ۳۵۴ دن چند گھنٹوں، منٹوں، سکنڈوں میں ایک قمری سال پورا ہوتا ہے۔ شمسی سال کو ۳۶۵ دن اور چند گھنٹے، منٹ، اور سکنڈ لگتے ہیں۔ اس طرح قمری سال، شمسی سال سے تقریباً گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے۔ اسی لیے جاہلیہ میں ہر تیسرے سال ایک تیرھویں قمری مہینے (یعنی ۲۹ یا ۳۰ دن) کا اضافہ کر دیتے تھے۔ لیکن تین سال میں ۳۳ دن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے چند سال تک ہر تیسرے برس جنتری میں ایک مہینے کا اضافہ کرنے کے بعد پھر ایک مرتبہ دو ہی سال بعد ایک مہینے کا اضافہ کر لیتے ہیں، جس کے بعد مکرر چند سال تک تین تین برس کے بعد تیرہ مہینوں والا سال بنایا جاتا۔ اسے قرآن میں نسی کا نام دیا گیا ہے۔

---

(۴) اسے اقوام متحدہ کی حالیہ تجویز سے مشابہت ہے کہ اٹھائیس دن کے ہر سال تیرہ مہینے ہوں (۲۸×۱۳=۳۶۴ دن) اور نو روز ایک گمنام ہوتا کہ مہینوں کی تاریخیں ہمیشہ معینہ دنوں میں آئیں۔ اگر اس پر عمل ہوا، تو اصلی جمعہ کا دن کبھی سنیچر، کبھی اتوار، کبھی پیر وغیرہ پڑے گا۔

Marfat.com

وقت شماری کے اسلامی احکام:

وقت شماری کا قرآن مجید میں کئی بار ذکر آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے عرب کس حد تک اس علم سے واقف تھے۔ چنانچہ:

(۱) "[اصحاب کہف] اپنے غار میں تین سو برس مقیم رہے اور نو (برس) کا اضافہ کیا" (۲۵:۱۸) یعنی تین سو خالص قمری سالوں میں کبیسہ گری کے لیے نو سال کا اضافہ کر کے تین سو شمسی سالوں سے تطابق پیدا کیا گیا۔ گویا ۳۰۹ شمسی سالوں کے برابر ہوے۔

(۲) "بیشک، مہینوں کی تعداد خدا کے ہاں، خدا کی تحریر میں، اس دن جب اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، بارہ مہینے تھی۔ ان میں سے چار حرام ہیں (ان میں لڑائی بھڑائی بند کرنی چاہیے)......نسی (کبیسہ گری) کفر میں زیادتی کے سوا کچھ نہیں۔ اس سے کافر ہی بھٹکتے ہیں: اس (مہینے) کو وہ ایک سال حلال قرار دیتے اور ایک سال حرام، تاکہ خدا کی طرف سے حرام قرار دیے ہوے (مہینوں) کی تعداد تو ٹھیک بیٹھ جائے لیکن وہ چیز حلال ہو جائے، جسے خدا نے حرام قرار دیا ہے۔ ان لوگوں کو ان کے بُرے کام بھی بھلے لگتے ہیں۔" (۳۶:۹-۳۷)

(۳) "وہ (خدا) ہی ہے جس نے سورج کو روشنی اور چاند کو نور بنایا اور اس (چاند) کی منزلیں مقرر کیں، تاکہ تم سالوں کی تعداد اور حساب جان سکو۔" (۵:۱۰)

(۴) "اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا۔ ہم رات کی نشانی کو ناپید کرتے ہیں اور دن کی نشانی کو نظر آنے والی بناتے ہیں، تاکہ تم اپنے پروردگار کا فضل حاصل کرسکو، اور سالوں کی تعداد اور حساب جان سکو۔ اور ہم نے ہر چیز میں تفصیلیں پیدا کی ہیں۔" (۱۲:۱۷)

(۵) "اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف بہ رہا ہے۔ یہ طاقتور اور جاننے والے (خدا) کی مقرر کردہ بات ہے۔ اور ہم نے چاند کی منزلیں مقرر کی ہیں تاکہ (ہر مہینے

کے آغاز پر) وہ کھجور کے پرانے پھڑے کی طرح (کمان دار شکل میں) مکرر عود کر آئے۔ نہ سورج کو یہ سزاوار ہے کہ چاند کو جا لے، اور نہ رات کو سزاوار ہے کہ دن سے آگے نکل جائے۔ (چاند اور سورج میں سے) ہر ایک الگ الگ (محور) میں تیر تا رہتا ہے۔" (۳۶:۳۸-۴۰)

(۶) "(اے رسول) وہ آپ سے نئے چاندوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجیے کہ وہ لوگوں کے لیے وقت شماری اور حج (کا زمانہ معلوم کرنے) کے لیے ہیں۔" (۲:۱۸۹)

وقت کے مفہوم سے بحث:

تاریخ کی کتابوں کے شروع میں وقت کے مفہوم سے بحث کرنا مسلمان مؤرخوں کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً طبری (ف ۹۲۳ء) جیسے پرانے مؤرخ نے اپنی "تاریخ الامم والانبیاء والملوک" میں یہی کہا ہے۔ مسعودی (ف ۹۵۶ء) نے بھی اس سے دلچسپی لی اور ساری دنیا میں جو سنہ مروج ہیں ان کی تفصیل بتائی ہے۔

سنہ کا رواج مسلمانوں میں:

کائتانی (Caetani) نے اپنی کتاب "واقعات اسلام (Annali del l'Islam)" (۱:۲۴۹) میں سنہ ہجری کے آغاز کا قصہ بیان کرتے ہوئے یہ حیرت انگیز واقعہ یاد دلایا ہے کہ عیسائیوں میں سنہ عیسوی کا رواج پہلے پہل نویں صدی عیسوی میں شارلمان کے زمانے میں ہوا۔ آماری (Amari) نے صقلیہ کی تاریخ لکھتے ہوئے وہاں کے ایک گرجے کا کتبہ درج کیا ہے جس میں مہینے کا نام تو فرنگی دیا ہے، لیکن تاریخ صرف ہجری سنہ میں دی گئی ہے، گویا صقلیہ میں کوئی معروف فرنگی سنہ نہیں پایا جاتا تھا، جس پر سب متفق ہوں اور یہ کہ ہجری سنہ سے سب واقف تھے۔

مسلمانوں میں سنہ ہجری کا رواج طبری (۴)، بیہقی (۵)، سخاوی (۶) وغیرہ کے

(۴) تاریخ طبری حالات ۱ھ (یورپی ایڈیشن، سلسلہ اول) ص ۱۲۵۰
(۵) دلائل النبوۃ (مخطوطات استانبول)
(۶) الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ (بغداد ۱۳۸۲ھ)، ص ۱۳۸-۱۳۹

Marfat.com

مطابق عہد نبوی ہی سے اور ہجرت کے پہلے سال ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ البتہ اس کے اصول سے متعلق شروع میں کچھ اختلاف تھا، بعض لوگ ربیع الاول کو سال کا پہلا مہینا قرار دیتے تھے، (۷) کہ رسول اکرم کی ہجرت اسی مہینے میں ہوئی؛ بعض لوگ محرم کو پہلا مہینا شمار کرتے تھے کہ قدیم سے عرب میں ایسا ہی رواج تھا (۸) بیہقی نے کچھ اور فرق بھی ذکر کیے ہیں (۹)۔ اسی لیے قواعد اور سرکاری استعمال کے احکام خلیفہ حضرت عمرؓ نے ۱۷ھ میں دیے (۱۰)۔ غرض کہاں ۱۷ھ اور کہاں نویں صدی عیسوی! ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا۔

طبری نے ۱۷ھ میں ہجری سنہ کے رواج کے لیے سرکاری مجلس مشاورت کے جو حالات بیان کیے ہیں (۱۱) وہ بھی سبق آموز ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشورہ نہ صرف کافی عرصے تک ہوتا رہا بلکہ یہ بھی کہ اس میں یہودیوں، ایرانیوں، (؟ پارسیوں) وغیرہ سے بھی رائے لی گئی تھی۔ بہر حال طبری کے مطابق خلیفے کی مشورت طلبی پر بعض لوگوں نے کہا کہ رومی (یعنی بیزنطینی) سنہ اختیار کیا جائے جو ذوالقرنین سے

---

(۷) طبری و سخاوی: حوالہ ہائے بالا

(۸) سخاوی: ۱۴۳۔ ابن عساکر تاریخ دمشق (نشرۂ منجد) ۱:۲۷۔ تاریخ طبری: ۱۲۵۲۔ (سخاوی: ۱۴۶) نے مسند الفردوس حدیث ۳۵۵ کے حوالے سے اس کی تائید میں ایک حدیث بھی نقل کی ہے۔

(۹) دلائل النبوۃ (حوالۂ بالا کے) مطابق کچھ لوگ سنہ کا آغاز اس محرم سے کرتے تھے جس میں بیعت عقبہ ہوئی اور ہجرت کرنا طے ہوا (یعنی ۱ھ قبل ہجرت) اس کے بخلاف کچھ لوگ اس محرم سے گنتے تھے جس میں خود رسول اکرم نے ہجرت فرمائی (اور یہی اب رائج ہے) اور کچھ اس محرم سے جو رسول اللہ کے مدینہ آنے کے بعد پہلی دفعہ آیا (یعنی ۲ھ) اس طرح کسی واقعے کے زمانے میں تین سال کا نادانستہ فرق ہو جاتا تھا۔ غزوۂ بنی المصطلق جو شعبان ۴ھ، شعبان ۵ھ اور شعبان ۶ھ میں تین مستند ترین مؤرخوں کے ہاں تین طرح سے بیان ہوا ہے، تو اس کی وجہ یہی تھی۔

(۱۰) طبری (ص ۱۲۵۴) نے ۱۷ یا ۱۸ لکھا ہے۔ ابن عساکر (تاریخ دمشق، ۱:۳۹) کے مطابق حضرت عمر نے ۱۶ھ میں حج کیا اور سرکاری جنتری کے احکام دیے؛ اس لیے حج کے ایک ماہ بعد ۱۷ سے نفاذ ہوا ہوگا۔

(۱۱) تاریخ طبری، ص ۱۲۵۰ تا ۱۲۵۵

Marfat.com

شروع ہوتا ہے (۱۲)۔ اسے اس بنا پر رد کیا گیا کہ "فھذ ایطول" (یہ طوالت پیدا کرتا ہے) (۱۳) بعض لوگوں نے کہا کہ فارسی (ایرانی) سنہ اختیار کیا جائے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کے ہاں کوئی مستقل سنہ ہے ہی نہیں، ہر نئے حکمران کے سنہ جلوس سے وقت شمار ہوتا ہے (۱۴)۔ پس اس کے اختیار کرنے میں غرض فوت ہو جاتی تھی۔ کسی اور نے کہا کہ بعثتِ نبوی کے آغاز سے حساب کیا جائے۔ مگر اس وقت تک اسلام پھیلا نہ تھا اور یہ سارے ہی مسلمانوں کو ان کے کفر و جہالت کا زمانہ یاد دلانے کا باعث تھا (۱۵)۔

---

(۱۲) اگر اس سے مراد سکندر اعظم ہے تو سنہ سکندری، سکندر کی وفات یعنی ۱۲ نومبر ۳۲۴ قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن سخاوی (صفحہ ۱۴۴) کی روایت میں بعض نومسلم یہودی جو جلسہ میں حاضر تھے، کہنے لگے "ہمارے پاس وقت کے حساب کا ایک سنہ ہے جسے ہم سکندر سے شروع کرتے ہیں: اگر یہ صحیح ہے تو اس سے سلوقی Seleucide سنہ مراد ہونا چاہیے جو گیارھویں صدی عیسوی تک یہودیوں میں شام میں رائج تھا اور یکم اکتوبر ۳۱۲ قبل مسیح سے شروع ہوتا تھا، جیسا کہ Der Grosse Brockhgus نامی جرمن انسائکلو پیڈیا میں لفظ Ara کے تحت لکھتا ہے۔

(۱۳) اس کا مطلب واضح نہیں۔ ۱۷ھ میں ۸۵۱ سلوقی پڑتا ہے۔

(۱۴) سخاوی (ص ۱۴۴) نے لکھا ہے کہ یہ توضیح ہرمزان نے کی ہے۔ یہ ایک ایرانی سردار تھا جو جنگ میں گرفتار ہو کر مدینہ آیا تھا۔ ممکن ہے کہ مسلمان بھی ہو گیا ہو۔ اس نے کہا کہ ایرانی وقت شماری کے حساب کو "ماہ روز" کہتے ہیں۔ راوی کا گمان ہے کہ لفظ ماہ روز کو معرب کر کے مؤرخ بنایا گیا اور پھر اس کا مصدر "تاریخ" بنا۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ "تاریخ" یمنی عربی لفظ ہے۔

(۱۵) ابن عساکر نے (تاریخ دمشق، جلد اول، ص ۳۴ نیز ۳۵ میں) دو ضعیف سی روایتیں نقل کی ہیں کہ ولادتِ نبوی سے آغاز کرنے کی بھی تجویز ہوئی تھی۔ لیکن اس پر بھی وہی اعتراض ہوتا ہے، جو بعثت نبوی کے متعلق ہوا۔ پھر یہ بھی واقع ہے کہ اس تاریخ سے شروع ہونے والا سنہ مکے میں رائج بھی تھا۔ یاد رہے کہ مکے میں حبشی حملے کی تاریخ سے ایک سنہ شروع ہوتا تھا اور حملہ آوروں کے ہاتھی کی وجہ سے اسے سنۃ الفیل یا ہاتھی کا سال کہتے تھے۔ اسی سال آنحضرت بھی پیدا ہوئے تھے۔ چونکہ اجنبی حملے اور اہل مکہ کی بھگدڑ سے اس کا شمار ہونا زبان زد اور عوام کا ذہن نشین امر تھا اس لیے اب اسی کو آنحضرت کی ولادت پر منطبق کرنا بھی

(باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

کسی نے کہا کہ آنحضرت کی وفات سے سنہ شروع کیا جائے۔ لیکن یہ ایک انتہائی دردانگیز اور افسوسناک واقعہ تھا۔ آخر میں ہجرت کو نقطۂ آغاز قرار دینے کا مشورہ ملا (جو کہتے ہیں کہ حضرت علی نے دیا تھا)۔ اسے سب نے قبول کر لیا کیونکہ یہ "دارالشرک سے دارالسلام میں آنے، اور حق و باطل میں امتیاز کرنے کی تاریخ ہے"۔

آنحضرت کی اپنی ہجرت تو ربیع الاول میں ہوئی تھی لیکن کچھ تو اس لیے کہ محرم کا سال کا پہلا مہینا ہونا معروف تھا اور اس میں تبدیلی کی ضرورت نہ تھی، اور کچھ اس لیے کہ آنحضرت سے پہلے دوسرے مکی مسلمانوں نے محرم کے مہینے ہی سے مدینے کی ہجرت شروع کر دی تھی، محرم کو سنہ ہجری کا آغاز تسلیم کر لیا گیا۔ مغربی مستشرقین نے زمانۂ حال میں ہجری اور عیسوی تاریخوں میں جو فرق ہے، اس کی بنا پر حساب کرنے کے لیے یکم محرم ۱ھ کے مطابق عیسوی تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض ۱۵ جولائی اور بعض ۱۶ جولائی ۶۲۲ء تعین کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مسلمان ہیئت دان خود اس کا حساب کر کے صحیح تاریخ متعین کریں۔

یہ نیا اسلامی سنہ جو ہجرت کی طرف منسوب ہو کر سنہ ہجری کہلاتا ہے خالص قمری سنہ ہے جس میں شمسی سال اور موسموں کے ہمیشہ معین مہینے میں آنے کے لیے کبیسہ گری نہیں کی جاتی۔

آسان نہ ہوتا۔ شاید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مکی حادثے کو اسلامی سنہ کے لیے قبول نہ کرنے میں مدنی انصار کی دلداری بھی مقصود تھی۔ مدینے والوں کا کوئی اپنا سنہ موجود نہ تھا۔ اس لیے ایسا سنہ اختیار کرنا بہتر تھا جو مکے اور مدینے دونوں جگہ کے مسلمانوں کے لیے دلکشی رکھتا ہو ہجرت سے شمار میں یہ بات بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ شاید یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ سنہ ہجری کے آغاز پر عیسائی دنیا میں روم میں الگ سنہ تھا، یونان میں الگ، شام میں الگ اور یہ سارے ہی سنین سیاسی واقعات سے متعلق اور کسی نہ کسی بادشاہ سے شروع ہوتے تھے: ان کو حضرت عیسیٰ یا عیسوی دین کے کسی واقعے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ شارلمان کے زمانے (نویں صدی عیسوی) میں حضرت عیسیٰ کی ولادت سے عیسوی سنہ کا آغاز کرنا ممکن ہے اسلامی تمدن سے ربط کے باعث ذہن میں آیا ہو، مگر اب آٹھ سو برس پہلے کے واقعات کا تعین آسان نہیں تھا۔ چنانچہ جدید مغربی تحقیقات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ ۴ یا ۶ قبل مسیح میں پیدا ہوئے تھے۔

Marfat.com

قمری اور شمسی سال:

قرآن (۹:۳۷) کے احکام کے تحت رسول اکرم نے اپنے آخری حج کے موقع پر (جو اسی لیے حجۃ الوداع کہلاتا ہے) یعنی اپنی وفات سے تین مہینے پہلے مکے کے مضافات میں بمقام عرفات، جبل الرحمۃ پر سے جو تاریخی خطبہ دیا (اور جس میں انسان کے بنیادی حقوق و فرائض کا ذکر ہے)، اس میں نسی یعنی کبیسہ گری کو منسوخ فرمایا اور خالص قمری سال رائج کرنے کا حکم دیا تھا۔ فرمایا (۱۶):

ایها الناس انما النسئی زیادة فی الکفر یُضلّ به الذین کفروا یُحلّونه عامًا ویحر مونه عامًا لیواطؤا عِدّة ما حرم الله، فیحلّوا ماحرّم الله ویحرّموا ما أُحلّ۔ وَ اِن الزمان قد استدا رکهیئة یوم خلق الله السماوات والأرض۔

لوگو! کبیسہ گری (لوند کا مہینا بڑھانا) کفر میں زیادتی کے سوا کچھ نہیں۔ اس طرح کافروں کو بھٹکایا جاتا ہے۔ (کیونکہ) وہ اس (مہینے) کو ایک سال (جنگ کے لیے) حلال قرار دیتے ہیں اور ایک اور سال اسے حرام قرار دیتے ہیں تاکہ (مہینوں کی) جس تعداد کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے اس کی (ظاہری) پابندی کرتے ہوئے اس

---

(۱۶) اس کا پورا متن ابن ہشام، طبری وغیرہ بکثرت مؤرخوں اور محدثوں نے دیا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے میری کتاب ''الوثائق السیاسیہ'' دستاویز نمبر ۲۸۷/الف) مندرجہ بالا اقتباس کے سمجھنے کے لیے چند باتیں ذہن میں رہیں۔ عرب میں اسلام سے پہلے ہر سال چار مہینے محترم قرار دیے گئے تھے، جن میں خونریزی حرام سمجھی جاتی تھی۔ ان میں سے تین مسلسل تھے، ذی قعدہ، ذی حجہ اور محرم۔ پھر جب قمری اور شمسی سال میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے کبیسہ گری شروع کی گئی، تو ان تین مہینوں میں وقفہ ڈالا جانے لگا اور پہلے دو مہینوں کے بعد ایک غیر محترم لوند کا مہینا بڑھایا جاتا، جس کے بعد پھر محرم کا مہینا آتا۔ اس لوند کے مہینے میں جنگ اور لوٹ مار جائز سمجھی جاتی تھی -- یہ ہے کفر میں زیادتی۔ لوند کا مہینا بیچ میں آ جانے سے عموماً تیسرے برس قمری سال کے اور لوند والے سال کے مہینوں میں ایک ایک مہینے کا فرق پڑتا اور یہ فرق بڑھتا جاتا، اور پہلے محرم، صفر میں آتا ہے، پھر ربیع الاول میں، پھر ربیع الآخر میں، وغیرہ اور کوئی پینتیس سال میں رفتہ رفتہ پھر دونوں قسم کے سالوں کے مہینے یکساں ہو جاتے۔ حجۃ الوداع کے سال ایسا ہی ہوا تھا -- اور خطبے میں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ ''تخلیقِ عالم کے زمانے کی صورت حال تکرر عود کر آئی ہے۔''

Marfat.com

وان عِدّة الشہور عنداللّٰہ اثنا عشر شہرا فی کتاب اللّٰہ یومَ خلق السّماوات والارض منہا أربعة حُرم، ثلاثة متوالیات و واحد فرد: ذوالقعدة و ذوالحجة ومحّرم، و رجب، مُضرالذی بین جمادی وشعبان۔ ألاھَل بلّغتُ؟ اللّہم فاشہد۔

(مہینے) کوحلال بنائیں جسے اللہ نے حرام قرار دیا اور اسے حرام بنائیں جسے اس نے حلال قرار دیا ہے۔ اب زمانہ گردش کر کے اسی شکل پر واپس آ گیا ہے جیسا کہ (اسے) اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے کے دن بنایا تھا۔ مہینوں کی تعداد اللہ کے ہاں، اللہ کی نوشت میں، آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے کے دن، بارہ مہینے قرار دی گئی۔ ان میں سے چار حرام ہیں۔ تین تو پے در پے ہیں اور ایک منفرد، یعنی ذیقعدہ، ذی الحجہ اور محرم نیز مُضر قبیلے والوں کا رجب کا مہینا جو جمادی (الآخر) اور شعبان کے بیچ میں ہوتا ہے۔ کیا میں نے (پیام) پہنچادیا؟ اے اللہ، تو گواہ رہ۔

اس اصلاح سے بے شمار نفسیاتی، سیاسی اور سماجی فائدے حاصل ہوے۔ مثلاً:

(۱) مسلمانوں کا اپنا ایک ممتاز سال پیدا ہو گیا جس میں کسی اور کی تقلید کی ضرورت نہ تھی اور اس کا حساب اور شمار اتنا آسان تھا کہ عامی سے عامی شخص بھی اسے سمجھ سکتا تھا۔

(۲) قمری سال چونکہ شمسی سال سے گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے اس لیے بتیس شمسی سال میں تینتیس قمری سال ہوجاتے ہیں۔ اس طرح (۳۲) سال میں حکومت (۳۳) مرتبہ ٹیکس وصول کر کے رعایا ہی کے فائدے کے لیے خرچ کرنے کی گنجائش پاتی ہے۔ زراعتی لگان کو کٹائی کے زمانے سے، اور دیگر محاصل کو کسی مہینے سے متعلق کرنے کے ذریعے سے کسانوں کی دشواری کو عہد نبوی ہی میں حل کر دیا گیا تھا۔

(۳) رمضان کے روزے اگر ہمیشہ ایک ہی موسم میں آئیں تو بعض ملکوں میں افراد کو ہمیشہ زحمت اور بعض ملکوں میں ہمیشہ آسانی رہتی ہے (مثلاً خط استواء پر سردی کا موسم خوشگوار ہوتا ہے تو قطبی علاقوں میں سخت مشقت کا) روزے کے ذریعے

سے فوجی اغراض کے لیے بھوک پیاس کو برداشت کرنے کی عادت ڈالنا اگر وقتاً فوقتاً موسموں کی تبدیلی کے ساتھ ہو (جیسا کہ قمری سال میں ہوتا ہے) تو زیادہ مفید ہے اور اس سے کسی ملک کے لوگوں کو شکایت بھی نہیں ہوگی۔ یہی بات حج پر بھی صادق آتی ہے۔

(۴) تاریخ بتاتی ہے کہ شمسی سال کا حساب آسان نہیں ہے؟ چنانچہ اس کی غلطیوں کو بار بار درست کرنا پڑا۔ مثلاً اسکندری (سلوقی) سنہ کے اصول کو جو ۳۱۲ ق م میں شروع ہوا تھا، جولیس سیزر نے ۴۶ ق م میں بدلا اور اعتدال صیفی (Equinox) کو پرانی جگہ سے ہٹا کر ۲۵ مارچ کو مقرر کر دیا۔ اس میں بھی غلطی تھی اور پادریوں کے اجتماع نیقیہ (ازنیق) میں ۳۲۵ء ایک نیا اصول حساب شماری کا مقرر کر کے اعتدال صیفی ۱۲ مارچ کو مقرر ہوا۔ لیکن اس میں بھی غلطی تھی، اس لیے پوپ تیرھویں گریگوری نے ۱۵۸۲ء میں حکم دیا کہ اکتوبر کی چوتھی کے بعد کا دن پانچ نہیں بلکہ پندرہ اکتوبر خیال کیا جائے (تاکہ دس دن کی غلطی دور کی جا سکے)۔ لطیفہ یہ ہے کہ عرصے تک یورپی لوگ خیال کرتے رہے کہ پوپ نے ان کی عمروں میں سے دس دن چرا لیے ہیں۔ موجودہ مروجہ یعنی گریگوری حساب بھی خامیوں کا حامل ہے، زمین کی گردش ست نہ بھی پڑی (اور روسی ہیئت دان بیان کر رہے ہیں کہ وہ روز بروز ست پڑتی جا رہی ہے اور سیکنڈوں کا فرق پیدا ہو گیا ہے) تو بھی کچھ عرصے بعد لازماً مزید ایک دن حساب سے حذف کرنا پڑے گا۔

یہ ساری دردسری ہجری حساب کے قمری سال میں بالکل نہیں پائی جاتی۔

قمری سنہ میں پیچیدگی ہے تو یہ کہ چاند کی رویت مشرقی اور مغربی ملکوں میں، نیز شمالی اور جنوبی ملکوں میں بعض وقت ایک ایک دن کے فرق سے ہوتی ہے۔ اس کا اثر عملاً اس پر ہوتا ہے کہ عید کی تعطیل کس دن دی جائے۔ مثلاً یہ ممکن ہے کہ مغربی پاکستان میں چاند ہو اور مشرقی پاکستان [1] میں نہ ہو۔ اسی طرح کسی واقعے، ولادت، وفات وغیرہ پر

[1] موجودہ بنگلہ دیش (مرتب)۔

Marfat.com

تاریخ کے ساتھ دن کا بھی ذکر ہو تو بین الممالک شمار میں بھی فرق ہو سکتا ہے۔

علم تاریخ و واقعات نویسی:

مسلمانوں کے سارے علوم و فنون کی طرح ان کا علم تاریخ بھی قرآن مجید کا رہینِ منت ہے۔ قرآن میں بکثرت تاریخی اشخاص اور واقعات کا ذکر ہے۔ اس کے اشاروں اور تلمیحوں کی تفصیل و تفسیر نے ایک نیا علم پیدا کر دیا۔

قرآن مجید کے یہ حوالے تخلیقِ کائنات، اوّلین انسان (آدم) کی پیدائش، مختلف ملکوں اور قوموں میں بھیجے ہوئے پیغمبروں، مختلف مقاموں کے اچھے یا بُرے بادشاہوں، اور دیگر سبق آموز واقعات و حوادث سے متعلق ہیں۔ قرآنی حوالوں سے لے کر قصص انبیاء کی جو مستقل کتابیں لکھی گئیں، وہ عالمگیر تاریخ کی اولین کتابیں کہی جا سکتی ہیں۔

مجوسی، یہودی، صابی اور عیسائی مشہور قومیں ہیں؛ قرآن میں ان کا بار بار ذکر آیا ہے، اور ان کے نبیوں کا بھی ذکر ہے۔ شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ کے صدر مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم نے بدھ مت کا ذکر بھی قرآن مجید میں پایا ہے۔ ان کا استدلال یوں ہے کہ آغاز اسلام کے وقت دنیا کے جتنے بڑے دین تھے، ان کا قرآن میں ذکر ہونا چاہیے۔ اسی لیے آتش پرست پارسی، ستارہ پرست صابی، بت پرست مشرک اور خدا پرست یہودی اور عیسائی لوگوں کا صراحت سے بارہا ذکر آیا ہے۔ اس زمانے میں بدھ مت بھی ایک بڑا مذہب تھا، پس اس کا ذکر بھی قرآن میں ہونا چاہیے۔ اس تمہید کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ قرآن میں ذوالکفل پیغمبر کا ذکر دو بار آیا ہے (سورہ ۲۱، آیت ۸۵ اور سورہ ۳۸ آیت ۴۸ میں) لیکن نام کے سوا کوئی تفصیل نہیں۔ قرآن ہی نہیں حدیث اور عام اسلامی تاریخوں میں بھی ان پیغمبر کے کوئی حالات نہیں ملتے۔ ذوالکفل، ذوالقرنین، ذوالنون نام نہیں لقب ہیں۔ (ذوالنون یعنی مچھلی والا سے مراد حضرت یونسؑ ہیں) ذوالکفل کے معنے ہیں کفل والا۔ مولانا مرحوم کا گمان ہے کہ یہ "کفل"، اصل میں کپل وستو کا معرّب ہے جو گوتم بدھ کا وطن ہے۔ کفل کے معنے عربی

میں روزگار اور پرورش کے بھی ہیں (کفالت کا لفظ اسی سے نکلا ہے) اور فرانسیسی مستشرق فلیوزا Filioza نے اپنی تاریخ ہند میں لکھا ہے کہ گوتم بدھ کے والد کا نام سُدھ دن تھا (یعنی پاک روزگار)۔ اس لفظ سے بھی ذوالکفل کو تعلق ہو سکتا ہے۔ مولانا مناظر احسن مرحوم نے ایک دوسرا حوالہ بدھ مت سے متعلق قرآن کی سورت (۹۵) میں بھی پایا ہے۔ اس سورت کا عنوان ہے "تین" (یعنی انجیر)، اور اس کی ابتدائی آیتیں یوں شروع ہوتی ہیں: قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی، اور سینا پہاڑ کی، اور اس محفوظ شہر کی ......" سارے مفسر متفق ہیں کہ اس میں چار پیغمبروں کا ذکر ہے: اس محفوظ شہر سے مراد مکہ معظمہ اور حضرت محمدؐ ہیں)، سینا پہاڑ نہر سویز کے جنوب مشرق میں معروف ہے اور یہیں حضرت موسیٰ کو خدا کی تجلی اور توریت کی وحی ہوئی تھی، جبل زیتون بیت المقدس میں ہے اور اس سے اشارہ حضرت عیسیٰؑ کی طرف ہے۔ اب رہ گیا لفظ انجیر؛ اس کے بارے میں کوئی تشفی بخش جواب مفسروں کو نہیں ملا اور ان میں اختلاف رائے ہے۔ بعض لوگ اس سے حضرت ابراہیمؑ مراد لیتے ہیں؛ لیکن حضرت ابراہیم کی سوانح عمری میں انجیر کو کوئی خاص اہمیت نہیں رہی ہے۔ مولانا مناظر احسن مرحوم یاد دلاتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کے برخلاف گوتم بدھ کی زندگی میں انجیر کو خاص دخل ہے، اور انہیں عرفان جنگلی انجیر ہی کے درخت کے نیچے حاصل ہوا تھا۔ اسی اصل درخت کی شاخ کو سیلون میں لیجا کر بویا گیا تھا، اور آج تک وہاں یہ پرانا درخت بدھ مت والوں کے ہاں انتہائی احترام سے دیکھا جاتا ہے۔

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی مدرس اردو ڈاکٹر ثریا سلطانہ بیگم نے گارسین دُتاسی کے حالات پر ڈاکٹریٹ کا جو مقالہ فرانسیسی میں لکھا ہے، اس میں انہوں نے یاد دلایا ہے کہ امام احمد بن حنبل کی مشہور کتاب المسند (۶:۲۰۶) میں اس کی صراحت ہے کہ بعثت سے قبل پیغمبر اسلام علیہ السلام نے ایک مرتبہ مسقط وعمان کے علاقے کا بھی طویل (تجارتی) سفر فرمایا تھا۔ نیز یہ کہ دائرۃ المعارف (حیدرآباد دکن) کی شائع کردہ کتاب المحبر مولفہ ابن حبیب (ص ۲۶۵) میں اس کا ذکر ہے کہ علاقہ مسقط وعمان میں ہر سال ایک بہت بڑا میلہ دَبا، میں لگتا تھا جس میں سندھ اور ہند اور چین، اور مشرق اور مغرب

کے تاجر بھی آیا کرتے تھے۔ تعجب کا مقام نہیں: اگر حضرت محمدؐ نے وہاں چینی تاجروں کو بھی دیکھا ہو۔ جن کی ہنرمندی کی تعریف آپ نے اپنے اس مشہور قول میں فرمائی ہے:

اطلبوا العلم ولو بالصّین

علم سیکھو، چاہے اس کے لیے چین (جیسے دور دراز ملک) ہی کو جانا پڑے۔

اس زمانے میں چین میں بدھ مت کا رواج ہو چلا تھا۔ ان حالات میں مولانا مناظر احسن مرحوم کا استنباط کافی وقیع ہو جاتا ہے۔

عالمگیریت:

قدیم زمانے میں ہر مؤرخ عام طور پر اپنی قوم اور اپنے ملک کے حالات پر اکتفا کرتا تھا۔ ارسطو نے ذرا بھی شرمائے بغیر لکھا ہے کہ غیر یونانی قومیں پیدا ہی اس لیے ہوئی ہیں کہ یونانیوں کے غلام رہیں۔ توریت میں حضرت موسیٰؑ کی طرف منسوب کتاب میں حکم ہے کہ غیر یہودی لوگ اگر لڑے بھڑے بغیر اطاعت کر لیں تو انہیں بطور غلام و خدمتگار زندہ رہنے دیا جائیگا، ورنہ ان کے مرد قتل کر دیے جائیں گے اور عورت بچے غلام بنا لیے جائیں گے (۱۷)۔ اور حضرت اشموئیلؑ کی طرف منسوب کتاب میں ہے کہ مقابلہ یا مدافعت کرنے والے دشمن کے مرد، عورت، دودھ پیتے بچے، اونٹ، گدھے، ہر جاندار چیز کو قتل اور نابود کر دینا چاہیے (۱۸)۔ توریت میں خدا کا لقب بھی عام طور پر ''بنی اسرائیل کا رب'' دیا جاتا ہے۔ جاپانیوں کے پرانے تصور میں تو ان کے ملک کے جزیروں کے سوا دنیا میں کسی اور علاقے کا وجود بھی نہیں۔ جاہلیت کے زمانے میں ایام العرب کے نام سے جو قبائلی کہانیاں پائی جاتی تھیں، وہ بھی عربی علاقوں کی مقامی تاریخیں تھیں۔ غرض عالمگیریت کہیں بھی نہیں ملتی۔

قرآن مجید کی سب سے پہلی آیت ہے: ''اَلْحمدُ لِلّٰه رَبِّ الْعٰلمین'' (تعریف اس خدا کے لیے جو سارے عالموں کا آقا ہے)، اس عالم کا بھی جس سے ہم واقف ہیں، اور ان دوسرے عالموں کا بھی جن سے ہمیں واقفیت نہیں ہے۔ اسی طرح

(۱۷) توریت، کتاب تثنیہ باب (۲۰) جملہ (۱۰ تا ۱۵)

(۱۸) توریت، کتاب اشموئیل اول، باب (۱۵) جملہ (۳)

پیغمبر اسلام ایک مخصوص گھرانے کے لوگوں کے لیے، ایک مخصوص ملک یا مخصوص وقت کے لیے نہیں، بلکہ سارے انسانوں کے لیے (کافۃً لِلنّاس) اورابدی و آخری تعلیم کے ساتھ (خاتم النبیّن) ہیں۔ ناگزیر نتیجہ یہ ہے کہ آپ کی تعلیم کے ماننے والوں کا نقطۂ نظر بھی عالمگیر ہی ہوسکتا ہے۔ قرآن میں کئی بار لکھا ہے کہ خدا نے ہر زمانے اور ہر ملک میں ہدایت کے لیے پیغمبر بھیجے ہیں۔ اور یہ کہ بعض کا ذکر قرآن میں ہے، تو بعض کا نہیں (۱۹) لیکن تھے سب خدا کے بھیجے ہوئے۔ اور خدا کا پیغام رساں کی حیثیت سے ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اسی لیے مسلمانوں کے ہاں مؤرخ کا فریضہ بھی عالمگیر تاریخ لکھنا، اور اس بڑے چوکھٹے میں اسلام کو بھی جڑنا قرار پایا۔ ہمارے زمانے میں پروفیسر ٹائنبی (لندن) کے وسائل زیادہ ہیں۔ لیکن اب سے تیرہ سو برس پہلے مؤرخ ابن اسحاق (ف ۱۵۱ھ) کی اہمیت گھٹ نہیں جاتی، جس نے خلیفہ منصور کے حکم سے ولی عہد مہدی کے لیے ایک ضخیم کتاب "المبتداء والمبعث" لکھی جس میں تخلیق عالم سے لے کر خلیفہ منصور کے زمانے تک کے تاریخی حالات تھے۔ اس کے بعد طبری اور مسعودی نے اپنے اپنے وسائل سے دنیا کی ساری مشہور قوموں کے حالات لکھے۔ البیرونی کا نام بھی کتاب الہند اور الآثار الباقیہ وغیرہ کے باعث ممتاز ہے۔ سب سے اہم شاید رشید الدین خان کی جامع التواریخ ہے جس میں پیغمبروں کے حالات بھی ہیں، بادشاہوں کے بھی، خلفاء اسلام کے بھی، پوپوں کے بھی، ہند، چین، منگولیا، روم، قسطنطنیہ، غرض بکثرت علاقوں کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ اور وہاں کے حکمرانوں کی تصویریں بھی دی ہیں۔ اس کے حصۂ چین کا میں نے ایک مرتبہ اپنے ایک جرمن استاد کے لیے ترجمہ کیا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ اولاً چین سے وہاں کی دو مستند تاریخیں منگائی گئیں اور چند چینی مؤرخ بھی مہمان بلائے گئے اور درباری مترجموں کی مدد سے ان کتابوں کا ترجمہ کروا کر جامع التواریخ کا یہ حصہ مرتب کیا گیا۔ اس کتاب کا حصۂ ہند اب ہالینڈ کے پروفیسر کارل یان (K. John) نے شائع کر دیا ہے۔

---

(۱۹) مثلاً قرآن، ۴:۱۶۴، نیز ۴۰:۷۸ وغیرہ

Marfat.com

شاہی دلچسپی اور سرپرستی:

عہد صحابہ ہی میں نہ صرف مسلمان مؤرخ پیدا ہو گئے تھے۔ (مثلاً حضرت علی کے بھائی عقیل بن ابی طالب جو مسجد نبوی میں مغازی کا درس دیا کرتے تھے، یا زیاد بن ابیہ جو کتاب المثالب کے مؤلف ہیں) -- بلکہ خود حکمران بھی اس علم میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ چنانچہ خلیفہ معاویہؓ نے یمن کے مشہور فاضل عبید بن شریۃ سے قدیم عرب کے حالات پر کتابیں لکھوائیں۔ دیگر ماہروں سے بھی کام لیا جس کا سبق آموز تذکرہ مسعودی نے مروج الذہب میں یوں کیا ہے:

كان من أخلاق معاوية أنه كان يأذن في اليوم والليلة خمس مرات۔ كان اذا صلّى الفجر جلس للقاص حتى يفرغ من قصصه ثم يدخل فيوتي بمصلي فيقرأ جزءً ا۔ ثم يدخل الى منزله فيأمرو ينهي۔ ثم يصلّى اربع ركعات ثم يخرج الى مجلسه فيأذن الخاصة الخاصة فيحدّ ثم ويحذ ثونه۔ ويدخل عليه وزراؤه فيكلمونه فيما يريدون من يومهم الى العشي۔ ثم يؤتى بالغداء الاصغر۔ ثم يخرج فيقول: ياغلام أخرج الكرسي۔ فيوضع فيسند ظهره الى المقصورة ويجلس على كرسي ويقوم الأحداث۔

معاویہ کی عادت تھی کہ (ملاقاتیوں کو) دن اور رات میں پانچ مرتبہ اجازت دیتے تھے۔ چنانچہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد بیٹھتے تا آنکہ واعظ اپنے وعظ سے فارغ ہوتا۔ پھر اندر جاتے اور ان کا قرآن لایا جاتا اُس کا ایک جزء پڑھتے۔ پھر اپنے رہنے کے کمرے میں جاتے اور احکام دیتے یا ممانعتیں کرتے پھر چار رکعت (نفل) نماز پڑھتے پھر نکل کر اپنے بیٹھنے کے کمرے میں آتے جہاں خاص الخاص لوگوں کو آنے کی اجازت دی جاتی۔ ان سے بات چیت ہوتی اور وزراء (مددگار) بھی آتے اور دن بھر کی ضرورتوں پر گفتگو کرتے۔ پھر چھوٹا ناشتا لایا جاتا ...... پھر دیر تک گفتگو ہوتی رہتی۔ پھر جب چاہتے اپنے رہنے کے کمرے میں چلے جاتے۔ اس کے بعد جب نکلتے تو (نوکر سے) کہتے: لڑکے کرسی لا۔ وہ رکھی جاتی اور وہ (مسجد میں) مقصورے کی طرف پیٹھ کرکے کرسی پر بیٹھتے اور مقدمے پیش ہوتے۔

Marfat.com

فيقوم اليه الضعيف والأعرابي والصبي والمرأة ومن لاأحد له فيقول: ظلمت- فيقول: أعزوه ويقول: غدي علي فيقول: البعثوا معه ويقول: صُنع بي فيقول، انظروا في أمره جتي اذالـهم يبق أحدٌ دخل فجلس على السرير- ثم يقول: أمذنوا للناس على قدر منازلهم: ولا يشغلني أحد عن رد السلام...... فأذااستووا جاوسا قال: ياهؤلاء انما سميتم أشرافا لانكم شُرفتم من دونكم بهذا المجلس؛ ارفعوا الينا حوائج من لايصل الينا-فيقوم الرجل فيقول ......ثم يؤتي بالغداء ويحضر الكاتب فيأكل لقمتين أو ثلاثاً والكاتب يقرأ كتابه فيأمرفيه بأمره ...... وربما قدم عليه من أصحاب الحوائج أربعون أونحوهم على قدر الغداء- ثم يرفع الغداء ويقال للناس، اجيزوا- فينصرفون- فيدخل منزله فلايطمع فيه طامع حتى

غریب آدمی ہو کہ خانہ بدوش بدوی، بچہ ہو کہ عورت یا کوئی اور بے یار و مددگار، ہر کوئی آ سکتا۔ کوئی کہتا مجھ پر ظلم ہوا ہے، تو فرماتے اس کی مدد کرو۔ کوئی کہتا مجھ پر تعدی ہوئی ہے، تو فرماتے اس کے ساتھ (مدد کے لیے پولیس) بھیجو۔ کوئی کہتا میرے ساتھ یوں ہوا ہے، تو فرماتے اس کے معاملے کو دیکھو۔ پھر جب کوئی (شکایتی) باقی نہ رہتا تو اندر جاتے اور تخت پر بیٹھتے۔ اور فرماتے: قدر و منزلت رکھنے والے لوگوں کو آنے کی اجازت دو، لیکن وہ مجھے سلاموں کا جواب دینے میں مشغول نہ کریں ...... پھر جب سب ٹھیک بیٹھ جاتے تو فرماتے: تم شریف اسی لیے کہلاتے ہو کہ اوروں کے برخلاف تمہیں یہاں بیٹھنے کا شرف حاصل ہے اس لیے جو لوگ ہم تک پہنچ نہیں سکتے ان کی حاجتیں ہم تک پہنچاؤ۔ اس پر کوئی اٹھ کر مثلاً کہتا ...... پھر ناشتا لایا جاتا اور کاتب (سکرٹری) حاضر رہتا۔ وہ دو تین لقمے کھاتے اور اس اثنا میں کاتب مراسلے پڑھتا رہتا، اور وہ مناسب احکام صادر فرماتے بعض اوقات اس ناشتے پر چالیس یا اس کے لگ بھگ اہل حاجت موجود رہتے۔ پھر ناشتا اٹھا لیا جاتا۔ اور لوگوں سے کہا جاتا کہ جا سکتے ہو۔ وہ چلے جاتے۔ پھر وہ اپنے رہنے کے کمرے میں جاتے جس کے بعد کسی کو ملنے کی جرأت نہ ہوتی۔ پھر جب ظہر کی اذان

Marfat.com

ينادى بالظهر- فيخرج فيصلي- ثم يدخل فيصلي اربع ركعات، ثم يجلس فيأذن لخاصة الخاصة [للأكل] ...... ويدخل اليه وزراؤه فيؤامر ونه فيما احتجوا اليه بقية يومهم- ويجلس الى العصر- ثم يخرج فيصلّي العصر ...... وينادى بالمغرب فيخرج فيصلها ثم يصلي بعدها اربع ركعات ثم يدخل منزله فلا يطمع فيه طامع حتى وينادى بالعشاء الآخرة فيخرج فيصّلي ثم يؤذن للخاصة، وخاصة الخاصة، والوزراء والحاشية- فيؤامره الوزراء فيما أرادوا صدراً من ليلتهم ويستمرّ اِلى ثُلث الليل في اخبار العرب وايامها، والعجم وملوكها وسياستها لرعيتها، وسائر ملوك الامم و حُروبها ومكائدها، وسياستها لرعيتها وغير ذلك الامم السالفة ثم تأء تيه الطرف الغريبة من عند نسائه من الحلوى

ہوتی، تو نکلتے اور نماز پڑھتے۔ پھر اندر جا کر چار رکعت (سنت) پڑھتے پھر خاص الخاص لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر (کھانا کھاتے......اور وزیر (مددگار) آتے اور دن کے باقی حصے کے لیے ضروری چیزوں سے متعلق مشورے ہوتے اور عصر کے وقت تک بیٹھے رہتے۔ پھر باہر نکلتے اور عصر کی نماز پڑھتے۔ پھر جب مغرب کی اذان ہوتی تو باہر نکلتے اور مغرب کی نماز پڑھتے جس کے بعد چار رکعت (سنت) بھی پڑھتے پھر اپنے رہنے کے کمرے میں جاتے جس کے بعد کسی کو ملنے کی جرأت نہ ہوتی۔ پھر جب عشاء کی اذان ہوتی تو نکلتے اور عشاء کی نماز پڑھتے۔ پھر خاص، اور خاص الخاص لوگوں اور وزیروں اور حاشیے کے (مقرب) لوگوں کو آنے کی اجازت دی جاتی۔ اور وزیروں سے رات کے ابتدائی حصے کے لیے مشورت ہوتی رہتی پھر ایک تہائی رات گئے تک قدیم عرب کے حالات اور مشہور جنگوں، عجم (ایران) کے حالات پر اور وہاں کے بادشاہوں کا اپنی رعایا سے برتاؤ، دیگر ممالک کے بادشاہوں اور ان کی جنگوں اور ان کے (دشمنوں کے ساتھ) مکاریاں اور اپنی رعایا کے ساتھ برتاؤ وغیرہ کو (سنتے) جو زمانہ سابق کی قوموں سے متعلق ہے۔ پھر زنانے سے نادر چیزیں آتیں مثلاً مٹھائی اور دیگر لطیف کھانے۔ پھر اندر جا کر ایک تہائی رات سوتے۔

Marfat.com

وغیرها من الماكل اللطيفة ثم يدخل فينام ثلث الليل۔ ثم يقوم فيقعد فيحضر الدفاتر فيها سيرالملوك وأخبارها والحروب والمكائد فيقراء ذلك عليه غلمان له مرتبون وقد وُكلوا بحفظها وقراء تها فتمربسمعه كل ليلة جمل من الأخبار والسير والآثار وانواع السياسات ثم يخرج فيصلّى الصبح ثم يعود فيفعل ماو صفنا في كل يوم۔

پھر اٹھ بیٹھتے اور وہ کتابیں لائی جاتیں جن میں بادشاہوں کا برتاؤ اور حالات اور جنگوں اور (دشمن سے) مکر کا ذکر ہوتا۔ ان کو وہ ملازم پڑھتے جو خاص اس کام کے لیے مامور تھے۔ اور ان کا کام یہی تھا کہ ان (کتابوں) کی رکھوالی کریں اور ان کو پڑھ کر سنائیں۔ اس طرح ہر رات (بادشاہوں کے) برتاؤ اور حالات اور سیاست کے کچھ نہ کچھ حالات سماعت سے گزرتے۔ پھر باہر نکلتے اور صبح (فجر) کی نماز پڑھتے۔ پھر دوبارہ سارا دن اسی طرح کام کرتے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

اس اقتباس کے آخری حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ملکوں کے تاریخی حالات پر (عربی میں ترجمہ یا تالیف کے ذریعے سے) کتابیں شاہی استعمال کے لیے تیار ہو چکی تھیں۔ یہ پیغمبر اسلام کی وفات سے بمشکل تیس سال بعد کے واقعات ہیں۔ اس طرح کی شاہی دلچسپیاں بعد کے زمانے میں بھی برقرار رہیں۔

واقعات کی صحت:

قدیم زمانے میں تاریخ کا مقصد اپنی قوم کے مشہور کارناموں کو تعریف و توصیف سے بیان کرنا ہوتا تھا، اور مؤرخ اکثر درباری مقرب اور حکومت کے ملازم ہوتے تھے، اس لیے مبالغہ آرائی جائز ہی نہیں لازم سمجھی جاتی تھی اور تاریخ اور افسانے میں فرق مشکل ہو جاتا تھا۔

واقعات کی صحت کا لحاظ قدیم زمانے میں صرف محکمۂ عدالت سے مخصوص تھا اور چشم دید گواہوں کی شہادت کی مدد سے کسی واقعے کو صحیح یا غیر صحیح قرار دینا حاکم عدالت کی ذمہ داری تھی۔ اور اس کا تعلق دو آدمیوں کے جھگڑے سے ہوتا تھا۔ اس کے برخلاف

Marfat.com

تاریخ میں یک طرفہ بیان اور مورخ کے ادّعا کے سوا اور کوئی ثبوت، کوئی حوالہ شاذ ہی ہوتا تھا۔ کئی سو سال کا عرصہ ہوا، ایسٹ انڈیا کمپنی نے مشہور جرمن مستشرق آلوئیس اشپرنگر کو کلکتے بلایا اور اس کی خدمات سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے ابن حجر کی کتاب ''الاصابة فی أحوال الصحابة'' کو ایڈٹ کیا، جو عہدِ نبوی کی تاریخ کے چشم دید راویوں کے حالات پر مشتمل ہے، اشپرنگر کو رشک تھا کہ قانونِ شہادت وثبوت کا اطلاق تاریخ پر مسلمانوں سے پہلے کسی قوم نے نہ کیا۔ مسلمان مؤلفوں کی لکھی ہوئی تاریخیں ''مستند'' واقعات کا مجموعہ ہوتی ہیں، یعنی پہلے سند بیان ہوتی ہے کہ چشم دید اور برسرِ موقع حاضر گواہ سے لے کر مؤلف تک واقعے کی نقل نسل بہ نسل کن لوگوں نے کی، پھر چند لفظی یا چند سطری واقعہ بیان ہوتا ہے۔ اس کے بعد دوسری سند شروع ہوتی ہے، تاکہ کوئی مزید واقعہ بیان ہو۔ اور ساری کتاب اس طرح سیکڑوں بلکہ ہزاروں اسانید کے ساتھ بیان شدہ واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ زمانۂ حال کی بہترین تاریخ وہ سمجھی جاتی ہے جس میں ہر واقعہ کا حوالہ دیا جائے، لیکن ہر واقعے کے لیے حوالے کے حوالے جو مؤلف سے لے کر چشم دید شاہد تک بیان ہوں ...... اتنا استیعاب، اتنے مکمل حوالے مسلمانوں کے سوا کسی قوم کے لٹریچر میں نہیں ملتے۔ مسلمانوں کے ہاں وہ تاریخ کم قابلِ اعتماد سمجھی جاتی ہے، جس کا مؤلف صرف کنایات پر اکتفا کرے اور چند راویوں کا نام لے کر پھر یہ کہہ دے کہ ''میں نے ان سب کے بیانات سے بحذفِ مکررات یہ مربوط تفصیل مرتب کی ہے۔'' اور بعض کے بیانات میں کچھ تفصیل ہے تو دوسروں کے ہاں کچھ اور تفصیل؛ اور یہ نہ بتائے کہ کونسی تفصیل کس ماخذ کی ہے۔

تاریخ کی شاخیں:

سفرناموں کے ذریعے سے مسلمانوں کے ہاں بین الممالک تاریخ کی روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ جہانگردوں میں ابن جبیر (ف ۶۱۴ھ/ ۱۲۱۷ء) اور ابن بطوطہ (ف ۷۷۹ھ/ ۱۳۷۷ء) کا نام لینا کافی ہے اگرچہ اس سے کئی صدی پہلے کی کتابیں مثلاً ''اخبار الہند والصین'' بھی موجود ہے۔

شہروں کی تاریخیں بھی کثرت سے لکھی جانے لگیں: بغداد، بصرہ، دمشق، مکہ، مدینہ، سمرقند، نیشاپور وغیرہ۔ ان میں شہر کی عام تاریخ کے علاوہ مشہور شہریوں کے حالات بھی ہوتے ہیں ملک وار اور خانوادہ وار تاریخیں تو ناگزیر ہی تھیں۔

پیشوں کے لحاظ سے بھی سوانح عمریاں لکھی گئیں: قاری، مفسر، محدث، فقیہ، قاضی، مورخ، طبیب، فلسفی وغیرہ چونکہ ہر دور میں کثرت سے گزرے ہیں، اس لیے یہ تخصص ناگزیر تھا کہ سارے ہم پیشہ مشاہیر کے حالات یکجا لکھے جائیں۔ پھر متاخر مؤلف ان کے تکملے بھی لکھتے رہے۔

بلا امتیاز، ہر شعبۂ حیات کے مشاہیر کے حالات کے مجموعے بھی کثرت سے تیار ہوئے۔ کبھی زمانے کے لحاظ سے کبھی حروف تہجی کے لحاظ سے۔ اول الذکر کبھی سنہ وار رہے اور کبھی صدی وار، سنہ وار میں حروف تہجی کا لحاظ ممکن نہیں؛ صدی وار میں حروف تہجی کی ترتیب ہی عام طور پر ملحوظ رہی ہے۔

چونکہ قانونِ شہادت کا تاریخ پر بھی اطلاق کیا جانے لگا تھا، اس لیے شروع ہی سے اس کی ضرورت رہی ہے کہ ایسی کتب رجال لکھی جائیں جن میں ہر شخص کے حالات اور اس کی ثقاہت کے ساتھ ساتھ یہ تفصیل بھی ہو کہ اس کے استاد کون کون تھے۔ اور شاگرد کون کون۔ اس سے راویوں کے سلسلوں کی صحت کی جانچ میں آسانی ہوتی ہے۔

نسب نامے بھی اسلام، خاص کر عرب کی تاریخ کی خصوصیت رہے ہیں اور ان سے متعلق بھی ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ پیغمبر اسلام نے حکم دیا تھا کہ ہر شخص اپنا نسب نامہ، دو، چار، دس، بیس جتنی پشت تک بھی ممکن ہو، زبانی یاد رکھے۔ خلیفہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ساری رعایا کے لیے بطور روزگار سالانہ وظیفے مقرر ہوئے تھے۔ اس دیوان میں رجسٹر تیار ہوئے تھے، ہر بچے کا پیدائش کے ساتھ ہی مختصر روزینہ مقرر ہو جاتا، جو عمر کے ساتھ بڑھتا جاتا۔ اس طرح ان رجسٹروں کی ہر وقت نظر ثانی ہوتی رہتی تھی۔ امام محمد شیبانی کے مطابق تو اس کا چھوٹے پیمانے پر آغاز عہد نبوی ہی میں ہو گیا تھا اور فوجی خدمت کے لیے تیار رضاکاروں کے مستقل روزینے مقرر ہو گئے تھے (۲۰) ہجرت

(۲۰) شرح السیر الکبیر للسرخسی، باب (۱۰۵) فقرہ (۱۹۷۸)

کے بعد شہری مملکتِ مدینہ کا جو دستور وضع ہوا، (۲۱) اس کے مطابق سارے مسلمانوں میں قبیلہ دار اساس پر بیمے کا انتظام بوجھل ذمہ داریوں کے لیے ہو گیا تھا۔ ان حالات میں نسب ناموں کی تیاری ناگزیر تھی۔ کتب انساب سے لوگوں کی رشتہ داریاں اور نسلی اور نکاحی رشتے وغیرہ معلوم ہوتے ہیں، جن سے بارہا تاریخی واقعات کے اسباب و بواعث کا پتا چلتا ہے۔

فلسفۂ تاریخ اور عمرانیات پر صاعد الاندلسی کی ''طبقات الامم'' سے ایک نئے علم کی داغ بیل پڑی، جس کی تکمیل مقدمۂ ابن خلدون سے ہوئی، اور اب یہ مستقل علم بن گیا۔ علم تاریخ کو اس منزل تک پہنچانے کا فریضہ مسلمانوں نے سرانجام دیا۔ اس کے بعد مشعل علم مغرب نے تھامی۔ ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت۔ لیکن اگلوں اور پچھلوں کی خدمات سے مقابلہ کر کے مسلمانوں کی اس خدمت کا درجہ متعین کرنا، یہ ناظر اور باحث کا کام ہے۔

(ارمغانِ مالک مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
مجلس ارمغان مالک۔ نئی دلی ۱۹۷۱ء)

---

(۲۱) تفصیل کے لیے دیکھیے: عہد نبوی کا نظامِ حکمرانی (از ڈاکٹر محمد حمید اللہ)

Marfat.com

فتح مکہ (۸ھ)
کی
چودہ سوسالہ یادگار

مضمون کے پس منظر کے طور پر پہلے اس کے ساتھ منسلک
ڈاکٹر صاحب کا گرامی نامہ ملاحظہ ہو۔

۱۸ ؍ ذی قعدہ ۱۴۰۸ھ "معارف"

مخدوم ومحترم! زاد مجدکم وعم فیضکم ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آج فجر کی نماز کے بعد تسبیح کے معمولات میں مشغول تھا کہ
یکا یک کچھ بات یاد آئی۔ قلم برداشتہ لکھ کر روانہ کر رہا ہوں۔ کیا
عجب کہ وہ ۱۴۰۸ھ ہی کے آخری شمارہ میں، مضمون نہیں تو خط ہی
کے طور پر شائع ہو جائے، فرض ادا ہو، قضا کی نوبت نہ آئے۔
واللہ علی مایشاء قدیر۔ حفظکم اللہ وعافاکم۔

الفقیر الی اللہ محمد حمید اللہ

کراچی کے موقر ہفتہ وار انگریزی اخبار "مسلم ورلڈ" مورخہ ۲۶ ؍ نومبر ۱۹۸۳ء
میں عرض کیا تھا کہ سنہ ہجری کی پہلی دہ سالگی ختم نبوت سے عبارت ہے اور اس کا لحہ لحہ

Marfat.com

تاریخ بشری کے لیے حرفِ آخر اور اسوۂ حسنہ ہے اور یہ بھی گزارش کی تھی کہ ۵ھ کے معرکۂ خندق، ۶ھ کے صلح نامۂ حدیبیہ، ۷ھ کے غزوۂ خندق، ۸ھ کی فتح مکہ اور ۹ھ کے عام الوفود کے واقعات پر چودہ سو (۱۴۰۰) سال گزر رہے ہیں، پھر ۱۰ھ کے حجۃ الوداع اور اکمالِ دین کا زمانہ آئے گا۔ فرمانِ الٰہی ہے کہ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ، کیا ہم تحدیث نعمت نہیں کریں گے؟

باری تعالیٰ کی حکمت ہے کہ مجھے فتح مکہ کی یادگار منانے کی یاد بھی دیر سے آرہی ہے، ختم رسالت پر اولین حکم "اِقْرَأْ" کا ہوا اور سمجھایا بھی گیا: "عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ"۔ "اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ" دوسری وحی تھی، "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ" تقریباً آخری آیت ہے، اور "اِذَا جَآءَ نَصْرُاللّٰهِ وَالْفَتْحُ" الآیۃ آخری سورہ سمجھی جاتی ہے، دیر بھی ہوئی ہے تو مالا يُدرك كله لايترك جله۔

فتح مکہ کا پس منظر دیکھیں:

حدیث قدسی میں ارشاد ہے کہ "كنت كنزا مخفيا....." اسی کی تصریح و تاکید قرآن نے بھی کی "مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" خود فرشتوں کے لیے البیت المعمور کی عبادت گاہ مقرر ہوئی اور حَافِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ اس کا طریقہ تھا، غالباً حضرت آدم علیہ السلام بھی جنت میں ویسا ہی کرتے رہے ہوں گے، ان کے "ظَلُوْمًا جَهُوْلًا" ہونے کے باوجود لغزش پر توبہ کی، نہ صرف توبہ قبول ہوئی بلکہ "اَمَانَة" کے حامل بنے اور مسجود ملائک بنائے گئے اور سزا کے طور پر نہیں بلکہ سرفرازی کے طور پر خلیفة الله فی الارض نامزد ہوئے، خدمت کا جائزہ لینے کے لیے بیوی کے ساتھ زمین کا سفر کیا تو کہتے ہیں کہ بیوی راستہ میں کھو گئیں، زمین پر پہنچ کر تلاش جاری رکھی، تو بالآخر وہ بمقام عرفات مل گئیں۔

زمین پر آسمانی زندگی جاری رکھنے کی خواہش ہوئی تو رب العالمین نے انجینئر فرشتے بھیجے، جنہوں نے مکہ معظمہ میں کعبہ کا بیت اللہ تعمیر کیا، جو نبی آدم علیہ السلام کے لیے اولین عبادت گاہ بنا، قطع کلام کریں کہ حکمت باری ہوئی کہ وہ انسان کی نظروں سے

غائب رہے، چونکہ مکان سے مکین بھی فوراً ذہن میں آتا ہے، اس لیے بیت اللہ سے ساکنِ بیت ذہن میں آتا ہے اور زیادہ باادب طور پر جس میں ساکن بیت کی صورت شکل معلوم کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ مورخ روایت کرتے ہیں کہ یہ "الکعبة البیت الحرام" عرش کے نیچے کے البیت المعمور کے عین تحت ہے، اس قدر کہ اگر وہاں سے ایک پتھر پھینکا جائے تو وہ کعبہ کی چھت پر گرے، اس میں رمز یہ ہے کہ کعبہ کے بیت اللہ کے پاس جو گویا عرش کی کھڑکی ہے دعاء کریں تو وہ راست عرش تک پہنچ جاتی ہے، کوئی درمیانی واسطوں کی ضرورت نہیں رہتی۔

غالبًا آدم علیہ السلام وحواء کعبہ کے پاس اسی طرح عبادت کرنے لگے ہوں گے جس طرح آسمان پر بیت المعمور کا طواف ہوا کرتا ہے اور ان کے بعد ان کی اولاد بھی۔

جب طوفان نوح آیا تھا تو روایت ہے کہ اللہ نے کعبہ کو اس کی حرمت کے باعث آسمان پر اٹھا لیا، بہرحال زمین اس سے محروم ہو گئی، بائبل (کتاب پیدائش ۸/۲۰) کی روایت معقول معلوم ہوتی ہے کہ جب طوفان تھما اور حضرت نوح اور ان کے ہمراہی کشتی سے نکل کر خشک زمین پر آئے تو انہوں نے فوراً ایک عبادت گاہ تعمیر کی، یہ ایک قربان گاہ سے عبارت ہے جہاں چیزیں قربان کی جاتی تھیں۔

اس پر چند ہی نسلیں گزریں کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا زمانہ آیا، وہ اچھے لیکن بت پرست گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اللہ نے فضل کیا تو ایک رات یکایک رب کی تلاش کی سوجھی۔ کوکب (زہرہ) ستارے کو دیکھا تو خیال کیا کہ وہی ان کا رب ہے، تھوڑی ہی دیر میں وہ ڈوب گیا تو اس گمان کو رد کیا، پھر چاند کو رب سمجھا، جب وہ بھی غروب ہو گیا اور سورج نکلا تو اسے رب خیال کیا اور آخر اس کو بھی ترک کرنا پڑا اور وحی نے خدائے واحد رب العالمین کے وجود کی تلقین کی۔ اس سے نہ صرف اطمینان خاطر ہوا بلکہ اس کی زور وشور سے تبلیغ بھی شروع کی، پہلے باپ نے ان کو گھر سے نکالا، پھر بت شکنی کے "جرم" پر بادشاہ نے زندہ آگ میں جھونکنے کی سزا دی۔

خدا کی حکمتوں کے کیا کہنے، اس نے انسانوں کو سمجھایا کہ کس طرح ٹھنڈی چیزوں کو مثلاً کھولتا گرم پانی بنائے اور کس طرح گرم چیزوں کو ٹھنڈا کر کے مثلاً برف بنائے،

Marfat.com

معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ حران (بابل) نے نادانستہ ایسی لکڑیاں اور ایسی چیزیں آگ بنانے کے لیے جمع کیں جن سے ٹھنڈا شعلہ پیدا ہوا (جواب ہر جگہ انسان بنانے لگا ہے) اور "یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ" کا معجزہ مشاہدے میں آیا۔

حضرت ابراہیمؑ بیوی اور بھتیجے حضرت لوطؑ کے ساتھ وطن کو چھوڑ اور بلاد النہرین کو عبور کر کے (عبرانی بن کر) کنعان پہنچے، وہاں بائبل کے مطابق اُن دنوں قحط تھا تو آگے بڑھ کر مصر پہنچے، وہاں بیوی حضرت سارہؓ کے حسن سے بدکار فرعون کے ہاتھوں بپتائیں پیش آئیں، لیکن وہ بھی حکمت الٰہی کا ایک جزء تھا، فرعون نے توبہ کر کے اپنی بیٹی حضرت ہاجرؑ کو بطور تحفہ حضرت سارہؓ کی خدمت گار کے طور پر پیش کیا، مصر سے واپسی پر فلسطین میں مورہ نامی مقام پر عبادت الٰہی کے لیے ایک قربان گاہ تعمیر کی (کتاب پیدائش ۱۲/۸-۷) پھر آگے بڑھ کر بیت ایل نامی مقام پر ایک نئی عبادت گاہ بنائی، (ایضاً ۱۳/۴) پھر مرے میں بھی یہی کیا، (ایضاً ۱۳/۱۸) کچھ عرصہ بعد تبلیغ دین کو توسیع دینے کے لیے اپنے نوزاد بیٹے اسماعیلؑ اور ان کی ماں ہاجرؑ کو مکہ میں بسایا اور اس بے آب و گیاہ مقام پر صفا و مروہ کی سعی پر اللہ نے زمزم کا چشمہ پیدا کیا، پھر امتحان خُلت کے آخری حصہ میں اکلوتے بیٹے کی قربانی کا حکم ملا۔ (کتاب پیدائش ۲۲/۸) کا یہ جزء صحیح ہوگا کہ حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو ذبح کرنے کے مقام پر بھی ایک عبادت گاہ کی تعمیر کی کہ احکام الٰہی کی وہاں تعمیل ہو) یہ منیٰ میں ہوا، ان امتحانوں کے بعد انہیں کعبۂ آدم کے مقام کی تلاش اور وہاں نئی عبادت گاہ بیت اللہ کی تعمیر کا حکم ہوا اور اس کے لیے حج کا طریقہ نافذ ہوا جس میں عرفات آدمؑ و حواؑ بھی شامل ہو گئے، حضرت ہاجرؑ کی سعی صفا و مروہ بھی ذبحِ فرزند کی جگہ جانور کی قربانی اور منیٰ بھی اور طواف کعبہ بھی شامل ہوئے۔

جب خاتم النبیینؐ کا زمانہ آیا تو آپؐ نے بھی حضرت ابراہیمؑ کی طرح کعبہ کی اپنے دستِ مبارک سے نئی تعمیر کی، حجرِ اسود اپنے ہاتھ سے نصب فرمایا، اپنے جد کی طرح جلاوطن ہو کر مدینہ بھی گئے اور وہاں دس سال تک خدا کے آخری دین کی تبلیغ کی جو روح اور بدن، دنیا و آخرت سب کی بھلائیوں کا جامع تھا، اس کے لیے جو جدوجہد کی وہ مورخ کو ششدر کر دیتی ہے۔ مدینہ میں کوئی مملکت نہیں پائی جاتی تھی۔ اس شہر کے ایک چھوٹے سے حصہ میں

Marfat.com

ایک شہری مملکت تاسیس کی، اس کا ایک تحریری دستور مدون اور نافذ کیا، چند مربع میل رقبہ کی یہ بستی دس سال بعد ایک مملکت کا دارالسلطنت بنی جو تیس لاکھ مربع کلومیٹر کے رقبہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ ہجرت کے وقت کے مٹھی بھر مسلمان حجۃ الوداع کے وقت ایک لاکھ چالیس ہزار حاجی عرفات بھیجتے ہیں (سارے مسلمان غالباً اس وقت پانچ لاکھ سے کم نہ تھے) ہتھیاروں سے کشمکش کو دیکھو تو بدر میں تین سو بارہ کا ساڑھے نو سو سے مقابلہ ہوا، اُحد میں سات سو کا تین ہزار سے، خندق میں چودہ سو کا بارہ ہزار سے، خیبر میں پندرہ سو کا بیس ہزار سے اور فتح اللہ ان کمزوروں کو دیتا ہے۔

خیبر ۷ھ کے بعد ۸ھ میں فتح مکہ ہوئی، اس کو یاد دلا کر اسے ختم کرتا ہوں، ۶ھ میں مشرکین مکہ سے دس سال کے لیے صلح ہوئی، انہوں نے بدعہدی کی اور مسلمان اہل خزاعہ کو نماز پڑھتے وقت قتل کیا، اس سے انتقام لینے کا حکم دیا کہ مدینہ سے کوئی شخص بلا اجازت باہر نہ جائے۔ حلیف قبائل کے سرداروں کو بلا کر کہا کہ ایک بڑی مہم کے لیے اپنے رضا کاروں کے ساتھ تیار رہو، ہم تمہارے علاقہ سے گزرتے وقت تم کو لے لیں گے، پھر مکہ پر حملہ کرنے کے لیے جو مدینہ کے جنوب میں ہے، مدینہ کے شمال، پھر مشرق، مغرب وغیرہ آڑے ترچھے سفر کرتے ہیں اور ایک بڑے صحابی کا بیان ہے کہ کسی کو خبر نہ تھی کہ کہاں جا رہے ہیں تا آں کہ ہم مکہ کے دامن میں اپنا پڑاؤ ڈالتے ہیں، دشمن سردار ابوسفیان گرفتار کر لیا جاتا ہے، مکہ پر خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر قبضہ ہو جاتا ہے، پھر آپ مشرکینِ اہل مکہ کو جمع کر کے پوچھتے ہیں کہ مجھ سے کس برتاؤ کی توقع کرتے ہو؟ پھر قتل عام، غلام بنانے، مال لوٹنے کی جگہ فرماتے ہیں: لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء۔ طرفۃ العین میں ان کی کایا پلٹ ہوگئی اور راتوں رات سارا مکہ پورے اخلاص کے ساتھ مسلمان ہو جاتا ہے۔ اسی واقعہ پر اب ۱۴۰۸ھ میں پورے چودہ سو سال گزر رہے ہیں۔

(معارف اعظم گڑھ۔ جولائی ۱۹۸۸ء)

Marfat.com

مآخذ و مراجع

۱۔ محمد حمید اللہ ڈاکٹر — خطبات بہاول پور
ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد ۱۹۹۷ء

۲۔ رسول اکرم کی سیاسی زندگی — دارالاشاعت، کراچی ۱۹۶۸ء

۳۔ محمد راشد شیخ — ڈاکٹر محمد حمید اللہ
المیزان پبلشرز، فیصل آباد ۲۰۰۳ء

۴۔ قاسم محمود سید — ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی بہترین تحریریں
بیکن بکس لاہور/ ملتان ۲۰۰۳ء

۵۔ سہ ماہی مجلہ عثمانیہ — کراچی۔ اپریل تا جون ۱۹۹۷ء

۶۔ ماہ نامہ دعوۃ — دعوت اکیڈمی بین الاقوامی یونیورسٹی
اسلام آباد۔ مارچ ۲۰۰۳ء

۷۔ سہ ماہی فکر و نظر — ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد
اپریل تا ستمبر ۲۰۰۳ء

۸۔ ششماہی معارف اسلامی — علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
جولائی ۲۰۰۳ء تا جون ۲۰۰۴ء

۹۔ روزنامہ منصف حیدرآباد (دکن) مورخہ ۶ر ستمبر ۲۰۰۳ء

Marfat.com

قانون

Marfat.com

Marfat.com

سِیَر یا قانون بین الممالک [1]

دو خود مختار سیاسی وحدتوں کے تعلقات جن قواعد کے تحت جاری رہتے ہیں، ان کو مسلمان فقہاء نے (عربی میں) "سِیَر" کا نام دیا تھا (جو "سیرۃ" کی جمع اور جس کے معنے طرز عمل اور برتاؤ کے ہیں)۔ قدیم زمانے میں اسے "قانون بین القبائل" کا نام دے سکتے تھے۔ پھر شہری مملکتوں کے زمانے میں اسے بین البلدیات کہہ سکتے تھے۔ ایک زمانے میں جب "قوم" کا مفہوم سیاسی تھا نسلی نہیں، بین الاقوام کی اصطلاح کا اس پر اطلاق ہو سکتا تھا۔ اب اسے بین الممالک یا بین الدول کے سوا کوئی اور نام نہیں دے سکتے۔

اس پس منظر سے معلوم ہوگا کہ سِیَر کا وجود انسانی سماج میں زمانہ ماقبل تاریخ سے ہو چکا ہونا چاہیے۔ لیکن تاریخی نقطۂ نظر سے ان "قواعد" کے نہیں بلکہ ان "قواعد کے علم" کے موجد پہلی اور دوسری صدی ہجری کے مسلمان فقہاء ہیں۔ دو وجوہ سے یہی استنباط کرنا پڑتا ہے۔

(۱) مسلمان ہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے علم سِیَر کے قواعد کا اطلاق عالمگیر کر دیا اور دنیا کی کسی بھی قوم یا مملکت کو اس سے مستثنیٰ نہ رکھا۔ قدیم ترین قوموں میں سے آریائی برہموں کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ان کو ان کے ہم مذہب، ہم زبان اور ہم تمدن مگر ایک دوسرے سے خود مختار برہمنی مملکتوں میں تو باہمی جنگ و امن کے تعلقات معینہ قواعد کے

---

[1] یہ مقالہ بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کے لیے پیرس سے آیا تھا (مدیر)

Marfat.com

تحت رہیں گے۔ لیکن باقی دنیا کو جسے ملیچھ کا نام دیا گیا تھا، اچھوت قرار دے کر منوسمرتی وغیرہ کے تحت جانوروں سے بھی بدتر درجے تک پہنچا دیا گیا تھا ان بے چارے مفتوحوں کا سایہ بھی کسی برہمنی مذہب والے پر پڑ جائے تو اسے نہانے کی ضرورت ہو۔ ان سے برتاؤ میں صرف صوابدید کی ہر آن بدل سکنے والی چیز پر عمل تھا۔ (۲) بنی اسرائیل کو توریت نے یہ تعلیم دی کہ جس اجنبی شہر کے سامنے وہ پہنچیں اور وہ خوشی سے اطاعت کرے تو وہاں والوں کو جان کی تو امان رہے گی لیکن وہ بنی اسرائیل کے غلام اور خدمت گار بنیں گے اور اگر مقابلے کے بعد وہ مغلوب ہو تو وہاں والوں میں سے مقاتلوں کو قتل، عورتوں، بچوں کو غلام اور مال و متاع کو غنیمت بنایا جائے گا۔ اس ''رعایت'' سے بھی عمالقہ قبائل (جو فلسطین کے عربی النسل باشندے تھے) مستثنیٰ تھے۔ ان میں سے کسی ذی روح کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔ عورت مرد ہی نہیں دودھ پیتا بچہ بھی بلکہ اونٹ بکری، بیل اور گدھا تک قتل کر دیا جائے۔ (دیکھو توریت میں کتاب تثنیہ نیز اشموئیل پیغمبر کی کتاب اول)۔ (۳) یونانی تصور ارسطو طالیس وغیرہ کے مطابق یہ تھا۔ جزیرہ نمائے یونان میں بسنے والی ہم مذہب، ہم زبان اور ہم تمدن یونانی شہری مملکتوں میں تو باہمی جنگ امن میں معینہ قواعد کا اطلاق ہوگا۔ باقی دنیا کے لیے جسے بربر (یعنی بربریت پسند) کا نام دیا گیا تھا، کوئی حق نہیں پایا جاتا تھا ''فطرت نے انہیں یونانیوں کا غلام بننے کے لیے پیدا کیا ہے'' اور ان کے متعلق یونانی اپنی صوابدید پر جو چاہے عمل کر سکتا ہے۔ (۴) رومی دور میں نسلی تنگ نظری سے تو نجات ملی لیکن دنیا کو تین حصوں میں بانٹا گیا۔ رومی سلطنت اور دوست اور حلیف ممالک اور باقی دنیا۔ حلیفوں کے ساتھ حالت امن میں تو معین قواعد کے مطابق سلوک ہوتا لیکن باقی اجنبی ممالک نیز سابق حلیف ملک سے جنگ کی صورت میں سوائے صوابدید کے کوئی معین قواعد نہ تھے۔ (۵) یورپ اور امریکہ میں ۱۸۵۶ء تک قانون ''بین المسیحین'' پر عمل تھا اور کسی غیر عیسائی کے لیے کوئی ''حق'' نہیں تسلیم کیا جاتا تھا۔ پوپ چوتھے نکولاس کے مطابق تو کسی غیر عیسائی کو دیے ہوئے قول کی پابندی مذہبی نقطۂ نظر سے کسی عیسائی پر واجب نہیں بلکہ عہد شکنی ہی بہتر ہے۔ ۱۸۵۶ء میں پیرس کانگرس میں جب ترکی سے ایک معاہدہ کرنا پڑا

Marfat.com

تو مجبوراً یہ قرار دیا گیا کہ مغربی قانون بین الملک کے اصول واحکام کا اطلاق ترکی پر بھی مساوات کے اصول پر ہوگا۔ اس تاریخ کے بعد رفتہ رفتہ جاپان وغیرہ غیر عیسائی ممالک صریح معاہدوں کے ذریعے متمدن کے زمرے میں داخل کیے جاتے رہے۔ حالیہ جنگِ عظیم تک یہ اصول رہا کہ "متمدن" ممالک میں آپس کے برتاؤ میں تو قواعد معین ہوں گے لیکن غیر متمدن سے، جس سے مراد عملاً یہ تھا کہ جو استعمار پرست مغربی حملہ آوروں کے خلاف اپنی مدافعت کے قابل نہ ہو، سوائے صوابدید کے کسی اور اصول پر عمل کی ضرورت نہیں۔ اب مجلس اقوام متحدہ میں اصول یہ ہے کہ جس جدید امیدوار کو اقوام متحدہ کے موجود الوقت ارکان اپنی اکثریت سے قبول کریں اور اس کی مجلس تحفظ کا کوئی مستقل رکن اس کے خلاف نہ ہو تو اسے اقوام متحدہ کا رکن بنایا جا سکتا ہے، ورنہ نہیں۔ بہر حال مغرب میں اب تک کسی ملک کو اس کے اپنے حق کی بنا پر "متمدن" تسلیم نہیں کیا جاتا بلکہ یہ فریق ثانی کی مرضی پر منحصر ہے۔ اس کے برخلاف چودہ سو برس ہوئے اسلام نے اپنے آغاز ہی سے یہ اصول قرار دیا کہ ساری غیر مسلم یعنی اجنبی دنیا کے ساتھ برتاؤ کے قواعد معین ہیں۔ صوابدید یا اصول شکنی کی کسی صورت میں اجازت نہیں۔

(۲) مسلمانوں سے قبل مختلف قوموں میں اجنبیوں سے جنگ و امن کے برتاؤ کا ذکر تو ملتا ہے لیکن یہ برتاؤ علم سیاست کا جزو تھا اور نصیحت الملوک یا شہزادوں کی درسی کتابوں میں ان سے بحث ہوتی تھی۔ قانون کی کتابوں میں نہیں۔ بین الممالک تعلقات کے قواعد کا ذکر میرے علم میں اسلام سے پہلے مستقل علم کے طور پر کبھی نہیں ہوا۔ مسلمانوں نے یا تو اس پر خصوصی کتابیں لکھیں یا ان کو قانون (فقہ) کی کتابوں میں ایک باب کے طور پر درج کیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ قواعد اسلامی قانون کا جزو تھے۔ مسلمان حاکم کی صوابدید کا مسئلہ نہیں۔ غرض مسلمانوں نے اسے قانون بھی بنایا۔ بین الممالک و عالمگیر اور ایک مستقل علم بھی۔

آغاز:

یہ کہنا تو دشوار ہے کہ سب سے پہلے کس مسلمان فقیہ نے علم سیر سے بحث کی۔ صحابہ کرام کو چھوڑ بھی دیں تو علقمہ نخعی، ابراہیم نخعی، حماد، ابن سیرین وغیرہ کی کتابیں اب

Marfat.com

نہیں ملتیں۔ زید بن علی زین العابدین کی وفات ۱۲۰ھ میں ہوئی (۱۲۲ھ بھی بیان کی جاتی ہے) ان کی کتاب ''المجموع فی الفقہ'' البتہ مل گئی اور چھپ گئی ہے۔ اس میں کتاب السیر کے عنوان سے ایک خاصا طویل باب ہے اور مسلمانوں کی خانہ جنگیوں ہی سے نہیں بلکہ اجنبی غیر مسلم ممالک سے جنگ اور صلح کے قواعد سے بحث کرتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ انہی کے ہمعصر تھے، معتقد اور شاگرد بھی کہے جا سکتے ہیں۔ بنی امیہ کے آخری حکمرانوں کی ستمگری سے عاجز ہو کر انہوں نے دامے درمے سخنے قلمے انقلاب کی مدد کی۔ چنانچہ زید بن علی کی مسلح کوشش کے وقت انہوں نے بڑی رقم کا چندہ بھی دیا تھا۔ معلوم نہیں ٹھیک کس تاریخ کو بہر حال بروایت ابن حجر انہوں نے ایک مستقل ''کتاب السیر'' لکھی، جس میں علاوہ اور قواعد جنگ و امن کے، اس نکتے سے بحث تھی کہ "لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق" (حدیث: خالق کی نافرمانی کے لیے مخلوق کی اطاعت نہ کی جائے۔) یعنی بغاوت شرعی نقطۂ نظر سے کب جائز ہے؟ اس خطیر علمی رائے زنی یا فتوی پر بڑا ہنگامہ مچا۔ ایک طرف تو امام ابوحنیفہ کو عراق چھوڑ کر حرمِ حجاز میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ دوسرے ان کی کتاب کی کئی لوگوں نے تردید لکھی۔ امام اوزاعی کی کتاب اس بارے میں سب سے مشہور ہے۔ امام مالک کی ''کتاب السیر'' بھی ایسی ہی ہونی چاہیے۔ کیونکہ لکھا ہے کہ بعض وقت عشاء کی نماز کے بعد سے فجر کی نماز تک دونوں اماموں میں مسجد نبوی میں علمی مباحثہ ہوتا رہا۔ امام مالک کی کتاب اب لاپتا ہے لیکن امام اوزاعی کی کتاب کے نہ صرف اقتباسات ملتے ہیں بلکہ اس کا جواب جو امام ابو یوسف نے ''الرد علی سیر الاوزاعی'' کے نام سے لکھا تھا، وہ موجود ہے اور چھپ بھی چکا ہے۔ ان سب کے بعد امام شافعیؒ کا زمانہ آیا اور عباسی دَور میں انہوں نے اپنی کتاب الام میں اس مباحثے پر مفصل تبصرہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ اولاً ابوحنیفہ کی رائے نقل کرتے ہیں پھر اس پر اوزاعی کی تنقید پھر ابو یوسف کا جواب اور آخر میں اپنی ذاتی رائے دیتے ہیں۔ اور مسئلہ بہ مسئلہ سارے اقتباسات یا اختلافی مباحث اس طرح درج کرتے ہیں۔

اس دَور کے بعد ہمیں سِیَر پر دو طرح کا مواد ملتا ہے۔ ایک تو مستقل کتابیں مثلاً

Marfat.com

امام محمد کی ''کتاب السیر الصغیر'' اور ''کتاب السیر الکبیر'' ۔ مذکورہ بالا ائمہ کے علاوہ زفر، ابراہیم الفزاری، واقدی وغیرہ بھی اس موضوع پر کتابیں لکھتے ہیں اور اب فزاری کی کتاب کے ٹکڑے اور واقدی کے اقتباسات ملتے ہیں۔

دوسرے فقہ کی عام کتابوں میں کتاب السیر کے عنوان سے ہمیشہ ایک مستقل باب قانون بین الممالک کے متعلق نظر آتا ہے: سنی کتابوں میں بھی شیعہ اور خارجی کتابوں میں بھی۔ اور جیسا کہ اوپر اشارہ ہوا اس صورت حال کو بڑی اہمیت ہے کیونکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ مسلمان بین الممالک تعلقات کے قواعد کو اپنے قانون ملک کا جزو سمجھتے ہیں، محض صوابدید کی چیز نہیں جو حکمران اور سپہ سالار اپنی مرضی سے بدل سکیں۔ اور جب کوئی چیز قانون ملک کا جزو ہوتی ہے تو اس کی خلاف ورزی پر عدالت اور قاضی کے ہاں فریاد کی جا سکتی اور داد چاہی جا سکتی ہے، چاہے مظلوم دشمن اجنبی ہی کیوں نہ ہو قانون بین الممالک کا اتنا بلند تصور مغرب میں آج تک نہیں آ سکا ہے۔

اسلامی قانون بین الممالک کی ایک واقعاتی اہمیت یہ ہے کہ مسلمان چونکہ بحرالکاہل (Pacific) سے بحرالظلمات (Atlantic) تک صدیوں حکمران رہے اور تین براعظموں پر اپنے بے شمار غیر مسلم ہمسایوں سے برتاؤ میں انہی قواعد پر عمل کرتے رہے، اس لیے قوانین کا باہمی تاثر ناگزیر تھا۔ اسلامی قانون چونکہ زیادہ ترقی یافتہ اور انسانیت پرور تھا اس لیے اس کی تاثیر بھی زیادہ رہی۔ میں نے اپنی حقیر انگریزی تالیف (MUSLIM CONDUCT OF STATE) میں ایک مفصل باب میں اس سے بحث کی ہے کہ جدید مغربی قانون بین الممالک کس حد تک اسلامی قانون اور مسلمانوں کے طرز عمل سے ماخوذ اور متاثر ہے۔ یہاں اس اشارے پر اکتفا کرتا ہوں۔

<u>مندرجات:</u>

قانون بین الممالک کی اب دو بڑی قسمیں ہوگئی ہیں: عمومی اور خصوصی۔ عمومی میں ان قواعد سے بحث ہوتی ہے جن کے تحت ایک حکومت کے تعلقات دوسری حکومت اور اس کی رعایا سے جنگ اور امن میں جاری رہتے ہیں۔ خصوصی میں اجنبی رعایا کے

Marfat.com

تعلقات مسلمان رعایا کے ساتھ بتائے جاتے ہیں۔ اس آخرالذکر کو عباسی دور کے فقہاء نے تہارج کا نام دیا تھا۔ اسے آج کل تصادم قوانین (CONFLICT OF LAWS) کا نام بھی دیا جاتا ہے کیونکہ اس کے مباحث میں اہم تر یہ ہوتا ہے کہ فریقین مقدمہ کے اپنے اپنے قانون میں احکام مختلف ہوں تو فیصلہ کس کے قانون کے مطابق کیا جائے؟ اسلامی قانون میں نکاح ایک معاہدہ ہے اور (طلاق کے ذریعے سے) قابلِ تنسیخ مگر عیسائی مذہب کے لحاظ سے نکاح ایک مقدس فعل (SACRAMENT) اور ناقابلِ تنسیخ چیز ہے لہٰذا ایک عیسائی کنبے کے مرد کے مسلمان ہو جانے کی صورت میں اگر نومسلم شوہر طلاق دے تو اس کے مقدمے کا فیصلہ کس فریق کے قانون کے مطابق کیا جائے؟ بہرحال تفصیلوں میں گئے بغیر عرض کرنا ہے کہ قدیم اسلامی کتب سِیَر میں عمومی اور خصوصی دونوں قسم کے قانون ہائے بین الممالک کا یکجا ذکر ہوتا رہا ہے۔

اساس:

اپنوں سے کسی ملک میں قانون ملک کے مطابق برتاؤ ہوتا ہے۔ صرف پرایوں کے لیے سِیَر کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن کسے اپنا اور کسے پرایا قرار دیں، اس بارے میں ہر تمدن کا اصول الگ رہا ہے۔ اوپر تمہید میں اس کی تاریخ اور ارتقا بیان ہوا۔ آج کل مغرب میں زیادہ تر جغرافی یعنی سیاسی قومیت کارفرما ہے نسل زبان اور مذہب کو قانوناً کم ہی اہمیت ہے۔ جمہوریہ جنوبی افریقہ میں نسلی یا رنگی قومیت ہے کالی رعایا درجۂ دوم کے شہری قرار دیے گئے ہیں۔ جمہوریۂ اسرائیل میں نسلی قومیت براج رہی ہے۔ عیسائی اہل ملک درجہ دوم کی اور مسلمان اہل ملک درجہ سوم کی رعیت ہیں اور یہودی چاہے دنیا کے کسی ملک میں رہتے ہوں، خود بخود اسرائیل کی رعیت بھی سمجھے جاتے ہیں گویا ان اجنبی یہودیوں کو مرکب یا دُہری قومیت حاصل ہوتی ہے۔ روس میں صرف اشتراکی درجہ اول کی رعیت ہیں اور ذمہ داری کے عہدوں پر فائز ہو سکتے ہیں (پارلیمنٹ کی رکنیت ہو کہ وزارت کسی غیر اشتراکی رعیت کو نہیں دی جا سکتی)۔ غیر اشتراکی باشندگانِ ملک خاص کر مسلمانوں کو اپنے مذہبی قانون پر عمل کی اجازت نہیں۔

Marfat.com

اس کے برخلاف مسلمان فقہاء نے اپنے دورِ عروج میں مطمح نظر (آئڈیالوجی) کو سیاسی و ملی ربط کا اصول قرار دیا۔ یعنی سارے مسلمان ایک قوم ہیں اور سارے غیر مسلم ایک دوسری قوم، لیکن مسلمان اپنے قانون پر اور غیر مسلم اپنے اپنے قانون پر عمل کریں۔ نتیجہ یہ ہے کہ سِیَر (قانون بین الممالک) کی کتابوں میں مسلمانوں نے ''اپنوں'' سے بحث صرف بغاوت اور خانہ جنگی کی صورت میں کی اور ''پرایوں'' میں نہ صرف اجنبی غیر مسلم سلطنتوں اور ان کی رعایا سے بحث کی بلکہ خود اسلامی مملکت کی غیر مسلم رعایا (ذمیوں) سے بھی۔

اس میں غیر مسلموں کا فائدہ ہی فائدہ ہے کیونکہ قرآن مجید کے صریح احکام کے تحت ہر مذہبی گروہ کو قانونی، دینی اور سماجی امور کی حد تک خودمختار رہنے کا حق ہے۔ دو عیسائیوں میں دیوانی یا فوجداری جھگڑا ہوتو "ولیحکم أهل الانجیل بما أنزل اللّٰه فیه" (المائدہ:۴۶) کے تحت ان کا مقدمہ اسلامی مملکت کی عیسائی عدالت میں عیسائی جج کے سامنے اور عیسائی قانون کے مطابق چلتا ہے۔ اسلامی قانون کا ان پر اطلاق نہیں ہوتا۔ یہی حال ہر مذہبی گروہ یہودی اور پارسی وغیرہ کا ہے۔ عیسائیوں میں فرقہ پرستی اور ان میں کثیر باہمی اختلاف کی بنا پر خلافت راشدہ میں یہ حل نکالا گیا کہ خصوصی فرقہ وار عدالتوں کی جگہ ہر فرقے کے پادریوں اور کلیساؤں کو عدالتی اختیار بھی دے دیے جائیں۔ (اگر فریقین مقدمہ مختلف مذہبوں یا ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں کے ہوں تو فریقین ہی یہ طے کرتے ہیں کہ کس ثالث سے رجوع کریں۔ عموماً مسلمان کا انتخاب ہوتا رہا ہوگا۔)

اسلام تبلیغی مذہب تو ہے لیکن دین قبول کرنے میں جبر واکراہ کو قرآن نے ممنوع قرار دیا ہے۔ غیر مسلموں کے لیے ذمی (یعنی زیر حفاظت اور ذمہ داری سے مستفید شخص) کا نام بے معنی نہیں۔ انہیں اپنے دین اور اپنے تمدن سے استفادے کی آزادی رہتی ہے۔ مسائل قانونِ شخصی، نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ کے ہوں، یا سماجی و معاہداتی، ان پر اسلامی قانون عائد نہیں کیا جاتا۔ سِیَر میں چونکہ اجنبیوں سے بحث ہوتی ہے، اس لیے ذمیوں کو ناگزیر اس کا موضوع قرار دیا گیا اور یہ صراحت کی گئی کہ بیرون

Marfat.com

سے سیاحت وغیرہ کے لیے آنے والے اجنبی بھی اپنے ہم مذہب ذمیوں میں داخل شمار کیے جائیں گے۔ مزید برآں ادنیٰ ملازمت سے لے کر وزارت تنفیذ تک سارے ہی عہدے غیر مسلموں کے لیے کھلے ہوئے ہیں جیسا کہ ماوردی، ابویعلی الفراء وغیرہ نے صراحت کی ہے۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بن امیہ ضمری کو سفیر بنا کر حبشہ بھیجا تھا۔'' اور وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔''

اس فراخدلی اور رواداری کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی مملکتوں میں غیر مسلم رعایا کی بغاوتیں (ترکی میں مغربی تصور قومیت آنے سے قبل تک) تقریباً ناپید رہیں۔ خلافتِ راشدہ کی برق آسا فتوحات نے ۲۶ ھ میں اسلامی فوجوں کو ایشیا، افریقہ اور یورپ کے تین براعظموں پر پہنچا دیا تو اس وقت مسلمان اقلیت ہی میں نہیں، آبادی میں اقل قلیل تھے۔ اس کے دس سال بعد حضرت عثمانؓ کی شہادت کے سلسلے میں خانہ جنگی شروع ہوئی اور سالہا سال جاری رہی لیکن اس اثنا میں نہ سابق بیزنطینی (رومی) رعایا نے بغاوت کر کے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی اور نہ سابق ایرانی یا کسی اور رعایا نے۔ بلکہ بہ اتفاق مؤرخین یہ ذمی مسلمانوں کی ماتحتی کو اپنے سابق ہم مذہبوں کی حکومت پر ترجیح دیتے رہے یہی حال علی العموم اموی اور عباسی دَور کا رہا۔ اس کا راز یہی معلوم ہوتا ہے کہ ذمیوں کو کامل داخلی خودمختاری حاصل رہی: عبادت وضمیر کی بھی اور ثقافت اور عدل گستری کی بھی۔

شاید یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مغربی تصور قومیت میں بنی نوع آدم کا تشتت ہی روز افزوں ہوتا ہے۔ اسلامی تصور قومیت مین متشتت و متفرق اجزاء کے روز افزوں توحد کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

ماخذِ احکام:

سِیَر چونکہ فقہ کا ایک باب اور ایک جزو ہے، اس لیے اسلامی قواعدِ سِیَر کے ماخذ اولاً وہی ہوں گے، جو فقہ کے ہیں۔ یعنی قرآن وسنت نیز اجتماعی یا انفرادی آراءِ فقہاء۔ لیکن عہدِ نبویؐ ہی سے اس سلسلے میں بین الممالک معاہدات کو ایک جائز اور واجب

Marfat.com

التعمیل ماخذ تسلیم کر لیا گیا (مثلاً صلح نامۂ حدیبیہ) ایسا ماخذ صرف فریقین معاہدہ میں کارفرما رہتا ہے اور صرف اس وقت تک جبکہ معاہدہ نافذ رہے دیگر ممالک و اوقات کے لیے وہ ایک نظیر کا کام دیتا ہے۔

ایک اور ماخذ متقابل اثر (RECIPROCITY) ہے۔ مثلاً حضرت عمرؓ کا حکم سرحدی چنگی کے افسروں کے نام کہ غیر ممالک کے تاجر جو کچھ درآمد کریں تو ان سے اسی شرح پر چنگی وصول کی جائے جس شرح پر ان تاجروں کے وطن میں مسلمان تاجروں سے وصول کی جاتی ہے۔ امام محمدؒ نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کسی اجنبی ملک میں مسلمان تاجروں یا عورتوں پر چنگی معاف ہو تو مماثل برتاؤ وہاں کے تاجروں سے اسلامی سرزمین میں کیا جائے گا۔ اسی طرح استیمان (ویزا) کے قواعد بھی مساوات اور تقابل کی اساس پر مبنی رہے۔

مزید تفصیلوں میں گئے بغیر عرض کرنا یہ ہے کہ اس طرح اسلامی سیَر ایک منجمد اور غیر ترقی پذیر نظام بن جانے کی جگہ نشوونما پانے اور ہر زمانے کی ضرورتوں کا ساتھ دینے کے قابل رہتا ہے اور فقہاء خذ ما صفا دع ما کدر پر عمل کر سکتے ہیں۔

مؤیدہ یا قوت نافذہ (SANCTIONS)

حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے نام ہدایت نامے میں کیا خوب کہا ہے کہ "لا ینفع تکلم بحق لا نفاذله" (اس حق سے فائدہ ہی کیا جو نافذ نہ کیا جا سکے)۔ دیگر قوانین کی طرح سیَر سے بھی حقوق اور واجبات دونوں پیدا ہوتے ہیں۔ فریق ثانی یعنی غیر مسلم مملکت کے نظام سے یہاں بحث نہیں۔ بتانا صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں خاص کر سیَر کا نفاذ کن تہدیدات کے تحت ہوتا ہے۔

قانون کے نفاذ کے لیے حکومت کی مادی قوت مکرر پہلی چیز ہے۔ پولیس، فوج اور دیگر مادی وسائل اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ جب کوئی متضرر اسلامی عدالت سے رجوع ہوتا ہے تو وہ فریقین کو حاضر ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ سماعت کے بعد فیصلہ کرتی اور اپنے حدود اختیار (اسلامی مملکت) کے اندر اس کا نفاذ کرتی ہے۔ چاہے یہ فیصلہ

Marfat.com

مسلمان کے حق میں ہوا ہو یا غیر مسلم دشمن کے۔ نفاذ پر آمادہ یا مجبور کرنے والی دوسری چیز خدا اور عذابِ آخرت کا خوف ہے۔

صرف ایک مادی وسیلے کے مقابلے میں یہ مادی اور روحانی دوگونہ مؤیدہ، ظاہر ہے کہ زیادہ مؤثر ہے۔ اب زمانۂ حال میں اخبارات کے باعث دنیا میں فضیحت رائے عامہ کی طرف سے تفضیح اور مماثل امور کو بھی روز افزوں اہمیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ بین الاقوامی عدالت انصاف ابھی طفولیت میں ہے۔ عدالت حقوق انسانی بے بس بھی ہے اور نااہلوں کے ہاتھ میں بھی ہے۔ مجلس اقوام متحدہ کو اس کے دستور نے معطل بنا رکھا ہے۔ لیکن ان ننھی منی چیزوں میں چاہے مسلمان مملکتیں شریک ہوں، ان کی ایجاد کا سہرا ان کے سر نہیں۔

قانون بین الممالک کے احکام تین حصوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں: حالتِ امن، حالتِ جنگ اور حالتِ غیر جانب داری۔ یہاں چند اشاروں پر اکتفا کے سوا چارہ نہیں۔

خودمختاری اور اقتدارِ اعلیٰ (INDEPENDENCE AND SOVEREIGNTY)

غیر محدود آزادی کا دنیا میں وجود نہیں۔ کچھ قدرتی پابندیاں ہیں: بچہ کتنا ہی چلائے، ماں چاند کو توڑ کر اس کے ہاتھ میں نہیں دے سکتی۔ کچھ پابندیاں غیروں کے مماثل حق سے پیدا ہوتی ہیں: میرے لیے بے شک یہ ممکن ہے کہ جسے چاہوں قتل کروں، جس کا مال چاہوں چھینوں۔ لیکن اتنا ہی امکان ہر دوسرے شخص کو بھی میرے خلاف پایا جاتا ہے۔ مجبوراً یہ پابندی گوارا کرنی پڑتی ہے کہ نہ میں کسی شخص کو قتل کر سکوں اور نہ کوئی دوسرا مجھے۔ ان اصول کا اطلاق افراد ہی کی طرح مملکتوں پر بھی ہوتا ہے۔

مذکورہ قدرتی اور باہمی مفاد کی پابندیوں کے سوا معاہداتی پابندیاں بھی حکومتیں قبول کرتی ہیں کبھی خوشی سے اور کبھی مجبوراً۔ ان سارے امور کا اطلاق بلاتفریق مذہب و ملت ساری انسانی حکومتوں پر ہوتا ہے۔

اصولاً دنیا میں صرف ایک اسلامی مملکت ہونی چاہیے۔ جب سب کا کعبہ اور

قرآن ایک ہے تو خلیفہ یا امام بھی ایک ہونا چاہیے۔ لیکن اس کا امکان نظر آتا ہے کہ ایک سے زائد اسلامی مملکتیں وقت واحد میں پائی جائیں۔ مثلاً صحیح بخاری میں ذکر ہے کہ جب نجاشی کی وفات کی اطلاع آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ یعنی وہ مسلمان تھا لیکن وہ اپنے ملک میں عملاً خودمختار بھی تھا۔ چاہے وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا دینی ہی نہیں دنیوی پیشوا بھی مانتا ہو لیکن حبشہ کے نظم ونسق کے لیے مدینے سے احکام بھیجے جانے کا پتا نہیں چلتا۔

نیم خودمختار مملکتیں بھی عہد نبویؐ میں نظر آتی ہیں۔ عمان (جنوب مشرقی عرب) میں جلندی کے دو بیٹوں جیفر اور عبد کی مشترکہ حکمرانی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خط لکھا کہ اگر مسلمان ہوئے تو انہیں ان کی بادشاہت پر برقرار رکھا جائے گا، ورنہ ان کے علاقے پر قبضہ کر لیا جائے گا۔ دونوں مسلمان ہو گئے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ہاں حضرت عمرو بن العاص کو بھیجا۔ (جنہیں ایک طرح مقیم سیاسی نمائندہ یا رزیڈنٹ کہا جا سکتا ہے) اور مؤرخ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں سے زکوٰۃ کی وصولی اور اسلامی مقدمات کا فیصلہ حضرت عمرو بن العاص سے متعلق تھے۔ باقی سارے امور میں جیفر وعبد خودمختار تھے۔

ایک سے زائد خودمختار مملکتیں خانہ جنگی کے ذریعے مسلمانوں میں بطور امر واقعہ پہلی صدی ہجری ہی میں وجود میں آ گئیں۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت اور حضرت معاویہ کے زمانے کے عام الجماعۃ (اتحاد کے سال) کے مابین سال ہا سال تک عملاً دو اسلامی مملکتیں رہیں۔ اس کے بعد اموی دور میں حضرت عبداللہ بن الزبیر کی حجازی حکومت بھی قابل ذکر ہے۔ بعد ازاں عباسیوں کی آمد پر اندلس مستقلاً الگ ہو گیا۔ رفتہ رفتہ خودمختار اسلامی مملکتیں روز افزوں ہوتی چلی گئیں۔ مجبوری کا کیا علاج؟ عباسی دور کے مختار فقہاء نے بالآخر فتویٰ ہی دے دیا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔

اتحاد اسلامی کا جذبہ عوام و خواص میں اب بھی برقرار ہے، لیکن ایک فردی خلافت اب ذرا دیر طلب نظر آتی ہے۔ البتہ ایسی مجلس خلافت کے ارکان اسلامی مملکتوں کے صدر ہوں نسبتاً آسان حل ہے اور اس میں سب کا فائدہ ہی نظر آتا ہے،

Marfat.com

نقصان کسی کا نہیں۔

اختیار سماعت (JURISDICTION)

اس سلسلے میں ذمیوں کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ نیز اس کا بھی کہ اجنبی مسافروں پر مسلمانوں کے قانون کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ ان کے ہم مذہب ذمیوں کے قانون کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت بھی قابلِ ذکر ہے کہ اسلامی تصورِ انصاف کے تحت ادنیٰ و اعلیٰ میں کوئی فرق نہیں حتیٰ کہ صدر مملکت بھی معمولی عدالت کے ماتحت سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ خلفاء راشدین کے دور سے لے کر ہمارے زمانے تک کے مسلمان حکمران کو ضرورت پر خود اس کی اپنی مملکت میں قاضی کے سامنے جواب دہی کے لیے آنا ایک معمولی واقعہ رہا ہے۔ غیر ملکی مہمان حکمران یا سفیر کی عزت تو کی جاتی ہے لیکن ان کا قانون سے بالا ہونا اسلامی نظامِ عدل گستری میں تسلیم نہیں کیا جاتا۔ (اگرچہ وہ آج مغربی قانون بین الممالک کے مسلمات میں شامل سمجھا جاتا ہے۔)

سفارت:

ماقبل تاریخ زمانے سے انسانی سماج میں پیام رساں پائے جاتے ہیں، لیکن مستقل سفیروں کا آغاز بہ ظاہر مسلمانوں ہی کے ہاں سب سے پہلے ہوا اور یورپ میں اس کے کوئی دو سو سال بعد۔ جیسا کہ امیر علی نے (HIST. OF SARACENS) میں لکھا ہے۔ خلیفہ بغداد کے مستقل نمائندے "خود مختار" صوبوں کے موروثی والیوں کے دربار میں اور ان والیوں کے کارندے بغداد میں رہا کرتے تھے۔

سفارت کے ذریعے معاہدے بھی ہوا کرتے ہیں۔ اس بارے میں عیسائی اور اسلامی تصور میں بنیادی فرق ہے۔ پوپوں نے خاص کر پوپ چوتھے نکولاس نے فتویٰ دے رکھا ہے کہ غیر مذہب والوں سے جو وعدہ یا اقرار کیا گیا ہو، اس کی پابندی عیسائی پر واجب نہیں۔ اسلام (قرآن) نے اس کے برعکس وعدے کی پابندی اور معاہدے کی تعمیل کو ہر کسی کے ساتھ لازمی اور واجبی چیز قرار دیا اور عہد شکنی پر گناہ اور عذاب آخرت سے بھی ڈرایا ہے۔ ایک مشہور حدیث میں تو یہاں تک حکم ہے کہ "وفاء بغدر خیر

Marfat.com

من عذر بغدر'' (دوسرے کی غداری کے باوجود عہد کا وفا کرنا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ غداری کا جواب غداری سے دیا جائے)۔

جنگ:

قانونِ جنگ ایک طویل داستان ہے۔ بعض پرانے مسلمان مؤلفوں نے اسے دوا قرار دیا ہے اور سماج کی بیماریوں کا آخری علاج۔ اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ تعدی اور حد سے تجاوز عمل میں نہ آئے اور قتل و خونریزی ناگزیر حد تک روا ہے۔ عہد نبوی میں دفائی اور پیش بندی کی صرف دو طرح کی جنگوں کا پتا چلتا ہے اور دشمن کو بھی اسلام قبول کرنے پر سارے گزشتہ جرائم سے معاف کر دیا جاتا ہے لیکن چند ذیلی تفصیلیں بے محل نہ ہوں گی۔

اعلان جنگ ضروری ہے۔ ممکن ہو تو ہر لڑائی کے آغاز پر دعوتِ اسلام دی جائے جنگ کا اثر سابقہ واجبات پر نہیں پڑتا۔ مثلاً حالتِ امن میں کوئی اجنبی ہمارے ملک میں آئے اور اس کے اثناء قیام میں اس کے ملک سے جنگ چھڑ جائے تو اس کی چاہے نگرانی کی جائے لیکن نہ اس کو قتل و قید کیا جا سکتا ہے اور نہ اپنے وطن واپسی سے روکا جا سکتا ہے۔ ایسی واپسی کے وقت وہ اپنی ساری دولت اور جائداد بھی ساتھ لے جا سکتا ہے۔ اسی طرح ایک حدیث (السیف محاءٌ للذنوب الا الدین) کے مطابق اجنبی کے واجب الادا قرضے اسے جنگ چھڑنے کے باوجود منسوخ نہیں ہوتے۔ مال غنیمت انفرادی سپاہی کا حق نہیں ہوتا بلکہ ساری غنیمت یکجا کی جاتی ہے اور ساری فوج کو اس میں حصہ دلایا جاتا ہے۔ (سپہ سالار اور سپاہی کے حصے برابر ہوتے ہیں) حتیٰ کہ ان سپاہیوں کو بھی جو لشکر میں تو تھے لیکن لوٹ یا لڑائی میں شریک نہ ہوئے۔ ایک صحیح حدیث قابل ذکر ہے۔ کسی صحابی نے پوچھا کہ بعض لوگ اپنی بہادری کے دکھاوے کے لیے جنگ کرتے ہیں۔ بعض قومی عصبیت کے تحت وغیرہ۔ ان میں کون خدا کی راہ میں جنگ کرتا سمجھا جائے گا؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ''صرف وہ جس کی غرض یہ ہو کہ خدا کا بول بالا ہو۔'' (من قاتل لتکون کلمة اللہ ھی العلیا۔)

یہ امر قابل ذکر ہے کہ اگر کوئی نبی خود جنگ کی نگرانی نہ کرے بلکہ دنیا دار اور بے دین بادشاہوں پر چھوڑ دے تو جنگ میں انسانیت پیدا نہیں ہوسکتی۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے سپہ سالاری بھی فرمائی اور ایسا نمونہ بھی چھوڑا جو مسلمان بادشاہوں کے لیے واجب العمل ہے اور ساتھ ہی انسانیت پرور بھی۔

غیر جانب داری:

آج کل عربی مؤلف اسے حیاد کہنے لگے ہیں۔ قبل اسلام کی عربی میں نیز قرآن وحدیث میں اس کے لیے اعتزال کی اصطلاح برتی گئی ہے۔ غیر جانبداری جب چاہے ختم کر کے جنگ میں شرکت تو کی جاسکتی ہے لیکن کوئی جنگ سابقہ معاہدے کی منسوخی کے اعلان اور فریق ثانی کو اطلاع دیے بغیر شروع نہیں کی جاسکتی اور جب تک غیر جانبدار رہیں، غیر جانبداری کرنی چاہیے۔ قرآن مجید میں تو ''معاہدہ کیے ہوئے'' ملک میں مسلمانوں پر ظلم ہو تو بھی غیر جانبداری کے زمانے میں غیر جانبدار رہنے کا عجیب وغریب حکم ملتا ہے۔

مشتے نمونہ زخروارے۔

(ماہنامہ فکر ونظر۔ راولپنڈی۔ مئی ۱۹۶۸ء)

علمِ قانون میں مسلمانوں کا حصہ

تمہید:

اگر ''قانون'' کے معنے طرزِ عمل کے طریقے کے ہیں تو قانون تقریباً اتنا ہی قدیم ہوگا جتنی خود انسانیت۔ انسان ایک طرف اپنے ذاتی تجربوں کو یاد رکھتا ہے اور ان سے فائدہ اٹھاتا ہے، اور دوسری طرف ''تاریخ'' کی مدد سے پرانے لوگوں کے تجربوں کا خود تجربہ کرتا اور مفید نظر آنے والے پرانے تجربوں کو اپنا لیتا ہے۔ یہ چیز اور شعبوں کی طرح قانون میں بھی ہونی چاہیئے۔

قانون اپنی اوّلین اور ابتدائی حالت میں ''عادت'' کی شکل میں رہا ہوگا، یعنی خود ساختہ قاعدہ، کسی بزرگ (باپ، استاد، قبیلے کے سردار، مجلس شوریٰ وغیرہ) کے احکام۔ ان میں جبر، تہدید اور خلاف ورزی پر سزا کے عناصر بعد میں آئے ہوں گے۔

اسلام بعثتِ نبوی پر (دسمبر ۶۰۹ء سے) شروع ہوا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تیئیس سالہ تبلیغی زندگی (۱۳ق ھ تا ۱۱ھ/مطابق ۶۰۹ء تا ۶۳۲ء) اساسی تشریع کا زمانہ ہے۔ اس کے بعد سے اب تک چودہ سو سال سے ذیلی تشریع یا توسیع کا زمانہ ہے جو جاری ہے۔ مسلمان فقہا میں اختلافات بھی پیدا ہوئے ہیں اور مر جانے اور ختم ہو جانے کی جگہ، اسلامی قانون کی نشاۃِ ثانیہ ہی ہوتی نظر آ رہی ہے کیونکہ تقابلی مطالعہ بتا رہا ہے کہ مسلمانوں کی قانونی میراث اوروں سے بہتر نہیں تو کسی سے کم بھی نہیں ہے۔

قانون دنیا کے ہر ملک میں ہر زمانے میں ملتا ہے۔ دیگر حیوانات کا طرزِ عمل زمان و مکان کے فرق سے نہیں بدلتا، لیکن انسانی فطرت کے باعث انسانوں کے طرزِ عمل میں یکسانی کی جگہ بہ کثرت اختلاف پایا جاتا ہے۔ دو ملکوں نہیں ایک ہی ملک میں، دو قوموں نہیں ایک ہی قوم میں، دو زمانوں میں بھی نہیں معاصرین میں بھی یک رائی کی جگہ انفرادیت اور باہم اختلاف رائے سے دوچار ہوتے ہیں، اور کہہ سکتے ہیں کہ انسان ''اپنے ہم جنسوں سے اختلاف رکھنے والے جانور'' کا نام ہے۔ بلکہ خود ایک انسان کی اپنی رائے بھی وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی ہے۔

ان حالات میں ہمارے موضوع پر کچھ بیان کرنا آسان نہیں۔ لیکن اس تنوع میں کچھ نہ کچھ توحدّ بھی ملتا ہے اور اسی پر آج کچھ گفتگو کی جا سکتی ہے۔

قانون کا مفہوم مختلف قوموں میں:

اگر آج کل معاصر مغربی قوموں میں قانون اور اخلاق میں فرق کیا جاتا ہے تو ہمارے اسلاف نے بھی کم و بیش یہی مفہوم ''فتویٰ'' اور ''تقویٰ'' کے نام سے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس امتیاز کے اسباب کچھ تو داخلی اور اساسی ہیں اور کچھ تاریخی اور عارضی۔ مختلف انسانوں کی افتادِ طبع کے فرق کو بھی اس میں دخل ہے۔ اسی لیے درجۂ تعبدیت IMPERATIVENESS اور لزوم میں فرق ہوتا ہے۔

غالباً قدیم زمانے میں ساری ہی دیندار قوموں میں قانون کو ایک الہامی چیز مانا جاتا تھا۔ نبی یا پیغمبر اس کو امت تک پہنچاتا اور پھر عبادت گاہ میں فریضہ انجام دینے والے مذہبی افسر اس کی تعبیر و تشریح کے مجاز سمجھے جاتے، بلکہ نفاذ بھی انہی سے متعلق ہوتا۔

یہودیوں میں شروع میں ایسا ہی تھا، لیکن اشموئیل (ساموئیل) پیغمبر کے زمانے میں پیغمبر کی موجودگی ہی میں ساول کو جنگی ضرورتوں سے طالوت (بادشاہ) بنایا گیا، اور اس طرح دین و دولت یعنی روحانی مسائل اور دنیوی بادشاہت میں فرق ہو گیا۔ (دیکھو عہد قدیم، کتاب ساموئیل اوّل، باب ۸ مابعد)۔

Marfat.com

حضرت عیسیٰ جس وقت فلسطین میں پیدا ہوئے تو وہاں بت پرست رومیوں کا قبضہ تھا۔ یہودی وہاں نہ صرف محکوم تھے بلکہ معتوب بھی۔ غالباً اسی لیے حضرت عیسیٰ نے جب اپنے دین کی تبلیغ شروع فرمائی تو ایک طرف (انجیل لوقا ۲۵/۴۰ کے مطابق) یہ فرمایا کہ "خدا کی چیز خدا کو، اور قیصر کی چیز قیصر کو دو" (جو دین و دنیا کی تفریق ہی کے معنے رکھتا نظر آتا ہے)، اور ساتھ ہی اپنے فرستادہ مبلغوں (حواریوں) کو (انجیل متی ۱۰/۶، ۱۵/۲۴ میں) تاکید بھی فرمائی کہ "میں صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لیے مبعوث ہوا ہوں" اور یہ کہ "وہ غیر یہودی لوگوں میں تبلیغ کے لیے نہ جائیں"۔ نیز یہ کہ (انجیل متی ۵/ ۱۸ تا ۱۹) "میں توریت کو منسوخ کرنے کے لیے نہیں آیا ہوں، اس کا ایک شوشہ تک نہیں بدلا جا سکتا"۔ اگرچہ حضرت عیسیٰ کے آسمان پر جانے کے چھ ہی سال بعد سینٹ پال وغیرہ چند لوگوں نے اس صریح حکم کو منسوخ قرار دیا، (عہد جدید، احکام حوارین، ۱۵/ ۲۸-۲۹)، لیکن اسے تین سو سال لگے کہ کوئی بادشاہ اس عیسائی دین کو قبول کرے۔ جب روما کا بادشاہ قسطنطین عیسائیت کو قبول کرتا ہے تو اسی شہر میں عیسائیوں کا دینی پیشوا پوپ بھی رہتا تھا۔ نہ پوپ نے اب دینی پیشوائی بادشاہ کے سپرد کرنی چاہی، اور نہ بادشاہ اپنی بادشاہت پوپ کو نذر کرنے پر آمادہ ہوا۔ خانہ جنگی تو نہ ہوئی، تقسیم عمل سے کام بن گیا، اور وہی اب تک چلا آ رہا ہے۔

ایران میں زردشت کا، چین میں کنفوشیوس کا، ہندوستان میں ویدوں، پرانوں کے لانے والے اہلِ دین کا مذہب ان کے جیتے جی ایک حد تک قبول بھی ہوا اور ان لوگوں کو مشیر بنایا بھی گیا تو خود ان کو بادشاہ اور حکمران بننے کا موقع نہ ملا۔ ہندوستان میں گوتم بدھ نے تو ولی عہدی پر لات مار کر زہد اور ترک دنیا کو ترجیح دی۔ اس کے برخلاف رسول اکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف خدائی احکام امت تک پہنچائے اور قرآن مجید کو کتابی صورت میں محفوظ کرنے کا انتظام کیا، بلکہ ایک مملکت بھی قائم فرمائی اور خود ہی اسے چلا کر نمونہ بھی چھوڑا (اور متاخر یہودی پیغمبروں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کی طرح) آپ نبی بھی رہے اور ساتھ ہی بادشاہ بھی کہ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری۔ آپ کی وفات کے بعد خلفاء راشدین اور ان کے جانشینوں میں کبھی

Marfat.com

دین اور دنیا کے لیے خانہ جنگی اور جھگڑے کا سوال پیدا نہ ہوا، اور سارا اسلام، چاہے دین ہو یا دنیا، ایک ہی افسر کے سپرد ہوتا رہا۔ عقائد، عبادات اخلاق تصوفی طریقت، معاملات، عقوبات، وراثت، ساری چیزوں کا ماخذ بھی ایک تھا (یعنی قرآن و حدیث) اور نگرانی و نفاذ بھی ایک ہی شخص (خلیفے) سے متعلق تھے۔ (اس فہرست میں طریقت کو دیکھ کر آدمی چوکنا نہ ہو۔ صوفی سلسلوں میں حضرت ابو بکر اور حضرت علی کے ناموں سے کون واقف نہیں؟ اور یہ خلیفہ بھی رہے ہیں)۔

احکام میں درجہ بندی:

لیکن جیسا کہ اوپر اشارہ ہوا، احکام میں درجہ بندی کی ضرورت ہے۔ خیر و شر میں فرق، اور معروف و منکر میں امتیاز ناگزیر تھا، ایک کو کرنے کے لیے اور دوسرے کو اجتناب کے لیے اس سے پنجگانہ تقسیم ہوئی:

پہلا قابل امر ذکر یہ ہے کہ خیر و شر سابق میں فلسفیانہ مفہوم اور نظری چیز تھے تو قرآن نے ان کو قانونی اور عملی چیز بنا دیا، اور ان کو ''معروف'' و ''منکر'' کے معنی خیز نام بھی دیے۔ ''معروف'' کہتے ہیں اس چیز کو جسے ہر شخص جانتا اور اس کا اچھا ہونا مانتا، اور عقلاً بھی سمجھتا ہے کہ ویسا ہی کرنا چاہیے، اور منکر یا غیر معروف چیز وہ ہوتی ہے جسے کوئی نہیں کرتا، اور نہ کرنے دیتا ہے۔ گویا خیر و شر خدا کی ''من مانی'' تقدیر ہی نہیں ہیں، بلکہ وہ انسانی عقلیت کے مطابق اور موزوں و مناسب بھی ہیں۔

مسلمان فقہا نے دیکھا کہ سارے اسلامی احکام کو اس معیارِ معروف و منکر پر جانچیں تو وہ پانچ قسموں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ خیرِ محض تو صرف اللہ کی ذات پاک ہے، اور شر محض کا دنیا میں کوئی وجود نہیں (خود شیطان بھی شر محض نہیں، کیونکہ انسان کے آزمانے کے لیے خدا نے اسے پیدا کیا ہے)۔ خیر اور شر ایک اضافی چیز ہیں، یعنی ان میں زیادتی اور کمی کا امکان ہے۔ اس لیے اگر کسی قانون قاعدے میں خیر ہی خیر نظر آتا ہو تو وہ واجب العمل ہوگا۔ اور اگر شر ہی شر نظر آتا ہو تو وہ حرام اور ممنوع ہوگا۔ اگر اس میں خیر غالب نظر آئے تو وہ مستحب اور پسندیدہ سمجھا جائے گا، چاہے لازم نہ قرار دیا جا

سکتا ہو۔ اور اگر شر غالب نظر آئے چاہے اس میں کچھ خیر بھی ہو تو اسے مکروہ اور ناپسندیدہ سمجھا جائے گا۔ لیکن کسی چیز میں نہ خیر نظر آئے نہ شر، یا خیر اور شر برابر کے ہوں تو اسے مباح قرار دیا جائے گا کہ جو شخص چاہے کرے یا نہ کرے، یا کبھی کرے اور کبھی نہ کرے۔ احکام اور قواعد کو خیر و شر کی اساس پر واجب، مستحب، مباح، مکروہ اور حرام کی پنجگانہ تقسیم۔ یہ ہے وہ جدّت جو مسلمانوں نے قانون کے متعلق کی، اور جو ان سے پہلے کسی کے ذہن میں نہ آئی تھی۔ یہ اساسی تقسیم ہے، جس طرح قطب نما میں شمال، جنوب، مشرق، مغرب کے چار جہت۔ پھر جس طرح ذیلی جہتیں نکل سکتی ہیں، اور شمال مشرق، وغیرہ دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح واجب اور مباح، نیز حرام اور مباح کے درمیان بہت سے درجے پیدا ہو سکتے ہیں، مثلاً سنت، سنت موکدہ وغیرہ ایک طرف، اور مکروہ تحریمی، مکروہ تنزیہی وغیرہ دوسری طرف۔ صرف ظاہری تعمیل اور ظاہری و باطنی کامل تعمیل کے فرق سے ''فتویٰ'' اور ''تقویٰ'' کا لطیف و نفیس فرق بھی پیدا ہوا کہ انسانی حاکم صرف ظاہر کو دیکھ سکتا ہے، باطن کو بھی دیکھنا اللہ کا اختصاص ہے۔

ظاہر و باطن کے اس فرق کو نیت سے بھی تعلق ہے۔ اور شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ حدیث شریف "انما الاعمال بالنیات" (سارے کام نیتوں پر مبنی ہوتے ہیں) بھی ایک اہم قانونی جدّت تھی۔ اور نظاموں میں اس کا کم پتا چلتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ۱۸۵۶ء کے جوڈیکچر ایکٹ کے نافذ کیے جانے تک انگلستان جیسے متمدن ملک میں جہاز، درخت، دیوار، جانور وغیرہ بھی ذمہ دار شخص سمجھے جاتے تھے، اور اگر ان میں سے کسی کے باعث حادثے میں انسانی جان تلف ہوتی تو ان غیر ذوی العقول چیزوں کو بھی سزا دی جاتی۔ مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت فرما دی ہے کہ 'العجماء جُبار''، غیر ذوی العقول اشیاء پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

انسانی معاشرے میں ابتداءً جبر کا امکان نہ تھا، اور مظلوم کو اپنی ذاتی قوت اور اپنے ذاتی وسائل کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ سلطنتوں اور حکومتوں کا زمانہ آیا تو حاکم کی قوت اور ظالم محکوم کے اضافی ضعف کا لحاظ رکھتے ہوئے ظالم سے انصاف کرایا جاتا۔ اور ملک کی پولیس اور فوج حاکم عدالت کی مدد کرتیں لیکن اس نظام میں، جواب تک ہر

Marfat.com

جگہ جاری ہے، خاص کر دو کوتاہیاں ہیں: ایک تو ظالم کا اتنا قوی ہونا کہ کسی نہ کسی وجہ سے عدالت اپنے فیصلے کی تعمیل نہ کرا سکے، مثلاً نظم ونسق کے بڑے افسروں یا حکمران کے قریبی رشتہ داروں کے خلاف۔ دوسری کوتاہی یہ ہے کہ اگر جرم کو اتنے مخفی طور پر کیا جائے کہ عدالت کو اس کا پتا ہی نہ چل سکے۔ اسلام نے پولیس وفوج کا نظام بھی برقرار رکھا اور اس میں ایک مزید اور بہت مؤثر چیز کا بھی اضافہ کیا۔ اور یہ حشر ونشر اور حساب آخرت کا تصور ہے۔ ایک طرف ہر انسان کو، خاص کر ہر مسلمان کو یہ یاد دلایا گیا ہے کہ دنیا میں سزا سے بچ بھی جاؤ تو آخرت کی ابدی زندگی میں عالم الغیب والشہادت اور عادل وقوی خدا سے کہاں بھاگ سکو گے؟ اور دوسری طرف حکامِ عدالت کو بھی ان کا فریضہ انصاف یاد دلایا گیا اور کہا گیا کہ اگر وہ ظلم کریں تو آخرت میں ان کو بھی سزا ملے گی۔ اس دہرے مادی وروحانی ذریعہ زجر تہدید SANCTION قائم کی گئی تا کہ ظلم کی بیخ کنی ہو۔ اور یہ دہری تہدید یقیناً واحد مادّی تہدید کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ہے۔

قانون میں دین ودنیا کا اجتماع:

نبوت اور بادشاہت کے اجتماع کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان خلیفہ دینی اور دنیوی دونوں معاملات کا ذمہ دار بنایا گیا۔ خلفاء راشدین کے زمانے میں عبادات اور معاملات ہی نہیں، سلوک وطریقت بھی خلیفے سے متعلق تھے، پھر طریقت کو اس سے الگ کیا گیا تو بھی عبادات اور معاملات ایک ہی شخص سے متعلق رہے۔ طریقت کو الگ کرنے کی وجہ بظاہر یہ تھی کہ حضرت ابوبکر کے زمانے ہی سے انصار کی یہ تجویز رد کر دی گئی کہ "منا أمیر ومنکم أمیر"[1]، یعنی وقت واحد میں ایک سے زائد خلیفہ ہوں (سیاسی معاملات کے لیے)؛ مگر روحانی دنیا میں یہ دشواری نہیں محسوس کی گئی اور وقتِ واحد میں ایک سے زائد افراد رسول اللہ کے خلیفے ہو سکتے تھے اور ہوئے۔ مثلاً نقشبندیوں کے ہاں حضرت ابوبکر، اور قادریوں، چشتیوں کے ہاں حضرت علی سے سلسلہ ملتا ہے اور یہ دونوں راست رسول اللہ کے خلیفہ ہیں، یہ نہیں کہ ایک کے بعد دوسرا جانشین ہوا ہو جیسا کہ

---

[1] ترجمہ: ایک خلیفہ ہم میں سے ہو اور ایک خلیفہ تم میں سے۔ (مرتب)

Marfat.com

سیاسی خلافت میں نظر آتا ہے۔ دیگر قوموں میں مادی اور روحانی امور کو ایک دوسرے سے الگ کیا گیا (یعنی سلطنت اور کلیسا)، تو مسلمانوں نے ظاہری اور باطنی امور کے لیے الگ الگ افسر بنائے۔ سیاسی خلیفہ ظاہری امور کے لیے جن میں نماز، روزہ، حج بھی شامل ہیں اور معاملات و سیاست بھی۔ اور باطنی امور کا خلیفہ اخلاق کی تربیت اور انسان اور خدا کے انفرادی تعلقات کو استوار تر بنانے میں مدد دیتا ہے۔ دونوں بھی رسول اللہ کے خلیفہ ہیں اور خلیفۂ بلافصل۔ فرق یہ ہے کہ سیاسی خلیفہ بلافصل صرف ایک فرد ہو سکا، روحانی خلفاء بلافصل بہ کثرت ہوے، رسول کی وفات کے فوراً بعد بھی، اور تا ایں دم ایک زمانے میں ایک ملک ہی نہیں، ایک شہر، ایک گلی بلکہ ایک مکان کے اندر بھی کئی مرشد یعنی روحانی خلیفے ہو سکتے ہیں۔

سیاسی خلیفے کو دینی اور دنیوی دونوں معاملات کی نگرانی کا فریضہ دیا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی قانون (فقہ) کی کتابوں میں بھی دونوں مسائل سے بحث ناگزیر ہوگئی۔ اور ایک مبتدی بھی جانتا ہے کہ فقہ کی کتابوں کے ابتدائی باب طہارت، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ پر مشتمل ہوتے ہیں، جو عبادات کہلاتے ہیں۔ پھر معاملات، تجارت و زراعت وغیرہ آتے ہیں۔ پھر عقوبات یعنی جرائم کا ذکر آتا ہے۔ آخر میں مابعد الموت نافذ ہونے والے امور یعنی وصیت اور وراثت سے بحث ہوتی ہے۔ اس ترتیب میں دو امر نمایاں کیے جانے کے قابل ہیں۔ اوّل تو یہ کہ زکوٰۃ یعنی ٹیکسوں کو (چاہے نقد اندوختے پر ہوں یا زراعت، تجارت، معدنیات وغیرہ پر)، عبادات میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر انسان حکومت کے جبر کے بغیر بھی نماز روزے کی پابندی کرتا ہے تو وہ زکوٰۃ بھی اسی عقیدت اور روحانی طلب کے باعث ادا کرتا ہے اور چھپانے، دھوکا دینے کی کوشش نہیں کرتا۔ دوسرا نکتہ یہ قابل ذکر ہے کہ عبادات سیاست اور معاملات ایک ہی حاکم کے ہاتھ میں ہونے سے وہ دونوں سے برابر کی دلچسپی لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایک کی خاطر دوسرا کام نظر انداز کر دے جیسا کہ مثلاً اشتراکی حکومتوں میں عبادت گاہوں اور دینی تعلیم کے اداروں وغیرہ کے ساتھ برتاؤ ہوتا ہے۔ مسلمان حکمران ہی مسجد میں امام ہوتا ہے، اور قصر حکومت میں بھی امام یعنی حکمران وہی

Marfat.com

ہوتا ہے۔ یہ خیال نہ کیا جائے کہ فقہ کی کتابوں میں سیاست کے قواعد سے بحث نہیں ہوتی۔ جرائم میں چوری اور رہزنی کے بعد بیرونی حملہ آوروں سے جنگ نہیں قانون بین الممالک سے بحث ہوتی ہے۔ نماز کے امام کے ذکر میں امام شافعی کی کتاب الام میں سلطنت کے امام یعنی قانون دستوری کی بحث ملے گی۔

اصولِ فقہ یعنی علم قانون:

ہر قوم اور ہر تمدن اپنا قانون بناتا ہے اور اس قانون کی کچھ خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں لیکن یہ ایک عجیب وغریب حقیقت ہے کہ پرانی قوموں نے قانون پر تو توجہ کی اور قوانین کے مجموعے بھی تیار کیے لیکن علم قانون کی ضرورت انہیں کبھی محسوس نہ ہوئی یعنی ایک ایسا علم جو قانون سے مجرد معنوں میں بحث کرے کہ قانون کسے کہتے ہیں، قانون کی تعمیل اور اطاعت کیوں کرنی چاہیے، قانون کے ماخذ کیا ہیں، قانون کون بنا سکتا ہے، کون بدل اور منسوخ کرسکتا ہے، قانون کی تعبیر اور توضیح کس طرح کی جائے، دو قانونی احکام میں اختلاف یا تضاد نظر آئے تو اس کے حل کا کیا طریقہ ہوگا، وغیرہ وغیرہ، غرض ایک ایسا علم جو کسی معین ملک یا قوم کے قانون سے متعلق نہیں ہوتا مگر جس کی روشنی میں دنیا کے کسی بھی ملک یا قوم کے قانون کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

اس خلاء کو سب سے پہلے مسلمانوں نے پُر کیا، اور اسے اصولِ فقہ یعنی قانون کی جڑوں کے معنی خیز نام سے موسوم کیا۔ قرآن مجید (سورہ ۱۴، آیت ۲۴ تا ۲۶) میں اچھے اور بُرے احکام یعنی قانون کا بڑے لطیف انداز میں ذکر ہے اور کہا گیا ہے کہ ''اچھا فرمان اچھے درخت کی طرح ہے کہ اس کی جڑ خوب ثابت رہتی ہے اور اس کی شاخیں (فرع) آسمان تک پھیل جاتی ہیں ....'' اس تلمیح سے اخذ کر کے مسلمان فقہانے قانون کی دو قسمیں کیں، ایک اصل (یا: جڑ) اور دوسرے شاخیں (یا: فرع)۔ فروع قانون تو وہ ہیں جن کے مماثل ہر قوم میں ملتے ہیں، یعنی قاعدے اور احکام کہ کس وقت اور کس حالت میں کیا طرزِ عمل ہونا چاہیے۔ لیکن اصول قانون میں مجرد علم قانون سے بحث ہوتی ہے اور اس کے ابواب یا بحثوں کا انطباق دنیا کے کسی بھی قانون پر کیا جاسکتا

Marfat.com

ہے۔ فرنگیوں میں جُورِس پُروڈنس حالیہ چیز ہے، مسلمانوں میں یہ کم از کم پہلی صدی ہجری کے اواخر سے ملتا ہے۔ اس پر سب سے قدیم معروف کتاب امام ابوحنیفہ کی ہے جنہوں نے کتاب الرائی تالیف کی تھی۔ پھر ان کے دونوں شاگردوں ابو یوسف اور محمد شیبانی کی طرف بھی ''اصول الفقہ'' نامی کتابیں منسوب ہیں۔ موجودہ دستیاب ہونے والی کتابوں میں سب سے قدیم امام شافعی کی ہے جس کا نام الرسالہ ہے اور جو اس علم سے تفصیل کے ساتھ بحث کرتا ہے۔ یہ مسلمانوں کی قانون کے سلسلے میں سب سے اہم جدت ہے۔ میں بھی اس سے ابتداءً ناواقف تھا۔ لندن یونیورسٹی کی سوسالہ سالگرہ ہوئی تو مشہور فرانسیسی مستشرق اوستروروگ کو خاص طور پر بلایا گیا اور اس کے وہاں دیے ہوئے تین لیکچر ''انگورا ریفارم'' کے نام سے شائع ہوے۔ ان میں سے ایک کا عنوان ہے ''قانون کی جڑیں'' (روٹس آولا) اور اس میں وہ سر دھنتا ہے اتنی اہم اور بدیہی چیز کیسے قدیم رومیوں یونانیوں کے ذہن میں نہ آئی اور کیسے وہ مسلمانوں سے مختص ہو کر رہ گئی۔

سیر یعنی قانون بین الممالک:

سنّی، شیعہ، فاطمی، اباضی (خارجی) کسی بھی مسلمان فرقے کی فقہ کی کتاب ہو، اس میں ایک باب ''کتاب السیر'' کے نام سے ضرور ہوتا ہے جس میں اجنبی ملکوں سے جنگ اور امن کے زمانے کے تعلقات کا ذکر ہوتا ہے۔ اسی کو مغرب میں انٹرنیشنل لا یعنی قانون بین الممالک کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے موجد بھی مسلمان ہیں۔ مگر کچھ تشریح کی ضرورت ہے:

اجنبی ممالک سے جنگ اور امن کے زمانے کے تعلقات اتنے ہی قدیم ہیں جتنا انسانی معاشرے میں بوقت واحد دو یا زیادہ خود مختار مملکتوں کا وجود۔ اس معنے میں یہ قانون اتنا ہی قدیم ہے جتنا تاریخی انسان۔ کیونکہ ہزاروں سال (قبل اسلام) سے مملکتوں کی باہمی جنگ کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن جنگ اور امن کے زمانے کے ان تعلقات کے لیے جو قاعدے بنے اور رہے ہیں ان میں وہ قاعدے عام نہیں ہیں بلکہ معین اجنبیوں سے مختص قرار دیے گئے ہیں۔ مثلاً بائبل (توریت) میں یہودی قانون ملتا ہے

Marfat.com

اوراس میں صراحت ہے کہ جنگ کے زمانے میں فلاں فلاں احکام پر عمل کیا جائے لیکن ان کا اطلاق عمالقہ پر نہ ہوگا؛ عمالقہ کو نیست و نابود کر دو، نہ صرف مرد بلکہ عورت، بچے، شیر خوار اطفال، حتی کہ ان کے اونٹ اور گدھوں تک کو قتل کر دو۔ (دیکھو کتاب تثنیہ اور کتاب ساموئیل اول) قدیم یونانی قانون بین الممالک کو دیکھو تو وہاں نظر آتا ہے جنگ کے نرم یا گرم جو قاعدے ہیں ان کا اطلاق یونانی النسل اور یونانی المذہب ریاستوں سے مخصوص ہیں، غیر یونانیوں سے برتاؤ میں کسی قاعدے قانون کی پابندی ضروری نہیں، جو چاہو کر سکتے ہو۔ رومی دور میں بھی زیادہ اصلاح نہ ہوئی اور صرف یہ کہا گیا کہ جن ملکوں کے ساتھ رومیوں کی حلیفی یا اور طرح کے تعلقات رہے ہیں ان کے ساتھ برتاؤ میں فلاں فلاں قاعدے ملحوظ رہیں، اجنبیوں سے تعلقات میں کسی قاعدے کی پابندی نہیں۔ سنہ ۱۸۵۶ء تک یورپ کا قانون بین الممالک صرف بین النصرانیت قانون تھا، اور صرف عیسائی ملکوں کے آپس کے برتاؤ سے مخصوص تھا۔ سنہ ۱۸۵۶ء میں پہلی دفعہ صراحت سے معاہدہ کرنا ہوا کہ ان قواعد کا اطلاق مسلمان ترکی سے بھی ہوگا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد کی مجلس اقوام، اور دوسری جنگ کے بعد کی موجودہ اقوام متحدہ بھی ہر کسی کے لیے کھلی ہوئی نہیں ہیں، اور ہر نئے امیدوار کو دو موجودہ رکنوں کی سفارش کی ضرورت ہوتی ہے کہ یہ نیا امیدوار مہذب ہے اور اسے اقوام متحدہ کا رکن بنایا جائے۔ پھر غلبۂ آراء سے اس کی رکنیت قبول کی جاتی ہے۔

اسلام وہ پہلا قانون ہے -- اور تا حال واحد -- جو کہتا ہے کہ سارے غیر مسلم ممالک سے معینہ قاعدوں کے ساتھ برتاؤ کیا جائے، اور یہ قاعدے جو جنگ اور امن دونوں زمانوں سے متعلق ہیں، معین اور معلوم ہیں۔ مسلمانوں کا بنایا اور برتا ہوا قانون بین الممالک قانون بھی ہے اور بین الممالک بھی، قدیم لوگوں کے ہاں نہ وہ قانون رہا ہے اور نہ بین الممالک۔ بلکہ محدود حلقہ انسانیت سے مخصوص۔

یہ اسلامی قانون بین الممالک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے شروع ہوا کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مملکت بھی قائم فرمائی اور دشمنوں سے جنگ بھی کی، اور حالت جنگ و صلح کے طرزِ عمل کا جو نمونہ چھوڑا اسی کی اساس پر

Marfat.com

مسلمان فقہا نے اسلامی قانون بین المما لک مدون کیا۔ اس کا قدیم ترین تحریری ذکر زیدی مذہب کے بانی امام زید بن علی کی کتاب ''المجموع فی الفقہ'' میں کتاب السیر میں ملتا ہے۔ امام ابوحنیفہ ان کے شاگرد سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق ابن حجر عسقلانی نے امام شافعی کی سوانح عمری ''توالی التاسیس'' میں لکھا ہے کہ سیر پر سب سے پہلے مستقل کتاب ابوحنیفہ نے لکھی۔ اس کے مندرجات پر امام اوزاعی نے اعتراض کیا تو ابوحنیفہ کے شاگرد ابو یوسف نے رد لکھا۔ پھر امام شافعی نے اس ساری بحث کو سامنے رکھ کر اپنی کتاب الام میں ایک باب لکھا جس کا نام ہے سیر الاوزاعی۔ اس میں وہ ابوحنیفہ، اوزاعی اور ابو یوسف کی دلیلیں بیان کرنے کے بعد اپنی ذاتی رائے درج کرتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ کے متعدد شاگردوں نے سیر یعنی قانون بین المما لک پر مستقل اور ضخیم کتابیں لکھیں۔ امام محمد کی کتاب السیر الکبیر ہم تک پہنچی اور بہت مفصل ہے۔ یونیسکو نے اس کا فرانسیسی ترجمہ کرایا ہے کہ اس علم کی یہ دنیا کی سب سے قدیم کتاب ہے۔ لبنان نے اسے شائع کرنے کی ہامی بھری، مگر وہ بیچارا اب قانون کی کیا خدمت کرے، خانہ جنگیوں میں اپنی ذاتی حفاظت ہی کر لے تو بہت ہے۔

تحریری دستور مملکت:

سلطنتیں دنیا میں بہت قدیم زمانے سے ملتی ہیں، لیکن حکمران کسی قاعدے قانون کے پابند نہ رہے ہیں، ان کی مرضی ہی ان کا قانون رہا ہے۔ حکمران کے برتاؤ کو معین قواعد کا پابند بنانا اور ان قواعد کو لکھ کر شائع کرنا حالیہ چیز سمجھی جاتی ہے۔

قدیم تاریخ پر نظر ڈالیں تو نظر آتا ہے کہ یونانیوں کے ہاں چھوٹی چھوٹی بہت سی شہری مملکتیں تھیں۔ ان میں سے شہر اثینا (آتھنس) کے متعلق بعض معلومات ارسطو نے لکھے ہیں مگر یہ دستور نہیں، بلکہ دستوری حالات کی تاریخ ہے۔ (ارسطو نے جو سکندر اعظم کا وزیر تھا، دنیا کی بہت سی مملکتوں کے دستوری قواعد فراہم کیے اور رسالوں کی صورت میں شائع کیے تھے) شہری مملکت اثینا کے دستور میں ایک بار کچھ اصلاحیں مناسب سمجھی گئیں تو سولن کو تجویزیں پیش کرنے پر مامور کیا گیا اور اس نے ترمیمیں تحریری طور پر

Marfat.com

پیش کیں۔ لیکن وہ صرف ترمیمیں تھیں، پورا دستور نہ تھا۔ اور کسی بادشاہ یا حکمران کی طرف سے نافذ کردہ چیز بھی نہ تھی۔ اس کے بعد ایک اور تحریری "دستور" کا پتا ملتا ہے جو طنز کے سوا کچھ نہیں۔ حضرت موسیٰ کے بہت بعد، اور حضرت داؤد سے کچھ پہلے ایک نبی تھے حضرت اشموئیل (سامویل)۔ یہ بوڑھے ہو گئے تو یہودیوں نے اصرار کیا کہ وہ اپنی موجودگی ہی میں ایک شخص کو بادشاہ نامزد کریں۔ خدا کے حکم سے انہوں نے قوم کو اس سے روکا اور کہا کہ بادشاہ جو کوئی بنے گا تو وہ تم پر ظلم کرے گا۔ تمہارے لڑکوں لڑکیوں کو لونڈی غلام بنائے گا، تمہارا مال زبردستی چھینے گا وغیرہ (دیکھو کتاب سامویل اول، باب ۸، جملے ۹ تا ۱۸)۔ مگر انہوں نے نہ مانا اور اصرار کرتے رہے۔ اس پر حضرت اشموئیل (سامویل) نے ساول نامی شخص کو طالوت یعنی بادشاہ نامزد کیا" اور تب سامویل نے قوم کو بادشاہت کے حقوق سے واقف کرایا، اور انہوں نے ان کو ایک کتاب کی صورت میں لکھا اور اسے خدا کے حضور میں پیش کیا اور پھر سارے لوگوں کو اپنے اپنے گھروں کو واپس بھجوا دیا" (سامویل اول، باب ۱۰، جملہ ۲۵)۔

ارسطو کا ہم عصر، ہندوستان میں کارٹیلیا تھا، جو ارسطو ہی کی طرح اپنے ملک میں وزیر تھا۔ اس کی لکھی ہوئی کتاب ارتھا شاسترا موجود ہے اور اس کے ترجمے بھی ملتے ہیں۔ لیکن یہ نصیحۃ الملوک قسم کی کتاب ہے، بادشاہ اس سے استفادہ کر سکتا تھا، شہزادے اس کو پڑھ سکتے تھے، لیکن وہ کوئی دستوری قانون نہ تھا کہ اس پر عمل ضروری ہو، اور نہ کسی بادشاہ کا فرمان کہ اسے کم از کم بادشاہ کا دستوری وعدہ ہی سمجھا جائے۔

تاریخ میں جو قدیم ترین تحریری دستور ملتا ہے وہ نبی اُمی پیغمبر اسلام کا مدون اور نافذ کیا ہوا دستوری قانون ہے۔ جب حضور ہجرت کر کے مدینہ آئے تو وہاں ایک سیاسی خلا تھا۔ کوئی مملکت پائی ہی نہیں جاتی تھی۔ وہاں صرف قبیلے رہتے تھے جن میں سو، سوا سو سال سے مسلسل باہمی جنگ ہی جاری تھی۔ مدینہ آتے ہی حضور نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے نمائندوں کو بلایا اور تجویز پیش کی کہ ایک شہری مملکت قائم کر لو، اور باہم اتحاد کرو تو سب ہی کا فائدہ ہے۔ اسے مسلمانوں، بت پرست عربوں اور یہودیوں نے قبول کیا تو باون دفعات کی ایک دستاویز مرتب ہوئی جس میں حکمران اور رعایا دونوں

Marfat.com

کے حقوق اور فرائض امن اور جنگ دونوں حالتوں کے متعلق تفصیل سے بیان ہوے اور علاوہ اور چیزوں کے سماجی بیمے (معاقل) کا بھی مفصل ذکر ہوا۔ یہ دستاویز، جو تحریری تھی، تاریخ نے محفوظ رکھی ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں سب سے پہلا یہ تحریری دستور مملکت ہے جو سنہ ۱ھ ہجری میں مرتب اور نافذ ہوا۔ (اس موضوع پر دیکھو میری انگریزی کتاب مطبوعۂ لاہور ''دی فرسٹ رٹن کانسٹی ٹیوشن اِن دی ورلڈ'')۔

جدید قانون سازی:

ایک بنیادی اور مسلمہ قاعدہ ہے کہ کسی موجودہ قانون قاعدے کو وہی شخص بدل سکتا ہے جس نے وہ پرانا قاعدہ بنایا ہو، یا اس سے بھی بڑے درجے کا کوئی شخص مثلاً کسی وزیر کا بنایا ہوا قاعدہ خود وزیر ہی منسوخ کر سکتا ہے، یا وزیر کا بھی افسر یعنی بادشاہ، یہ نہیں ہو سکتا کہ وزیر کا کوئی ماتحت وزیر کے حکم کو منسوخ کر سکے۔ ان حالات میں بادشاہ کے حکم کو خود بادشاہ ہی بدل سکے گا، یا کوئی نبی اور یہ کہتے ہوے کہ اللہ نے یہ حکم دیا ہے جو بادشاہوں کا بھی بادشاہ ہے۔ پرانے نبی کے لائے ہوے حکم کو ایک بعد میں آنے والے نبی کے ذریعے سے بدلا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی نبی یہ کہہ دے کہ میں آخری نبی ہوں، میرے بعد قیامت تک کوئی اور نبی آ نہیں سکتا، تو پھر اسی آخری نبی کے احکام کے بدلنے کا کوئی امکان علمی نقطۂ نظر سے رہ نہیں سکتا۔

اس مسئلے کے کئی پہلو قابلِ غور ہیں: قانون اگر روز بدل سکے اور قانون ساز کوئی مستبد بے اصول بادشاہ ہو تو رعایا کو سکونِ خاطر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر کوئی قانون کبھی بدل نہ سکے تو حالات کے بدلنے سے اگر اس قاعدے کے بدلنے کی ضرورت محسوس ہو تو گتھی کا کوئی حل مل نہ سکے گا۔ یہ آخر الذکر احتمال ایک مفروضہ ہے اور بس کیونکہ اگر پرانا قانون بعد میں بھی ٹھیک معلوم ہو تو اس کے بدلنے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ ریاضی کے قاعدوں کی طرح کہ قدیم زمانے میں دو اور دو چار ہوتے تھے تو اب بھی چار ہی ہوتے ہیں، پانچ نہیں۔ کہنے کا منشا یہ ہے کہ اسلامی قانون کا جو حصہ اللہ اور رسول کے احکام (قرآن اور حدیث) پر مبنی ہو تو اس میں ثبات اور استحکام کا

Marfat.com

فائدہ تو ہوگا، لیکن تعطل کی خامی اس میں اس وقت نہیں پیدا ہوگی جب جدید زمانے میں بھی عقل اسے مفید اور معقول سمجھے۔ اور تجربہ بتا رہا ہے کہ قرآن وحدیث کے احکام اب چودہ سو سال بعد بھی معقول ہی تسلیم کیے جا رہے ہیں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ سارا اسلامی قانون قرآن وحدیث پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ بہت سے اجزا انسانوں، فقیہوں کے استنباط کردہ ہیں۔ اور ایک فقیہ کا حکم دوسرا فقیہ قبول بھی کر سکتا اور اپنی نئی رائے بھی دے سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے اختلاف آراء کی صورت میں معقول تر رائے کو سب قبول کریں گے، اور دوسری رائے رد کی جا سکے گی۔ مثلاً کون نہیں جانتا کہ بے شمار معاملات میں امام ابو حنیفہ کی رائے کو ترک کر کے ان کے شاگردوں (صاحبین وغیرہ) کی رائے کو خود حنفی مذہب میں قابل عمل سمجھا جاتا ہے۔

غور کریں تو نظر آئے گا کہ اسلامی قانون میں اولاً وہ سارے قاعدے داخل تھے جو ملک (مکہ، مدینہ، عرب) میں رائج تھے اور رسول اللہ نے ان کو منسوخ نہ قرار دیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ کچھ پرانے رواج قرآن یا حدیث نے بدلے، اور کچھ نئے احکام دیے۔ قبل اسلام کے غیر منسوخ شدہ قواعد کا ایک جز حدیث میں بھی ''تقریر'' کے نام سے شامل ہو گیا، یعنی وہ عرف و عادت، وہ رسم و رواج جسے رسول اللہ نے برقرار رکھا۔ عہد نبوی کے اواخر میں ایک مزید اور بہت اہم چیز بڑھی، اور یہ اجتہاد ہے۔ ہوا یہ کہ حضرت معاذ بن جبل گورنر بنا کر دور دراز یمن کو بھیجے گئے۔ رخصت کے وقت رسول اللہ نے ان سے پوچھا: احکام کس طرح دیا کرو گے؟ کہا: کتاب اللہ کے مطابق۔ پوچھا: اگر اس میں حکم نہ ملے تو؟ کہا: رسول اللہ کی سنت کے مطابق۔ پوچھا: اگر اس میں بھی نہ ملے تو؟ کہا: پھر تو میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کروں گا۔ اس پر رسول اتنا خوش ہوئے کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کی: تعریف ہو اس اللہ کو جس نے اپنے نبی کے فرستادے کو اس چیز کی توفیق دی جو اس کے نبی کو پسند ہے۔

غرض عہدِ نبویؐ میں غیر منسوخ شدہ قدیم رسم و رواج، قرآن، حدیث اور (قرآن وحدیث کے سکوت میں) اجتہاد اسلامی قانون کے ماخذ تھے۔ ان کے علاوہ معاہدات کے ذریعے سے، نیز مماثلت RECIPROCITY کے طور پر بھی نئے قاعدے قبول

Marfat.com

ہونے لگے تھے اور غیر ملکوں کے معقول قاعدے بھی قبول کیے جانے لگے تھے، خود بخود نہیں، بلکہ انفرادی بیرونی قاعدے اگر وہ ہمیں معقول معلوم ہوں۔ اجماع ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔

اجتہاد کی اجازت تو رسول اللہ نے دی، لیکن ایک سے زائد لوگوں کے اجتہاد سے اختلاف کی صورت ابھی پیدا نہیں ہو سکی تھی، کیونکہ رسول اللہ کی زندگی میں اگر دو صحابیوں کی رائے میں اختلاف ہوتا --اور بارہا ایسا ہوا بھی -- تو فریقین اسے رسول اللہ سے رجوع کرتے اور رسول کا حکم اس کا فیصلہ کر دیتا۔ لیکن رسول اللہ کی وفات کے بعد اختلافات پیدا بھی ہوے اور بڑھتے ہی گئے۔ دیگر قوموں میں قانون سازی کا حق یا تو اہل دین کو ہوتا یا حکمران کو۔ اسلام میں یہ ممکن نہ تھا۔ خلفاء نے شاذ و نادر کچھ احکام دیے، اور وہ بھی فقہا کے مشورے کے بعد، لیکن قانون سازی کا حق مسلمانوں میں غیر سرکاری اہل علم سے مختص ہو کر رہ گیا۔

عدل گستری کو حکمران سے آزاد رہنا چاہیے۔ اسے بہتوں نے مانا، اور اب مغرب میں بھی اس پر عمل ہوتا ہے۔ لیکن قانون سازی کو بھی حکومت سے آزاد رہنا چاہیے، یہ اب بھی مغرب کے ذہن میں نہیں آیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر نئے انتخاب کے بعد نمائندوں کی اکثریت ہر پرانے قانون کو بدل سکتی اور بدلتی ہے۔ مسلمانوں کی چودہ سو سالہ روایت یہ ہے کہ اجتہاد و استنباط سے اسلامی قانون کے کسی خلا کو پُر کرنا، یہ حکومت کا نہیں، اہل علم اور فقہا کا کام ہے۔ ایسے نجی اہل علم چونکہ سب آپس میں مساوی ہوتے ہیں، اس لیے ہر شخص اپنی رائے دیتا اور دوسروں کو حق ہوتا ہے کہ کسی اور کی رائے کو قبول کرے یا رد کرے۔ کبھی کبھی سب ہم عصر کسی استنباط کو قبول کرتے رہے اور اسے اجماع کا نام دیا جانے لگا۔ مگر وہ اب تک کوئی ادارہ نہ بنا یعنی یہ معلوم کرنا ممکن نہیں کہ آیا واقعی کسی قاعدے پر سارے لوگوں کو اتفاق ہے۔

اس عرض کا منشا یہ کہنا ہے کہ اسلام میں جس حد تک ذیلی قانون سازی ہو سکتی ہے، یعنی قرآن و حدیث کے سکوت کے وقت پیدا شدہ مسائل کا قاعدہ مقرر کرنا، یہ کام حکومتوں نے نہیں، نجی فقہاء نے کیا۔ گویا اسلام میں عدل گستری ہی نہیں، قانون سازی

Marfat.com

بھی حکومت سے آزاد رہی ہے۔ اور یہ اس بات کی ذمہ دار رہی ہے کہ قانون کی تیز ترقی ہو۔ ہجرت پر ایک صدی بھی نہیں گزری تھی کہ نجی فقہا نے اسلامی قانون کے مجموعے مدون کر کے شائع کر دیے، اور حکومتوں کو بھی اس پر اعتراض نہ رہا۔ چونکہ یہ نجی رائیں تھیں، اس لیے کسی کے لیے واجب التعمیل نہ تھیں، ہو سکتا تھا کہ کوئی حاکم عدالت کسی کتاب کی کوئی بات قبول کر کے نافذ کرے، کوئی دوسرا کوئی دوسری چیز، ان سے جو دشواریاں پیدا ہوئیں ان کو کس طرح حل کیا گیا، وہ موجودہ بحث سے غیر متعلق ہے ان گتھیوں کو حل کیا گیا، اور آئندہ بھی ہر وقت حل کیا جا سکتا ہے۔

یہاں ایک ذیلی چیز کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ مذکورۂ بالا خنلافات آراء نے مسلمانوں میں ایک نئے علم کو پیدا کیا اور اس کا نام ہے علم الاختلاف۔ چنانچہ ایسی کتابیں لکھی جانے لگیں فلاں فلاں مسئلے میں کیا اختلاف ہے اور ہر فقیہ اپنی تائید میں کیا دلیلیں پیش کرتا ہے۔ اور پھر ایک مسئلے پر بنیادی اختلاف ہو تو اس کے نتیجے کے طور پر کیا کیا فرعی اختلاف خود بخود پیدا ہوتے ہیں، چاہے ابتدائی اختلاف کرنے والوں کے ذہن میں وہ نتائج آئے ہوں یا نہیں۔

خلاصہ:

علمِ قانون کی مسلمانوں نے بھی خدمت کی ہے۔ ان کی بعض جدتوں کو اوروں نے جلد یا بدیر قبول بھی کر لیا۔ بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جو تا حال قبول نہیں ہوئی ہیں۔ چند چیزوں کا ہم نے یہاں ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے اور بھی چیزیں ہوں۔ تعاون اور اشتراکِ عمل سے ان کا پتا چلے گا اور اس سے سب فائدہ اٹھائیں گے۔

مسلمان علما کی بین الاقوامی کانفرنس (۷ تا ۱۰ مارچ ۱۹۸۱ء) مقالات کانفرنس (جلد ہشتم۔ حصہ اوّل)۔

Marfat.com

تاریخِ قانون میں مسلمانوں کا حصہ

تمہید:

قانون سے مراد انسان کے حقوق و فرائض کا علم ہے۔ یہ چیزیں کبھی عملدرآمد اور رسم و رواج سے وجود میں آتی ہیں، کبھی حکومت کے فیصلے سے، تو کبھی استنباط اور قیاس کے باعث۔ اس معنی میں قانون اتنا ہی قدیم ہے، جتنا انسانی سماج۔ بنی نوع انسان میں افراد کا فرق، گروہوں کے فرق میں؛ اور گروہوں کا فرق، ان کے قانونوں کے فرق میں منعکس ہوتا ہے۔

ہر انسانی گروہ ماحول یا تاریخی اسباب سے کسی نہ کسی چیز پر زیادہ زور دیتا ہے، اور اسی بنا پر اس خاص مسئلے میں زیادہ ممتاز نتائج حاصل کرتا ہے۔ قانون کی ضرورت ہر انسانی گروہ کو رہی ہے، چین ہو کہ ہندوستان، عراق ہو کہ ایران، مصر ہو کہ یونان، امریکا ہو کہ افریقا، کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں رہا ہے۔ اور ہر گروہ نے قانون میں ترقی کی ہے۔ یہاں مسلمانوں کے حصے یا کارنامے سے بحث کی جائیگی، تاکہ ہر دوسرا گروہ اپنے ہاں کے قانون کی تاریخ سے اس کا مقابلہ کر سکے۔

قانونیات یا اصولِ قانون:

قانون یعنی مجموعۂ احکام ہر ملک میں ملتا ہے، تحریری ہو کہ غیر تحریری۔ لیکن قدیم

Marfat.com

زمانے میں علم قانون کا پتا نہیں چلتا۔ قانون میں احکام کی تفصیل ہوتی ہے کہ فلاں کام کیا جائے، فلاں کام نہ کیا جائے وغیرہ۔ علم قانون میں اس سے بحث ہوتی ہے کہ قانون کی سماج کو ضرورت کیوں ہے، احکام کس طرح بنائے اور بدلے جاتے ہیں، تعبیر واطلاق کس طرح ہو، استنباط کے کیا قاعدے ہیں وغیرہ۔ اوّل الذکر ہر ملک میں علاحدہ ہوتا ہے، آخرالذکر کا اطلاق دنیا کے ہر ملک اور ہر گروہ کے قانون پر کیا جا سکتا ہے۔ اوّل الذکر کو درخت کی شاخیں اور ڈالیاں کہیں تو آخرالذکر کو اس درخت کی جڑ کہا جا سکتا ہے (جیسا کہ قرآنی آیت ''اصلها ثابتٌ وفرعها في السّمآء'' میں بھی کہا گیا ہے) اوّل الذکر کو اب قانون اور آخرالذکر کو اصول قانون کہتے ہیں۔

میرے علم میں اصول قانون پر دنیا میں سب سے پہلی کتاب مسلمانوں نے لکھی۔ چونکہ وہ قانون کو ''فقہ'' کہتے ہیں، اس لیے اس دوسرے علم کو وہ ''اصول فقہ'' سے موسوم کرتے ہیں۔ اس بارے میں قدیم ترین کتابیں امام ابو حنیفہ (ف ۷۶۷ء) اور ان کے دونوں شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد شیبانی کی طرف منسوب ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اب دستیاب نہیں ہوتی کہ اس کی تحلیل کی جا سکے۔ آج کل موجود سب سے قدیم کتاب امام محمد شیبانی کے شاگرد امام شافعی کی ہے۔ اس کا نام ہے ''الرسالہ''۔ اس کا انگریزی ترجمہ ایک عراقی عیسائی مجید خدوری نے امریکا میں شائع بھی کیا ہے۔ اس میں فلسفۂ قانون، ماخذ ہائے قانون، تعبیر، استنباط واطلاق قانون اور مماثل چیزوں سے بحث اور ان کا اسلامی قانون پر اطلاق کیا گیا ہے۔ اس کے بعد سے اس موضوع پر مسلمانوں نے سیکڑوں کتابیں لکھی ہیں اور دینی مدارس میں آج تک یہ موضوع نصاب کا جزو ہے۔

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ قانون تو نہیں، قانونیات کا آغاز مسلمانوں سے ہوا۔

فلسفۂ قانون:

بھلائی اور بُرائی (خیر وشر) پر انسان قدیم سے غور کرتا آیا ہے اور اس سے فلسفے میں بحث ہوتی ہے۔ لیکن قانون کو جبر واستبداد کی جگہ عقل اور نظریۂ خیر وشر پر مبنی کرنا بھی

مسلمانوں ہی سے مخصوص نظر آتا ہے۔ اس کا آغاز کس مؤلف سے ہوا، یہ تو معلوم نہیں۔ امام غزالی کے ایک اشارے سے گمان ہوتا ہے کہ اس کا ذکر معتزلہ فرقے کے فقہا سے ہوا۔ بہر حال مسلمانوں نے کہا ہے کہ جو بھلائی ہے، وہ ضرور کرنی چاہیے (فرض)؛ اور جو بُرائی ہو، اس سے بچنا ضروری ہے (حرام)۔ مخلوط چیزوں میں سے جس میں بھلائی زیادہ ہو، اس کی سفارش کی جائیگی (مستحب)، اور جس میں بُرائی زیادہ ہو، اس سے حوصلہ شکنی کی جائیگی (مکروہ)۔ جس میں بھلائی اور بُرائی دونوں برابر ہوں، یا جس میں نہ بھلائی نظر آئے نہ بُرائی، اس کو ہر شخص کی مرضی اور اختیار پر چھوڑ دیا جائیگا (مباح)۔ یہ پنجگانہ تقسیم قانون کے سارے احکام پر حاوی ہے۔ قانون دیوانی ہو یا فوجداری، معاہدات ہوں یا وراثت، حتیٰ کہ عبادات بھی اسی میں آسانی سے داخل ہو جاتے ہیں۔ قطب نما کی ذیلی سمتوں ''شمال، شمال مشرق'' وغیرہ کی طرح ان قانونی بنیادی قسموں کی بھی ذیلی قسمیں کی جاتی ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان فقہاء نے اسے قرآنی اصطلاحات معروف و منکر سے اخذ کیا ہے۔ معروف سے مراد اچھی چیزیں ہوتی ہیں، لیکن اس لفظ کے لغوی معنی ہیں: ''جسے ہر شخص جانتا اور مانتا ہو'' یعنی جس کی بھلائی اور خوبی سے ہر کوئی واقف ہو، اور کسی کو اس سے انکار نہ ہو۔ اسی طرح منکر سے مراد بُری چیزیں ہوتی ہیں، مگر اس اصطلاح کے لفظی معنی ہیں: ''جس سے کوئی واقف نہ ہو''، گویا جس کے رائج اور اچھے سمجھے جانے سے ہر کوئی انکار کرتا ہو۔ غرض اسلامی قانون اپنے ہر حکم اور ہر ممانعت کے متعلق یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ خیر و شر کی مسلمہ فلسفیانہ اساس پر پوری اُترے اور اس کی محض جبر کی بنا پر تعمیل نہ کی جائے۔

تعمیل کے وسائل اور تہدیدات:

آج کل کہا اور پڑھایا جاتا ہے کہ قانون کی تعمیل اس لیے کرنا چاہیے کہ وہ ملک کے مقتدر اعلیٰ (بادشاہ یا پارلیمنٹ) کا حکم ہے؛ اور اگر اس کی تعمیل نہ کریں، تو وہ ہمیں پولیس، فوج اور عدالت کی مدد سے مجبور کریگا کہ اس کے حکم کے مطابق عمل کیا جائے۔

Marfat.com

لیکن اس بیان میں کئی خامیاں ہیں۔ پہلے یہ کہ قانون کا بعض لوگوں پر اطلاق نہیں ہو سکتا مثلاً قانونِ انگلستان یہ کہتا آیا ہے کہ بادشاہ کوئی غلط، ناحق کام کر ہی نہیں سکتا۔ وہ، اور دیگر مغربی قوانین بھی، غیر ملکی سفیروں وغیرہ کو مقامی عدالت کے اختیار سماعت سے باہر مانتے ہیں۔ دوسری خامی یہ ہے کہ چونکہ اساس جبر ہے، اس لیے ہر شخص کو اس کے خلاف ضد ہوتی ہے اور وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے فرائض کو چھپائے اور قانون کی زد میں نہ آئے۔ دوسرے الفاظ میں، اگر حکومت کسی شخص کے واجبات سے واقف نہ ہو، تو اُس شخص کو کوئی ترغیب نہیں ہوتی کہ وہ از خود حکومت کو ان سے واقف کرائے اور اپنا فریضہ انجام دے۔

اسلام نے قانون کی تعمیل دو گونہ اساس پر مبنی رکھی ہے: اولاً، یہ ذہن نشین کرایا گیا کہ قانون خدا کا حکم ہے اور خدا عالم الغیب ہے، جس سے کوئی چیز چھپائی نہیں جا سکتی؛ وہ ہمارے مرنے کے بعد بھی ہمیں دوبارہ زندہ کر کے ہمارے دنیوی اعمال کا رتی رتی حساب لیگا اور جزا و سزا دیگا۔ دوسرے، سارے دنیوی وسائل (پولیس، فوج، عدالت وغیرہ) بھی مہیا رکھے۔ مزید برآں حکم بھلی چیزوں ہی کا دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ سچا مسلمان کسی جبر کے نہ ہونے کے باوجود نماز پڑھتا اور روزہ رکھتا ہے؛ اسی طرح حکومت کے ناواقف یا کسی اور وجہ سے کمزور ہونے کے باوجود ٹیکس دینا اور دیگر فرائض کا انجام دینا ضروری سمجھتا ہے۔

قانون جنگ و صلح:

اسے آج کل قانون بین الممالک کہتے ہیں (بعض لوگ بین الاقوام بھی کہتے ہیں)۔ قدیم زمانے میں یہ نہ تو واقعی بین الممالک اور عالمگیر تھا اور نہ قانون ہی۔ یہ کاملاً حکمران اور سپہ سالار کی مرضی پر ہوتا تھا کہ دشمن اور اجنبی سے کیا برتاؤ کیا جائے۔ یہ کوئی متعین قاعدہ نہیں تھا، بلکہ ہر وقت بدلا جا سکتا تھا بعض وقت اس کے لیے کوئی قاعدے ہوتے بھی، تو ان کا اطلاق ہم نسل، ہم مذہب اور ہمزبان دشمنوں ہی تک محدود رہتا، دوسروں سے نہیں۔ اسی لیے اس موضوع کے قواعد، اگر بیان بھی ہوتے، تو کسی قانون

Marfat.com

کی کتاب میں نہیں، بلکہ سیاسیات کی کتاب، شہزادوں کی تعلیم و تربیت کی کتاب میں بیان ہوتے۔

قانون بین الممالک کو ''قانون'' اور ''بین الممالک'' دونوں قرار دینا، اور اس کو عام قانونِ ملک کا ایک جزو قرار دینا -- اس کا آغاز بھی مسلمانوں میں ملتا ہے۔ امام حسینؓ کے پوتے زید بن علی کی وفات ۷۳۸ء میں بتائی جاتی ہے۔ ان کی تالیف ''المجموع فی الفقہ'' اب چھپ گئی ہے؛ اور یہ مسلمانوں کی قانونی کتابوں میں سے سب سے قدیم ہے، جو ہم تک پہنچی ہے۔ اس میں جہاں معاملات، وراثت وغیرہ کے ابواب ہیں، وہیں ایک باب ''سیر'' کے عنوان سے بھی ہے۔ اس میں ساری غیر مسلم دنیا (نیز باغی مسلمانوں) سے جنگ اور صلح کے احکام دیے ہیں۔ اس کے بعد سے اب تک فقہ کی جو لاتعداد کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے ہر ایک میں یہ باب ملتا ہے۔ گویا، بین الممالک تعلقات کے احکام قانون کا جزو بن گئے؛ اب وہ انفرادی صوابدید اور من مانی کرنے کی چیز نہیں رہے۔

اس موضوع کی اہمیت کے باعث مسلمانوں نے اسے ایک مستقل علم بھی بنا دیا۔ ابن حجر العسقلانی نے امام شافعی کی جو سوانح عمری لکھی ہے، اس میں بتایا ہے کہ سیر پر مستقل کتاب سب سے پہلے ابو حنیفہ نے لکھی (جو مذکورۃ الصدر زید بن علی کے شاگرد کہے جاتے ہیں)۔

اس کے نظریات کی ایک معاصر فقیہ امام اَوزاعی نے تنقید کی۔ ابو حنیفہ نے خود اس کا جواب دینا مناسب نہ خیال کیا، مگر ان کے ایک شاگرد ابو یوسف نے الرد علیٰ سیر الاوزاعی کے نام سے ایک کتاب لکھی (جواب چھپ گئی ہے)۔ پھر امام شافعی نے اس ساری بحث کی تنقیح کی۔ انہوں نے اپنی کتاب الأم میں ''سیر الاوزاعی'' کے نام سے ایک باب شامل کیا، جس میں سارے فریقوں کے دلائل نقل کر کے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی تحقیق اور ذاتی رائے لکھی ہے۔

ان لوگوں کے معاصر امام مالک، امام محمد شیبانی، امام زفر، نیز مشہور مؤرخ اور بغداد کے قاضی واقدی نے بھی اس موضوع پر 'کتاب السیر' کے عنوان سے مستقل

کتابیں لکھیں۔ بعد کی صدیوں میں سرخسی (ف ۱۰۹۰ء) نے امام محمد شیبانی کی شرح کر کے 'شرح السیر الکبیر' لکھی، جو دائرۃ المعارف، حیدرآباد (دکن) نے عرصہ ہوا، چار ضخیم جلدوں میں چھاپی تھی (یونیسکو نے اس کی اہمیت محسوس کر کے مجھ سے اس کا فرانسیسی ترجمہ کرایا ہے، جو چھپنے کے لیے بیروت بھیجا جا چکا ہے۔)

تحریری قانونِ دستور:

دستور یعنی حکومت کرنے کا طریقہ اتنا ہی قدیم ہے، جتنا خود مملکت کا دنیا میں وجود۔ لیکن اگر دستور سے ہم حکومت کا صرف وہ طریقہ مراد لیں، جو تحریری اور مدوّنہ بھی ہو اور ملک کے حکمران کی طرف سے نافذ کیا ہوا بھی ہو، تو یہ اسلام سے قبل مجھے کہیں نہیں ملا۔

چین کے کنفیوشس کی کتاب ''شوکنگ'' ہندوستانی کوٹلیہ کی ''ارتھ شاستر'' اور یونانی ارسطو کے ''دستورِ اتھنس'' کو دستورِ مملکت کہا جا سکتا ہے، لیکن یہ وزیروں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں، کسی حکمران کی طرف سے نافذ کردہ آئین نہیں۔ مزید برآں ارسطو کی کتاب میں شہری مملکت اتھنس کے دستور کی تاریخ اور ارتقا بھی بتایا گیا ہے۔ گویا یہ ایک درسی اور تاریخی کتاب ہے، قانونی دستاویز نہیں۔ ارسطو سے پہلے سولن کا کارنامہ بھی اس ذیل میں نہیں آتا کیونکہ نہ صرف یہ کہ سولن ملک کا واحد حکمران نہیں تھا، بلکہ یہ بھی کہ اس نے اپنے وطن کے دستور میں صرف چند ترمیمیں کیں، سارا دستور مدوّن اور نافذ نہیں کیا۔

زمانۂ حال میں انگریزوں کا ماگنا کارٹا جن حالات میں بھی مرتب ہوا ہو، وہ بہر حال ۱۲۱۵ء میں وجود میں آیا۔ فرانسیسی اور امریکی دستور تو اور بھی بعد کے ہیں۔ ان حالات میں پیغمبر اسلام کا دستورِ مملکت مدینہ جو ۶۲۲ء کے غالباً ماہ جون میں مدوّن اور نافذ ہوا، دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور مملکت کہا جا سکتا ہے۔

ہوا یہ کہ جب آنحضرتؐ نے بت پرستی ترک کرنے اور اچھے اخلاق و عادات پر عمل کرنے کی اسلامی دعوت دی، تو ان کے ہموطنوں نے مخالفت کی، اور روز افزوں

اذیت دینی شروع کی۔ آخر مجبور ہو کر آپ کو ترکِ وطن کرنا پڑا۔ آپ مدینہ چلے آئے، جہاں حکومت کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں تھا۔ شہر عبارت تھا، چند قبیلوں سے جو آئے دن خانہ جنگیوں میں مبتلا رہتے تھے چونکہ یہاں کے سر برآوردہ قبیلوں کے سردار مسلمان ہو گئے تھے، اسلیے اس ''اجنبی غیر جانبدار'' شخص (یعنی پیغمبر اسلام) کی سرکردگی میں بہ آسانی امن قائم ہو گیا۔ رسول اکرم نے ۵۲ دفعات پر مشتمل ایک دستاویز مرتب فرمائی، جس میں مدینے کو ایک شہری مملکت اور خود مختار سلطنت قرار دیا گیا؛ حکمران اور رعایا کے باہمی حقوق و فرائض بتائے؛ عدل گستری، قانون سازی، جنگ و صلح وغیرہ کے اصول درج کیے؛ مسلمانوں اور غیر مسلم رعایا کے تعلقات کی تفصیل دی؛ مختلف اہم مالی ذمہ داری پیدا کرنے والے حادثات کے لیے بیمے (انشورنس) کا نظام قائم کیا؛ اور دیگر انتظامی تفصیلات کے علاوہ صراحت سے یہ بھی کہا گیا کہ مسلمان ہوں کہ غیر مسلم، ساری رعایا اپنے جھگڑوں میں آنحضرت کا حکم بجا لائیگی۔

اس دستور کو تاریخ نے محفوظ رکھا ہے اور دنیا کی بڑی بڑی زبانوں کے علاوہ اس کا اُردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے (دیکھیے میری کتاب ''عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی'' میں باب ''دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور)۔

موازنۂ حکومت (بجٹ):

مختلف مذہبوں اور تمدنوں کی اساسی کتابوں میں جہاں حکمرانی کے قواعد کا ذکر ملتا ہے، وہیں حکومت کی آمدنی اور ٹیکسوں وغیرہ کی تفصیل بھی کچھ نہ کچھ ملتی ہے [1] لیکن میرے علم میں اس سرکاری آمدنی کے خرچ کے قواعد اسلام سے قبل کہیں نہیں ملتے؛ گویا ان کو حکمران کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

---

[1] مسلمانوں میں ہارون رشید بلکہ اس سے بھی کچھ قبل کے مفصل موازنے اب تک تاریخ میں محفوظ ہیں کہ کس مد سے، کس مقام سے، کتنی رقم وصول ہوتی تھی۔ غیر مفصل موازنے یعنی مجموعی آمدنی کا ذکر عہد بنی اُمیہ کے گویا آغاز سے ملتا ہے۔ صوبۂ عراق کی آمدنی تو حضرت عمر کے زمانے سے معلوم ہے، اور ہر دور میں جو کمی زیادتی اس میں ہوتی رہی، اس کا بھی پتا چلتا ہے۔

Marfat.com

قرآن وہ واحد دینی کتاب ہے، جس میں موازنہ خرچ کے تفصیلی احکام دیے گئے ہیں، اور حکم دیا گیا ہے کہ سرکاری آمدنی کن چیزوں پر خرچ کی جائے (دیکھیے سورہ ۹:۶۰):

> جز ایں نیست کہ مسلمانوں سے وصول ہونے والے محاصل فقراء اور مساکین کے لیے ہیں، نیز ان لوگوں کے لیے جو (ان محصولوں کے وصول اور خرچ کرنے کا) کام کریں؛ اور ان کے لیے جن کے دل موہ لینا مقصود ہو؛ اور گردنوں (کو جُوئے سے چھڑانے) کے لیے؛ اور کچلنے والی مالی ذمہ داریوں میں دبے ہوئے لوگوں کے لیے؛ اور اللہ کی راہ میں؛ اور فرزندِ راہ (مسافر) کے لیے۔ یہ اللہ کی طرف سے مقرر کیا ہوا فریضہ ہے اور اللہ خوب جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اس میں ابتدائی لفظ بہت اہم ہیں ''جز ایں نیست'': اس کے سوا کچھ اور نہ کیا جائے۔ اس آیت میں آٹھ جامع مدات گنائی گئی ہیں، جو حکومت اور رعایا کی بہی خواہ حکومت کے سارے اخراجات پر حاوی ہیں۔ اس آیت میں صرف مسلمان رعایا سے وصول ہونے والے محصولوں کا ذکر ہے، غیر مسلم رعایا کے ٹیکس کے خرچ کرنے کے احکام دوسری آیتوں میں ہیں۔ موجودہ آیت کے سلسلے میں امام ابو یوسف کی 'کتاب الخراج' میں حضرت عمر کا یہ قول درج ہے کہ فقراء سے مسلمان محتاج مراد ہیں اور مساکین سے غیر مسلم مساکین۔ تیسرا زمرہ ''عاملین'' کے لیے ہے؛ اس میں سارا کشوری اور لشکری نظم ونسق شریک ہو جاتا ہے، گویا ملازمین سرکاری۔ چوتھی مد مولفۃ القلوب کے لیے ہے۔ اس کی تشریح ابو یعلیٰ الفراء نے اپنی ''الاحکام السلطانیہ'' میں یوں کی ہے:

> اس میں چار قسم کے لوگ شامل ہیں: پہلے وہ، جو مسلمانوں کی مدد کریں؛ دوسرے وہ، جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے باز رہیں، تیسرے وہ، جو اسلام قبول کرنا چاہیں، چوتھے وہ، جن

Marfat.com

کی وجہ سے ان کے عزیز اور رشتے دار مسلمان ہو سکیں۔ان میں سے ہر کسی پر یہ مد خرچ کی جا سکتی ہے، چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔

گویا یہ آج کل کی اصطلاح میں ''سیکرٹ فنڈ'' ہے۔ پانچویں زمرے میں، فقہاء اور مفسر، دو اخراجات شامل کرتے ہیں: ایک تو ملک میں پائے جانے والے غلاموں کو آزاد کرانا، (ان کے آقاؤں کو معاوضہ دے کر)؛ اور دوسرے ملکی رعایا، چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم، اگر وہ دشمن کے ہاتھ جنگ وغیرہ میں قید ہو گئی ہو، تو ان کی رہائی کے لیے فدیہ دینا، چھٹا زمرہ قرض اور مالی ذمہ داری سے دبے ہوئے لوگوں کا ہے۔ یہ فقراء و مساکین نہیں، جن کا اوپر ذکر آ چکا ہے، بلکہ وہ لوگ ہیں جن کی ضرورت عارضی ہوتی ہے، مثلاً زلزلے یا طغیانی کے مصیبت زدہ، خون بہا ادا کرنے کے مستوجب وغیرہ۔ایسے لوگوں کی بلا معاوضہ مالی اعانت بھی کی جا سکتی ہے، انہیں بلا سود قرض بھی دیا جا سکتا ہے، جیسا کہ حضرت عمر کے زمانۂ خلافت میں اکثر ہوتا رہا۔ ساتویں مد ''فی سبیل اللہ'' کی ہے، جس میں فقہاء اور مفسر کے نزدیک سب سے پہلے ملک کا دفاع اور فوج آتے ہیں۔ اس کے بعد مسجدیں، مدرسے اور سارے خیراتی کام ہیں۔ آٹھویں اور آخری مد ''فرزندِ راہ'' کی بتائی گئی ہے۔ مسافروں کی مہمان نوازی صرف یہی نہیں کہ انہیں مفت کھانا کھلا دیا جائے، سفر کے لیے سڑکوں، پلوں کی تعمیر، جان و مال کی حفاظت کے لیے پولیس کا انتظام، حفظانِ صحت کے لیے دوا سازوں اور دوا فروشوں کی نگرانی اور شفا خانوں کا قیام، ان کے رہنے کے لیے ہوٹلوں، سرایوں کا نظام وغیرہ۔ غرض وہ سارے انتظامات آ جاتے ہیں، جن سے ''فرزندِ راہ'' کو جانی اور مالی حفاظت اور آرام مل سکتا ہے۔

<u>متفرقات:</u>

مجھے تو کسی قدیم قانونی نظام میں ''نیت'' کا ذکر بھی نہیں ملا۔ یہ آنحضرت کے قول ''انما الاعمال بالنیات'' (اعمال نیتوں ہی پر مبنی ہیں) کے باعث اسلامی قانون،

Marfat.com

خاص کر فوجداری اور تعزیرات میں اہمیت کی حامل ہے۔ نابالغ بچے، مجنون، سہو اور غلط فہمی میں مبتلا شخص وغیرہ، اسی بنا پر مستوجب سزا قرار نہیں پاتے۔

تقابلی قانون بھی مجھے اوّلاً مسلمانوں کے ہاں ملتا ہے۔ ''اختلاف الفقہاء'' نامی کتابوں میں نہ صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ فلاں مسئلے میں کس کی کیا رائے ہے، بلکہ یہ بھی کہ ہر ایک فریق کی دلیل کیا ہے پھر کسی بنیادی اختلاف کے نتائج اور تفرعات کا ذکر ہوتا ہے۔ مسلمان فقہا نے اپنی قانونی کتابوں میں احکام کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے، عبادات، معاملات، عقوبات، اور وراثت۔ اس طرح یہ دینی اور دنیوی، روحانی اور مادّی، ساری زندگی کے احکام پر حاوی ہو جاتے ہیں بلکہ وراثت میں تو مرنے کے بعد اثر انداز ہونے والے احکام (وصیت، تقسیم ترکہ وغیرہ) سے بھی بحث ہوتی ہے۔

آخر مین تدوینِ قانون کی تیز گامی کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ زید بن علی (ف ۷۳۸ء) کی کتاب قدیم ترین موجودہ کتاب ہے اور مذکورہ تقسیم پر مشتمل ہے اور امام محمد شیبانی (ف ۸۰۵ء) نے جو شارلمانؒ کے ہمعصر ہیں ''کتاب المبسوط'' لکھی، جس کا نامکمل مخطوطہ، جو استانبول میں ہے، چار ہزار صفحوں پر مشتمل ہے۔ گویا رسول اکرم کی وفات کے سو سال کے اندر ایک اَن پڑھ قوم تمدن کی اس سطح پر پہنچ گئی کہ دنیا کی تاریخ قانون میں اہم اضافوں کے قابل ہو جائے۔

(نذرِ عابد۔ مرتبہ مالک رام
مجلس نذرِ عابد۔ نئی دلی ۱۹۷۴ء)

Marfat.com

رُومی قانون اور اسلامی قانون کے تعلقات پر چند ملاحظات

حق بات کو ماننا چاہیے۔ خواہ وہ تلخ ہو، مسلمان فقہاء نے اسلامی قانون کی جو تدوین کی، آیا اس میں انہوں نے فلسفے، طب وغیرہ کی طرح، بیرونی مدد لی یا نہیں؟ اگر لی ہے تو چشم ماروشن اور اگر نہ لی تو چشم ماروشن، اس میں نہ تو شرمانے کی ضرورت ہے اور نہ مغرور ہونے کی بلکہ تلاش وتحقیق کی ضرورت ہے۔ اسی جذبہ کے تحت اس موضوع کا میں مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ ''وَفَوقَ کُلِ ذی عِلم عَلِیم۔''

بعض ''بے رنگ'' اہل قلم کو ضد ہے کہ رنگدار قوموں میں اپج نہیں ہوسکتی اور اُن کی ہر عمدہ چیز یونان یا روما کی نقل اور بگڑی ہوئی نقل ہوتی ہے، فقہ کی حد تک اہل قلم کی کمی نہیں اور اُن کی متفقہ یقین دہانی پر'' طائفان وزدان برسر قلۂ کوہ نشستہ بودند'' کا قصہ صادق آتا ہے اور بکرا لے جانے والوں میں بعض بھولے بھی ہوتے ہیں، میں نے ایسی بہت سی چیزیں پڑھیں لیکن ان میں بے بنیاد مفروضات اور بے دلیل دعووں کے سوا کم ہی کوئی چیز ملی۔

ایک مقالہ فقہ اسلامی کی تدوین وارتقاء میں بیرونی موثرات پڑھا تھا۔ ایک اور مقالہ انجمن علمی اساتذہ جامعہ عثمانیہ کو سنایا گیا تھا۔ رسالہ اسلامک کلچر حیدرآباد ۱۹۳۹ء (ص ۱۲۵ تا ۱۲۶) میں بھی بعض چیزیں شائع کیں۔ امام ابوحنیفہ کی تدوین قانون اسلامی (مجموعہ مقالات حیدرآباد اکاڈمی ۱۳۶۱ھ) کا باب بھی اسی پر مشتمل ہے۔ سب سے مفصل بحث میں نے کل ہند موتمر مستشرقین ہند کے اجلاس حیدرآباد ۱۹۴۱ء میں کی۔ مجھے علم نہیں یہ مقالہ اس کی روداد میں چھپا یا نہیں لیکن اسے حیدرآباد اکاڈمی کے مجموعہ

Marfat.com

مقالات (۱۹۴۳ء) میں انگریزی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ (انفلوئنس آف رومن لا ان مسلم لا)

ہندی موتمر مستشرقین (۱۹۴۱ء) کے ایک سال بعد اطالوی زبان میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے اس کا نام "تحریرات کارنونال یسو آنجہانی، جلد چہارم، مشرق قوانین" ہے مجھے اس کا علم ابھی چند ماہ ہوئے ۱۹۵۲ء میں ہوا۔ یہ مقالہ ۱۹۴۳ء میں لکھا گیا تھا لیکن چھپ نہ سکا اور ۱۹۴۲ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ مارگیولوث، شاخت وغیرہ کے مضامین کے مقابلہ میں یہ ایک دیانت دارانہ علمی تحقیق ہے اور اس قابل ہے کہ ہمارے اہل علم اس سے واقف ہوں۔

ایک اور مضمون جامعہ الجزائر کے پروفیسر بوسکے نے ۱۹۴۷ء میں فرانسیسی میں لکھا تھا جو رویو الثر یرئین (جولائی تا ستمبر ۴۷ء مطبوعہ الجزائر) میں چھپا تھا۔ یہ ایک طرح سے نال یسو کے مضمون کا تکملہ ہے اور رطب ویابس پر مشتمل ہونے کے باوجود کافی معلومات کا حامل ہے۔

اولاً نال یسو کا مضمون اطالوی سے ترجمہ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ اگر ناظرین کو پسند آیا اور طلب جاری رہی تو فرانسیسی مضمون (مولفہ بوسکے) کا ترجمہ بھی گزرانا جائے گا۔

میں یہاں صرف ایسے خیالات پیش کروں گا جو اصلاً تاریخی نوعیت کے ہیں۔ اور یہ اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ ممتاز ماہران قانون کے اس کثیر مجمع میں مجھے کچھ کہنے کی گنجائش ہو سکے۔

اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو وہ پہلا شخص جس نے یہ دعویٰ کیا کہ اسلامی قانون مادی حد تک رومی قانون سے ماخوذ ہے، ۱۸۶۵ء میں دوے نی کوکات تیسکی (Domenicogathesche) تھا (دیکھو اس کی اطالوی تالیف Ioanual di dirittopublicopri vato otto mano) یعنی عثمانی قانون عمومی و خصوصی کی متداول کتاب مطبوعہ سکندریہ ۱۸۶۵ء۔ یہ شخص سکندریہ کی عدالتِ مرافعہ مخلوط میں وکالت کرتا تھا اور انجمن المعہد المصری کا رکن تھا۔ اسے نہ عربی آتی تھی اور نہ ترکی لیکن اسے سلطنتِ عثمانیہ (ترکی) اور مصر سے

Marfat.com

تعلق رکھنے والے مسائل قانون وضابطہ سے بڑی دلچسپی تھی اور اس موضوع پر قابل قدر کتابیں (مغربی زبانوں میں [1]) ناپید نہ تھیں۔

وہ اپنے قیاس کا آغاز بعض مفروضات سے کرتا ہے جو اس حیثیت سے بہت کچھ قابلِ بحث ہوتے ہیں کہ تاریخی وجوہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے یا نہیں اور یہ کہ دونوں قوانین (جسٹی نین کے قانون روما اور اسلامی قانون) میں متعدد مشابہتیں پائی جاتی ہیں، یا نہیں۔ اس کا گمان تھا کہ رومی احکام وقواعد کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب جعلی حدیثوں کی شکل میں مسلمانوں نے اپنے ہاں آسانی داخل کر لیا ہو گا۔

اس وقت سے اس نظریہ کی طرح طرح سے تائید کی جاتی رہی ہے۔ کبھی تو پورے اذعان کے ساتھ اور کبھی محض قیاس کی بناء پر یہ موید ین یا تو غیر مستشرق قانون دان ہیں، جن میں سے بعض براہِ راست یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ مسلمانوں کا قانون اساساً رومی قانون ہے۔ جس میں بہ مشکل کوئی ترمیم کی گئی ہے جیسا کہ ہنری ہیوز نے ۱۸۸۱ء میں کہا تھا یا وہ طلبہ مسائل اسلامی ہیں۔ جو قانون میں بہت کم دخل رکھتے ہیں۔

لیکن حقیقت میں کسی نے بھی اس موضوع کی ساری پیچیدگیوں پر غور نہیں کیا جو اسلامیاتی ماخوذیت کے طرفدار ہیں۔ وہ یا تو عام ادعا پر اکتفا کرتے ہیں جو تخمینی اندازوں کا ثمرہ ہوتا ہے، نہ کسی گہرے مطالعے کا، یا بہت ہی مخصوص نکات تلاش کرتے ہیں۔ یا معین اسلامی قواعد اور متعین رومی قواعد کی مماثلتوں کو جمع کرتے ہیں جو بعض وقت زیر بحث مسئلہ پر اثر انداز تو ہوتی ہیں لیکن اس سے اس کا اثبات نہیں ہوتا اور یہ مماثلتیں بے شبہہ زیر بحث مسئلے پر قیمتی مواد مہیا کرتی ہیں لیکن اس کو حل کرنے سے بہت دور ہیں۔

ان کے مقابلہ میں چند جدید مسلمان ایرانی بہائی مؤلف، ابو الفضل الجار فقدانی کی ایک تالیف کی بناء پر جو ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی اور جس کا عربی متن عبدالجلیل سعد

---

[1] یہ تین لفظ میں نے اپنی طرف سے بڑھائے ہیں۔ غالباً یہی مراد ہے (مترجم)

Marfat.com

کی ''مقدمۃ القوانین'' میں ہے، یہ ادعا کرتے ہیں کہ جس چیز کو اہل یورپ رومی قانون کہتے ہیں وہ اصل میں اسلامی قانون سے ماخوذ ہے۔

اس لیے میں چاہتا ہوں کہ قانون روما کے (جس سے اس کا وسیع ترین مفہوم مراد ہے) قانون اسلام پر عمیق اثر پڑنے کے متعلق مجھے جو شکوک وشبہات ہیں، ان کے سب وجوہ یکجا بیان کردوں اور چند ایسے نکات بتاؤں جن کو ان دونوں قانونوں کے باہمی تعلقات پر رائے ظاہر کرنے والوں نے یا تو محض بے وجہ فرض کرلیا یا نہایت ناکافی بنیاد پر انہیں قابل لحاظ قرار دے لیا۔

(ا) ایک اور خلط مبحث اس مسئلہ میں اس بناء پر پیدا ہوتا ہے کہ ہم یہ بتانا بھول جاتے ہیں کہ قانون اسلامی کا کیا مفہوم ذہن میں ہے۔ ''قانون اسلامی'' کی یہ اصطلاح اہل یورپ کے ہاں مختلف معنی اختیار کرلیتی ہے۔ اکثریت کے ہاں یورپی زبانوں اور نظاموں میں اس کے ہم معنی اصطلاح کی غیر موجودگی کی وجہ سے جس چیز کو مسلمان ''فقہ'' سے موسوم کرتے ہیں، اسؔ کا مفہوم یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مذہبی قانون (شریعت) کا وہ حصہ ہے جو مومن کے خدا کے ساتھ، اپنے آپ کے ساتھ اور دوسروں کے ساتھ پائے جانے والے تعلقات ظاہری کے احکام بیان کرتا ہے۔ قانون کا جو مفہوم اہل مغرب کے ہاں ہے، اس کو دیکھتے ہوے یہ تعریف ایک جہت سے ضرورت سے زیادہ وسیع ہے اور ایک جہت سے ضرورت سے زیادہ تنگ ہے چنانچہ عبادات جن میں بعض ایسے احکام بھی مندرج ملتے ہیں جو ہمیں قانون عمومی سے متعلق معلوم ہوتے ہیں مثلاً نظامِ خراج کے بعض اجزاء اور قواعد معدنیات وغیرہ قانون خاندان واشخاص و وراثت، قانون جائداد (بشمول اوقاف) قانون معدلت (آداب القاضی) وعقوبات، قانون جنگ (سیر) اور بعض ایسے مسائل جو اہل مغرب کو مذہبی رسم ورواج سے زیادہ متعلق نظر آتے ہیں مثلاً یمین و نذر معمولی مسالخ قربانی کا ذبیحہ جائز و ناجائز اکل و شرب، صید البر والبحر، لباس جن کا ذکر فقہ میں ہوتا ہے اس کے برخلاف مقدس مصادر (قرآن وحدیث) کے مہیا کردہ عناصر میں صراحت نہ ہونے کے باعث قانون عمومی کے اہم حصے اور خود قانونِ خصوصی (پرائیویٹ لا) کے متعدد اجزاء، فقہ سے خارج سمجھے

گئے ہیں مثلاً نظریۂ سلطنت و سلطان قانون انتظامی کے بہت سے اجزاء جن کو سیاستِ شرعیہ کہا جاتا ہے یعنی معاملہ عمومی میں صوابدید کا اس طرح استعمال کہ وہ شریعت کے خلاف نہ ہو۔

بعض اہل یورپ قانون اسلامی کے ایک ایسے معنے بتاتے ہیں جو فقہ سے کافی مختلف ہیں۔ چنانچہ وہ فقہ سے اپنے من مانے ایسے اجزاء الگ کر لیتے ہیں جو مغربی تصورات کے مطابق واقعی قانون ہیں اور اُن میں وہ کچھ تو ایسے امور کا خاص کر قانون عمومی کے مسائل کا اضافہ کر لیتے ہیں جو مسلمانوں کی نظر میں سیاستِ شرعیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ ایسے مسائل کا جو فقہ میں بڑھائے گئے ہیں اور متاخر زمانہ میں گوارا کر لیے گئے ہیں مثلاً طویل المدت اجاراتِ اراضی کے معاہدے جن کو بہت متاخر زمانے میں بحر متوسط کے اسلامی ممالک میں اوقاف اور جاگیروں کی کثرت و ترقی کے باعث جائز تسلیم کر لیا گیا ہے۔

اس طرح بعض وقت خاص کر نو آبادیاتی ماحول میں قانون اسلامی کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ اس قانون کا نام ہے جو کسی خاص علاقے کے مسلمانوں میں مستعمل ہو یعنی وہ اجزائے فقہ جن پر عمل متروک نہ ہو گیا ہو بشمول اس خالص رواجی قانون کے جس کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

ہر شخص محسوس کر سکتا ہے کہ اگر مذکورۂ بالا تین تعریفوں میں سے کسی ایک کو بھی ترجیح دی جائے تو قانون روما کے ساتھ تعلقات کا مسئلہ کس قدر مختلف طور پر پیدا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ مذکورہ صدر تعلقات کے متعلق جو لوگ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں ان میں سے اکثر کے متعلق یہ واضح نہیں ہوتا کہ آیا وہ صرف کلیات موضوعہ کی حد تک یعنی بطور علم قانون کے قانون اسلام کو قانون روما کا تابع قرار دیتے ہیں (جیسا کہ حقیقت میں بعض کا خیال ہے) یا صرف کتابوں میں مواد کی ترتیب و تبویب کی حد تک۔

(۲) مزید بحث سے پہلے یہ متعین کرنا ضروری ہے کہ عربی قانون یا عربی قانونوں کی حالت اسلام سے پہلے کیا تھی۔ اس بارے میں بنیادی تحقیقات اب تک عمل میں نہیں

Marfat.com

لائی گئی ہے اور ایسی تحقیقات کی ضرورت کو وہ لوگ بالکل نظر انداز کرتے رہے ہیں جو یہ رائے رکھتے ہیں کہ اگر خاندان (ازواج اور اس کے تعلقات) وراثت، تعزیرات اور طریقہ عدل گستری کے قانون کو چھوڑ دیا جائے تو عربوں کا قانون ایک ایسی خلا سے مشابہ تھا جسے رفتہ رفتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے زمانوں میں غیر عربی اقوام نے جو اسلامی حکومت کے ماتحت اور مسلمان بنائی گئی تھیں اجنبی قوانین سے پر کر دیا۔

لیکن قبل از اسلام ترقی یافتہ عربی قوانین کا پایا جانا ہر شک و شبہ سے پاک ہے۔ ہم صرف جنوب مغربی عرب ہی سے بحث نہیں کرتے جو نہایت پرانے شہر روما کی بنیاد رکھے جانے سے بھی پہلے قدیم تمدن کا مرکز تھا اور جس میں مملکتی عضویتیں (یا ادارے) شاہی قسم کے دستور کے ساتھ مستحکم طور پر موجود تھے اور جہاں اس کا رواج عام تھا کہ معاہدوں کو پتھر یا تانبے پر کندہ کر کے شائع کرتے تھے اور جہاں ایک بااقتدار تحریری قانون بھی پایا جاتا تھا چنانچہ ۱۹۲۷ء میں ایک سبائی کتبہ شائع کیا گیا ہے جس میں سبا اور ذوزیدان کے بادشاہ شمر یہرعش (تقریباً ۲۸۰ء) نے جانوروں اور غلاموں کی جنایات کے سلسلہ میں قانون تعذیب (قید و جلاوطنی؟) کے حدود و احکام مقرر کیے ہیں۔ اس جنوب مغرب ہی سے نہیں بلکہ ہم ۶۰۰ء کے لگ بھگ کے زمانے کی حجاز کی حضری و شہر نشین آبادیوں سے بھی بحث کرتے ہیں۔ جن کی مدد کو اسلام نکل کھڑا ہوا تھا۔ یہ ممکن نہیں کہ اس سے صدیوں پہلے ان لوگوں میں قانون جائداد نے قابلِ ذکر ترقی نہ کر لی ہو۔ اس بات کی طرف اشارہ کافی ہے کہ قریش مکہ بین الممالک نوعیت کا عظیم الشان کاروانی وتجارتی کاروبار کرتے تھے اور خانۂ کعبہ کے حج کے سلسلہ میں میرہ (غلہ رسانی) وخفارہ (بدرقہ) کی عظیم خدمات انجام دی جاتی تھیں، بڑے زرعی اور آب رسانی کے کام انجام دیے گئے تھے اور مدینہ تبوک، تیما، الیمامہ وغیرہ کے نخلستانوں میں مختلف قسم کے زراعتی معاہدے ہوا کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کم سے کم اسلامی قانون جائداد کے ایک بڑے حصے کے جراثیم اس آبادی میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کافی پہلے وجود میں آچکے تھے۔

بیشک یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ فلسطین و شام سے تماس کے باعث رومی اثرات

عرب میں آ گئے ہوں لیکن اگر ایسا ہوا ہوگا تو یہ اثرات اسلامی قانون پر قبل اسلام کے عربی قانون کے توسط سے پڑے ہوں گے نہ کہ اسلامی زمانے میں جب کہ عربوں نے اپنے جزیرہ نما کے باہر بڑی فتوحات حاصل کیں اور یہ مفروضہ بھی محض گمان ہی گمان ہے جس کی اب تک واقعات وحقایق سے کوئی تائید نہیں ہوتی اور اگر ایسی کوئی چیز ثابت بھی ہو جائے تو اس سے دوسری قسم کی دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔ میں یہاں صرف ایک چیز کے ذکر پر اکتفا کرتا ہوں۔ یہ پانچویں صدی عیسوی کے نصف اول کی مشہور شہادت تھیوڈوریتو کا بیان ہے کہ رومی سلطنت کے اقصائے حدود میں ایسی آبادیاں ہیں جو روما کی ماتحت تو ہیں مگر ان پر رومی قانون نافذ نہیں ہوتا، تھیوڈوریتو اس کی وضاحت میں لکھتا ہے کہ

"علاوہ اور اقوام کے طاقتور اسماعیلی قبائل Te pom polaphyla toy Ismaeel اس میں شامل ہیں۔"

اب صرف یہ دریافت طلب رہتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ان علاقوں میں جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اسلام پیدا ہوا اور پھلا پھولا زمانۂ قبل اسلام کے قانون جائداد کو جزءً ہی سہی بحال کیا جا سکے؟ اس سوال کا جواب تقریباً نفی میں ہوگا۔ اگر ہم صرف اس مواد پر اکتفا کریں جو پرانی عربی شاعری اور زمانہ قبل اسلام اور پہلی صدی ہجری کی اولیات مہیا کرتی ہیں اور ان معلومات کو نظر انداز کر دیں جو حدیث میں بیان ہوئے ہیں، جدید "اسلامیاتیوں" کو شاعری وقصص کے ان ماخذوں پر بڑا غرہ ہے۔ یہ اعتماد دینیات، سیاسیات، اخلاق وغیرہ کے متعلق تو درست ہوگا لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ خاص قانون کے معاملہ میں صورت حال مختلف ہے۔ مذکورہ صدر شعبوں کے برخلاف قانونی احکام پر مشتمل حدیثوں کی تعداد ہزاروں پر مشتمل نہیں بلکہ مختصر ہے اور ان میں وہ صورت حال بھی نہیں ہے جو اسنوک مورخ دینے Snon ck Hurgronje نے دوسرے معاملات میں مشاہدہ کی ہے کہ کسی معینہ مسئلہ میں اگر ایک حدیث ایک بات کا حکم دیتی ہے تو دوسری حدیث اس کے بالکل خلاف ہے اور ایک تیسری حدیث الفاظ کے ایسے لطیف فرق سے جو بہ مشکل محسوس ہوتا ہے دونوں کے بین بین حکم دیتی اور

Marfat.com

دونوں اضداد میں تطابق پیدا کر دیتی ہے۔ قانون میں مختلف مذاہب فقہ اختلافی مسائل میں بیشتر مختلف حدیثوں کی بنیاد پر اختلاف نہیں کرتے بلکہ عموماً ایک ہی حدیث کی مختلف تعبیروں کی اساس پر اختلاف ہوتا ہے مثلاً خیار مجلس کو شافعی، حنبلی اور اثنا عشری جائز قرار دیتے ہیں اور مالکی اور حنفی ناجائز اور یہ اختلاف ایک ہی حدیث کی مختلف تعبیروں کے باعث ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ایسے اختلافات میں مسلمانوں کی ابتدائی نسلوں نے ان صورتوں میں حدیثیں وضع نہیں کیں بلکہ جبکہ عدم تیقن اور ارادہ میں اختلاف ہو۔ مثلاً وقف کے سلسلے میں۔ جس میں بے شمار اختلافات ہیں یا نہیں اور دوسرے اہمیت رکھنے والے مسائل کے سلسلے میں۔ ایسے معاملات میں مسلمان فقہاء اپنی رائے کی تائید میں جو حدیثیں بیان کرتے ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے۔

اس قسم کے مشاہدات کی بنا پر مجھے امید ہے کہ حدیثوں کو کام میں لا کر قبل اسلام کے عربی قانون کو بحال کیا جا سکتا ہے۔

(۳) اس امر کی تائید کہ اسلام سے پہلے ایک ایسا عربی قانون موجود تھا جو قابل ذکر ترقی کر چکا تھا، اس واقعہ سے بھی (جس کا بظاہر کسی نے اب تک لحاظ نہیں کیا ہے) ہوتی ہے کہ اسلامی قانون کا ایک بڑا حصہ بشمول قانون جائداد پہلی صدی ہجری ہی میں مدون ہو چکا تھا اگر اتنی جلد تشکیل کو نہ مانیں تو پھر میرے خیال میں اس دوسرے واقعے کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکے گی کہ مسئلہ متعہ کو چھوڑ کر مسلمانوں کے مختلف غیر راسخ العقیدہ [1] فرقوں (شیعہ، خوارج) اور راسخ العقیدہ (سنی) فرقوں کے مذاہب فقہ میں اس سے زیادہ فرق نہیں ہے جتنا خود سنیوں کے چاروں مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو اس کی بنا پر یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسلامی قانون عمومی طور پر ان تفرقوں کے پیدا ہونے سے قبل تشکیل پا چکا تھا جو بڑے معتقداتی اختلافات کے باعث رونما ہوئے اور یہ کہ مدینے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کی نسلوں میں فقہاء (سبعہ) کے پائے جانے کی جو روایت بیان کی جاتی ہے وہ اس سے زیادہ اعتماد کی مستحق ہے جتنا اب تک اس پر کیا

---

[1] یہ اصطلاح مولف کی ہے مترجم کی نہیں۔

Marfat.com

جاتا ہے اور یہ بھی ملحوظ رہے کہ چونکہ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں شیعوں کو سیاسی اقتدار حاصل نہ تھا اور اس طرح انہوں نے اپنا نظامِ قانون اس امکان کے بغیر تعمیر کیا کہ اس کا عملی اطلاق ہو اس لیے ان کو اس کی تحریک ہوئی ہو گی کہ اس سے زیادہ آزادی کے ساتھ عمل کریں جتنا راسخ العقیدہ سنی جو حقائقِ حیات کے لحاظ کرنے پر مجبور تھے۔

(۴) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً ہی بعد عربوں نے اپنے ہولناک حملوں سے نہ صرف بیزنطینی (رومی) سلطنت کے کئی بڑے ایشیائی اور افریقی صوبے چھین لیے بلکہ ایک دوسری بڑی سلطنت ایران کو بھی شکست دے کر اس پر پوری طرح قبضہ کر لیا۔ اس لیے نظریے کی حد تک یہ خیال کرنا منطقی ہو گا کہ اسلامی فقہ پر ساسانی قانون کا اثر بھی پڑا ہو گا اور ایرانی نظم ونسق نے فوراً ہی اسلامی نظم ونسق کو بعض اصطلاحیں مہیا کیں مثلاً ''دیوان'' یا خلیفہ ثانی حضرت عمر ۱۳ تا ۲۳ھ /۶۳۴ء تا ۶۴۴ء نے فتح کے بعد ہی بابل اور عراق کے علاقہ کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ اسلامی قانون کے مطابق مفتوحہ ممالک میں اراضی کے مالگذاروں سے برتاؤ کرنے کا ایک نمونہ بن گیا۔ اس نظامِ مالگذاری نے ایران سے چند اصطلاحیں بھی لے لیں، مثلاً بیع المرابحہ کا ایک دوسرا نام (دہ یازدہ، دہ دوازدہ) گویا اس میں حط نہیں بلکہ ربح ہوتا یا لفظ سفتجہ (ہنڈی) جس کا کوئی عربی مترادف نہیں یا پانی کے قواعد جو ایسے ممالک میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں جہاں زندگی صرف آب پاشی پر منحصر ہو اور یہ اچھی طرح ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اسلام سے قبل ہی ساسانی سلطنت نے علاقہ بابل کی پوری سرحد پر بدویوں کے حملوں کو روکنے کے لیے ایک حاجز مملکت کھڑی کر دی تھی اور آخر میں یہ بھی لحاظ کے قابل ہے کہ خاص علاقہ مابین النہرین اور بابل ہی میں جہاں ساسانی پایۂ تخت تھا، سنیوں کے دو بڑے مذاہب حنفی وحنبلی کے بانیوں نے زندگی گزاری اور تدریس کا کام انجام دیا نیز ایک اور سنی مذہب شافعی کے بانی کی زندگی کا پہلا حصہ بھی وہیں گزرا۔ اسی طرح مختلف فرقوں کے مختلف شعبوں کے نظام ہائے قانون بنانے والے بھی وہیں رہے۔ ان اسباب کی بنا پر نظریہ کی حد

Marfat.com

تک اسلامی قانون پر ایرانی ساسانی قانون کے اثرات کا بھی امکان ہے۔ اگرچہ اب تک اس قانون کے متعلق ہمیں عملاً کچھ بھی معلوم نہیں ہے اسی لیے زیر بحث مسئلے کے متعلق کوئی قیاس آرائی نہیں کی جاسکتی۔

قبل اسلام کے عربی قانون ہی کی طرح ساسانی قانون میں رومی یا یونانی اثرات کے سرایت کر جانے اور پھر اس کی راہ سے اسلامی نظام تک پہنچنے کا خیال کوئی لغو بات نہیں ہوگی لیکن پھر بھی یہ گمان ہی گمان ہوگا جس کا پیش کرنا تو آسان ہے لیکن ثابت کرنا مشکل۔

(۵) جسٹی نین (یوسنی نیان) کے زمانہ کے قانون روما کے قواعد اور اسلامی قوانین میں بہ کثرت مشابہتیں ہیں اور بعض صورتوں میں اثر انداز بھی لیکن یہاں مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر بیرونی مشابہت کی تائید اندرونی عناصر اور تاریخی دستاویزوں سے نہ ہو تو یہ مشابہت کتنی ہی مغالطہ انگیز کیوں نہ ہو، اس کے ثبوت کے لیے کافی نہیں ہے کہ ایک قانون دوسرے کا تابع اور اس سے ماخوذ ہے۔ جو لوگ اسلامی قانون کے بڑے حصے کے رومی قانون سے ماخوذ ہونے کا ثبوت دینے کی غرض سے مماثلتوں کو اکٹھا کرتے ہیں، وہ اس مسئلہ کے تین بنیادی نکتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں:

(الف) مثلاً وہ ان اختلافات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو اسلامی مذاہب فقہ میں خود چار راسخ العقیدہ سنی مذاہب میں بھی پائے جاتے ہیں اس لحاظ سے جن مسائل میں اسلامی قانون اور رومی قانون میں مشابہت بتائی جاتی ہے وہ کسی ایک مذہب کے چند احکام میں ہوتی ہے اور دوسرے مذاہب فقہ میں وہ احکام نہیں پائے جاتے۔ اس نکتہ کو فراموش کر دینے کی وجہ سے غیر عربی دانوں مثلاً دارستی (Daresle) کولر (Kohler) کی تحقیقات میں بعض ایسے عناصر کو اسلامی قانون کی خصوصیت قرار دے دیا گیا ہے، جو اس کے صرف کسی ایک مذہب فقہ کی خصوصیت ہیں۔

(ب) دوسرے وہ ان مماثلتوں کا شکار کرنے میں اس کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ان اختلافات کو بھی نمایاں کریں جو فقہ اور رومی قانون کے احکام میں

Marfat.com

پائے جاتے ہیں حالانکہ یہ اختلافات مکسوبہ حال کو پہنچنے میں کسوٹی کا سا کام دے سکتے ہیں۔

(ج) تیسرے وہ اس عمیق فرق کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں جو مغرب کے ام الادوار (کلاسیکل زمانہ) اور اسلامی دنیا میں "قانون" اور اس کے ماخذوں کے تصور کے متعلق پایا جاتا ہے۔ ایسی صورتیں بہت ہیں کہ وہ خیالات اور ادارات جو اس ہیلینی (یونانی) میں گہری جڑ پکڑ گئے تھے، عربوں کی فتح کے بعد عربی اسلامی تمدن کی اساس بن گئے پھر بھی وہ اسلامی قانون (فقہ یا غیر فقہ) میں سرایت نہ کر سکے مثلاً یہ سب جانتے ہیں کہ ہیلینی (یونانی) ماحول میں بیع وشراء کو ایک معاہدہ مالی سمجھا جاتا ہے حالانکہ تمام اسلامی مذاہب فقہ کا اجماع ہے کہ وہ ایک معاہدہ تراضی (آپس کی رضامندی کا معاملہ) ہے مسلمانوں کا یہ رجحان اس بناء پر نہیں ہے کہ وہ اس بارے میں رومی تصورات کی طرف رجوع کرتے ہیں اور نہ اس بناء پر ہے کہ وہ معاملہ مالی اور معاملہ تراضی میں امتیاز پیدا کرتے رہے ہیں بلکہ اس کی بنیاد وہ قرآنی آیت (سورہ نمبر۴، آیت نمبر۲۹) ہے جس میں "تجارۃ عن تراض" وارد ہوا ہے یعنی تجارت آپس کی رضامندی سے ہونی چاہیے۔

اسی طرح جب عربوں نے بہت مختصر مدت میں بیزنطینی سلطنت کے انتہائی زرخیز صوبوں پر قبضہ کر لیا تو انہوں نے وہاں مال گرو کرنے (hypathec) کا بڑا رواج پایا۔ اگرچہ یہ چیز خود یہودیوں کے قانون مشنا میں اپوطیقی کے نام سے آ گئی تھی مگر معاشی زندگی میں اُس کی اہمیت کے باوجود یہ ادارہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا کہ اسلامی قانون میں سرایت کر سکے اور اب ہمارے زمانہ میں یورپی قانون سازی کے ذریعہ سے (مسلمانوں میں) داخل کیا گیا ہے۔

ہیلینی دنیا میں طویل المدت اجارۃ اراضی بہت رائج تھا۔ مگر اس کو مسلمانوں کے قانون میں اپنی حقیقی جگہ حاصل کرنے کے لیے کئی طویل صدیاں لگیں۔ پھر بھی تمام مذاہب فقہ نے اس کو جائز قرار نہیں دیا اور اس جواز کا باعث اوقاف اور جاگیروں

Marfat.com

(اقطاع) کی کثرت تھی۔

(۶) اکثروں نے اسلامی قانون کو رومی قانون کا تابع قرار دیا ہے اور کچھ لوگ تو یہاں تک گمان کرتے ہیں کہ قانون روما کی کتابوں کا عربی میں اور کتاب پانڈیکٹ (Pandects) کا فارسی ترجمہ ہو چکا ہوگا جن کا مسلمان فقہاء نے مطالعہ کر کے اُن سے اپنے قواعد اور اپنے نظامہائے قانون اخذ کیے ہوں گے حالانکہ ایسا دعوٰی کرنا آج بھی ممکن نہیں ہے اور اس قسم کے دعووں کی تاریخی لغویت قطعی ثابت ہے اور یہی امران جدید ترین (۱۹۳۲ء تک کے) منفی نتائج سے بھی واضح ہوتا ہے۔ جو مختلف مشرقی (عبرانی، سریانی، قبطی، عربی، حبشی) ادبیات میں تحقیقات کرنے سے ظاہر ہوئے ہیں اور یہ تحقیقات خاص اس غرض کے لیے عمل میں لائی گئی تھی تاکہ شہنشاہی (رومی) قوانین کو نئے روپ میں پائے جانے کے متعلق بنفانتے (Benfante) کے مفروضے کی تائید کے لیے مواد فراہم کیا جا سکے۔

تاریخی لغویت سے قطع نظر بھی یہ بات عجیب ہے کہ ان خیالات کے موید ین نے یہ نہیں سوچا کہ معین مسائل کو خاص خاص ابواب میں داخل کرنے کے لیے شدید مشابہتوں کا پایا جانا ضروری اور لازمی ہے خواہ وہ کسی متمدن قوم کا قانون کیوں نہ ہو۔ اس بنا پر میں اپنے کو شخصی خصوصی قانون کی چند مثالوں تک محدود رکھ کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر عرب فقہاء نے کسی رومی متداول کتاب کو نمونہ بنایا ہوتا تو وہ نابالغوں اور غلاموں یا ملکیت اراضی کے مسائل کو ایسے مختلف ابواب میں ہرگز نہ منتشر کرتے جہاں اُن کے پانے کا کوئی یورپی قانون دان کبھی گمان ہی نہیں کر سکتا اور مسائل ربا کو بیع و شراء سے متعلق نہ کیا جاتا۔ اسلامی فقہ میں اس کی نہایت واضح علامتیں موجود ہیں کہ اس کے ایک بڑے حصہ کی تدوین مستقل طور پر عمل میں لائی گئی اور یہ تدوین میری رائے میں محض قانونی نظریات سے کہیں زیادہ ان تاریخی حالات کے باعث ہوئی جن میں مسلمانوں کے قانونی و سماجی ادارات نے ترقی کی۔

(۷) اسلامی قانون پر رومی قانون کے اثر کے نظریے کی تائید میں جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں ان میں سے ایک دلیل اس کی تدوین میں سرعت بھی ہے کہ دوسری صدی

Marfat.com

ہجری کے آغاز ہی میں مسلمانوں میں فقہی مسائل کا مطالعہ اور اس پر تالیفیں شروع ہو کر عظیم ترقی حاصل کر چکی تھیں اور اس غیر معمولی واقعہ کی توجیہ وہ لوگ یہ کرتے ہیں کہ اس کے لیے رومی قانون کو نمونہ فرض کیا جائے جو رومی قانون کی ادبیات نے مہیا کیا تھا۔

لیکن اس دلیل آرائی کے وقت اس کو بھلا دیا جاتا ہے کہ اس غیر معمولی اور قبل از وقت وسعت و بارآوری کا باعث یہ نہ تھا کہ مسلمانوں کو قانون سے (اس کے مغربی معنوں میں) کوئی عشق تھا۔ اس زمانے میں مشرقی عیسائیت کے پیدا کردہ مصائب کے نتیجے میں قانونی میلان سارے مشرق قریبہ میں کلیۃً مفقود تھا۔ اس کے برخلاف مسلمانوں میں اس کثیر قانونی پیداوار کا سبب اصل میں وہ تصور تھا جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین قانون کے متعلق رکھتے تھے کیونکہ قانون (فقہ) کو علم دین کا جز لاینفک قرار دیا گیا تھا اور وہ محض دنیوی مادی علم نہیں تھا اور فقہ کی اتنی تیز ترقی اصل میں علوم دینی کی (جن کا آغاز قرآن کی تفسیر اور حدیث کی تدوین و تشریح سے ہوا) تیز ترقی ہی کا ایک پہلو ہے۔

(۸) جو لوگ کہتے ہیں کہ اسلامی قانون رومی قانون کا تابع ہے یا کم از کم اس پر اس کا عمیق عمل ہوا ہے ان کا یہ فریضہ تھا کہ کم سے کم وہ وضاحت کے ساتھ یہ بیان کرتے کہ یہ تابعیت یا عظیم اثر کس طور پر وقوع پذیر ہوا۔

بعض اہل قانون نے یہ مفروضہ پیش کیا ہے کہ رومی قانون کی کتابوں کے عربی ترجمے ہوئے ہوں گے مگر واقعات و حقائق اس مفروضے کی پوری تردید کرتے ہیں یا کم از کم یہ کہ اسکندریہ و بیروت کے مشہور مدارس قانون کی جو اگرچہ عربی فتوحات سے ایک صدی پہلے ہی بند ہو چکے تھے روایت جاری رہی ہوں گی۔ اس کے مقابلے میں علوم اسلامیہ کے یورپی ماہرین اور ان عیسائیوں اور یہودیوں کا نظریہ جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا تاریخی حقیقت سے کم دور تھا کیونکہ انہوں نے ان محاکم عدالت کا خیال کیا جو اسلامی فتح کے وقت پائے جاتے تھے لیکن اس گروہ کو اپنے اس مفروضہ سے قبل چند سنجیدہ اور شدید تاریخی گتھیوں کو حل کرنے کی ضرورت تھی یعنی جس وقت عربوں نے فلسطین و شام پر تسلط قائم کیا اس وقت وہاں کے نظامہائے عدالت کی واقعی حالت کیا

Marfat.com

تھی؟ کیا وہ برسرکار تھے؟ اور بہت سے مقاموں پر وہ اہل کلیسا کے سپرد نہیں ہو چکے تھے؟ اور ہم کو معلوم ہے کہ مشرق میں یہ لوگ قانونی مسائل سے کتنی کم واقفیت رکھتے تھے اور کیا عربی تاریخوں سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ عربی حملہ شروع ہوتے ہی تقریباً تمام بیزنطینی کشوری اور عدالتی مجسٹریٹ جو قانون کے واحد حقیقی واقف کار تھے ملک چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اس کا پتا اس واقعہ سے چلتا ہے کہ شہروں کی اطاعت اسقفون کے توسط سے ہوتی رہی کشوری افسروں کے توسط سے نہیں جو فرار ہو چکے تھے؟ زیر بحث مسئلے میں ان سوالات کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن ابھی ایک اور نکتہ ہے جس پر مختصر طور سے توجہ منعطف کرانے کی ضرورت ہے۔

وہ یہ کہ اسلامی قانون کی رومی قانون سے ماخوذیت اور ان دونوں کے باہمی تعلقات پر جتنی بحثیں ہوئی ہیں ان میں ضمناً یہ چیز پیشگی فرض کر لی جاتی رہی ہے کہ پرانا نظام عدل گستری عربی فتوحات کے بعد بھی ایک سو برس تک باقاعدہ طور پر جاری و ساری رہا تھا اور نئے مالک اپنی غیر مسلم رعایا کے متعلق اس سے استفادہ کرتے رہے تھے، جو واقعہ کے مطابق نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں نے مفتوحہ قوموں کے نظام میں مداخلت نہیں کی اور یہ قرار دیا کہ جس کا جو مذہب ہوگا اس کا وہی قانون۔ اس طرح اگر وہ یہ غیر صحیح مفروضہ مان لیں کہ اسقفون اور ربیوں کی عدالتیں باقاعدہ کارگزار تھیں (باقاعدہ اس معنی میں کہ اسقف رومی قانون کی صحیح صحیح تعمیل کرتے رہے) تو بھی عرب اس سے علمی استفادہ نہیں کر سکتے تھے اور ان کا مفاد مشترکہ معاشی کاروبار سے بھی وابستہ نہ تھا جس کی بناء پر قانون جائداد کے سلسلے میں فاتح اپنے مفتوحوں سے کچھ سیکھتے کیونکہ مفتوحات کے بعد عرصہ دراز تک عربوں نے صرف حاکمانہ فرائض سے کام رکھا یعنی وہ صرف افسر اور سپاہی رہے کسان، تاجر اور زمیندار (زرعی زمینوں کے مالک) نہیں بنے۔ یہ صحیح ہے کہ سرکاری زمینیں فوجیوں کو بطور جاگیر عطا ہوتی رہیں لیکن جاگیر کا عرب مالک صرف اس پر قناعت کرتا تھا کہ عیسائی گماشتے اسے لگان ادا کرتے رہیں اور جو زرعی معاہدے عمل میں آئے اور اُن کی بناء پر جو جھگڑے پیدا ہوتے تھے۔ ان میں فریقین عیسائی ہوتے

Marfat.com

تھے اور پہلی صدی ہجری میں جب اسلامی قانون شکل گیر ہو رہا تھا اسلامی عدالتیں ایسے مقدموں کی سماعت نہیں کرتی تھیں اور اگر اتفاقاً اُن سے رجوع کیا بھی جاتا تو وہ مقدموں کا فیصلہ اپنے قوانین کی اساس پر کرتی تھیں عیسائیوں کے قانون کی بنیاد پر نہیں اس کے علاوہ جو زمانہ زیر بحث مسئلہ کے لیے اہمیت رکھتا ہے اس میں نومسلموں کا کوئی قابل ذکر اثر ہی نہیں تھا اور وہ صرف موالی کی حیثیت رکھتے تھے اور عربوں سے کم مرتبہ خیال کیے جاتے تھے اور اُن کو قضا کے عہدوں پر مامور نہیں کیا جاتا تھا۔

ان تاریخی حالات میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ عام ملکی نظم ونسق کے ایک جزء کو چھوڑ کر رومی قانون کا اثر اسلامی قانون کے بننے میں قابلِ ذکر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

(معارف، اعظم گڑھ۔ جنوری ۱۹۵۳ء)

Marfat.com

Marfat.com

عربوں کی جہاز رانی
پر استدراک

کم کتابیں ہوتی ہیں جو متخصصین (ماہرین فن) اور عوام دونوں کو یکساں پسند آئیں۔ ان خوش نصیب کتابوں میں سے ایک مولینا سید سلیمان ندوی کی تازہ تالیف "عربوں کی جہاز رانی" ہے۔ مضمون اتنا اچھوتا پھر بھی مواد اتنا زیادہ اس کی کم توقع تھی خاص کر طبع اول کے وقت اس کی عام پسندی کا شاید اس سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ بعض روز ناموں نے بہ اقساط پوری کتاب اپنے صفحوں میں نقل کر دی۔ میں بھی ان شائقین میں سے ہونے کی عزت رکھتا ہوں جو اس کتاب سے واقف تھے اور ان کا تقاضا تھا کہ یہ جلد چھپ کر منظرِ عام پر آ جائے۔ کئی سال کے انتظار کے بعد جب اس کا اشتہار نظر سے گزرا تو میں نے فوراً یہ کتاب منگالی اور باوجود سخت اور ضروری مصروفیتوں اور فرائض منصبی کے، اسے ختم کر کے ہی چھوڑی، پڑھتے وقت حاشیوں پر جا بجا اپنی یادداشت کے لیے کچھ معلومات لکھے۔ اب انہی باتوں کو یہاں کسی قدر پھیلا کر بیان کروں گا۔

یہ کوئی تنقید نہیں ہے تنقید اسی وقت ہوتی ہے جب دلچسپ اور کارآمد ہو اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ناقد بھی اس کتاب کے موضوع کا ماہر ہو اور قریب قریب تالیف کے برابر ہی تنقید پر محنت صرف کرے۔ یہ تو چند بے ربط معلومات ہیں جو مہینے بھر

سے بستر پر پڑے ہوئے ایک بیمار کے کمزور دماغ اور کمزور تر حافظے نے اپنے حالیہ سفر تعلیمی کی بیاض کی مدد سے اکٹھا کیے ہیں۔اس جلدی کی وجہ یہ ہے کہ آج کل جبری آرام ملا ہوا ہے، پھر ایسی فرصت کہاں۔اب ذی حجہ ۱۳۵۴ھ کی ابتداء ہے۔عید کے بعد شاید نئی مصروفیتیں ہوں۔ یہ مضمون اگر کوئی بحران نہیں تو ایک عامی کا بیان ہی اس سے زیادہ نہیں۔(کذا)

اس تحریر کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ ابھی ابھی سال حال کے مقابلے میں کامیاب ہونے پر دو عربی النسل مسلمان، حیدرآبادی میرے بھی رشتہ دار، نوجوان، حکومت برطانوی ہند کے ڈفرن جہاز پر قائم کردہ مدرسے میں بحری تعلیم کے لیے بطور کیڈٹ داخل کیے گئے ہیں۔ یہ خبر سن کر ریاست حیدرآباد کے کھوئے ہوئے ساحل کی تاریخ بجلی بن کر دماغ میں کوند گئی اور ٹھنڈی آہ نکال کر گرم آنسو ٹپکا گئی۔

ایک کمی:

سب سے پہلے ایک قدیم شکایت دہرانی پڑتی ہے جس کے جواب میں عموم البلوی کا فقیہانہ عذر بھی اب نامقبول ہے۔ وہ یہ کہ اتنی اچھی کتاب اور پھر بھی اشاریے (انڈکس) اور کتابیات ببلیوگرافی سے محروم! ایک دفعہ میں نے سوربون (پاریس) میں اپنے ایک پروفیسر سے مزاحاً کہا تھا، کہ اشاریے اور کتابیات کی خواہش وہی ناظر کرتے ہیں جو سست اور کام چور ہوں۔ ان کا جواب میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ انہوں نے سادگی سے کہا، ہاں سست اور کام چور مؤلف ہی اس محنت اور افادہ عام سے باز رہتا ہے۔ سید صاحب کی محنت اور انہاک سے میں واقف ہوں۔ سید صاحب اپنے شاگردوں سے یہ کام لے سکتے اور اپنا قیمتی وقت دوسرے کاموں کے لیے بچا سکتے ہیں۔ ہمارے اچھے مؤلفوں کی کتابوں کو دیکھ کر اکثر گرے کا قطعہ یاد آتا ہے:

Full many a gensofope restrayserene الیٰ آخرہ

اسماء و اعلام اور مطالب کی ابجدی فہرست نہ صرف ناظرین کو بلکہ خود مؤلف کو ہمیشہ مدد دیتی اور کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ یہ حال حوالوں اور ماخذوں کی کتابوں کے

Marfat.com

علیحدہ یکجا تذکرے کا ہے۔ مجھے معلوم نہیں سید صاحب نے سرہنگ زادہ کی حقائق الاخبار عن دول البحار سے استفادہ کیا ہے یا نہیں۔ کتاب میں کتابیات ہوتی تو فوراً تحقیق کر لی جاتی۔ سرسری ورق گردانی میں اس کا کہیں حوالہ نہیں دکھائی دیا، اس کتاب کی دو ضخیم اور ایک معمولی حجم کی جلدیں عرصہ ہوا مصر میں چھپی ہیں۔ پہلی جلد میں مسلمانوں کی بحریت ہی کا ذکر ہے۔

حدیث کا مواد:

عہد جاہلیت میں عربوں کی جہاز رانی کے معلومات لغت، قدیم اشعار اور قرآن مجید سے تو بیشک حاصل ہو سکتے ہیں۔ (عکجر ص ۴[1]) لیکن اس سلسلے میں حدیث کے وسیع ادب کو ہاتھ لگائے بغیر چھوڑ دینا کم از کم طالب علمانہ احتیاط کے خلاف ہے۔ ممکن ہے ان خطبات کی تیاری کا ناقابل یقین کم وقت حدیث سے مواد حاصل کرنے کے محنت طلب کام میں مانع رہا ہو، سرخسی کی شرح السیر الکبیر للامام محمد میں متعدد دلچسپ واقعات ملتے ہیں۔ علی متقی کی کنز العمال اور تبویب الحدیث غیر مطبوعہ میں تو بحری سفر پر متعدد مستقل باب ملتے ہیں۔

لغت:

کشتی اور جہاز کے الفاظ (عکجر ص ۶-۷) صرف دس دیے گئے ہیں۔ بعد میں کچھ اور آئے ہیں لیکن یہ فہرست بہت ہی سرسری ہے۔ اول تو ان لغت کی کتابوں کی ورق گردانی ضروری ہے جن میں فن دار الفاظ یکجا کیے گئے ہیں پھر اس موضوع پر لکھے ہوئے جدید رسالے بھی دیکھنے ضروری ہیں۔

مثال کے طور پر وستن فیلڈ (Wistenfeld) کا رسالہ Die Namen der schippeimaral ischen جہازوں کے نام عربی میں اس میں کوئی سو نام ہیں۔ میں یہاں ان کو بلاتنقید بہ ترتیب ابجدی دہرا دیتا ہوں۔ شاید یہ رسالہ آسانی سے ہر کسی کو دستیاب نہ ہو سکے۔

---

[1] عکجر مخفف ہے عربوں کی جہاز رانی کا۔

Marfat.com

اسطول (ج اساطیل)	اعراری	بالوع	بحریہ	برعانی
اسطولا	بارجہ	باہرات	براکیۃ	برکۃ، لبرکۃ
برکوس لابرکوس	جفار، جفایۃ	ذہبیۃ	سوقیۃ	ظلطل
برمۃ	جفل	رکوۃ	شبارہ	عجوز
بریک	جفن	رمادہ ا	شباک	عدولی
بسطۃ	جلبہ	رمث	شبوق	عرواس
بطاس	جنک	زیرباذیہ	شخور	عشاری، عشری
بطان	حراقہ، حراک	زبزب	شخوہ	غارب
بطسہ	حمالۃ	زلاج	شلملی	غراب
بوس، بوص، بوصی	حمامہ	زلال ۲	شلندی	فلک، فلوک
بیرجۃ	خلیج	زوراء	شموط	فلوکۃ
نلتوی	غلیۃ	زورق	شنان	قادس
جاریۃ (ج جوار)	خن	سفینۃ	شکولیۃ	قارب
جاسوس	خیطیۃ	سکان	شینی	قرقور، قرقورہ
جلیۃ	دغیص	سلور	صلغہ	قطعات
جدی	دقل	سماریہ	طبطاب	کارونیۃ
جرم	ذونیج	سنبوق	طیار، طیرہ	کندوریات

۱ الرمادہ (Armada)

۲ القلقشندی نے صبح الاعشیٰ میں ایک لفظ کلکۃ بھی دیا ہے جس کی جمع کلک بتائی ہے اور اس سے ایک رسم الخطی لطیفہ بھی بیان کیا ہے جو باصلاح خفیف یوں ہوگا۔ مارأینا کلکلک (ہم نے تیری کشتیوں جیسی کشتیاں نہیں دیکھیں) یعنی پانچ کاف ایک ہی لفظ میں یکجا جمع ہوگئے ہیں۔

Marfat.com

لاطیۃ	مرکب	مصاباب	ملقوطۃ	واجبات
ماجشون	مرکوس	معبر	ناغضۃ	ذکیۃ
ماشوت	مجیۃ	معدیۃ	نقیرۃ [1]	ہرہور
مثلثہ	مستعام	مطلع	بھتوغ	
مرزاب	مسطحات	یکتہ	واسطیۃ	

اسی سلسلے میں ابن قمالی کا بھی ایک اقتباس (بحوالہ وستنفلد) دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

الاسطول المنصور هولا من يجرى فى ديوان الجيش المصرى ومسند كر حاله فى موضعه اسماء مراكب طريده شينى مسطخ حراقة مركوس شلندى، اعرارى وسنفعة المسلمين به اشهر من ان تذكر واكثر من ان تحصرفاما الطريدة فانما برسم حمل الخيل واكثر ماتحمل اربعين فرسا واما الحمالة مخمل فيها الغلة واما الشلندى فانه مركب صقت تقاتل الغزاة علي ظهره وجدافون يجدفون تخه واما المسطح فهوفى معناه فاما الشيتى ديسمى الغراب (نسخة العرات) ايضاً فانه يجدف بمائة واربعين مجداف وفيه المقاتلة والجدافون والحراقة مختصرة وربما كانت ماية (مُلتان) وحوالى ذلك والعرارى (الاعزارى) من توابعه يحمل فيه الازواد والمركوس لطيف نقل

[1] شاید اس سے ناقرہ یا نقارہ کا لفظ تارپیڈو کے لیے برتا جا سکتا ہے شاید غرافۃ بھی (احرقنہا لتغرق اغلہا۔ ۱۸:۷۱)

Marfat.com

الما لخفته يدخل على المواضع و يكون وسقه (وسعه؟) دون مائة اردب۔

اسطول منصور اور وہ مصری محکمۂ فوج میں رائج ہے اور اپنے موقع پر ہم اس کا حال لکھیں گے۔ اس بیڑے کے جہازوں کا نام یہ ہے طریدہ اسینی مسطح، حراقہ، مرکوس، شلندی، اعراری۔ اس سے مسلمانوں کو جو فائدہ پہنچتا ہے اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ عام طور پر مشہور ہے اور اس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ طریدہ گھوڑوں کے لادنے کے لیے مخصوص ہے اور زیادہ سے زیادہ اس پر چالیس گھوڑے لادے جاتے ہیں، حمالہ میں غلہ لادا جاتا ہے شلندی ایک چھت والا جہاز ہے جس کی چھت کے اوپر سے سپاہی لڑتے ہیں اور ملاح اس کے نیچے ہوتے ہیں مسطح بھی اسی قسم کا ہوتا ہے شینی جس کو غراب بھی کہتے ہیں وہ ۱۴۰ ڈانڈ سے چلایا جاتا ہے اور اس میں سپاہی اور ملاح ہوتے ہیں۔ حراقہ مختصر ہوتا ہے اور بسا اوقات سویا اس کے قریب ہوتا ہے اور عراری اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ اس میں رسد لادی جاتی ہے۔ مرکوس اپنے ہلکے پن سے پانی میں آسانی سے چلتا ہے اور ہر جگہ جا سکتا ہے۔......

زین الدین المعبری کی تحفۃ المجاھدین فی بعض اخبار البر تکالیین [1] نامی تاریخ میں بھی متعدد دیگر نام ہیں۔

تمیم الداری:

لفظ داری کے معنی بھی (عکجر ص ۱۰) ملاح کے بتائے گئے ہیں۔ کیا حضرت تمیم

---

[1] یہ عربی کتاب پرتگالی ترجمے کے ساتھ ۱۸۹۸ء میں لزبن (پرتگال) میں چھپی ہے رسالہ تاریخ شائع کردہ جدید اڈیشن بلا مبالغہ فی سطر پانچ چھ غلطیوں کا حامل ہے، پتھر کے چھاپنے نے اور بھی ناس کر دیا ہے۔ مزید براں اس میں بعض اصلاحیں ناشناس ہیں مثلاً شہر کوشی (مقامی تلفظ کچی) کو کوشن (بربنائے Cochin) کر لیا گیا ہے۔

الداری کو بجائے قبیلہ بنی الدار کی جانب منسوب کرنے کے ان کے بحری سفروں کے باعث اس لقب سے ملقب ہونا قرار دیا جائے تو زیادہ صحیح نہ ہوگا؟ قصہ تمیم الداری پر مقریزی کا اشاعت طلب رسالہ الضوء السارى لمعرفة خبر تميم الدارى (مخطوطہ لائڈن وپاریس) کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، اس کا ایک فقرہ یہ ہے:

"تميم بن اوس الدارى يكنى ابارُقية قدم مصروقيل ان قدومه كان لغروالبحر......"

برشہ:

لفظ برشہ کا استعمال (عکجر ص۲۲) المعمری نے بھی ملیبار کی تاریخ میں کثرت سے کیا ہے شاید اس کو (Barge, Bark, Barchetta, Barque, Barquette) یوروپی[1] السنہ کے کسی لفظ سے تعلق ہو۔ ممکن ہے پرتگالی تلفظ ہو، پرتگالی لغت اس وقت میرے سامنے نہیں ہے۔

زبان زد بحری محاورے:

الفاظ کی اس بحث کے سلسلے میں یہ امر بھی شاید قابل ذکر ہے کہ متعدد بحری محاورے عربوں کی زبان پر چڑھ گئے تھے۔ یہ سمندر سے روزمرہ کے تعلق کے بغیر ممکن نہیں۔ ان میں سے دو پر کچھ بیان بے محل نہ ہوگا۔

ایک تو خود قرآن مجید (۴۸/۴) میں بھی برتا گیا، تذهب ريحكم تمہاری

---

[1] یہ امر شاید دلچسپی سے پڑھا جائے گا کہ لفظ یوروپ کی اصلیت کیا ہے۔ میرے ایک سامی لسانیات کے پروفیسر نے پارلیس میں بیان کیا تھا کہ بابل والے مشرقی ملکوں کو شمش آسیا کہتے ہیں اور مغربی ملکوں کو شمش اوروپا۔ عربی دان فوراً پہچان لیں گے کہ شمش وہی ہے جو عربی میں شمس (سورج) کی صورت میں برتا جاتا ہے۔ آسیا اٹھنے اور نکلنے کے معنی مواساۃ (غم دور کرنا ہمدردی کرنا) سے غالباً تعلق رکھتا ہے۔ موسیٰ (پانی سے نکالا ہوا) بھی اس سے رشتہ رکھتا ہے۔ بابلی زبان میں (غ) نہیں تھا وہ اسے الف کی طرح پڑھتے تھے اس طرح معلوم ہوگا کہ اوروپا اور غروب غرب، مغرب میں کتنا گہرا تعلق ہے۔ انہی بابلی الفاظ سے یوروپ اور ایشیا بنے اور پھیلے ہیں۔

Marfat.com

ہوا اکھڑ جائے گی یا تمہاری قوت جاتی رہے گی۔ اس محاورے کی اصلیت میرے خیال میں بادبانی جہاز رانوں کا محاورہ ہوگا کہ بادبان سے ہوا بدل گئی خواہ رخ کے تغیر سے خواہ بادبان کے پھٹ یا ٹوٹ جانے سے تو جہاز اور جہاز ران بے بس ہو جاتے ہیں۔

دوسرا ایک اور محاورہ ''مابل بحر صوفۃ'' کا ہے اور نہ صرف عبدالمطلب کی جانب منسوب ایک معاہدے میں [1] برتا گیا ہے بلکہ ہجرت کے بعد ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاہدے [2] ہمسایہ عرب قبائل سے کیے ان میں بھی اس کا کئی بار استعمال ہوا ہے۔ ابن ہشام نے بھی اپنی سیرت میں اسے برتا ہے اس کا سرسری با محاورہ ترجمہ ہوگا کہ جب تک سمندر موجیں مارتا ہے یعنی ہمیشہ کے لیے لیکن خود صوف البحر بھی ایک دلچسپ چیز ہے۔ اس پر کم کچھ سننے میں آتا ہے اس لیے اگر ابن البیطار کی کتاب المفردات (جلد ا ص ۱۴۱ اب) اصطخری (ص ۴۲ س ۱۶ الخ [3]) اور دوزی (Duzy) کی عربی لغت (Supplement) سے اس صوف البحر یعنی سمندری اون کی تشریح معارف میں کسی وقت شائع کر دی جائے تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اگر موقع ملا تو کسی آئندہ فرصت میں اسے ناظرین معارف کے سامنے پیش کروں گا۔

قرآن اور سمندر:

قرآن مجید میں سمندر کا ذکر (علجر ص ۳۰ تا ۴۸) ایک مستقل مقالے کا محتاج ہے۔ یادداشت کے لیے لینن گراڈ کے پروفیسر بارتولد کے مضمون کی طرف یہاں صرف اشارہ کروں گا جس کا جرمن ترجمہ جرمنی کے مشہور شرقیاتی رسالے Zdmg ۱۹۲۹ء کے صفحہ ۳۷ تا ۴۳ میں ڈاکٹر ریتر نے بعنوان ذیل کیا ہے:

Der Koran and dasmeer

یعنی قرآن اور سمندر۔ اصل مضمون (Zapiski Kollegii P1G.RO

---

[1] زینی دحلان (السیرۃ الحمدیۃ) جلد ۳ ص ۳۰۳ تا ۳۰۴۔

[2] ابن سعد جلد اق ۲ ص ۲۶ تا ۲۷ (معاہدات بنو عمرہ بنو غفار نعیم بن مسعود اشجعی)

[3] یہ دونوں حوالے خود دوزی کی لغت میں تشریح کے ضمن میں مندرج ہیں۔

Marfat.com

(vostokovendovi) میں ۱۹۲۵ء میں روسی میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں پروفیسر بارتولد آنجہانی نے علاوہ اور باتوں کے اس یورپی خیال کو پھر سے تازہ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ضرور بحری سفر کیا ہو گا اس کے بغیر قرآن میں سمندر کے سفر وغیرہ کا اتنا مدققانہ اور کثیر ذکر نہ ہوتا۔[1]

قصہ حضرت موسیٰ و کان وراء هم ملك يا خذ كُلَّ سَفِينَةٍ غصباً (سورۂ کہف) کی بھی کچھ تحقیق شامل کر دی جاتی تو بے محل اور غیر دلچسپ نہ ہوتی۔

مرزوقی:

مرزاقی (عکجر ص ۴۴) غالباً طباعت کی غلطی ہے اس سے مراد المرزوقی ہیں ان کی زیر تذکرہ کتاب الازمنہ والا مکنۃ میں قسم قسم کے معلومات کا ایک نہایت قابل قدر گنجینہ فراہم کیا گیا ہے۔ اس کے نام میں وہ وسعت نہیں جو اس کے مواد میں ہے۔

عہد نبوی کے مزید معلومات:

عہد نبوی کے ان معلومات (عکجر ص ۴۸ تا ۵۰) سے پیاسوں کی تشفی نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلے میں چند اور چیزوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے مثلاً:

۱۔ وہ احادیث جن میں بحری جنگوں کی پیشین گوئی ہے وغیرہ

۲۔ عہد نبوی کی ایک بحری جنگ (حوالہ: طبقات ابن سعد، جلد ۲، ق ا ص ۱۷ تا ۱۸ [2])

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معاہدے ایلہ (شمال مغربی عرب) اور بحرین (جنوب مشرقی عرب) کی بندرگاہوں کے باشندوں سے جن میں بحری جنگوں

---

[1] اس سلسلے میں شاید میرے ایک مضمون کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے جو انجمن ترقی اردو کے حالیہ شائع کردہ مجموعہ مضامین حبش اور اطالیہ کے صفحہ ۱۰۶ تا ۱۱۱) میں خاص اسی مبحث پر ہے کہ آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی حبش کا سفر فرمایا تھا۔ میرا پورا مضمون صفحہ ۱۰۰ سے ۱۱۷ تک ہی ہے گو بہ ظاہر پورا باب صفحہ (۱۲۴) تک میری جانب منسوب نظر آتا ہے۔

[2] معارف: افسوس کہ یہ حوالہ درست نہیں۔

Marfat.com

اور تجارت کے متعلق بھی دفعات ہیں۔ [1]

نجاشی کا بھیجا ہوا وفد:

نجاشی کے وفد (عکجر ص ۴۹) کے متعلق عام طور سے مشہور تو یہی ہے کہ جہاز کے ڈوبنے سے ہلاک ہوگیا، وفد کا سرگروہ نجاشی کا بیٹا بھی اسی زمرے میں شامل تھا لیکن سمہودی نے تاریخ مدینہ میں بیان کیا ہے کہ نجاشی کا بیٹا مدینہ آیا اور حضرت علی سے رشتہ موالات بھی پیدا کرلیا اور بعد میں اپنے باپ کے مرنے پر مدینہ ہی میں رہنا پسند کیا اور حبشہ جا کر تخت نشیں ہونے سے انکار کردیا۔ حبشی وفد کے آنے کا ذکر ابن عبدالباقی وغیرہ نے بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفورِ اخلاق سے ان لوگوں کی خدمت خود فرماتے تھے اور یہ گویا مہاجرین مکہ کی حبشہ میں پناہ دہی کا جواب تھا۔ ابن عبدالباقی کی الطراز المنقوش (حالات حبشہ پر) نیز فضائل حبشیان کی ایک مطبوعہ کتاب سواطع الانوار (ص ۸۲) پر آنحضرت کے نام آیا ہوا نجاشی اصحمہ کا جو خط درج ہے اس میں اس وفد اور اپنے بیٹے اریحا کے بھیجنے کا ذکر ہے۔ اگر خط صحیح ہے تو نامہ بر یقیناً نجاشی کا بیٹا ہوگا مگر یہ خط متقدمین کے ہاں نہیں ملتا۔

حضرت عمرؓ:

کتاب الخراج میں امام ابو یوسف لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قوم من اھل الحرب وراء البحر سے تجارتی معاہدہ کیا تھا کہ وہ ممالکِ محروسہ اسلامیہ میں آیا کریں۔

قسطنطنیہ پر حملے:

مسلمانوں کے ابتدائی بحری حملوں میں (عکجر ص ۵۸ تا ۶۲) استانبول پر حملوں کا ذکر نہیں نظر آیا حالانکہ حضرت معاویہ کے عہد کے حملے کی یاد دلانے والا وہاں

---

[1] معاہدہ ایلہ جو یحنہ بن روبہ سے ہوا، سیرت ابن ہشام ص ۹۰۲ طبقات ابن سعد (جلد ۱ ق ۲ ص ۳۷) ابو عبید کی کتاب الاموال (فقرہ ۵۱۳) و نیز دیگر کتابوں میں ملے گا۔ بحرین کا معاہدہ جو قبیلۂ عبدالقیس سے ہوا ابن سعد (جلد ۱ ق ۲، ص ۳۲ تا ۳۳) میں ہے۔

Marfat.com

حضرت ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مزار یادگار زمانہ ہے۔ عبدالملک بن مروان کے غالباً بیٹے مسلمہ کا حملہ بھی قابل ذکر ہے۔ اس کے واقعات ایک قدیم ترکی تالیف (الاقوال المسلمه فی غزوات المسلمه) میں تفصیل سے ملتے ہیں جس کے مخطوطے علاوہ استنبول کے کتب خانوں کے کیمرج یونیورسٹی لائبریری میں بھی میری نظر سے گزرے ہیں۔ مقدسی کی جغرافیہ میں بھی قسطنطنیہ کے ذکر میں اس کا کچھ بیان ہے اور وہ لکھتا ہے کہ قسطنطنیہ اس وقت بصرے کے برابر یا اس سے بھی کچھ چھوٹا شہر ہے استانبول کے یورپی حصے میں غلطہ کے پل کے قریب جو عرب جامعی ہے وہ بھی اسی زمانہ کی یادگار بیان کی جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گو اس مسجد کی تعمیر جدید حال میں ہوئی ہے لیکن اس کی طرز بنا استانبول کی باقی تمام مسجدوں سے جدا ہے اور خالص عربی وضع کی ہے جس میں بیزنطینی اثر کو دخل نہیں۔ مسجد کے اندر ایک منظوم کتبہ بھی ہے اس کے چند اشعار نقل کرتا ہوں جن سے ضروری تاریخ اور معلومات حاصل ہوں گے۔

کیم التمش آلتی سنہ گچمش ایدی ہجرتدن
چون اولدی حضرت عبدالملک خلیفہ دین

مراد ایلدی قسطنطنیہ یہ اوسفر
کہ قیلدی مسلمہ نامداری سر عسکر

بودعظمی گوش ایدن عرباندن اللی شبک آدم
تعہد ایلد یلرتا بعین ایلہ اول دم

صحابہ دندہ نیچہ کیمسہ قیلدی بیلہ سفر
جناب حقہ تو کللہ اولد یلر رہبر

دیار رومہ کلوب اول بو شہری فتح ایتدی
اہچندہ بولد یعنی مالی حیشہ بخش ایتدی

بو بیتی مال غنیمتلہ ایلیوب معمور
کہ نامی اولدی عرب جامعی ایلہ مشہور

یدی سنہ بوشہرده اقامت ایلدیلر
بو بارگاہِ خداده عبادت ایدیلر

وغیرہ وغیرہ کل چونتیس شعر ہیں جو میں نے نقل کر لیے تھے۔اس کتبے اور اس کے بیانات کی تحقیق شاید کسی اور صحبت میں کر سکوں جس میں مسجد کے فرش کی پیمائش اور نقشے وغیرہ کی اپنے پاس کے مواد کی مدد سے توضیح وتشریح بھی ہو گی۔ اوپر کے اشعار سے معلوم ہو گا کہ ۲۶ھ میں دعوتِ جہاد پر لبیک کہہ کر پچاس ہزار عربوں کی فوج جس میں چند صحابہ اور تابعین بھی شریک تھے یہاں آئی، مالِ غنیمت سے اس مسجد کو تعمیر کیا اور سات سال تک یہیں مقیم رہی۔

مصنوعی آبی راستے مسلمانوں کی ابتدائی بحری کارروائیوں میں مجھے ایک اور واقعہ یاد آتا ہے جو تاریخ طبری (۲۰۳۸) میں ہے کہ حضرت خالد بن الولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے سپاہیوں کو کشتیوں میں سوار کرا کے عراق کی بعض نہروں سے گزرنا چاہتے تھے۔ ایرانیوں نے ان کا پانی خالی کر دیا اور کشتیاں چل نہ سکیں پھر نہروں میں پانی آنے کے مقام کی مرمت کی گئی اور کشتیاں منزلِ مقصود کو روانہ ہوئیں۔

امام ابو یوسف کی کتاب الخراج میں آبی راہوں کی مرمت اور نگہداشت پر متعدد فصلیں ہیں ان کی جانب بھی اس سلسلے میں اشارہ کیا جا سکتا ہے۔

عرب میں بندرگاہ:

عربی بندرگاہوں کا ذکر خاصی تفصیل سے (عکجر ص ۶۷ تا ۷۱) کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں عمان کے مشہور بندرگاہ دبا کے متعلق چند چیدہ معلومات بے محل نہ ہوں گے اسی طرح بحرین کے بندرگاہ مشقر اور یمن کے بندرگاہ عدن وغیرہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ا۔۔۔۔۔ثم سوق دباو هي احدى فرضتي افرض العرب ياتيها تجار السند والهندو الصين واهل

Marfat.com

المشرق والمغرب فيقوم سوقها آخر يوم من رجب وكان بيعهم فيها المساومة وكان الجلندی بن المتكبر يعشر هم فيها و فی سوق صحار و يفعل فی ذلك فعل الملوك بغيرها۔

پھر بازار دبا ہے اور وہ عرب کا ایک بندرگاہ ہے جس میں سند، ہند، چین کے تاجر اور مشرق اور مغرب کے لوگ آتے ہیں اور یہ بازار رجب کے آخر (۱۰) میں لگتا ہے اور ان کی بیع اس بازار میں مساومہ ہوتی ہے اور جلندی بن متکبران سے اس میں اور بازار صحار میں عشر لیتا ہے اور اس معاملے میں وہی طریقہ اختیار کرتا ہے جو بادشاہ لوگ اور بازاروں میں اختیار کرتے ہیں۔

(کتاب المحبر لمحمد بن حبیب المتوفی ۲۴۵ھ مخطوطہ برٹش میوزیم ورق ۱۰)

......ثم يرتحلون بها الی دباوكانت احد فرض العرب يجتمع بها تجار الهند والسند والصين واهل المشرق والمغرب......... فيشترون بها بيوع العرب الهجر ......"

(كتاب الازمنه والامكنه للمرزوقی باب ۴۰)

پھر اس کو لے کر وہ دبا کو جاتے ہیں جو عرب کا ایک بندرگاہ تھا جہاں ہند، سند اور چین کے تاجر اور مشرق و مغرب کے لوگ جمع ہوتے تھے اور وہاں عرب اور ہجر کی طرح خریداری کرتے تھے۔

۲۔ ثم یر تحلون منها الی المشقر بهجر فتقوم سوقها اول يوم من جمادی الآخرة الی آخر الشهرفتوافی بها فارس يقطعون البحرات اليها بيباعاتهم ......" (كتاب المحبر ورق ۹۴ ۹۵)

Marfat.com

پھر اس سے مشقر کا سفر کرتے تھے جو بحرین سے یہ
بازار جمادی الآخرہ کے پہلے دن سے آخری مہینے تک لگا رہتا تھا
اور ایرانی لوگ اپنا سرمایہ تجارت لے کر وہاں بحری سفر کر کے
آتے تھے۔

۴،۳......ثم یسیرون بجمیع من فیھا من تجار البر والبحر الی الشحر۔ شحر مھرة۔ فیقوم سوقھم ......ثم یرتحلون منھا الی عدن الا تجارالبحر فانه لایرتحل منھم الا من بقی من بیعه شئي ولم یبعه فیوا فی الناس بعدن من بقی معه من تجار البحرشئي و من لم یکن شھدالا سواق التی کانت قبلھا ......وکانہ طیب (الطیب!) الخلق ...... ولم یکن احد یحسن صنعه من غیر العرب حتی ان تجاراالبحرلتر جع بالطیب المعمول، تفخربه فی السند والھند وترتحل به تجارالبر الی فارس والروم......

(المرزوقی باب ۴۰)

پھر وہاں خشکی اور تری کے جو تاجر ہوتے تھے، ان کو لے
کر شحر یعنی شحر مہرہ تک جاتے ہیں اور وہاں ان کا بازار لگتا ہے پھر
وہاں سے عدن کو جاتے ہیں البتہ بحری تاجروں میں صرف وہی
لوگ وہاں سے عدن کا سفر کرتے ہیں جن کا سودا کچھ بکنے سے رہ
گیا ہے اور اس نے اس کو نہیں بیچا ہے تو عدن میں لوگوں کے
پاس وہی بحری تاجر آتا ہے جس کے ساتھ کچھ مال رہ گیا ہے اور
وہ لوگ بھی عدن میں آتے ہیں جو اس سے پہلے کے بازاروں
میں نہیں گئے تھے اور اہل عرب کے سوا کوئی دوسرا اس کو عمدہ نہیں

Marfat.com

بنا سکتا تھا یہاں تک کہ بحری تاجر اس مصنوعی خوشبو کو لے کر واپس
ہوتے ہیں تو سند اور ہند میں اس پر فخر کرتے ہیں اور خشکی کے تاجر
اس کو لے کر ایران اور روم میں جاتے ہیں۔

آبنائے عمان یا باب المندب؟

''اسی کے پاس عمان کی دریائی پہاڑیاں ہیں اور وہ جگہ ہے جس کو درو دور کہتے ہیں یہ دو پہاڑوں کے بیچ تنگ دریائی راستہ ہے (باب المندب؟) (عکجر ص ۷٦)
یہاں غالباً سہو قلم سے بجائے '' آبنائے عمان '' کے ابنائے باب المندب لکھ دیا گیا ہے۔
باب المندب بحر قلزم کے دہانے پر ہے یہاں خلیج فارس کا ذکر ہے۔

چین:

ہم نے اوپر کی سطروں میں حدود ملک چین تک کے راستے بتائے ہیں (عکجر ص ۷۹) اس سلسلے میں وہ مشہور مقولہ بیان کیا جا سکتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کیا جاتا رہا ہے کہ اطلبواالعلم و لو کان بالصین اگر چہ یہ حدیث ابن عبدالبر نے علم پر اپنی مشہور کتاب میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے درج کی ہے۔
بیہقی نے شعب الایمان میں، ابن عدی نے الکامل میں اور العقیلی نے الضعفاء میں لیکن ماہرین نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے، شاید اس قیاس کو زیادہ دوراز کار نہیں قرار دیا جائے گا کہ یہ حدیث اس زمانے کی پیداوار ہے جب عربوں کے تجارتی تعلقات چین سے بہت مستحکم ہو گئے تھے اور وہاں کے بگپور (فغفور یا بغبور۔ باگ کے معنی تاتاری اور جدید روسی زبان میں خدا کے ہیں۔ پور بیٹے کو کہتے ہیں۔ چینی اپنے بادشاہ کو آسمان کا بیٹا سے ملقب کرتے رہے ہیں) کے اسلام لانے کا امکان نظر آ رہا تھا اس وقت چینیوں کی تالیف قلبی کی ضرورت تھی۔

تیسری صدی کا سفر نامہ یورپ:

''ابن فضلان نے بغداد سے روس و بلغار تک اپنا سفر نامہ مرتب کیا تھا۔ جس کا مختصر خلاصہ یاقوت نے اپنی معجم (البلدان) میں شامل کیا ہے'' (عکجر ص ۱۱۵) اہل علم

میں سے ہر ایک کو یہ سن کر خوشی اور چند کو تازہ خبر معلوم ہوگی کہ مقتدر باللہ عباسی کے (جو تیسری صدی کے اواخر میں خلیفہ ہوا) سفیر ابن فضلان کا کھویا ہوا سفر نامہ مل گیا ہے اور ایران سے اس کے ایک مکمل نسخہ کی عکسی نقل (فوٹو) برلین کے سرکاری کتب خانے میں آ چکی ہے اور اب اسے روسی اور دیگر زبانیں جاننے والے چند جرمن شرقیاتی اشاعت کے لیے تیار کر رہے ہیں اور غالباً ترجمہ بھی تفصیلی تعلیقات اور جدید ترین معلومات کے تقابلی مطالعے کے ساتھ شائع ہوگا۔

جاپان:

''اہل عرب ...... جاپان کو جزائر واق واق کہتے ہیں'' (عکس ص ۱۲۹) عرصہ ہوا عجائب الہند کے فرانسیسی ضمیمے میں پروفیسر دحویے نے یہ دلچسپ نظریہ پیش کیا تھا لیکن ابھی دو سال ہوئے پاریس کے رسالہ ژورنال آزیاتیک میں پروفیسر قران Trerrand جس کا چند ماہ قبل انتقال ہو گیا ہے نے اس بارے میں نئے سرے تحقیقات کی ہے اور عربی کے علاوہ چینی اور دیگر ماخذوں سے کثیر مواد فراہم کیا ہے جس کا خلاصہ بھی انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں (عنوان ''واق واق'' کے تحت) شائع ہوا ہے۔ اس تفصیلی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ اس سے مراد جاپان نہیں بلکہ بورنیو ہے۔

ابن جبیر:

عربی سیاحوں کے سلسلے میں ابن جبیر کا سفر نامۂ حج بھی قابل ذکر ہے۔ یہ سلطان صلاح الدین کا ہمعصر ہے اور اس نے سپین سے مصر وغیرہ تک جہاز پر سفر کیا تھا۔ ابن جبیر نے جس وقت نظر سے حالاتِ سفر بیان کیے ہیں اور اثنائے راہ میں آتش فشان پہاڑوں، بندرگاہوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے اس سے بہت کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں خاص کر بحری سفر میں مسافر کے تجربے بہت دلچسپ ہیں۔

بحری نقشے:

سامان وآلاتِ جہاز رانی کے سلسلے میں بحری نقشوں کا ذکر (عکس ص ۱۳۷ تا ۱۴۱) کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک حالیہ تحقیق کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ کولمبس نے امریکہ کا

ایک نقشہ تیار کیا تھا جو اب ناپید ہے۔ مشہور ترکی ماہر بحریات پیری رئیس اس کا تقریباً ہمعصر تھا۔ ترکی میں ان دنوں سلیمان اعظم جیسے اولوالعزموں کا دور تھا جو دنیا کو فتح کرنے کے منصوبے رکھتے تھے[1]۔ ایسے زمانے میں سرکاری افسروں کے معلومات بھی عصری (اپ ٹو ڈیٹ) ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ پیری رئیس نے کولمبس کا نقشہ امریکہ کسی طرح حاصل کیا اور اپنے نقشہ عالم میں شامل کر کے شائع کیا۔ یہ نقشہ کتب خانہ توپ قپو سرائے (استانبول) میں ملا اور کوئی تین سال ہوئے کہ اس کو بون یونیورسٹی کے صدر کلیہ شرقیات اور جرمن مجلس شرقیات کے معتمد ڈاکٹر پاؤں کالے (P. Kahle) نے ایک طویل مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ایک ضخیم تر کتاب اسی موضوع پر انگریزی میں بھی پروفیسر کالے نے لکھی ہے جو امریکہ کی کسی یونیورسٹی کی جانب سے شائع ہوگئی ہے، یا ہونے والی ہے۔

صور الکواکب:

صور الکواکب (عکجر ص ۱۴۴) پر ایک نہایت قدیم رسالہ کتاب الازمنہ لیوحنا بن ماسویہ المطبب المعلم الفلکی ۱۹۲۲ء میں مصر میں شائع ہوا ہے [2]۔ اس میں سال کے بارہ مہینوں کی فلکی کیفیت تفصیل سے دی گئی ہے۔

قطب نما:

قطب نما پر جسے جہت نما یا سمت نما کہنا شاید زیادہ موزوں ہو عربوں کے متعلق بہت دلچسپ مواد یکجا کیا گیا ہے (عکجر ص ۱۴۷ تا ۱۶۲) مگر یہ چیز اس سے بہت زیادہ پرانی ہے۔ حال میں چند ماہ قبل حیدر آباد کے ضلع رائچور میں مسکی نامی مقام پر اثری

---

[1] اس کا سفیر چین گیا تھا تاکہ وہاں کی فوجی قوت وغیرہ کا اندازہ لگائے۔ سفر کی رپورٹ جو خطائی نامہ کے نام سے فارسی میں لکھی گئی تھی اور جس کا بعد میں ایک ناقص ترجمہ بھی ہوا ہے چین کے متعلق معلومات کی انسائکلو پیڈیا ہے۔ اس کا جرمن ترجمہ مجھ سے کرایا گیا تھا جو اب چینی ماخذوں کے حواشی کے اضافے کے ساتھ مع اصل فارسی متن قریب میں شائع ہوگا یہ کام جرمن مجلس شرقیات کے معتمد اور اس کے رسالے کے اڈیٹر ڈاکٹر کالے انجام دے رہے ہیں۔

[2] Bulletindel. Instilut del. Egyrte XV 1833 P 235-256

Marfat.com

کھدائی کے سلسلے میں زمانہ ماقبل تاریخ کے عہدِ حجری کی جو چیزیں دریافت اور دستیاب ہوئی ہیں ان میں تین عدد جہت نما بھی صحیح و سالم حالت میں ملے ہیں۔ ان پر سولہ جہتوں کے نشان اور ذیلی جہتوں کی علامتیں صاف طور سے نمایاں ہیں۔ کسی دل جلے نے کہا ہے کہ اس چرخ کہن کے نیچے خود ہمارے اپنے سوائے کوئی چیز نئی نہیں۔

ایرانی ملک یمن میں:

ایرانیوں کی تجارتی اور دیگر ماوراالبحر نو آبادیوں کا ایک سرسری ذکر (عکجر ص ۱۷۱ تا ۱۷۲) اشارۃً کر دیا گیا ہے۔ پارسیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بعد بحری حملہ کر کے یمن پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہرز سپہ سالار و گورنر کے ساتھ آئے ہوئے یہ لوگ ابناء کہلاتے تھے۔ یہ لوگ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مسلمان ہو گئے اور کشوری عہدوں پر سرفراز کیے گئے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں ردّت کے موقع پر یمن کے عربوں میں یمنی قومیت کے جو جذبات پیدا ہوئے تھے، وہ آج چودہویں صدی ہجری میں ترکی، مصر، ایران و عراق وغیرہ کے حالات کو دیکھ کر اپنی حیرت انگیز قدامت دکھاتے ہیں:

"......ولما سمع بذلك قيس ارسل الى ذى الكلاع واصحابه اِنَّ الابناء نزاع فى بلاد كم ونقلاً فيكم وان تتركو هُم لن يزالوا عليكم وقدارى من الراى ان اقتل روسهم واخر جهم من بلادنافتبرء واقلم يمالؤه و لم ينصر واالا بناء واعتزلوا۔

(تاریخ طبری ص ۱۹۹۰)

جب قیس نے اس کو سنا تو ذی الکلاع اور اس کے ساتھیوں کو پیغام دیا کہ ابناء تمہارے ملک میں اجنبی ہیں اور دوسری جگہ سے منتقل ہو کر آئے ہیں اگر تم لوگ ان کو چھوڑ دو گے تو تم پر حملہ کر دیں گے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ ان کے سرداروں کو

Marfat.com

قتل کر دو اور اپنے ملک سے ان کو نکال دو تو یہ لوگ الگ ہو گئے
اور اس کی موافقت نہیں کی اور ابناء کی مدد نہیں کی اور ان سے الگ
ہو گئے۔

ہندی امیر البحر:

جہاز رانوں کا ذکر کرتے ہوئے (عکجر ص ۱۷۱ تا ۱۸۳) عربوں کے ساتھ ترکوں وغیرہ تک کا ذکر کر دیا گیا ہے اور محروم ہے تو غریب ہندوستان ملیبار میں پرتگالی حملوں کے زمانے میں کالیکٹ پر سامری (Zamorin) لقب کے راجے حکمران تھے۔ان کی بری فوج میں مسلمانوں کی کافی تعداد تھی لیکن ان کا بحریہ معلوم ہوتا ہے کہ خالص اسلامی تھا زین الدین المجری کی تحفۃ المجاہدین فی بعض اخبار البرتکالیین اور مسٹر پانکار کی حالیہ کتاب Malaban and The Portuguese میں اس بات کا کافی مواد ملتا ہے کہ کنج علی مرکار کا خاندان موروثی طور پر راجا سامری کا امیر البحر تھا چونکہ ملیباری مسلمان تاجر رہے ہیں اور مذہبیت کے باعث ہر سال ان کے بہت سے لوگ حج کو جایا کرتے تھے اسی لیے ان میں جہاز رانی بڑی ترقی کر گئی تھی۔ کنج علی مرکار کا خاندان اب بھی غالباً شہر پانی (ملیبار) میں آباد ہے۔اگر اس خاندان کا کوئی رکن یا کوئی اور صاحب ہمت و معلومات اس امیر البحر خاندان کی تاریخ مرتب کرے تو نہ صرف دکن یا ہند بلکہ مسلمانوں کے لیے باعثِ نازش ہوگا کہ کس طرح مٹھی بھر آدمیوں اور گنتی کی کشتیوں سے ان مجاہدوں نے سمندروں اور مشرق کے مالک پرتگال کا نسلوں تک سمندر میں ناک میں دم کر رکھا تھا۔

ہندوستان کی تاریخ ترکی ماخذوں سے:

اسی طرح ایک بعد کے زمانے میں بعض مسلمان ملیباری ریاستوں کے حکمرانوں نے سلطان ترکی کو جہاز پر دو ہاتھی بھیجے (جن میں سے ایک راہ میں مر گیا) اور ایک قصیدہ عربی میں لکھا کر یورپی عیسائیوں کے مظالم کے خلاف مدد کی التجا کی تھی۔ایک ترکی مورخ ان حالات کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ قصیدہ کی عربی میں بہت سی غلطیاں تھیں اور وزن وغیرہ بھی درست نہ تھا۔سفارت چند روز انتظار کر کے ناکام واپس ہوئی۔

Marfat.com

ہندوستان کے بہت سے واقعات ترکی تاریخوں اور سفر ناموں میں ملتے ہیں خاص کر مغلیہ عہد اور اس کے بعد کے زمانوں کے متعلق۔ ممکن ہے کہ کبھی ان سے ملک کو روشناس کرانے کی فرصت ملے۔

عربوں کی بحری تصانیف:

عربوں کی بحری تصنیفات (عکجر ص ۱۸۳) پر گو میں سرہنگ زادہ کی مذکورہ بالا کتاب کے سوا کسی اضافے کے قابل نہیں ہوں لیکن کس قدر افسوس ہوتا ہے کہ ابن ماجد وغیرہ کی پاریس سے شائع شدہ کتابوں کے فرانسیسی دیباچے سے اب تک فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا ہے۔ علی گڑھ کے ایک سابق پروفیسر صاحب نے ایک مرتبہ اس کے کسی باب (جو شاید انگریزی میں تھا) کا معارف میں ترجمہ شروع کیا تھا۔ ہندوستان میں بفضلِ خدا اب کافی تعداد فرانسیسی دانوں کی پیدا ہو گئی ہے خود جامعہ عثمانیہ میں کم از کم نصف درجن اساتذہ (جن میں دو پاریس کے ڈاکٹر ہیں) سید صاحب کو مدد دے سکتے ہیں۔ ایسی علمی چیزوں میں کوئی ایسی بات نہیں چھوڑ دینی چاہیے جو ذرا کاوش پر قابل عمل ہو جاتی۔

سند باد بحری الف لیلہ اور ہومر کی نظم:

نہ معلوم اہل علم میری اس رائے پر کیا کہیں گے کہ الف لیلہ سے بھی مواد حاصل کرنا چاہیے تھا علاوہ متعدد بحریت آمیز قصوں کے اس میں سند باد بحری کے سفر قابل ذکر ہیں۔ یہ افسانے یقیناً اسی زمانے کی پیداوار ہیں جب عربی جہاز رانی اوج عروج پر تھی۔ بحری سیاحوں اور ملاحوں کی کہانیاں غالبًا تیسری صدی ہجری میں اتنی زیادہ ہو گئی تھیں کہ ان سے سند باد کے سات بحری سفروں کے لیے کافی مواد فراہم ہو سکتا تھا۔

سند باد کے سلسلے میں ایک زیادہ اہم مسئلے پر کچھ کہنا ہے۔ جرمنی اور فرانس کے اساتذہ سے بھی میری اس بارے میں گفتگو رہی ہے اور وہ میرے دلائل کو کافی وزندار اور قابل غور قرار دیتے رہے ہیں۔ وہ یہ کہ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ مسلمان عربوں نے یونان سے علوم وفنون تو لیے لیکن ادب وشعر کو اپنی زبان میں ترجمہ کر کے منتقل نہیں کیا۔ اس سلسلے میں ایک بڑا ثبوت یہ پیش کیا جاتا ہے کہ ہومر کی نظموں کا ترجمہ ابھی اسی صدی

میں ہوا، اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ لیکن سند باد کے قصوں کو یولیسیس کے واپسی وطن کے بحری اور مہمات بھرے سفر کے ساتھ ملا کر جو شخص پڑھتا ہے وہ ان کی یکسانی سے متاثر اور حیرت زدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ناظرین سند باد کے تیسرے سفر کے اس قصے سے خالی الذہن نہ ہوں گے کہ سند باد مع اپنے ہمراہیوں کے ایک جزیرہ میں پہنچا ہے جہاں ایک آنکھ والا دیو رہتا تھا۔ اس نے ان کو اپنے رہنے کے مقام پر بند کر دیا اور روزانہ دو ایک آدمیوں کو آگ پر بھون کر کھانے لگا۔ آخر سند باد نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے ایک دن رات کو سوتے میں دہکتی ہوئی سلاخ سے اس دیو کو اندھا کر دیا اور سب بھاگ نکلے۔ اس قصے کے ساتھ یولیسیس کا واقعہ جو ہومر نے لکھا ہے کسے یاد نہ آئے گا جو ایک آنکھ والے سائکلوپ پولی فیم کے ساتھ پیش آیا اور جو جزئی تفصیلات میں بھی بالکل اس سند بادی قصے سے مشابہ ہے۔ بحری سفر، مصیبتیں اور انجام میں ہیرو کی کامیابی، یہ یولیسیس کی مہموں اور سند باد کے سفروں دونوں میں مشترک ہیں۔

اس سے سوائے اس کے کیا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہومر کی نظم پوری طرح یا کم از کم اس کے بہت سے قصے عربوں میں اتنے معروف اور زبان زد ہو گئے تھے کہ لوگ ان کو اب اجنبی نہیں خیال کرتے تھے۔ ابن ندیم (الفہرست ص ۳۰۵) کا بھی خیال ہے کہ سند باد اجنبی اور غالباً ہندی تالیف معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ابھی عرض ہوا اسے ہندی کی جگہ یونانی سے ماخوذ قرار دینا صحیح تر معلوم ہوتا ہے۔

یہ چند ناچیز ملاحظات ہیں جو مولف فاضل کے غور کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔

(معارف اعظم گڑھ۔ مئی ۱۹۳۶ء۔ جون ۱۹۳۶ء)

Marfat.com

تصحیح

مقالہ عربوں کی جہاز رانی پر استدراک

''عربوں کی جہاز رانی پر استدراک'' کے عنوان سے معارف کے دو نمبروں (مئی و جون ۳۶ء) میں جو مقالہ شائع ہوا ہے وہ افسوس ہے کہ راقم سطور کی عدم موجودگی میں مصحح معارف اور بعض کارکنوں کی مسالحت سے ایک سے زیادہ مقام پر غلط چھپ گیا ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے ان غلطیوں کی تصحیح بھیجی ہے جو ذیل میں شکریہ کے ساتھ درج کی جاتی ہے۔

''سب ایڈیٹر''

صفحہ ۳۳۰ سطر او ما بعد بجائے مطبوعہ عبارت کے یوں پڑھیے مرکوس اپنے ہلکے پن کے باعث پانی لے جانے کے لیے مناسب ہے اور اس میں ایک سوار دب سے کچھ کم پانی سما سکتا ہے۔

ص ۳۳۵ سطر ۱۶ صحیح یوں ہے۔ بو عظی گوش ایدن عربا ندن اعلیٰ بیک آدم

ص ۴۰۶ سطر ۹ یوں پڑھیے۔ اور ہجر کے اسباب کی خریداری کرتے ہیں

''سطر ۱۳، ۱۵ صحیح یوں ہے۔ جو بحرین میں ہے بازار جمادی الآخرہ کے پہلے دن سے مہینے کے آخر دن تک لگا رہتا ہے اور ایرانی لوگ اپنا سامانِ تجارت لے کر......''

ص ۴۰۷، سطر ۱۱، ۱۲ میں یوں اصلاح ہو: اور عطر خلق کو اہل عرب کے سوا کوئی

دوسرا عمدہ نہیں بنا سکتا۔

ص ۴۰۹ حاشیے کی سطر دوم یوں پڑھیے: جس کا بعد میں ایک ناقص ترجمہ ترکی زبان میں بھی ہوا۔

ص ۴۱۱ سطر ۹، ۱۳ کی غلطیاں سخت ہیں۔ یہ عبارت اصل میں یوں ہے: ان کو چھوڑ دو گے تو تم پر ہمیشہ مسلط رہیں گے اور ابناء کی بھی مدد نہیں کی بلکہ غیر جانبدار رہے۔"

(معارف اعظم گڑھ۔ اگست ۱۹۳۶ء)

آٹھویں صدی ہجری میں
مصر و شام کی ڈاک کا انتظام

تمہید:

(''التعریف بالمصطلح الشریف'' فنِ انشاء کی ایک عربی انسائیکلوپیڈیا ہے جو ۷۴۲ھ میں یعنی اب سے زائد از (۶۰۰) سال قبل تالیف ہوئی۔ بروکلمان کی تاریخ (ادب اللغۃ العربیہ) کی فہرست [1] سے پتا چلتا ہے کہ اس کے متعدد نسخے کتب خانہ ایا صوفیا، قاہرہ، لائیڈن وغیرہ میں موجود ہیں۔ اسکے مصنف کا نام ابو العباس احمد بن ابو المعالی یحییٰ بن فضل اللہ القریشی العدوی العمری الشافی ہے۔ اسکے مزید حالاتِ زندگی و کارنامہ جاتِ علمی کا مواد مذکورہ فہرست کے علاوہ فوات الوفیات میں بھی ملتا ہے۔ گو یہ کتاب ۱۳۱۲ھ میں قاہرہ میں چھپ چکی ہے لیکن چونکہ اس قسم کے مواد سے اُردو ادب خالی ہے اور یہ کتاب اس شخص کی تالیف ہے جو سرکاری میر منشی ابنِ میر منشی تھا جسکی بناء پر یہ مواد مستند قرار پاتا ہے، اس لیے اس کا مختصر تذکرہ اور ایک باب کا اقتباس غیر دلچسپ نہ ہوگا۔)

کتاب کے سات باب ہیں۔ پہلے کا عنوان ''رتب المکاتبات'' ہے۔ اسمیں جہاں سلاطینِ عالم سے فرداً فرداً ہر ایک کے القاب، خط کی تمہید وغیرہ بیان ہوئے ہیں وہیں اس ملک کے اہم حالات کا بھی مجمل ذکر اسکی اہمیت اور دلچسپی میں اضافہ کرتا ہے۔

---

[1] جلد دوم ص: ۱۴۱ C. Brockelmaun, Gaschichte der Arab achen Letterature

Marfat.com

خلیفۂ وقت اور بیسیوں دیگر سلاطین اسلام مثلاً ''محمد بن طغلق'' شہنشاہِ ہند اور ''صاحب البلغار'' وغیرہ کے تذکروں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم بادشاہوں اور حکمرانوں وغیرہ کا بھی بیان اس میں موجود ہے۔ دوسرے باب میں ''عادات العہود والتقالید والتفاویض و التواقیع والمراسیم والمناشیر'' یعنی مختلف قسموں اور درجوں کے معاہدے کرنے کے خاکے اور مسودے دیے گئے ہیں۔ تیسرے باب میں قسموں کے متعلق اور چوتھے میں ''الامانات والدفن ولھُدن والمواصفات والمفاسحات'' کا ذکر ہے۔ پانچواں باب تاریخی حیثیت سے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں ہر ملک و ریاست کا جغرافیہ اور اس زمانے کے حدود وغیرہ بیان ہوے ہیں۔ چھٹے باب میں چند فصلیں ''ڈاک اور کبوتروں کے اسٹیشنوں'' کے متعلق ہیں اور یہ مقالہ اسی پر تحریر کیا گیا ہے۔ اس باب میں تجارتی اور مسافرتی بندرگاہوں وغیرہ کا بھی مختلف فصلوں میں ذکر ہے۔ ساتواں اور آخری باب ''ایسے امور کے متعلق ہے جن کی عموماً ضرورت پیش آیا کرتی ہے'' اس آخری باب کی سات فصلیں ہیں۔

اس موقع پر جیسا کہ اوپر بیان ہوا صرف یہ بتایا جائیگا کہ اس وقت ڈاک کا کتنا باقاعدہ اور منظم انتظام تھا۔ ضمناً اسلامی ڈاک کی تاریخ بھی آ گئی ہے۔

ڈاک:

ڈاک کے متعلق قاعدہ ہے کہ ہر چار فرسخ پر اسٹیشن ہوں۔ ہر فرسخ تین میل کا ہوتا ہے۔ ہر میل میں تین ہزار گز ہوتے ہیں۔ ہر گز میں چوبیس انگل اور ہر انگل کے چھ جَو اور ہر جو کے چھ خچر کے بال ہوتے ہیں۔ اسی ناپ پر ڈاک کا عمل ہے۔

لیکن ڈاک کے موجودہ مرکزوں میں اس کا لحاظ نہیں ہے کیونکہ بعض کی مسافت میں تفاوت پایا جاتا ہے جو کبھی تو پانی کی دوری کے سبب اور کبھی کسی گاؤں سے مانوس رہنے کے باعث واقع ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض جگہ ایک کے بجائے دو برید (اسٹیشن) کرنے پڑتے ہیں۔

ڈاک کا انتظام اکاسرۂ ایران و قیاصرۂ روم کے عہد میں بھی تھا لیکن مجھے

Marfat.com

(مولف کتاب التعریف بالمصطلح الشریف کو) ان کی صورت اور پیانے کا حال معلوم نہیں۔

اسلام میں سب سے پہلے معاویہ بن ابی سفیانؓ نے ''برید'' کا انتظام کیا۔ یہ اسوقت رائج کیا گیا جب ''امیر المومنین علیؓ'' کا انتقال ہو گیا اور ان کے بیٹے اور جانشین حضرت امام حسنؓ حضرت معاویہؓ کے حق میں سلطنت و خلافت سے دست بردار ہو گئے۔ آپ نے اپنی سلطنت کے ہر حصے سے جلد سے جلد خبریں حاصل کرنیکی غرض سے ایرانی دہقانوں اور رومی واقف کاروں کو جمع کر کے ان کو اپنے منشا و مقصد سے آگاہ کیا۔ انہوں نے حسب الحکم ''برید'' کی تنظیم کی اور اس سلسلے میں خچر سے کام لیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسکی اولیت کا سہرا خلیفہ عبدالملک بن مروان کے سر ہے جس نے عمرو بن سعید الاشدق، عبداللہ بن زبیر، مصعب بن زبیر اور مختار بن ابی عبید کی ''بغاوت و خروج'' کے خاتمے کے بعد اس کا انتظام کیا اور اس کے ذریعے سے قسطنطنیہ سے طلا کار نگینے منگا کر دمشق کی جامع مسجد اور مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس کی مسجدوں کی آرائش کی جسکی کچھ باقیات اب بھی (۱۳۴۶ھ میں) جامع دمشق کے صحن، قبوں اور اس کے آس پاس پائی جاتی ہیں۔ مکے میں باب بنی شیبہ اور دار الحجلہ کے پاس مہدی کے اضافہ کردہ حصے میں یہ طلا کاری دیکھی جا سکتی ہے جس کو تا حال مہدی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ بیت المقدس میں صخرۂ مبارک اور محراب القبلی کے پاس اسکے کچھ آثار باقی ہیں۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ برید کے ذریعے مزار نبویؐ پر دُرود و سلام بھیجا کرتے تھے۔ اس کے بعد عرصے تک ڈاک کا انتظام قائم رہا لیکن بنی اُمیہ کے خاتمہ اور بنی عباس کے برسرِ حکومت آنے کے عہد میں خراسان و عراق میں سلسلۂ تعلقات منقطع ہو گیا۔

خاندان خلافت عباسیہ میں مہدی کے زمانے تک اس طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ خلیفہ مہدی نے اپنے بیٹے ہارون رشید کو جب ایک موقع پر سپہ سالار بنا کر بھیجا تو احوال و کوائف سے باخبر رہنے کے لیے اپنے اور لشکرگاہ کے درمیان برید کا انتظام کیا جو ہر وقت تازہ بہ تازہ نو بہ نو اخبار پہنچانے لگی۔ اس سفر جنگ کے اختتام کے ساتھ ہی یہ

انتظام بھی برخاست ہو گیا۔ ہارون رشید جب خود تخت نشین ہوا تو ایک دن اسے یہ انتظام بھی یاد آیا اور اپنے وزیراعظم یحییٰ بن خالد برمکی کے مشورے سے سلطنت کے صوبہ جات سے باضابطہ خبریں حاصل کرنے کا بندوبست کیا اور وہی طریقہ اختیار کیا جو بنی اُمیہ کے دور میں رائج تھا۔ مختلف مرکزوں پر خچر جمع کیے گئے اور اسکے ذریعہ خلیفہ اور خبررساں خط وکتابت کرنے لگے۔

یہ حالت مامون رشید کے زمانے تک رہی۔ بنی بویہ نے جو خلفاء عباسیہ کی کمزوری سے ان پر غالب آرہے تھے اس سلسلۂ برید یا ڈاک کو منقطع کر دیا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے حالات خلیفے سے مخفی رکھنا چاہتے تھے تاکہ اچانک بغداد پر حملہ کر کے خلیفہ سے من مانی باتیں منوالیں۔

سلجوقی بادشاہوں نے بھی یہی طریقہ جاری رکھا کیونکہ انکی خانہ جنگی اور باہمی نزاعات حسب منشا گھڑ چڑھے اور خچر سوار ڈاکیے روانہ کرنے سے مانع تھے۔

جب زنگی خاندان حکومت کرنے لگا تو برید کے لیے اعلیٰ نسل کی اونٹنیاں منتخب کر کے مقرر کیں۔ بنی ایواب نے بھی اپنے زوال تک اس کو جاری رکھا۔

ان کے بعد ترکی خانوادے حکمران ہونے لگے تا آنکہ ملک الظاہر بیبرس[ا] کے زمانے میں مصر و شام اور حلب سے فرات تک تمام ممالک ایک ہی علم کے زیر نگین ہو گئے۔ دمشق میں یہ خاص انتظام ہوا کہ وہاں ایک ایک نائب، وزیر، قاضی اور کاتب الانشاء متعین ہوے اور میرے (مصنف کتاب کے) چچا ''الصاحب شرف الدین ابو محمد عبدالوہاب'' کاتب الانشاء مقرر ہوے۔ جب وہ اپنے مستقر جانے سے قبل حضور میں باریاب ہوے تو انہیں ہدایات دی گئیں ہمیشہ مرکز اعلیٰ کو تاتاریوں اور فرنگیوں کی تازہ کارستانیوں اور دیگر حالات سے باخبر رکھیں اور کہا گیا ''اگر ممکن ہو تو ہر رات مجھے تازہ خبریں پہنچایا کرو''۔ پھر وہ زمانہ قدیم اور عہد خلفاء کی ڈاک کے عمدہ انتظام کا تذکرہ سنا تو بادشاہ نے انہیں بھی اسی طرح عمل کرنے کا حکم کیا۔

ا مصنف کو یہ روایت مفصل و مطول طور پر جمال الدین الدواداری نے جو بریدی کے نام سے موسوم اور ابن سدید سے معروف ہے بیان کی تھی۔

Marfat.com

یہ برید اب تک باقی ہے اور اتنی اہمیت و وسعت اختیار کر چکی ہے کہ اسکی موقوفی کا خیال تک نہیں پیدا ہو سکتا۔

موجودہ مراکز برید

مصر:

مصر میں تین جہتوں سے ڈاک آتی ہے (۱) مرکز قلعہ جبل محروسہ سے قوص اور پھر اسوان جانے کے لیے پہلے جیزہ جاتی ہے وہاں سے زاویہ حسین، منتیہ القائد (نو قائم شدہ مرکز)، ونا، لبیا، دہروط، اقلوسنا ہو کو منتیہ بن خصیب پہنچتا ہے جو دریائے نیل کے کنارے آباد ہے۔ یہاں عمدہ چراگاہیں ہیں۔ مدرسے، حمام اور بازار بھی کچھ کم نہیں۔ کہتے ہیں کہ امیر خصیب نے اپنی حکومت مصر کے زمانے میں اسے اپنے بیٹے کے لیے بسایا اور اسی کے نام سے موسوم کیا اور جواب بھی مشہور ہے۔ ڈاک یہاں سے اشمونین جاتی ہے جو صعید کا ایک شہر ہے اور یہیں پائے تخت بھی ہے۔ پھر ذروتو سربام جاتی ہے جو شریف حصن الدین بن تغلب کی طرف منسوب ہو کر ذروۃ الشریف بھی کہلاتا ہے۔ یہ شریفی مستقر تھا۔ یہاں ان کے قصر اور مکانات موجود ہیں۔ یہ بھی نیل کے کنارے آباد ہے۔ یہاں سے منقلوط، اسیلوط (یہ دونوں صعید میں ہیں طما مراغہ (یا مرالغ) بنش بوزہ (یا لبر بوزہ) جرجہ بلیتہ اور ہو جاتی ہے۔ اس سے قریب کرم احمر واقع ہے اور یہ دونوں صرفِ خاص سلطان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہیں مغربی میدانوں کا سرسبز علاقہ ختم ہو جاتا ہے اور ریتلے میدان خائق دندرا سے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں سے ڈاک قوص جاتی ہے پھر اسوان، نوبہ اور سواکن تک بھی ''ہمن'' کے ذریعے جاتی ہے۔

(۲) اسکندریہ کے دو راستے ہیں پہلے قلعہ محروسہ سے براہ قلیوب، منوف، محلمہ (مدینہ غربیہ) اور نحریریہ پہنچتی ہے۔ دوسرا راستہ مرکز قلعہ سے جیزہ، جزیرۃ القطہ، دروان، طرانہ زاویہ مبارک (یا انباوک)، دمہنور الوحش سے لوقین ہوتا ہوا، اسکندریہ پہنچتا ہے۔

(۳) دمیاط جانے کے لیے سعیدیہ سے جس کا ذکر نیچے آئیگا راستہ پھر پھوٹتا ہے۔ چنانچہ قلعہ محروسہ سے سعیدیہ جا کر اشموم الرمان جاتے ہیں اور پھر دمیاط پہنچتے ہیں۔

Marfat.com

فرات:

قلعۃ الجبل المحروسہ سے ''مراکز اخذہ'' کے ذریعے فرات جانے کے لیے پہلے سریاقوس جاتے ہیں۔ اس کے قریب خانقاہ ناصریہ اور بازارات بھی ہیں۔ یہاں سے بیر البیضا اور بلبیس پہنچتے ہیں جو سلطانی گھوڑوں کا آخری مرکز ہے۔ سلطانی گھوڑوں کے لیے سائس اور چارہ وغیرہ سرکاری اہتمام سے ملتا ہے۔ اس کے بعد مقررہ برید عربی قبائل کے ہاتھ میں ہے۔ ان کو گھوڑوں کا کرایہ دیا جاتا ہے۔ ہر ماہ کی پہلی کو نوبت بہ نوبت یہ لوگ ہر مرکز پر اپنے گھوڑوں کے ساتھ آتے ہیں۔ ایک ماہ ایک لوگ اور دوسرے ماہ دوسرے لوگ آتے ہیں۔ اسکی نگرانی کے لیے ایک سرکاری عہدہ دار مقرر ہے جو اس نوبت کے گھوڑوں کو سرکاری نشان کا داغ لگاتا ہے۔

ان مرکزوں میں سب سے پہلا سعیدیہ ہے جہاں سے خطارہ، قبر الوایلی (جو عمارات، چشموں اور باغوں کے باعث خوب آباد ہو رہا ہے)، صالحیہ، (جو مصری علاقے کا آخری معمور شہر ہے) بیر غزی قصیر (کریم الدین وکیل الخاص الناصری نے یہاں ایک مکان مسجد اور اذان گاہ تعمیر کی تھی مگر سوائے آخر البیان کے سب منہدم ہو گئے ہیں۔ اس اذان گاہ سے روشنی گھر کا کام لیا جاتا ہے اسکے قریب ہی کا قولہ کا قدیم مرکز ہے جس کے متصل ایک پل کے نیچے سے طغیانی کے زمانے میں علاقہ رمل کا پانی بہ جاتا ہے) جب وہ، (یہاں عمارت و پانی معدوم ہیں صرف شہادت {داغ اندازی} کے لیے گھوڑے یہاں ٹھہرتے ہیں اور پانی ساتھ لاتے ہیں) غرابی، قطیا، صبیحہ نخل معن (اس کو مخفف کر کے کوئی ایک لفظ بولتے ہیں) مطیلب، برادہ، ودادہ، (یہاں ایک چھوٹا سا قریہ اور ملک الاشرف خلیل کی بنائی ہوئی مسجد ہے۔ فخر الدین کاتب المالک نے یہاں ایک رباط تعمیر کی تھی جو بعد میں فروخت ہوگئی) بیر القاضی، (ودادہ اور اس میں فاصلہ بہت ہے) عریش (کریم الدین وکیل خاص نے یہاں ایک مضبوط و محفوظ مسافر گھر بنایا ہے اور پانی کا بھی انتظام کیا ہے۔ رات کو مسافر یہاں رہتے ہیں اور فرنگی ڈاکوؤں سے اطمینان رہتا ہے)، خروبہ (یہاں بھی مسافر گھر ہے جو فخر الدین کاتب نے

تیار کرایا تھا) ڈاک پہنچتی ہے۔ شہادت زدہ گھوڑے یہاں ختم ہو جاتے ہیں۔ اس سے آگے جانے کے لیے سرکاری گھوڑے اور اصطبل ہیں۔ چنانچہ یہاں سے زعقہ، رفح، سلقہ، (یہ بیزنطینی ڈاک کا بھی مرکز تھا) غزہ کی راہ سے ملاقس، بلدالخلیل، جنبا، صافیہ ہو کر کمرک جاتے ہیں۔

اگر دمشق جانا ہو تو غزہ (مذکورۂ صدر) سے جینین، (جو مرکز برید گویا ڈاک خانہ یا پوسٹ آفس ہے) بیت دراس، (یہاں ناصرالدین خزندار تنکری نے ایک عمارت بنائی ہے۔ پہلے یاسور میں ٹھہرتے تھے مگر فاصلہ زیادہ ہونے سے اب اسے اسٹیشن بنایا گیا ہے) قشری (یہاں ایک وقف کا کنواں ہے اور طاجار الدوادار الناصری کے جو اس مرکز کی تجدید کا مشیر تھا، آثار موجود ہیں اور لدوبلیت، دراس، یاسور میں مسافت زیادہ ہونے سے بہت مفید ثابت ہو رہا ہے) لدعجا (یہ راستے سے ہٹ کر ہے اگر یہاں سے بدلی جائے تو بہتر ہو) طیرہ (یہاں مکان ناصرالدین دوادار تنکری نے بنانا شروع کیا تھا جس کو اس کے بعد دوسروں نے مکمل کیا) فاقون، فحر، جینین پہنچتے ہیں۔ یہاں سے ایک راستہ نین اور حطین ہو کر صفد بھی جاتا ہے۔ دمشق جانے کے لیے زرعین، بلیان، مجامع (یہ ۱۱ے ھ میں بطور زاید مقرر ہوا)؟

زحر اربد جامع (امیر کافل نے مفس سے قربت کے باعث اسے اسٹیشن بنایا پہلے ڈلی (یعنی راس الماء میں تھا) صنیمن، غباغب، کسود، دمشق، اسٹیشن تھے۔

دمشق سے متعدد شاخیں پھوٹتی ہیں چنانچہ قصیر - قطیفہ - قسطل - قارا - بریج العطش - فسولہ - یہاں سے طرابلس کو بھی راستہ جاتا ہے - شمین - حمص - کاہ - طیمن - جرابلس - معرہ - انقرابا - آباد - قنسرین - حلب - باب - شاجور - بیرہ - یہ ایک زبردست قلعہ ہے اور شروع سے ابتک مسلمانوں کے قبضے میں ہے۔

قصیر - قطیفہ - قطنہ - (یہاں کوئی مرکز نہیں ہے صرف جوتے نعل، روٹی اور صدقہ ملتا ہے) - جلجل - مصنع - قریتین - حیر - بیضا - تدمر - ارک - سخنہ - کواتل - قباقب - رجبہ - (مشرقی سرحد پر آخری اسٹیشن ہے)۔

دمشق سے بریج الفلوس - ارنیب - نصران - صفد تک

دمشق سے خان میشلون - زُبدل - حسین - بیروت تک

دمشق سے خان میشلون - جزین - صیدا تک (صیدا سے بیروت جانے والوں کے لیے ایک مرکز ہو سکتا ہے)۔

دمشق سے خان میشلون - کرک نوح - (صوبہ بقاع کا مستقر) بعلبک تک

دمشق سے زبدانی - بعلبک - قصبا - فسولہ - قصب - قدس - انمار - شعرا - عرقا طرابلس۔

دمشق سے براہ جسر - حمص جاتے ہیں پھر سلمیہ - بفدید - سوریا

دمشق سے براہ جسر - عین یزال - صہلان - خابور - راس العین

دمشق سے مصیاف، حمص میں بھی راست اتصال ہے۔

دمشق سے براہ طفس - قینیہ - برجِ ابیض - خشبان - (اور دو مزید مرکزوں کے بعد) کرک۔

دمشق سے صوبہ دلات کو براہ صفقہ - طفس - اذرعات جاتے ہیں۔

حلب جانے کے لیے نمبر (۱) کے آخری مشہور اسٹیشن بیرہ ہو کر جاتے ہیں۔ اس سے آگے سموقہ - سندرا - بیت الفار - عینتاب - بہشتی ہیں یہاں سے قیساریہ وغیرہ بھی جاتے ہیں۔

عینتاب مذکورۂ بالا سے قلعۃ المسلمین ایک مرکز ہے اور یہیں فرات ہے۔ قلعۃ المسلمین سے جسر الحجر اور لخشا پر یہ سلسلہ منتہی ہوتا ہے۔

حلب سے ارجاب - تیزین - یغرا - بغراض - (ارمینیا کی سرحد پر ہے) مایاس ایاس جاتے ہیں۔

حلب سے جبول، بالس، جسر بھی ایک سلسلہ ہے اور یہ حلب کے مرکزوں کا خاکہ ہے۔

باقی دوسرے قلعے اور مستقر صوبہ جات انہی کی ذیلی شاخوں یا ایک سے دوسرے کی راہ میں واقع ہیں۔

Marfat.com

طرابلس کے مرکز:

طرابلس سے مرقیہ، بلدیاس، لاذقیہ (یہاں کی بندرگاہ بہترین اور درجہ اوّل کا شمار ہوتا ہے) صہیون (قلعہ اور سابق پائے تخت ہے اور تاریخی حیثیت سے بہت سے واقعات کا موقع رہا ہے) بلاطنس، قلیعہ، کہف، قدموس، خوابی، رصافہ، مصاف، صہیون سے برزید کو بھی ایک راستہ جاتا ہے۔

ممالک محروسہ سے متصل بریدی راستے:

حمصیرہ الارد کے ہیں جو ہلاکو خاں کے جانشینوں کے قبضے میں ہیں۔ ان کے مرکزوں کو ''خیل الاولات'' اور ''خیل الیام'' کہتے ہیں۔ مگر یہاں کے گھوڑے وغیرہ نہ تو سلطانی ملک ہیں اور نہ کام کرنے پر مجبور۔ وہ صرف اپنی مرضی سے عربی قبائل اہل مصر کی طرح ڈاک لاتے لیجاتے ہیں۔

کبوتروں کی ڈاک

(سب سے پہلی قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس کی ابتداء موصل سے ہوئی اور فاطمی خلفاءِ مصر اس سے کام لیتے رہے۔ اس کے لیے ایک خاص محکمہ قائم کیا اور کبوتروں کے اترنے کے مقامات مقرر کیے۔

محی الدین بن عبدالظاہر نے ایک فاضلانہ کتاب ''تمایم الحمام'' کے نام سے اسی بارے میں لکھی ہے۔

موصل کی اس ''ایجاد'' پر سب سے پہلے نورالدین بن زنگی نے ۵۶۵ھ میں توجہ کی اور اس سے فائدہ اٹھایا)

مراکز:

اس کا جال تمام اسلامی ممالک میں بچھا ہوا ہے چنانچہ گو اب مصر سے قوس، اسوان اور عنیتاب سے تعلق ٹوٹ گیا ہے لیکن پھر بھی قاہرہ سے اسکندریہ، قاہرہ سے

Marfat.com

دمیاط، قاہرہ سے سویس، قاہرہ سے بلبیس (سرحد شام پر) صالحیہ، قطیا، ولدادہ، غزہ، قدس شریف تک، غزہ سے نابلس، غزہ سے لد، قاقون، جینین، صفد تک، جینین سے بلیان اربد، طفش، صنمین، دمشق تک اور پھر ان میں سے ہر ایک سے متصلاً مشہور مقامات تک مثلاً بلیسان سے اذرعات اور طفش تک (والی الولات یعنی گورنر جنرل کو باخبر رکھنے کے لیے)۔

پھر دمشق، بعلبک، قارا، قریتین تک، قارا سے حمص، حماہ، مصرہ، معرہ، حلب، بیرہ، قلعۃ المسلمین بہشتی تک اور آس پاس جہاں کہیں بھی ضرورت ہو انتظام ہے، پھر قریتین سے تدمر، سخنہ، قباقب، رحبہ تک اتصال ہے (البتہ واضح رہے کہ آجکل سخنہ سے قباقب کو کبوتر نہیں لیجاتے ہیں بلکہ تدمر کے چٹھی رساں ہی جو سخنہ میں رکھے گئے ہیں قباقب پہنچاتے ہیں)۔

یہ خلاصہ ہے اس کبوتری ڈاک کے مرکزوں کا جواب (۷۴۶ھ) میں ممالک اسلامیہ میں قائم ہیں۔ فقط

کبوتروں کی اور معمولی ڈاک کا خریطہ جس میں ان ممالک کا نقشہ بنا کر اتصال دکھایا جا سکتا ہے اگر تیار ہو تو باعث دلچسپی ہو گا۔ مذکورۂ بالا مقالے سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ برید کتنی منظم اور باقاعدہ تھی۔

(مجلہ عثمانیہ حیدرآباد دکن دسمبر ۱۹۲۸ء مارچ ۱۹۲۹ء)

Marfat.com

پٹرول، گاس (گیس) اور
ابتدائے اسلام

اسلام سے قبل:

اگرچہ عنوان سے بے تعلق سا نظر آئیگا، لیکن یہ ذکر ضروری ہے کہ عربوں کا تعلق پٹرول اور مٹی کے تیل سے کچھ نہیں، تو ایک ہزار سال قبل اسلام سے نظر آتا ہے۔ چنانچہ سالومون (سلیمان) بن ایزاک (اسحاق) نے (جو فرانس کے علاقہ تروا Troyes میں ۱۰۴۰ء تا ۱۱۰۵ء زندہ رہا) اپنی مشہور شرح تورات میں ان کا ذکر کیا ہے۔ جب حضرت یوسف کو ان کے بھائیوں نے باپ سے جدا کرنا چاہا، تو انہیں ایک کاروان والوں کے ہاتھ جو مصر جا رہے تھے، بطور غلام فروخت کر دیا تھا۔ کتاب تکوین (۳۵:۳۷) میں صراحت ہے کہ یہ بنی اسماعیل یعنی عرب لوگ تھے اور خوشبودار چیزیں تجارت کے لیے لے جا رہے تھے۔ سالومون بن ایزاک اس کی شرح میں لکھتا ہے کہ ''عادۃً یہ لوگ صرف نفط (مٹی کا تیل یا ڈانبر) لے جایا کرتے تھے، جس کی بدبو تکلیف دہ ہوتی ہے۔ مگر اس مرتبہ وہ عطریات لے جا رہے تھے، تا کہ حضرت یوسف کو تکلیف نہ ہو۔''

قرآن میں:

۱۔ سلیمان علیہ السلام کے ذکر میں سورۂ سبا (۱۲:۳۴) (بلحاظ نزول اٹھاونواں کی

Marfat.com

سورہ) میں بیان ہوا ہے "وَأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ" یعنی خدا نے ان کے لیے "قطر" کا چشمہ بہا دیا۔ اگر چہ قطر کے معنے پگھلائے ہوئے تانبے کے بھی ہوتے ہیں، لیکن اسے مذکورۂ تحت قطران کا مترادف بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح تورات کی اوپر بیان کی ہوئی شرح معنی دار ہو جاتی ہے۔

۲۔ جہنم میں جو مختلف قسم کے عذاب ہونگے، ان کا ذکر سورۂ ابراہیم (۱۴:۵۰) (بلحاظ نزول بہتر واں مکی سورۃ) میں یوں ہوا ہے: "سَرَابِيلُهُم مِّن قَطِرَانٍ" یعنی ان کے کُرتے قطران کے ہونگے۔ قطران ڈانبر کو کہتے ہیں، اور یہ لفظ یورپی زبانوں میں بھی داخل ہو گیا ہے (مثلاً فرانسیسی میں یہ Goudron ہو گیا ہے) جو اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ عربی معاشیات و اقتصادیات میں اس کو اہمیت حاصل تھی اور یورپ میں یہ چیز عربی ممالک ہی سے درآمد ہوتی تھی۔

حدیث میں:

حدیث کی تقریباً سب کتابوں میں ذکر ہے کہ جب قبیلۂ عبدالقیس کے لوگ مدینہ آئے اور اسلام قبول کرنے کے بعد وطن واپس جانے لگے، تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ میں تمہیں چار باتوں کی تاکید کرتا ہوں، اور چار باتوں سے روکتا ہوں۔ ان ممنوعات میں چار قسم کے شراب کے برتنوں کا ذکر ہے: دُبّا، حنتم، نَقِیر، مُقَیَّر۔ ان میں سے آخری مُقَیّر اس برتن یا پیپے کو کہتے ہیں جس پر قار یعنی ڈانبر کی طلا کی گئی ہو، خاص کر درازوں کے بند کرنے کے لیے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قبیلۂ عبدالقیس "بحرین وعمان" میں رہتا تھا، جو آج کل الھفوف اور الاحساء کہلاتے ہیں اور سعودی عرب میں پٹرول کا مرکز ہیں۔

اس حدیث سے ثابت ہے کہ ڈانبر عہد نبوی میں بھی معلوم اور مستعمل تھا۔

خلافت راشدہ میں:

ابن سعد نے اپنی تاریخ "الطبقات" (۳ | حصہ اول |: ۲۶) میں لکھا ہے: حضرت علی کے قاتل ابن ملجم کو گرفتار کر لیا گیا تھا، اور وہ قید خانے میں تھا۔ جب حضرت

Marfat.com

علی زخموں کے کاری ہونے سے فوت ہو گئے تو دفن کے بعد ان کے بیٹے امام حسن نے آدمی بھیجا کہ اسے قید خانے سے نکال لائے، تاکہ اس سے قصاص لیا جا سکے۔ لوگ دیکھنے کو جمع ہوئے اور نفط اور لکڑی کے چُورے اور آگ لائے، اور کہا کہ ہم اسے آگ میں جھونکیں گے۔'' اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ ۴۰ھ میں نفط اتنی عام چیز تھی کہ اسے لوگ ہر وقت بازار میں خرید سکتے تھے۔

خلافت بنی اُمیہ میں:

''حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ کے زمانے میں ہم جہازوں میں سوار ہو کر گئے اور دشمن (بیزنطینی رومیوں یعنی یونانیوں) سے دوچار ہوئے تو ہم نے ان پر مُحرقات پھینک مارے'' (شرح السیر الکبیر للسرخسی، طبع حیدرآباد دکن (۱۳۳۶ھ)، ۳: ۲۱۳): اگرچہ اس حدیث میں اس کی صراحت نہیں ہے کہ یہ آتش زن مادہ (محرقہ) کیا تھا، لیکن یونانی آگ اس زمانے کی ایک معروف چیز تھی اور پانی سے بھی نہیں بجھتی تھی۔

خلافت عباسیہ میں:

امام محمد شیبانی خلیفہ ہارون رشید کے قاضی القضات تھے (یورپ میں شارلمان کے معاصر) اور ۱۸۹ھ میں رَے (طہران) میں فوت اور دفن ہوئے۔ ان کی کتاب الاصل (جس کا دوسرا نام کتاب المبسوط بھی ہے) فقہ کی بہت ضخیم اور بڑی اہم کتاب ہے اور اب حیدرآباد دکن میں چھپ بھی گئی ہے۔ وہ اس کے باب الشروط میں ایک بڑی دلچسپ بات ضمناً بیان کرتے ہیں چونکہ یہ اہم بات ہے اس لیے ہم اصل اور ترجمہ دونوں درج کریں گے:

واذا اشتری ارضًا فیہا عیون النفط والغاز فالعین تدخل فی الشراء عندنا، وماھو الحاصل من النفط و الغاز	جب کوئی ایسی زمین خریدے، جس میں نفط اور گاس کے چشمے ہوں، تو ہمارے (حنفی) مذہب میں چشمہ تو خرید میں خود بخود داخل ہو جاتا ہے لیکن جو نفط اور گاس اس سے حاصل ہو، وہ بغیر ذکر کے خود بخود

لایدخل اِلّا بذکرہ لأن الحاصل فیه بمنزلة الریع للارض۔ وأمّا العین فھی جزء من الارض، فتدخل فی العقد بدون ذکر و ھذا بخلاف الماء الذی فی البئر فانه لایدخل ذلک فی شراء الارض والدار۔ لأن الماء قبل الاحراز لایکون مملوکا لأحد فلایتناوله البیع، ذکراً ولم یُذکر، بخلاف النفط والغاز فانه مال مملوک، بمنزلة الملح فی المملحة۔ ومن العلماء من قال: العین لاتدخل فی بیع الارض بدون الذکر لأن اسم الارض یتناول الموضع الذی یمکن الانتفاء به بالزراعة أو السکنیٰ۔ والعین لیس من ذلک فی شئی، فلاتدخل فی العقد بدون الذکر۔

داخل نہیں ہوتا کیونکہ یہاں حاصل ہونے والی چیز ایسی ہی ہے جیسے پودے زمین کے لیے۔ چونکہ چشمہ زمین کا جزو ہے، اس لیے بغیر ذکر کے معاہدے میں داخل ہو جاتا ہے، برخلاف پانی کے جو ابھی کنوئیں کے اندر ہی ہو (اور ڈول سے نکالا نہ گیا ہو) وہ زمین اور مکان کی خرید میں خود بخود داخل نہیں ہو جاتا۔ وجہ یہ ہے کہ (کنوئیں میں سے کھینچ کر) حفاظت میں لینے سے پہلے پانی کسی کی مملوکہ چیز نہیں ہوتا، اس لیے خرید وفروخت میں وہ شامل نہیں ہوتا، چاہے ذکر ہو یا نہ ہو۔ نفط اور گاس اس کے برخلاف ہیں کیونکہ وہ مملوکہ مال ہوتے ہیں، جیسے نمک کی کان میں نمک، لیکن کچھ علماے قانون ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ زمین فروخت ہو تو اس میں چشمہ بغیر ذکر کے داخل نہیں ہوتا کیونکہ زمین کے لفظ میں صرف وہ مقام شامل ہوتا ہے جس سے زراعت یا سکونت گاہ کے لیے استفادہ کیا جا سکتا ہو۔ اور چشمے میں ایسی کوئی چیز نہیں۔ اس لیے وہ معاہدے میں ذکر کے بغیر داخل نہیں ہوتا۔

فللتحرز من ھذا الخلاف ذکر أنه یکتب:

اس اختلاف سے بچنے کے لیے (امام محمد نے) بیان کیا ہے کہ معاہدہ نامہ یوں لکھے:

"اشتری منه الارض التی یقال

فلاں شخص سے فلاں زمین اور وہ چشمے خرید ے، جن

Marfat.com

لها كذا، والعيون التي فيها الغاز والنفط حدود هذه الارض التي فيها العيون۔ اشترى منه هذه الارض المحددة في كتابنا هذا، والعيون التي فيها النفط والغاز، وما في العيون من النفط و الغاز محدودها كلها۔"

میں نفط اور گاس ہے۔ وہ زمین جس میں چشمے ہیں، اس کے حدود فلاں فلاں ہیں اس شخص سے وہ زمین خریدی جس کی ہمارے اس معاہدہ نامے میں تحدید کی گئی ہے، نیز وہ چشمے جن میں نفط اور گاس ہے، اور وہ تمام نفط اور گاس بھی خریدا جو مذکورہ حد بندی والے چشموں میں ہے۔

مذکورہ بالا اقتباس کے لیے کتاب المبسوط للسرخسی، جلد (۳۰) صفحہ (۱۹۰) بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

معدنی اور نباتی مادّے:

ابو حنیفہ احمد بن داؤد دینوری نے بیان کیا ہے کہ ارز اور صنوبر کے درخت سے زِفت کا مادہ نکالا جاتا ہے، اور زیادہ تر کشتیوں کی طلاکاری کے لیے استعمال ہوتا ہے کیونکہ قار (معدنی ڈانبر) سمندر کے پانی کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا بلکہ جھڑ جاتا ہے، مگر زفت اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ رہا وہ زفت جو دواؤں میں ڈالا جاتا ہے، تو اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں، وہ زمین سے نکالا جاتا ہے۔ (دینوری کی کتاب النبات کا یہ اقتباس الجامع الادویۃ المفردہ لابن بجون، مخطوطۂ ڈبلن، اور کتاب الصیدنہ للبیرونی، مخطوطہ، بروصہ، ترکیا، سے لیا گیا ہے، اصل کتاب ناپید ہے)۔

نَفط اور نِفط (نون کے زبر اور زیر دونوں سے) کحیل (یعنی ڈانبر) کو کہتے ہیں۔ ابوعبید کے مطابق نفط ہر قسم کے قطران کو کہتے ہیں (نباتی ہو یا معدنی) لیکن ابوحنیفہ احمد بن داؤد دینوری نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ ابوعبید کا قول فاسد ہے۔ اور بیان کیا ہے کہ نَفط اور نِفط (زیر اور زبر دونوں سے) حُلابۂ جبل یعنی پہاڑ کا دودھ ہے جو کنوئیں کی

گہرائی میں ملتا ہے، اور اس سے آگ جلائی جاتی ہے۔ زیر کے ساتھ نِفط کہنا زیادہ فصیح ہے۔ نفاطہ اور نفاطہ (ف پر تشدید کے ساتھ اور تشدید کے بغیر) اس مقام کو کہتے ہیں جہاں سے نفط نکالتے ہیں۔ نفاطات اور نفاطات ف پر تشدید کے ساتھ اور تشدید کے بغیر ایک قسم کی سرج (مشعل) ہے جس سے نفط کو پھینکا جاتا ہے (یہ حوالہ لسان العرب اور تاج العروس میں مادّہ نفط کے تحت ملے گا)۔ دینوری کی وفات ۲۸۲ھ میں ہوئی۔

زہریلی گاس اور دھواں:

کتب خانۂ عام مصر میں کتب فقۂ حنفی نمبر (۱۰۸۰) میں ایک پرانا گمنام عربی مخطوطہ ہے، جس کا نام ہے، ''رسالہ فی کیفیۃ الحرب والاسری والمرتدین''۔ اس کے ستائیسویں باب میں یہ دلچسپ جملہ ملتا ہے: جنگ میں تکلیف پہنچانا مثلاً آگ، دھویں، تیزاب اور بدبودار زہریلی گاس کا استعمال تاکہ استحکامات اور قلعوں کو خراب کریں اور دشمن میں دہشت پیدا کریں، جائز ہے۔

نفط سازی کا طریقہ:

مدینۂ منورہ کے مشہور کتب خانۂ عارف حکمت بے میں ایک بہت پرانا عربی مخطوطہ ملا ہے، جس کا نام ہے: فی صناعۃ النفط۔ یہ خالص فنی کتاب ہے کہ کس طرح مٹی اور بیکار مادّوں کو پٹرول سے الگ کیا جاتا ہے اور اس کام میں کونسے کیمیاوی طریقے استعمال ہوتے ہیں۔ چونکہ پایۂ تخت ریاض میں سعودی وزارتِ تعلیمات اس پر کام کر رہی ہے اس لیے میں یہاں زیادہ تفصیل نہیں دے سکتا۔

خلاصہ:

یہ چند منتشر اور جستہ جستہ معلومات ہیں، جو یکجا کی گئی ہیں۔ ممکن ہے، ناظرین کو مزید حوالے بھی ملیں۔ علمی تعاون سے رفتہ رفتہ پٹرول کی تاریخ کے زنجیرے کی ایک کڑی مکمل ہو جائیگی۔

(نذر زیدی۔ مرتبہ مالک رام۔ مجلس نذر زیدی۔ نئی دلی ۱۹۸۰ء)

Marfat.com

Marfat.com

مستشرقین

Marfat.com

Marfat.com

استانبول کی موتمرِ مستشرقینِ عالم

حال میں ترکی جانے کا اتفاق ہوا، خیال ہوا کہ اس علمی سفر کے حالات دلچسپی سے خالی نہ سمجھے جائیں گے۔ اس مقالے کے دو حصے ہیں:

(۱) موتمر مستشرقین کا حالیہ اجلاس (۲) ترکی کے کتب خانے

ناگزیر وجوہ سے محض ایک اطلاع کے طور پر یہ سطریں تحریر ہیں:

یورپی جامعات میں مشرقی اور خاص کر اسلامی علوم کی تعلیم تو کئی سو سال سے ہو رہی ہے اور مشرقیات کی انجمنیں بھی کئی مقاموں پر ایک صدی سے زیادہ عرصہ سے قائم ہیں، لیکن کوئی بین الممالک انجمن نسبتہً حالیہ چیز ہے اور پچاس سال سے بھی کم عرصہ ہوا کہ "موتمر مستشرقین عالم" کے نام سے ایک یورپی ادارہ وجود میں آیا۔ ہر تین چار سال

ل ہمارے محترم اور فاضل دوست ڈاکٹر حمید اللہ صاحب دارالمصنفین کے پرانے مخلص قدردان ہیں، وہ جہاں بھی رہتے ہیں اس کو نہیں بھولتے۔ چنانچہ پیرس جیسے دور دراز مقام سے معارف کے لیے وقتاً فوقتاً علمی سوغات بھیجتے رہتے ہیں۔ ابھی چند مہینے ہوئے، ان کا ایک علمی خط معارف میں شائع ہو چکا ہے۔ اب انہوں نے موتمر مستشرقین عالم منعقدہ استانبول کی مختصر روداد اور ترکی کے متعلق مفید معلومات قلمبند کر کے بھیجے ہیں۔ اس موتمر کا دعوت نامہ دارالمصنفین کے نام بھی آیا تھا، مگر اس غریب ادارہ میں اتنے کثیر مصارف برداشت کرنے کی طاقت کہاں ہے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب کی بھیجی ہوئی سوغات میں ناظرین معارف کو بھی شریک کیا جاتا ہے۔ "م"

Marfat.com

میں اس کا اجلاس ہوتا ہے، الجزائر کے بعد، یہ دوسری دفعہ ہے، کہ اس کا اجلاس گزشتہ ستمبر میں ایک اسلامی شہر (استانبول) میں ہوا۔ اس بائیسویں اجلاس میں ساری دنیا سے اہلِ علم جمع ہوئے اور ہر حیثیت سے یہ سب سے کامیاب اجلاس رہا۔ ۱۵؍تا ۲۲؍ستمبر ۱۹۵۱ء ایک ہفتے صبح اور شام ہر روز اس کی نشستیں ہوتی رہیں۔ کوئی تین سو کے اجتماع میں پاکستان سے تو صرف ایک شخص جامعہ پنجاب کے معین امیر آئے، لیکن حیدرآباد اور ہندوستان نے توقع سے زیادہ دلچسپی لی۔ جامعہ کلکتہ کے استاذ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی سے ناظرین ناواقف نہیں، حکومت ہند کے پانچ نمائندوں میں یہ اکیلے مسلمان تھے۔ حیدرآباد سے ہر شخص اپنے مصارف سے شوق علم میں آیا تھا اور اس کی قدر بھی کی گئی، چنانچہ دونشستوں کے صدر حیدرآبادی نامزد ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نظام الدین تو آئے لیکن پروفیسر محمد عبدالرحمٰن خان نہ آسکے۔ اس کی بنا پر وہ صدارت نہ کر سکے، جامعہ عثمانیہ کے ڈاکٹر محمد غوث اور ڈاکٹر محمد یوسف الدین بھی آئے تھے۔ صدارت کے اعزاز مصر کے ڈاکٹر ابوبکر اور ڈاکٹر مراد کامل نیز ایران کے پروفیسر علی اصغر حکمت کو بھی عطا ہوئے تھے۔

مقالے توقع سے اتنے زیادہ آئے کہ متعدد شعبوں کو کئی ذیلی شعبوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ چنانچہ اسلامیات کو ایک کی جگہ چار شعبوں میں بانٹا گیا۔ مزید براں مشرق بعید میں سے ملایا و انڈونیشیا کو الگ کر کے مستقل شعبہ بنانا پڑا، قدیم اناطولیا کو دو، ترکیات کو تین اور اسلامی فنونِ لطیفہ کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑا۔

اجلاس مشترکہ یعنی جلسۂ عام میں ڈاکٹر نظام الدین (حیدرآباد) نے یہ بتایا کہ عربی فارسی مخطوطات کی اشاعت میں مشرق اور مغرب کس طرح تعاون کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر زکی ولیدی طوغان (استانبول) نے کہا کہ قرون متوسطہ کے مسلمان مورخ کس قدر ناقدانہ رویہ رکھتے تھے اور ڈاکٹر کرامرس (لائڈن) نے بتایا کہ اسلامی عمرانیات میں عام عمرانیات کے علاوہ کیا خاص اور زائد ابواب ہوتے ہیں۔

یہ تو ممکن نہیں کہ جملہ مقالوں کی (جو عربی، ترکی، نیز یورپی زبانوں میں تھے) فہرست دی جائے، ہمالیہ تلے کے مسلمانوں کی دلچسپی کی چیزیں شمار سے باہر ہیں۔ اس

Marfat.com

لیے مشتے نمونہ از خروارے پر اکتفا کیجاتی ہے۔

۱۔ حران اور پرمچہ کے آثار قدیمہ (پروفیسر لائڈن، انقرہ)
۲۔ سباد معین (یمن) کی تازہ کھدائیاں (البرائٹ - بالٹی مور)
۳۔ زمانہ جاہلیت کی یمنی عورت (بسٹین - آکسفورڈ)
۴۔ فینیقی حروف تہجی معین (یمن) سے لیے گئے (گیورگیف - بلغاریا، صوفیا)
۵۔ المدونہ میں کتاب الغصب (دے می لیا - روما)
۶۔ طوق الحمامۃ لابن حزم کے مشرقی مصادر (گراسیا گومیس - مجریط، اندلس)
۷۔ الحکمۃ العروضیہ لابن سینا (پادری قنواتی - قاہرہ)
۸۔ جزیرہ مالطہ کی موجودہ زبان کا درجہ عربی بولیوں میں (کولین، پاریس)
۹۔ ہندو ثقافت کا اثر عربی ادبیات پر (رائے چودھری کلکتہ)
۱۰۔ تاریخ ابن ایاس کے چند نو دستیاب شدہ اجزاء (محمد مصطفےٰ - قاہرہ)
۱۱۔ انقرہ کے مخطوطات (بکر صدقی بایکل - انقرہ)
۱۲۔ جمہرۃ الانساب لابن خرم شائع کردہ لیوئی پرووان سال کی بے شمار غلطیاں،
(خلیل نیاچ - استانبول)
۱۳۔ سفرنامہ ابن فضلان قدیم جرمن معلومات کے ماخذ کے طور پر،
(گراف، باڈمانن برگ، جرمنی)
۱۴۔ اباضیون کے ریت میں غائب شدہ شہر سیدراتہ کی دریافت
(میڈم فان برشم، جینوا)
۱۵۔ خلفاء فاطمیین کے آداب و مراسم (کانار الجزائر)
۱۶۔ عماد الدین اصفہانی کی الفتح القسی (ماسے - پاریس)
۱۷۔ الحاکم کی رصدگاہ مصر (آیدین سائلی - انقرہ)
۱۸۔ عربی و اسلامی طب (سارنیلی - نیپلز)
۱۹۔ ابودلف کا رسالہ ثانیہ (مینورسکی، کیمبرج)
۲۰۔ ولی کشمیر میر سید علی ہمدانی (علی اصغر حکمت - طہران)

Marfat.com

۲۱۔ فنِ تنقید کی ترقی میں قرآن کا حصہ (خلف اللہ - اسکندریہ)
۲۲۔ فقہ کی تاریخ (برون شوانگ - بورڈو، فرانس)
۲۳۔ اسلامی مشرق میں زراعت کا اثر زمین پر (ہسکے - استانبول)
۲۴۔ زانی کے مزینہ سے نکاح کی حرمت اسلام میں (شاخت، آکسفرڈ)
۲۵۔ ناصر خسرو کی جامع الحکمتین (گوربین - طہران)
۲۶۔ اسلام اور بنیادی حقوق انسانی (محمد غوث - حیدرآباد دکن)
۲۷۔ اسلامی قانون کی تاریخ پیدائش (گوئٹائن - اسرائیل)
۲۸۔ مقدمہ ابن خلدون کے نئے صحیح اڈیشن کی ضرورت (تاویت الطنجی، قاہرہ)
۲۹۔ اسلام اور ساجی بیمہ (محمد یوسف الدین - حیدرآباد دکن)
۳۰۔ فتوت تاریخ اسلام میں (ماسینون، پاریس)
۳۱۔ دیوان حافظ کا قدیم ترین نسخہ کلکتہ میں ہے (زبیر صدیقی - کلکتہ)
۳۲۔ قبلائی قاآن کا جاوا پر حملہ (داماے - انڈوچائنا)
۳۳۔ پندرہویں اور سولہویں صدی کی ترکی مردم شماریاں (عمر لطفی برکان، استانبول)
۳۴۔ ویانا (آسٹریا) میں ۱۷۶۶ء کی ترکی جبری فوجی خدمت
(اپنے پے کی ویس - ویانا)
۳۵۔ انیسویں صدی کے آغاز میں کودریکا یونانی کی جاسوسی ترکی میں، فرانسیسی وزیر خارجہ کی روشنی میں (ایضاً)
۳۶۔ جوامع التواریخ مولفہ رشید الدین خان کے حالاتِ فرنگ کے ماخذ
(یان اوتربشت، ہالینڈ)
۳۷۔ بی بی مریم کی تاریخ میں دوسری صدی عیسوی کا ایک ترکی قصیدہ
(پپالتی - استانبول)
۳۸۔ قدیم چغتائی میں ایک ترجمہ قرآن مجید (فاخر عز - لندن)
۳۹۔ قرہ قویونلو اور آق قویونلو (مینورسکی - کیمبرج)
۴۰۔ ''سیاست نامہ'' کس حد تک اصلی ہے (یحیٰی الخشاب - قاہرہ)

Marfat.com

۴۱۔ پرانے ایران کا جاگیرداری نظام (ویڈن گرین - اپسالا - سویڈن)
۴۲۔ تالمود اور حدیث کی مماثلتیں (بانیت - اسرائیل)
۴۳۔ ایرانی سیاست اور یہود کی بابل سے واپسی (گالنگ - مائنس - جرمنی)
۴۴۔ بحرمیت کے پاس حال میں دستیاب شدہ قبل مسیح کا نسخہ توریت،
(فاندر ریلوک، ہنمیگین، ہالینڈ)
۴۵۔ اتھنس کی فاتحہ جامع مسجد (ماتیسکو - اتھنس)
۴۶۔ مسلمان مصوروں کی سوانح عمریاں مرتب کرنے کی ضرورت (مایر - اسرائیل)
۴۷۔ فاطمی دور کے منقش مٹی کے برتن (زکی حسن - قاہرہ)
۴۸۔ قدیم غزنی میں ترکی فنون لطیفہ (ایٹنگ ہازوین - واشنگٹن)
۴۹۔ ترکی اثر مغلیہ فنونِ لطیفہ پر ہند میں (بلیے براون - پارلیس)
۵۰۔ استانبول کے قبرستانوں کے کتبے (معین اطانچ - استانبول)
۵۱۔ عربی خط کا ولولہ خیز درجہ فنِ لطیف میں (مدحیہ - استانبول)
۵۲۔ ماخذ ہائے فقہ کا جدید مطالعہ (قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس کے علاوہ دیگر ایک درجن ماخذ راسخ العقیدہ فقہا کے ہاں (ناچیز راقم الحروف)

موتمر نے متعدد قراردادیں بھی منظور کیں کہ مختلف حکومتوں سے خواہش کی جائے کہ اپنے ہاں کے کتب خانہ ہائے عمومی کے مخطوطات کی فہرستیں شائع کریں اور فوٹو لینے کے انتظامات کریں۔ مخطوطہ کتابوں کے علاوہ دستاویزوں کے مطالعہ پر اہل علم توجہ کریں، اسلامیات کا خصوصی مطالعہ کرنے والوں کی ایک خصوصی انجمن بنائی جائے اور آئندہ اجلاس انگلستان میں ہو، (جو تین یا چار سال بعد ہوگا)۔

موتمر مستشرقین کے سلسلہ میں استانبول کے علاوہ درجن بھر دیگر ترکی شہروں میں بھی علمی نمائشیں کی گئیں، جن میں قلمی کتابیں تصویریں، قدیم آلات، وغیرہ وغیرہ بلامبالغہ لاکھوں کی تعداد میں جمع کی گئی تھیں۔

آئندہ سال ۱۳۷۲ھ ۵ر جمادی الآخرہ کو مولانا روم کی وفات پر پانچ صدیاں گزر رہی ہیں اور ۱۶۵۳ عیسوی میں فتح قسطنطنیہ کی پانچ صد سالہ سالگرہ سرکاری طور پر

Marfat.com

ترکی میں منانے کا انتظام ہورہا ہے۔ یہ خبر مسرت سے سنی جائے گی کہ مکتوب مبارک نبوی بنام مقوقس موجود ہے اور عجائب خانہ توپ قپو سرائے میں کمرۂ آثار مبارک میں ایک سنہری صندوق میں عزت واحترام سے محفوظ ہے۔

ترکی حکومت نے مہمانداری کے جو انتظامات کیے تھے، اس پر سارے یورپی و امریکی شرمندہ تھے کہ ان کے ہاں اس کا عشرعشیر بھی نہیں ہوتا [۱]۔

موتمر کے شعبہ ہائے اسلامی نے جہاں اور قراردادیں منظور کیں، وہیں یہ بھی تھی کہ دائرۃ المعارف جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن) کی خدمات کو وہ قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ وہ روزافزوں پھلے پھولے گا اور اپنی خدمتِ علم کو سدا جاری رکھے گا۔

ترکی کے کتب خانے:

خدا نظر بد سے بچائے، عالم اسلامی میں کتب خانوں کے لحاظ سے ترکی کا درجہ اتنا بلند ہے کہ باقی سب اس کے سامنے ہیچ نظر آتے ہیں۔ شاید یہ کہنا بھی ہر مبالغے سے خالی اور خالص صداقت ہے کہ ساری دنیا کی عربی، فارسی کی قلمی کتابیں ایک طرف ہوں اور صرف ترکی کی ایک طرف تو بھی ترکی کا پلہ بھاری رہے گا۔

۱۹۴۵ء کی ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق ترکی کے چونسٹھ شہروں اور قصبوں میں ایسے عمومی کتب خانے ہیں جن میں مخطوطات موجود ہیں۔ اکیلے شہر استانبول میں ایک سوترپن کتب خانے ہیں۔ حکومت اب ان سب کو یکجا کرتی جارہی ہے۔ چنانچہ

---

[۱] معارف: اس کے مقابلہ میں ہم ہندوستانیوں کی میزبانی کا حال یہ ہے کہ ابھی گزشتہ اکتوبر میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کا جو اجلاس لکھنو میں ہوا تھا اور جس میں ہندوستان کے علاوہ بیرونی ملکوں کے بعض نمائندے بھی آئے تھے، اس میں میزبانی کا جیسا انتظام تھا، اس کو دیکھ کر گردن شرم وندامت سے جھک جاتی تھی کہ بیرونی ملکوں کے نمائندوں کا سوال تو الگ رہا، خود ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے بلند اور ستھری معاشرت کے لوگوں نے اہل لکھنو کی میزبانی اور سلیقہ وتمیز کے متعلق کیا رائے قائم کی ہوگی، مگر اس میں اہل لکھنو کا شکوہ بے کار ہے اس لیے کہ لکھنو جن لوگوں سے عبارت ہے وہ اس میں دخیل ہی نہ تھے۔

Marfat.com

موتمر مستشرقین ۱۹۵۱ء کے موقع پر جو رہبر مکاتب ہمیں تقسیم کیا گیا اسکی تحریر کے مطابق استانبول کے یہ ڈیڑھ سو سے زائد کتب خانے اب صرف اٹھارہ عمارتوں میں اکٹھے ہو گئے ہیں، اکیلے کتب خانۂ سلیمانیہ میں اب ترپن کتب خانے ہیں۔

انکی کتابوں کی صحیح تعداد بیان کرنی مختلف وجوہ سے مشکل ہے۔ ۱۹۴۵ء میں وزارت تعلیمات کی رپورٹ میں کوئی بیس ہزار ترکی، ایک لاکھ گیارہ ہزار عربی اور آٹھ ہزار فارسی قلمی کتابوں کا اندازہ کیا گیا تھا، اس فہرست میں انقرہ میں کوئی قلمی کتاب نہیں بتائی گئی ہے، (اور میں نے وہاں کے کتب خانۂ عام میں آٹھ ہزار مخطوطات نیز جامعۂ انقرہ کے شعبۂ تاریخ و جغرافیہ میں ۱۷ ہزار مخطوطات خود دیکھے)۔ اسی طرح کتب خانۂ جامعہ استانبول کو اس شمار سے خارج رکھا گیا تھا، وہاں اس وقت سترہ ہزار سات سو اڑتالیس (۱۷۷۴۸) مخطوطے ہیں اور جدید خریداری اور تحفوں کی وصولی کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ یہ یاد رہے کہ مجموعۂ رسائل کو شمار میں صرف ایک کتاب فرض کیا جاتا ہے اور بعض وقت ایک ایک جلد میں سو سو چھوٹے چھوٹے رسالے ہوتے ہیں اور یہ صورتیں نادر نہیں، جب ان میں نادر روزگار کتابیں ہوں۔

ان دو مرکزوں کے علاوہ بروصہ اور قونیہ میں سے (جہاں مولانا رومؒ کا مزار ہے) ہر ایک میں پانچ پانچ چھے چھے ہزار مخطوطات ہیں۔ ان مقاموں کے علاوہ راقم کو افیون قرہ حصار، بالیکیسر، ینی شہر، چوروم، سکی شہر، قسطمونو، قیصری، کوتاہیہ اور منسیا جانے کا موقع ملا، لیکن حسرت رہی کہ ازمیر (سمرنا) ادرنہ (اڈریانوپل) اماسیہ، چنکیری، اسپارتا، عطیہ اور سمسون جانا نہ ہو سکا، جہاں ہر ایک میں ہزاروں مخطوطات ہیں۔ کیا عجب ہے کہ جہاں تعداد کم ہے، وہیں گودڑ میں لال چھپے ہوے ہوں۔ خانگی ذخیروں کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

ترکی جانے کا مقصد موتمر مستشرقین کی شرکت کے بعد چند معین مخطوطات سے استفادہ کرنا اور دینوری کی کتاب النبات کو ایڈٹ کرنے کے سلسلے میں ان کی جانب رجوع کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دو مہینوں کے قیام اور درجن بھر سے زائد مقاموں کے سفر کے باوجود بہت زیادہ کتابیں دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ فہرستیں دیکھیں، چند نام نوٹ کیے

Marfat.com

اور اُن میں سے بھی چند منتخب کو منگوا کر ورق گردانی کی۔ بہر حال اپنی یادداشت میں سے چند کا ذکر ناظرین کے لیے کرتا ہوں۔

فقہ:

۱۔ کفایۃ المنتہی، مألفہ مرغینانی (صاحب ہدایہ) اس نادر روزگار کتاب کے نسخے جامعہ استانبول اور اباصوفیہ میں ہیں۔ یہ ہدایہ کے بعد کی تالیف ہے، لیکن توقع کے برخلاف زیادہ بڑی نہیں، چار سو سے بھی کم ورق ہیں، قامت کہتر ہو تو کیا ضروری ہے کہ قیمت بھی کمتر ہو۔

۲۔ التجنیس والمزید: مؤلفہ الفیا، استانبول، بروصہ، قونیہ وغیرہ میں متعدد نسخے ہیں۔

۳۔ کتابُ الرسوم: مؤلفہ عبدالرحمٰن بن نصر بن عبداللہ (بروصہ و انقرہ) یہ فنِ حسبہ کی نظری نہیں، بلکہ عملی کتاب ہے اور ان تمام محاصل کا ذکر ہے، جو مختلف اہلِ پیشہ سے وصول کیے جاتے تھے، مثلاً شاہراہ، پل، غلّہ فروش، نانبائی، قصاب، حلوائی، دوا فروش، عطّار، ماہی فروش، گوالے، بزاز، درزی، رنگریز، موچی، صراف، سنار، طبیب حیوانات، غلام جانور فروش، حمام، فصد کھولنے والے، طبیب مودب، مودّب صبیان (استاذ) اہلِ ذمہ وغیرہ، ہر اہلِ پیشہ کی چالبازیوں اور اہل حسبہ کی نگرانی سے بھی بحث ہے۔

۴۔ نہایۃُ المجتہد و کفایۃ المقتصد: مولفہ ابن رشد (قونیہ دو جلد) یہ گویا بدایۃ المجتہد کا تکملہ ہے، اس نسخہ کی یہ خصوصیت بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہ حضرت محی الدین ابن عربیؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، نیز (روایۃ محمد بن علی بن محمد بن احمد ابن العربی الطائی الحاتمی عنہ اجازۃ ومناولۃ)

۵۔ اصول الفقہ: مولفہ موفق الدین ابومحمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ المقدسی (قونیہ) حنبلی اصولِ فقہ پر نفیس کتاب ہے۔

۶۔ شرح القدوری للاقطع: المتوفی ۴۷۴ھ دو جلد (قونیہ)

Marfat.com

۷۔ آدابُ القضاۃ للخصّاف (قونیہ)

۸۔ شرح مختصر الکرخی: مولفہ قدوری (بروصہ)

۹۔ کتاب التجرید: مولفہ قدوری وہبی، (استانبول)

قرآنیات:

۱۔ تفسیر بسیط للواحدی: (۱۰۰۵) ورق (قونیہ)

ان کی تفسیر وجیز کے نسخے زیادہ ملتے ہیں مگر تفسیر بسیط بہت کمیاب ہے۔

۲۔ تفسیریات پر سترہ رسائل کا ایک ضخیم مجموعہ (قونیہ)

اہم تر رسالے یہ ہیں:

۱۔ ترتیب التیسیر فی قواعد علم التفسیر۔ بزمانہ الملک الظاہر چمق

۲۔ الناسخ والمنسوخ لابن سلامہ البغدادی المتوفی ۴۱۰ھ

۳۔ الاکلید للسیوطی

۴۔ احکام القرآن لسرح الدین درویش بن قاسم نقل ۸۹۰ھ

۵۔ تبیان مولفہ نووی

۶۔ الجواہر المعون للشعرانی۔

۷۔ اسباب النزول للواحدی

۸۔ تاویلات مشکل القرآن لابن قتیبہ

۹۔ التعریف للسہیلی صاحب روض الانف

۱۰۔ بُرهان القرآن لحافیہ من الحجۃ البیان لمحمود بن حمزۃ المقری الکنانی المتوفی ۵۰۰ھ

۱۱۔ المتشابهات للراغب الاصفہانی

Marfat.com

۳۔ تفسیر امام الحرمین الجوینی (جامعۂ استانبول)

۴۔ احکام القرآن مؤلفہ بیضاوی، مشہور تفسیر بیضاوی کے مؤلف ہی کی تالیف (کوتاہیہ) دو جلدیں

۵۔ امثال القرآن مؤلفہ امام ماوردی (بروصہ)

۶۔ تفسیر ابن عربی (بالی کیسر) اسی (۸۰) جلدوں میں سے صرف ایک جلد۔

متفرقات:

۱۔ کتاب الذخائر والتحف (افیون قرہ حصار) مختلف بادشاہوں وغیرہ نے جو تحفے بھیجے اس میں انکی دلچسپ تفصیل اور دوسرے معلومات ہیں۔

۲۔ معدن الجواہر (قونیہ) بصرہ اور جزائر خلیج فارس کے حالات۔

۳۔ تاریخ صفد (جامعۂ استانبول) شہر صفد، صور، عکہ، ناصرہ، طبریہ، عثلیث وغیرہ کے حالات۔

۴۔ کتاب المفردات للادریسی (محمد فاتح استانبول) یہ مشہور مولف ادریسی کی جڑی بوٹیوں پر ایک اہم کتاب ہے۔

۵۔ کتاب الصیدنہ للبیرونی (بروصہ) دواسازی پر کتاب۔

۶۔ کتاب الجفر للبیرونی (قونیہ) علم جفر پر بیرونی جیسے شخص نے جو کچھ لکھا ہو، وہ لغویت نہیں ہوسکتی۔

۷۔ جواہر نامہ مؤلفہ نصیر الدین طوسی (انقرہ) فارسی، جواہر شناسی پر نفیس رسالہ ہے۔

۸۔ عجائب الدنیا مؤلفہ مسعودی (بروصہ)

۹۔ اخبار الزمان مؤلفہ مسعودی (قسطمونو) مسعودی کی کم چیزیں بچی ہیں۔

۱۰۔ غریب الحدیث مؤلفہ ابو عبید القاسم بن سلام (چورم) ۳۱۹ھ کا مخطوطہ ہے۔ ابتدائی چند ورق موجود نہیں ہیں اور بیشمار اجازتیں اور سماعات ہیں۔

۱۱۔ غریب القرآن والسنۃ، مؤلفہ ابو عبید (قونیہ)

Marfat.com

۱۲۔ اخبار خالد بن ولید مولفہ محمد بن ابراہیم بن یوسف الحنبلی نقل ۹۶۴ھ (قونیہ)

۱۳۔ مجموعۂ (الف) کتاب المقصود والممدود لابی العباس بن ولاد۔

(ب) کتاب المذکر والمونث لابی حاتم السجستانی (قونیہ)

۳۸۶ھ کا مخطوطہ ہے۔

۱۴۔ مولانا روم کے مزار پر شہر قونیہ میں جو عجائب خانہ کھولا گیا ہے، اس میں نہ صرف مولینا کے استعمالی ملبوسات ہیں، بلکہ مثنوی شریف و متعلقات اور کتاب فیہ مافیہ کے قدیم ترین نسخے بھی ہیں، ان میں متعدد فارسی تراجم قرآن میں سے ایک پر ۶۰۳ھ درج ہے، گویا مولانا روم کی ولادت سے بھی ایک سال پہلے کا نسخہ ہے۔

۱۵۔ کتاب الحشائش باتصویر (توپ قپوسرائے استانبول) نباتات کے خواص اور ان کی نہایت نفیس تصویریں ہیں۔

۱۶۔ مسالک الابصار مؤلفہ ابن فضل اللہ العمری (آیا صوفیا) اس کا ایک ٹکڑا چھپا ہے یہاں جلد (۲ تا ۲۷) ہیں۔ ہر فن کے معلومات کی انسائیکلو پیڈیا ہے، ایک باب ہندوستان پر بھی ہے، نیز اطباء کے حالات میں بھی ایک فصل ہندوستان پر ہے بعض ٹکڑے جامع استانبول وانقرہ میں بھی ہیں۔

۱۷۔ جوامع التواریخ مؤلفہ رشید الدین خان (توپ قپو استانبول)

بہت بڑی تقطیع اور نہایت نفیس تصویروں کی حامل اور تالیف کے صرف دس سال بعد کی نقل اور مکمل ہے، اس کا ہندو کشمیر و بدھ مت کا حصہ ہالینڈ کا پروفیسر یان شائع کرنے والا ہے۔

۱۸۔ کتاب المطر والرعد (کوپرولو (استانبول)

کاغذ پر تھوڑی سی جگہ باقی رہ گئی ہے، اسے پُر کرنے کے لیے عنوان سے غیر متعلقہ چیزیں بھی درج کرتا ہوں۔ میں نے ۱۹۳۲ء میں ترکی میں تین ماہ گزارے تھے۔ اس انیس سال میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، ان کا اکثر حصہ خوشگوار ہے۔ مذہبیت بہت بڑھ گئی ہے اور الحمد للہ نماز کا شوق نوجوانوں میں زیادہ ہوگیا ہے۔ تین چار بڑے

Marfat.com

شہروں کو چھوڑ کر باقی ملک میں شراب خانے ناپید ہیں، صنعت وزراعت میں خاص ترقی ہوئی ہے، لیکن بعض پہلو افسوسناک بھی ہیں۔ ملک کی آزادی اب باقی نہیں رہی اور ترکی وزراء اپنے ضمیر کے خلاف واشگٹن کے حسب الحکم رائے دینے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں۔ یہودی اثر ہر جگہ غالب ہے، کمال پاشا کے دور میں بھی یہودی وزراء ہی کارفرما تھے۔ ہمیں دور سے نام کی بنا پر اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ جاوید پاشا وزیر مالیات (جسے کمال پاشا کی جان کے خلاف سازش کرنے کے الزام میں پھانسی دی گئی،) توفیق رشدی آراس (سابق وزیر خارجہ) خالدہ ادیب خانم[1] سب یہودی ہی تھے، یا ہیں، اب بھی ملک کی تجارت یہودیوں ہی کے ہاتھ میں ہے، دولتمند صرف وہی ہیں۔

چند ماہ ہوئے معارف میں میرا ایک خط چھاپا گیا تھا جس میں رسم الخط کے بعض مسائل سے بحث تھی۔ استانبول میں مشہور عربی لغت العباب مؤلفہ صغانی دیکھ رہا تھا کہ اس میں جا بجا معرب الفاظ کی اصل نظر سے گزری۔ مؤلف کے ہاتھ کے مخطوطے میں (گ) کو (ک) لکھا گیا ہے۔ ایسا ایک اقتباس جو کچھ اور تاریخی اہمیت بھی رکھتا ہے درج ذیل ہے:

"والقصیر......جزیرۃ صغیرۃ عالیہ قریبۃ من جزیرۃ هنکام فی بحر فارس قال الصغانی مؤلف هذا الکتاب ذکرلی ابراہیم هنکامی رحمۃ اللہ شیخ جزیرۃ هنکام بهاسنۃ اربع عشرۃ و سمۃ آن جزیرۃ القصیر مقام الابدال والابرار و من رویت لہ الارض،

جزیرۂ قصیر خلیج فارس میں جزیرۂ ہنگام کے قریب، مجھ (صغانی) سے وہاں ۶۱۴ھ میں شیخ جزیرۂ ابراہیم ہنگامی نے بیان کیا، کہ جزیرۂ قصیر میں ابدال وابرار اور وہ لوگ رہتے ہیں جن سے روئے زمین کی کوئی چیز چھپی نہیں رہتی اور وہاں کوئی آبادی نہیں ہے، اگر کوئی جہاز وہاں لنگر ڈالے تو وہ لوگ دکھائی

[1] معارف: آگراس سے مراد مشہور ومعروف خالدہ ادیب خانم ہیں، جو چودہ برس پہلے ہندوستان آ چکی ہیں تو یہ انکشاف بالکل نیا ہے، اس لیے کہ وہ تو بظاہر مسلمان تھیں، ممکن ہے نسلاً یہودی رہی ہوں یا اس نام کی کوئی اور خاتون ہوں۔

Marfat.com

وَلیس بها ساکن۔ ومن ارسیٰ
بها یراهم ویغلیون عنه۔
واشارلی الیها من هنکام
نظالت فزاء ت لی بعد لای۔
وَلو املك زمام امری لرکبت
الیها سواری الغمام وتشبثت
باذیال الریاح ولکنی کنت
محملت الرسالة الی الهند من
بغداد وما ابعد السند من
سنداد۔

دیتے ہیں، پھر غائب ہو جاتے ہیں۔
پھر شیخ نے اشارے سے بتایا، بڑی دیر
کے بعد میں نے اسے دور سے دیکھا
اگر میں اپنے کام کا مختار ہوتا، تو بادلوں
کے ستونوں پر سوار ہو کر اور ہوا کے
دامن میں چمٹ کر وہاں جاتا، لیکن
بغداد سے مجھے سفارت پر ہندوستان
(سندھ) بھیجا گیا تھا اور سندھ اور
سنداد قریب نہیں ہیں۔

(معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۵۲ء)

کیمبرج کی موتمر مستشرقینِ عالم

محترم جناب اڈیٹر صاحب معارف ۔ اعظم گڑھ

سلام مسنون۔ معلوم نہیں تازہ موتمر مستشرقین کی روداد آپ تک پہنچی یا نہیں بصورت نفی مندرجہ ذیل تذکرہ شاید ناظرین کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

تمہید و مبادیات:

اگر چہ بعض حالات نے مجھے موتمر میں شرکت کے لیے کیمبرج جانے کا موقع نہ دیا، لیکن مختلف لوگوں سے جو چشم دید حالات سنے اور موتمر کے جو سرکاری نشریات دیکھے، اُن کی روشنی میں یہ معلومات ناظرین کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔

موتمر کا گزشتہ اجلاس استانبول میں ہوا تھا جس کی دور ونداد یں معارف میں چھپ چکی ہیں ۔ وہاں کی قرار داد کے مطابق تازہ اجلاس انگلستان میں ہوا۔ اس کی دعوت رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے دی تھی اور ملکۂ برطانیہ نے سرپرستی قبول کی تھی اور اس کے لیے کیمبرج کا انتخاب ہوا جس کی وجہ غالبًا اس کا جامعاتی قرونِ متوسطہ کا ماحول بھی ہے اور شہر کا حسن کیونکہ آکسفر ڈاب ایک صنعتی شہر بن گیا ہے۔ جس کی پرانی ہیئت بدل گئی ہے۔ یہ موتمر کا تیئسواں اجتماع تھا جو ۲۱ تا ۲۸ اگست ۱۹۵۴ء کو منعقد ہوا۔ آیندہ اجلاس تین سال بعد جرمنی میں ہوگا۔

جو فرنگی استانبول کے اجتماع میں وہاں کی اسلامی مہمان نوازی دیکھ چکے تھے، وہ کیمبرج کی ترقی یافتہ اور مہذب مہمان نوازی پر اگر زبان سے اعتراف نہ بھی کریں تو دل میں ضرور شرمائے ہوں گے۔ کالجوں کے اقامت خانے رہایش کے لیے مفت تھے اور اسی کے باورچی اور ملازم بھی تھے۔ پھر بھی قیام و طعام کا اقل ترین خرچ تمیں شلنگ

ساری دنیا میں مذہب شکنی کے پرچار میں مشغول رہے لیکن حیرت اس پر ہوتی ہے کہ اپنے حریف امریکہ اور اس کے رفقاء کا اثر گھٹانے اور ان اسلامی ممالک کو جو اس وقت حریف کے زیرِ نگین تو نہیں لیکن زیر اثر ضرور ہیں اپنا ہمنوا بنانے کی جب وہ کوشش کر رہا ہے اور اس کے لیے حج کو ہر سال سرکاری اہتمام سے چند افراد بھیجے جاتے ہیں اور قاہرہ کے سفارت خانے میں کثرت سے مسلمانوں کو مامور کر کے ان کو تاکید کی جاتی ہے کہ وہ پابندی سے نماز باجماعت مسجدوں میں پڑھا کریں ایسی حالت میں اپنے مخفی نمایندوں کے ذریعہ نہیں بلکہ علانیہ ومسلمہ سرکاری نمایندوں کے ذریعہ کیمبرج جیسے مقام پر ایسی حرکتیں کیوں کی جاتی ہیں جن سے روس کے حریفوں کو ایک مفت کا حربہ ہاتھ آتا ہے؟ یہ واقعہ ہے کہ آج کل سارے آزاد اسلامی ممالک امریکہ، برطانیہ، فرانس، ہالینڈ اور بلجیم وغیرہ سے نالاں ہیں۔ ان حالات میں روس کے لیے یہ آسان تھا کہ وہ اپنے کو مظلوموں کا ہمدرد ظاہر ہی نہیں بلکہ ثابت بھی کرے۔ اس کے لیے ایک آدھ ووٹ اسرائیل کے خلاف کبھی کبھی دے دینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی اعلان کردہ سرکاری پالیسی پر عمل کر کے (ثابت کرے کہ وہ) آزادی اور ناطرفداری کا حامی ہے اور یہ پالیسی عملاً اندرونِ ملک کے مسلمانوں کے ساتھ برتی جائے اور بیرونِ ملک ان حماقتوں کا سدِ باب کیا جائے جس کا کیمبرج میں مظاہرہ کیا گیا۔

<u>تقسیم کار:</u>

تقریباً نو سو نمایندوں کے اجتماع کے باعث کام کو بارہ شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا جس کی سرکاری ترتیب یہ تھی۔

۱۔ مصریات ۲۔ سامی لسانیات
۳۔ آشوریات ۴۔ ایران، آرمیدیا، وسطی ایشیا
۵۔ آلتائی (ترکی) السنہ ۶۔ ترکیات (تاریخ)
۷۔ ہندیات ۸۔ مشرق بعیدہ
۹۔ (الف) اسلام (السنہ ادبیات وفنونِ لطیفہ)

روزانہ لیا گیا جو عام ہوٹلوں سے بھی گراں تھا۔

دعوت نامے میں سب سے پہلے یہ درج تھا کہ پروٹسٹنٹ، کیتھلک اور یہودی عبادت کا انتظام کن مقاموں پر کس کس وقت ہوگا۔ جب موتمر میں شرکت کرنے والے عربی نام والے صاحب بہادروں کو خود ہی فکر نہ ہو تو اسلام کو کون پوچھتا، جب مدعی خود ست ہو تو گواہ کیوں چست ہوگا؟

برسوں کی بے تعلقی کے بعد پہلی مرتبہ اس دفعہ روس سے بھی دس بارہ نمایندے آئے تھے۔ انتخاب اگرچہ ایسے لوگوں کا کیا گیا تھا، جو انگریزی اچھی جانتے تھے لیکن عصبیت یا خودداری کہ انہوں نے اپنی مادری زبان ہی میں سارے مقالے سنائے مگر ان کی اس جدت کو اور لوگوں نے رشک کی نظر سے دیکھا کہ ان مقالوں کے انگریزی ترجمے بھی وہ طبع کرا کے ساتھ لائے تھے اور حاضرین میں مفت تقسیم کردیے گئے تھے۔ عموماً ہر شعبے میں ان نمایندوں نے حصہ لیا، فانوسی تقریروں کے ذریعے مزید دلچسپی پیدا کی گئی، اگرچہ فنی نقطہ نظر سے ان رنگین فلموں کی سب نے داد دی۔ لیکن اس کا منشا چونکہ علم سے زیادہ دعایہ اور پروپیگنڈا تھا اس لیے ہر شخص کا ردعمل اس کے حوصلے کے مطابق تھا۔ ان میں سے ایک ''بزرگ'' کی تحقیق و استنباط یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اہل مکہ جس ''اللہ'' کی پوجا کرتے تھے وہ ایک بڑا سرمایہ دار تاجر سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسرے ''بزرگ'' نے دو قدم آگے بڑھ کر یہ ارشاد فرمایا کہ مسیلمہ کذاب نے قرآن مجید کی نقالی کر کے اس کا منھ نہیں چڑایا تھا بلکہ اصل میں مسیلمہ کذاب کے ''ادبی شہ پاروں'' کی نقالی کر کے پیغمبر اسلام نے قرآن مجید تیار کیا تھا۔ اگر خداوندانِ ماسکو کا منشا صرف خدا پرستی اور ہر ایک خدا کو ماننے والے دین کی مخالفت ہو تو البتہ ان تحقیقاتوں کو کسی نہ کسی حد تک درست کہا بھی جا سکتا تھا، لیکن جو لوگ غیر جانبداری سے سیاسیاتِ عالم کا مطالعہ کرتے ہیں اور جنہیں نہ روس سے دشمنی ہے اور نہ امریکہ سے کوئی خوش عقیدگی وہ اس طرح کی بوالعجبیوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ روس کا یہ منشا تو سمجھ میں آتا ہے کہ سویٹ یونین میں بسنے والے سارے مسلمانوں کو دہریہ اور اشتراکی بنایا جائے۔ اسی طرح اس کی اس سیاست کو بھی بااصول قرار دے سکتے ہیں کہ اپنے خفیہ کارندوں کے ذریعہ وہ

Marfat.com

(ب) اسلام (تاریخ و مذہب)

۱۰۔ مشرق و مغرب کا تماس، اور مشرقی ممالک کی عیسائیت

۱۱۔ افریقہ۔

معلوم نہیں اس تقسیم کی ترتیب کس اصول پر کی گئی، ہم کو بے وجہ بدگمانی نہیں کرنی چاہیے۔

منتخب مقالے:

نظام العمل میں مقالے جس ترتیب سے درج ہیں اس کو برقرار رکھتے ہوئے چند ایسے عنوانوں کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے جو معارف کے ناظرین کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ (رموز: گ انگریزی، ف فرانسیسی، ج جرمن)

۱۔ مسٹر غنیم (گ) سقارہ میں تیسرے مصری خانوادے کے نئے سیڑھی دار اہرام کے ایک احاطے کی دریافت

۲۔ Baamgartel ع (گ) خانوادہ واریت سے قبل کا مصری فن تعمیر

۳۔ عبدالرحمٰن بدوی (گ) قدیم مصری اصول تعمیر کے متعلق بعض لسانیاتی شواہد

۴۔ y - yadin (گ) تیسرے الفیۂ قبل مسیح کے آغاز پر فلسطین و مصر کے حربی تعلقات

۵۔ مسٹر حسن (گ) ابوالہول کے راز نئی کھدائیوں کی روشنی میں

۶۔ W.F. Albright بنی اسرائیل کے خروج مصر سے متعلق چند ملاحظات

۷۔ J.Rykman (ف) وسطی عرب کے ثمودی کتبوں پر عارضی تبصرہ

۸۔ G.c.m. Rykman (ف) وسطی عرب میں ۱۵۵۱ء تا ۱۹۵۲ء میں چٹانوں پر دستیاب شدہ سبائی کتبوں کی مختصر فہرست۔

۹۔ سینٹ جان عبداللہ فلبی (گ) سعودی عرب میں ۱۵۵۱ء تا ۱۹۵۲ء کے کتبات کی تلاش کی مہم کا جغرافی اور عام تذکرہ۔

۱۰۔ ایضاً۔ ملکہ سبا کے ملک کی تلاش (ایک فلم)

Marfat.com

۱۱۔ g M. Fitegerald (گ) ہکسوس بادشاہوں کے قلعے اور جنگی رتھیں (حضرت یوسفؑ کے زمانے میں یہی شامی خانوادہ مصر پر حکمران تھا)

۱۲۔ H.Birkeland (گ) قدیم کلاسیکل عربی لہجے کا اتار چڑھاؤ (accent)

۱۳۔ J.Pirenne (ف) یونان اور سبا کے تعلقات جنوبی عرب کی تاریخ اور واقعات کا زمانہ معین کرنے کی ایک نئی اساس۔

۱۴۔ W.Maxtix (گ) سامی السنہ کے صیغہ امر کی اصلیت۔

۱۵۔ مسٹر مسقطی (گ) سامی السنہ کا صیغہ جمع۔

۱۶۔ J.Sckirmann (گ) قرونِ متوسطہ کی عبرانی شاعری میں خوبصورت لڑکا (امرد پرستی)

۱۷۔ C.J.Edmands (گ) عراق کے اہلِ حق

۱۸۔ T.J. Billy (گ) ڈنمارک کی ۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۴ء میں بحرین بھیجی ہوئی علمی مہم کا مختصر اور ابتدائی خاکہ

۱۹۔ Ericoceralli (گ) قرون متوسطہ کے مغربی افسانوی واقعات کا فارسی مخطوطات کے ایک نئے ذخیرے میں ذکر۔

۲۰۔ F.Altheim اور R.S.T.iehl (ج) بہرام چوبین کا افسانہ

۲۱۔ R.Firye (گ) کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس بن زجکو کا اندرز نامہ

۲۲۔ مسٹر موقبر (گ) ایران کی تازہ اثریاتی دریافتیں

۲۳۔ احمد آتش (ف) شاہنامۂ فردوسی کی تکمیل کی تاریخ۔

۲۴۔ V. Minorsky (ف) اسلامی ایران کے جغرافیہ و تاریخ پر چند تشریحات۔

۲۵۔ مسٹر تیمور (ج) سیواس میں ۱۳۲۴ء کا ایک عربی و ترکی وقف نامہ۔

۲۶۔ مسٹر منصورا وغلو (گ) قدیم اناطولی ترکی کے شخصی ناموں اور لقبوں پر چند ملاحظات۔

۲۷۔ احمد آمرے (ف) ترکی زبانوں اور انڈو یوروپی زبانوں کے تعلقات۔(اردو اور ترکی میں اتنی مشابہت ہے کہ اس کا لفظی ترجمہ گلابی اردو نہیں بلکہ فصیح اردو

Marfat.com

ہوتا ہے)

۲۸۔ عثمان طوران (گ) قرونِ متوسطہ کے ترکوں میں جہانگیری کا تصور۔

۲۹۔ فائق رزیت اونات (گ) مورخ نشری کی حیات و تالیف پر جدید تحقیقاتیں۔

۳۰۔ خلیل ایناجی (گ) عثمانی سلاطین ترکی کی فتوحات اور مقامی امراء ومعززین۔

۳۱۔ زکی ولیدی طوغان (ج) از کمبون کی رزمیہ نظم خان نامہ کی ممکنہ تاریخی اساس۔

۳۲۔ طیب گوکبلگین (ف) سلطان سلیمان قانونی کے عہد کے علاقہ رومیلیکی تنظیم اور اس کا نظم ونسق۔

۳۳۔ بکر صدقی بائیکل (ج) سلاطین آل عثمان سے فیصلہ کن جنگ کے متعلق اوزون حسن کی تیاریاں اور جنگ کا آغاز۔

۳۴۔ Deny (ف) سترہویں صدی عیسوی کا ایک عالم ترکیات علی بابا البرٹ بابوفکی۔

۳۵۔ اولوجان چغتائی (گ) عثمانی سلاطین کی بیویاں

۳۶۔ احمد دانی (گ) تاریخ ہند کا پس منظر آثار قدیمہ کی روشنی میں۔

۳۷۔ A Silva Regan (گ) پرتگالی دستاویز خانوں میں ہندی مواد۔

۳۸۔ Richard whitehead (گ) جہانگیر کے کتبوں پر منطقۃ البروج کی علامتیں۔

۳۹۔ Alfxed Mastex (گ) ہندی اور اردو کی اصلیت اور اس کا آغاز۔

۴۰۔ F.P.Baxgeliakx (گ) قصر الحمراء گیارہویں صدی عیسوی میں۔

۴۱۔ بیگم F.E.Day (گ) اموی ظروف اور برتن۔

۴۲۔ J.V.Macmalam (گ) ابتدائی اسلامی کے کمبل؟

۴۳۔ ابوالعلی عفیفی (گ) ابن عربی کی تالیفات۔

۴۴۔ ولید عرفات (گ) کتب سیرت میں منقولہ نظموں خصوصاً حسانؓ بن ثابت کے اشعار کی صحت۔

۴۵۔ محمد خلف اللہ (گ) چوتھی صدی ہجری میں اعجاز قرآنی کا تصور۔

۴۶۔ مسٹر مزالی (ف) القزاز اور اس کی تالیف ونمائش الشعر۔

۴۷۔ L.A.Mayex (گ) اسلامی تعمیرات کے متعلق چند حقائق اور چند گتھیاں۔

Marfat.com

۴۸۔ B.S.Rice (گ) عربی مخطوطات کے منقش سرورق کا ارتقاء۔

۴۹۔ بیگم van Berchene (ف) صحرائے الجزائر کے ریگ میں دفن شدہ شہر سدراتہ کی کھدائی کے دو مہموں کا نتیجہ۔

۵۰۔ J.Walker (گ) اموی اصلاحات سکہ سازی کے بعد کے اوّلین سکے۔

۵۱۔ J.Roboox (گ) اسناد اسلامی علم حدیث میں۔

۵۲۔ G.Vagda (ف) پاریس کے کتب خانہ عام کے چند عربی مخطوطات کے سماعات واجازات

۵۳۔ G.Weil (گ) خلیل کے علم عروض کی کلید۔

۵۴۔ C.Caken (ف) بحر متوسط کے اسلامی ممالک کی معاشی اور سماجی تاریخ۔

۵۵۔ G.Wiet (ف) مملوک سلاطین کا ایک حکمنامہ مکہ معظمہ میں۔

۵۶۔ مسٹر مہدی (گ) ابن خلدون کے علم عمرانیات کی اساس قدیم کلاسیکل فلسفہ اور اسلامی فلسفہ میں۔

۵۷۔ M.Plessner (گ) طب اور سائنس پر عربی مخطوطوں کی ایک عالمگیر فہرست۔

۵۸۔ F.gabxieli (ف) جغرافیہ ادریسی کے کامل نسخے کی اشاعت کی تجویز۔

۵۹۔ L.Massignon (گ) بی بی فاطمہؓ سے عورتوں کی عقیدت کا اصل منشاء۔

۶۰۔ مسٹر ادریس (ف) زیری سلاطین کے زمانہ میں مالکیوں کا شیعوں سے مناقشہ گیارہویں صدی عیسوی میں (شمالی افریقہ میں)

اس کی توقع کم ہے کہ یہ مقالے کبھی یکجا شائع ہوں گے۔ اکثر لوگ اپنے پسند کے رسالوں میں اپنا مضمون دے دیتے ہیں اور بعض کے چھپنے کی کبھی نوبت ہی نہیں آتی۔ اس کی وجہ ارباب موتمر کے پاس رقم کی کمی ہے۔ کیا ترقی یافتہ مغرب میں علم کی کساد بازاری اس سے کم ہے جس کی اہلِ مشرق کے متعلق شکایت ہوتی ہے؟

شاید اس مختصر رپورٹ میں کسی کو کوئی کام کی چیز مل جائے مجھے خاص کر نمبر (۵۷) اور (۵۸) سے دلچسپی ہوئی۔

(معارف اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۵۴ء)

Marfat.com

موتمر مستشرقین عالم
کا اجلاس میونک ۱۹۵۷ء

اس موتمر کا عموماً سہ سالہ اجتماع ہوتا ہے۔ استانبول اور کیمبرج کے اجلاسوں کی روداد سے معارف کے ناظرین واقف ہو چکے ہیں۔ اس کا چوبیسواں اجلاس ۲۸ر اگست سے ۴ر ستمبر تک میونک (مغربی جرمنی) میں ہوا تھا۔ مدعوئین میں تقریباً پندرہ سو فضلا تھے جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ مٹھی بھر مسلمان بھی تھے لیکن الحمدللہ انہوں نے بہت اچھا اثر چھوڑا۔ ترک، تونسی، شامی وغیرہ مختلف ملکوں کے مسلمانوں نے شعبہ وار اجلاسوں کی صدارت بھی کی۔ ہندی مسلمانوں میں دو ایک طالب علم جو یورپ میں موجود تھے، آ گئے تھے۔ باقی سرکاری نمایندگی تھی جس کے لیے اب مسلمان چنے نہیں جاتے۔ آیندہ اجلاس ۱۹۶۰ء میں حکومتِ روس کی دعوت پر لینن گراڈ میں ہونا طے پایا ہے۔

موتمر سے خواہش کی گئی تھی کہ وہ مسلمانوں کے لیے (جن کی کوئی مسجد شہر میں نہیں ہے اور جن کو ہفتے میں ایک بار نہیں بلکہ روزانہ پانچ بار نماز پڑھنی پڑتی ہے) کانگریس کے احاطے میں کوئی کمرہ خاص کر دے۔ منتظمین نے اسے خوشی سے منظور کیا۔

موتمر کا کام اتنا وسیع ہے اور اس میں حصہ لینے والے اتنے زیادہ ہونے لگے ہیں کہ مقالوں کو چودہ شعبوں میں بانٹنا پڑا اور ان کے اجلاس بہ یک وقت ہوتے رہے۔ آدھے سے زیادہ کام اسلام اور مسلمانوں یا اسلامی علاقوں کے ساتھ خاص تھا جس سے دنیا میں ان کی اہمیت محسوس ہوتی ہے جس کا اندازہ اس فہرست سے ہوگا۔

(۱) مصریات

Marfat.com

(۲) خط منحنی اور مغربی ایشیا (عراق وغیرہ)

(۳) توریت و یہودیت

(۴) عیسائیت

(۵) سامی السنہ

(۶) اسلامی السنہ

(۷) اسلامی تاریخ وفنون لطیفہ

(۸) ترکیات

(۹) ایرانی وقفقازیات

(۱۰) ہندیات

(۱۱) وسطی ایشیا

(۱۲) چین و جاپان

(۱۳) جنوبی ومشرقی ایشیا اندونیسیا

(۱۴) افریقائی زبانیں

ان موضوعوں پر کوئی ساڑھے چار سو مقالے پڑھے گئے جن میں سے بعض میں فانوسی تصویریں بھی دکھائی گئیں، تقریریں صرف تین زبانوں میں منظور کی گئی تھیں، جرمن، فرانسی یا انگریزی۔ روسی نمایندوں نے اپنی تقریروں کو انگریزی میں چھاپ کر سب حاضرین میں تقسیم کرنے کی جدت کی تھی۔ یہ کام حکومتیں کر سکتی ہیں۔ کریماں را دست اندر درم نیست

یہ تو ممکن نہیں کہ سارے مقالوں کا خلاصہ دیا جائے محض عنوانات لکھنے کے لیے بھی کافی جگہ کی ضرورت ہے، اس لیے منتخب عنوانوں کے ذکر پر اکتفا کی جاتی ہے۔

مصریات (۴۳ مقالے):

۱۔ سلیم حسن (قاہرہ) اوناس میں جدید کھدائی

۲۔ دوڈالف آئنین (فلاڈلفیا) مطرحینہ میں کھدائی

۳۔ ژان ورکوتے (خرطوم) ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۵ء میں سودان میں اثریاتی تحقیقات

Marfat.com

۴۔ لبیب حبشی (الاقصر) رعمسیس دوم کے زمانے میں مصر اور لیبیا کے تعلقات

۵۔ حسن ثابت (خرطوم) سلطنت نپتو کے خارجہ تعلقات

۶۔ وی جے آذرئیف (موسکو) قدیم مصر کے معاشی اور ثقافتی اثرات باہمی بیرونی ممالک سے

اشوریات اور میخی خط (۵۵ مقالے):

۱۔ معزز چیغ (استانبول) استانبول کے عجائب خانے میں ۱۹۵۰ء کے بعد سے تحقیقاتی کام۔ حصہ اوّل

۲۔ خدیجہ قزل آلی (استانبول) ایضاً۔ حصہ دوم

۳۔ ای سے اشپائزر (فلاڈلفیا) مسکین اشوری تمدن میں

۴۔ سی جے گیاڈ (لندن) بنوتعد کی حکومت عرب میں

۵۔ ژورژرو (بصرہ) زیریں عراق کا قدیم جغرافیہ

۶۔ سلیمان مصطفےٰ زبیں (تونس) قدیم مشرق قریبہ کے فنون لطیفہ کے بعض اثرات افریقہ کے اسلامی فنون لطیفہ میں

۷۔ ڈبلیو ایف البرائٹ (بالٹی مور) قبل اسلام عرب کی سنہ وار تاریخ

توریت اور یہودیات (۲ مقالے):

۱۔ ایس ایم عبدالعال (لیڈس) سامریوں کے عقائد و عبادات پر اسلامی اثرات

۲۔ الگزانڈر شرابیر (بوداپسٹ) ہنگری میں ترکی دور کے عبرانی دفتر

عیسائی مشرق اور بیزنطین (۱۷ مقالے):

۱۔ فریدون دیر منگیتین (استانبول) آلیکسی اور مانویل کومنین کے محلات کا صحیح محل وقوع

۲۔ ساوی ابی جے (استانبول) خانوادہ پالیولوگ کے زمانے کا مذہبی فن تعمیر

سامیات (۲۴ مقالے):

۱۔ گونزاک ایکمان (بلجیئم) جنوبی عرب کے کتبوں میں آسمان و زمین کا ذکر

۲۔ توفیق فہد (اسٹراسبورگ) قبل اسلام کے ازلام کعبے میں

۳۔ ژاکلین پیرٹین (بلجیئم) جنوب عرب کی تاریخ میں سلطنت قبتان کا اختتام

۴۔ اسٹفان اسٹریلسین (وارسا) ایک یمنی الاصل حبشی روایت ''خط'' کے متعلق

اسلامیات، حصہ ادبیات (۳۴ مقالے):

۱۔ اڈالف گرومان (آسٹریا) قرآن کریم کے قدیم نسخوں کی تاریخ کا تعین

۲۔ صلاح الدین المنجد (قاہرہ) ادارۂ مخطوطات عربی اور اس کی کارکردگی

۳۔ یحیٰی خشاب (قاہرہ) نظام الملک اور سیاست نامہ

۴۔ جورج قنواتی (قاہرہ) قاضی عبدالجبار معتزلی کی المغنی فی اصول الدین

۵۔ آناری شمل (انقرہ) اقبال کا جاوید نامہ

۶۔ محمد طالبی (پاریس) قراءۃ بالالحان

۷۔ عابد مزالی (تونس) تفسیر یحیٰی بن سلام

۸۔ وی آئی بلیایئف (موسکو) الاوراق للصولی کا مخطوطۂ لینن گراڈ

۹۔ آر والتسر (آکسفرڈ) فارابی کی آراء المدینۃ الفاضلہ

۱۰۔ مادموازیل ڈالویرنی (پاریس) الکندی کے دو غیر مطبوعہ رسالے ''علم مرایا اور سحر'' پر

۱۱۔ عباس زایات (جرمنی) ابوحیان توحیدی کا ایک نایاب واحد مخطوطہ

۱۲۔ ایلویل سٹن (ایونبر) فارسی علمِ عروض

۱۳۔ باوزانی (روما) فارسی ادبیات میں ''ہندی انداز''

۱۴۔ محمد ابراہیم الکتانی (مراکش) المورد الاعلیٰ فی اختصار المحلی اور المقدح المعلیٰ فی کمال المحلی''

۱۵۔ فیلکس پریخا (مجریط اسپین) مخطوطہ کتاب الشطرنج نمبر ۲۲۳۴ عاطف آفندی

Marfat.com

استانبول

۱۶۔ امجد طرابلسی (دمشق) زجر النابح لابی العلاء المعری (از برٹش میوزیم)

۱۷۔ مجتبیٰ مینوی (طہران) کلیلہ ودمنہ کا اختصار از خلیفہ مامون

۱۸۔ ڈاکٹر فلوصی (بغداد) عراق کی جدید مختصر کہانیوں کے رجحانات

اسلامیات حصہ مذہب، تاریخ وفنون لطیفہ (۴۵ مقالے):

۱۔ صبحی لبیب (ہامبورگ) قرون متوسط کے مصر میں قرض دینے کے اصول

۲۔ وادید ایالون (اسرائیل) سلاطین مملوک کی بحری جنگیں

۳۔ صابر خان (کلکتہ) مسکویہ نے اپنی ہمعصر معاملات کن مصادر سے حاصل کیں

۴۔ انوار الحق (مدراس) اسلامی سیاسی تصورات کے اثرات قرون متوسطہ کے یورپ پر

۵۔ ایکناس خلیفہ (بیروت) ابن خلدون کا ایک غیر مطبوعہ رسالہ

۶۔ والٹرفشل (برکلے) ابن خلدون اور تقابل مذاہب

۷۔ علی زادہ (موسکو) رشید الدین خان کی جامع التواریخ۔

یہ عنوان دیا گیا تھا لیکن جو مقالہ پڑھا گیا اس کا عنوان تھا تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی میں آذربیجان کا نظام مالگزاری اراضی

۸۔ عثمان طوران (انقرہ) سلجوقی دور میں اسلام کی اشاعت

۹۔ موریس ڈمیانڈ (نیویارک) امریکی عجائب خانوں میں قدیم اسلامی ایرانی برونز کے برتن

۱۰۔ عباس مزدہ (طہران) قدیم ایرانی کانچ کے برتن ۱۵۰۰ ق م تا ۱۵۸۰ء

۱۱۔ ارنست کیونل (برلن) برلین کے عجائب خانوں کی بعض نامعلوم تصویریں

۱۲۔ ڈی ایس رائس (لندن) جامع مسجد حران کے پتھروں میں اہل اسلام کے بعض کتبات

۱۳۔ امیر موریس شہاب (بیروت) آنجار مین ایک اموی قبیلہ کی دریافت

Marfat.com

۱۴۔ فواد سسزگین (استانبول) حدیث کی روایت کے بعض پہلو

۱۵۔ اے جانس (جوگجاکرتا) اسلام جدید اندونیسیا میں

۱۶۔ محمد حمید اللہ (پاریس) جمالیات اور فنون لطیفہ تعلیمات نبویؐ میں۔ اس کو میونک کے ریڈیو نے ریکارڈ کر کے نشر کیا۔

۱۷۔ سلیم بیراقداروِوچ (بلگراڈ) جنوبی سلاف ممالک میں مشرقی میراث فنون لطیفہ میں

۱۸۔ صبح عبدالعال (کیمرج امریکا) حجاز میں پہلی صدی ہجری میں بڑی جاگیریں

۱۹۔ ای اے بیلائف (موسکو) ساتویں صدی میں اسلامی فرقہ بندیاں

۲۰۔ اوکتائی ارسلان آپا (استانبول) تبریز کے فن کار دربار استانبول میں

ترکیات (۲۶ مقالے):

۱۔ احمد حمدی تانپنار (استانبول) ترکی شاعری میں مرثیہ

۲۔ (جی لیشکے مونستر) وحیدالدین محمد سادس

۳۔ تی بیکل اوغلو (انقرہ) صلحنامۂ مدروس ۱۹۱۸ء کی ایک غیر مطبوعہ دستاویز

ایران وقفقاز (۳۷ مقالے):

۱۔ اے جی مرزایف (موسکو) شہنشاہ نامہ کا مولف

۲۔ محمد باقر (لاہور) ایرانی قاموسین

۳۔ علی سامی (شیراز) اصطخر اور پسرگادہ

۴۔ بی جی غفوروف (ماسکو) سامانی خانوادے کا عروج وزوال

۵۔ گل پاشا الفت (کابل) خوشحال کھٹک کی شاعری میں روزمرہ زندگی کے مناظر

۶۔ محمد مقری (پاریس) اہل حق کے ہاں حلول کا نظریہ

۷۔ عبدالغفور فرہادی رواں (کابل) مشرقی فارسی کے بعض پہلو

۸۔ میر نجم الدین (کابل) شیخ سعدالدین احمد انصاری کی سوانح عمری

۹۔ ملیحہ طارق آخیا (انقرہ) سعادت نامۂ ناصر خسرو

۱۰۔ ای ای ابرٹلس (موسکو) فردوسی اور سلطان محمود غزنوی

۱۱۔ علی افقہ (طہران) ایران میں ادبی نشأۃ ثانیہ

هندیات (۴۱ مقالے):

۱۔ خواجہ احمد فاروقی (لندن) انیسویں صدی کی ہندی سماجی زندگی کے متعلق اردو فارسی معلومات

۲۔ ظل الوحید (کلکتہ) ہندوستان ہمیشہ غیر تبدل پذیر ہی رہا

۳۔ آربندہ باسو (ڈرہام) جدید ہندی تصوف

۴۔ جی ڈیریٹ (لندن) ۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۶ء میں ہندو قانون کی تبدیلیاں

ایشیا (۲۵ مقالے):

۱۔ علی توپچی باشی (پاریس) چند روسی نام جو آلتائی الاصل ہیں

۲۔ خالدہ دولو (لندن) سقانی اور لطفی کا تقابل

۳۔ سعادت چغتائی (انقرہ) بیطرۃ الواضح کا مخطوطہ

۴۔ جعفر اوغلو (استانبول) اناطولیہ اور رومیلی پر جدید تحقیقات

۵۔ اے ایم بلینیسکی (موسکو) ساتویں اور آٹھویں صدی میں صغد

چینیات (۳۴ مقالے):

۱۔ ایل سی گڈرچ (نیویارک) عربوں کے شہر زیتون یعنی چوہ نجو پر نئی روشنی

جاپان اور کوریا (۱۱ مقالے):

۱۔ ڈونالڈ شیولی (برکلے) سترہویں صدی کے جاپانی شہروں میں ناٹک

جنوب مشرق ایشیا (۱۶ مقالے):

۱۔ جی ایف ہال (لندن) سفیر اور مستشرق

۲۔ ڈی آلیدا (لزبن) جزیرہ تیمور کے فنون اور دستکاریاں

Marfat.com

افریقیات (۲۸ مقالے):

۱۔ ایف ڈبلیو پارسن (لندن) حوسہ زبان کی صرف ونحو کے بعض پہلو

عمومی اجتماعات میں تقریریں:

۱۔ کلوڈشیفر (پاریس) راس شجرہ وغیرہ کی نئی کھدائی

۲۔ پروفیسر ارومان (استانبول) اناطولیا میں اسلامی فنونِ لطیفہ

۳۔ پرنس پیٹر ڈنمارک کے علمی مشن افغانستان میں

متفرقات:

موتمر کی طرف سے متعدد تحریکیں بھی منظور ہوئیں۔ان میں سے ایک قابل ذکر یہ ہے کہ عرب ممالک میں اعلیٰ معیار کے جو روز افزوں مخطوطے شایع ہو رہے ہیں ان کو قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور مشرق ومغرب میں اس سلسلے میں تعاون کی توقع کی جاتی ہے۔

یہ غالباً پہلی مرتبہ مغرب نے مشرق کی ستایش کی ہے۔

جرمن انجمن مستشرقین کا مشہور رسالہ ZmDQ ایک سو سات برس سے جاری ہے۔اس نے موتمر کے سلسلے میں ایک خصوصی نمبر شائع کیا ہے جس میں ایک مقالہ تھا" جامعہ میونک میں مشرقیات کی تعلیم کی صد سالہ سرگزشت"۔ایک اور مقالہ عربی زبان کی لغتوں کے متعلق تھا۔

میونک کے کتب خانوں اور عجائب خانوں نے بھی اپنے ذخائر پر معلومات کی ایک باتصویر کتاب شائع کر کے تقسیم کی۔ یوروپ کے قدیم ترین عربی مطبوعات، قرآن وغیرہ کے قدیم مخطوطے میونک میں اور اس طرح کے دوسرے معلومات ان سے حاصل ہوتے ہیں۔ علاوہ دیگر معلومات مثلاً تصاویر، فنکارانہ مصنوعات، غیر اسلامی خاص کر یہودی چیزیں وغیرہ۔

غرض یہ اجتماع جس میں ہر مذہب وملک کے لوگ، ہر رنگ اور ہر خیال کے افراد اور اہل علم کے علاوہ بہت سے تماشائی جمع ہوے تھے، بہت دلچسپ تھا۔

(معارف اعظم گڑھ-مارچ ۱۹۵۸ء)

موتمر مستشرقینِ عالم
کا پچیسواں اجلاس ماسکو

Marfat.com

تمہید:

جیسا کہ تین سال قبل (معارف مارچ ۵۸ء) میونخ کے اجلاس کی روئداد میں عرض کیا گیا تھا کہ اس اجلاس میں مستشرقین نے حکومت روس کی دعوت کو بغلبۂ آرا منظور کیا تھا، چنانچہ یہ اجلاس ۹ تا ۱۶ اگست ۱۹۶۰ء کو ماسکو میں منعقد ہوا۔ اس کے مختصر حالات ناظرین معارف کی دلچسپی کا باعث ہونگے۔

تاریخ:

۱۸۷۰ء میں جب بسمارک کے زمانے میں فرانس نے جرمنوں کے مقابلہ میں سخت ہزیمت اٹھائی تو صلح کے بعد فرانس نے سارے یورپ پر حکومت کرنے کے (نپولین والے) خواب کے بجائے مشرق کی فتح بہتر اور سہل تر خیال کی۔ اس مقصد کے لیے مشرق کے متعلق ہر قسم کے معلومات کی ضرورت تھی تا کہ فوجی فتح کے بعد تسلط قائم رکھنے میں سہولت ہو، چنانچہ ان فتوحات میں تنہا اجارہ داری کے بجائے بٹوارہ ہی قابل عمل تھا، اس لیے سارے یورپ نے پورے مشرق کے متعلق ہر قسم کے معلومات فراہم کرنے میں تعاون کیا اور ۱۸۷۳ء میں پہلی موتمر مستشرقین اسی شکست خوردہ مقام پارلیس میں منعقد ہوئی (جنگ ہٹلری کے بعد بھی پہلی موتمر پھر اسی شکست خوردہ پارلیس

میں ۱۹۴۸ء میں ہوئی)۔

اس کے بعد دوسرا اجلاس لندن ۱۸۷۴ء

(۳) سنٹ پیٹر سبورگ (حال لینن گراڈ) ۱۸۷۶ء؛

(۴) فلارنس (اٹلی) ۱۸۷۸ء؛

(۵) برلین (جرمنی) ۱۸۸۱ء؛

(۶) لائیڈن (ہالینڈ) ۱۸۸۳ء؛

(۷) ویانا (آسٹریا) ۱۸۸۶ء؛

(۸) اسٹاکہوم و کرسچیانا (سویڈن (ناروے، مشترکہ طور پر) ۱۸۸۹ء؛

(۹) لندن ۱۸۹۲ء؛

(۱۰) جنیوا (سوئستان) ۱۸۹۴ء؛

(۱۱) پاریس (فرانس) ۱۸۹۷ء؛

(۱۲) روما (اٹلی) ۱۸۹۹ء؛

(۱۳) ہامبورگ (جرمنی) ۱۹۰۲ء؛

(۱۴) الجزائر ۱۹۰۵ء؛

(۱۵) کوپن ہاگن (ڈانمارک) ۱۹۰۸ء؛

(۱۶) اثینہ (ایتھنس، یونان) ۱۹۱۲ء؛

(۱۷) آکسفرڈ (برطانیہ) ۱۹۲۸ء؛

(۱۸) لائیڈن (ہالینڈ) ۱۹۳۱ء؛

(۱۹) روما (اٹلی) ۱۹۳۵ء؛

(۲۰) بروسیلز (بلجیم) ۱۹۳۸ء؛

(۲۱) پاریس ۱۹۴۸ء؛

(۲۲) استانبول (ترکی) ۱۹۵۱ء؛

(۲۳) کیمبرج (برطانیہ) ۱۹۵۴ء؛

(۲۴) میونک (جرمنی) ۱۹۵۷ء؛

Marfat.com

(۲۵) ماسکو (روس) ۱۹۶۰ء: آیندہ اجلاس غالباً ۴ سال بعد ہوگا۔

تتمۂ تاریخ کے طور پر یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشہور فرانسیسی مولف موسیو بینازی نے اپنی کتاب ''فرانسیسی شمالی افریقہ خطرے میں'' لکھا ہے کہ ۱۸۷۰ء میں جرمنی نے فرانس کے معدنیاتی علاقے الراس اور مورین چھین لیے تھے۔ اس لیے فرانس کی توجہ ہٹانے کے لیے ایک دن بسمارک نے فرانسیسی سفیر سے کہا ''تونس ایک پکا ہوا میوہ ہے، تم نہ لوتو کوئی اور اسے توڑ لے گا۔ چنانچہ ۱۸۸۱ء میں فرانس نے اس پُرامن اور دوست ترکی صوبہ پر حملہ کر دیا مگر تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر سارے اسلامی ممالک پر فرنگی قبضہ ہوگیا اور اب خدا کی قدرت کرشمے دکھا رہی ہے اس موتمر کا مقصد اصلی ابتدا میں خواہ سیاسی رہا ہو مگر مستشرقین میں خالص علم دوستوں کی کمی نہیں۔

متفرقات:

۱۹۶۰ء کے آغاز ہی سے روسی اجلاس کی دعوتیں اور اسکے متعلق دوسری اطلاعیں آنا شروع ہوگئی تھیں اور بہت سے لوگوں کو موتمر سے زیادہ روس کے دیکھنے کی خواہش تھی اور یہ خیال تھا کہ سرمایہ پرستوں کی جہنم کی جگہ اشتراکی جنت میں ارزانی اور چیزوں کی افراط بہت زیادہ ہوگی، لیکن وہاں جا کر اچھے اچھے کھاتے پیتے لوگوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ قیام کے تین درجے تھے: درجۂ اعلیٰ میں تیس (۳۰) ڈالر (ڈیڑھ سو روپیہ) روزانہ، درجۂ متوسط میں ساڑھے ستاسی روپیہ روزانہ، اور درجۂ ادنیٰ میں ساڑھے سڑسٹھ روپیہ روزانہ صرف قیام و طعام کا خرچ تھا۔ درجۂ ادنیٰ میں دو دو تین تین آدمیوں کے لیے ایک کمرہ تھا۔ اسٹیشن سے ہوٹل اور واپسی کا ٹیکسی کا کرایہ پچاس روپیہ بتایا گیا تھا، اس کے باوجود میں نے ہمت کی تھی، لیکن بعد کے ایک اعلان میں بتایا گیا کہ ماسکو سے تاشقند، سمرقند، بخارا اور واپسی کا کرایہ کوئی بارہ سو روپے (ہوائی جہاز میں) ہوگا اور تاشقند میں ایک دن اور سمرقند و بخارا میں صرف چند چند گھنٹے قیام ہوگا تو بادلِ نخواستہ میں نے نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ ''قل انتظروا انا منتظرون''۔ اسلیے ذیل کے

Marfat.com

معلومات مطبوعہ اعلانات پر مبنی ہیں۔

حاضرین میں جو نظام نامہ تقسیم کیا گیا تھا اس میں بتایا گیا تھا کہ یونانی کیتھلک، پاپٹسٹ اور ارمنی عیسائیوں کے گرجے ماسکو میں کہاں کہاں واقع ہیں اور یہودی کنیے کہاں ہیں۔ مسلمانوں کے متعلق تھا کہ ۷ شارع یو پولزوف میں مسجد ہے جس میں جمعہ کی نماز ایک بجے ہوتی ہے۔ اس میں ایک تاتاری النسل عالم امام ہیں اور اچھی عربی بولتے ہیں۔ کئی سو آدمیوں کی اچھی خاصی جماعت ہو جاتی ہے۔

سیر و دلچسپی کی چیزوں میں متعدد میوزیم تھے جن میں سے ایک مشرقی ثقافتوں کے لیے مختص ہے۔ اشتراکی حکومت کو اس سے ذاتی دلچسپی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ زار کی حکومت گردی کے صرف چند ماہ بعد اسے قائم کر دیا گیا۔ مہمانوں کو ان عجائب خانوں کے علاوہ متعدد فلم، ناچ بھی مفت دکھائے گئے اور کریملن کے دارالامارۃ کی سیر بھی کرائی گئی۔

کانفرنس سے پہلے اخباروں، رسالوں میں مضامین چھپنے شروع ہو گئے تھے۔ روسی اکیڈمی علوم کی طرف سے ایک ماہوار رسالہ ''سوویرے مے نی ای دوستوک'' (ہمعصر مشرق) نکلتا ہے۔ اسکی جولائی ۱۹۶۰ء کی پوری اشاعت موتمر سے مخصوص تھی۔ اسکے چند مضمون یہ ہیں:

''عالمگیر اجتماع مستشرقین'' از باوا جان غفوروف

''ازبکستان میں مستشرقیت'' از صباحت عظیم جان بیگم

''سوویت مستشرقیت'' از گمنام۔

تاجکستان کے دریائے وخش کا تالاب جو زیر تعمیر ہے اور جس سے تیرہ لاکھ ایکڑ زمین زیر کاشت آ جائیگی از مینکوف

''بابرنامہ باتصویر'' از پوزنر ناظم عجائب خانۂ ثقافت ہائے مشرق

''بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کی نود سالہ سالگرہ'' از گنی ایوا بیگم

''افغانستان میں'' از تولن تمشی الیف کرغیزی

"سامرہ کی کھنڈر دیواروں میں" از وربیانتس

"لبنان کی سیر" از کاتین

"ایران میں ارتجاعیت کا دور دورہ" از دومالوف

"برطانوی بورنیو کا انجام" از وونتکی

"مشرقی مطبوعات کا ذخیرہ" از وانیشٹائین

"سرنستانی ایڈن کے اعتراف ہائے جرم" از وونڈارفسکی وغیرہ

یہ سارے مضامین باتصویر ہیں، خاصکر بابرنامے کی تصویریں ۴ صفحوں میں بہت نفیس چھپی ہیں۔

وہیں سے "پروبلیمی ووستوکو ویدے نیا" (مسائل معلومات مشرقی) نامی ایک سہ ماہی رسالہ نکلتا ہے، اسکی جولائی ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں ۳۴۶ صفحے ہیں۔ یہ بھی روسی اکیڈمی علوم کی طرف سے چھپتا ہے۔ اس کے سرورق پر پہلی سطر میں کچھ چینی عبارت ہے، دوسری سطر دیوناگری خط میں اور تیسری سطر میں عربی خط میں "مسائل الاستشراق" لکھا ہے۔ اسکے بہت سے مضامین دلچسپی کے قابل ہیں۔ مثلاً

ہندوستان میں حکومتی سرمایہ داری، ایران و افغانستان کی سیاست خارجہ اور معاشی ترقی، پندرہویں صدی عیسوی کے آغاز پر ترکی کی کسانوں کی بغاوت۔ الروض المعطار لابن عبدالمنعم الحمیری کا مخطوطہ مدینہ منورہ اور اس میں مشرقی وسطی و شمالی یورپ کا تذکرہ۔ ایرانی رزمیہ نظموں کا اثر بعض روسی شاعروں پر۔ ہندی آریائی زبانوں میں بعض الفاظ کی ساخت۔ موتمر مستشرقین عالم کے دونوں (تیسرے اور پچیسویں) اجلاس کی عہد آفریں اہمیت، ترکمان اشعار کی ایک نادر بیاض۔ ابوالفرج ہارون کی کتاب الکافی (فی النحو العبرانی) کی اہمیت۔ بہرام چوبین اور اسکی تاریخ کے ماخذوں کا تقابل۔ لینن گراڈ کی اکیڈمی علوم کا شعبہ شرق قدیم۔ چکوسلواکیہ میں ۱۹۵۹ء میں مستشرقیت۔ سید حبیب احمد وفا ایک انقلاب پسند شاعر اور عالم۔ ان کے علاوہ اور مضمون بھی ذکر کے قابل ہیں۔

سرد یوچنلو نے ایک مقالہ میں بتایا ہے کہ اجنبی زبانوں کے الفاظ واصطلاحات کا

Marfat.com

تلفظ روسی خط میں کس طرح ادا کیا جائے اور اس سلسلے میں عربی، اردو، ہندی، فارسی، ترکی، پشتو، منگولی، جاپانی اور کسی قدر چینی کا بھی ذکر ہے۔ (یہ امر واضح رہے کہ روسی میں ث، ع، غ، ح، ق، ذ، ص، ض، ط، ظ، نون غنہ تو کیا ج، ھ بھی نہیں ہیں۔ میرے نام جو دعوت نامہ آیا تھا اس پر پتا میں ''موخام مادخامی ودل لاخ'' لکھا ہوا تھا۔

پیٹرا چیک نے برٹسلاوا (واقع چکوسلواکیا) کے مخطوطات عربی پر ایک مقالہ میں بتایا ہے کہ اس میں بوسینا (یوگوسلاویا) کے مسلمانوں کی تاریخ پر بعض اہم ومفید کتابیں اور دستاویز موجود ہیں اور ان مخطوطات کی ایک توضیحی فہرست تیار کر لی گئی ہے۔ اس مضمون میں اسکے علاوہ جن مخطوطوں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:

روضات الجنات فی اصول الاعتقادات

ازہار الروضات

نور الیقین

عقیدۃ اہل السنۃ

مفتاح العلوم للجرجانی

کافیہ لابن حاجب

مرقاۃ الوصول الملاخصرو

آداب البحث للآبھری

الذکر فی زیادۃ اہل مقابر

تبشیر الغزوات فی سبیل اللہ

تیرہ صفحے کے ایک طویل مقالے میں جرمن شاعر گوئٹے کے ''مغربی مشرقی دیوان'' کے اقتباسات دیکر انکی نئی (اشتراکی) تعبیر کی گئی ہے۔ اس دیوان سے سر اقبال مرحوم بہت متاثر تھے اور بجا طور پر تھے۔ اس میں شاعر نے مسلمانوں اور خاص کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی توصیف کی ہے۔ وہ ایک پورا دیوان ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر لکھنا چاہتا تھا لیکن حالات نے موقع نہ دیا۔ اس نے ایسی بہت سی نظمیں اور تشریحی یادداشتیں اپنی زندگی ہی میں شائع کیں۔ ایک نظم کو اس نے چھپائے رکھا تھا جو

Marfat.com

اس کے مرنے کے بعد اس کے کاغذوں میں ملی، اسے بھی اس کے ورثہ نے شائع کیا۔ اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی اہمیت وافادیت پر زور دیا گیا ہے۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ گوئٹے اس زمانہ (۱۷۴۹ء تا ۱۸۳۲ء) کا شخص ہے جب یورپی زبانوں میں اسلام اور سیرت پاک پر صحیح اور اچھی کتابیں گویا لکھی ہی نہیں گئی تھیں۔ اس لیے اسکو اس کے خیالات ورجحانات کے باعث اس کے عہد اور اپنے ماحول کا باغی سمجھا جاتا تھا۔

بونگار ولیوین نے مشہور سنسکرت کتاب ارتھاشاستر مولفہ کا ڈلیا کے تازہ شائع شدہ روسی ترجمے پر سولہ صفحے کی تنقید کی ہے۔ یہ کتاب اصول حکمرانی اور محصول اور ٹیکس کے مسائل پر ہے۔ اس کا انگریزی اور جرمن ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ اس کتاب کا مصنف اور ماکیاویلی اطالوی مصنف ''پرنس'' اخلاق وانصاف پر حکمراں کے ذاتی مفاد کو مرجح سمجھتے ہیں۔ کنفوشس نے بھی چینی میں اس موضوع پر جو کتاب لکھی ہے اس کے ترجمے موجود ہیں۔ امام ماوردی کی احکام السلطانیہ اور ان کے ہمعصر حنبلی امام ابو یعلی الفراء کی اسی نام کی کتاب احکام سلطانیہ چھپ چکی ہیں، اول الذکر کا تو جامعہ عثمانیہ نے اردو ترجمہ بھی چھاپا تھا۔ کاش کوئی علوم سیاسیہ کا ماہر (مثلاً پروفیسر ہارون خاں شروانی) ان کتابوں کا تقابلی مطالعہ کر ڈالتے فالحق یعلو ولا یعلیٰ علیہ۔ ابو یعلی نے مصارف زکوٰۃ پر جو بحث کی ہے اس پر عش عش کرنا پڑتا ہے۔

بعض مہمان بھی کارگزاری دکھانے میں پیچھے نہ رہے۔ مثلاً چکوسلواکیا کی طرف سے مہمانوں میں دو کتابیں تقسیم کی گئیں۔ ایک انگریزی کا پندرہ روزہ اخبار ''نیو اورینٹ'' اس کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ دوسری فرانسیسی میں ''مستشرقیت چکوسلواکیا میں''۔ اس میں عربیات، ایرانیات، مصریات، چینیات، ہندیات وغیرہ وغیرہ پر مستقل باب ہے۔ اس کے علاوہ چکوسلوا کی کتابوں اور عالموں کے حالات اور تعلیم گاہوں کی موجودہ حالت کا ذکر ہے۔ عربیات کے سلسلے میں لکھا ہے کہ ۱۶۱۴ء میں جہاں ''تردید قرآن'' کے نام سے ایک کتاب چھپی تھی جس میں ضمناً قرآنی آیات کا چکوسلوا کی زبان میں ترجمہ تھا۔ یہ قدیم ترین چکوسلوا کی ترجمہ قرآن ہے۔

Marfat.com

نظم ونسق:

موتمر کا افتتاح نائب وزیراعظم میکویان نے کیا جو علمی سے زیادہ سیاسی نقطۂ نظر کا حامل تھا۔ لیکن موتمر کی صدارت روس کے ممتاز عالم اور بلند مرتبہ عہدہ دار باوا جان غفوروف نے کی (جن کے ایک مضمون کا اوپر ذکر آیا ہے)۔ انکی مادری زبان فارسی ہے۔ تین سال قبل موتمر میونک میں جو روسی وفد آیا تھا اسکے نگراں اور صدر بھی یہی تھے۔

اگرچہ دو ہزار مرد اور عورتیں موتمر میں شریک ہوئے لیکن مقالوں کا اعلان صرف (۷۶۶) افراد کے متعلق تھا۔ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ماسکو نہ جا سکے۔ مثلاً! یہ ناچیز، ایسے لوگوں کی تعداد کافی تھی، لیکن جو مقالے پیش ہوئے انکی تعداد بھی کئی سو تھی جنکو انیس شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) مصریات
(۲) اشوریات و بابلیات
(۳) سامی السنہ، عبرانی، بائبل
(۴) خطبات
(۵) بیزنطیات
(۶) عرب ممالک (صدر نشین زاہدوف، ۴۳ مقالے)
(۷) عربی زبان (۴۵ مقالے)
(۸) ایرانیات (صدر نشین علی زادہ)
(۸الف) افغانیات
(۹) فارسی زبان
(۱۰) وسط ایشیا (صدر نشین مومنوف)
(۱۱) ترکیات و منگولیات (صدر نشین عظیموف)
(۱۲) تاریخ ترکی
(۱۳) قفقازیات (صدر نشین محمدوف)

Marfat.com

(۱۴) ہندیات

(۱۵) جنوب مشرقی ایشیا (انڈونیشیا وغیرہ)

(۱۶) چینیات (مگر خود چین سے کوئی شخص نہ آیا کیونکہ چینی اپنے کو عالمگیر قوم سمجھتے ہیں، محض مشرقی نہیں)

(۱۷) کوریا

(۱۸) منگولیا

(۱۹) سیاہ افریقا

اس تقسیم میں بائبل کے لیے تو ایک شعبہ رکھا گیا تھا لیکن اسلام کے لیے نہیں۔

یہ مقالے عربی، روسی، جرمن، فرانسیسی یا انگریزی میں تھے۔ ان سات آٹھ سو مقالوں میں سے صرف ان چند کا ذکر کیا جاتا ہے جس سے معارف کو دلچسپی ہوسکتی ہے لیکن مجھے یہ علم نہیں کہ ان میں سے کتنے واقعی پڑھے گئے۔

مقالے:

(۱) اے ملامت (اسرائیل) حضرت سلیمان کے تعلقات مصر سے

(۲) اے آلٹ مان (امریکہ) یہودی اسلامی مباحثے کا ذکر الباقلانی کے ہاں

(۳) اریل بارسا (امریکہ) یہودی خاندان میں میمون کی طبابت اور انکا طب عربی کو یورپ پہنچانا

(۴) محمد احمد حسین (قاہرہ) حروب صلیبیہ میں استعماری عنصر

(۵) امین الخولی (قاہرہ) دریائے نیل اور دریائے والگا (روس) کے تعلقات

(۶) محمد الفاسی امیر جامعہ رباط (مراکش) مراکشی مخطوطات

(۷) لوی ماسینیوں (فرانس) عرب شہروں کی تشکیل

(۸) تی لیوتسکی (پولینڈ) شمالی افریقہ کے اباضی (خوارج) تاجر قرونِ متوسطہ کے سوڈان میں

(۹) کلود کاہن (فرانس) وقف کی حقیقت و آغاز

Marfat.com

(۱۰) ڈیوڈ نیوبل باربور (برطانیہ) انگلستان کے بادشاہ جان کی سفارت مراکش کے ''میرالومین'' (امیرالمومنین) کے نام

(۱۱) سلیمان مصطفےٰ زبین (تونس) مغرب اقصیٰ کی اسلامی معماری میں محراب

(۱۲) اولیگ گرابر (امریکہ) مقاماتِ حریری کا باتصویر نسخہ

(۱۳) ڈی ایس رائس (برطانیہ) خران میں جولائی تا اگست ۱۹۵۹ء میں اثریاتی کھدائی۔

(۱۴) جارج وکینس (کینیڈا) نصیرالدین طوسی کا تذکرہ سقوطِ بغداد

(۱۵) جے کرامرس (جرمنی) ابو عبیدہ، ابن درید اور غلام ثعلب کے بعض نو دریافت شدہ مخطوطے

(۱۶) جارج اسکالمون (قاہرہ) قرون متوسطہ کے اسلامی فن حرب کے ماخذ ہائے معلومات

(۱۷) نابیہ ایبوٹ (امریکہ) عربی بردیٔ (پاپیروس) اور ابتدائے اسلام کی کتب حدیث

(۱۸) محمد حمید اللہ (فرانس) تقویم ہجری (اس میں امام بیہقی کے ایک مخطوطے کی اساس پر بتایا گیا ہے کہ ابتدائے اسلام کے مولفوں کے ہاں اس تقویم کا شمار بیعتِ عقبہ یعنی ۱ھ قبل ہجرت سے یکم محرم ۱ھ ہجری سے نیز ربیع الاول ۱ھ ہجری کے بعد کے آغاز سنہ یعنی یکم محرم ۲ھ ہجری سے غرض تین مختلف سنہ پائے جاتے تھے۔ روایتوں میں سنین کے اختلاف کا اصل باعث یہی معلوم ہوتا ہے، مثلاً غزوہ بنی المصطلق کی تاریخ موسیٰ بن عقبہ کے ہاں شعبان ۴ھ ہجری ہے تو ابن اسحاق کے ہاں شعبان ۶ھ اور واقدی کے ہاں شعبان ۵ھ۔ نہ کہیں جھوٹ ہے نہ سہو بلکہ طریقِ شمار کا فرق ہے اور بس۔ ایسی اور بھی مثالیں دی گئی ہیں اور زمانۂ جاہلیت کے سال کبیسہ (اور نسی) پر بھی بعض نامعروف ونظرانداز حقایق کو اجاگر کیا گیا ہے)۔

(۱۹) مجید خدوری (عیسائی ہیں، امریکہ) الرسالۃ مؤلفہ امام شافعی

Marfat.com

(۲۰) مادام کراچ کوفسکی (روس) سولھویں صدی کے بعض نادر مخطوطاتِ قرآن

(۲۱) ڈی ایم ڈنلاپ (برطانیہ) لزبن کی اکیڈمی، علوم (پرتگال) کے عربی مخطوطات

(۲۲) آرارنالدیز (فرانس) عربی صرف ونحواور اس کا اثر تفسیرِ قرآن پر

(۲۳) ٹی شوموفسکی (روس) پندرہویں صدی عیسوی کا ایک عربی دائرۃ المعارف بحریہ۔ [غالباً ابن ماجد اسد البحر کے رسائل کے متعلق]

(۲۴) سید مہدی روحانی (ایرانی مقیم فرانس) کیا فلسفے کا آغاز ایران سے نہیں ہوا؟

(۲۵) محمد عبداللہ شعبان (امریکہ) الفتوح لابن اعثم من خراسان کا ذکر

(۲۶) احمد علی کوہزاد (افغانستان) تاریخ افغانستان پر انیسویں صدی عیسوی کے بعض مخطوطات

(۲۷) آیسو بومباچی (اٹلی) غزنوی حکمراں مسعود اول کا تخت

(۲۸) عبدالغنی مرزایف (روس) صفوی دور کے فارسی ادبیات کا نیا ماخذ (اس میں محمد بدیع ابن محمد شریف ملیحا المتولد ۱۰۵۳ھ کی مذکر الاصحاب کے روس میں سات نسخے ہونے کا ذکر کیا گیا ہے)۔

(۲۹) یوزیف ایلغباین (برطانیہ) برٹش میوزیم میں بلوچی مخطوطے

(۳۰) محمد نظام الدین (حیدرآباد دکن) البیرونی کے کارنامے سائنس میں

(۳۱) ہیرولڈ لامب (برطانیہ) سمرقند میں تیموری عہد کے اواخر کے تبدیل پذیر ثقافتی اثرات

(۳۲) اے مختاروف (روس) زرفشاں دریا کے بالائی حصے میں بابر کے نام کا ایک کتبہ۔

(۳۳) اومیاکوف (روس) پندرہویں صدی عیسوی کے آغاز پر وسطی ایشیا کے مغربی یورپ سے تعلقات

(۳۴) جودالماس۔ قصۂ یوسف مؤلفہ علی، بلغاری تاتاریوں کا ایک علمی کارنامہ

(۳۵) عمر لطفی بارکان (ترکی) مسجد سلیمانیہ استنبول اور اس کے اوقاف کی تعمیر

نو کا انتظام۔

(۳۶) جی یشکے (جرمنی) اتاترک نے جمہوریت کا منصوبہ کب تیار کیا؟

(۳۷) عزیز احمد (مقیم لندن) سید احمد خاں و جمال الدین افغانی کا اثر جدید ہندی مسلمانوں کے تصورات سیاسی پر۔

(۳۸) شیخ عنایت اللہ (پاکستان) عربوں کا عمل و دخل افریقا میں۔

(معارف اعظم گڑھ-نومبر ۱۹۶۰ء)

Marfat.com

موتمر مستشرقینِ عالم امریکہ میں

تمہید:

مجھے خیال پڑتا ہے کہ معارف نے سب سے پہلی مرتبہ ۱۹۳۲ء میں ''اٹھارہویں موتمر مستشرقین عالم، ترجمہ از فرنچ شکیب ارسلان'' کے عنوان سے اس ادارے کی سرگرمیوں سے اپنے ناظرین کو روشناس کرایا تھا، یہ میری طالب علمی اور نوجوانی کا زمانہ تھا، اس کے بعد سے بارہا اس موتمر کے اجلاسوں کی کارروائی پیش کی جاتی رہی، گزشتہ اجلاس تو دہلی میں ہونے کی وجہ سے اہل ہند اب اس سے خوب واقف ہو چکے ہیں۔

اب کی دفعہ، ستائیسواں اجلاس امریکہ کی دعوت پر مچیگن یونیورسٹی میں ہوا ہے جو آن آربور نامی شہر میں ممالک متحدہ اور کنیڈا کی سرحد پر واقع ہے، اس بلد الجامعہ کا مطار بس میں ایک گھنٹے کے سفر پر شہر ڈیٹرائیٹ میں واقع ہے جو موٹر سازی کا مرکز اور ابھی چند روز قبل گورے کالے ہنگامے میں اس بری طرح تباہ ہوا ہے کہ اربوں روپے کی جائداد آتش زدگی کے جنون کی نذر ہوئی ہے۔

مجھے اس سب سے ''مہذب'' ملک کا انتظام پسند نہ آیا، اگر شخصی مسئلے کو نظر انداز بھی کردوں کہ جامعہ مچیگن کا دعوتی ہونے کے باوجود مجھے ویزا ملنے میں چھ ہفتے کا انتظار کرنا پڑا (اور سفر سے اڑتالیس (۴۸) گھنٹے پہلے تک خبر نہ تھی کہ اجازت ملے گی بھی یا نہیں) یہ امر قابل ذکر ہے کہ موتمر کا افتتاحی اجلاس ۱۳، اگست کو ہو گیا، اور ہمیں دعوت دہندہ

Marfat.com

جامعہ کی طرف سے مہیا کیے ہوئے خصوصی طیارے میں اس اجلاس کے ختم ہونے کے بعد آدھی رات کو پہنچایا گیا۔ (حالانکہ ابتدائی اطلاع یہ تھی کہ ہم اجلاس سے قبل کی رات کو پہنچیں گے، پھر بلا اطلاع ہوائی کمپنی نے تاریخ بدل دی) اسی طرح پاریس سے دو خصوصی طیارے مقرر کیے گئے، پھر بکثرت لوگوں کو یہ اطلاع دی گئی کہ جگہ نہ ہونے کے باعث اُن کو طیارے میں نشست نہیں مل سکتی اور بالآخر روانہ صرف ایک طیارہ ہوا! یہ ہے مشتے نمونہ از خروارے، خیر۔

ہمارے پان امریکن کمپنی کے طیارے میں ایک سو ساٹھ مسافر تھے، یہ طیارہ پاریس سے شام کے ساڑھے پانچ بجے اُڑا، (پاریس میں ان دنوں آٹھ بجے غروب آفتاب ہوتا ہے) چونکہ مغرب کی سمت میں جا رہے تھے، اور طیارے کی رفتار چھے سو میل فی گھنٹہ اور بلندی ماؤنٹ ایوریسٹ سے بھی اونچی تینتیس ہزار فٹ پر تھی، نتیجہ یہ ہے کہ آفتاب نے ڈوبنے کا گویا نام ہی نہ لیا، جب ہماری گھڑیوں میں "آدھی رات کے بعد دو بجے تھے کہ طیارے میں سے سورج ڈوبتا نظر آیا، اگر کوئی شخص روزہ سے ہوتا تو سحری کے بعد افطار تک چوبیس گھنٹے ہو جاتے، (اگر افطار مقامی غروب کے حساب سے کیا جائے) مزید آدھ گھنٹہ بعد مطار پر اترے تو معلوم ہوا کہ مقامی وقت مغرب کے ساڑھے نو بجے ہیں، واپسی میں مشرق کی طرف پرواز کرنی ہے، اس لیے رات کے دس بجے اڑنے پر دو تین گھنٹے بعد آفتاب طلوع ہو جاتا ہے، اور کل دس گھنٹوں کی پرواز کے بعد امریکا کے حساب سے تو رات ہی کو، لیکن پاریس میں دوپہر سے کچھ پہلے پہنچتے ہیں، نماز اور روزے کے اوقات کا کوئی حل ہمارے فقہاء کو نکالنا ہوگا۔

جاتے وقت مختلف جزیروں وغیرہ کے علاوہ ایک مرتبہ ہماری توجہ اس پر منعطف کرائی گئی کہ ہمارے نیچے سمندر میں چار آئسبرگ (برف کے پہاڑ) تیر رہے ہیں کوئی چھے میل کی بلندی پر سے یہ ایک متوسط قد و قامت کے جہاز کی طرح نظر آ رہے تھے، اور سفید چمک رہے تھے۔

سفر اگر چہ پاریس سے شروع ہوا لیکن سارے مسافر فرانس کے باشندے نہ تھے، ان میں مختلف ملکوں کے فرنگیوں کے علاوہ متعدد ہندوستانی (جن میں ایک گیروے

Marfat.com

لباس میں بدھ مت کے لاما بھی تھے،) مصری، لبنانی، مراکشی وغیرہ بھی سوار تھے۔

جامعہ مچیگن:

جامعہ مچیگن جو شہر آن آربور میں واقع ہے، ممالک متحدہ امریکہ کی قدیم اور بڑی جامعات میں سے ایک ہے اور موتمر مستشرقین عالم کے اجلاس کے لیے اس کا انتخاب بتاتا ہے کہ ملک میں اس کا کیا پایہ ہے، یہاں کچھ نہیں تو سو سال سے علوم مشرقیہ سے دلچسپی لی جارہی ہے، وہاں کے ذیل کے شعبے اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔

(۱) مشرق قریبہ کی زبانیں اور ادبیات، جو عملاً عربی اسلام کے متعلق ہے اور مراکش سے بغداد تک کے رقبہ کی قدامت و معاصرت پر حاوی ہے۔

(۲) جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کے مسائل کا مرکز، ایران، افغانستان، براعظم ہند، ملایا اور انڈونیشیا کے ذریعے سے عجمی اسلام سے اختصاص رکھتا ہے۔

(۳) روسی اور مشرقی یوروپ کے مسائل کا مرکز ضمناً ہی سہی ترکی اسلام سے متعلق ہے۔ ان کے علاوہ قانون، موسیقی، جغرافیہ وخرائط (نقشہ ہائے ممالک) حتیٰ کہ نباتات، اور آبی وسائل (مچھلی، پٹرول) وغیرہ کے شعبوں میں بھی مسلمانوں کے وطن سے بڑی بحث ہوتی ہے، مثال کے طور پر ڈاکٹر اسٹیوارٹ نے چالیس (۴۰) سال تک راولپنڈی کے گورڈون کالج میں نباتات کا پروفیسر رہنے کے بعد اپنی آخری زندگی مچیگن ہی میں شعبۂ نباتات میں گزاری اور وہاں کے ذخیرۂ نباتات کو ہمالیہ اور ہمالیہ تلے کے بے شمار پودوں کے اضافے سے ترقی دی۔

یہاں کا شعبۂ تعلیمات و تقابلی طریقۂ تدریس بھی قابل ذکر ہے، اس کی بہ کثرت سرگرمیوں میں سے ایک یہ ہے کہ بمبئی اور بڑودہ کے اساتذۂ تعلیمات مچیگن بلائے گئے، اور ان کی جگہ مچیگن کے اساتذہ بمبئی اور بڑودہ میں کام کرنے لگے، اس طرح کا کام لبنان اور ازبکستان جیسے اسلامی علاقوں میں بھی ہوا، ازبکستان کے متعلق شائع شدہ رپورٹوں سے واضح ہے کہ روسیوں نے وہاں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی

Marfat.com

ہے، اور اہلِ ملک وہاں بیسویں صدی کی صنعت اور آلات وغیرہ اور نیز زراعت میں اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ اسے انقلاب انگیز کہا جا سکتا ہے۔ اس شعبے کی سرگرمیوں کا منشا زیادہ تر بیرونی ممالک کے متعلق معلومات جمع کرنا ہے، جسے کوئی چاہے تو جاسوسی کہہ سکتا ہے۔

یہاں کے عجائب خانوں اور کتب خانوں میں بھی اسلامیات کا کافی ذخیرہ ہے۔ اگرچہ مخطوطات میں کوئی خاص نوادر نہیں ملتے ہیں، یہاں کی انجمن شرقیات (ایسوی ایشن فار ایشین اسٹڈیز) بھی قابل ذکر ہے جو خود بھی کتب و رسائل چھاپتی ہے، اور تنگدست علماء کو تالیفیں چھاپنے میں مالی مدد بھی کرتی ہے اور آخر میں یہاں کے مسلمان طلبہ کی ایک بڑی انجمن ہے، اس کے پاس ایک بڑی عمارت ہے، جس میں ایک مسجد بھی ہے۔

شرکاے موتمر:

تقریباً پچاس ملکوں سے کوئی ڈھائی ہزار عورت مرد اہلِ علم نے شرکت کی اطلاع دی، لیکن یہ کہنا مشکل ہے، کتنے لوگ حقیقت میں آئے، مثلاً فہرست میں لبنان سے صلاح الدین المنجد کا ذکر تھا، مگر وہ نظر نہ آئے، دارالمصنفین کے فاضل وعزیز محترم مولوی صباح الدین[ا] کا اور میرا مقالہ دونوں ایک ہی وقت میں تھے میں کہہ نہیں سکتا کہ وہ تشریف لائے یا نہیں، جم غفیر میں وہ نظر تو نہ آئے، ممالک متحدہ امریکہ اور کینیڈا میں متوطن یا ملازم مسلمانوں میں اب کافی اہل علم نظر آتے ہیں، مثلاً کینیڈا سے آنے والوں میں عزیز احمد، محمد انوار الحق اور ایک احمقانہ نام والے ''عبدل ایس سیرت'' (شاید عبدالسلام کی خرابی ہے) فہرست میں نظر آئے، انوار الحق صاحب مدراس کے مشہور ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کے فرزند ہیں، جب ولایت میں تعلیم پا رہے تھے تو بڑی داڑھی کیساتھ باپ کے ہو بہو تھے، کینیڈا میں اُن کی بیوی پروفیسر ہیں، اور یہ خود تعلیم پا رہے ہیں۔ انگلستان سے آنے والوں کی فہرست میں میاں محمد سعید کا ذکر ملا، فرانس سے کچھ

ا اپنا مقالہ بھیج دیا تھا خود نہیں گئے تھے۔ (معارف)

Marfat.com

نہیں تو نصف درجن مسلمان آئے، لیکن ان سارے فرنگستانی مسلمانوں میں نومسلم میرے علم میں نہ آئے، صرف ایک جرمن کے متعلق نجی اطلاع ہے کہ وہ کبھی کبھی جمعہ اور عیدین میں نماز میں شرکت کے لیے آجاتے ہیں، اگرچہ اپنے اسلام کا انہوں نے کبھی زبان سے اقرار نہیں کیا ہے، البتہ ایک فرانسیسی خاتون نے اقرار کیا کہ وہ مسلمان ہو چکی ہیں۔

پاکستان سے تو خیر مسلمان ہی آسکتے ہیں، لیکن ہندوستان سے دلی اور علی گڑھ وغیرہ سے کئی مسلمان آئے تھے اور ملاقات بھی ہوئی، بمبئی کے ڈاکٹر حسین ہمدانی مرحوم کے فرزند عباس ہمدانی بھی اپنی بیوی کے ساتھ آئے تھے، موروثی شغف فاطمیات کے متعلق جاری ہے۔

حیرت اس پر ہوئی کہ ملیزیا سے آنے والوں کی کافی اچھی فہرست میں سب کے سب چینی تھے، ایک بھی مسلمان کا نام نظر نہ آیا اور اس پر حیرت تو نہیں دل کی سوزش ضرور ہوئی کہ حالیہ ہنگاموں سے قبل کے اسرائیل میں لاکھوں ہی مسلمان تھے، لیکن ان میں سے کوئی علماء کی صف میں نظر نہیں آتا کہ موتمر مستشرقین کے لیے آئے، ان بیچاروں کا روزگار تو خاکروبی اور حمالی رہ گیا ہے، اللہ ان پر رحم فرمائے۔

روس کی سیاست میں بھی کافی انقلاب ہو گیا ہے اور وہاں کے بڑے سرکاری وفد میں بہ کثرت اسلامی نام ملے اور ان کے القاب میں ''روسی اکاڈیمی علوم کا رکن'' بتاتا ہے کہ بڑے پائے کے لوگ ہیں، البتہ اکثر کے مقالوں میں عصر جدید کا عنصر زیادہ تھا، گویا ''علم کی خاطر علم'' سے کہیں زیادہ سیاست اور ملکی پالیسی کی خدمت پیش نظر معلوم ہوئی، مگر دم آخر روس نے حالیہ فلسطینی جنگ کے باعث موتمر کا مقاطعہ کیا اور روس سے کوئی نہیں آیا۔

یہ بات اتنی بری نہیں جتنی کانفرنس کے سربرآوردہ اور کرتا دھرتا، ''برادران یوسف'' کا یہ رجحان کہ مسلمانوں کو تاریخ میں ظالم ہونا عربوں اور ترکوں کے جھگڑے کو تازہ اور تیز کرنا اور یہ سب بلاد مقدسہ کی تازہ تحبیس کی ادامت کی کوشش ہیں۔

Marfat.com

مہمان نوازی کا انتظام:

امریکی مہمان نوازی واقعی یورپ کے مقابل بہت بہتر رہی۔ جامعہ کے طلبہ کے گھر میں جتنے لوگ سما سکتے تھے، (اور کئی سو لوگ وہاں رہ سکتے ہیں،) اُن کو رہائش اور خوراک مفت رہی اور مچیگن سے واشنگٹن اور نیویارک نہ صرف مفت لیجایا اور وہاں پھرایا گیا، بلکہ وہاں کا ہفتہ بھر کا قیام بہت اچھے ہوٹلوں میں مفت ہی رہا، (بجز خوراک کے) حسب معمول ضیافتیں، ریسپشن، مچیگن کے گورنر کی آمد اور خیر مقدمی تقریر، اقوام متحدہ کی طرف سے بھی خیر مقدم عمل میں آئے۔

لیکن شروع میں کہا گیا تھا کہ موتمر کے انعقاد کے وقت سارے مقالوں کے خلاصے، ایک ایک صفحے پر، کتابی صورت میں چھاپ کر مفت بانٹے جائیں گے، تاکہ ارکان اُن کا سرسری مطالعہ کر کے جس مقالے کو چاہیں اپنی شرکت کے لیے منتخب کر سکیں اور یہ کہ کامل مقالے بعد میں چھاپے جائیں گے اور موتمر کے ارکان کو حسب عادت مفت مہیا کیے جائیں گے، پھر جب اجلاس شروع ہوا تو اطلاع دی گئی کہ بیچارہ امریکا اتنا غریب ہے کہ مقالوں کے خلاصے چھاپ نہ سکا اور سارے مقالوں کو بھی چھاپنے سے قاصر ہے، صرف ایک ایک صفحے کے خلاصے آیندہ اجلاس تک چھاپ کر شائع کیے جائیں گے اور اگر کوئی صاحب اپنا مقالہ یا اس کا ملخص کہیں اور چھاپ لیں، تو پھر ''بخوشی'' اس کا خلاصہ بھی اس روداد کی جلد سے حذف کر کے وہاں صرف حوالہ دیدیا جائے گا، کہ فلاں جگہ چھپا ہے۔

وجہ؟ بتایا گیا کہ مصارف طباعت زیادہ ہیں اور یہ امریکہ کی استطاعت سے باہر ہیں۔ قبل اس کے کہ موتمر کے مقالوں کا ذکر کروں، امریکہ میں اسلام کے متعلق کچھ مشاہدات عرض کروں گا۔

امریکہ میں اسلام:

ممالک متحدہ امریکہ میں کہتے ہیں کہ دو ہزار جامعات ہیں، سرکاری بھی، نجی لوگوں کی بھی۔ مجھے شروع میں یقین نہ آیا، لیکن جب یہ دیکھا ایک شہر واشنگٹن میں جس

Marfat.com

کی آبادی آٹھ لاکھ سے بھی کم ہے، پانچ یونیورسٹیاں ہیں، تو دو ہزار کی تعداد کو قرینِ قیاس ماننا پڑا۔ امریکہ میں یہ قانون ہے کہ طلبہ کے ہر گروہ کو دینی اور ثقافتی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں، چنانچہ جس جامعہ میں مسلمان طلبہ ہوں وہاں انجمن طلبہ کے مکان میں ایک کمرہ مسلمانوں کو بھی ملتا ہے جسے وہ عام طور پر نماز گاہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں، آن آربور کی جامعۂ مچیگن میں سات آٹھ مسلمان طلبہ معلوم ہوئے، یہ اپنی ''مسجد'' میں جمعہ کی نماز بھی پڑھتے ہیں اور باری باری سے ہر طالب علم خطیب و امام بنتا ہے۔ یہاں اور کنیڈا میں بہ کثرت جامعات میں مسلمان اساتذہ بھی نظر آتے ہیں۔

مسلمان طلبہ کی تعداد کم ہے اور سارے ملک میں منتشر ہیں۔ اس کا درماں یہ کیا گیا ہے کہ ''وفاقِ مسلم طلبہ ممالک متحدہ و کینیڈا'' کے نام سے ایک مرکزی انجمن بنائی گئی ہے اور ہر سال اس کا کسی نہ کسی جامعہ میں اجلاس ہوتا ہے۔ امریکہ کی آب و ہوا میں عملیت و حرکت ہے، الحمدللہ یہ انجمن بھی کافی کارگزار ہے، مالی وسائل بھی ہیں، کتابیں رسالے بھی چھپتے ہیں۔ ان انجمنوں کے سربراہ یا تو عرب طلبہ ہوتے ہیں، (زیادہ تر شامی) یا پھر ہمالیہ تلے کے براعظم کے دیگر ممالک کے مسلمان طلبہ، خاص کر سیاہ فام طلبہ بھی کم نظر آتے ہیں۔

امریکہ میں گوری ماؤں کے بچے کم ہوتے ہیں، کالی رعیت کی تعداد قدرتی طور پر بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے، چھے سات بچے، اوسط تعداد ہیں۔ گوروں کالوں کی کشمکش کی تہ میں ایک راز یہ بھی ہے، اسی لیے حکومت سارے وسائل سے کوشش کر رہی ہے کہ باہر سے آنے والے صرف گورے ہوں اور بہ کثرت ہوں، جب انسان صریح ناانصافی کرتا ہے، تو قدرت بالواسطہ کوئی اور تدبیر کر لیتی ہے۔

ہر فرنگی ملک کی طرح امریکہ میں بھی اسلام اب کافی تیزی سے پھیل رہا ہے، صوبۂ مچیگن ہی میں پانچ مسجدیں ہیں، خاص کر شہر ڈیٹرائٹ کی مسجد میں کچھ نہیں تو دو ہزار کی جماعت ہو سکتی ہے۔

گوروں کالوں کی کشمکش دو دھاری تلوار ہے، اس سے کالوں کو عیسائیت سے نفرت اور اسلام کی طرف کشش بڑھ رہی ہے۔ امریکہ میں کچھ نہیں تو پندرہ فی صد آبادی

Marfat.com

سیاہ فام ہے (یعنی صوبوں میں ان کی اکثریت بھی ہے، مچیگن میں وہ تہائی تک پہنچ گئے ہیں) ان سیاہ فاموں کو ایک زمانے میں جبراً عیسائی بنا لیا گیا تھا اب ان میں سے دو تہائی دوبارہ مسلمان ہو گئے ہیں، لیکن نسلی جھگڑوں کے باعث بارہا کالے مسلمانوں کی انجمنوں بلکہ مسجدوں میں بھی گورے مسلمانوں کا داخلہ بند ہے، گورے مسلمانوں میں بھی مماثل برائی نظر آتی ہے اور اس کا حل اس وقت تک مشکل ہے جب تک کہ نسلی کشمکش کا سیاسی حل نہ نکل آئے۔ اس حل میں اسلام بیشک ہاتھ بٹا رہا ہے لیکن نسلی کشمکش صحیح اسلام کے پھیلنے میں ایک رکاوٹ بھی بن گئی ہے۔

امریکہ بڑا کٹر دین پرست عیسائی ملک ہے۔ عیسائیت کی تبلیغ پر جتنی دولت وہ صرف کرتا ہے وہ سبق آموز ہے۔ اپنے قیام کے زمانہ میں واشنگٹن اور نیویارک میں میں نے دیکھا کہ ہوٹلوں کے ہر ہر کمرے میں میز کے خانے میں جہاں کچھ اسٹیشنری کاغذ لفافے اور اشتہار ہوتے ہیں، وہیں بائبل کا ایک نسخہ بھی ہوتا ہے کہ مسافر اس کا مطالعہ کرے، عموماً امریکی بائبلوں کے شروع میں ایک انڈکس (اشاریہ) بھی ہوتا ہے کہ عیسائیت کی اچھی تعلیمات کن کن صفحوں میں ہیں، موتمر مستشرقین کے ارکان کو ایک رات ایک فلم بتایا گیا ''یمن، حضرموت اور مسقط و عمان کے آثار قدیمہ'' ان کھنڈروں کو کھودنے والوں کے ساتھ بتایا گیا کہ ہمیشہ مشنری ڈاکٹر بھی ہوتے ہیں اور وہ مقامی آبادی کا مفت علاج بھی کرتے ہیں اور ان کو باور کراتے ہیں یہ طبابتی علم و حکمت عیسائی مذہب کی وجہ سے ہے، (اور غالباً انفرادی تبلیغ میں یہ بھی کہتے ہیں کہ بیماری مسلمان ہونے کی وجہ سے ہے۔)

نیویارک میں مسلمانوں کے متعدد بلکہ بہ کثرت ادارے ہیں، ''اسلامک سنٹر'' جزیرۂ مانہاٹن میں دریا کنارے پُرفضا مقام پر ہے اور اس کا امام ازہر (مصر) کی طرف سے آتا ہے، ڈاکٹر محمد عبدالرؤف ازہر کے بھی تعلیم یافتہ ہیں اور کیمبرج و لندن کے بھی سند یافتہ، وہ ہر دلعزیز ہیں، ان سے معلوم ہوا کہ آج کل عید کی نماز کسی ہوٹل کے بڑے ہال میں پڑھی جاتی ہے، لیکن اب ایک مسجد کے لیے زمین خریدنے کا انتظام ہو گیا ہے، ''اسلامک مشن'' بروکلین کے محلہ میں ہے، جسے ایک مغربی مہاجر (بہ ظاہر طرابلس

Marfat.com

الغرب والے) اپنے مصارف پر چلا رہے ہیں۔کئی منزلہ مکان ہے جس میں ایک بڑی مسجد بھی ہے، ایک ماہوار رسالہ بھی نکالتے ہیں، کہہ رہے تھے کہ پچپن (۵۵) سال سے مقیم ہوں، جب یہاں آیا تو نسلی کشمکش اتنی شدید تھی کہ ایک دن برسرراہ میری ہر چیز لوٹ لی گئی اور ننگ دھڑنگ ایک میل پیدل چل کر گھر واپس آیا اور پولیس نے دخل دینا غیرضروری خیال کیا، کوئی پچاسی (۸۵) سالہ یہ شیخ اب بھی تنومند اور سرگرمی سے اپنے کام میں مصروف ہیں۔

فرانس میں اسلام زیادہ تر تصوف کی راہ سے پھیل رہا ہے تو امریکہ میں میرے ملاقاتیوں کے بیان کے مطابق عقل کی راہ سے، لیکن ہر جگہ ناصح بے عمل سے زیادہ مضر کوئی مبلغ نہیں پایا گیا۔

امریکہ میں عجائب خانوں اور کتب خانوں میں اسلامی چیزوں کی کمی نہیں اور وہاں ہر چیز بڑے پیمانے پر ہوتی ہے، واشنگٹن میں ''لائبریری آف دی کانگریس'' کہنے کو تو پارلیمنٹ کا جز اور ارکان پارلیمنٹ کے استفادہ کے لیے ہے، لیکن وہ ہر شخص کے لیے کھلی ہوئی ہے، وہاں اب کتابوں، رسالوں وغیرہ کی تعداد چون (۵۴) ملین سے کچھ زائد (ساڑھے پانچ کروڑ) ہوگئی ہے! دو (۲) وسیع عمارتیں ناکافی ثابت ہوگئی ہیں، اب ایک تیسری بڑی عمارت بن رہی ہے، اس میں اردو کتابوں کا بھی کافی ذخیرہ معلوم ہوتا ہے۔ میں نے تراجم قرآن مجید کے سلسلے میں یہاں کچھ تلاش کی تو انڈونیشیا، بنگال وغیرہ کے متعدد تازہ ترین تراجم کا پتا چلا، جن سے میں واقف نہ تھا۔ واشنگٹن کی مسجد جسے مسلمان ممالک کے سفیر چلاتے ہیں، بہت خوبصورت ہے، ساتھ ہی ایک مختصر دارالمطالعہ بھی ہے۔ پاریس کی طرح یہاں بھی مسلمانوں سے زیادہ سیاح تفریح کے لیے آتے ہیں۔

امریکہ میں یہودیوں سے نفرت بڑی شدید ہے (لیکن وہ تجارت، صنعت، صحافت وغیرہ پر چھائے ہوئے ہیں) اور امریکہ اُن کی تائید بظاہر اس لیے کر رہا ہے کہ وہ امریکہ چھوڑ کر فلسطین یا کہیں اور جا بسیں اور ان سے پیچھا چھوٹے۔

ایک عجیب وغریب معاملہ یہ مشاہدے میں آیا کہ امریکہ والوں کو یا تو سیاست و

دفتریت سے دلچسپی ہے یا تجارت سے۔ کم ہی لوگ اعلیٰ تعلیم پاتے ہیں، اساتذہ اور بڑے انجینئر بہ کثرت باہر کے مستعار یا تازہ وارد لوگ ہیں، بیرونی زبانوں کے لیے ہی نہیں عام علوم کے لیے بھی مختلف ممالک کے مسلمان اساتذہ جا بجا جامعات میں ملتے ہیں، (ہندو بھی ہیں) یہ چیز ممالک متحدہ امریکہ میں بھی ہے، کنیڈا میں بھی، جنوبی امریکہ میں بھی۔ آزاد پیشوں میں ڈاکٹروں کی بھی بڑی مانگ ہے اور ان میں بھی بہت سے مسلمان نظر آتے ہیں۔

موتمر مستشرقین کی علمی کارکردگی:

ستائیسویں بین الممالک موتمر مستشرقین اگست ۱۹۶۷ء کی (۱۳) سے (۱۹) تک شہر آن آربور میں منعقد ہوئی، چونکہ کوئی ڈھائی ہزار اہلِ علم کا مجمع ہو گیا تھا، اس لیے تقسیم کار کی ضرورت تھی، یہ تقسیم کچھ زیادہ علمی نہ تھی، بلکہ بے تکی سی معلوم ہوتی تھی، چنانچہ:

شعبہ (۱) مشرق قریبہ (۲) مشرق قریبہ اور عالم اسلامی (۳) جنوبی ایشیا قدیم زمانے میں (۴) جنوبی ایشیا جدید زمانے میں (۵) جنوب مشرقی ایشیا (۶) چین قدیم (۷) چین جدید (۸) جاپان (۹) کوریا (۱۰) وسطی ایشیا اور آلتائی (ترکی) امور (۱۱) اجتماعی مباحث، (آبادی، فنونِ لطیفہ، دفتریت، مغربی تہذیب کا اثر مشرقی قوموں پر، موسیقی، قدیم امریکہ کا تعلق مشرق سے، کتب خانے، زراعت کی اصلاح مشرق میں، ادبیات میں انقلابی رجحانات، مشرقی علوم کے مطالعے کے ادارے مختلف ممالک میں وغیرہ)۔

ان میں سے نمبر۲ اور نمبر۱۰ کو غالباً سیاسی مصلحت سے جدا کیا گیا تھا، حتیٰ کہ اُن کے اجلاس بھی الگ الگ عمارتوں میں رکھے گئے، جن میں باہم میل بھر کا فاصلہ تھا، نمبر۳ میں ہندوستان اور نمبر۴ میں انڈونیشیا و ملایا سے بھی اسلام کو گہرا تعلق ہے، مگر انہیں الگ کیا گیا تھا۔ اسلام کی اہمیت گھٹانے کی اس کوشش میں اس کی اہمیت بڑھ ہی گئی کہ ایک کی جگہ کئی شعبوں میں زیادہ تر اسلام ہی کا ذکر تھا۔

Marfat.com

یہی نہیں ہر شعبے کے ذیلی شعبے بھی تھے اور سب بہ یک وقت جمع ہوتے تھے، مثلاً شعبۂ دوم کو بتیس (۳۲) ذیلی شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت کم لوگوں کے مقالے کوئی شخص سن سکتا تھا۔

اسلامیات پر مقالے مسلمانوں ہی نے نہیں غیر مسلم اہلِ علم نے بھی پڑھے، ایک ہزار نہیں تو کئی سو مقالے اسلامی دلچسپی کے تھے، سب کی تفصیل افسوس ہے کہ ممکن نہیں، کچھ مقالے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر تھے، تو کچھ مسلمانوں کی تاریخ و تمدن کے متعلق، اسی طرح مسلمانوں کی بستیوں اور ملکوں کی پرانی تاریخ پر، حتیٰ کہ جس چیز کو مثلاً خالص یہودی تصور کیا جاتا ہے، اس سے بھی مسلمانوں کو گہرا تعلق ہے، مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام کے نظم و نسق کی بعض تفصیلیں۔

نمونہ از خروارے چند، مقالوں کے عنوانوں کا ذکر کرتا ہوں، خدا ہی بہتر جانتا ہے، یہ کب اور کہاں چھپیں گے۔

شعبہ اوّل:

(۱) معزز جیگ (ترکی): استانبول کے عجائب خانوں میں مسماری کتبوں کا ذخیرہ

(۲) مائکل روٹن (امریکا): دریاؤں کا اثر عراقی تمدن پر

(۳) ماری لوئیز بول (ڈانمارک) خربۂ صیلون میں ڈانمارکی آثار قدیمہ کی کھدائیاں

(۴) ماری لوئیز، شومون (فرانس): ساسانی دور کے ماتحت بادشاہ و حکمراں حیرہ وغیرہ میں

(۵) صبری تبریزی: شیطان اور شر ایرانی خرافات میں

(۶) نیڈلر (کینیڈا): وادی حلفاء کے قریب جبل شیخ سلیمان کی چٹانوں پر چند قدیم کندہ تصویریں

(۷) فرکوتر (فرانس): نوبیہ میں فرانسیسیوں کی آثار قدیمہ کی کھدائیاں

(۸) پائز (انگلستان): عربوں کی تاریخ نویسی قبل اسلام میں

(۹) رابرٹ اسمتھ (امریکہ): فحل (اردن) میں آثار قدیمہ کی کھدائیاں

(۱۰) شیشمان (فرانس): حضرت عزیر اور قرآنی آیت

قالت الیہود عزیرن ابن اللّٰہ''

شعبۂ دوم:

(۱) سید حسین نصر (ایران): شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی کی کتابیں

(۲) برمان (امریکہ): ارسطو کی کتاب اخلاق کا اثر قدیم عربی کتب فلسفہ پر

(۳) اینڈ ریس (جرمنی): یونانی سے عربی میں ترجمہ اور عربی اصطلاحاتِ فلسفہ

(۴) تحسین یازیجی (ترکی): عبداللہ انصاری کی ایک ''گمنام تالیف''

(۵) محمد باقر (پاکستان): قدیم زمانے میں فارسی کی ترقی، ہمالیہ تلے کے براعظم میں

(۶) احمد برکات (سوئٹزرلینڈ): ہندوؤں کا حصہ فارسی نثر نگاری میں

(۷) ثائفل (بلجیم): عربی معاہدات لسانیاتی نقطۂ نظر سے

(۸) نہاد چیتن (ترکی): زوزنی کی حماستہ الظرفاء

(۹) بائزیکس (جرمنی): ثعلب کی کتاب قواعد الشعراء

(۱۰) صلاح الدین البحیری (مصر): الناصر داؤد کے خطوط

(۱۱) لوئی گاروے (فرانس): وحی کا اثر اخلاق اور سیاست پر

(۱۲) لبون (انگلستان): مسلمانوں کے شہر ساتویں سے بارہویں صدی ہجری تک

(۱۳) کیڈی (امریکہ): جمال الدین افغانی کا اثر حالیہ اسلامی بیداری پر

(۱۴) سعید رمضان (سوئٹزرلینڈ): اسلام اور عربوں کی (جاہلانہ) قوم پرستی

(۱۵) ؟ (چکوسلواکیا): صدرالدین عینی کی تالیفیں

(۱۶) محمد خلف اللہ احمد (مصر): فصیح عربی کا اثر جدید عربوں کی زندگی اور فکر پر

(۱۷) ام ملکوف (فرانس): ترکی کی پیشہ ورانہ انجمنیں آخی)

(۱۸) فاروق سومر (ترکی): بیمنجی قبیلے کے سردار کی یادداشت

(۱۹) مرزا قدیر بیگ (کینیڈا): ابن عربی پر مجدد الف ثانی کی تنقید

(۲۰) سلمان تمیمی (عراق): خلافت کا اسلامی تصور

(۲۱) عمر لطفی برکان (ترکی): ترکی میں سولہویں صدی عیسوی کے نصف دوم میں

Marifat.com

کچھ معاشی و سماجی بحران

(۲۲) کاہن (فرانس): قرون متوسطہ کے اختتام پر اسلامی معاشیات کی برتری یوروپی معاشیات پر

(۲۳) سامی مکارم (امریکہ): الحاکم بامر اللہ

(۲۴) ایس اے علی (ہندوستان): ابوالفیض فیضی کی ایک کم معروف فارسی لغت

(۲۵) عبدالقادر قرہ خان (ترکی): سلطان سلیمان کے زمانہ کی ترکی شاعری

(۲۶) ہائد (اسرائیل): ترکی کتب فتاوی

(۲۷) روبوفسکی (ہنگری): لطافت نامۂ خجندی

(۲۸) نہاد کیسکلک (ترکی): ابن عربی کی تازہ دریافت تالیف بلغۃ الحکمۃ

(۲۹) جارج مقدسی (امریکہ): حنبلی مذہب اور تصوف

(۳۰) احمد بن محمد ابراہیم (سنگاپور): سنگاپور میں مسلمانوں کے قانون شخصی میں تبدیلیاں

(۳۱) محمود الحسن صدیقی (مکسیکو): قدیم اسماعیلی تبلیغی سرگرمی سندھ میں

(۳۲) نبی بخش قاضی (پاکستان): احمد رومی کی دقائق الطریق

(۳۳) ہانس کروزے (جامعہ عثمانیہ): جھنڈا اسلامی فوج میں (لواء اور رایہ میں فرق)

(۳۴) ناچیز محمد حمید اللہ (فرانس): نسی، ہجری سنہ اور ہجری و عیسوی تاریخوں کے تطابق پر ایک نئی جنتری کی تالیف کی ضرورت۔ اسکی تائید میں کانگریس نے بالاتفاق ایک قرارداد منظور کی اور تسلیم کیا کہ موجودہ جنتریاں ناقابل اعتماد ہیں۔

شعبۂ چہارم:

(۱) ڈاگمار برنشروف (جرمنی): ۱۹۶۲ء کے عام انتخابات میں حیدرآباد دکن کا ایک شہر دائرہ انتخاب

(۲) سی ام نعیم (امریکہ): ہندوستانی پاکستانی کشمکش کا اثر اردو زبان اور ادب پر

(۳) رفیق الرحمٰن (امریکہ): بنیادی حکومتِ عوام کا پاکستانی نظام اور پنچائتی راج کا ہندی نظام۔

شعبۂ دہم:

(۱) زکی ولیدی طوغان (ترکی): برمکیوں کی اصل

(۲) اہل خانم (ترکی): وسط ایشیا کی قدیم ترین ترکی مسجد میں فنِ معماری کی خصوصیتیں۔

(۳) مانتراں (فرانس): الجزائر میں ترکی دور کے نظم ونسق کی خصوصیتیں

اختتامی جملہ:

اس ختم نہ ہونے والی فہرست کو ختم کر کے صرف یہ عرض کروں گا کہ آیندہ اجلاس کے لیے جو تین سال بعد ہوگا کوئی مقام طے نہ ہوا، ارجنٹائن کی دعوت آئی تھی، مسئلہ مجلس انتظامی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

(معارف اعظم گڑھ۔نومبر ۱۹۶۷ء)

Marfat.com

تلخیص وتبصرہ

اٹھارہویں موتمر مستشرقین لائڈن

''چند ماہ گذرے لیڈن (ہالینڈ) میں مستشرقین کی اٹھارہویں کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس کے کچھ حالات مشہور شامی اہل قلم امیر شکیب ارسلان نے اپنے فرانسیسی ماہنامے میں (جو ناسیون عرب کے نام سے جینوا سے شائع ہوتا ہے) ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۱ء کی اشاعت میں لکھے ہیں۔ اس کی تلخیص ناظرینِ معارف کی دلچسپی کے لیے ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

یہ کہا جاسکتا ہے کہ آجکل لائڈن شرقیاتی [1] علوم کا مرکز ہے۔ شاید یہی وہ یوروپی شہر ہے جہاں اسلامی معاملات اور خاص کر عربی تمدن سے بہت دلچسپی لی جاتی ہے۔ وہاں سے نہایت نادر عربی مخطوطے چھپ کر شائع ہوتے رہے ہیں اور عربی علوم کا سنجیدہ مطالعہ وہاں بہت طویل عرصہ سے جاری ہے۔ ہالینڈ عام طور پر اور لائڈن خاص طور پر ہمارے تمدن سے جو دلچسپی لے رہا ہے، وہ ہم سے خراجِ تحسین وصول کیے بغیر نہیں رہتا۔

ہالینڈ نے مشرقی امور سے اپنی متوارث دلچسپی کا تازہ مظاہرہ اس طرح کیا ہے کہ لائڈن میں مستشرقین کی اٹھارہویں موتمر کا انتظام کیا گیا۔ یہ موتمر مختصر سادہ الفاظ میں کامیاب رہی اور جس عظیم وعتیق تمدن کے نام سے وہ منسوب ہے اس کے شایانِ

۱۔ اورینٹلسٹ کے لیے جامعہ عثمانیہ کے اصول پر شرقیاتی مرادف ہوسکتا ہے جو مستشرق کی بہ نسبت زیادہ قابلِ اشتقاق بھی ہے۔

شان ثابت ہوئی اگر چہ یورپی صحافت آجکل موجودہ تباہ کن اقتصادی سوالات اور تخفیف اسلحہ کے مسائل میں مصروف ہے اس لیے موتمر لائڈن کے حالات کی اتنی اشاعت نہیں ہو سکی جس کی وہ مستحق تھی۔ معززین کی ایک اعزازی کمیٹی بھی اس کے لیے منتخب ہوئی تھی۔ مجلس انتظامی کے لیے بیس نہایت مشہور اساتذہ چنے گئے تھے اور ایک شعبۂ اطلاعات قائم کیا گیا تھا۔

موتمر کو نو شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا:

۱۔ اسلام

۲۔ سامی اقوام والسنہ

۳۔ اشوریات

۴۔ مصریات

۵۔ داخلی و وسطی ایشیا

۶۔ مشرق اقصیٰ اور جزائر شرق الہند

۷۔ ہندیات

۸۔ عہد نامۂ قدیم (تورات) اور یہودیت

۹۔ پاپیریات (یعنی قدیم مصری کاغذ پاپیروس کے تحریرات سے متعلقہ امور)

موتمر کا افتتاح یکشنبہ ۶ ستمبر کو ہوا۔ آٹھ سو نمائندے دنیا کے مختلف ممالک سے آئے تھے جن میں ہر دو صنف کے افراد شامل تھے۔ پروفیسر اسنوک ہرگرونیے نے موتمر کا افتتاح کیا۔ اس نے شرقیاتی علوم سے دلچسپی کی عظیم الشان ترقی کا ذکر کیا اور کہا ۱۸۸۳ء میں لائڈن میں چھٹی موتمر منعقد ہوئی تھی۔ اس میں (۲۱۸) سے زیادہ نمائندے نہ تھے مگر اب اس اجلاس میں آٹھ سو سے زائد نمائندے شامل ہوئے ہیں جن میں زنانہ نمائندگی بھی بہت اچھی ہوئی ہے۔

موسیو ترپاسترا ہالینڈ کے وزیر تعلیم نے ایک مقالہ سنایا۔ اس میں ولندیزی شرقیات کی تاریخ بتائی اس نے کہا:

''یہ ملک ہمیشہ سے مشرقی امور میں دلچسپی لیتا رہا ہے اور اس

Marfat.com

اہمیت کو خوب سمجھتا ہے جو ایشیاء اور یورپ کے باہمی تفاہم کو حاصل ہے۔ اس نے آخر جب جزائر الکاہل کے بڑے حصے پر تسلط حاصل کیا تو اسی بنا پر اس کے سیاسی اور معاشی مفاد سے اس ملک میں ہماری سرگرمیوں کو بے انتہا بڑھانا اور ترقی دینا پڑا۔ یہ صحیح نہیں جیسا بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ ایشیائی مقبوضات سے ہالینڈ کا اصلی مقصد سوائے تجارتی نفع کے اور کچھ نہیں۔ اس کے برخلاف ہالینڈ کی اولین کوشش رہی ہے کہ ان دور دراز ممالک میں عیسائیت کی خوبیوں اور فائدوں کی تبلیغ کرے''۔

وزیرِ تعلیم ہالینڈ کا یہ اعلان اپنے ملک کی حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے شرقیاتی موتمر میں انتہائی صداقت اور پوری صفائی و وضاحت سے تھا جس میں یہ کوشش نہ تھی کہ غیر مسلموں کو مذہبی معاملات میں ہالینڈ کی انتہائی بے پروائی دکھائی جاے جس طرح بعض دیگر استعماری سلطنتیں کرتی ہیں کہ محض نمائش کے لیے مذہبی معاملات میں انتہائی آزادی اور مکمل بے اعتنائی ظاہر کرتی ہیں مگر چند خاص و مسلسل ذرائع سے اس بات کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتیں کہ اپنی نوآبادیوں کے مسلمان اور دیگر اقوام کو عیسائی بنالیں برخلاف اس کے ہالینڈ کو اقرار ہے اور وہ اس خواہش پر فخر بھی کرتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو وہ اپنی نوآبادیوں میں عیسائیت کے پھیلانے کی کوشش کریگا۔ ولندیزی وزیر کا یہ اعلان ہم پوری طمانیت کے ساتھ بہ طور ثبوت ان مشرقی لوگوں کے لیے درج کرتے ہین جو یہ حسن ظن رکھتے ہیں کہ بڑی یوروپی سلطنتوں کی پالیسی میں مذہبی رجحانات کو دخل نہیں ہوتا خاص کر ترقی یافتہ سلطنتوں میں ...... اور آج اسی بنا پر مشرقی قومیں مذہب و سیاست اور تدبر و حکومت کی آمیزش کو اپنی روشن خیالی سے قومی و وطنی خدمت کے لیے ایک بدنما داغ سمجھ رہی ہیں۔

لیکن ہز ایکسیلنسی وزیرِ تعلیم ہالینڈ، ہالینڈ کے ان تبلیغی مشنوں کی کوششوں کے نتائج کو مستشرقین کی کانفرنس میں فخر سے پیش کرتے ہیں جس کے ذریعہ بحرالکاہل کی

Marfat.com

ولندیزی نوآبادیوں میں ایک ناقابل یقین سرگرمی اور جوشِ عمل سے (جسکی پشت پناہی کے لیے ہر قسم کے ذرائع لاکھوں آدمی اور کروڑوں فلورین (سکے) ہیں) ایک لاکھ بیس ہزار مسلمانوں کو جن کا بڑا حصہ یتیموں اور مفلسوں پر مشتمل تھا، عیسائی بنانے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ گو یہ تعداد ایک صفر ہے، اور ملکۂ ہالینڈ کی ساڑھے چھ کروڑ (شرق الہند) مسلم رعایا کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہیں رکھتی لیکن ساتھ ہی یہ کامیابی ناقابل تردید اہمیت رکھتی ہے۔ مگر کیا اسکی بنا پر ہالینڈ کو تاریک خیال، قدامت پرست اور مذہبی دیوانے کا خطاب دیا جا سکتا ہے؟ لائڈن کی شرقیاتی موتمر میں علاوہ افتتاحی استقبال کے دیگر ضیافتیں بھی ہوئیں۔ حکومت ہالینڈ نے اس کے اعزاز میں شہر لاہائی (ہیگ) کے ریدرتسال میں ایک شاندار پُرشوکت استقبال کیا۔ وہاں وزیرِ مستعمرات نے تقریر کی اور نمائندگان موتمر کو خوش آمدید کہا۔ نوردویک میں ہوئس تروین ہوٹل میں جملہ نمائندوں کو شب کے کھانے (ڈنر) پر مدعو کیا گیا۔ اشٹاٹ گیئے ہورت سال مین ۱۲رستمبر کو اختتامی جلسہ ہوا اور یہ اعلان کیا گیا کہ اس شرقیاتی موتمر کا انیسواں اجلاس روما (اٹلی) میں تین یا چار سال بعد ہو گا۔

موتمر کے شعبۂ اسلام میں غالباً سب سے زیادہ ارکان تھے جو (۸۰) اور (۱۰۰) کے مابین تھے۔ اس میں پڑھے ہوے مقالے بھی نہایت محنت اور قابلیت سے لکھے گئے تھے۔

اس شعبے میں جن عربوں نے مقالے سنائے وہ یہ ہیں:

(۱) شیخ مصطفیٰ عبدالرزاق (مصر) انہوں نے لفظ ''اسلام'' اس کے ابتدائی مفہوم اور اس (مفہوم) کی ترقی و وسعت پر بحث کی۔ اس مقالے نے بڑی دلچسپی پیدا کی۔ اس میں اس بات کی کوئی کمی نہ تھی کہ دندان شکن دلائل سے چند شرقیاتیوں کے اس خیال کی تردید کی جاے کہ اسلام قلب کو مس نہیں کرتا اور وہ سواے اس کے کچھ نہیں کہ چند رسمی قوانین کو ملحوظ اور زیرِ عمل رکھا جاے۔

آپ نے آیات قرآنی اور احادیث نبوی کو شہادت میں پیش کرتے ہوے بتایا کہ قوانین کی صرف سختی کے ساتھ پابندی سے کسی کو اسلام میں نجات نہیں ملتی جب تک

کہ اس کے ساتھ نیت نہ ہو، اور خدمتِ خلق اور خیرات ومبرات کے بغیر محض رسوم بیکار ہیں۔ مشہور شرقیاتی گونت سی ہرنے اپنی نہایت قابل دید تصنیف میں جو ''عقائد و قوانینِ اسلام'' پر ہے اپنی پوری قوت بیانیہ اور طاقتِ منطقیہ سے اسی (غلط) خیال کو پیش کی اور ابھارا تھا............''

(۲) یمن کے علامہ ہمدانی نے آخری خلفاے فاطمیہ کے عہد کے عربی ادبیات پر مقالہ پڑھا۔

(۳) مشہور مصری عالم احمد پاشا تیمور مرحوم کے فرزند تیمور بک نے ادبیات جدیدہ پر مضمون سنایا۔

(۴) ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے عربی بلاغت اور اُس کے یونان سے تعلق پر تقریر کی۔ باوجود آپ کی فصاحت و بلاغت کے یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ یونانی کتابوں کے تراجم سے پہلے بھی عربوں میں بلاغت کا وجود تھا۔

(۵) علامہ محمد ترکی (تونس کے نمائندے) نے اپنی نوعیت کا نہایت اہم مضمون ''عربی خطاطی اور ابن مقلہ پر پڑھا۔

(۶) اور خود امیر شکیب ارسلان نے ''تاریخ اور مختلف عربی بولیوں کا تعلق'' پر مضمون پڑھا۔ یہ مضمون اسی زیرنظر پرچے میں شائع ہوگیا ہے۔

(۷) حافظ عفیفی پاشا مصری سفیر لندن نے جدید عربی حروف کبیرہ پر مقالہ پڑھا جو اس بے مجواز شاہ فواد کی نسبت سے حروف تاج کہلاتے ہیں

شاہ فواد نے عربی میں ان حروف تاج سے ''کیپٹل لیٹر'' کو رواج دینا چاہا ہے، کہ جسطرح انگریزی و دیگر لاطینی خطوں میں اسما و اعلام اور ہر جملے کے پہلے لفظ کا پہلا حرف امتیاز کی خاطر بڑا لکھا جاتا ہے وہی طریقہ عربی میں بھی رائج ہو جاے۔ چنانچہ ایک انعامی مقابلے کے نتائج کو مصری وزارت تعلیم نے بعد ترمیم مناسب نہ صرف شائع کیا ہے بلکہ جدید اطلاعات کے بموجب مدارس کی درسی کتابیں اسی خط میں چھپ رہی ہیں اور جملہ دفاتر و محکمہ جات سرکاری میں اسکا جبری نفاذ عمل میں آچکا ہے۔ اس کے متعلق سرکاری رسالے سے جس کا نام ''حروف التاج و علامات الترقیم و مواضع

Marfat.com

استعمالہا" ہے۔ جدید حروف کی ماہیت پیش کی جاتی ہے۔

نمونۂ عبارت ملاحظہ ہو:۔

نوٹ: یہ تو ہوا خطِ طباعت، خطِ کتابت میں بجائے تاج کے اِنٹو کا ہندسہ لکھا جاتا ہے۔

مدیر رسالہ معارف کے مدیر ہندوستان کے مشہور عالم مولانا سید سلیمان ندوی ہیں۔

ادب

Marfat.com

گارساں دُتاسی

اردو کی قدر فرانس میں ہوئی تھی۔ اب فرانس کی قدر دنیائے اردو میں ہو رہی ہے۔ کہنے کا منشا یہ ہے کہ ۱۸۲۸ء میں جامعہ پیرس کے مدرسۂ السنۂ شرقیہ میں اردو کی تدریس کا انتظام شروع ہوا اور پورے پچاس سال ۱۸۷۸ء تک اس کی ذمہ داری پروفیسر GARCIN DE TASSY جس کا صحیح تر تلفظ گارسیں دُتاسی ہے، کے سپرد رہی۔ تازہ معلومات حاصل کرنے کے وسائل بڑھے تو اس نے اردو ادبیات کی روزمرہ بر جستی ترقیوں پر سالانہ تبصرے کرنے شروع کیے۔ تبصرے کیا کیے، زبان اور اہل زبان کی جیتی جاگتی تصویر کھینچنے اور نشو ونما کا فلم لینے کی کامیاب کوشش کی۔ ہموطنوں میں اس کی قدر نہ ہوئی (بات یہ ہے ہندیات سے مراد فرنگیوں میں برہمنی دیو مالا ہوتا ہے)۔ گارسیں دتاسی نے ہمالیہ تلے کے براعظم میں بتوں اور بت پرستوں کی جگہ بت شکنوں سے نہ صرف دلچسپی لی بلکہ صاف صاف اور علی الاعلان آخرالذکر کو اول الذکر پر ترجیح دی۔ یونانی و رومی دیو مالا جن کی گھٹی میں ہو وہ اس ''جرم'' کو معاف نہیں کر سکتے تھے۔ زندہ مشاہیر کی ہمعصر قاموس ہائے اعلام میں تو ان کا پانچ سات سطری ذکر ہو جاتا تھا اب تو وہ اس کا بھی مستحق نہیں سمجھا جاتا۔

گارسیں دتاسی کو سرسید سے بڑی عقیدت تھی اور علی گڑھ کا مدرسۃ العلوم (موجودہ مسلم یونیورسٹی) ان کا مرکز آمال تھا۔ حق بہ حقدار کہنا چاہیے کہ جامعۂ علی گڑھ کی استاذِ اُردو سیدہ ثریا سلطانہ (حال: بیگم حسین) کچھ عرصہ ہوا پاریس آئیں اور '' گارسیں دتاسی کی حیات اور کارنامۂ علمی کا جائزہ'' لکھ کر درجۂ اعلیٰ کے ساتھ ڈی لٹ کی ڈگری حاصل

Marfat.com

کی۔ اور جب اپنی تحقیقات کے سلسلے میں سیکڑوں میل کا سفر کر کے گارسیں دتاسی کی قبر پر بھی پہنچیں تو زبان حال سے ضرور یہ سنا ہوگا

ایں کار از تو آید و خوباں چنیں کنند

سیدہ ثریا کا مقالہ فرانسیسی میں ہے اور چھپ بھی گیا ہے۔ یہاں زیادہ تر اسی سے استفادہ کر رہا ہوں۔

مؤلف کے حالات:

نقیدِ اردو عبدالحق مرحوم نے طبع اول کے وقت اس کتاب پر پُرمغز دیباچہ لکھتے ہوئے مولف کے کچھ حالات دیے ہیں۔ سیدہ ثریا سلطانہ کی جستجو سے اب بہت سے نئے معلومات بھی حاصل ہو گئے ہیں۔

جنوبی فرانس میں مرسیٰ ایلیا کے نام سے ایک مشہورِ عالم بندرگاہ ہے، جسے انگریز مارسیلز کہتے ہیں تو خود اہل فرانس ''مارسے ای'' پر اکتفا کرتے ہیں۔ ہزاروں برس ہوئے، اسے فینیقیوں نے آباد کیا تھا اور انہی کا دیا ہوا نام اب تک چلا آ رہا ہے (اس نام کے معنی ہیں: بندرگاہ خدا) معلوم نہیں ہمارے مولف کا خاندان وہاں کب سے بس رہا تھا۔ لیکن اس کا دادا ژاں ژوزلف گارسیں JEAN JOSEPH GARCIN وہاں ایک تاجر تھا تو باپ ژوزلف ژاک JAQUES گارسیں دلالی کرتا تھا۔ اس نے ۱۱ رجنوری ۱۷۹۳ء کو خاندان تاسی کی ایک خاتون کلیر ورژینی تاسی CLAIRE VIRGINE TASSY سے شادی کی (جو شاید اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی) تو دونوں خاندانوں کا نام برقرار رکھنے کے لیے بچوں کا نام گارسیں دتاسی رکھا جانے لگا۔

ہمارا مولف ۲۰ رجنوری ۱۷۹۴ء کو مرسیٰ ایلیا میں پیدا ہوا اور اس کا نام یوں رکھا گیا: ژوزلف ایلیودور ساژیس ورتیو گارسیں دتاسی (JOSEPH-ELIODORE-SAGESSE-VERTU GARCIN DE TASSY) اس کا ایک بھائی ژوریف تیوفیل بھی پیدا ہوا۔

وہ (۲۳) سال کی عمر تک مرسیٰ ایلیا ہی میں رہا۔ مغلیہ ہندوستان کی ثروت اور سلاطین ترکی کی سطوت اس زمانے میں ہر نوجوان فرنگی کو ان ممالک کے خواب دکھایا

Marfat.com

کرتی تھی۔ (شاید ۱۸۳۰ء کے حملۂ جزائر کی تیاری میں) مرسیٰ ایلیا میں عربی کی تعلیم کا انتظام تھا جس سے تاجر بھی فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس زمانے میں ایک مصری (غالباً قبطی عیسائی) جبریل طویل اس خدمت پر مامور تھا۔ (جیسا کہ ۱۸۷۳ء کے مقالے میں بیان ہوا) ایک اور مصری عیسائی رافائیل موناخس بھی وہیں تھا (معلوم نہیں کس سلسلے میں، لیکن بعد میں یہ پیرس میں سلویستر دساسی SILVESTRE DE SACY کے تحت مددگار پروفیسر عربی بنا) گارسیں دتاسی بیان کرتا ہے کہ بیس سال کی عمر میں اس نے ان دونوں سے عربی پڑھنی شروع کی۔ تین سال بعد اس شوق کی مزید تکمیل کے لیے پیرس روانہ ہو کر وہاں جامعہ میں شرکت کی۔ سلویستر دساسی مدرسۃ السنۂ شرقیہ کا ناظم تھا۔ گارسیں دتاسی نے عربی، فارسی اور ترکی کی تعلیم پائی اور اسی پر اپنی تعلیم ختم کی۔

ختم تعلیم پر ۱۸۲۲ء میں وہ (امتحان اور سند سے آزاد) مشہور درسگاہ کولیو د فرانس COLLEGE DE FRANCE میں سکریٹری کی انتظامی خدمت پر مامور ہوا۔ اور اسی سال ۵ دسمبر کو ماری فیلیسیتے سوفی سیسے MARIE-FELICITE-SOPE SAISSET سے شادی کی جو ایک بڑے خاندان کی لڑکی تھی۔ علاقہ اود کے جاگیردار فابر COMTE FABRE D'AUDE کی رشتہ دار جیسا کہ اس نے ۱۸۷۷ء کے مقالے کے ضمیمے میں وضاحت کی ہے۔ (اولاد نہ ہوئی اور باون سال کی رفاقت کے بعد بڑھاپے میں وہ اسے داغ مفارقت دے گئی) بعد ازاں کولیو د فرانس میں وہ فارسی کے پروفیسر کی نیابت بھی کرتا تھا (جیسا کہ ۱۸۷۷ء کے مقالے میں اس نے بیان کیا ہے۔ مگر تاریخ نہیں بتائی ہے)۔

اس زمانے میں فرانس میں شرقیات سے بڑی دلچسپی لی جا رہی تھی چنانچہ اسی ۱۸۲۲ء میں پیرس کی مشہور انجمن مستشرقین ''سوسیتے آزیاتیک'' SOCIETE ASIATIQUE قائم کی گئی۔ گارسیں دتاسی اس کا شریک معتمد اور کتب خانہ دار بنا۔

سلویستر دساسی نابغۂ عصر عالم بھی تھا اور علم دوست بھی۔ استادوں اور کتابوں کے بغیر اس نے جس طرح عربی سیکھی اس پر آدمی ششدر رہ جاتا ہے۔ اپنی بے پناہ صلاحیتوں اور انتھک محنت کے باوجود وہ آخر انسان تھا جو کام خود نہ کر سکتا تھا اسکے لیے وہ موزوں افراد کو مامور کر کے ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ اگرچہ اس زمانے

Marfat.com

میں انگریزوں نے فرانسیسیوں کو ہندوستانی مقبوضات سے نکال باہر کر دیا تھا لیکن سلویستر دساسی نے اردو کی اہمیت بھانپ لی (غالباً وہ انگریزوں کی اس سیاست سے واقف تھا کہ اہل ہند کو ان کی ثقافتی و سرکاری زبان یعنی فارسی سے توڑ کر قوم پرستی کی آڑ میں ملکی زبان پر لگایا جائے جس میں ان کا کوئی دینی لٹریچر نہ ہو اور قصہ کہانیوں اور شاعری کی حوصلہ افزائی کر کے عیسائیت کے لیے راہ ہموار کی جائے، اسی لیے اس نے اپنے شاگرد رشید گارسیں دتاسی سے خواہش کی کہ دنیائے اسلام کی ہونے والی بڑی زبان کو سیکھے)۔

وہ انگلستان گیا۔ عربی، فارسی اور ترکی کی واقفیت کے باعث اردو آسانی سے اور جلد سیکھ لی۔ جب ۱۸۲۸ء میں اردو کی پروفیسری قائم ہوئی تو یہ گارسیں دتاسی کے سوا کس کو مل سکتی تھی! اردو کی پروفیسری سلویستر دساسی کے اثر اور رسوخ سے قائم ہوئی تو ملک میں بڑا واویلا مچا۔ اخبار میں مضمون نکلے۔ پمفلٹ چھپے۔ معترضین کے دلائل کا لب لباب دیوشوم (DUCHAUME) کے پمفلٹ میں ملتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ مسلمان کسی طرح عیسائیت قبول نہیں کرتے۔ پھر ان کی زبان پر پیسہ اور محنت کیوں اکارت صرف ہوں؟ سنسکرت کی سرپرستی موزوں تر ہے۔ "ہاتھی جاتا، کتا بھونکتا۔ دو سال کے تجربے کے بعد یہ نئی کرسی مستقل کر دی گئی اور گارسیں دتاسی نے تن من دھن سے کام کر کے وہ شہرت پیدا کی کہ یورپ کے اور ممالک ہی نہیں، خود انگلستان سے طلبہ آتے اور اس کی شاگردی اپنے لیے ضروری سمجھتے۔

اپنے ۱۸۷۵ء کے مقالے میں وہ بیان کرتا ہے کہ جیسے ہی ۱۸۱۷ء میں وہ پاریس آیا تو پروفیسر لانگلیس (LANGLES) کے "متمول کتب خانے میں میں نے ہندوستانی زبان کی اولین کتابیں دیکھیں" افسوس کی آرائشِ محفل کا نام ساٹھ سال کے بعد بھی اس کے حافظے میں تازہ رہا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے ملک میں سیاسی انقلاب ہوا اور جمہوریت قائم ہوئی۔ اس کی خونریزیاں کیا کم تھیں کہ ۱۸۷۰ء میں جرمنی نے حملہ کر کے نپولین کی فتوحات کا کہنا چاہیے کہ انتقام لیا۔ یہ سارا زمانہ علمی ترقی کا بھی ہے، ملکی بدامنی کا بھی۔ گارسیں

Marfat.com

دتاسی کے جاننے والوں کے جاننے والے ابھی پاریس میں موجود ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ گارسیں دتاسی ایک کم گو، خشک اور سب سے الگ تھلگ رہنے والا شخص تھا۔ اسے کتاب کا کیڑا بھی کہہ سکتے ہیں۔ سفید خوبصورت داڑھی اس کی وجاہت میں اضافہ کرتی تھی۔ اس کی صحت بھی اچھی تھی۔ چنانچہ چوراسی سال کی عمر میں بھی وہ پابندی سے اپنا تدریسی کام انجام دیا کرتا تھا اس زمانے میں وظیفۂ معمری کا رواج نہ تھا اس لیے مرتے دم تک وہ اپنی خدمت پر مامور رہا۔

سیاست میں دخل نہ دینے کے باعث اس کی ہر زمانے میں عزت رہی۔ طالب علمی کے اختتام پر اس نے ایک عربی کتاب کا ترجمہ شائع کیا تو سلویستر دتاسی کی پیشکش پر اسے ۱۸۲۱ء میں شاہ فرانس کے حضور میں باریابی ہوئی جمہوری دور میں اسے ۱۸۳۷ء میں ''جمعیت اعزازی'' LEGION D'HONNEUR میں شامل کیا گیا۔ شرقیات اور نسلیات اس کے دو خصوصی موضوع تھے۔ ان دونوں کی انجمنوں میں وہ شریک رہا اور دونوں کا نائب صدر منتخب ہوا۔ جنگ جرمنی میں محاصرۂ پاریس کے وقت پایۂ تخت شہر کاں CAEN میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ گارسیں دتاسی بھی وہیں چلا گیا تھا۔ وہاں کی اکاڈیمی کا بھی وہ اعزازی رکن بنا۔

بیرونی ممالک میں سے برصغیر کا ہم الگ ذکر کریں گے سینٹ پیٹرسبلورگ (روس)، برلین (جرمنی) میونک (باویریا) ویانا (آسٹریا) فلارنس (اٹلی)، اپسالا (سویڈن)، کی علمی اکاڈیمیوں اور امریکن اورینٹل سوسائٹی نے اسے اپنا اعزازی رکن بنایا۔ پرتگال اور سویڈن کی حکومتوں نے اسے اعزازی تمغے دیے۔ انگریزوں نے بھی سی ایس آئی (ستارہ ہند کا کمانڈر) کا خطاب دیا۔ اور اس کی ''تاریخ ادبیات ہند'' تیار ہوئی تو اس کی پہلی جلد فرانسیسی ہی میں ملکہ وکٹوریا نے اپنے نام سے معنون کر کے چھپوائی۔

دنیائے اردو سے تعلقات:

گارسیں دتاسی کو پاکستان یا بھارت آنے کا کبھی موقع نہ ملا۔ لکھی ہوئی چیزوں کو پڑھنے اور اردو بولنے والے مسافروں میں سے کوئی پیرس میں اس سے ملنے آتے تو ان

Marfat.com

سے بات چیت کرنے کے سوا اسے کسی اور راست تعلق کا موقع نہ ملا۔ پتھر کے چھاپے کا اثر ہے کہ بارہا وہ غلط تلفظ کا ارتکاب کرتا ہے اسے چونکہ کوئی سیاسی دلچسپی نہ تھی اس لیے انگریزوں نے اس کے کام میں روڑے نہ اٹکائے اور بہ کثرت اہل ہند سے اس کی مراسلت کا سلسلہ قائم ہو گیا، جو اسے معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ تھا۔

تقابلی مطالعہ کے کچھ امکانات ہیں اور اس پر توجہ مفید ہو گی۔ مثلاً وہ جن ہندی سیاحوں سے ملاقات کا ذکر کرتا ہے، ان میں سے بعض کے سفرنامے موجود ہیں۔ جسٹس امیر علی مرحوم جب تعلیم کے لیے نوجوانی میں ولائت آئے تو اس سے بھی ملے، جہاں گارسیں دتاسی ان کی بڑی تعریف اپنے مقالے میں کرتا ہے، وہیں امیر علی کی خودنوشتہ سوانح عمری میں (جو حیدرآباد دکن کے اسلامک کلچر میں چھپی) اس ملاقات کا ذکر ہے۔ ایسی چیزیں دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس کی البتہ کم توقع ہے کہ پاکستان یا ہندوستان میں گارسیں دتاسی کے خطوط کسی گھرانے میں محفوظ ہوں، لیکن ناممکن نہیں۔ سرسید اور ان کے بیٹے سید محمود کے ہاں کی چیزیں غالباً ساری کی ساری تلف نہیں ہوئی ہونگی۔ گارسیں دتاسی کی تحفۃً روانہ کردہ کتابوں کا تو پتا چلتا ہے کہ وہ علی گڑھ میں ہیں۔

اس کی قدر دنیائے اردو میں البتہ نئی نہیں ہے۔ اس کے ہمعصروں نے بھی اسے سرآنکھوں پر بٹھایا۔ خود اس نے اپنے مقالوں میں ذکر کیا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کی علمی انجمنوں نے اسے اعزازی رکن بنایا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں وہ ۱۸۷۰ء میں انجمن تہذیب لکھنؤ کا ۱۸۷۱ء اور ۱۸۷۷ء میں مظفر پور (بہار) کی علمی انجمن یا لٹریری سوسائٹی کا، ۱۸۷۷ء میں سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کا حوالہ دیتا ہے۔ پاکستان کے سلسلے میں ۱۸۶۶ء اور ۱۸۷۲ء میں لاہور کی انجمن اور یونیورسٹی کا ذکر ہے جو ذرا تفصیل کا مستحق ہے۔

انگریزی دور کے آغاز میں ان کے زیر تسلط علاقے میں جابجا علمی انجمنیں نظر آتی ہیں۔ جن میں انگریز افسر بھی شریک رہتے ہیں۔ یہ اچھی خاصی اکاڈیمیاں تھیں اور اگر باقی رہتیں تو مماثل مغربی انجمنوں سے کم نہ ہوتیں۔ انگریزوں نے خاص کر تعلیم کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھی۔ ویسے تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ۔ لیکن ان کا خیال درست تھا کہ بچے کو جیسی تعلیم دی جائے گی وہ اسی رنگ میں رنگا جائے گا۔ مقامی صنعت و دستکاری

Marfat.com

کو ہزار وسائل سے تباہ کرنے کے بعد زراعت وتجارت کو چھوڑ کر گزر اوقات کا ذریعہ سرکاری ملازمت ہے۔ اس کے لیے سرکاری مدارس کی سند ضروری قرار دی گئی۔ سرکاری مدارس سے اول تو دینیات کی تعلیم کو یکسر خارج کیا گیا، پھر مدارس زیادہ تر مشنریوں کے سپرد کیے گئے۔ جن کے ہاں عیسائیت کی تعلیم لازمی تھی۔ مدراس، بمبئی اور کلکتہ میں ۱۸۵۷ء ہی میں یونیورسٹیاں قائم کر دی گئیں۔ اور ہوشیاری سے ہر جامعہ سے ملحق بیسیوں کالج کھولے گئے۔ ان میں بعض کا نام بھی کرسچن کالج تھا کام تو سب ہی کا انگریزیت میں رچا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نتائج خاطر خواہ نہ نکلے۔ مسلمان تو کیا ہندو بھی عیسائیت پر مائل نہ ہوئے۔ بت پرستی اور ذات پات کی جکڑبندیوں میں پھنسا ہوا ہندومت انگریزوں کے لیے اس لیے بھی کوئی حریف نہ تھا کہ اس میں تبلیغ نہیں۔ زیادہ ضرورت مسلمانوں پر توجہ کرنے کی تھی۔ ایک تو انہی سے انگریزوں نے حکومت چھینی تھی۔ اس لیے ان پر نگرانی ضروری تھی ایک اعادۂ حکومت کی کوشش نہ کریں۔ دوسرے تیرہ سو سال کی شاندار تاریخ کے باعث اسلام کا عالم گیر مذہب عیسائیت کا نہ صرف سب سے بڑا حریف تھا بلکہ ساز وسامان بھی رکھتا تھا۔ ترکی اور ایران بڑی سلطنتیں تھیں اور پہلی مرتبہ ایک بڑی اسلامی مملکت (براعظم ہند) عیسائیوں کے ہاتھ آئی تھی۔ اس لئے ہر قسم کے تجربے ہو رہے تھے کہ کس طرح اس کو اپنے ماضی اور اپنی ثقافتی میراث سے کاٹ کر ہمیشہ کے لیے وفادار رعیت بنایا جائے۔ اندلس میں عیسائی حکومت کے قیام پر مسلمانوں کا یا تو قتل عام کیا گیا۔ یا ان کو جلاوطن کیا گیا۔ اس سے ملک کو کچھ اتنا معاشی اور تمدنی نقصان پہنچا کہ اس کی تقلید اگر ممکن بھی ہو تو مناسب نہ تھی۔ ۱۸۳۰ء میں فرانس نے ترکی صوبہ الجزائر پر حملہ کیا اور رفتہ رفتہ سارے ملک پر قبضہ کیا تھا۔ اس کے سپہ سالار اور الجزائر کے گورنر مارشل بیوژد (BUGEAUD) کا قول مشہور ہے۔ ''مسلمان اور عیسائی دو اس قدر مختلف ذہنیتوں کے مالک ہیں کہ اگر ان میں سے ایک ایک کا سر کاٹ کر کسی دیگ میں ایک سو سال تک ان کو جوش دیا جائے تو بھی دونوں سروں سے دو مختلف قسم کا شوربا نکلتا رہے گا جو ایک دوسرے سے امتزاج نہ پیدا کر سکے گا۔''

Marfat.com

انگریزوں نے کہا کہ ہمت نہ ہارنی چاہیے۔ انہیں ایک نئی تدبیر ذہن میں آئی۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کو اسلام کی تعلیم تو دی جائے لیکن یہ تعلیم عیسائی دیں۔ شاید اس طرح مسلمانوں کو یقین ہو جائے گا کہ غلط بود ہر چہ ماپنداشتیم، اسلام اصل میں ایک غلط اور بگڑا ہوا مذہب ہے۔ تدبیر میں جدت بھی تھی ذہانت بھی لیکن بعض ارباب اقتدار کو ہچکچاہٹ تھی۔ انہیں یقین نہ تھا کہ عیسائی یا یہودی استاد اس کی صلاحیت رکھتے ہوں کہ اسلام کا غلط ہونا ثابت کر دیں۔ بلکہ خوف تھا کہ اسلام کی ترقی ہی کے سامان نہ ہوں اس سے بہتر تو یہ ہے کہ تعلیم سے اسلام خارج ہی رہے۔ آراء کی اس کشمکش میں بہ ظاہر طے یہ ہوا کہ چھوٹے پیمانے پر تجربہ کر کے دیکھا جائے۔

اس کا ذکر ۱۸۶۶ء کے مقالے میں ہے کہ لاہور میں ایک ''مشرقی یونیورسٹی'' قائم کی جائے۔ ڈاکٹر لائٹ نر (LEITNER) نے ''انجمن اشاعت مطالب مفیدہ'' کے نام سے لاہور میں ایک اکاڈیمی قائم کی (جس کا گارسیں دتاسی کو بھی اعزازی ممبر بنایا گیا) پھر علوم مشرقیہ کی ایک یونیورسٹی کی داغ بیل ڈالی۔ گارسیں دتاسی لکھتا ہے کہ اس کے ''تجاویز اول'' اس کے پاس آئی ہیں اور یہ کہ اسے اس یونیورسٹی کا اعزازی پروفیسر بھی نامزد کیا گیا ہے۔ اس شاندار تجویز میں سے صرف لاہور کا اورینٹل کالج باقی رہا۔ اور جلدی ہی لارڈ مکالے نے ذریعہ تعلیم کو انگریزی قرار دلانے میں کامیابی حاصل کی تو لاہور کی ''اورینٹل یونیورسٹی'' یا ''یونیورسٹی آف انڈیا'' کا خیال ترک کر دیا گیا۔

اس کی تالیفیں:

ڈاکٹر ثریا سلطانہ بیگم ۲ نے بڑی تلاش کے بعد گارسیں دتاسی کی (۱۵۵) کتابوں اور مقالوں کا پتا چلایا ہے۔ اس تعداد میں (۲۷) تنقیدیں ہیں جو مختلف کتابوں پر کی گئی ہیں (۶) وفات نامے ہیں۔ باقی (۷۲) میں سے کچھ کتابیں ہیں، اور بڑا حصہ علمی رسائل میں چھپے ہوئے مضامین۔

یہ فہرست خاصی مکمل ہے۔ ممکن ہے دو ایک کا مزید اضافہ کیا جا سکے۔ مثلاً ۱۸۷۶ء کے مقالے میں وہ لکھتا ہے کہ اس نے لندن کے اخبار ''انڈین میل'' کے نام

Marfat.com

۲۵ر مارچ کو لفظ ''شہنشاہ'' کے مفہوم اور تاریخ کے متعلق ایک خط لکھا ہے (کہ ملکہ وکٹوریا کے اس خطاب کو اختیار کرنے کی تجویز تھی) اسی طرح اس کے ۱۸۷۱ء کے مقالے کی فرانسیسی اصل کے سرورق پر اس کی جن کتابوں کا بطور اشتہار ذکر ہے، اس میں میجر آر ڈبلیو برڈ R.W. BIRD کی ۱۸۵۷ء میں لندن میں چھپی ہوئی انگریزی کتاب کا ترجمہ LA SPOLIATION D'BUDH (یعنی اودھ کی لوٹ مار) بھی مذکور ہے۔ یا یہ کہ ۱۸۶۱ء کے مقالے میں وہ بیان کرتا ہے کہ مس کارپنٹر کی کتاب SIX MONTHS IN INDIA (''ہندوستان میں چھ ماہ'') کی تنقید و تحلیل اس نے REVUE ORIENTALE نامی رسالے میں چھاپی ہے۔

ڈاکٹر ثریا سلطانہ بیگم کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ گارسیں دتاسی کو اگرچہ بہت سی زبانیں آتی تھیں (اردو، عربی، فارسی، ترکی، یونانی، لاطینی، جرمن، انگریزی وغیرہ) لیکن لکھا اس نے صرف اپنی مادری زبان فرانسیسی میں، چاہے وہ ترجمے ہوں یا تالیفیں۔ ممکن ہے اوپر جس خط موسومہ انڈین میل کا ذکر آیا وہ انگریزی میں لکھا گیا ہو۔ اسی طرح ۱۸۷۵ء کے مقالے کے باب ششم کی نظم شاید اس نے انگریزی ہی میں لکھی ہو۔

کتاب ہذا:

مجھے دیگر تالیفوں سے یہاں بحث کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض کا اردو ترجمہ بھی ہوا ہے۔ موجودہ کتب کے کچھ اجزاء اولاً رسالہ اردو میں چھپے تھے پھر بعد میں کتابی صورت میں ''خطبات'' اور ''مقالات'' دو ناموں کے تحت اسے تین جلدوں میں شائع کیا گیا۔ خوشی کی بات ہے کہ طبع ثانی کے وقت من وعن دوبارہ چھاپنے کی جگہ اصل فرانسیسی سے مقابلہ اور نظر ثانی کا فیصلہ کیا گیا اور یہ کام اس ناچیز کے سپرد کیا گیا۔

کام بڑا تھا لیکن میں نے بساط بھر اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے۔ میں اولاً ان فاضل شخصیتوں کی محنت کا اعتراف کرتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کا ترجمہ کیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا ترجمہ اچھا ہے۔ خاص کر مجھے سید راس مسعود

Marfat.com

مرحوم کی حد تک حیرت ہی ہے۔ ان کی ساری عمر اعلیٰ عہدوں کی مشغولیت میں گزری مگر ان کے ترجمہ کردہ اجزاء کیا بہ لحاظ فرنچ دانی کے، کیا بہ لحاظ موزوں اردو الفاظ کے انتخاب کے مجھے سب سے بہتر نظر آئے۔ کسی لفظ کو چھوڑے بغیر مکمل ترجمہ کرنے کی بھی انہی نے سب سے زیادہ پابندی رکھی۔

دوسرے شرکائے کار کے ترجمے بھی اچھے ہیں۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ اگر کہیں کوئی لفظ، کچھ جملہ کسی انسانی سہو سے ترجمے میں چھوٹ گیا تو اس کی تلافی کروں۔ بعض صورتوں میں پرانا ترجمہ مفہوم کا اجمالی ذکر کرتا تھا۔ میں نے مکمل لفظی ترجمہ دینے کی خواہش میں اس کو بدلنے کی جسارت کی ہے۔ کہیں کہیں میں نے حواشی میں تشریح وتوضیح یا تصحیح کی کوشش کی ہے غرض کوئی چیز ایسی نہیں چھوڑی گئی ہے جس میں مترجم یا نظر ثانی کرنے والے کی چیزیں مولف کی طرف منسوب ہو جائیں۔ جن حواشی میں کوئی نام (مترجم، ایڈیٹر وغیرہ) نہیں ہے وہ سب گارسیں دتاسی ہی کے ہیں چونکہ اس کا منشا محض خدمت علم ہے اس لیے میں نے ان ساری "تبدیلیوں" کی جرأت اس امید کے تحت کی ہے کہ سارے ہی متعلقہ لوگ، مولف، مترجمین اور سرپرست اسے پسند فرمائیں گے۔ افسوس زیادہ تر اس کا ہے کہ اصل سرپرست یعنی بابائے اردو اس کام کی تکمیل تک ہم میں نہ رہے۔ غفر اللہ لہ۔ ان کی سرپرستی کے بغیر یہ گنجینہ شاید ابھی راز نہاں ہی رہتا۔

یہ کتاب ۱۸۵۰ء کے حالات سے شروع ہوتی ہے اس کے سات سال بعد سلطنت مغلیہ پر جو انقلاب آیا، اسمیں بے شمار علمی خزانے برباد ہو گئے۔ اس زمانے کی بہت سی چیزوں کی حد تک یہ کتاب گویا واحد ذریعۂ معلومات ہے۔ انگریزی دور کے آغاز کی بہت سی چیزیں خاص کر اردو اخبار بھی ہمارے اسلاف کی بے توجہی سے ناپید ہیں۔ اکے دکے نمبر کہیں ہیں بھی تو وہ کثیر معلومات جو اس کتاب میں ہیں ان کے ماخذ اب بالکلیہ تلف ہو چکے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں تو خود انگلستان کے بہت سے کتب خانے بمباری میں تباہ ہو گئے۔

اس کتاب کا ایک پہلو بڑا سبق آموز ہے۔ اور وہ انگریزوں کی مذہبی سیاست۔ اس طرح کی کچھ چیزیں میں نے پروفیسر محمد شفیع مرحوم کی خدمت میں پیش کیے ہوے

Marfat.com

''ارمغان'' مطبوعہ لاہور میں اپنے مضمون میں نمایاں کی ہیں۔ یہاں مزید معلومات ملتی ہیں کہ ظاہری غیر جانبداری اور مذہب سے سرکاری بے تعلقی کے باوجود فرنگی حکومت نے ملک کو عیسائی بنانے کی کس کس طرح کوشش کی؟ کیوں انگریزی زبان و ادب کے مطالعے میں عام طور پر دینی کتابیں رکھی جاتی تھیں گولڈن ٹریژری کی نظمیں ہوں یا ملٹن کی، بنیان کے ناول ہوں یا میری کوریلی کے، شروع میں تو جبر بھی کیا گیا، مسجدیں اور تعلیمی اوقاف ضبط کیے گئے۔ سرکاری مدرسے کھولنے کی جگہ مشنریوں کو اسکول اور کالج کھولنے کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ سر ولیم میور نے علی گڑھ کالج کے معائنے کے وقت جو تقریر کی (اور جو اس کتاب میں بھی درج ہے) اس سیاست کا اچھا خلاصہ ہے اور قانونی یا ڈپلومائک الفاظ میں اپنا مقصد بیان کر دیا ہے۔ اس کام میں سارے یورپ نے ہاتھ بٹایا۔ سوئزرلینڈ، جرمنی وغیرہ کے قابل سے قابل مشنری وہاں بلائے گئے۔ فرانسیسی مشنری بھی کم نہ رہے۔ چونکہ گارسیں دتاسی کو اس مقصد سے عشق تھا، اس لیے اس نے اتنے کثیر معلومات جمع کر دیے ہیں کہ کہیں اور یکجا نہیں ملتے۔ غرض ہمالیہ تلے کے براعظم میں ترویج عیسائیت کی تاریخ کا یہ قیمتی ماخذ ہے۔

اس سے بھی عجیب یہ کہ جو عیسائی اور خود حاکم طبقے کے انگریز اس محکوم ملک میں مسلمان ہو جاتے تھے، ان کا خاصا تفصیلی ذکر اس کتاب میں ملتا ہے۔ ملک کے بے شمار سماجی، علمی اور دیگر معلومات بھی اس میں ہیں اور صرف اسی میں ملتے ہیں۔ اسی لیے میں عرض کروں گا کہ محترم ناشر اس ضخیم کتاب کا ایک اچھا اور مفصل اشاریہ بھی بنائیں اور شاید بہتر ہو کہ ساری کتاب ایک ہی نام سے چھپے، یہ نہیں کہ کچھ جلدیں ''خطبات'' کہلائیں اور کچھ ''مقالات''۔

یہ اسلاف کی سرگزشت ہے۔ خوش قسمت صرف وہ اخلاف ہوں گے جو ان گزشتہ تجربوں سے سبق لیں۔ آخر میں انجمن ترقی اردو کا شکرگزار ہوں کہ اس نے مجھے اس کام سے نوازا۔ شادم کہ کارے کردم۔

پاریس، ربیع الآخر ۱۳۸۳ھ

Marfat.com

حواشی

۱ گارسیں دتاسی کی وفات پر یہ پروفیسری برخاست ہوگئی۔ اب دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر اس کا مکرر انتظام ہوا ہے۔ فرنگی طلبہ اور طالبات کی خاصی تعداد اسے اختیار کرتی ہے۔

۲ توقع ہے کہ فاضل مولفہ اپنا مقالہ نظرثانی اور اضافوں کے ساتھ جلد اردو میں منتقل کر دیں گی۔ اس دلچسپ کتاب میں اولاً ایک تاریخی تمہید ہے کہ میگاس تھینیس سے لیکر گارسیں دتاسی تک ہندیات سے یوروپ خاص کر فرانس، میں کیا دلچسپی لی گئی (مختلف یوروپی زبانوں میں اردو کی صرف نحو، لغت وغیرہ کی تدریسی کتابیں بھی) اور ضمناً یہ اجاگر کیا ہے کہ البیرونی وغیرہ مسلمانوں ہی کے کارنامے زیادہ اہم رہے ہیں۔ گارسیں دتاسی کی سوانح عمری کے بعد اس کی ساری مطبوعہ تحریروں پر، کتابیں ہوں یا مقالے، تبصرہ کیا گیا ہے۔ زیر ترجمہ ''خطبات و مقالات'' پر بھی دس بارہ صفحوں میں بحث ہے۔ آخر میں گارسیں دتاسی کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط بھی پہلی دفعہ شائع کیے ہیں جن سے ان کے اخلاق و کردار کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

ماہ نامہ قومی زبان - کراچی - جنوری ۱۹۶۴ء

Marfat.com

دانتے کی نظم طربیہ ربانی

کے

معراج نبوی سے ماخوذ ہونے کی چند نئی اور قطعی شہادتیں

آلی گیئے ری دانتے اٹلی کا مشہور شاعر گزرا ہے۔ وہ ۱۲۶۵ء میں اب سے کوئی سات سو برس پہلے شہر فلارنس میں پیدا ہوا۔ اپنی اس ننھی سی شہری مملکت کی سیاسیات میں اس نے کافی حصہ لیا۔ اسے بارہا سفیر بنا کر بھی بھیجا جاتا رہا۔ وہ فلارنس کے چھ صدر پادریوں میں سے ایک تھا۔ اس کا تعلق گوری جماعت سے تھا۔ جب کالی جماعت برسر اقتدار آئی تو اسے جلاوطن کیا گیا۔ کچھ دن پاریس میں گزار کر وہ راوینا (اٹلی) چلا گیا اور وہیں ۱۳۲۱ء میں وفات پائی۔ نو عمری ہی سے وہ چھوٹی بڑی غزلیں لکھتا اور فولکو پورتنیاری کی بیٹی بیاتریکس سے اپنے عشق کا اظہار کرتا رہا۔ پھر اس نے ''نئی زندگی'' نامی نظم لکھی لیکن وہ زیادہ تر اپنی عجیب وغریب نظم طربیہ ربانی کے باعث مشہور اور اطالوی شاعری کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے جنت، دوزخ اور برزخ تینوں مقاموں کی سیر کی ہے اور وہاں والوں کے دنیوی زندگی کے حالات اور ربانی سزا وجزا کا نقشہ کھینچا ہے۔ لوگ اس کے خیالات اور معلومات کے باعث اس کو بدعقیدگی سمجھتے تھے لیکن اگر اس کی نظم کا وہ حصہ جہاں خاکش بدہن، دانتے نے ختم المرسلین علیہ السلام کو تفرقہ پروری کے الزام میں اپنے دوزخ میں دکھایا ہے اصلی ہے اور کسی بدنصیب نے بعد میں جعل سازی اور الحاق نہیں کیا ہے تو دانتے کا اسلام اس سے زیادہ مضحکہ خیز ہو جاتا ہے جتنا نپولین اور قیصر ولیلم کا سیاسی اسلام یا گوئٹے کا اسلام کو اس کے لفظی معنوں میں اپنے لیے استعمال۔

Marfat.com

دانتے کی تصویر جنت و دوزخ کے عیسائی ماخذ نہیں ملتے۔ اس کا ربط ایک حد تک ابو العلاء المعری کی کتاب الغفران جیسی طنزیہ اور ملحدانہ کتاب سے کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں بہت زیادہ مشابہت معراج نبوی کے تذکرے سے ہے۔ قصہ معراج کی چوری اس کو اپنے اغراض کے لیے استعمال کرنا اور اسے اپنی نظم طربیہ ربانی کا پلاٹ بنانا اب زیادہ قرین قیاس سمجھا جاتا ہے۔

۱۹۱۹ء میں اسپینی مستشرق پادری آسین پالاسیوس نے اسی آخرالذکر نظریے کو اپنی معرکہ آرا ضخیم کتاب [1] مطبوعہ مجریط (میڈرڈ) میں پیش کیا تھا۔ جس کا خلاصہ حیدرآباد دکن کے مرحوم مجلہ مکتبہ میں بالاقساط اردو زبان میں بھی چھپا تھا۔ ابھی ابھی اسپینی اور اطالوی زبان میں دو کتابیں چھپی ہیں ان میں اسی موضوع پر بعض تازہ تحقیقات کا ذکر ہے۔ ان کا خلاصہ ایک فرانسیسی اخبار کے واسطہ سے پیش ہے۔ شاید ناظرین کے لیے دلچسپی کا باعث ہو۔

جوں ہی واقعہ اسراء و معراج کو دانتے کی نظم طربیہ ربانی کا ماخذ قرار دیتے ہوئے اسپینی پادری پالاسیوس نے اپنی کتاب شائع کی، اس کی تائید و تردید میں نشریات کا سیلاب امنڈ آیا اور نہ صرف سپین اور اٹلی میں بلکہ سارے یورپ و امریکہ میں مباحثے چھڑ گیا۔ انگلستان میں زیادہ تر سرد مہری سے کام لیا گیا۔ فرانس میں خاص کر آندرے بلسور (Andre Bellessort) اور لوی ژیلے (Louis Gilet) نے پادری پالاسیوس کی پرزور تائید کی۔ لوی ژیلے نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ دانتے کے متعلقہ ادبیات میں یہ کتاب سب سے زیادہ اہم ہے اور واحد تالیف ہے جس سے اس شاعر کو سمجھنے میں ایک قدم آگے بڑھ سکا ہے۔

کچھ اور لوگ محتاط سے رہے۔ اطالوی مستشرق گابرے لی (G.gabrielli) نے ایک طویل یادداشت شائع کی جس کا عنوان Intorno alle foxtiorientalidella Divina comedia (یعنی طربیہ ربانی کے مشرقی ماخذوں پر تبصرہ) تھا۔ اس میں اس نے دو قسم کے اعتراض

---

[1] La escatologia Musalmana en la commedy یعنی طربیہ ربانی میں مسلمانوں کے تصورات مابعد الحیات مؤلفہ Miguel Asin palacion تین سو زائد صفحوں میں شائع کیا تھا۔

Marfat.com

اٹھائے جن کو مخالفین کی ٹولی لے اڑی اور جوش و خروش دکھانے لگی۔ پہلے یہ کہ طربیہ ربانی میں اور معراج محمدی کی مختلف روایتوں میں باہمی مماثلت محض سطحی ہے اور دوسرے یہ کہ دانتے کو عربی یقیناً نہیں آتی تھی اور یہ ثابت کرنا ناممکن ہے کہ دانتے نے مسلمانوں کے ادبیات مابعد الممات کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا موقع پایا تھا۔

۱۹۲۱ء میں دانتے کی چھے سوویں برسی دھوم دھام سے منائی گئی تو فرانس نے بھی اپنے ہاں اس کا اہتمام کیا۔ اس کی مجلس انتظامی ایک رسالہ بھی شائع کرتی رہی جس کا نام Bulletin du gomite cathoique fxaneaise pour lacelebration du sixieme centenaire de la Mort de Dante تھا۔ اس کے مدیران ہنری کوشین (Henry Cochine) اور آندرے پے راتے (Andre Perate) تھے۔ اس رسالے میں پادری مان دونے (Pore Mandonnet.e.P) نے ایک مضمون میں بتایا تھا کہ قصہ معراج محمدی کے ایک حصہ کا ترجمہ دانتے کی زندگی میں لاطینی میں پادری ریکولدو داموننے کروچے Ricoedo da Monte-Croce مبلغ نے کر کے اپنی تالیف legem saracenorum (یعنی مسلمانوں کے قانون کی تردید) میں شائع کیا تھا۔ طربیہ ربانی اور اس دومینکی فرقے کے پادری ریکولدو کی تالیف میں مماثلت اتنی دور کی تھی کہ پادری مان دونے Bere Mandonnet کو بھی لکھنا پڑا تھا کہ دانتے کے لیے یہ بات آسان تھی کہ مزید مفید اور ضروری معلومات خانقاہ سینٹ ماریہ جدید کے مبلغ ریکولدو سے بالمشافہ حاصل کرے۔ بداہتہً یہ مفروضہ ایسا تھا کہ دل کو نہ لگا اور گابریے لی (Gabrielli) کا آخری اعتراض اپنی پوری قوت کے ساتھ برقرار رہا۔

اب اس اعتراض کا قطعی ازالہ دو تازہ تالیفوں نے کر دیا ہے جو کم و بیش ایک ہی ساتھ شائع ہوئی ہیں پہلی اطالوی میں ہے دوسری ہسپانوی میں۔

1. E. Cerulld.Il bibrodella Scalaet la questione delle fontiaraba spagnole della divina comedia"
2. J. Munoz Sendino.la Escala de Makoma

ا۔ اجے رلی کی اطالوی کتاب کتاب معراج اور طربیہ ربانی کے عربی و ہسپانوی ماخذوں کا مسئلہ

۲۔ مونوز سینڈ ینو کی اسپینی کتاب ،معراج محمد،

یہ دونوں کتابیں ایک ہی موضوع سے بحث کرتی ہیں۔ یعنی ایک عربی کتاب کے دو ترجمے دستیاب ہوے ہیں۔ ایک لاطینی میں دوسرا فرانسیسی میں، بادشاہ اذفونش (الفونسو) عقلمند کے حکم سے یہ کام شہر اشبیلیہ میں بونا ونتورے (Bonaventare) نامی ایک شخص نے (جو غالباً سپین کا رہنے والا تھا) انجام دیا تھا۔ اگر چہ براہ راست عربی سے نہیں بلکہ اس ترجمے سے جو عربی سے قسطیلی زبان میں ایک یہودی طبیب ابراھیم الفقیم کے ہاتھوں سرانجام پایا تھا۔ یہ تینوں ترجمے (قسطیلی ، لاطینی، فرانسیسی) ایک ہی سال ۱۲۶۴ء میں ہوے ہیں۔

یعنی دانتے کی پیدائش سے بھی ایک سال قبل

فرانسیسی ترجمے کا نام le hivre de l esckiele makomet (یعنی کتاب معراج محمد) ہے اور مترجم بونا ونتورے (Banaventure) ذیلی عنوان کے طور پر لکھتا ہے۔

Ciest le livreque home appeleen asrxazimois halmaereig que voltant dire en francois come monteren alt

یعنی یہ کتاب اس موضوع پر ہے جسے سارا قینی یعنی عربی زبان میں بلمر یگ (المعراج) کی خرابی کہتے ہیں۔ جس کے معنی فرانسیسی میں ہوں گے بلندی پر چڑھنا۔

بلمر یگ (یعنی المعراج) کے ابتدائی معنی سیڑھی کے ہیں اور اصطلاحی معنی بلندی پر جانے کے ہیں۔ خاص کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر مراد ہے۔ جس میں آپ حضرت جبریلؑ کے ہمراہ عالم بالا اور عالم مابعد الممات کی سیر کے لیے روانہ ہوے تھے۔

معراج نبوی کے تین بڑے حصے یا منزلیں ہیں پہلے اسراء یعنی رات کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جانا جو زمینی سفر ہے، دوسرے معراج یعنی عالمِ بالا کو پرواز اور تیسرے گویا ان دونوں کو ملا کر ایک ہی قصہ قرار دینا۔

مذکورہ بالا قسطیلی ، لاطینی اور فرانسیسی ترجموں کی موجودگی سے اس کا امکان پوری طرح پیدا ہو جاتا ہے کہ دانتے نے مسلمانوں کے تصورات مابعد الممات سے واقفیت حاصل کر لی ہو لیکن اس نے مذکورہ تین ترجموں میں سے کسی ایک کو یا ان کے کسی لاطینی یا

Marfat.com

اطالوی خلاصے کو واقعی پڑھا بھی تھا یا نہیں یہ ایک الگ اور پیچیدہ سوال ہے اور یقیناً اس پر بہت سی سیاہی خاص کر اس میں بہے گی تاکہ اپنے قومی شاعر کے شہ کار کو بیرونی خاکوں کا مرہون منت قرار پائے۔ دانتیانی (یعنی دانتے سے متعلقہ مباحث میں مشغول لوگ) ایک بے چین و بے قرار گروہ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان کی خوب ہی بن آئے گی اور موافق و مخالف خوب ہی لکھا بولا جائے گا، بہرحال مذکورہ بالا ترجمہ قصہ معراج اور طربیہ ربانی کے تفصیلی اور دقیقہ رس مقابلے کے بغیر کوئی چیز استناد کے ساتھ بیان نہیں کی جاسکتی۔

ایک چیز البتہ ابھی سے ذہن میں آتی ہے جب دانتے اپنی سیر عالم آخرت کے سلسلہ میں برزخ یا اعراف (Purgatorg) پر پہنچتا ہے تو وہاں کا محافظ فرشتہ اپنی تلوار کی نوک سے شاعر کی پیشانی پر سات ''گ'' کے نشان بناتا ہے اس سے مقصد یہ تھا کہ سات گناہ ہائے کبیرہ کا اسے کفارہ ادا کرنا ہے جس کے لیے برزخ کی مقدس پہاڑی کی ساتویں کنگنیون (Cornices) پر حاضر ہو کر اپنا تزکیہ عمل میں لائے۔ جیسے جیسے پہاڑی کے ان ساتوں دائروں میں سے ایک ایک کر کے باہر نکلتا ویسے ویسے ''گ'' کا ایک ایک نشان اس کی پیشانی سے مٹتا جاتا اور سیاح اپنے کو سبک سے سبک تر محسوس کرتا)

دانتے کی اپج کا کامل احترام کرنے والے بھی اسے بالکل کمزور نہیں تو کافی مسکین فہم کا تصور قرار دیتے تھے۔ اب سات ''گ'' معراج محمدی کے قصہ میں بھی ملتے ہیں۔

طربیہ ربانی کے ماخذوں کی بحث سے قطع نظر بھی چیرلی (Ceralli) اور مونوزسیند ینو (Manoz sendino) ہر دو کی کتابوں سے ہمیں اس امر کے متعلق تازہ معلومات حاصل ہوتے ہیں کہ قرون متوسطہ میں عیسائی دنیا عالم عربی کے متعلق کیا معلومات رکھتی تھی۔ ان معلومات کے حصول کا ذریعہ کیا تھا اور یہ کہ بادشاہ ازفونش عقلمند (الفونسو) کے دربار میں اسلام کے متعلق کیا دلچسپی لی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر برونیٹو لاطینی (Brunetto latini) ۱۲۶۰ء میں قسطینہ میں فرانس کا سفیر تھا وہاں سے واپسی پر اس نے (livre dou tresox) (خزانے کی کتاب) لکھی اور ۱۲۶۴ء میں معراج محمدی پر ایک ہی کتاب کے تین تین زبانوں میں ترجمے ہوتے ہیں۔

(معارف اعظم گڑھ-اپریل ۱۹۵۱ء)

Marfat.com

فرانسیسی زبان کی پیدائش میں عربی کا حصہ

یہ ایک محض گمان، استنباط اور نظریہ ہے، اور وہ بھی تحقیق کے ابتدائی مدارج میں۔ شروع میں کچھ تمہید کی ضرورت بھی معلوم ہوتی ہے۔

''یُسَبّحُ الرعد بحمده'' (قرآن ۱۳/۱۳ رعد اللہ کی حمد کے ذریعے سے تسبیح کرتا ہے) اور ''وانْ من شیء اِلّا یسبّح بحمده ولکن لا تفقهون تسبیحهم (۱۷/۴۴: کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کی، اس کے حمد کے ذریعے سے تسبیح میں مشغول نہ ہو۔ لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے) اور مماثل آیات سے قطع نظر کریں، تو جمادات اور نباتات میں بھی اپنی مرضی سے چیخنے، آواز نکالنے کی قدرت نظر نہیں آتی۔ یہ صرف حیوانات سے مخصوص امر ہے۔ اور حیوانوں میں انسان ان کی سب سے زیادہ قابلیت رکھتا ہے۔ مکبر الصوت آلات نے پتا چلایا کہ مچھلیاں سب جانوروں سے زیادہ ٹراتی ہیں۔ اور اب پتا چلنے لگا ہے کہ جانوروں کی بھی ''بولیاں'' پائی جاتی ہیں اور ان سے نکلنے والی آوازیں خوشی، ڈر اور مختلف حالتوں میں یکساں نہیں، بلکہ الگ الگ ہوتی ہیں۔ اس لیے اب ہمارے زمانے میں قرآن مجید (سورہ ۲۷/۱۶-۱۸) کے ذکر کردہ ''منطق الطیر'' (پرندوں کی بولی) اور ''قالت نملة'' (ایک چیونٹی بولی) پر صرف اعتقاد کے لیے اعتقاد رکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔

Marifat.com

جہاں تک انسان کا تعلق ہے (سورہ ۱۴/۷۱) "خلقکم اطوارا" (یعنی (خدا) نے تم کو ارتقاء در ارتقاء سے پیدا کیا ہے) سے استنباط کیا جائے تو شاید ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں ابتداءً صرف فطری صلاحیت سے مفرد آوازیں نکلتی رہی ہونگی، پھر رفتہ رفتہ مرکب آوازیں اور آوازوں کے مجموعے انسان نے اپنی مختلف ضرورتوں کے لیے استعمال کرنے شروع کیے، ایک آواز یا ایک مجموعہ ایک غرض کے لیے، اور دوسرا دوسری غرض کے لیے۔

شاید قرآن (سورہ ۲/۳۱-۳۴) میں اسی کی طرف اشارہ ہے: "اور خدا نے آدم کو سارے نام سکھائے پھر ان (موسوم) چیزوں کو فرشتوں کو دکھا کر پوچھا کہ تم مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ انہوں نے کہا تجھی کو پاکی سزاوار ہے، ہمیں کوئی علم نہیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں سکھایا ہے، تو ہی علیم و باحکمت ہے، پھر اس نے فرمایا: اے آدم، ان (فرشتوں) کو ان (چیزوں) کے نام بتا۔ جب اس نے ان کے نام بتائے تو فرمایا کہ ......" نام سے مختلف چیزوں اور مفہوموں میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ اور یہی حضرت آدم نے کیا۔ یہ قصہ بائبل میں بھی ہے (کتاب پیدائش ۲/۱۹-۲۰) اور وہاں چیزوں کو نام حضرت آدم دیتے ہیں۔ (ناموں کی اہمیت کنفوشس کی کتابوں میں ہے لیکن ان تفصیلوں سے ہم اپنے موضوع سے دور ہو جائیں گے۔

کسی چیز، کسی فعل، کسی مفہوم کے بعد ماضی، حال اور مستقبل، نیز امر و نہی میں امتیاز کی ضرورت پیش آئی ہوگی اور اس طرح زبان وجود میں آئی ہوگی جس میں شروع میں تعدادِ الفاظ محدود رہی، پھر رفتہ رفتہ ہر نسل میں اضافہ ہوتا رہا ہوگا۔ پیشے اور اختصاص کے وجود میں آنے پر انفرادی معلومات میں فرق بھی ناگزیر تھا۔

ایک ہی جوڑے، آدم اور حوا، سے ایک نہیں متعدد زبانوں کا وجود میں آنا اور ان میں اتنا فرق ہونا کہ ایک کی زبان دوسرے کو بالکل سمجھ میں نہ آئے، یہ ہر زمانے میں ایک اچنبھا ہی رہا ہے۔ بائبل کی کتاب پیدائش (۱۱/۱-۹) کا بیان ہے کہ طوفان نوح تک سارے انسانوں کی ایک ہی زبان تھی۔ پھر جو لوگ غرق ہونے سے بچے تھے وہ ملک شنار کی طرف گئے اور وہاں پختہ اینٹوں سے ایک شہر بنانا شروع کیا اور اس میں

Marfat.com

ایک منارہ بھی بنانا چاہا جو اتنا بلند ہو کہ آسمان تک پہنچ جاے۔ (شاید منشا یہ تھا کہ خدا کو دیکھیں) یہ بات خدا کو پسند نہ آئی، اور وہ آسمان سے نیچے اتر کر اس مقام کو آیا اور ان لوگوں کو سارے کرۂ ارض پر منتشر کر دیا جس کے باعث ان کی زبان ایک نہ رہی اور اس مقام کو بابل کا نام دیا گیا جس کے معنے ہیں زبانوں کا مختلف ہو جانا، نت نئی زبانوں کا پیدا ہونا۔ اس قصے کی کوئی تائید، کوئی ذکر نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں۔ لیکن قرآن (سورہ ۳۰/۲۲) میں ایک بڑا عمیق المعنی جملہ آیا ہے: ''اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا فرق ایک ایسی چیز ہے جس میں اہل علم کو (خدا کی) عجائبات ملیں گی''۔ مجھے پتا نہیں کہ آیا ہندو ادبیات (سنسکرت) میں اس سلسلے میں کچھ بیان ہوا ہے یا نہیں۔ بہر حال قرآن کے نزول کے زمانے میں جو حالت تھی، وہ آج بھی ہے اور اگر بدلی ہے تو صرف یہ کہ مصنوعی (اور بہتر) زبان بنانے کی دو کوششیں یورپ میں ہوئیں: ایک وولاپوک (Volapuk) جسے جان مارٹن شلایر (J.M. Schleyer) نے ۱۸۷۹ء میں ایجاد کیا، اور دوسری ایسپرانٹو Esperanto جو گویا اس کی اصلاح تھی، یہ ڈاکٹر تسامن ہوف (Zamenhof) نے بین الاقوام روابط میں سہولت پیدا کرنے کے لیے بنائی۔ گرتے پڑتے یہ دونوں بھی اب تک باقی ہیں ان کو بولنے والی کوئی قوم تو نہیں بنی، لیکن بولنے سمجھنے والے افراد ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔

دنیا میں مختلف زبانیں ہی نہیں، کم و بیش فرق رکھنے والی شاخیں (dialect) اور ذیلی شاخیں (Patois) بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً ہندوستانی زبان میں اردو اور دکھنی کا فرق۔ یہ فرق روز افزوں ہیں اور ساری دنیا میں۔ ہمارے جو ہم وطن بھائی بہن مثلاً انگلستان میں جا بسے ہیں اور اس پر ایک نسل گزر گئی ہے تو ان کا مشاہدہ اور ان کا بیان ہے کہ انگریزی زبان ان کی آنکھوں کے سامنے اتنی تیزی سے بدلی اور بدل رہی ہے کہ وہاں کے عیسائی فرنگیوں کے اپنے بچے بھی اب مثلاً بائبل میں مستعمل انگریزی کو سمجھ نہیں سکتے ہیں۔

زبانوں کے اختلاف، اور نئی زبانوں کی پیدائش کے اسباب اور طریقوں کے متعلق جہاں تک ہمارا علم اب تک پہنچ سکا ہے، وہ ایک لمبی داستان ہے۔ ہماری آنکھوں

کے سامنے کی دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں:

۱۔ چند سال قبل جنوبی افریقا کے شہر جوہانس بورگ جانے کا موقع ملا تھا۔ وہاں میاں نامی ایک بہت مخیّر اور علم دوست خاندان رہتا ہے۔ ان کے ہاں کے کتب خانے میں ایک کتاب دیکھی جو وہاں کے گوروں ہی میں سے ایک کی لکھی ہوئی ہے۔ مؤلف کہتا ہے کہ جب ہالینڈی لوگوں کا ملک پر تسلط ہوا تو نوآبادکاری کے لیے طرح طرح سے مزدور اور غلام وہاں لائے جاتے رہے اور ان سے نوآبادکاری کے کٹھن کام لیے جاتے رہے۔ ان مزدوروں اور غلاموں کو ہالینڈی زبان سیکھنی پڑی جسے وہ بگاڑ کر اور غلط سلط بولتے رہے اور ہالینڈی صرف ونحو کے قواعد کو آسان بنا کر گفتگو کرتے رہے۔ انگریز آئے، تو ان بدنصیب ''غلاموں''، یعنی بنگالیوں، مالاباریوں، ملایا و جاوا والوں، عرب، حبشی لوگوں کی تعداد چونکہ گوروں سے بہت زیادہ ہوگئی تھی اس لیے فصیح ہالینڈی کی جگہ بگڑی ہوئی، غلاموں میں بولی جانے والی ہالینڈی اتنی مروّج تھی کہ گورے بھی اسی کو بولنے پر مجبور تھے کہ اپنے مزدوروں سے بات کرسکیں۔ پھر انگریزوں سے نفرت کے باعث ان ہالینڈی گوروں نے مقامی بگڑی ہوئی ہالینڈی میں لکھنا پڑھنا بھی روزافزوں شروع کیا۔ لیکن ان گوروں سے بہت قبل مقامی مسلمان اس کو لکھنے پڑھنے میں برتنے لگے تھے۔ اور اسے افریقانیہ کا نام دیتے تھے۔ اور زیرِ ذکر کتاب کا مؤلف لکھتا ہے کہ موجودہ افریکانس (افریقانیہ) زبان کے قدیم ترین دستیاب شدہ نمونے عربی خط میں مسلمانوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ اور یہ اسلامی کتابیں (اسلام کے متعلق) ہیں۔ غرض عربی اور حبشی زبانوں کا ہالینڈی زبان پر جو اثر پڑا، اس سے افریقانیہ زبان پیدا ہوئی اور وہ اب جمہوریہ جنوبی افریقا کی سرکاری زبان ہے۔

۲۔ اگر جنوبی افریقا کے ایک حصے پر ہالینڈ کا قبضہ ہوا، تو ایک دوسرے حصے پر فرانس کا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ایک جگہ غلاموں اور مزدوروں کو ہالینڈی بولنی ہوتی تھی تو دوسری جگہ فرانسیسی۔ نتیجہ دونوں جگہ ایک ہی ہوا یعنی ایک نئی زبان پیدا ہوئی۔

Marfat.com

فرانسیسی علاقے کی زبان کو کریول Kreol کہتے ہیں اور اس میں بھی اب کافی لٹریچر پیدا ہو چکا ہے، اگرچہ افریقانیہ کے مقابلے میں، جس میں قرآن مجید کے کامل تراجم بھی ہو چکے ہیں، ان دونوں نئی زبانوں، (افریقانیہ اور کریول) کا اثر محدود رہا اور اصل ہالینڈی اور فرانسیسی زبانیں جو ہالینڈ اور فرانس میں بولی جاتی تھیں متاثر نہ ہوئیں۔ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہالینڈ اور فرانس میں وہ لوگ مفقود سے تھے جو افریقانیہ اور کریول بولتے ہوں۔

یہ حالیہ مثالیں غالباً ہمیں قدیم تر زمانے کے واقعات کو سمجھنے میں مدد دیں گی۔

لاطینی زبان کے پرخچے اڑنا:

کوئی ہزار سال کی بات ہے کہ لاطینی زبان، جو یورپ کے بڑے حصوں میں رومی فتوحات کے باعث پھیل گئی تھی، ختم ہو جاتی ہے اور اس کی مقامی بولیاں مستقل زبانیں بن جاتی ہیں۔ ہمارا اشارہ اسپینی، اطالوی اور فرانسیسی کی طرف ہے۔ اور ان نئی زبانوں کی تولید ہی کے متعلق ہمارا نظریہ ہے کہ وہ عربی کے باعث ہوا۔

لیکن دوسری تفصیلیں یا دلیلیں دینے سے قبل خود عربی زبان کی ایک اہم خصوصیت کو نمایاں کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ دنیا میں عام طور پر زبانوں میں اندرونی ارتقاء مسلسل ہوتا رہتا ہے اور کہتے ہیں پانچ سو سال بعد وہ زبان ناقابل فہم ہو جاتی ہے۔ مثلاً مشہور انگریز شاعر چاسر (Chaucer) (ت ۱۴۰۰ء) کی نظموں کو اس کے جنم بھوم لندن میں اب کوئی انگریز سمجھ نہیں سکتا۔ بجز پرانی انگریزی کے متخصص اساتذہ کے۔ یہی حال فرانسیسی، جرمنی، روسی وغیرہ کا ہے۔ اس کا تاریخ عالم میں واحد استثنا عربی زبان ہے، اور یقیناً قرآن کی برکت سے گزشتہ پندرہ سو سال سے نہ عربی صرف ونحو بدلی ہے، نہ الفاظ کے معنی۔ حتیٰ کہ تلفظ میں بھی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اگر آج رسول اللہ زندہ ہوں تو عربی راڈیو اور عربی اخباروں کو اسی آسانی سے سمجھ سکیں گے جس طرح آپ اپنے ہمعصر عربوں کو سمجھ سکتے تھے، یا ہم قرآن و حدیث کو سمجھ سکتے ہیں۔ دونوں زمانوں کی زبانوں میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ عربی کو مقامی بولیوں میں چاہے فرق ہو لیکن

Marfat.com

عربوں کی لکھنے پڑھنے کی علمی زبان ہر جگہ یکساں ہے۔ اگر عربی میں یہ استحکام نہ ہوتا تو پھر رحمان و رحیم خدا کو ضرورت پیش آتی کہ ایک نیا پیغمبر بھیجے اور قرآن ایک نئی زبان میں نازل کرے۔

یہ تھی وہ عربی زبان جو اپنی سیاسی اور عسکری قوت کے اوجِ عروج کے زمانے میں لاطینی سے مڈبھیڑ ہوئی۔

مسلمان حضرت عثمان کی خلافت کے زمانے (۲۷ھ) میں اندلس میں داخل ہوئے۔ پھر رفتہ رفتہ سارے پرتگال اور اسپین پر بھی قبضہ کیا اور اٹلی اور جنوبی فرانس کے بڑے حصے پر بھی۔ اسپین میں وہ کوئی آٹھ سو سال حکومت کرتے رہے۔ اٹلی میں خاص کر صقلیہ میں بھی وہ بہت دن رہے۔ خود جنوبی فرانس میں ایک خودمختار اسلامی حکومت سوا سو، ڈیڑھ سو سال تک برقرار رہی، اور اس زمانے کے مسلمان حکمران کے دیے ہوئے جاگیروں کے پروانے تک تا حال محفوظ ہیں۔

اسپین کے متعلق شاید یہ یاد دلانا بے محل نہ ہو گا کہ وہاں کے لاکھوں نومسلم اسپینی، اسپینی زبان بولتے رہے جو عربی سے ظاہر ہے کہ بہت متاثر تھے اور عرب اس زبان کو الخمیادو سے موسوم کرتے تھے جو الاعجمیۃ کی خرابی تھی (اسپینی میں حرف ج کا تلفظ خ ہوتا ہے، جبرالٹر کو وہ آج بھی خبرالٹر بولتے ہیں) اور یہ الخمیادو عربی خط میں لکھی جاتی تھی۔ اس میں قرآن کے ترجمے بھی ہیں، طب وغیرہ دنیوی علوم کی کتابیں بھی۔ اور ان کے ہزاروں نہیں تو سیکڑوں قلمی نسخے آج بھی مجریط (میڈرڈ)، اسکوریال وغیرہ میں محفوظ و موجود ہیں۔ عربی خط والی پرتگالی کا بھی یہی حال ہے۔

عربی کا اثر خاص کر فرانسیسی پر:

لاطینی زبان اٹلی میں نہیں، اسپین اور فرانس میں بھی مروّج تھی اور وہاں وہ علمی زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔

عرب ان ملکوں میں پہنچے اور طویل عرصہ سکونت پذیر رہے تو لازماً لاطینی بولنے پر مجبور ہوئے۔ ان اجنبیوں کے منہ میں لاطینی زبان وہ نہ رہ سکی جو فرنگی علماء میں مروّج

Marfat.com

تھی۔ اگر عربوں نے اسے بگاڑا تو یہ اسے سہل تر بنانے کے لیے تھا، اور کچھ اپنی عربی زبان کی خصوصیتیں بھی اس عربائی ہوئی لاطینی میں داخل کیں اور یہ ''بگڑی ہوئی'' لاطینی زبان برقرار بھی رہی اور پھلتی پھولتی بھی گئی۔ اور اس طرح اسپینی، اطالوی اور فرانسیسی زبانیں پیدا ہوئیں۔

یہاں مجھے نہ اس سے بحث ہے اور نہ دلچسپی کہ فرانسیسی زبان میں کتنے عربی لفظ ہیں۔ الفاظ مستعار لینے سے زبان نہیں بدلتی، بلکہ وہ مستعار لفظ ہی مستعار لینے والی زبان کے قواعد اور عام ماحول کے تابع ہو جاتا ہے۔ یہ زندہ اور موجود زبانوں میں بھی ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ ابھی حال میں روسیوں نے ایک گولا پھینکا جو زمین کے اطراف میں گردش کرنے لگا، اور انہوں نے اسے اِسپوٹنیک کا نام دیا۔ فوراً یہ لفظ دنیا کی ساری زبانوں میں داخل ہو گیا، جیسا کہ سابق میں ٹیلیفون، گراموفون وغیرہ لفظوں کے سلسلے میں ہوا تھا۔ مجھے بحث ان چیزوں سے ہے جو کسی زیر پیدائش زبان میں باہر سے آتے اور اس میں داخل ہو جاتے ہیں۔ چونکہ یہ بحث ابھی اپنے آغاز میں ہے اس لیے زیادہ مثالوں کی توقع نہ کی جانی چاہیے۔ بہرحال سب لوگ جانتے ہیں کہ لاطینی زبان میں علامت معرفہ نہیں ہے (اُردو میں بھی نہیں)، انگریزی میں ہے یعنی THE، جس کے استعمال سے کوئی چیز غیر محدود نہیں رہتی معین ہو جاتی ہے۔ غرض علامت تعریف لاطینی میں نہیں لیکن اس کی تینوں بیٹیوں فرانسیسی، اطالوی اور اسپینی میں ہے۔ عربی میں ال (مثلاً الاسلام) ہے، تو اطالوی میں IL (IL Islam)، اسپینی میں EL (EL Islam) اور فرانسیسی میں:

- حرف علت سے شروع ہونے والے اسم پر علامت تعریف لگائیں تو (L) مثلاً (L' Islam) (مماثل چیز عربی میں ہے کہ الف لام تعریف سے پہلے مثلاً! ''ب'' ہو تو علامت تعریف کا الف گر جاتا ہے اور صرف لام رہ جاتا ہے۔ مثلاً بالاسلام کا تلفظ بِلْ اسلام ہوگا، ''بِ اَل اسلام نہیں۔
- حرف صحیح سے شروع ہونے والے الفاظ کو معرفہ بنانا

Marfat.com

چاہیں تو مذکر اسم کے لیے واحد کی صورت میں LE، مونث کی صورت میں LA، مذکر و مونث دونوں کی جمع کی صورت میں LES ہوتا ہے۔ (یہ نزاکتیں عربی میں نہیں ہیں)۔

۞ علامت تعریف سے پہلے لفظ A (یعنی ''اوپر'') ہو تو ALE کی جگہ AU (یعنی فلاں چیز کے اوپر) ہو جاتا ہے۔ اس کی متوازی چیز عربی میں شمسی و قمری حروف سے شروع ہونے والے لفظ پر الف لام تعریف آئے تو لام کا تلفظ کچھ اور ہو جاتا ہے۔ مثلاً الاسلام (اَل اِسلام) لیکن السلام (اَس سلام)۔

بہرحال لاطینی زبان میں علامت تعریف نہیں تھی، اس کی اولاد میں وہ آ گئی ہے۔ عربی (اَل)، اسپینی (EL)، اطالوی (IL)، فرانسیسی (L) یہ معنی خیز ہے۔

ایک دوسری چیز جو اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ اُردو ہی کی طرح لاطینی میں فعل جملے کے آخر میں آتا ہے، عربی میں فعل، فاعل شروع میں ہوتے ہیں، اس کے بعد مفعول و متعلقات آتے ہیں، فرانسیسی وغیرہ لاطینی زاد زبانوں میں لاطینی قاعدے کی جگہ عربی کے قاعدے پر عمل ہوتا ہے۔ موروثی چیز کو بدلنے پر مجبور کرنے کے لیے کوئی طاقتور بیرونی چیز کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

ایک اور چیز کا بھی یہاں ذکر کرتا ہوں: لاطینی زبان میں (ج) کی آواز نہیں ہے، اس کی جگہ (ی) ہوتی ہے۔ اطالوی میں تو فرق نہیں ہو سکا۔ فرانسیسی میں (ژ) ہو گیا جو شمالی افریقا کی عربی زبانوں کا لہجہ ہے اور وہ عرب (ج) کا (ژ) تلفظ کرتے ہیں۔ لبنان میں بھی وہی حال ہے، اور اس فرق کو ظاہر کرنے کے لیے فرانسیسی میں (I) کے ساتھ (J) کا اضافہ ہوا۔ اسپینی میں بھی یہی ہوا، لیکن وہاں (J) کا تلفظ (خ) ہوتا ہے۔ جبرالٹر کو وہ خبرالٹر کہتے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ حرف (ج) کا تلفظ مختلف عرب قبائل میں بھی مختلف ہوتا ہے۔ مصر میں وہ (گ) ہوتا ہے (گمال عبدالناصر) یمن میں وہ (ی) ہوتا ہے (عجمی کا تلفظ عیمی) حجاز میں (ج) اور لبنان اور شمالی افریقا میں (ژ)،

اور مشرقی افریقا میں (خ)۔ آخری لیکن بہت اہم چیز یہ ہے کہ علامت تعریف کا قدیم ترین معلوم استعمال فرانسیسی زبان میں Cantileoe de Saint-Eulalie میں ہے جو ۸۸۰ء کے لگ بھگ لکھی گئی، جیسا کہ فرنچ اکیڈیمی سے مجھے معلوم ہوا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب مسلمان اسپین، اٹلی اور فرانس میں تھے۔

جس زمانے میں اسپین ہی نہیں، جنوبی فرانس اور اٹلی میں بھی مسلمانوں کی حکمرانی تھی، اسی زمانے میں وہ سوئٹزرلینڈ کے بعض علاقوں میں بھی تسلط رکھتے تھے، جیسا کہ ہمارے مرحوم پروفیسر ہارون خان شروانی کی تالیفوں سے علم دوست طبقہ خوب واقف ہے۔ تلاش پر پتا چلا کہ سوئٹزرلینڈ کی ایک مقامی زبان رومانش (Romansch) بھی ہے اور وہ بھی لاطینی کی ہی بچی ہے۔ اور اس رومانش میں بھی (اپنی ماں لاطینی کے برخلاف) لفظ کو معرفہ بنانے کے لیے ایک لفظ استعمال کرنا ہوتا ہے جو (IL) ہے۔ دوسرے الفاظ میں رومانش زبان کی ساخت میں بھی عربی کا اثر پڑا ہے۔

ایک ذیلی امر جو قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ شمالی افریقا (مراکش، الجزائر، تونس) میں بولی جانے والی عربی میں علامت تعریف (ال) میں سے الف گر جاتا ہے۔ آج بھی مثلاً مراکش کے شہر الآغاوات کو لکھتے اور بولتے Alghaouat ہیں۔ ایک موجودہ عالم کا نام لکھتے اور بولتے Larbi ہیں، جو اصل میں ''العربی'' ہے۔ ایک اور فاضل Lahbabi ہیں جس سے مراد الحبابی ہوتا ہے۔ ایسی ہزاروں بلکہ اَن گنت مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں جو عرب جنوبی فرانس میں آئے اور انہوں نے وہاں کی مروّجہ لاطینی کو متاثر کیا، وہ بھی اپنی زبان میں علامت معرفہ کے ''ال'' میں سے الف گرا دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی میں علامت تعریف آئی تو وہ (LE) یا (L) بنی، اور اسپینی، اطالوی اور رومانش کی طرح (IL) یا (EL) نہ بنی۔ بہر حال اس زمانے کی لاطینی بولیاں عربی سے متاثر ہوئیں، اور ان کی صرف ونحو میں جن عربی چیزوں کا اضافہ ہوا، ان میں الف لام تعریف سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

اور اب اسی پر ختم کرتا ہوں، واللہ اعلم بالصّواب۔

(نذرِ مختار۔ مرتب مالک رام۔ مجلس نذرِ مختار۔ نئی دلی ۱۹۸۸ء)

Marfat.com

ادیبوں سے دُہائی!

ایک ادب شناس کے ہاتھوں چند ہندوستانی الفاظ کی تختۂ مشق بننے پر فریاد!

ہر زبان میں بہت سے ایسے لفظ ہوتے ہیں جو مختلف حالات میں غیر ممالک سے آ کر اس زبان کی سرزمین میں بس جاتے ہیں۔ ''حقوق شہریت'' حاصل کرنے کے باوجود بھی اکثر ''غیر ملکی لفظ'' اپنی صورت شکل اور اپنے لہجے یا تلفظ کے باعث فوراً پہچان لیے جاتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کی لغتوں میں ''غیر ملکی متوطن'' لفظوں کا ''شجرہ نسب'' بھی محفوظ رکھا جاتا ہے اور ان کی اس قدر سرگزشت بھی کہ وہ لفظ اپنے ''وطن'' میں کیا رنگ روپ اور مفہوم رکھتا تھا۔ وطن سے سیدھا ہمارے ہاں چلا آیا یا کہیں اور بھی آب و دانے کی کشش میں ٹھوکریں کھانی پڑیں اور اس کے رنگ روپ اور مفہوم پر اس سفر میں کیا کیا اثر پڑا۔

○

ہمارے پاس ابھی بزم ہائے موسیقی اور اجتماع ہائے سماجی سے اتنی فرصت کہاں کہ ادب دان و ادب آموز اس طرف توجہ کریں۔ اسی طرح شعر و سخن کی ظاہری چمک دمک پر سر دھننے کا ملک میں اتنا زور ہے کہ الفاظ کی نقاب کشائی کی طرف زبان داں کو بھلا کیوں توجہ ہونے لگی۔ اسی لیے ایک ادب ناشناس کی ادیبوں کی خدمت میں بے ادبی اگر کسی معذرت کی متقاضی بھی ہو تو شباب کے کوچہ سے کسی بلبل کی آواز پر کسی راہ رو نیم

Marfat.com

حکیم بلکہ اناڑی کا دوڑ جانا بھی ثواب کا کام ہونا چاہیے۔ اگر وہ خود کوئی درماں نہ کر سکے تو کسی کو بلا تو سکتا ہے۔

O

ہندوستانی زبان کے کسی حقہ نواز (یا محقق) سے پوچھو کہ نُقرہ کس زبان کا لفظ ہے تو وہ نقرہ کے قاف کا نہایت متانت سے تلفظ کرتے ہوئے اور الہ آباد میں مقیم ایک حیدرآبادی ''مورخ الفاظ'' سے استشہاد کرتے ہوئے بزرگانہ انداز میں ارشاد فرمائیں گے ''ہا ہیں؟ آپ کو معلوم نہیں کہ یہ عربی لفظ ہے اور فارسی سے ہمارے پاس آیا ہے! بیچارہ عین و قاف کے تلفظ سے مرعوب ہونے والا ہے، بے زبان دکنی، زبان دراز اور چرب زبان مدعیانِ ''اہل زبانیت'' سے کہاں بحث کر سکتا لیکن اگر اللہ نے کسی کے سر میں بھیجہ دیا ہو، اور وہ ایک نہیں صرف ایک درجن زبانیں سیکھ لے تو پھر وہ بھلا ان یک لسان اہل زبانوں کی کیا پروا کرے۔

O

یہ کوئی بُحران نہیں بلکہ اس لفظ کے حسب ونسب سے ایک واقف کا بیان ہے کہ لفظ نقرہ بدوی سے زرتشتی نہیں بنا بلکہ ایران ہی سے عرب آیا اور واپسی میں حاجی کی جو وضع بنائی تو سگے رشتہ دار بھی ان حضرات کو نہیں پہچان سکے اور وہ اسی سے خوش ہے۔ سنیے یہ سفید پوش اور سفید رُو نقرہ صاحب کو جو اپنا نام نُقرۃ بتا کر نخرے کیا کرتے ہیں، ان کا نام ان کے والدین نے پہلوی میں '' نک رتہ'' رکھا تھا جس کو شاہ پہلوی کے ہمعصر نکردہ (نہیں کیا ہوا) کہتے ہیں۔ اصل میں چاندی دو طرح کی ہوتی ہے ایک ''بنائی ہوئی''، یعنی سکہ اور '' دوسری نہیں بنائی ہوئی''، یعنی خالص چاندی اسی آخر الذکر کو ''نکرتہ'' کہتے تھے۔ جس کو عربوں نے نقرہ لکھنا اور کہنا شروع کیا مگر اس سے مراد خالص'' اور نہ

بنائی ہوئی'' چاندی ہی ہوتی رہی چنانچہ فقہ کی مستند کتاب ہدایہ میں ''نقرۃ فضۃ'' کا محاورہ بھی کتاب البیوع میں برتا گیا ہے۔ ''فضہ'' بھی چاندی کو کہتے ہیں اور اس محاورہ کے معنی فقط یہ ہوں گے کہ خالص اور ''نکردہ'' چاندی۔ الفاظ کی ہجرت اور غیر ممالک میں جا کر اپنی اصل کو بھلا دینا جب آدمیوں میں ہوتا ہے تو پھر ان ''لب زادوں'' کو کیوں برا کہا جائے؟!

الفاظ کی اس ہجرت کے سلسلہ میں خود لفظ ''ہجرت'' کی بھی کچھ خبر لینی چاہیے۔ انسانوں کی نہیں بلکہ انسانوں کی تمولذوں کی (جس کو الفاظ کہتے ہیں)۔ تاریخ سے دلچسپی اور واقفیت رکھنے والوں کا بیان ہے کہ عرب کے جنوب میں پرانے زمانہ میں ایک قوم بستی تھی جو ایک بولی بھی بولتی تھی۔ اسی کے کچھ لوگ ترک وطن کر کے مغرب میں گئے اور حبشہ میں بس گئے اور کچھ لوگ مشرق میں گئے اور بحرین وغیرہ میں بس گئے۔ انہی لوگوں کی بولی میں لفظ ''ہجر'' شہر کو کہتے تھے۔ چنانچہ حبشی زبان میں یہ لفظ پایا جاتا ہے اور بحرین کے قدیم پایہ تخت کا نام بھی ہجر ہے۔.......... جس طرح مصر، قاہرہ، مدینہ، بلدہ، حیدرآباد، ہذا البلد الامین میں بیان شدہ بلد اور شہر روما کا معروف حرف URBS اُربس وغیرہ میں سے ہر لفظ کے معنی شہر ہی کے ہیں۔

قدیم مشہور لغت نویس الازہری کا بیان لسان العرب نامی لغت میں ملتا ہے کہ خود عربی میں بھی ابتداءً اس لفظ ہجر کا یہی مفہوم تھا۔ چنانچہ ہاجر (مصدر مہاجرت و ہجرۃ) کے معنی ہیں خانہ بدوشی کو ترک کر کے کسی شہر میں جا بسنا یہی تہذیب کی علامت تھی۔ غالباً اسی لیے مسلمانوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ترک وطن کو بخیالِ ادب ''ہجرت'' سے موسوم کیا کہ بری جگہ کو چھوڑ کر اچھی اور مہذب جگہ جا بسے۔ کس کو گمان اور اندازہ ہو گا کہ ایسا ہوا؟

بیچارے سلیم مرحوم نے برق سے برقانا اور نرم سے نرمانا کا مصدر بنا لیا تو گنگا جمنی لوگوں کے نزدیک ہندوستان کی ناک کٹ گئی۔ کیا انہیں معلوم ہے کہ عربوں نے ''گمان'' سے ''گمن'' تو نہیں البتہ ''خمن، یخمن، تخمین بنا لیا.......... آپ بھی روز کسی نہ کسی چیز کا تخمینہ کرتے ہوں گے۔

اسی طرح ''اندازہ'' سے ہَندَسَ یُہَندِسُ ہَندَسَۃً فَہُوَ مُہَندِسٌ کر لیا۔ بیچارے ہندی بہت دن سے اکڑ رہے تھے کہ علم ''ہندسہ'' کا نام بتاتا ہے کہ وہ ہندوستان کی ایجاد تھی مگر واقعے اور قیاس میں وہی فرق ہوتا ہے جو تاریخ اور کہانی میں یا یورپ اور ایشیاء میں یا مغرب اور مشرق میں۔

ہاں بھلا آپ جانتے ہیں یہ یورپ اور ایشیاء کے الفاظ بھی آپ کے رشتہ دار ہیں؟ اب رشتے کا ہے کو یاد رہیں گے، ہم ٹھہرے صاحب بہادر اور یہ لوگ بیچارے دقیانوسی وضع کے۔ مگر پھر بھی عِلمُ الشیٔ خَیرٌ مِن جھلِہٖ ابھی آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یوروپ اور مغرب ایک ہی صاحب کا نام ہے جو کبھی داڑھی کے ساتھ مونچھ بھی منڈا کر سوٹ بھی پہن لیتے ہیں (اور بعض مقرر ان کی صورت سے دھوکا کھا کر اپنی تقریر میں ''جنٹلمین'' سے پہلے ''لیڈیز'' کا لفظ بھی بڑھا لیتے ہیں اور کبھی مونچھوں کے ساتھ داڑھی بھی بڑھا کر جبہ پوشی بھی اختیار کر لیتے ہیں آپ شاید سمجھے نہیں؟ سنیے!

پرانے زمانے میں بابل میں کچھ انسان نما جانور بستے تھے۔ (ہم بھی جانور ہی ہیں) وہ ان علاقوں کو جدھر آفتاب ڈوبتا تھا۔ شامیش اور یا کہتے تھے۔ عربی دان سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ الفاظ بگڑی ہوئی عربی میں ''شمس'' اور ''غروب'' ہیں۔ مطلب تو ٹھیک ہے۔ مگر یہ بگڑی ہوئی عربی نہیں بلکہ بابلی زبان ہے جو بقول یوروپیوں کے موجودہ عربی کی ماں ہی نہیں بلکہ نانی ہے۔ بابلی زبان میں ''غ'' نہیں تھا۔ اس لیے وہ اس کا تلفظ ''الف'' ہی کرتے تھے۔ اور ''ب'' کو ''پ'' کہتے تھے.......... آخر جانور ہی تو تھے۔

Marfat.com

اسی طرح وہ ممالک جو آفتاب کے نکلنے کے رخ میں تھے، بابلیوں کی زبان میں ''شامیش آسیا'' کہلاتے تھے اسی آسیا اور اوریا کو انگریزنیوں کے بچوں نے ایشیاء اور یوروپ کر دیا۔ ہم تو مقلد ہی ٹھہرے ۔ یہ لفظ آسیا بھی جس کے معنی اٹھنے اور نکلنے کے ہیں۔ عربی میں پایا جاتا ہے اور عبرانی میں بھی چنانچہ آسی (سواساۃ) کے معنی ہیں۔ غم کو اٹھانا یا تسلی دینا، موسیٰ کے معنی بھی آپ جانتے ہوں گے۔ پانی میں سے نکالا ہوا ''مو'' اور ''ماء'' یعنی پانی ایک ہی لفظ ہیں۔ ہوں گے!

اچھا اب ان خشک باتوں کو جانے دیجیے اس سے تو خود اورنگ آباد کے لغت نویسوں کو بھی دلچسپی نہ ہوگی۔ ہاں ایک پہیلی کا حل ہم آپ کو بتا دیتے ہیں کسی اُردو یا ہندوستانی کے مدعی مہارت پر ہاتھ صاف کر لینا۔

پوچھیے کیا ہماری زبان میں بھی جرمن اور فرنچ کی طرح ایسے الفاظ ہیں جن کو مذکر پڑھیں تو الگ معنی ہوں اور مونث پڑھیں تو الگ؟

اگر وہ کہیں کہ نہیں تو پھر اپنا مندرجہ ذیل منتر پڑھنا شروع کر دیجیے:

گدھے کا کان .... نمک کی کان

پھولوں کا ہار .... انگریز کھلاڑیوں کی ہار اور ہماری جیت

قبر کا تعویذ .... گلے کی تعویذ

اگر اس پر ناک بھوں چڑھائیں تو:

پنجابی کا ناک .... اور لکھنوی کی ناک

کہتے ہوئے ہاتھ بڑھا دیجیے اور کہیے:

ہاتھ ملانا یار کیوں کیسی کہی!

(ماہ نامہ شہاب - حیدرآباد دکن اکتوبر ۱۹۳۶ء)

Marfat.com

حیدرآباد کی ایک تعلیمی جوبلی

مملکتِ آصفیہ کی موجودہ درسگاہوں میں سب سے قدیم سرکاری ادارہ دارالعلوم ہے جس کے قیام پر ۱۳۶۲ھ میں ۹۰ سال گزر چکے۔ یہ درس گاہ ملک کے نظامِ تعلیم کا مرکز رہی ہے اور اسی کے حصہ اعلیٰ نے پچیس سال ہوے جامعۂ عثمانیہ کا قالب اختیار کیا اور دارالعلوم کالج کو وہاں شعبۂ دینیات قرار دیگر اولاً شعبہ فنون کا اور پھر رفتہ رفتہ سائنس، انجینئری، تعلیم المعلمین، طب، کلکاری وغیرہ کا اضافہ عمل میں آتا رہا۔

شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ کے طلبہ جو بجا طور پر اپنے آپ کو جامعۂ عثمانیہ کے سب سے قدیم اور سب سے اہم جزو کا نام لیوا سمجھتے ہیں، ہر سال اپنی درسگاہ کا یوم تاسیس مناتے ہیں۔ سال حال کی تعطیلات عیدالاضحیٰ میں طلبۂ قدیم و جدید نے اہل ملک کی ہمدردی و اشتراکِ عمل سے اپنی درسگاہ کا نود سالہ جشن بڑی شان سے منایا۔ اس کا مختصر تذکرہ ناظرینِ معارف کی دلچسپی کے لیے پیش کیا جاتا ہے:

خانوادہ آصفی کو تعلیم سے جو خصوصی دلچسپی ہے اس کا مظاہرہ اس جشن میں اس طرح ہوا کہ سلطان العلوم آصف جاہ سابع نے اپنے بھائی شہزادہ بسالت جاہ بہادر کو اس امر پر مامور فرمایا کہ جشن دارالعلوم کا افتتاح فرمائیں۔ شہزادہ موصوف نے علومِ اسلامیہ اور ثقافتِ اسلامیہ کی عالمگیر اہمیت اور اس سے اہلِ زمانہ کی مجرمانہ غفلت پر پُرزور الفاظ میں توجہ مبذول کرائی اور فرمایا کہ حیدرآباد جو ہند میں اسلامی تحریکوں کا مرکز ہے اس بارے میں جو بھی اقدام کرے، وہ ضروری و بروقت بھی ہے اور اس کے شایانِ شان

Marfat.com

بھی۔اس جشن کے متعدد اجزاء و شعبے تھے۔

۱۔ خطبات علمیہ۔ اس میں تاریخ تعلیم اسلامی، تاریخ دارالعلوم، جامعۂ عثمانیہ کے قیام کی اندرونی سرگزشت، شعبۂ دینیات، جامعۂ عثمانیہ کی پچیس سالہ کوشش، جدید طرز سے علومِ اسلامیہ کی تحقیق و تعلیم وغیرہ شامل تھے۔ یہیں وزیر تعلیم کی زبانی حکومتِ آصفی کے اس ارادے کا نیم سرکاری اعلان ہوا کہ جملہ مسلم طلبہ کے لیے عربی لازم کر دینا حکومت کے پیش نظر ہے۔

۲۔ محفل عربی - ایک خصوصی نشست میں صرف عربی تقریروں، مقالوں اور نظموں کا انتظام کیا گیا تھا جو انتہائی کامیاب رہا، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ نئی پود میں بھی بحمداللہ عربی تعلیم کافی پائی جاتی ہے۔

۳۔ مظاہرۂ تجوید کی خصوصی نشست، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ مسلمانوں میں اپنے اس خاص فن کا ذوق روزافزوں ہے، فنِ تجوید پر بعض دلچسپ مقالوں کے ضمن میں قرأتوں کے مختلف اقسام کے عملی مظاہرے بھی کیے گئے، مثلاً قرأتِ سبعہ، قرأت عشرہ وغیرہ۔

۴۔ فارسی مشاعرہ۔ اس میں طرحی مصرع یہ تھا:

این چنیں دارالعلومے کے دکن پیدا کند

سلطان الشعراء حضرت آصفجاہ سابع نے بھی طرحی مصرع پر ایک غزل سرفراز فرمائی تھی۔

۵۔ فانوسی تقریروں میں ایک تقریر مناظر حجاز و بیت المقدس پر تھی اور دوسری دکن کی اسلامی تہذیب پر۔ دونوں بڑی سبق آموز اور دلچسپ رہیں۔

۶۔ نمائش ثقافتِ اسلامیہ، یہ نمائش پورے جشن کی جان تھی، صرف ایک ہفتہ کھلی رہنے کے باوجود ہزارہا آدمیوں نے اس کا معائنہ کیا، جس میں ہر مذہب اور ہر طبقے کے لوگ شامل تھے، آخری دنوں میں واقعۃً نمائش گاہ میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی تھی۔ پانچ پانچ ہزار اشخاص روزانہ آتے تھے۔

حال میں مدراس کی نمائش کے حالات معارف میں چھپ چکے ہیں۔ حیدرآباد

Marfat.com

کی نمایش بھی انہی کارکنوں کے زیرِ انتظام ہوئی۔ اس لیے اس کی تکرار کے بجاے اس نقش ثانی کی صرف بعض خصوصیتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس نمایش میں فلکیات کا شعبہ زیادہ مکمل اور دلچسپ تھا۔ قسم قسم کی دھوپ گھڑیاں، دیسی ساخت کی قدیم دوربین جس کی سند سے معلوم ہوتا تھا کہ نواب آصف الدولہ حکمرانِ اودھ نے کسی کو عطا کی تھی، مختلف نمونوں کے اسطرلاب اربع لجیب، فلکیات میں مسلمانوں کی تحقیقاتوں کے حالات (مثلاً آفتاب کے داغ، قطر زمین کی پیمایش، انعطافِ شعاع، مدوجزر کے وجوہ وغیرہ) جلی خط میں نمایاں کیے گئے تھے۔ ایک بہت بڑے نقشے میں کرۂ سماوی اور ستارے بنائے گئے تھے اور ہر ستارے کا عربی اور انگریزی نام بھی لکھا تھا، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ پنچانوے فی صدی نام عربی ہی کے مغربی زبانوں میں برقرار ہیں صرف تلفظ بگڑ گیا ہے۔

جغرافیہ میں ادریسی وغیرہ کے نقشہ ہائے عالم، علم ملاحی میں قسم قسم کے عربی جہازوں کے نقشے دلچسپ چیز تھے۔

مخطوطات کا شعبہ بہت اہم تھا، نادر کتب میں صحیفۂ ہمام بن منبہ المتوفی ۱۳۱ھ خاص چیز تھی، اس کے علاوہ انجیل کا عادل شاہی دور کا فارسی ترجمہ جو ایک مسلمان عالم نے کیا تھا، پانچویں صدی ہجری اور اس کے بعد کے لکھے ہوئے نسخے، یاقوت مستعصمی، عماد، میر علی وغیرہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں اور قرآن مجید، داراشکوہ و عالمگیر کے مخطوطہ قرآن، حضرت عثمانؓ کے ہاتھ کے قرآن کا فوٹو جو ترکی حکومت نے شائع کیا تھا، حافظ ابن حجر وغیرہ مشاہیر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں، ابن القیم کی نادر روزگار تالیف احکام اہل الذمہ (جلد اول چھ سو صفحوں میں تھی، اس کے اجزاے مابعد کا پتا نہیں)۔

سکوں میں بنی امیہ سے لے کر اب تک کے تقریباً ہر اہم اسلامی حکمران خانوادے کی نمایندگی ہوئی تھی۔ سبکتگین، بلبن، تغلق، شیر شاہ سوری، احمد شاہ ابدالی، بچہ سقہ، نادر خان و ظاہر خان نیز مختلف ممالک اسلامی (جاوا، مشرقی افریقہ، زنجبار، مسقط، عمان وغیرہ) وغیرہ وغیرہ کے سکے تھے۔

سیرۃ النبی کا شعبہ زیادہ اہم تھا، سو ڈیڑھ سو مقامات کے فوٹوؤں کے ذریعہ

Marfat.com

ولادت باسعادت سے وفات تک کے حالات نمایاں کیے گئے تھے۔ اس میں غارِ حرا، غارِ ثور، بدر و طائف، اُحد و خندق، مناظرِ حج اور دیارِ حبیب کے فوٹو تھے۔

تاریخِ اسلام کے نقشے بھی دلچسپ تھے، عہدِ نبوی و خلافت راشدہ کے فتوحات کا پانچ رنگی نقشۂ عالم، تیرہ سو سالہ فتوحاتِ اسلامی کا دس رنگی نقشہ، دنیا کی موجودہ اسلامی آبادیوں کا تفصیلی نقشہ تین رنگوں میں مع اعداد و شمار۔

اسلحہ کا شعبہ بھی اہم تھا۔ قسم قسم کی تلواریں اور دیگر اسلحے جن کے کام و استعمال کا ذکر ان کے نام تک سے اب نئی نسل بے خبر ہو گئی ہے۔ فاروقی سلاطین کی توپیں، اورنگ زیب وغیرہ کی تلواریں، حروب صلیبیہ کے زمانے کی تلوار، بہادر شاہ کی تلوار، آہن ربا جبیہ وغیرہ۔

تصاویر کے ذخیرہ نے قدیم و جدید استادوں کا بڑا جمگھٹا پیدا کر دیا تھا جو خاص کر دکن کی تاریخی شخصیتوں کا مکمل مرقع کہا جا سکتا ہے۔

دکن کی ڈیڑھ دو صدی پہلے کی امیرانہ زندگی کے سامان، سنہری قالین، چاندی کی جڑاؤ کرسیاں، صوفے، میزیں وغیرہ۔

اس نمائش نے نوجوانوں میں ایک لہر دوڑا دی ہے اور انہیں اپنے گھروں کے سامانوں کی اہمیت کی جانب متوجہ کر دیا ہے کہ وہ کتنے ہی بوسیدہ اور خراب کیوں نہ ہوں، نہایت قیمتی اور قابلِ تحفظ ہیں۔

توقع ہے کہ یہ نمائش ان شاء اللہ جلد ایک معرضِ ثقافت اسلامیہ کی صورت میں مستقل میوزیم کی حیثیت اختیار کر لے گی، جس میں منظم اور باقاعدہ طور سے سامان تیار اور فراہم کر کے جمع کیا جایا کریگا جو تاریخ و تمدن اسلامی کے لیے ایک درس گاہ بن جانے کا، ابھی تو یہ خانگی کوششیں ہیں خدا کرے پروان چڑھیں۔

خطبات علمیہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کا مقالہ ''اصول فقہ'' پر رکھا گیا تھا، مگر موصوف کی آمد کی تاریخ میں خانگی وجوہ سے تبدیلی ہوئی۔ اس مقالہ کو روئداد جشن میں شامل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

جشن کی طرف سے تذکرہ دارالعلوم کے نام سے ضخیم کتاب شائع ہو چکی ہے اور

Marfat.com

سامانِ نمائش کی مفصل فہرست مشاعرے اور خطباتِ علمیہ کی طباعت کا کام شروع ہو چکا ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ برطانوی ہند کی قدیم ترین جامعات کلکتہ، مدراس، بمبئی کے قیام سے بھی ایک سال قبل دارالعلوم حیدرآباد کا افتتاح ہوا تھا اور غالبًا ہندوستان کے غیر سرکاری اسلامی مدارس میں بھی اب کوئی اتنا قدیم موجود نہیں ہے۔

وللہِ عاقبۃ الامور۔

(معارف اعظم گڑھ-فروری ۱۹۴۴ء)

Marfat.com

سود

Marfat.com

Marfat.com

انجمن ہائے قرضہ بے سودی

''سود کی مذہبی حرمت سے قطع نظر خالص دنیاوی حیثیت سے بھی سودی قرضوں نے مسرف مسلمانوں کو جس نوبت تک پہنچا دیا، اُسکے نتائج بالکل ظاہر ہیں، بعض کوتاہ نظر مسلمانوں نے مسلمانوں کو تباہ کن سودی قرضوں سے روکنے کے بجائے شرعی حیلوں سے سود کے جواز اور اس کی ترویج کو مسلمانوں کے اقتصادی زوال کا علاج تجویز کیا ہے، حالانکہ قوموں کی اقتصادی ترقی کا مدار سود خوری پر نہیں، بلکہ صنعت وحرفت اور تجارت کی اشاعت و ترقی پر ہے۔ گو بیشتر مسلمانوں کی تباہی کا سبب ان کا اسراف ہے، لیکن بعض حالات میں واقعی اور ناگزیر ضروریات نادار مسلمانوں کو سودی قرض لینے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اس مجبوری کے پیش نظر خلافت راشدہ کے دور میں بیت المال سے حاجتمند مسلمانوں کی امداد اور ان کے قرضوں کا انتظام تھا، لیکن آج اس قسم کا کوئی اجتماعی نظام نہیں ہے اور بہت سے مسلمان ضروریات کے موقع پر سودی قرض لینے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ سب سے اول اس ضرورت کا احساس حیدرآباد میں کیا گیا، اور آج سے پچاس ساٹھ برس پیشتر وہاں بے سود کے قرض دینے والی انجمنیں قائم ہوئیں، یہ انجمنیں اتنی کامیاب ہوئیں کہ اب حکومت نے بھی

Marfat.com

ان کی جانب سرپرستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب صدیقی نے ان انجمنوں کی روداد ہمارے پاس اشاعت کے لیے بھیجی، چونکہ اس کا تعلق عام مسلمانوں کے مفاد اور وقت کے ایک اہم مسئلہ سے ہے اور اس سے ان انجمنوں کے نظام اور ان کی کارگزاری پر روشنی پڑتی ہے اس لیے اس کو عام مسلمانوں کے سبق کے لیے شائع کیا جاتا ہے۔ ''م''

رسالۂ معارف جہاں علوم اسلامی کی بے بہا خدمت انجام دے رہا ہے، وہیں معاشرۂ مسلمانان کی اصلاح میں بھی اسکی کارگزاری کچھ کم نہیں ہے، اسی آخر الذکر قسم کا ایک امر ناظرین سے عرض کرنا ہے۔

دنیائے اسلام میں ہر جگہ اور ہند میں خاص طور پر مسلمان افلاس اور فضول خرچی میں شہرت رکھتے ہیں، نتیجہ قرض داری ہے، وہ قرضداری جس سے مسلمان کم از کم پانچ دفعہ روزانہ نماز میں

اَللّٰھُمّ انی اعوذبك منَ المَاثم وَالمَغرمِ

خدایا۔ میں تیرے ہاں گناہ اور قرض سے پناہ چاہتا ہوں۔

کے الفاظ میں اظہار بیزاری کرتا ہے، لیکن یہ اظہار بیزاری بھی صرف لفظی ہو گیا ہے، عمل سے کوسوں دور ہے۔

انسانی معاشرے میں باہمی احتیاج قدیم سے ہے اور انہی احتیاجوں میں سے ایک رقم کی عارضی ضرورت بھی ہے۔ کسی کے پاس فالتو رقم ہوتی ہے، اور کسی کو اس کی احتیاج۔ عام حالتوں میں یہ معقول تو ہے کہ فاضل رقم والا، اپنی قرض دہی سے کچھ نفع حاصل کرے، لیکن انسانیت بھی کوئی چیز ہے، اخلاقِ فاضلہ کا بھی کچھ پاس ہونا چاہیے، بے بس ومحتاج کی امداد اس کا ہم جنس انسان نہ کرے تو پھر مخلوقات میں کس سے آس رکھی جا سکتی ہے؟!

یہی وجہ ہے کہ قدیم سے ہر مہذب مذہب نے ہر جگہ سود خواری کی ممانعت کی، اسلام نے تو اسے خدا اور رسول سے اعلانِ جنگ کا لرزہ خیز نام دیا ہے۔

یہ سب سہی لیکن دنیا میں جب تک انسان کو آزادی ہے اس کی کم توقع کی جا سکتی ہے کہ تکلیف دہ نیکی پر بطور اکثر عامل ہو، اپنا روپیہ چاہے فالتو ہی ہو، دوسرے کو بے سودی قرض دے دینا، اور اس طرح ایک جوکھم مول لینا واقعی ایک تکلیف دہ نیکی ہی ہے، حکومت کے سوا عوام میں ایسے شاذ ہی ملیں گے، جو بے سودی قرض دے سکیں۔

اور تمام تمدنوں نے سود کی ممانعت جس حد تک کی ہو، لیکن اس کے اصل باعث پر توجہ نہ کی۔ اسلام ہی وہ واحد تمدن ہے جس نے سود کی ممانعت کے ساتھ ساتھ اس کے استیصال کے وسائل مہیا کیے اور جیسا کہ عرض ہوا، قرضہ دینا اور سود سے دست برداری گوارا کرنا صرف کسی حکومت ہی کے لیے علی العموم آسان ہے، افراد عوام کے لیے نہیں، چنانچہ قرآن مجید نے اسے حکومت کے فرائض میں داخل کیا اور حکم دیا کہ سرکاری آمدنی کا ایک حصہ قرضداروں کی اعانت کے لیے اٹھا رکھا جائے:

> انّما الصّدقات للفقرآء والمساکین والعاملین علیها والمؤلفة قلوبهم وفی الرقاب والغارمین
> الآیۃ
>
> بے شک زکوٰۃ وغیرہ کی سرکاری آمدنیاں فقیروں، مسکینوں، وصول کنندہ افسروں، مولفۃ القلوب، غلامی و قید سے رہائی اور قرضداروں کے لیے ہیں۔

چونکہ آیت کے شروع ہی میں فقراء و مساکین آ چکے ہیں، اس لیے ان قرضداروں سے مراد نانِ شبینہ کے محتاج و فقیر نہیں ہو سکتے، بلکہ وہی کھاتے پیتے لوگ ہو سکتے ہیں جنہیں عارضی طور پر قرض کی شدید ضرورت ہو گئی ہو۔

یہ امر قابل عرض ہے کہ اس آیت میں ''زکوٰۃ'' کی جگہ ''صدقات'' کا لفظ

Marfat.com

استعمال کیا گیا ہے جو زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے، جس کی تشریح و تفصیل یہاں شاید غیر ضروری ہوگی۔

سب لوگ جانتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں سرکاری خزانہ سے اہلِ حاجت مسلمان قرض حاصل کیا کرتے تھے، خود خلیفۃ المسلمین ضرورت کے وقت بیت المال سے قرض لیتے تھے اور جب سالانہ یا ششماہی تنخواہ دیوان سے ملتی تھی تو اس کو ادا کردیتے تھے۔

یہ سرکاری انتظام اگر جاری رکھا جاتا تو دنیائے اسلام میں سودخواری باقی ہی نہیں رہتی، حالیہ زمانوں میں اس کی کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ حکومتیں اتنی رعایا پروری کریں۔

مملکت اسلامیہ دکن صانہا اللہ عن الشرور والفتن سے حالیہ زمانہ میں جہاں متعدد اصلاحی اقدام ہوئے ہیں، وہیں انجمن ہائے قرضہ بے سودی بھی ہیں، ان کی کچھ تفصیل یہاں پیش کرنے کی اجازت چاہی جاتی ہے۔

ابھی برطانوی ہند میں کوآپریٹو کی سودی انجمنیں قائم بھی نہ ہوئی تھیں کہ اس سے ایک نسل پہلے (اب سے پچپن، ساٹھ سال قبل) شہر حیدرآباد کے ایک دردمند شیخ نے انجمن مؤید الاخوان قائم کی جو بانی انجمن کے لائق بیٹے مولانا سید محمد بادشاہ حسینی معتمد مجلس علمائے دکن کی وجہ سے اب تک جاری اور روزافزوں ترقی کر رہی ہے۔ اس انجمن کا اصول یہ رہا، کہ لوگ چرم قربانی اور دیگر خیراتی رقمیں اس ادارے کو دیدیا کریں، چھوٹی ابتداء کے باوجود اس انجمن نے اب دس پندرہ ہزار کا سرمایہ جمع کرلیا ہے، اور اب تک پانچ چھ لاکھ روپیہ بے سودی قرض دے چکی ہے، یہ چھوٹی انجمن ہے لیکن والفضل للمتقدم۔

اس اثناء میں مملکت آصفیہ میں اور بھی درجنوں انجمنیں بے سودی قرض کے لیے وقتاً فوقتاً قائم ہوئیں جن میں متعدد اب بھی باقی ہیں۔

انہی میں سے ایک کا تفصیلی ذکر کرنا مقصود ہے۔ محکمۂ بندوبست و داخلۂ حقوق اراضی (سیٹل منٹ و لینڈ رکارڈ) کی انجمن امداد باہمی قرضہ بلاسودی نے چند ماہ ہوئے اپنا بیسواں سالانہ جلسہ کیا، اس میں بیان ہوا کہ بیس سال میں اس نے ایک لاکھ

Marfat.com

روپیہ سے زیادہ کا سرمایہ جمع کر لیا ہے جس سے اب ماہانہ پانچ چھ ہزار کے جدید قرضے دیے جارہے ہیں، اس کا اصول امداد باہمی ہے۔

ہوتا یوں ہے کہ مثلاً دس آدمیوں نے ایک انجمن قائم کی اور اس کا سو روپیہ کی مالیت کا ایک ایک حصہ خرید لیا اور وعدہ کیا کہ ماہانہ ایک ایک روپیہ کی قسط ادا کی جائیگی، تا آنکہ سوا آٹھ سال میں پوری رقم ادا ہو جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے مہینے میں دس شرکاء سے دس روپے وصول ہوتے ہیں جو ایک یا زائد شرکاء کو قرض میں دیے جاتے ہیں، ادائی مثلاً بیس ماہ میں رکھی جائے تو ماہانہ آٹھ آنے[1] قسط قرضہ میں وصول ہوتے، دوسرے ماہ میں دس روپے مزید رقم حصص میں اور آٹھ آنے قسط قرضہ میں وصول ہوتے ہیں، تیسرے ماہ علاوہ رقم حصص کے ساڑھے دس روپیہ کی قسط قرضہ آٹھ آنے سے کچھ زائد وصول ہوتی ہے اور اس طرح ہر ماہ آمدنی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ سوا آٹھ سال کے اختتام پر دس ہی غریب آدمیوں سے ہزار روپے جمع ہو جاتے ہیں جو شرکاء میں قرض کی صورت میں پھیلے ہوئے اور گشت کرتے رہتے ہیں اور محض اقساط قرضہ سے ماہ بہ ماہ اتنی رقم جمع ہو جاتی ہے کہ ضرورت مند شرکاء کی ضرورت پوری ہو جائے۔

نئے شرکاء بڑھتے رہتے ہیں، وفات وغیرہ سے کچھ خارج بھی ہوتے اور اپنی رقمیں واپس بھی لیتے رہتے ہیں، لیکن اگر کارکن امانت دار ہوں تو انجمن کی ساکھ اور اس کا کاروبار پھیلتا جاتا ہے۔

انجمن کے لیے بہی کھاتوں اور کاغذ سیاہی وغیرہ کی ضرورت رہتی ہے، اس کی فراہمی کا انتظام یہ ہوتا ہے کہ شرکاء مثلاً ایک پائی ماہانہ مد محفوظ و صادر کے لیے ادا کرتے ہیں اور درخواست قرضہ پر بھی ایک آنہ یا مناسب محصول لگایا جاتا ہے، یہ رقم اتنی ہو جاتی ہے کہ کاروبار کے پھیلنے پر محاسب کی تنخواہ وغیرہ بھی ادا ہو سکتی ہے اور مد محفوظ و ناقابل بازیافت رقموں کے لیے بھی کام دیتی ہے۔ مثلاً کسی کی وفات ہو گئی اور اس کی جمع سے زیادہ قرض وصول طلب ہے، اور اس کی ضمانت بھی اتفاقاً ناکافی ہو گئی ہے وغیرہ۔

ضمانت شخصی بھی ہوتی ہے اور مالی بھی، شخصی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک یا زائد

---

[1] اس وقت کا سکہ رائج الوقت (مرتب)۔

Marfat.com

اشخاص اقرار کرتے ہیں کہ قرض گیرندہ اگر رقم ادا نہ کرے تو وہ اپنی ذات و جائیداد سے ادا کر دیں گے، مالی ضمانت میں زیور، جائیداد غیر منقولہ وغیرہ ہوتے ہیں اور عموماً قرض کی مقدار سے ڈیوڑھی مالیت کے سامان قبول کیے جاتے ہیں تاکہ قیمتوں کے اتار چڑھاؤ سے جوکھم نہ رہے۔

قرضے کی مقدار پر بھی پابندیاں عائد ہوتی ہیں، ایک حصہ لینے والا مثلاً زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو روپے تک قرض لے سکتا ہے۔ اسی طرح ڈیڑھ سو کا حق ہونے کے باوجود کم آمدنی رکھنے مثلاً چپڑاسی ہونے کی صورت میں احتیاطاً اسکی مقدار گھٹ سکتی ہے وغیرہ۔

اگر وقت واحد میں بہت سے قرض خواہ ہو جاتے ہیں تو درخواست کے تقدم، ضرورت کی شدت اور گنجائش کا لحاظ کیا جاتا ہے، عموماً مجلسِ انتظامی ہر مہینہ جلسہ کر کے طے کرتی ہے کہ اس مہینہ میں کن کن لوگوں کو کتنا قرض دیا جائے اس میں اگر بے جا پاسداری نہ ہوتو سب خوش رہتے ہیں۔

یہ اور دیگر انتظامی امور تجربے سے بھی معلوم ہو جاتے ہیں، تجربہ کار انجمنوں کے قواعد سے بھی علم ہوسکتا ہے۔ دفتر بندوبست کی مذکورہ انجمن میں اس وقت ایک ہزار شرکاء ہیں، ان میں مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی، انجمن کے اخراجات کے باوجود بچت کے ذرائع سے اب اس کا محفوظ سرمایہ تین ہزار روپے کا ہو گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اگر کوئی شخص اپنا خرچ آمدنی سے زیادہ رکھے اور کمی کی تلافی قرضے سے کرتا رہے تو لقمان کی حکمت بھی اس کی مدد نہیں کر سکے گی اور وہ جلد یا بدیر تباہ ہو جائے گا۔ انجمن ہائے قرضۂ حسنہ کا مقصد صرف ان لوگوں کی مدد ہے جن کے آمد و خرچ میں تو توازن ہو، لیکن اگر وقتی طور سے ان کو اتنی رقم کی ضرورت ہو جائے جو ان کی آمدنی سے فوری طور پر بچائی نہیں جاسکتی تو ان کو قرض دیا جائے۔

مسلمانانِ ہند سے اسراف کی عادت کو چھڑانے اور آمد و خرچ میں توازن پیدا کرنے کے لیے بہت سے ذیلی و تکمیلی وسائل کی حاجت ہے (علاوہ انجمن ہائے قرضۂ حسنہ کے) فضول مراسم کا ترک کرنا، غیر ضروری مصارف میں تخفیف بلکہ ان کا ختم کرنا،

Marfat.com

اور جیسا کہ مجلس علماے دکن نے تجویز کیا ہے، اگر کوئی شخص اپنی سکت سے زیادہ محض دکھاوے کے لیے دھوم دھام سے کوئی تقریب کرے اور اس کے لیے سودی قرض حاصل کرے تو ایسی تقریب کا بائیکاٹ کرنا چاہیے۔ ہو سکے تو مجموعۂ تعزیرات میں ترمیم کر کے مسرفانہ مراسم انجام دینے والوں اور قرض لے کر بیجا و غیر ضروری امور کی تکمیل کرانے والوں کو قابل دست اندازی جرم کا مرتکب اور قابل سزا قرار دینا ہوگا۔

بہر حال انجمن ہاے امداد باہمی بھی قرضۂ بلا سودی نے حیدرآباد میں کافی مفید کام انجام دیا ہے اور اب وہ روز افزوں وسعت حاصل کرتی جا رہی ہیں۔ ساٹھ سال کا طویل اور جہادی دور ختم ہو گیا ہے، اب حکومت بھی ان کی سرپرستی کر رہی ہے۔ چنانچہ حکومت حیدرآباد نے حال میں لکھا ہے کہ ''حکومت سرکاری مالی دلچسپی کے ساتھ محکمۂ بندوبست کے ملازمین کی انجمن کی ترقی کو نوٹ کرتی ہے اور اس انجمن کی خصوصیت یعنی کاروبار کے لیے سودی ہونے کے متعلق دیگر دفاتر کی انجمنوں کو بھی ترغیب دلاتی ہے، کیونکہ کسی انجمن قرضۂ امداد باہمی کا صحیح مقصد یہی ہے کہ کفایت شعاری کی حوصلہ افزائی اور اپنے ارکان کی خدمت ہو نہ کہ نفع اندوزی عمل میں لائی جائے۔''

(معارف اعظم گڑھ۔ مارچ ۱۹۴۴ء)

Marfat.com

Marfat.com

مکاتیب

Marfat.com

Marfat.com

پاریس

۱۳؍شوال المکرم ۱۳۷۰ھ

محترم جناب شاہ صاحب

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

کل شام کی ڈاک میں جون ۵۱ء کا معارف ملا، مسرت سے ورق گردانی کی، اردو املا کی تاریخ پر ایک عمدہ مضمون نظر سے گزرا، اس سے کئی وجوہ سے مجھے دلچسپی ہوئی، بلکہ عرصہ سے تمنا تھی کہ کوئی باہمت اہلِ علم ادھر توجہ کریں، موجودہ مضمون ''تقابلی املائیات'' کے لیے اردو دانوں کے حلقے سے باہر بھی خوش آمدید سمجھا جائیگا، اور میں یہاں ادارۂ السنہ شرقیہ میں اسے روشناس کراؤں گا۔

لیکن یہ ایک وسیع مضمون ہے اور نہ صرف یہ کہ فاضل مقالہ نگار کو اپنی تلاش جاری رکھنی چاہیے، بلکہ ضرورت ہے کہ دیگر اہلِ علم بھی اپنے معلومات اور اپنی تحقیقات کے نتائج سے اس بحث کی تکمیل میں حصہ لیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ املاء کے ارتقاء میں تین پہلو خاص کر مؤثر ہوتے ہیں:

ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر محمد حمید اللہ سابق پروفیسر قانون بین الممالک جامعہ عثمانیہ دارالمصنفین اور معارف کے مخلص قدردانوں میں ہیں، وہ جہاں بھی رہتے ہیں معارف کو نہیں بھولتے چنانچہ وہ آجکل پیرس میں ہیں وہاں بھی اس کو منگاتے ہیں، اردو املاء اور رسم الخط سے ان کو خاص دلچسپی ہے۔ اس پر انہوں نے کچھ کام بھی کیا ہے، اس لیے انہوں نے ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان صاحب لکچرار اردو کالج کراچی کے مضمون ''اردو املاء کی تاریخ'' کو بہت پسند کیا اور اس کے متعلق بعض مفید مشورے بھی دیئے ہیں۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ہم ان کا خط شائع کرتے ہیں۔ ''م''

Marfat.com

۱۔ پہلے یہ کہ جب کوئی ''بولی'' (یعنی غیر علمی محض بولی جانے والی زبان) پہلے پہل ''لکھی'' (یعنی تحریری زبان) بنتی ہے، تو کچھ تو صحیح تلفظ کی تلاش میں ''مشق و خطا'' کو ناگزیر دخل ہوتا، اور ہمیں اختلافات املا سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور کچھ گاؤں گاؤں کی بولی الگ ہونے اور تلفظ میں باہم اختلاف ہونے کے باعث مختلف اہلِ قلم کے ہاں نہ صرف مختلف ادوار میں بلکہ خود ہم عصروں میں املا کی حد تک فرق ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ بقائے اصلح کے طور پر کسی ایک جگہ کی بولی سب پر غالب آجاتی ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ خود تلفظ میں مختلف اسباب سے ارتقاء یا فرق پیدا ہو جاتا ہے، بیرونی اقوام سے تماس، خاص کر غیر زبان بولنے والوں کے تلفظ کو بھی اس میں دخل ہوتا ہے، اوّل الذکر امر کے سلسلہ میں سہولت پسندی بھی ایک خاص رجحان ہے اسلیے اردو ہی نہیں ساری دنیا کی زبانوں میں (ہ) کی آواز غائب ہوتی جا رہی ہے مثلاً انگریزی میں آنَر (honour) کو ہانر کوئی نہیں کہتا۔ اگرچہ انگریزی میں اب بھی (H) کا تلفظ بہت کچھ باقی ہے، فرانسیسی میں اب (H) کا لکھنا تو بدستور ہے، مگر بولنا یا پڑھنا اب ساری زبان سے غائب ہو گیا ہے۔ اطالیوں نے تو حد کر دی ہے کہ اپنے حروفِ ہجا سے (H) کو حذف ہی کر دیا ہے۔ یہ چیز اردو میں بھی نمایاں ہے اور ہائے مخلوط کی مثالوں سے اس کا مشاہدہ ہو سکتا ہے مثلاً ساتھی میں تو ھ بولا جاتا ہے لیکن ہاتھ کا تلفظ اب عملاً صرف ہات رہ گیا ہے، ثانی الذکر کے سلسلہ میں شاید علاقہ بڑاڑ کا برار بن جانا انگریزی اثر کا نمونہ سمجھا جا سکتا ہے۔

۳۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ کوئی لکھی جانے والی زبان اپنا رسم الخط کسی نوبت پر بدل ڈالے تو نئے خط میں املا کو معین ہوتے ہوتے کافی عرصہ لگتا ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ترکی زبان اس کا ایک دلچسپ نمونہ ہے اور گزشتہ پچیس تیس سال میں نہ صرف املا میں بار بار تبدیلی ہوتی رہی ہے بلکہ خود تلفظ پر بھی اثر پڑ رہا ہے۔ اگر پرانے ترکی (عربی) خط میں چھوٹے حروف علت (زبر زیر پیش)

Marfat.com

نہ ہونے سے تلفظ متاثر ہو رہا تھا تو اب لمبے حروفِ علت (آ، اِی، اُو) غائب ہیں۔علی اور عالی ایک ہی طرح لکھے جاتے ہیں۔

اس سے قطع نظر غیر زبانوں کے الفاظ و اصوات کی تحریر ایک مستقل مسئلہ ہے۔

عربی زبان میں (پ ٹ چ ڈ ڑ گ) جن سے ہمیں روزمرہ سابقہ ہے نہیں ہیں، جب ہم نے اپنی بولی کو عربی خط میں لکھنا شروع کیا، تو یہ نئے حروف ایک دن میں نہ تو سوجھ سکتے تھے، اور نہ مقبول و مروج ہی ہو سکتے تھے۔

شاید محترم مقالہ نگار کو اس سے دلچسپی ہو گی، اکبری دور کے ایک ملیباری مؤلف زین الدین المعبری نے جب عربی میں تحفۃ المجاہدین فی اخبار البرتگالیین لکھی، تو انہوں نے بھی ملیبار کے شہروں اور آدمیوں کے ناموں میں (ڈ) اور (ڑ) وغیرہ کو (د) اور (ر) ہی لکھا، جیسا اس کتاب کے مخطوطوں میں نظر آتا ہے۔ اور لزبن کے مطبوعہ اڈیشن میں بھی اسکو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

ممکن ہے اہلِ علم اس کام کو بھی آگے بڑھائیں، جس میں ناچیز نے بھی حصہ لیا ہے، اور جس میں اس کی تلاش عمل میں لائی گئی ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں عربی خط میں لکھی جانے والی زبانوں میں مختلف غیر عربی آوازوں (پ ٹ ڑ وغیرہ) کو ادا کرنے کے لیے کیا نئے حروف یا علامتیں ایجاد کیں اور آیا ایک ہی آواز کے لیے مختلف مقاموں پر مختلف حروف تو نہیں برتے جاتے، اور ممکن ہو تو اس میں اتحاد و ہم آہنگی کا انتظام کیا جائے۔

جون کا معارف تو مل گیا، لیکن اپریل اور مئی کے پرچے غائب ہیں، جون کے پرچے میں جو شُشماہی فہرست ہے، اس سے تو معلوم ہوا کہ دانتے کی نظم ''طربیہ ربانی'' کا مضمون جو بھیجا گیا تھا، وہ شاید اپریل میں چھپ بھی گیا، لیکن دیکھنے سے تا حال محروم رہا، معلوم نہیں ڈاک کے ان ڈاکوؤں کا کیا علاج ہے۔

مخلص

محمد حمید اللہ

معارف اعظم گڑھ - اگست ۱۹۵۱ء

Marfat.com

اتوار ۱۲ ربیع الانور ۸۰ھ پاریس

مخدوم ومحترم سلام مسنون

رسالہ معارف کی جلد (۸۵) میں فاضل محترم اطہر مبارکپوری نے مسلسل دو قسطوں میں ''عرب و ہند کے قدیم علمی وثقافتی تعلقات'' کے عنوان سے جدید دریافت و شائع شدہ نادر کتاب الذخائر والتحف للقاضی الرشید بن الزبیر پر تبصرہ فرمایا اور اقتباسات کا ترجمہ کیا ہے، فاضل مقالہ نگار کی دو چیزوں پر کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

وہ لکھتے ہیں کہ القاضی الرشید نامعروف نہیں ہے بلکہ محترم پروفیسر عبدالعزیز میمنی صاحب نے اس کا حال کئی کتابوں میں پایا ہے قصہ یہ ہے کہ ابن خلکان اور یاقوت نے جس القاضی الرشید کا ذکر کیا ہے اسکی وفات ۵۶۱ھ یا ۵۶۲ھ میں ہوئی ہے اور ہماری کتاب کی اندرونی شہادت یہ ہے کہ اس کا مؤلف اس سے تقریباً ایک صدی قبل فوت ہو چکا ہے۔ ابن خلکان میں القاضی الرشید بن القاضی الرشید کا ذکر ہے میرا گمان ہے کہ ہماری کتاب پوتے کی نہیں بلکہ دادا کی ہے (لیکن دادا کے حالات نہیں ملتے) کتاب میں میرے دیباچے کے الفاظ کا یہی منشا ہے۔

اسی طرح وہ راجہ دھمی یا رہمی پر قطعی فیصلہ صادر کر دیتے ہیں کہاں سے کیا پڑھنا چاہیے اور وہ کون ہے۔ میں نے بہ کثرت تحقیقی مقالوں کے حوالے دیے ہیں کہ وہ فضلا بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے اور نہیں بتا سکے کہ اس معرب لفظ کی اصل کیا ہے اور اس کا کس تاریخی شخص پر اطلاق ہونا چاہیے؟ اگر محترم مبارکپوری صاحب ان سارے مقالوں کو پڑھ کر ان کے دلائل کی تنقید کر کے کوئی فیصلہ صادر فرمائیں تو علم کی بڑی خدمت ہوگی اور ایک دیرینہ بحث ختم ہو سکے گی۔ ظاہر ہے کہ محض دعوی کافی نہیں، دلائل کی

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اس خط میں قاضی رشید کے بارہ میں جس التباس کا اظہار کیا ہے اور اسکی تحقیق کی جانب قاضی اطہر صاحب مبارک پوری کو توجہ دلائی ہے۔ اتفاق سے قاضی صاحب اس خط کی اشاعت سے پہلے ہی اسکے متعلق اپنی تحقیق لکھ چکے تھے جس کو اس کے ساتھ ہی اس نمبر میں شائع کیا جا رہا ہے۔......'م'

Marfat.com

ضرورت ہے۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی مرسلہ ایک پارۂ تحریر کی مجھے حال میں کترن ملی ہے۔ مخدوم محترم فرماتے ہیں کہ مجھ ناچیز کی فرانسیسی سیرت نبویہ کا اردو ترجمہ ہونا چاہیے۔ یہ میری عزت افزائی ہے، لیکن ناظرین معارف سے عرض ہے کہ (۱) اگر مولف اپنی تحریروں کا ترجمہ بھی خود کرنے لگے تو اس کے تکمیل طلب اور تدوین شدنی کاموں کو کون تمام کرے؟ یوں بھی (۲) اس کتاب کا بڑا حصہ میرے ان مضامین کی نظرثانی پر مشتمل ہے جو معارف وغیرہ میں چھپے ہیں اور پھر ''عہد نبوی کا نظام حکمرانی'' اور ''رسول اکرم کی سیاسی زندگی'' نامی کتابوں میں داخل ہوے ہیں۔ اس میں شک نہیں نظرثانی اور ترمیم بھی ہوئی ہے اور بعض نئے ابواب کا بھی اضافہ ہوا ہے مثلاً فینانس، نظام فوج، ارتقاء سرحدات، مملکت و تقسیم صوبہ جات و اضلاع وغیرہ۔ کتاب بڑی تقطیع کے کوئی آٹھ سو صفحوں میں چھپی ہے۔ اس ضخیم ترجمے کے کام کو بہرحال کوئی انجام دینا چاہے تو میں یہ مدد ضرور دے سکتا ہوں کہ (بشرط حیات وصحت) ترجمے کی نظرثانی کر کے یہ بتا سکوں کہ آیا کہیں مضمون سمجھنے میں کوئی غلطی تو نہیں ہوئی ہے۔ ویسے متعدد تالیفوں کا کام فی الوقت جاری ہے اور ان کو چھوڑ کر ترجمے میں لگنے کا کوئی سوال نہیں ہے۔

آخر میں یہ عرض ہے کہ چند سال قبل رسالۂ معارف نے مجھ سے پوچھا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے کے نسخۂ قرآن کی موجودگی کی کیا حقیقت ہے؟ اس پر میرا جواب بھی چھپا تھا کہ اس کا عکس لیکر زاررُوس نے چھاپا تھا اب تک کچھ مزید تفصیلیں بھی ملی ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس کا نسخہ برٹش میوزیم میں نہیں (جیسا کہ میں نے لکھا تھا) بلکہ ڈرہام یونیورسٹی میں ہے، میں نے اس کا میکروفلم منگایا ہے اگر آئے تو ان شاء اللہ کچھ تفصیل آیندہ عرض کر سکوں گا۔

موتمر مستشرقین ماسکو پر ایک تبصرہ ارسال خدمت ہے۔

فقط نیاز مند

محمد حمید اللہ

(معارف اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۶۰ء)

Marfat.com

پاریس - ۲۳ر اگست

محترمی! زاد مجدکم

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تہذیب جدید کا کرشمہ ہے کہ مئی ۱۹۷۲ء کا رسالہ معارف اب اگست کے آخر میں آیا ہے۔ اس میں امیہ بن ابی الصلت پر مقالہ شوق سے پڑھا۔ اگرچہ آخر میں "باقی" لکھا ہے لیکن اس کا کسے یقین کہ اسے دیکھنے کا موقع ضرور ملے گا۔ اسی لیے دو چیزیں جو ذہن میں گزریں، فوراً عرض کرتا ہوں۔

مقالہ کے شروع ہی میں (یعنی صفحہ ۳۲۵ کے حاشیے میں) لکھا ہے کہ زید ابن عمرو بن نفیل "بعثت نبوی سے ۷۵ سال پہلے ہی مر گیا" کیا ہندسے میں طباعتی غلطی ہے؟ یا مقالہ نگار نے تحقیق کے بعد لکھا ہے؟

بعثت نبوی چالیس سالہ عمر میں ہوئی۔ لہٰذا امیہ کو ولادتِ باسعادت نبوی سے پینتیس سال پہلے مر چکا ہونا چاہیے، لیکن میرے سامنے اس وقت الروض الانف للسہیلی (طبع اول) ہے، اس میں جلد اول کے صفحہ (۱۴۶) پر ہے:

روی البخاری عن ...... ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لقی زید بن عمرو بن نفیل بأسفل بلدح قبل ان ینزل علی النبی علیہ السلام الوحی .... الخ	امام بخاری نے فلاں فلاں سے روایت کی ہے کہ رسول اکرمؐ نے بلدح [پہاڑ] کے زیرین حصے میں زید سے ملاقات فرمائی اور اس وقت تک آپ پر وحی نازل نہ ہوئی تھی ....وغیرہ۔

اسی طرح سیرۃ رسول اللہ لابن ہشام میں ہے (طبع یوروپ) اس کے صفحہ (۱۴۸ تا ۱۴۹) پر اس کی موت کے ذکر میں ہے کہ وہ دینِ حق کی تلاش میں موصل تک گیا، پھر شام آیا تو میفعہ کے مشہور راہب نے اس سے کہا، "تو اسے یہاں کہاں ڈھونڈ

Marfat.com

رہا ہے، وہ تو تیرے ہی ملک میں مبعوث ہوگا، اور اب اس کا وقت آ چکا ہے۔ اس پر وہ تیزی سے مکہ واپس ہوا، مگر راستے میں قبیلۂ لخم کے لٹیروں نے اسے مار ڈالا --- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زید کی وفات بعثت نبوی کے بعد ہوئی۔

دوسرا قابل توجہ امر یہ ہے کہ بلاذری کی کتاب انساب الاشراف (مخطوطہ ہائے استانبول و رباط) کے اس حصہ میں جواب تک غیر مطبوعہ ہے، امیہ بن ابی الصلت کی سوانح عمری بھی ہے۔ اس میں یہ جملہ ہے:

وکان یھودیا　　　　وہ یہودی تھا،

اس توضیح کے بعد اس کے اشعار میں توحید، فرشتوں وغیرہ کا ذکر آئے تو کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے۔ قبیلۂ ثقیف سے اس کا تعلق موالات کا ہوگا، نسل کا نہیں۔

خدا کرے آں محترم اب خیر و عافیت سے ہوں۔

نیاز مند

محمد حمید اللہ

(معارف اعظم گڑھ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

پیرس، ۲۶؍رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ

محترمی زاد مجدکم

سلام مسنون:　　　　عید مبارک

ابھی ابھی جولائی کا معارف پہنچا، ممنون ہوا۔

اس کے صفحہ ۱۷، ۱۸ میں "عبداللہ بن عمرؓ" غلط ہے، یہ حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن العاص ہیں، مرحوم شاہ معین الدین احمد صاحب نے یہ غلطی نہیں کی ہوگی۔

مرحوم کے بیان پر کہ "بے شک ابتداء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث کی ممانعت کی تھی،" فاضل معاصر محمد مصطفےٰ الاعظمی کی یہ تحقیق ناظرین کی

Marfat.com

خدمت میں پیش کیے جانے کے قابل ہے کہ ممانعت کا حکم رسول اکرمؐ سے صحیح حدیثوں میں کہیں ثابت نہیں، صرف ایک حدیث حضرت ابو سعید الخدریؓ کی ہے، جو صحیح مسلم میں داخل ہوگئی ہے، لیکن ابن حجرؒ نے فتح الباری میں بیان کیا ہے کہ امام بخاریؒ نے اسے بھی رد کر دیا اور خیال ظاہر کیا کہ یہ حضرت ابو سعید الخدریؓ کی ذاتی رائے ہے جو کسی غلطی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہوگئی ہے۔

اس خبر سے بھی مسرت ہوئی کہ سیرت شامی چھپ رہی ہے۔ خدا جلد مکمل کرائے۔

نیاز مند

محمد حمید اللہ

(معارف اعظم گڑھ-اگست ۱۹۸۱ء)

جولائی ۸۱ء کے معارف کے صفحہ ۱۷ و ۱۸ پر کتابت کی غلطی کی وجہ سے حضرت "عبداللہؓ بن عمروؓ" کے بجائے عبداللہؓ بن عمر چھپ گیا ہے، ہم جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اس غلطی کی طرف مندرجہ بالا مکتوب لکھ کر توجہ دلائی، اس میں اور بھی ایک مفید بات لکھی ہے جو امید ہے کہ ناظرین کے لیے باعث دلچسپی ہوگی۔

پیرس ۲۶ر جمادی الآخر ۱۴۰۳ھ

مخدوم و محترم زادمجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

ابھی ابھی شام کی ڈاک میں نوازش نامہ ملا، اور سرفراز کیا، چالیس پینتالیس سال ہو گئے، آپ سے دارالمصنفین میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، اور آپ کی نوازش اور مہمان نوازی بھولی نہیں، تب کی ملنساری ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ہر وقت کی ہے، معظکم اللّٰہ وعافاکم،

آپ کی فرمایش سرآنکھوں پر، لیکن مستشرقین کی شکایت کے ادارے سے اس ناچیز کو بالکل اتفاق نہیں، اگر محترم علی میاں نے مجھ سے اس پر پیشگی گفتگو کی ہوتی تو میں ادب سے عرض کرتا کہ ایسا نہ کریں؛ ان میں سے ہر فرد پیشہ ور عناد اور دشمنی نہیں رکھتا اور جو اکا دکا رکھتا ہے، وہ اس طرح کی کانفرنسوں اور شکایت ناموں سے شدید تر دشمنی دکھانے لگتا ہے، (جیسا کہ کچھ دنوں سے یہاں نظر آرہا ہے)۔

ہم اپنے بچوں کو انہی کے ہاں بھیجتے ہیں، اور اُن کے پُرزۂ کاغذ (ڈاکٹری کی سند) پر اتراتے ہیں، پھر انہی کی شکایت کریں؟ اخلاق تو اس کی اجازت نہیں دیتے، وہ مسلمان نہیں ہیں، اُن سے توقع کرنا کہ وہ سو فی صد ہماری باتوں کی داد دیں، یہ عبث ہے۔ اُن کے دین اور ان کی دنیا کے متعلق کیا ہم بھی مبالغہ آمیز شکایتیں، اور تنقیدیں نہیں کرتے۔

میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ وہ عام طور پر عمداً اسلامی چیزوں پر اعتراض نہیں کرتے، وہ مخلص ہوتے ہیں، یعنی اپنے علم اور اپنی فہم کے مطابق تاثر لیتے اور بتاتے ہیں، اور گالی گلوچ کے ساتھ نہیں، خالص علمی انداز میں ان کو ان کی غلطیاں بتائیں تو عام طور پر فوراً مان لیتے ہیں۔ ایک تجربہ عرض کرتا ہوں، شاخت آنجہانی سے آپ ناواقف نہیں، ایک مرتبہ انقرہ میں امام سرخسی کا جشن منایا گیا، پہلے شاخت صاحب کی تقریر تھی، پھر میری باری آئی۔ انہوں نے اپنی رائے بیان کی، اس سے پیشگی واقف ہوئے بغیر میں نے ان چیزوں کی تردید کی، جشن کے صدر نے بعد میں مجھ سے بیان کیا کہ شاخت نے اپنی

پڑھی ہوئی تقریر واپس مانگ لی اور بہت سے ترمیموں کے بعد دی، کہ آپ اسے چھاپ سکتے ہیں، یہی تجربہ مجھے اٹلی کے سب سے بڑے مستشرق ''لیوی ولا ویدا'' سے رہا۔ جزیہ اور ذمیوں سے دگنی چنگی کی وجہ سے میری بحث پڑھ کر مجھے خط لکھا، کہ تمہاری ان دلیلوں پر تو کوئی یہودی ربی بھی زبان نہیں کھول سکے گا۔

غرض اس ناچیز کی رائے میں ان کی چیزوں کو کھلے دل سے پڑھ کر ان کی غلط فہمیوں کو خالص علمی انداز میں دور کریں ہو سکے تو ان کا نام بھی نہ لے کر، زیر بحث مسئلہ کو اس طرح پیش کریں کہ اعتراض خود ہی دور ہو جائے اور ظاہر ہے کہ یہ چیز محنت چاہتی ہے تو زیادہ صحیح اور زیادہ مفید ہوگا۔

معارف میں'' خطبات بہاول پور'' کی تحلیل دیکھی، تمنا تو تنقید و تصحیح کی تھی، معلوم نہیں اس کا ۲۲ صفحوں کا غلط نامہ آپ کو ملا یا نہیں، کئی دفعہ کافروں کو بھی ''حضرت ......رضی اللہ عنہ'' لکھ ڈالا ہے۔

خدا کرے آپ خیر و عافیت سے ہوں۔ حال میں سلمان صاحب یہاں آئے تھے، دعوت دی ہے، شاید آیندہ ماہ ڈربن جا کر دوبارہ ملاقات کرسکوں۔

نیاز مند

حمید اللہ

(معارف اعظم گڑھ مئی ۱۹۸۳ء)

Marfat.com

پاریس ۱۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ دوشنبہ

مخدوم ومحترم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کئی ہفتے ہوئے عنایت نامہ مل گیا اور سرفراز کیا تھا۔ ''جشنِ سلیمانی'' کی آخری معلوم تجویز کے انجام کے انتظار میں جواب میں تاخیر ہوئی۔ معاف فرمائیں۔

کیا ایسے جشن شرعاً جائز ہیں؟

آج کل کے بحرانِ فکری میں بعض مسلمان اور تو اور خود جشن میلادِ نبویؐ کو بھی حرام قرار دے رہے ہیں اور واحد استدلال یہ کہ رسول اکرم نے اس کا حکم نہ دیا، (جس میں ''خلق عظیم'' ہو تو کیا اس کی تواضع اجازت دے سکتی ہے، کہ وہ ایسا حکم خود اپنے متعلق دے؟) مگر یہ بھولے اس بات کو بھولتے ہیں کہ خود خدا نے اپنے حبیب کا یہ جشن شروع فرمایا اور ہمیں اطلاع دی کہ

اور مزید برآں خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپؐ کے واسطے سے مسلمانوں کو حکم دیا کہ "وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ" کیا اس سے بڑھ کر کوئی نعمت خداوندی ہو سکتی ہے کہ کسی امت اور نوع انسانی کے کسی معاشرے میں کوئی نبی بھیجے؟

حدیث صحیح ہے کہ "العلماء ورثة الانبياء" اس تحدیث نعمت کا موضوع بننے کا استحقاق کسی نبی کے بعد سب سے پہلے علمائے امت کو حاصل ہوگا۔ اور تحدیثِ نعمت کے طریقے غیر محدود ہو سکتے ہیں۔

Marfat.com

جشنِ سلیمانی:

عصرِ حاضر میں، خاص کر ہمالیہ تلے کے براعظم اور اردو زبان میں مرحوم سید سلیمان ندویؒ نے دین اور علم کی اتنی خدمت کی ہے کہ اس کے مماثل کسی اور نے شاذ ہی کی۔ ان کے مستفیدین اور انکا احترام کرنے والے شکرگزار دیگر مقاموں کی طرح پاریس میں بھی بہ کثرت ہیں۔ کہتے ہیں کہ مرحوم نے ایک بار اس سرزمین فرنگ کو اپنی آمد سے شرف بھی بخشا تھا، یہ بھی معلوم ہو گا کہ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصے سے جامعۂ پاریس میں اردو کی تعلیم کی کرسی قائم ہے اور گارسیں دتاسی سے لے کر اب تک اس کا سلسلہ جاری ہے، (پاریس میں اردو کی کرسی کے قیام کا فرانسیسی فرمانِ شاہی مورخہ ۱۷ر دسمبر ۱۸۳۰ء کا موجود ہے۔)

جشنِ صد سالہ:

مولانائے مرحوم کی ولادت دیسنہ میں، خاندانی روایات کے مطابق، جمعہ ۲۳ر صفر ۱۳۰۲ھ کو ہوئی اور ان کے دادا کی طرف ایک تاریخی قطعہ منسوب ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں۔ ؎

شدہ مہرِ تاباں ز برجِ کمال بگفتا کہ بے داد شد مصرعے

اس کی معادل تاریخ نہ معلوم کس نے (سہواً) ۲۲ر نومبر ۱۸۸۴ء بتائی اور وہ یہاں تک پھیلی کی مرحوم کے مزار تک پر کندہ کرادی گئی۔

فرنگیوں نے دو تین سو سال سے تقابلی جدولیں شائع کرنی شروع کی ہیں جن میں ہجری اور عیسوی معادل تاریخیں درج ہوتی، اور آسانی سے ڈھونڈھی جا سکتی ہیں۔ ایسی قدیم ترین کتاب لاطینی میں ہے اور اب ہر بڑی فرنگی زبان میں موجود ہے اور اسی کی نقل عربی اور اردو (اور شاید فارسی اور ترکی میں بھی) میں ہوئی اور ان ساری غلطیوں کی حامل جو فرنگی جدولوں میں ہیں۔

بات یہ ہے کہ ان میں گزشتہ چودہ سو سال کے ہر مہینے کی رویت ہلال کو حساب

Marfat.com

کر کے معلوم کرنے کی جگہ ایک من گھڑت اصول فرض کر لیا ہے کہ محرم، ربیع الاول، جمادی الاولیٰ، رجب، رمضان اور ذی القعدہ ہمیشہ ہمیشہ تیسے ہوتے ہیں اور صفر، ربیع الآخر، جمادی الآخرۃ، شعبان اور شوال ہمیشہ انتیسے ہوتے ہیں، اور ذی الحجہ حسب حساب کبھی انتیسا اور کبھی تیسا ہوتا ہے۔

بچہ بچہ بھی جانتا ہے کہ یہ بالکل غلط ہے، رمضان مثلاً کبھی انتیسا ہوتا ہے تو کبھی تیسا، کبھی کئی کئی مہینے مسلسل انتیسے اور کبھی مسلسل کئی مہینے تیسے بھی ہوتے ہیں۔

ان حالات میں ان فرنگی جدولوں پر کامل اعتماد نہیں ہوسکتا، ایک، دو یا تین دن کا فرق ہوسکتا ہے، جیسا کہ ابھی نیچے مرحوم کی تاریخ وفات کے سلسلہ میں عرض ہوگا۔

بہر حال ان فرنگی جدولوں کے مطابق جمعہ ۲۳ر صفر ۱۳۰۲ھ کی معادل تاریخ جمعہ ۱۲ر دسمبر ۱۸۸۴ء ہے (۲۲ر نومبر نہیں)۔ تاریخ وفات اتوار ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء کو ہوئی جو پاکستانی رویت ہلال کے مطابق ۱۴ر ربیع الاول ۱۳۷۳ھ تھی، (لیکن فرنگی جدولوں کے مطابق اتوار کو ۱۵ر ربیع الاول تھی، اور ۱۴ر کو سنیچر کا دن تھا)۔

افسوس ہے کہ ۱۴۰۲ھ میں کسی کو خیال نہ آیا کی مرحوم کی ولادت کا صد سالہ جشن منایا جائے۔ اب فرنگی صدی کے سوا چارہ نہیں۔

<u>پاریس کی تقریبیں:</u>

۱۔ حکومت فرانس نے ابھی کوئی سال ڈیڑھ سال سے سیاسی مصلحت کے تحت سرکاری ٹیلی وژن میں ہر اتوار کی صبح کو نو سے سوا نو بجے تک پندرہ منٹ مستقل طور پر ''اسلامی اشاعت'' (Emission Islamique) کے لیے دے رکھے ہیں، اس کا سہرا مستشرق پروفیسر ژاک برک (Jaques Berque) کے سر ہے، جو صدر جمہوریہ موسیو میتر ان کے پرانے شخصی دوست ہیں، اس کی سربراہی کے لیے مقامی مسلمانوں کی ایک کمیٹی قائم کی گئی ہے، میں نے اسکے صدر اور معتمد سے عرض کیا کہ ایک اشاعت مرحوم سید سلیمانؒ کے لیے مختص کی جائے، انہیں کچھ تفصیلیں بھی دیں کہ مرحوم کا علمی کارنامہ کیا ہے، اور ٹیلی وژن کی ضرورتوں سے مرحوم کے مزار کے کچھ فوٹو (جو مولانا غلام محمد صاحب کراچی

Marfat.com

کا تحفہ تھے) نیز مرحوم کی چند کتابوں کے سرورق کے عکوس بھی مہیا کیے، یہ عرض قبول کی گئی، اور اتوار ۲۵ر نومبر ۱۹۸۴ء کو یہ اشاعت عمل میں آئی، اس میں مطلوبہ دو ایکٹروں میں ایک پروفیسر عبدالغفور فرہادی رواں صاحب (سابق وزیر و سفیر افغانستان) تھے، اور دوسرے سالار الدین محمد صاحب تھے، جو کتب خانہ السنۂ شرقیہ میں ایک فہرست نگار ہیں اور کاریکال کے باشندے۔

۲۔ اسی دن دوپہر کو پاریس کے محلۂ اِسٹالن گراڈ کی مسجد میں بھی یہ جشن ہوا، جو نمبر ۳۹ شارع طنجہ پر واقع ہے اور وسعت کے لحاظ سے یہاں کی سب سے بڑی مسجد ہے کہ کوئی تین ہزار آدمی بیک وقت نماز پڑھ سکتے ہیں۔ پاریس میں رابطة الطلاب الاسلامیین ایک انجمن ہے، جو تیں اکتیس سال سے قائم ہے، وہ ہر اتوار کو ایک لکچر کراتی ہے عربی میں ہو تو اس کا فی الفور فرانسیسی ترجمہ ہوتا ہے، فرانسیسی میں ہو تو عربی ترجمہ۔ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند، اولاً قرآن خوانی اور فاتحہ ہوئی۔ پھر میں نے تقریباً دو گھنٹے اپنے معلومات فرانسیسی میں برجستہ عرض کیے، جن کا آدھا وقت عربی ترجمے میں صرف ہوا، اس کے بعد حاضرین نے جو بہت متاثر تھے، سوالات بھی کیے، اور توضیحیں چاہیں۔

۳۔ اس کے چند دن بعد دسمبر کے آغاز میں، اس کے لیے یہاں کی ''ترکی'' مسجد میں ہندی پاکستانی جلسہ ہوا۔ انگلستان میں عالمگیر اسلامی مشن نامی ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے، اس کی ایک شاخ پاریس میں بھی دو چار سال سے قائم ہے۔ ان احباب کو یاد دلانا پڑا کہ سلیمان ندوی'' کون تھے، کب تھے، پھر ان کی فرمائش کی تعمیل کرنی پڑی، اولاً آدھ گھنٹہ حاضرین نے قرآن خوانی کی، پھر وہاں اردو میں اس موضوع پر لکچر ہوا۔

۴۔ اب پاریس میں ایک جگہ تیرہ یونیورسٹیاں قائم ہوگئی ہیں، ان میں سے ایک میں اردو کے استاد محمد عبدالماجد صاحب ہیں، انہوں نے جامعہ میں اس تقریب کا اہتمام کیا اور ۱۲ر دسمبر کو ٹھیک صد سالہ سالگرہ کے دن ان کے شعبے میں فرانسیسی تقریریں ہوئیں، خود ان کی بھی اور ایک میری بھی۔ میں نے خاص کر اس پر زور دیا کہ مرحوم کے ہاں اپج بہت تھی اور نئے نئے نادر موضوعوں پر کام کرتے تھے، مثلاً قدیم مسلمانوں کے ہاں

Marfat.com

اندھوں کا خط، جغرافیۂ قرآن، تحریری تدوین حدیث، انجیل برنابا، نظریۂ ارتقاء، ملکِ حبشہ میں ایک اسلامی مملکت، روس میں اسلامیات کی تعلیم، جاپان کا نظامِ تعلیم وغیرہ وغیرہ، زمانہ طالب علمی میں سیرتِ عائشہؓ لکھی جو بعد میں اب تک بلا ترمیم شائع ہوتی رہی ہے، اور بڑی مستند کتاب ہے، انہیں اسلامی دستور سے بھی دلچسپی تھی۔ مسئلہ خلافت کے سلسلے میں ہندستانی وفد میں لندن بھی گئے اور مکہ معظمہ کی کانفرنس میں بھی شریک رہے۔ وہ عربی کے خطیب تھے، انگریزی ہی نہیں عبرانی بھی جانتے تھے۔ کتابیں دس بیس لکھیں تو مقالے سیکڑوں۔ وسعت قلب کا یہ عالم تھا کہ حنفی تھے، لیکن سوانح عمری لکھی تو امام مالکؒ کی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ سیرت النبیؐ کی پانچ جلدیں ہیں، جو اردو زبان کا مایہ ناز ہیں، ہنوز ناتمام ہی تھی کہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

۵۔ پاریس میں جامعات کے ساتھ ایک مستقل ادارہ ہے ''بین الممالک معاملات کی تحقیق''، اس میں معلومات اور دستاویزیں جمع کی جاتی ہیں، اس نے بھی مرحوم سے دلچسپی لی ہے اور توقع ہے کہ آیندہ چند ہفتوں یا مہینوں میں اس کے ہاں بھی معتاد لکچروں میں (جو ہر پیر کو ہوتے ہیں۔) ایک سید صاحب مرحوم کی تقریب کے لیے بھی ہو گا۔ واللہ المستعان۔

(ڈاکٹر) محمد حمید اللہ

(معارف اعظم گڑھ۔ مارچ ۱۹۸۵ء)

Marfat.com

۵/جنوری ۱۹۸۶ء

مخدوم و محترم مد فیضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

کل شام ستمبر ۱۹۸۵ء کا معارف ملا۔ رات کو ورق گردانی کی، سب ہی مضامین دلچسپ ہیں۔ بارک اللہ۔

(۱) دراقت کا مضمون ابھی مکمل نہیں ہوا ہے، احتیاطاً ایک چیز کا ذکر کرتا ہوں۔ گوٹن برگ (فوت ۱۴۶۸ء) فنِ طباعت کا موجد مانا جاتا ہے۔ حال میں مجھے پتا چلا کہ پانا (آسٹریا) کے کتب خانۂ عام میں ایک ٹکڑا قرآن مجید کا موجود ہے۔ جو گوٹن برگ سے پانچ سو سال قبل سلجوقی دور میں (غالباً مصر میں) چھپا ہے۔ اور یہ تاریخ فرنگی محققوں نے بیان کی ہے۔ آسٹریا کو فوراً خط لکھ کر اس کا فوٹو منگایا۔ واقعی قابلِ دید اور قابلِ ذکر چیز ہے۔ میں اسے اپنے فرانسیسی مقالے "تاریخ خطِ عربی" میں چھاپ بھی رہا ہوں۔ اطلاعاً عرض ہے۔

(۲) یہ سب جانتے ہیں کہ صلح حدیبیہ سے واپسی پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمسایہ سلاطین کو تبلیغی خط لکھے۔ یہ ـــــ ھ کے اواخر کا واقعہ ہے، اس میں دو نکتوں کو توجہ دلانے کی اجازت چاہتا ہوں۔

(الف) اس پر سالِ رواں میں ۱۴۰۰ سال گزر رہے ہیں۔

(ب) رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ایک وقت تین براعظموں پر اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو وسعت دی، یوروپی حکمران ہرقل، ایشیائی حکمران کسریٰ پرویز اور افریقی حکمران اصحمہ نجاشی کو خط لکھے۔

(۳) شاید یہ بھی کہ صلح حدیبیہ کو قرآن مجید نے فتح مبین اور نصر عزیز کا نام دیا ہے، حضرت عمرؓ جیسا فرد بھی اسوقت اس کو سمجھ نہ سکا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر تشویش سے پوچھا تھا۔ یہ اہانت آمیز صلح کیوں؟ حضورؐ نے راز کو فاش کرنا نہ چاہا، امام شمس الائمہ سرخسی نے اپنی کتاب المبسوط اور شرح السیر الکبیر

میں اسکا راز بتایا ہے کہ یہ خیبر کی مجوزہ مہم کے وقت قریش کی غیر جانبداری و ناطرفداری کے حصول کے لیے تھا۔

ناچیز

محمد حمید اللہ

(معارف اعظم گڑھ۔فروری ۱۹۸۶ء)

مخدوم ومحترم طول اللہ عمرکم وکثر فینا امثالکم

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

کرم نامہ ملا۔ سرفراز کیا۔ یہ معلوم کر کے دلی صدمہ ہوا کہ نصیب دشمناں آپ کی صحت اچھی نہیں ہے اور آنکھوں پر عمل جراحی ہوا ہے۔ خدا جلد صحت کامل عطا فرمائے۔

میں معارف کا ادنا ناظر ہوں۔ دل میں اس کا احترام بہت ہے، چونکہ وہ مرجع انام ہے اور لوگ اب بھی، آیندہ بھی اس سے استناد کریں گے۔ اس لیے کبھی کوئی بات کھٹکے تو اطلاع دیتا ہوں کہ میری غلطی سے آپ مجھے آگاہ فرما دیں۔ اور بس۔

حفظکم اللہ وعافاکم

نیاز مند دیرینہ

محمد حمید اللہ، پیرس

۱۰ جمادی الآخرہ ۱۴۰۷ھ

(معارف اعظم گڑھ۔ مارچ ۱۹۸۷ء)

Marfat.com

پاریس - یکم رمضان ۱۴۰۷ھ

مخدوم ومحترم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

موقر رسالہ معارف کا شمارہ جنوری ۱۹۸۷ء ابھی ابھی آیا تو ورق گردانی سے استفادہ کیا۔ خاص کر پروفیسر عبدالرحمٰن مومن صاحب کا مضمون بہت ٹھوس ہے۔

اسی شمارے میں صفحہ ۴۸ پر درج ہوا کہ:

''حمید اللہ صاحب نے مجموعۃ الوثائق السیاسیہ میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ حضرت عمروؓ بن حزم کے صاحبزادے کی ولادت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے دو برس قبل ہوئی تھی۔ یہ بات درست نہیں، اس لیے کہ مورخین بالاتفاق یہ تحریر کرتے ہیں کہ آپ کو ۱۰ھ میں نجران کا عامل بنا کر بھیجا گیا تھا اور بچے کی ولادت نجران میں ہی ہوئی تھی۔''

ہوگا۔ لیکن مورخین کا ''بالاتفاق'' تحریر کرنا اس لیے صحیح نہیں کہ میں نے ابن عبدالبر کی الاستیعاب کی ایک روایت یہاں نقل کی، اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا۔

صاحب مقالہ اگر الوثائق السیاسیہ کا پانچواں اڈیشن سامنے رکھتے تو ان کے مضمون کے لیے مزید معلومات بھی ملتیں۔ وہ کراچی کے رسالہ ہمدرد اسلامیکس جلد ۵، شمارہ ۳-۱۹۸۲ء ص ۳ تا ۶ اور وہاں باتصویر مضمون سے بھی ناواقف نظر آتے ہیں۔ اسی طرح الاکوع الحوالی کی تالیف الوثائق السیاسیہ الیمنیہ، طبع بغداد ۱۹۷۶ء ان کے لیے مفید ہو۔

ناچیز

محمد حمید اللہ

(معارف اعظم گڑھ - مئی ۱۹۸۷ء)

Marfat.com

۱۴ر صفر ۱۴۰۸ھ

مخدوم ومحترم زاد فیضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

کرم نامے نے سرفراز کیا۔ حفظکم اللہ وعافاکم

معارف کی میرے دل میں بہت عزت ہے، وہ ہمارے تاریخِ حال کا مستقبل میں ایک وثیقہ، ایک ماخذ ہو گا۔ اسی لیے اس کے مندرجات کے متعلق آپ کو اکثر تکلیف دیتا، بلکہ دل دُکھاتا رہتا ہوں۔ التجا ہے کہ یہ قصور معاف کردیں کہ مقصد رنجیدہ کرنا بالکل نہیں۔

اس وقت اگست ۱۹۸۷ء کا معارف مکرر دیکھ رہا ہوں، معلوم نہیں عماد الدین خلیل صاحب کا قصور ہے، یا فاضل مترجم کا کہ صفحہ ۹۳ پر بواتیہ لکھا ہے، کیا ہم یہ نام بھی بھول گئے ہیں؟ Poitiers جس کا اردو تلفظ ہو گا پُواتیے۔ اسی طرح صفحات ۹۳، ۹۴، ۹۵ کے حواشی میں محمد اسد لیوپولڈ ویلس چھپا ہے، یہ Weiss وایس ہونا چاہیے۔ (آسٹریا کی یعنی جرمن زبان کا نام ہے) وہی لفظ جو انگریزی میں White / سفید ہو گیا ہے) صفحہ ۱۰۲ پر فرانسیسی نومسلم Etienne Dinet کا نام اتیین ڈینید کو میں "اے تیین دینے" لکھوں گا۔ صفحہ ۱۰۴ پر اطالوی کیتانی Caetani کا تلفظ کاے تانی ہے اسی صفحے پر ہالینڈی ہیرگرنجہ Hurgranje کا تلفظ میں نے خود ان کی زبان سے، ان کے گھر میں، ان کی بیوی اور بیٹی کی موجودگی میں ہُور خُردیے سنا ہے، ہالینڈی میں (G) کا تلفظ (خ) اور (j) کا (ی) ہوتا ہے، آخر میں صفحہ ۱۰۶ پر فلہاوزن جو جرمن ہے، (Wellhausen) اردو میں ویلہاوزن ہونا چاہیے، اس میں (W) انگریزی کے (V) کی طرح ہے، لیکن جو اردو میں نہیں پایا جاتا ہے قریب تر آواز اردو میں (واو) کی سی ہے۔

آپ دلی تشریف لے گئے تھے، محترم کرم فرما مالک رام صاحب ایک نیا ارمغان نکالنے والے تھے، معلوم نہیں آپ کو خبر ہے یا نہیں، اور یہ کہ وہ کس مرحلے میں؟ (لکھ دیا جواب کا انتظار نہیں اس کی زحمت نہ فرمائیں) ڈاکٹر زور مرحوم کے متعلق عرض

کرونگا کہ انہیں اللہ جنت نصیب کرے، رفیق تو تھے، لیکن ان کے اختصاص یعنی اردو ادب سے مجھے لگاؤ نہ رہا، اس لیے واقفیت بھی کم ہے، آپ کا فرمانا سرآنکھوں پر۔ ایک محدث ابومحمد عبداللہ بن محمد بن زیاد السندی کے حالات کی سخت تلاش ہے، بہ ظاہر چوتھی صدی ہجری کے ہیں، ابن حجر کے یہاں بھی ذکر نہیں ملا، اسلام آباد سے بھی نفی میں جواب آیا ہے۔ واللہ المستعان۔ حفظکم اللہ وعافاکم۔

محمد حمید اللہ

(معارف اعظم گڑھ۔ دسمبر ۱۹۸۷ء)

پاریس، فرانس

۳۰ر جولائی ۱۹۸۸ء، ۱۶ر ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ

مکرم ومحترم متعنا اللہ بطول حیاتکم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ

جولائی کا شمارہ جولائی ہی میں پہنچ گیا، ممنون ومسرور بھی ہوا اور ششدر بھی، جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ شاید جلد بازی کے باعث مجھ سے ہی غلطی ہوئی تھی، مگر غلطی کی اصلاح ہو جائے تو اچھا ہے،

صفحہ ۵۶/سطر ۱۵ میں چھپا ہے "۷ھ کے غزوۂ خندق" یہ "خیبر" ہونا چاہیے۔

صفحہ ۵۹/سطر ۷: "اُن دن" کیا یہ "اُن دنوں" نہیں ہونا چاہیے؟

صفحہ ۶۰/سطر ۱۵: "اس سے انتقام لینے کا حکم دیا" واضح نہیں، کہنا یہ ہے:

"اس کا انتقام لینے کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا۔"

نیازمند:

م ح ا

(معارف اعظم گڑھ۔ اگست ۱۹۸۸ء)

Marfat.com

پاریس، فرانس
۱۴ر محرم ۱۴۰۹ھ

مخدوم ومحترم زاد فیضکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہفتہ عشرہ ہو گیا، کرم نامہ ملا تھا، عمر کا بہانہ بناؤں تو بھی قصوروار بہرحال ہوں کہ جواب فوراً نہیں دیا، والعذر عند کرام الناس مأمول، معاف فرمادیں۔

آپ کو زحمت دی تھی، دلی شکریہ کہ آپ تصحیح شائع فرمارہے ہیں، ہمارے آثار قلمیہ کی عمر ہم سے زیادہ ہوتی ہے، الا ماشاء اللہ، معارف ایک مستند رسالہ ہے، اس میں سہواً ہی سہی، غلطی ہوئی ہو تو اس کی تصحیح ایک علمی فریضہ ہے، علمی رسالوں کے نئے سے زیادہ پرانے نمبروں سے اہل علم استفادہ کرتے ہیں۔

آپ دیکھ چکے ہیں کہ جب بھی کوئی اپنی دانست میں اہم چیز ذہن میں آتی ہے تو میں معارف ہی کا توسط ڈھونڈتا ہوں، میرے تجربے میں عنوان کام کا تین چوتھائی حصہ ہوتا ہے، مواد کا جمع کرنا بیس فی صد اور تدوین پانچ فی صد، لیکن عنوان حسب طلب ذہن میں نہیں آتا یہ بہانہ نہیں حقیقت ہے، اور کیا عرض کروں؟

حفظکم اللہ وعافاکم
(م ح ا)

مکرر۔ ان دنوں اتفاقاً دسمبر ۱۹۵۹ء کا معارف ہاتھ میں پڑا، اس میں اس ناچیز کے فرانسیسی ترجمۂ قرآن کی تاریخ بھی ہے[۱]، وہ پہلا اڈیشن تھا، آپ کو یہ سن کر مسرت ہو گی کہ اب ۱۹۸۸ء میں الحمدللہ اس کا پندرہواں اڈیشن مطبع میں ہے۔ اس دفعہ ناشر اس کے ایک لاکھ نسخے نکالنا چاہتا ہے۔ مانگ بہت ہو گئی ہے، خاص کر سیاہ افریقہ میں۔

(معارف اعظم گڑھ - اکتوبر ۱۹۸۸ء)

---

۱ ان سطروں کی کتابت ہو چکی تھی کہ مکتوب نگار کا اس پر مقالہ بھی آ گیا جو ان شاء اللہ آئندہ شمارہ میں شائع ہوگا۔

Marfat.com

منگل ۱۹ ررمضان المبارک ۱۴۰۹ھ

مخدوم ومحترم محمد عارف عمری صاحب زادفیضکم

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اپریل رواں کے معارف میں عبد بن حمیدؒ پر آں محترم کا مقالہ پڑھا۔ ماشاء اللہ حقِ تحقیق ادا کیا گیا ہے۔ جزاکم اللہ فی الدارین خیرا۔ ؎

کیا یہ ناچیز آں محترم کو ایک زحمت دے سکتا ہے؟

استانبول میں ایک مخطوطہ ہے کتاب السردوالغرد فی صحائف الاخبار ونسخھا من سید المرسلین، مما الفہ ابو الخیر احمد بن اسمعیل القزوینی۔ یہ کوئی ۵۰۰ھ کے ایک نامعلوم مولف ہیں اور اپنی اسناد میں ایک ابو محمد عبداللہ بن محمد بن زیاد السندی کا ذکر کرتے ہیں۔ کیا خاص کر آخر الذکر کا آپ کو کوئی پتا چلتا ہے؟

کتاب کے آغاز میں ہے: عربی عبارت

اگر تلاش میں زحمت ہے تو پھر اس عریضے کو ردی کر دیجیے۔ عید مبارک

ناچیز ح

(معارف اعظم گڑھ۔ مئی ۱۹۸۹ء)

؎ ایک ادنیٰ طالب علم کے حقیر مضمون کی ڈاکٹر صاحب جیسے متبحر عالم اور نامور فاضل کی یہ تحسین یقیناً انکی عالی ظرفی اور اپنے خوردوں کی حوصلہ افزائی ہے، اس سے پہلے بھی دسمبر ۸۷ء کے معارف میں ابو محمد عبداللہ بن محمد بن زیاد کے متعلق ان کا گرامی نامہ شائع ہوا تھا، اور اب انہوں نے اس کے متعلق اس ناچیز کو بھی تحریر فرمایا ہے۔

تلاش وجستجو کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر مخطوطہ میں کاتب نے اَلْبِسْمَذِی کو السندی لکھ دیا ہے، اسی وجہ سے کتابوں میں ان کا ذکر نہ مل سکا۔ ابو محمد بن عبداللہ بن زیاد السندی درست نہیں ہے، صحیح ابو محمد عبداللہ بن محمد بن علی بن زیاد اَلْبِسَمْذِی ہے، انہوں نے عبداللہ بن محمد بن شیرویہ سے اور ان سے عبدالرحمٰن بن حمدان النصروی نے روایت کی ہے، انکے مزید حالات کے لیے (کتاب الانساب علامہ سمعانی، جلد ۷ ص ۲۱۶، ۲۱۷ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد) اور (المشتبہ فی اسماء الرجال، امام ذہبی ص ۷۴، ۷۵ مطبوعہ لائیڈن) دیکھی جا سکتی ہے۔

(محمد عارف عمری)

Marfat.com

محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی معذرت

محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کا شمار دور حاضر کے نامور مسلم محققین میں ہوتا ہے انہوں نے حیدرآباد دکن سے علمی و تحقیقی زندگی کا آغاز کیا اور اب کافی عرصہ سے پیرس میں مقیم ہیں۔ مختلف جرائد و رسائل میں ان کے علمی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

گزشتہ سال ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے عربی جریدہ ''الدراسات الاسلامیہ'' کے کسی شمارہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں انہوں نے اس مسئلہ پر بحث کی کہ جب قرآن کریم نے بیک وقت چار سے زیادہ شادیوں کی ممانعت کر دی ہے تو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نو بیویاں کیوں تھیں؟ اس کے جواب میں انہوں نے یہ نکتہ پیدا کیا کہ قرآن کریم کا یہ حکم نازل ہونے کے بعد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پانچ بیویوں کو حقوق زوجیت سے الگ کر کے ''اعزازی بیویوں'' کی حیثیت دے دی تھی اس پر پاکستان کے دینی حلقوں میں ہیجان پیدا ہوا۔ مختلف رسائل و جرائد نے اس پر قلم اٹھایا اور اہل علم نے اس نکتہ کو مسترد کر دیا۔ ''الشریعہ'' میں بھی پروفیسر عبدالرحیم ریحانی صاحب کا ایک مضمون شائع کیا گیا جس میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب موصوف کی اس تحقیق کو رد کر۔تے ہوئے لکھا کہ بیک وقت چار سے زیادہ بیویوں کا ہونا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کا ایک مفصل وضاحتی مکتوب موصول ہوا۔ جس میں انہوں نے اپنے سابقہ موقف کا اعادہ کرتے ہوے اس پر دلائل دیے ہیں۔ یہ مکتوب بھی ''الشریعہ'' میں شائع کر دیا گیا اور اعلان کیا گیا کہ اس پر مولانا قاضی محمد رویس خان ایوبی کا تحقیقی مضمون شائع کیا جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کے اس موقف پر ماہنامہ صدائے اسلام پشاور نے بھی

Marfat.com

احتجاج کیا تھا۔ جس پر انہوں نے صدائے اسلام کے مدیر کے نام ایک مکتوب میں اپنے موقف سے رجوع اور معذرت کا اظہار کیا ہے۔ یہ مکتوب ذیل میں درج کیا جا رہا ہے اور اسکے ساتھ بحث کو ختم کیا جاتا ہے کیونکہ اس مکتوب کے بعد بحث کو مزید آگے بڑھانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس کے ساتھ ہی ہم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے اہل علم کی روایت کو نبھاتے ہوئے اپنی غلطی کے اعتراف میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کی جس سے ان کے علمی وقار اور احترام میں یقیناً اضافہ ہوا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و عافیت کے ساتھ اپنا علمی سفر جاری رکھنے کی توفیق عطاء فرمائیں۔ آمین یا الہ العالمین۔ (ادارہ)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا خط

باسمہ تعالیٰ حامداً و مصلیاً

محترم جناب ایڈیٹر صاحب ماہنامہ صدائے اسلام پشاور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ آپ کے مؤقر رسالے سے بدقسمتی ہے فرانس جیسے دُور دراز ملک میں واقف نہ ہو سکا تھا۔ اب ایک دوست نے اس کے جولائی ۹۰ء کے چند اوراق بھیج کر میری توجہ اس کی طرف منعطف کرائی ہے۔ فوراً آپ کو یہ عریضہ بھیج رہا ہوں۔ کامل پتا پاس نہ ہونے سے معلوم نہیں پہنچے گا یا نہیں۔

میری عمر پچاسی سال سے متجاوز ہو گئی کہ (محرم ۱۳۳۶ھ کی ولادت ہے)[ا] اس لیے یقیناً عقل بھی سٹھیا گئی ہے۔ ادارہ تحقیقات اسلامی میں نیک نیتی سے جو مضمون لکھا تھا وہ غلط ہو سکتا ہے کہ انسان ہوں الحق یعلو ولا یعلی علیہ حق بات کا بول بالا ہو سکتا ہے انسانوں کا نہیں۔ آپ کے ناظرین میری نہیں اہل علم کے فیصلے کی تعظیم کریں۔

ا ڈاکٹر صاحب کو ذہول ہوا۔ عمر ۸۵ سال نہیں بلکہ ۷۵ سال بنتی ہے۔ (۱۴۱۱ھ-۱۳۳۶ھ)
(م۔ع۔م۔ح)

Marfat.com

فرنگستان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جہاں آئے دن اعتراض ہوتے رہتے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کہتے کچھ تھے اور کرتے کچھ اور مثال کہ قرآن مجید نے چار پر بیویوں کی تحدید کی ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نو بیویاں تھیں۔ اعتراض معقول نظر آتا ہے اس لیے جواب کی ضرورت ہے۔ اگر یہ خصائص نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے تو سر آنکھوں پر، اگر نہیں تو مسکت جواب کی ضرورت ہے۔ اتفاق سے تفسیر طبری وغیرہ پرانی مستند کتابوں میں ایک جواب ملا جس میں رسول اکرم کی توہین بالکل نہیں بالکل یہ کہ رسول اکرم احکامِ خداوندی کی تعلیم بھی کرتے تھے اور تعمیل بھی فرماتے تھے۔ اگر میرا مطالعہ ناقص اور میرا استنباط غلط ہے تو میں اللہ کے پاس معافی مانگتا ہوں۔ میں نے الدراسات الاسلامیہ میں عربی میں مضمون اسی لیے لکھا ہے کہ وہ عوام نہیں بلکہ اہلِ علم کے مطالعہ میں آتا ہے۔

محمد حمید اللہ

(بشکریہ ماہنامہ صدائے اسلام پشاور جنوری ۱۹۹۱ء)

(ماہ نامہ الشریعہ گوجرانوالہ - مارچ ۱۹۹۱ء)

باسمہ تعالٰی حامداً ومصلیاً

۲۸ صفر ۱۴۱۳ھ/ اگست ۱۹۹۲ء

مخدوم ومحترم زاد مجدکم

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

معارف کا تازہ شمارہ ۲/۱۵۰ آج پہنچا۔ ممنون ہوا۔ اور کام چھوڑ کر اسے پڑھا

Marfat.com

اور مستفید ہوا۔

۱۔ اس کے صفحہ ۱۵۵ پر ''تیونس'' کی توقع نہیں تھی، آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ شاید وہاں انگریزی کا تلفظ یوں ہی ہوتا ہو۔ لفظ تونس ہے۔ برموقع بھی لوگ تونس ہی کہتے ہیں۔

۲۔ صفحہ ۱۵۴ میں یہ اضافہ کروں گا کہ ہجرہ کاونسل اسلام آباد نے جن ایک سو اہم کتابوں کے چھاپنے کا فیصلہ کیا ہے، ان میں نمبر (۲) پر القزوینی کی کتاب السرودالفرد ہے۔ شاید ابھی وہاں نہیں آئی ہے، یہ حدیث کی اہم اور شاید قدیم ترین کتاب ہے۔ اس میں چند صحابہ کی تالیفیں یکجا کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت جعفر بن نسطور الرومیؓ ہیں جو نظر آتا ہے کہ غزوۂ تبوک کے وقت تبوک میں مسلمان ہوے، ان کے مزید کوئی حالات باوجود تلاش اب تک نہ ملے، شاید آپ کو کچھ پتا ہو۔

۳۔ صفحہ ۱۵۴ تا ۱۵۵ پر مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کی تفسیر کے ابتدائی حصے کے کوالالمپور میں چھپنے کا ذکر ملا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں یہ جامعۂ عثمانیہ کے پروفیسر سید عبداللطیف مرحوم کی کتاب کی مکرر طباعت ہے۔ حیدرآباد میں ایک عبداللطیف ٹرسٹ بھی ہے۔ ان کی شاید ساری ہی تفسیر انگریزی میں حیدرآباد دکن میں چھپی ہے، ملیشیا میں طبع ثانی ہے۔

ناچیز

محمد حمید اللہ

(معارف اعظم گڑھ۔اکتوبر ۱۹۹۲ء)

پاریس ۱۱ رمئی ۱۹۹۴ء

مخدوم ومحترم اڈیٹر صاحب رسالۂ معارف زادمجدکم

سلام مسنون

ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ بمبئی کے فضیلت مآب پروفیسر عبدالرحمٰن مومن صاحب نے آپ کو کتاب السرودالفرد مولفہ ابوالخیر قزوینی پر ایک مضمون بھیجا ہے۔ اگر وہ

Marfat.com

مضمون چھپ رہا ہے تو معارف کے اسی شمارے میں مناسب معلوم ہو تو مسلکہ تحریر بھی شامل فرما دیں۔ ممنوں ہوں گا۔ "ح"

پاریس میں ایک فاضل ایرانی رہتے ہیں۔ انہوں نے زحمت فرما کر میرے ایک خط کے جواب میں مندرجۂ ذیل اطلاع دی ہے۔ خدا انہیں جزائے خیر دے:

"ابوالخیر احمد بن اسماعیل بن یوسف الطالقانی القزوینی۔ طالقان ایک بہت چھوٹا شہر ہے جو تہران کے قریب ہے۔ اس مولف کا لقب رضی الدین ہے یہ ایک جلیل القدر شافعی عالم تھے، بہت بڑے حفاظ قرآن میں سے تھے، زبردست خطیب بھی تھے۔ ۵۹۰ھ قمری میں وفات پائی۔ حنبلی فقیہ عبدالرحمٰن بن علی بن الجوزی التیمی جمال الدین ابوالفرج کے معاصر تھے۔ بعض وقت بغداد جا کر مجلس وعظ منعقد کرتے جس میں خلیفۂ وقت بھی (جو بظاہر ابوالعباس الناصر الدین اللہ احمد بن مستضئ تھا) ان کی مجلس وعظ میں آتا اور پس پردہ بیٹھا کرتا۔ اس میں عوام کا بڑا اژدحام ہوا کرتا۔ بہت جلیل القدر عالم تھے۔ حدیث، تفسیر، قراءت اور دیگر علوم منقولہ میں بہت بلند درجہ رکھتے تھے اور صاحب تالیفات تھے۔

مخفی نہ رہے کہ ہمارے ہاں ابوالخیر نامی گیارہ فاضل گزرے ہیں:

۱۔ احمد ابوالخیر بن علی معروف بہ نجاشی
۲۔ ابوالخیر جواد معروف بہ ابوالخیر حماد
۳۔ ابوالخیر حسن معروف بہ ابن خمار
۴۔ ابوالخیر عاشق معروف بہ ابوالخیر عاشق
۵۔ ابوالخیر عبد معروف بہ بیضاوی
۶۔ ابوالخیر فضل اللہ معروف بہ ابوسعید فضل اللہ
۷۔ ابوالخیر محمد بن عبداللہ معروف بہ مروزی
۸۔ ابوالخیر محمد بن عبدالرحمٰن معروف بہ سخاوی

Marfat.com

۹۔ ابوالخیر محمد بن محمد بن علی معروف بہ جزری

۱۰۔ ابوالخیر بن مصطفیٰ طاش کوبری زادہ

۱۱۔ زیر بحث کتاب السرد والفرد کا مولف

''ضرورت پر مزید تفصیل دے سکتا ہوں۔''

خادم

''ح''

(معارف اعظم گڑھ۔ جولائی ۱۹۹۴ء)

پیرس، فرانس

۲۹ ستمبر ۹۴ء

مخدوم و محترم زاد مجدکم و عم فیضکم!

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ ابھی ابھی معارف کا تازہ شمارہ بابت ماہ مئی ۹۴ء ملا۔ ممنون بھی ہوا اور سرفراز بھی۔ اگر کسی اور سے کام بنتا تو آپ کو زحمت نہ دیتا۔ آپ نے ایک نئے (ہندی) ترجمۂ قرآن مجید کا ذکر فرمایا ہے۔ کیا آں محترم اطلاع دے سکتے ہیں کہ سورۃ المنافقون ۴/۶۳ کی آیت کانھم خشب مسندۃ کا اس میں کیا ترجمہ ہوا ہے ؟[1] ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ کے ترجمے دل کو نہیں لگتے۔ دیوار پر جھکائے ہوئے لکڑی کے ٹکڑوں کو منافقین سے کیا مشابہت ہے؟ مجھے پسند وہ ترجمہ ہے جو تاج العروس نے ''سند'' کے مادے میں دیا کہ وہ مالدار لوگوں کا شاندار لباس ہے نہ کہ استناد، جھکانا۔

حفظکم اللہ وعافاکم

خادم: الفقیر الی اللہ: ح

(معارف اعظم گڑھ۔ اکتوبر ۱۹۹۴ء)

---

[1] ترجمہ کا جو حصہ خدابخش لائبریری سے شائع ہوا ہے اس میں سورۂ منافقون کا ترجمہ درج نہیں ہے۔ (معارف)

Marfat.com

4, R. Tournon,

75 Paris vi

۸ شعبان ۱۳۹۱ھ

محترمی زادمجدکم

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ میں سفر پر تھا، واپسی پر عنایت نامہ ملا، دانی صاحب کا مضمون نقل کرنے کی آپ نے زحمت فرمائی۔ جزاکم اللہ خیرا۔

اس مضمون میں کوئی نئی چیز نہ ملی۔

راجہ کا نام زھمی/دھمی اور اس کا تلفظ نیز اس کی ہندی اصل کے متعلق علاوہ اور امور کے ان عربی کتابوں کے مخطوطوں کا مقابلہ ضروری ہے جن میں یہ نام آیا ہے۔ اولاً وہ حوالے جمع کیے جائیں جن میں یہ نام ہے، پھر ان کتابوں کے مخطوطوں کو دیکھا جائے۔ یہ کام مشکل بھی ہے اور کسی نے اب تک کیا بھی نہیں۔

بہرحال نوازش پر دل سے ممنون ہوں۔

الفقیر الی اللہ

محمد حمید اللہ

(ماہ نامہ تعمیر افکار کراچی - مارچ - اپریل - مئی ۲۰۰۳ء)

(بیاد پروفیسر سید محمد سلیم)

Marfat.com

۲ر ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ

''میں انقرہ آیا ہوا ہوں کہ کل یہاں مشہور حنفی فقیہ امام سرخسی کی ۴۸۳ھ میں وفات پر نو سو سال گزرنے کی یادگار منائی جا رہی ہے۔ بین الاقوامی اجتماع ہے۔ یاد ہوگا کہ امام سرخسی کو حکمران وقت نے کسی وجہ سے قید کر دیا تھا جہاں وہ سالہا سال (شاید پندرہ سال) صابر وشاکر رہے اور قید میں بھی طلبہ کو درس املا کراتے رہے۔ زمانۂ قید کے اس املا کی یادگار

کتاب المبسوط : ۳۰ جلد (کوئی سات ہزار بڑی تقطیع کے صفحے)
شرح السیر الکبیر : ۴ جلد (ڈیڑھ ہزار صفحے)
اصول الفقہ : ۲ جلد (ہزار صفحے)
شرح زیادات الزیادات

ہیں اور چھپ چکی ہیں۔ اُسی زمانے کی کئی اور کتابیں تھیں جو اب ناپید ہو گئی ہیں۔ اس تقریب پر ایک نمائش بھی کی جا رہی ہے جس میں صرف سرخسی کے مخطوطات جمع کیے گئے ہیں جو ایک سو کے قریب ہیں۔ قدیم ترین مخطوطہ چھٹی صدی کا ہے۔

گزشتہ سال بھی ایک تقریب ہوئی تھی اور استانبول میں ابو حنیفہ دینوری جو مشہور نباتاتی گزرا ہے، اس کی وفات پر گیارہ سو سال گزرے تھے۔ اس کے سلسلے میں

Marfat.com

بھی کتب نباتات کی ایک نمائش کی گئی تھی۔ کئی درجن باتصویر قلمی کتابیں بھی اس میں دیکھنے میں آئی تھیں۔ جن میں قدیم اسلامی مصوروں کی بنائی ہوئی نباتاتی رنگین تصویریں تھیں۔

چار سال بعد اوّلین نزول وحی پر چودہ سو سال گزر رہے ہیں۔ ترکی بھائیوں نے اُس کو موزوں طور پر منانے کی تیاری شروع کر دی ہے۔''

(محمد حمید اللہ)

تبصرہ:

ترکی لیڈروں نے تو بہت چاہا کہ اسلام اور اس کے متعلقات سے اپنا پیچھا چھڑا لیں۔ لیکن اسلام اور اسلامیات خود ہی اس آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے نہیں اور کسی فلسفی، مہندس، شاعر، مورخ و ادیب کی علمی یادگاروں تک تو خیر لیکن دینی شخصیتوں اور مذہبیات کی یادگاروں کے منانے میں تو یقیناً فخر ملت اور ہمارے سابق ہم وطن ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی بھی سعی و تحریک کو بڑا دخل ہوگا۔ اختیاری ہجرت کی سعادت صحیح معنی میں جو انہیں حاصل ہوئی، وہ نادر ہی کسی کے نصیب میں آتی ہے۔ اس خوش نصیبی پر وہ اپنے ہمہ وقتی قلمی اور لسانی جہاد سے برابر اضافہ ہی کرتے رہتے ہیں۔ ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

(ہفتہ وار صدق جدید لکھنؤ یکم مئی ۱۹۶۴ء)

Marfat.com

ذخیرہ محمد اقبال مجددی لاہور

مآخذ و مراجع

۱۔ محمد حمید اللہ ڈاکٹر — خطبات بہاول پور
ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد ۱۹۹۷ء

۲۔ رسول اکرم کی سیاسی زندگی — دارالاشاعت، کراچی ۱۹۶۸ء

۳۔ محمد راشد شیخ — ڈاکٹر محمد حمید اللہ
المیزان پبلشرز، فیصل آباد ۲۰۰۳ء

۴۔ قاسم محمود سید — ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی بہترین تحریریں
بیکن بکس لاہور/ملتان ۲۰۰۳ء

۵۔ سہ ماہی مجلہ عثمانیہ — کراچی۔ اپریل تا جون ۱۹۹۷ء

۶۔ ماہ نامہ دعوۃ — دعوت اکیڈمی بین الاقوامی یونیورسٹی
اسلام آباد۔ مارچ ۲۰۰۳ء

۷۔ سہ ماہی فکر و نظر — ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد
اپریل تا ستمبر ۲۰۰۳ء

۸۔ ششماہی معارف اسلامی — علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
جولائی ۲۰۰۳ء تا جون ۲۰۰۴ء

۹۔ روزنامہ منصف حیدرآباد (دکن) مورخہ ۶ر ستمبر ۲۰۰۳ء

Marfat.com

Marfat.com

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (سیرت پاک)

تحریر: ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ   ترجمہ: پروفیسر خالد پرویز

عالمی شہرت یافتہ عالم دین ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ نے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی تمام تر زندگی کے مطالعہ اور تحقیق کا نچوڑ اس کتاب میں سمو دیا ہے۔ کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی تھی جسے پروفیسر خالد پرویز نے انتہائی سلیس، سادہ اور وضاحتی انداز میں اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ سینکڑوں کتابوں کی ایک کتاب۔ ہر قاری کے لیے یکساں مفید۔

دنیا کا قدیم ترین پہلا دستیاب شدہ مجموعۂ حدیث

صحیفہ ہمام بن منبہ عن ابی ہریرہؓ

تحقیق: ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ   تزئین: پروفیسر خالد پرویز

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ حافظ الحدیث بھی تھے اور محافظ الحدیث بھی۔ آپؓ نے اپنے ایک شاگرد ہمام بن منبہ کے لیے ایک مجموعہ حدیث مرتب کیا تھا جو من و عن محفوظ رہا۔ عالمی شہرت یافتہ عالم دین ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ نے اس مجموعہ کو تلاش کیا، ایڈٹ کیا اور ساتھ ہی تاریخ و تدوینِ حدیث سے متعلق بیش بہا تفصیلات بھی بیان کر دیں۔ پروفیسر خالد پرویز نے ہر حدیث کا عنوان حاشیہ، انگریزی ترجمہ، حضرت ابو ہریرہؓ کی شخصیت کے ساتھ اردو انگریزی میں دیباچہ تحریر کر کے اس کی تزئین کی ہے جس سے اس کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ مستند مجموعہ اس دعویٰ کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ پہلی تین صدیوں تک تدوین حدیث کا کام انجام ہی نہیں پایا تھا۔

بیکن بکس

- قذافی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور فون: 042-7351662
- گلگشت، ملتان فون: 061-520790, 520791

E-mail:beaconbookspakistan@hotmail.com

BEACON BOOKS

Rs.410

عالمی شہرت یافتہ عالم دین

نگارشاتِ

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

گرد آوردہ: محمد عالم مختارِ حق

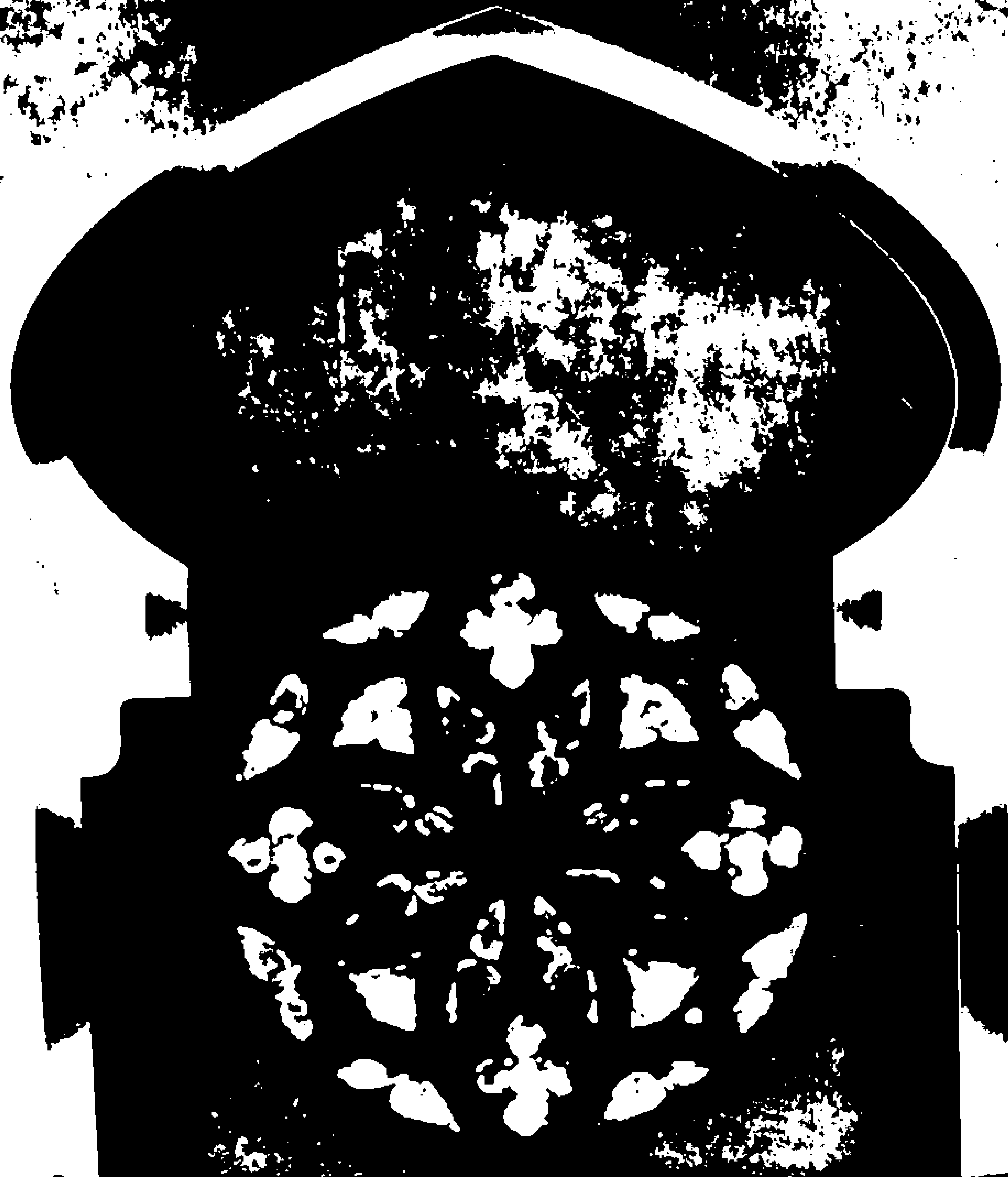

Marfat.com